تہذیبِ نفس
اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ
الحدیث
نفس کیا ہے؟
آفات و خطراتِ نفس
تزکیہ و تہذیبِ نفس
پیر عبداللطیف خان نقشبندی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تہذیب نفس

نفس کی اہمیت، اقسام و مدارج، اس کی آفات اور قلب، عقل اور روح پر اثرات پر مفصل اور مدلل بحث کے بعد قرآن و احادیث اور اقوال صالحین کی روشنی میں اس کی تہذیب پر ایک کتاب

مصنف

حضرت پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ

خلیفہ مجاز نیریاں شریف (آزاد کشمیر)

نشان منزل پبلی کیشنز

نادر آباد نمبر 2، بیدیاں روڈ، لاہور۔ فون 03234848781 :042-35709606

Web: www.nishanemanzal.com eMail: nishanemanzal@gmail.com

نشان منزل پبلیکیشنز۔ شاپ نمبر ۲، ظہور ہوٹل، نزد مکتبۃ المدینہ، داتا دربار مارکیٹ، لاہور۔042.37114939

نام کتاب: تہذیب نفس

نام مصنف: حضرت پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ

مرتب : احمد فضیل خان

اشاعت اول: جولائی 2012ء

تعداد: 1000

ٹائٹل: طارق محمود نقشبندی

پبلشر: نشان منزل پبلی کیشنز

صفحات: 586

قیمت:

معاونت: علامہ شبیر، عارف جمیل، عاصم مجید خان، سلمان لطیف، لقمان لطیف حماد، شوکت، سرفراز، اسلم، اقبال، اور واجد

ملنے کا پتہ

ادارہ نشانِ منزل (رجسٹرڈ) نادر آباد نمبر 2، بیدیاں روڈ لاہور۔ فون: 042-35709606

نشان منزل پبلیکیشنز۔ شاپ نمبر ۲ ظہور ہوٹل، نزد مکتبۃ المدینہ دا تا دربار مارکیٹ، لاہور۔ 042.37114939

اس کتاب کے مخصوص سیلز پوائنٹ (بیرون ممالک)

Arif Jamil Khan, Pleasanton,USA.Tel: 15105798668.

.Salman Latif Khan, Pleasanton,USA Tel 15106769886.

Luqman Latif Khan, Vancouver, Canada Tel 17788381365

Tahir Ayub, Toronto, Canada Tel 14168225590

Asif Zaman, Bredford, England. Tel 447832930285:

اس کتاب کے مخصوص سیلز پوائنٹ (پاکستان)

ادارہ نشانِ منزل، نادر آباد کالونی، بیدیاں روڈ، لاہور کینٹ، ٹیلیفون: 0323-4878481/0423570960

نشان منزل پبلیکیشنز۔ شاپ نمبر۲ ظہور ہوٹل، نزد مکتبۃ المدینہ، داتا دربار مارکیٹ، لاہور۔ 042.37114939

نشان منزل پبلیکیشنز۔ شاپ نمبر۳، عمر مارکیٹ، جی ۱۰/۴، اسلام آباد۔ 03235083640

فیروز سنز لاہور، راولپنڈی، پشاور، کراچی۔

سنگ میل پبلشرز۔

مکتبہ ضیاء القرآن، لاہور اور راولپنڈی۔

نوری کتب خانہ نزد دربار گنج بخش روڈ لاہور۔

خزینۃ العلم و ادب، اردو بازار، لاہور 04237211468

احمد بکس اینڈ پبلیکیشنز، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

ویلکم بک سیلر، اردو بازار، کراچی 02132633151

البلال بکس، اردو بازار، کراچی: 0213263264

فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور، کراچی۔

سعید بکس، اسلام آباد، پشاور۔

جہانگیر بکس ملتان، ٹیلیفون: 0614781781

بیکن بکس گلگشت کالونی ملتان۔

بک گیلری، جناح روڈ کوئٹہ، ٹیلیفون: 08184323229

بکس اینڈ بکس، ایبٹ آباد۔

بک لینڈ، جناح روڈ کوئٹہ، ٹیلیفون: 0812824295

شمع بک ایجنسی، اردو بازار، لاہور۔

بنگش بکس، سیالکوٹ۔

صراط مستقیم گوجرانوالہ۔

صراط مستقیم داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

مکتبہ امام رضا داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

مکتبہ اعلیٰ حضرت داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

مکتبہ خان قادریہ داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

مکتبہ خانہ قادری رضوی گنج بخش روڈ لاہور۔

مغل دارالکتب الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

مکتبہ جمال کرم داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

مکتبہ دارالعلم داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

الفیصل ناشران اردو بازار لاہور۔

نعیمی کتب خانہ اردو بازار لاہور۔

مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور۔

کتاب گھر کمیٹی چوک راولپنڈی۔

اسلامک بک کارپوریشن فضل داد پلازہ کمیٹی چوک راولپنڈی۔

کرمانوالہ بک شاپ داتا دربار مارکیٹ لاہور۔

تعمیرات انسانیت، اردو بازار، لاہور۔

اقرأ بکس، انارکلی، لاہور۔

مکتبہ غوثیہ، کراچی

علامہ فضل حق پبلشر لاہور

مکتبہ سخی سلطان حیدر آباد

نورانی ورائٹی ہاؤس ڈیرہ غازی خان

مکتبہ برکات المدینہ کراچی

مکتبہ رضویہ کراچی

مکتبہ بہار شریعت لاہور

تہذیبِ نفس از قرآن کریم

۱۔ ''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○'' ۱ (قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی۔ پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اسکی پارسائی۔ یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کرلیا۔ اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا)۔

۲۔ ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ'' ۲ (لوگوں کے لیے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کردی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے)۔

۳۔ ''وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ'' (اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمائے)۔ ۳

۴۔ ''قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ'' (فرمایا: (ایسا نہیں) بلکہ تمہارے نفسوں نے یہ بات تمہارے لیے مرغوب بنادی ہے، اب صبر (ہی) اچھا ہے)۔ ۴

۵۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس کو (بُری) خواہشات و شہوات سے باز رکھا، تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔ ۵

۶۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ (بے شک وہی بامراد ہوا جو (نفس کی آفتوں اور گناہ کی آلودگیوں سے) پاک ہوگیا)۔ ۶

---

۱ الشمس:۹۔ ۲ آل عمران:۱۴۔
۳ یوسف:۳۵۔ ۴ یوسف:۸۳۔
۵ النازعات:۴۰ ۶ الاعلیٰ:۱۴

تہذیبِ نفس از احادیثِ مبارکہ

۱۔ ''اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِیَّ''[1] (داناوہ ہے جواپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور آنے والی زندگی کے لئے عمل کرتا ہے۔ عاجز وہ ہے جواپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا رہتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہے)۔

۲۔ ''رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ قَالَ مُجَاهَدَةُ النَّفْسِ'' (ہم جہادِاصغر سے جہادِاکبر کی طرف لوٹے ہیں صحابہ نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ جہادِاکبر کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: وہ مجاہدۂ نفس ہے)۔[2]

۳۔ ''مَا تَقُوْلُوْنَ فِیْ صَاحِبٍ لَّكُمْ اِنْ اَنْتُمْ اَكْرَمْتُمُوْهُ وَ اَطْعَمْتُمُوْهُ وَ كَسَوْتُمُوْهُ اَفْضٰى بِكُمْ اِلٰى شَرِّ غَايَةٍ وَ اِنْ اَهَنْتُمُوْهُ وَ اَعْرَيْتُمُوْهُ وَ اَجَعْتُمُوْهُ اَفْضٰى بِكُمْ اِلٰى خَيْرِ غَايَةٍ، قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذَا شَرُّ صَاحِبٍ فِی الْاَرْضِ، قَالَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ اِنَّهَا لَنُفُوْسُكُمُ الَّتِیْ بَيْنَ جُنُوْبِكُمْ''[3] (تم اپنے ایسے ساتھی کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ اگر تم اس کی تکریم کرو اور اس کو کھلاؤ پلاؤ اور اس کو پہناؤ تو پہنچادے برائی کی انتہا کو، اگر اس کی اہانت کرو، پہناؤ، کھلاؤ تو پہنچادے بھلائی کی انتہا کو، صحابہ ؓ نے کہا یارسول اللہ! ﷺ وہ روئے زمین پر بدترین ساتھی ہے، فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ تمہارے نفوس ہیں جو تمہارے پہلوؤں کے درمیان موجود ہیں)۔

۴۔ ''اَعْدٰى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ''[4] (تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان (یعنی تیرے باطن میں) ہے)۔

۵۔ ''اَلنَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَتَشْتَهِیْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُهٗ اَوْيُكَذِّبُهٗ'' (نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تائید یا انکار کرتی ہے)۔[5]

۶۔ اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا (اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما، اس کو پاکیزہ کر، تو سب سے بہتر پاک کرنے والا ہے اور تو اسی کا ولی اور مولیٰ ہے)۔[6]

---

[1] سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، متوفی ۲۷۵ھ، حدیث ۴۲۶۰، جلد ۲، صفحہ ۱۴۲۳، دار الفکر، بیروت۔

[2] کشف الخفاء، اسماعیل بن محمد الجراحی، متوفی ۱۱۶۲، حدیث ۱۳۶۲، جلد ۲، صفحہ ۳۲۵، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

[3] تفسیر قرطبی، ابوعبداللہ القرطبی جلد ۹، صفحہ ۲۱۰، دار الشعب، بیروت۔

[4] تفسیر الکبیر، امام فخر الدین الرازی، متوفی ۶۰۴ھ، جلد ۲۸، صفحہ ۳۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

[5] صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، حدیث ۶۲۳۸، جلد ۶، صفحہ ۲۴۳۸، دار الفکر، بیروت۔

[6] صحیح مسلم، مسلم بن حجاج القشیری، متوفی ۲۶۱، حدیث ۲۷۲۲، جلد ۴، صفحہ ۲۰۸۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

سرِ ورق

نفس کو اِس کتاب کے سرِ ورق پر ایک بھنور سے ظاہر کیا گیا ہے جس کی تباہ کاریوں سے انسان کا محفوظ رہنا محال ہے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو تو کچھ دشوار نہیں۔ یہ بھنور جو نفس کو ظاہر کر رہا ہے وہ انسانی قالب میں رکھا گیا ہے جس کی اصل تو صاف ہے، جسے سبز رنگ سے دکھایا گیا ہے، جیسا کہ خواجہ غلام فریدؒ کی کافی ہے کہ:

کُنْ فَیَکُوْن جدرب فرمایا	اساں دی کولے ہاسے
قَالُوْا بَلٰی اُساں کنی سنیا	کوئی گونگے بولے ناسے
اک لامکان مقام اُساں دا	اتھاں آن بتاں وچ پھاسے
نفس فرؔید پلیت چا کیتا	اساں اصل پلیت تے ناسے

نفس کی تباہ کاریاں اس بھنور میں (قتل و غارت، دہشت گردی، لوٹ مار، سود خوری، چور بازاری وغیرہ) سرخ رنگ سے ظاہر کی گئی ہیں اور دیگر برائیاں پیلے رنگ میں دکھائی گئیں ہیں۔ سبز رنگ طریقت کے راستے کو ظاہر کرتا ہے جس پر چل کر انسان اپنی نجات کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ یہ راہ انبیاء کرام علیہم السلام کی راہ ہے، جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور اولیاء کرامؒ نے فیض حاصل کیا اور نبی کریم ﷺ کے توسط سے آج بھی فیض رساں ہیں۔ یہی وہ راہ ہے جس کو قرآن نے ''یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ'' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور احادیث میں ہے ''یَکُوْنُ خُلَفَاءُ بَعْضُهُمْ عَلٰی اَثَرِ بَعْضٍ فَمَنِ اسْتَقَامَ مِنْهُمْ فَفُوْا لَهُمْ بَیْعَتَهُمْ'' (حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (میرے) خلفاء ہوں گے اور پھر ان کے خلفاء ہوں گے۔ سو جسے تم سیدھے راستہ پر پاؤ اس کے ساتھ بیعت نبھاؤ)[1] مولانا رومؒ نے اسی راہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر	دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

(نفس کو شیخ کے سائے کے سوا کوئی چیز نہیں مار سکتی، اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے تھام لو) (م۲:۲۴۲)

---

[1] مسند ابن راھویہ، اسحٰق بن ابراھیم راھویہ، متوفی ۲۳۸ھ، حدیث ۲۲۳، جلد ۱، صفحہ ۲۵۷، مکتبۃ الایمان، المدینہ منورہ۔

انتساب

بنام

حضور پُرنور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وجملہ خواجگانِ نقشبندؒ

از حضرت صدیقِ اکبرؓ تا خواجہ مخدومِ مَن قبلہ پیر حضرت علامہ علاؤ والدّین صدّیقی غزنوی مدظلّہ العالی، سجادہ نشین دربارِ نیریاں شریف تراڑ خیل آزاد کشمیر......اور اِس فقیر کے محبوب قومی شاعر علامہ اقبالؒ اور میرے درویش والدینؒ جن کی فیض رَس نگاہوں نے مجھے ملّت وقوم کی خدمت کے قابل بنایا۔

خادم الفقراء

پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ

فہرست

حمدِ باری تعالیٰ

(از عبداللطیف خان نقشبندی)

کریمی شان ہے تیری تو ہی پروردگار اپنا
تو ہی ستار ہے مولا، تو ہی آمرزگار اپنا
تیرے ہی نام پر سب کچھ ہے جینا اور مرنا بھی
دیا ہے بس خلیل اللہ نے یہ ہم کو شعار اپنا
ترے ہی نام کی برکت سے عقدوں کی کشائش ہے
رضا تیری الٰہی ہے سوادِ کار زار اپنا
تیرے لطف و کرم کے منتظر، بخشش کے جویا ہیں
میرے اعمال رکھتے ہیں تجھ ہی پر انحصار اپنا
اسی نسبت پہ اُٹھیں گے کہ جس نسبت پہ مرتے ہیں
زہے قسمت جو ہو جائے مدینے میں مزار اپنا
میرے نالوں کو دے پرواز، دل کو آہ و زاری دے
معاون آہ و زاری میں ہو نفسِ کم عیار اپنا
میرے دل کو عطا کر رازِ الوندی سے آگاہی
بنایا ہے جہاں میں تو نے مجھ کو رازدار اپنا
الٰہی روضۂ اقدس کی مجھ کو باریابی دے
رسول اللہ کی فرقت میں ہے دامن تار تار اپنا
خدایا تو ہی میرے غم میں میری چارہ سازی کر
ہماری قوم کے غم میں ہے سینہ داغدار اپنا
الٰہی کس طرح ہوتا ہے وصلِ یار لوگوں کو
مقدر آزما کے دیکھا ہم نے بار بار اپنا
مدح ممکن نہیں تم سے لطیفؔ اس حسنِ کامل کی
کہ حُسنِ یار از خود ہوتا ہے آئینہ دار اپنا

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(از عبداللطیف خان نقشبندی)

وہ نورِ خدا پردۂ معنی میں بشر ہے

یہ کرۂ خاکی، یہ فلک ہے یا دھر ہے
ہر چیز پہ سرکارؐ کا فیضانِ نظر ہے

رحمت سے تری کوئی بھی محروم نہیں ہے
یکساں ترا مومن پہ و کافر پہ اثر ہے

اللہ رے! کیا شانِ ملی صلِّ علیٰ کو
مشکل میں مصیبت میں مسلماں کی سپر ہے

ہر لحظہ سلامت رہے گر عشقِ محمدؐ
اللہ کی نظر میں یہی معراجِ بشر ہے

الفت ہے محمدؐ کی تو محفوظ ہے انساں
سرکارؐ کی گویا میری رگ رگ پہ نظر ہے

اسباب پہ تکیہ کبھی کرتا نہیں مومن
عاشق ہوں مرا عشق ہی بس زادِ سفر ہے

مشتاقِ نظر مارا ہے بس ایک نظر کا
یہ قتل گہِ عشق تو اک عام خبر ہے

انفس ہو یا آفاق یہ ہو جاتے ہیں مکشوف
سرکارِ دو عالمؐ کا تصور وہ گہر ہے

کافر کہو مجھ کو یا کہو مشرک و زندیق
وہ نورِ خدا پردۂ معنی میں بشر ہے

کٹتی نہیں راہ کوئی بدوں عشقِ محمدؐ
اس راہ پہ چلنے کی سند آہِ سحر ہے

جو علم لطیفؔ از رہِ الطاف نبیؐ ہو
اس علم کے آنے کی جگہ قلب و صدر ہے

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

بڑھ کے ہر شے سے محبت ہو تو ہے عشقِ رسول ﷺ

مال و زر، سے، زُھد و تقویٰ سے نہیں، اس کا حصول
بڑھ کے ہر شے سے محبت ہو، تو ہے عشقِ رسولؐ

عشق اپنا، اِن کی ذاتِ پاک کا اعجاز ہے
سچ تو یہ ہے، عشق کا، مطلع و منبع ہیں رسولؐ

آ سکے صدیقؓ کوئی، تو وہ شاید کہہ سکے
کیسی کیفیت ہے، کیا ہے، منصب عشقِ رسولؐ

رب سے راضی جب ہوا بندہ، تو راضی ہے خدا
دونوں طرفوں سے ہوا کرتا ہے، ایجاب و قبول

آپؐ ہی کے عشق سے، قائم ہے ساری کائنات
آپؐ کے دم سے، جہانوں میں ہے رحمت کا نزول

اس کا احساں ہے ازل سے، ملت و اقوام پر
جس نے سب لوگوں کو سکھلائے ہیں جینے کے اصول

وہ ہیں حاکم، جب تلک قائم حکومت رب کی ہے
پھر تصرف میں نہ ہو کیونکر غلاموں کا شمول

عاشقانِ رُسل کا شاید پہلا یہ انعام ہے
عقبیٰ کے ایماء پہ دنیا کو نہیں کرتے قبول

شعر میرے کیا ہیں جذبِ شوق اور نذرِ لطیفؔ
آستانِ پاک پر میری عقیدت کے ہیں پھول

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

جہاں تاجدارِ مدینہ کا گھر ہے وہاں سر کے بل تاجدار آرہے ہیں

نظر میں عرب کے دیار آرہے ہیں
مدینے کے قرب و جوار آرہے ہیں

تھے متوالے ہم جس کے حُسنِ ازل سے
اسی کے یہ آئینہ دار آ رہے ہیں

نشاں یوں ملا ہے دیارِ نبی ﷺ کا
یہاں جھونکے از کوئے یار آرہے ہیں

زہے عشق تجھ کو ملی یہ سعادت
ترے نالے اب روئے کار آرہے ہیں

نہ کیف اور احوال کی ہے خبر کچھ
یہ دیوانے دیوانہ وار آرہے ہیں

نہیں اختیار اپنی گفتار پر بھی
یہ جذبات بے اختیار آرہے ہیں

یہ آنکھوں میں کیسا حجاب آ گیا ہے
یا جلوئے ہیں کہ بے شمار آ رہے ہیں

نظر دور سے سبز گنبد پہ آئی
دل و جان پیہم نثار آ رہے ہیں

بالآخر خدا نے دکھایا ہے یہ دن
کہ عاصی نبی ﷺ کے دوار آرہے ہیں

جھکانے کو سر آستان نبی ﷺ پر
یہاں بعد صد انتظار آرہے ہیں

جہاں تاجدارِ مدینہ کا گھر ہے
وہاں سر کے بل تاجدار آرہے ہیں

زیارت کے لمحوں کا تھا حال یہ کہ
خزاں پر نسیم و بہار آرہے ہیں

ذرا اس ہجومِ زیارت کو دیکھو
ہزاروں قطار و قطار آرہے ہیں

یہاں حاضری کا تعین نہیں ہے
گئے آئے اور بار بار آرہے ہیں

وہ کیا خوب تھے جو مدینہ میں گزرے
بہت یاد لمحات پیار آرہے ہیں

لطیفؔ آگئے چھوڑ کر کیوں مدینہ
یہ پچھتاوے اب بار بار آرہے ہیں

[1] اس نعت شریف کے اشعار لیبیا سے مدینہ شریف کی راہ میں جہاز پر لکھے گئے اور کچھ مدینہ شریف میں مکمل ہوئے۔

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

جس کا کوئی نہ ہوا اپنا اس کے ملجا آپ ﷺ ہیں

یا محمدؐ، سید و سرور و مولا آپ ہیں
جس کا کوئی نہ ہو اپنا، اس کے ملجا آپ ہیں
بے نواؤں بے کسوں کے ہمدم ہیں مونس آپ ہیں
نا امیدوں کو کشائش کا اشارہ آپ ہیں

نسلِ انساں سے ہوا ہے اور نہ ہو گا حشر تک
جس سے بہتر ہو نہیں سکتا وہ ہونا آپؐ ہیں
نورِ مَن نُورِ خدا ہے جسدِ خاکی کا جلا
سرِ اسرار خدا کے سرِ یکتا آپ ہیں

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتا ہے کیا ربّ کا خطاب
اے محمدؐ، حامد و محمود و طٰہٰ آپ ہیں
آپؐ سے وابستہ ہیں ارض و سماء کی دولتیں
آپؐ کی ہے ساری دنیا، میری دنیا آپ ہیں

کس طرح ہیں، کیسے، کیونکہ، جان سکتا ہے یہ کون
آپؐ وہ سر ہیں کہ جس سر کے شناسا آپ ہیں
قاسم اللہ کے خزانوں کے رسول اللہ ہیں آپ
آپؐ کا دینا ''یداللہ'' سے ہے داتا آپ ہیں

کس لئے کہتے ہیں مجھ کو مفلس و نادار لوگ
جبکہ مختارِ زمانہ میرے آقا آپؐ ہیں
آپؐ کی نظرِ مبارک سے شفا ہے دستیاب
حضرتِ عیسیٰؑ کے دکھ کے بھی مسیحا آپؐ ہیں

غم اگرچہ ناروا تجھ سے زمانہ ہے لطیف
تیرے مشفق مہربان و کرم فرما آپ ہیں

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

کافی ہے مجھ کو عاشقِ خیرالبشر ﷺ ہوں میں

کہتے ہیں لوگ مجھ کو کہ اہلِ نظر ہوں میں
لیکن یہ سچ ہے آپ سے خود بے خبر ہوں میں

شاہ و گدا کا نام نہیں معتبر مجھے
کافی ہے مجھکو عاشقِ خیرالبشرؐ ہوں میں

مجھ کو ڈرا سکیں گے نہ دیر و حرم کے لوگ.
فتویٰ وہ جو بھی دیں کافر نہیں ہوں میں

اللہ کا رازِ خاص ہے یہ زندگی میری
حق کی ردا میں رہتا ہوں، باہر نہیں ہوں میں

ہوتا ہوں میں عوام میں ہر وقت دل عزیز
گر دل کسی کا ہوں تو کسی کا جگر ہوں میں

دوزخ کی آگ ڈرتی ہے مومن کے نور سے
شیطان جس سے ڈرتا ہو، ایسا شرر ہوں میں

اپنے سے بڑھ کے ہم کو ہے اس قوم کا خیال
قاصد رسولِ پاکؐ کا روزِ حشر ہوں میں

اپنی خودی کی محفلِ گمنام میں لطیفؔ
عشقِ رسولِ پاکؐ کا پیغام بر ہوں میں

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میں گداگر ہوں مجھے نسبت مولائی ہے

آس احساس کی رگ رگ میں چلی آئی ہے
سبز گنبد کی شبیہ یادوں پہ لہرائی ہے
دل میرا ایک ہی لذت کا شناسائی ہے
میں گداگر ہوں مجھے نسبتِ مولائی ہے

دل کو مطلوب ہے اک گوشہ تنہائی بس
جس میں جلوہ گہہ محبوب کی رعنائی ہے
خُلد میں ساتھ نہ ہو تیرا تو منظور نہیں
ہم نے اس بات پہ سو بار قسم کھائی ہے

دُور رہنا ہمیں سرکار سے منظور نہیں
ان کے قدموں میں ہو جن کا کوئی شیدائی ہے
سکر ہو، کیف ، یا سوز و گدازِ ہستی
جس جگہ یہ ہوں وہاں گوشہ تنہائی ہے

خستہ و وارفتہ و بیکس مجھے کہتا ہے جہاں
تیرے عاشق کو جنوں خوردہ ہے ، سودائی ہے
یہ طریقت ہے کہ دل عشقِ محمدؐ میں ڈھلیں
یہی اک رمز شریعت نے بھی دہرائی ہے

غایتِ کن تھی فقط عشقِ محمدؐ کی نوید
ورنہ دنیا میں کوئی خوبی ہے نہ زیبائی ہے
صورتیں کتنی حسیں اور جمیل آئیں ہیں
آپؐ کے حُسن میں ہر حُسن کی یکجائی ہے

تیرے دربار سے منگتوں کو ملی ہے ہر شئے
نیک و بد کی ترے دربار میں شنوائی ہے
نظر آتا نہیں مجھ کو بجز جلوۂ دوست
اور کچھ دیکھے نہ کوئی بس یہی بینائی ہے

ہیں کرم فرماتے ہر اک پہ میری سرکار لطیفؔ
غم نہ کر تجھ پہ نظر آپؐ نے فرمائی ہے

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

میں شہِ لولاک ﷺ کی عظمت کا متوالا بنا

جب سے گلشن دیدۂ اختر کا نظارا بنا
میں شہِ لولاک کی عظمت کا متوالا بنا

کھل گئے اسرار مجھ ناچیز پر اک اک تمام
ان کی نظروں سے مرا دل جب کرم والا بنا

ذکرِ رب، ذکرِ حبیب اور ذکرِ شیخ
منزلِ راہِ طلب میں جادۂ پیا بنا

موجِ طوفاں اولیاء کے واسطے ہے اک حباب
ناخدا کشتی کا جن کی حضرتِ والا بنا

انبیاءؑ بھی کیوں نہ ہوں محتاج ان کی ذات کے
روزِ محشر بخششِ حق کا وہ رکھوالا بنا

عشق میں جلتا تھا دل صدیقؓ کا مثلِ کباب
جس طرح انوارِ حق سے طورِ سینا بناطور

آپؐ کی لطف نظر سے ہے وابستہ یہ جہاں
آپؐ کا لطفِ کرم عالم کا شیرازہ بنا

شاہد و مشہود کے جو درمیاں موجود تھے
ان کے دم سے سالک بِرکج ہیں، نگاہ والا بنا

میں نے دیکھا آپؐ کے لطف و کرم کو ہر جگہ
باور اس سے ہر جگہ پر آپؐ کا آنا بنا

میں بھی اُن کے لطف سے بھرپور ہوں اب تک لطیف
جن کی ذاتِ پاک سے عالم کا بن جانا بنا

نعتِ رسول مقبول ﷺ

انہی کے اک تصور سے دلوں میں کیف و حال آیا

مدینے کا ہمارے دل میں جب نقشِ جمال آیا
رخِ اقدس میرے دل میں بایں حُسن و کمال آیا

یہ دوری کیسی دوری ہے کہ ہیں لحاتِ قرب اس میں
توجہ جب بھی کی ہم نے تو روضہ بے محال آیا

ہو جب مجبوری کا عالم تو رو لیتا ہوں پل بھر کو
ادھر ٹپکا مرا آنسو، ادھر حکمِ وصال آیا

خیالوں کی یہ دنیا تو فقط بحرِ تلاطم ہے
یہ طوفاں، عشق کے قطرے، رگِ صوفی میں ڈال آیا

وہ اک حصہ تھا نورِ لم یزل کے ذاتی جلووں سے
وجودِ مصطفٰےؐ میں دیکھئے کیسا کمال آیا

کمالاتِ جہاں بنی اُسی کے ہاتھ آتے ہیں
جدھر دیکھو ادھر ہی جلوۂ پُرخال خال آیا

تصور مصطفائی کا ملا تو ربطِ کامل سے
اُنہی کے اک تصور سے دلوں میں کیف و حال آیا

رسولِ پاکؐ کی ہی ذات عشقِ حق کی مصدر ہے
اسی چشمے سے عشقِ ابوبکرؓ، عزمِ بلالؓ آیا

محمد ﷺ کی محبت سے عروجِ دین و ملت تھا
بجھا یہ عشق جب سینوں سے، اُمت کو زوال آیا

ہے اسوہ کا راز سے آگاہی
اسی سے اوجِ ملت، حسنِ خو، صدقِ مقال آیا

کیا کہیں، کیوں ہر وقت دل صورتِ سیماب ہے
قوم کے غم میں دلِ نالاں سدا بے تاب ہے

خون کے آنسو رلاتی ہے مسلمانوں کی بات
ختم کردے اے خدا الحاد کی تاریک رات

کُن بما لطفِ لطیفؔ و چشمِ خوش انجام را
برکشا برما خُدایا گردشِ ایّام را

نظم

کرلیتا ہے پھر مومن اک تازہ جہاں پیدا

جب ذکر سے ہوتی ہے کچھ آہ و فغاں پیدا
کر دیتی ہے مومن میں اک راحتِ جاں پیدا

شب خیزی سے ملتا ہے آہوں کو تاثر جو
اس اثر سے ہوتے ہیں سرمست جواں پیدا

کرتے ہیں بیاں جب ہم روداد مشائخ کی
افراد میں ہوتی ہے اک روحِ رواں پیدا

بد مست ہو جب کافر مسلم کی عداوت میں
کرتا ہے بیانوں میں آوازِ سگاں پیدا

ہو عزم مسلسل تو ڈھل جاتے ہیں پتھر بھی
ہوتی ہے عزائم سے وہ تاب و تواں پیدا

دنیا میں مسلماں کی تحقیق کی بازی ہے
کر لیتا ہے پھر مومن اک تازہ جہاں پیدا

اللہ کی حضوری میں سرمست ہو جب عارف
کرتا ہے وہ نظروں سے محشر کا سماں پیدا

سرگرم عمل کر دے بھٹکے ہوئے آہو کو
اے شاعرِ ملت تو کر ایسی زباں پیدا

پیدا ہے جہاں بینی، تسخیر کے جذبے سے
ہوتا ہے اسی سے ہی شاہیں کا جہاں پیدا

بیداری سے بندے میں فاروقیؓ و کراریؓ
بیکاری سے ہوتی ہے بس خواب گراں پیدا

وہ شاعرِ ملت کیا گر قوم کا غم نہ ہو
ہیں کربِ مسلسل سے شاعر کے زماں پیداؔ

گر دل میں تمنا ہے کر خونِ جگر پیدا
ہوتی ہے مجاہد کے اس خوں سے اذاں پیدا

ہو جاتی ہے راتوں میں اللہ سے بھی سر گوشی
لاتی ہے سحر خیزی مردے میں بھی جاں پیدا

الفاظ میں مومن کے، طوفان ہے، جادو ہے
تیشے سے وہ کرتا ہے اک جوئے رواں پیدا

لے اڑتا ہے بندوں کو یہ جذب لطیفؔ اپنا
کرتا ہے دلوں میں جو اک سوزِ نہاں پیدا

ابلاغ سے دم لیں گے، نہ آرام کریں گے

(از مصنف)

ابلاغ سے دم لیں گے، نہ آرام کریں گے
جب تک کہ ہیں زندہ، بڑا ہم کام کریں گے
ہے آرزو میری، کہ بہ صد جذبۂ پیہم
بے دین ہیں جو، مائلِ اسلام کریں گے
ہے عافیت اسلام میں، اور جائے پناہ بھی
ہر ذرّے کے ہمراہ تیرا پیغام کریں گے
اسلام کی امداد میں ہی، رَبّ کی مدد ہے
یہ نعرہ بلند آج، سرِبام کریں گے
افراد کو افکار کی ظلمت سے نکالیں
ملّت کا مداوا یہ، صبح شام کریں گے
ناواقفِ سر چشمۂ ملت ہے مسلمان
اس علم کو، حکمت کو، سرِعام کریں گے
محدود ہے چند سینوں میں ولیوں کی محبت
ہر سینے کو اب عشق کا بسطام کریں گے
ہر فرد کے ظاہر میں بھی باطن کی چمک ہو
یہ کام تصوف کا ہے، بے دام کریں گے
خوش ہوں کہ لطیفؔ اپنی طلب ہے تو یہی ہے
ہم خدمتِ اسلام کو ہر گام کریں گے

تلقینِ روحانی

(مریدوں کے نام)

از پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ

قلبِ مرجوع اور عقلِ سلیم کی متوازی راہوں میں اگرچہ حوادثِ زمانہ کے قطرات ٹپکتے رہتے ہیں تو بھی ان خدائی راہوں پر چلنے والوں کو کوئی طاقت مسدود نہیں کر سکتی ایسی تنگ و تاریک نظر آنے والی راہوں سے بھی وہ شواہد نظر آتے رہتے ہیں جن کی گردِ راہ کو کسی معمولی روحانی شہنشاہ کے اِنتہائی قرب رکھنے والے رفیق ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

روحانیت ایک لامتناہی گہرائیوں کا سمندر ہے جس میں موتی، ہیرے اور جواہرات کو اللہ تعالیٰ نے سمندر کی تہوں میں ہی محفوظ، مقدور اور مامون کر رکھا ہے، ایسے بحرِ بیکراں سے جو موجیں اُٹھتی ہیں وہ بھی سمندر کے قریب سے گزرنے والے لوگوں کو بھی کچھ دیر کے لئے مسرور کرتی ہیں لیکن سمندر میں موجود موتیوں اور عام ریگزاروں کی رفعتوں میں کوئی نسبت نہیں ہوتی، اس کی شان اس دن واضح ہوگی جب سمندر کو قیامت خیز زلزلوں سے افشاں کیا جائے گا مگر اس دن کسی کو اپنے کئے ہوئے پر شرم کرنا بھی اُس کے کام نہیں آئے گا، میں جس طرح مسدود حالات کے باوجود اور ضعیف العمری کی حالت میں تبلیغی مقاصد سے دور نہیں رہا اور چار عدد کتب کو بنام اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ، سوز و ساز رومیؒ، تہذیبِ نفس اور ''شاہیں کا جہاں اور'' کو تصنیف کیا ہے اِن چار عدد تصانیف کے علاوہ یہ فقیر گیارہ عدد کتب پہلے بھی شائع کر چکا ہے جو اُمتِ مسلمہ کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے، اسی طرح آپ بھی حالات کے تھپیڑوں میں خدمتِ خلق کے جذبے سے اپنے سینوں کو گرم رکھیں۔

اُمید ہے کہ یہ کتب اشاعت کے بعد شہرہ آفاق ہونے کا شرف حاصل کریں گی۔ اللہ تعالیٰ ان تصانیف کی برکات سے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو نیا ولولہ اور جذبہ عمل عطا فرمائے۔

مورخہ یکم جنوری ۲۰۰۸ء

خاکِ پائے درویشاں
پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ
سابق ڈائریکٹر محکمہ موسمیات لاہور

عرضِ مرتّب

از کرنل احمد فضیل خان

انسان نفس و روح کا مرکب ہے۔ روح منبع خیر اور نفس منبع شر ہے۔ انسانی روح نورانی ساخت کی وجہ سے خیر اور عمل صالح کی طرف مائل کرتی ہے۔ نفس میں خبث کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جو اس کی اصل ہے جسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اور دبانے سے مزید بڑھتا ہے اور مارنے سے مزید قوی ہوتا ہے۔ فطرتاً یہ روح کے الٹ ہے۔ روح جن باتوں سے طاقتور ہوتی ہے نفس ان سے کمزور ہو جاتا ہے اور جن چیزوں سے روح کمزور ہوتی ہے نفس طاقتور ہو جاتا ہے۔ اس کی اصلاح مقصود ہو تو اس کو جنگلی اور سرکش گھوڑے کی طرح سدھایا جاتا ہے۔ پھر یہی نفس جو سراپا شر ہے، اس سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح چابک زمین سے اٹھا کر مالک کے ہاتھ میں پکڑاتا ہے، اپنے مالک کا وفادار اور فرمانبردار بن جاتا ہے۔ چنانچہ اولیاء عظام نے اپنے نفوس کو اسی طرح اپنا فرمانبردار بنایا اور اللہ تعالیٰ کے دیے گئے تصرفات سے عوام الناس کے باغی نفسوں کا تزکیہ کیا اور واصل باللہ کرنے کے بعد نیابت الٰہی کا تاج ان کے سروں پر سجایا۔ جہاں اس نفس کی وجہ سے اس قرۂ عرض پر بے پناہ فسق وفجور، لاقانونیت اور فساد، اور دیگر رذائل نمودار ہیں وہاں حضرت انسان کے مراتب اور درجات کا موجب بھی یہی نفس ہے۔ نفس کی مخالفت اور محاسبۂ نفس انسان کے درجات کی بلندی کا سبب بنے اور اس (انسان) کو اشرف الملائکہ کے مقامِ عروج پر جا پہنچایا اس لئے بزرگانِ دین نے اپنے نفس کی سرکوبی اور اس کی مخالفت میں ان تھک اور ناقابلِ یقین کوششیں کیں۔ اس کو بے لگام و بے مہار چھوڑ دیا جائے تو اس کی سرکشی مزید بڑھتی رہتی ہے نفس کی اس سرکشی کو مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ایک زہریلے سانپ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ آپ نے اس نفس کی سرکشی کا علاج یہ تجویز کیا ہے کہ ؎

هیچ نکشد نفس را جز ظلِ پیر ۔ دامنِ آں نفس کُش راسخت گیر

(نفس کو شیخ کے سائے کے سوا کوئی چیز نہیں مار سکتی، اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے تھام لو) (م۲: ۲۴۴)

نفس پہ لکھی گئی یہ کتاب اپنے مواد اور ضخامت کے لحاظ سے غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں نفس کے معاملات کو نہایت حسین پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ نفس کے تمام تقاضوں کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے نفس کے موضوع پر پیدا ہونے والے حتی الامکان سوالات کے جوابات کو بھی رقم کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نفس کی لغوی و اصطلاحی بحث کے ساتھ ساتھ حقیقتِ انسان پر مدلل اور مفصل گفتگو شامل کی گئی ہے۔ انسان فی القرآن کے عنوان کے تحت انسان کی فطری اور جبلی کمزوریاں، چند منفی خصائل کا حاصل ہونا اور ھویٰ و ہوس کا اس کی طینت میں داخل ہونا، اور ان سب بیماریوں کا علاج قرآن اور حدیث کی روشنی

میں پیش کیا گیا ہے۔نفس کو قرآن و حدیث سے واضح کرتے ہوئے اس کے شر سے پناہ مانگنے کی مسنون دعائیں بھی یکجا کر دی گئی ہیں۔قلب، روح اور عقل پر نفس کے اثرات بیان کرنے کے بعد پیر صاحبؒ نے نفس کی اہمیت واضح کی اور یہ رقم کیا کہ مکمل نظام کائنات نفس کے گرد گھومتا ہے۔نفس کی اقسام اور مدارج اس طرح سے بیان کیے گئے ہیں کہ سالکین راہ حق پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نفس کا علاج کن خطوط پر کیا جاتا ہے۔اور یہ کہ نفس نفسِ امّارہ سے نفسِ لوّامہ اور پھر مطمئنہ کے بعد نفس راضیہ اور مرضیہ میں کس طرح بدلتا ہے۔نفس کے بڑھتے ہوئے مطالبات و خطرات و آفات اور سرکشی و فریب مفصل طریقوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ سالکینِ طریقت اس کے مکر کو اچھے طریقے کے ساتھ سمجھ سکیں۔مولانا رومؒ کے کلام کا احاطہ جس طرح سے کیا گیا ہے قارئین کے لیئے انتہائی دلچسپی کا باعث ہے۔

نفس پر مفصل بحث کرنے کے بعد تزکیہ و تصفیۂ باطن کے طریقہ کار کو زیب قرطاس کیا گیا ہے۔ محاسبہ، مراقبہ اور مشارطہ کو اقوال و احوالِ صالحین کی روشنی میں جس انداز میں بیان کیا گیا ہے یقیناً قارئین کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے گا۔علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کو جس سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے متوسط علم رکھنے والے کیلئے اس کا سمجھنا کوئی دشوار نہیں۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ذکرِ الٰہی درود وسلام بہدیہ خیرالانام، توبہ استغفار اور دیگر اعمالِ صالح سے تہذیب نفس سے نفس کی تربیت کس طرح کی جاتی ہے؟ حضرات جنیدؒ و بایزیدؒ نے تہذیب نفس کی منزل کس طرح حاصل کی؟ کھانے اور نیند کی کمی نفس پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟ مرشد کی توجہ، نظر کرم اور صحبت نفس کی تہذیب کیلئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے؟ ان تمام سوالوں کا اس کتاب میں مفصل جواب دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو نفس اور شیطان کے فریب سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کو اپنا کھویا ہوا وقار عطا فرمائے: آمین ثم آمین۔

تاثرات

از

حضرت پیر علاؤالدین صِدّیقی غزنوی مدظلہٗ
(ماخوذ از حضورِ قلب)

مصنف کی معرکتہ الآرا کتاب ''نشانِ منزل، جلد اوّل، حصہ اوّل'' کے بعد منظرِ عام پر آنیوالی تصنیف ''حضورِ قلب (مع معارفِ قلب)'' اپنے موضوعات کے اعتبار سے ایک منفرد، مستند، معلومات سے لبریز، معنی خیز اور دلوں کی دنیا میں زبردست انقلاب پیدا کرنیوالی کتاب ہے۔ غالباً اس موضوع پر اِس قدر مفصل، مدلّل اور واضح کتاب اِس سے قبل ضابطۂ تحریر میں نہیں آئی۔

یہ بات حیران کُن ہے کہ دنیا کے تمام دانشور اسلام کو مذہبِ انسانیت تصور کرتے ہیں اور اس کی ذہانت، متانت اور پرشکوہ اقامت کے علاوہ اِسے جمالیات سے لبریز، زندۂ جاوید اور پائندہ رہنے والا مذہب تسلیم کرتے ہیں لیکن بے چارہ مسلمان اِسلام کے اِن تمام روشن پہلوؤں سے تقریباً مکمل طور پر نا آشنا اور نابلد ہے۔ اس دور کا مسلمان نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر اپنے دلوں کو ہلاکت میں ڈالے ہوئے، بے دینی کی زندگی اپنانے پر قطعاً مطمئن نظر آ رہا ہے۔ مسلمانوں کو اِس دور کے مادی تقاضوں کی کش مکش نے دینی فرائض کی ادائیگی سے مکمل طور پر غافل کر دیا ہے اور اب وہ کسی ناصح کی طرف رجوع کرنے کو بھی تیار نہیں۔

پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ، ڈائریکٹر (ریٹائرڈ) محکمہ موسمیات نے ایسے بے دینی کے دَور سے اُمتِ مسلمہ کو نکالنے کی غرض سے متعدد کتب تصنیف فرمائی ہیں اور زیرِ نظر کتاب آپ کی ان کوششوں کی ایک جھلک پیش کر رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی تمام زندگی مسلمانوں کو اپنی اصلاح کی طرف راغب کرنے میں گزار دی لیکن آج کے مسلمانوں کی اکثریت قرآن اور حدیث کی طرح اُن کے کلام سے بھی مکمل طور پر بے خبر ہے۔ عالمِ اسلام کے دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے پیر خان صاحب نے نہایت حسین اور دلچسپ انداز سے لوگوں کو ایک بار پھر علامہ اقبالؒ کے کلام کے روشن پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے اور زیرِ نظر کتاب میں علامہ اقبالؒ کے نادر کلام کا ایک ایسا مجموعہ پیش کیا ہے جو شاید اب تک اِس انداز سے کسی کتاب میں یکجا فراہم نہیں کیا گیا۔ امید ہے کہ آپ کی یہ تصنیف اُن مسلمانوں کی اصلاح کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوگی جن کے دلوں میں طلبِ اسلام کی معمولی سی رمق بھی باقی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے عوام کو قلب کی دنیا میں موجود ساختوں، قوتوں، اُس کی مختلف

حالتوں، قلب کی بنیادی معلومات وتصرفات، معارف و واردات، کوائف و اصطلاحات اور قلب کی دیگر ضروری تفاصیل کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو قلب میں پیدا ہونے والی بیماریوں، نفس اور شیطان کی خودساختہ ہلاکتوں، اِس میں پیدا ہونے والے قلبی فسادات اور دلوں کو مردہ کر دینے والے حوائج سے آگاہ کیا ہے تاکہ مسلمان اِس سے تقویتِ قلب، صفائے قلب اور اصلاحِ قلب کی روشن راہوں پر چلنے کے لیے راہنمائی حاصل کرسکیں۔

یہ کتاب عوام کے لیے مکمل اور مطلوبہ معیار کے مطابق راہنمائی کی حامل ہے اور خواص کے لیے دلوں کی تشنگی مٹانے کا سامان فراہم کرتی ہے۔ امید ہے کہ نوجوانانِ اسلام اِس حسین اور دلکش تحریر سے اپنی منزل کا تعین کرتے ہوئے جادہ پیمائی کے لیے کمربستہ ہوکر چل نکلیں گے اور عشاقِ امت اس میں اپنی تشنگیٔ قلب کی تسکین اور راحتِ جان کا سامان پائیں گے۔

میری دعا ہے کہ مسلمانانِ عالم اِس کتاب سے استفادہ حاصل کریں اور موصوف کو درازیٔ عمر اور وسعت فیضان نصیب ہو۔ آمین!

مورخہ ۱۳۔ ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ
بمطابق یکم ستمبر ۱۹۹۳ء

پیر علاؤالدین صدیقی غزنوی نقشبندی
سجادہ نشین دربار عالیہ، نیریاں شریف
تراڑ خیل (آزاد کشمیر)

مقدمہ

(ماخوذ از رابطہ شیخ)

از حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ سابق جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان

اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کریم عَلَیْهِ التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ وَالتَّسْلِيمُ کو بے شمار شانوں اور ان گنت کمالات سے بہرہ ورفرما کر مبعوث کیا۔ یہ کمالات عالیہ حد واحصاء سے باہر ہیں۔ انہیں میں سے ایک خصلت حمیدہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ دلوں کا تزکیہ فرماتے ہیں، وہ دل جو دنیوی خواہشات سے آلودہ ہو چکے ہوں، ان کی دھڑکنوں کا مرکز ومحور بدل گیا ہو، جو اپنے خالق ومالک کے ذکر کی حلاوت سے محروم ہو چکے ہوں، شیطانی وسوسہ اندازیوں اور نفس کی دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بن چکے ہوں۔ جب ایسے پراگندہ دل بھی آپ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوں گے اور آپ ﷺ کی نگاہِ لطف ان کی جانب اٹھ جائے گی تو ان دلوں کو وہ طہارت نصیب ہو جائے گی کہ قدسیان سمٰوت بھی ان پر رشک کریں گے۔ اب شیطانی حربے ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے بلکہ وہ تو انوار ربانی کے مہبط ومرکز بن چکے ہوں گے۔

ہمارے پاک وپاکیزہ سرشت پیغمبر ﷺ کے فیض ہمایوں نے دلوں کی اجڑی ہوئی دنیا کو بہار آشنا کر دیا۔ ایسی سرمدی ودائمی بہار کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی خزاں کی ستم رانیوں کا شکار نہیں ہو سکتی۔

نبی اکرم واطہر ﷺ کی فیض بخشیوں کا یہ سلسلہ اولیائے کرامؒ کی صورت میں آج بھی جاری وساری ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ کے روحانی تصرفات اور باطنی فیوضات نے ہمیشہ دنیا میں خیر کی روایت کو زندہ رکھا۔ عصیاں ولغزشوں سے آلودہ دلوں کو حق وراستی کے انوار سے روشن ومنور کرنے کا سلسلہ ہمیشہ ان پاکانِ امت نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے بحال رکھا۔ اولیائے کرامؒ کی اس مساعی کے صدقے اس امت میں ایسے ارفع واعلیٰ کردار اور ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان جیسے نادرِ روزگار وجود پیش نہیں کر سکتی۔

آج جبکہ عالمِ اسلام گوناگوں ابلیسی سازشوں کا شکار ہے ان میں سے ایک بہت بڑی سازش اسلام کے اس روحانی نظام کو مشکوک اور بے اصل ثابت کرنے کی ہے۔ اغیار اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ امت

اپنے ایمان، محبت اور حق کی خاطر مر مٹنے کے لازوال جذبے کہاں سے حاصل کرتی ہے۔ ایسے میں وہ افراد بڑے خوش بخت اور فرخندہ اقبال ہیں جو اپنے اسلاف کی درخشندہ اور حیات آفریں روایات کی پاسداری کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

محترمی عزت مآب حضرت پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ کی تصنیفاتِ عالیہ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ فی زمانہ صوفیائے کرامؒ کی تعلیمات کو سہل انداز میں اور عصری ذوق کے مطابق نوجوان نسل اور تشکیک زدہ افراد کے سامنے پیش کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ ان روایات کے احیاء کے بغیر امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا مقصد کبھی بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ ایسی مفید اور معیاری کتابوں کے مصنف یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے اللہ رب العزت پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ کی کاوشوں کو قبولیت سے ہمکنار فرمائے اور اُن کی فیض رسانیوں کے سلسلہ کو اور مزید وسعت عطا فرمائے۔ آمین

خاک راہِ صاحب دلاں

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (نَوَّرَ اللّٰہُ تُرْبَتَہٗ)

اپریل ۱۹۹۸ء

تقدیم

(از مصنف)

یہ کتاب نفسِ انسانیہ کو مہذب کرنے کی روشن راہوں کو واضح کرتی ہے۔ ہر انسان کی زندگی کا کامیاب یا ناکام ہونا اسی حقیقت پر منحصر ہے کہ اس نے اپنے نفس کے کوائف کو کس صورت میں ڈھالا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مذہب اسلام کی روح تہذیبِ نفس کے محور کے گرد گھومتی ہے اور ہر مسلمان کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے ضوابطِ نفس پر کہاں تک غلبہ حاصل کیا ہے۔ ایک مسلمان کے مقام کی بلندی اسکی اطاعتِ دین اور ضبطِ نفس کی کیفیت پر منحصر ہے اور ان دونوں مرحلوں کے طے کرنے کے بعد اس کو نیابتِ الٰہی کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ ایسا شخص جزو کل کے جملہ رموز سے آگاہی رکھتا ہے اور اپنی قوم میں مصلح کی حیثیت سے لاکھوں اشخاص کی راہنمائی کرتا ہے۔

دنیا میں جس قدر گناہ اور برائیاں نظر آتی ہیں اُن سب کا محرک انسانی نفس ہے۔ ہر شخص پر نفس کا حملہ عمر بھر کیلئے رہتا ہے اور کوئی شخص (ماسوائے انبیائے کرام علیہم السلام کے) ایسا نہیں کہ جسے نفس کی آلائشوں سے پالا نہ پڑتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کیلئے نفس کی آفات کا علم حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔ نفس کی اصلاح صرف اُس وقت متصور ہو سکتی ہے جب اس کی آفات کی تفصیل کا علم ہو جائے اور اس کے علاج کی تدابیر کا علم ہو۔ زیرِ نظر کتاب میں نفس کی علامات اور اس کی اصلاح پر مبنی ایک اچھی خاصی تفصیل درج کر دی گئی ہے۔

نفس انسان کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہے جیسے کہ وہ جسم کا ایک حصہ ہو۔ جب انسان کی روح عالم ارواح سے دنیا میں آئی تو اس کی راہ میں ایک علاقہ ایسا آتا ہے جس کو عقل بسیط کہتے ہیں اور اس جگہ وہ اپنی فطرت کے مطابق عقل کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور اسی طرح وہ روح نفس بسیط سے گزرتی ہے تو اپنی قدرت کے مطابق نفس کو جذب کرتی ہے اور پھر عدم بسیط سے ہوتی ہوئی دنیا میں نمودار ہوتی ہے۔ کسی روح کا نفس کو جذب کرنا اس کی اپنی فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور دنیا میں آکر اس کا نفس اس قدر نفسانیت کا مظاہرہ کرتا ہے جتنا کہ اس نے نفس بسیط سے حاصل کیا۔ اس بات کا اظہار ایک حدیث شریف میں کیا گیا ہے جس کا ذکر حضرت علی الہجویریؒ نے "کشف المحجوب" میں فرمایا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نفس تو انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے۔ وہ حدیث نیچے دی جا رہی ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ہوس اور حرص انسان کی سرشت میں داخل ہیں۔ "اَلْهَوٰى وَالشَّهْوَةُ مَعْجُوْنَتَانِ بِطِيْنَةِ ابْنِ اٰدَمَ" (ھویٰ اور شہوت انسان کی مٹی

میں گوندھ دی گئی ہیں)۔[1]

حضرت علی الہجویریؒ ''کشف المحجوب'' میں فرماتے ہیں کہ ترکِ ھویٰ بندے کو امیر بنا دیتی ہے اور اتباعِ ھویٰ بندے کو غلام بنا دیتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اسیر تھے تو امیر ہوگئے۔ زلیخا امیر تھی تو اسیر بن گئی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان ھویٰ اور حرص کے ذریعے انسان پر حملہ کرتا ہے۔ حرص سے مراد شدتِ آرزو یا ارادہ کا پایا جانا ہے۔ اَلْھَوٰی سے مراد خواہشاتِ نفسانیہ کی طرف مائل ہونا ہے۔ اس میں نفس کے تقاضوں کی جانب نفس کا میلان رہتا ہے۔ ھویٰ نفس کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ نفس کی دعوت ھویٰ سے ہوتی ہے۔ حضرت یعقوب چرخیؒ فرماتے ہیں کہ ھویٰ میں دل کا کسی ایسی چیز کی طرف مائل ہو جانا ہے جو نا جائز ہو۔ علامہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ ھویٰ کو ھویٰ اسلئے کہتے ہیں کہ یہ انسان کو دنیا میں ہر مصیبت میں پھنسا دیتی ہے اور آخرت میں ھاویہ یعنی جہنم میں پھینکتی ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کرتا رہے۔ حضرت یعقوب چرخیؒ لکھتے ہیں۔ اگر کسی کو شیخ کامل نہ مل رہا ہو تو وہ روزانہ ۲۰ بار یہ استغفار پڑھے۔ ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' (میں اس خدا سے استغفار کرتا ہوں جس کے سوا کوئی خدا نہیں اور وہ حی وقیوم ہے اور میں اس کی طرف توبہ کرتا ہوں)۔

ہر بندے کو عقل اور ھویٰ کی طرف سے دعوت ملتی ہے۔ جو عقل کے پیچھے لگا ایمان حاصل کر لیتا ہے اور جو ھویٰ کے پیچھے لگا وہ گمراہ ہوا اور کفر پر لگ گیا۔

الھویٰ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک قسم کا تعلق تو لذت اور شہوت سے اور دوسری قسمِ ھویٰ جاہِ خلق اور ریاست سے تعلق رکھتی ہے۔ اوّل قسم والا شراب، جوا اور زنا وغیرہ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم والا عبادت خانوں میں بیٹھ کر فتنۂ خلق پیدا کرتا ہے اور مخلوق کو گمراہی کے راستوں کی طرف بلاتا ہے۔ ایسا شخص خواہ کمال بھی حاصل کر لے تقربِ حق سے محروم رہتا ہے۔ جس کو حرص وھویٰ سے برأت حاصل ہو وہ خواہ بت خانوں میں بیٹھ جائے مقرّبِ حق ہوگا۔ جب انسان میں گناہ کی جرأت ہوتی ہے تو شیطان اسے اپنے جال میں لے کر گناہوں کو خوبصورت بنا کے پیش کرتا ہے اور اس پر اپنی ظلمت کی تجلی ڈالتا ہے۔ گناہ کی ابتدا ھویٰ سے ہوتی ہے۔ شیطان ان بندوں کو نفس کے ذریعے گمراہ کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بندے نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نہیں مگر یقیناً شیطان اس پر غالب ہے سوائے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وہ شیطان پر غالب ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے۔ ''اَلشَّیْطَانُ یَفِرُّ مِنْ ظِلِّ

---

[1] کشف المحجوب، ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری، متوفی ۴۶۵ھ، صفحہ ۳۵۵، ضیاء القرآن پبلیکیشنز۔

عُمَرَ" (شیطان حضرت عمرؓ کے سائے سے بھی بھاگتا ہے۔)[1]

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص کلمہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھ لیتا ہے تو وہ تمام باطل خداؤں کی نفی کرتا ہے اور ان کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ ان باطل معبودوں میں سے سب سے بڑا معبود انسان کی نفسانی خواہشات ہیں جو اس کو حرکات ممنوعہ پر آمادہ کرنے کیلئے ہر وقت دعوت دیتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کیلئے فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا ہے اور اپنی دل کی خواہشات پر اُمڈ پڑتے ہیں۔ فرمایا "اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰہُ ط "[2] (کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنے (خواہشِ) نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے)۔

شیخ سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کلمۂ طیبہ "لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا اعتبار اوّل یہ ہے کہ یہ تمام باطل خداؤں کی نفی کرتا ہے۔ مکتوبات امام ربانی میں درج ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بڑائی میری چادر ہے اور بلند قدری میرا لباس ہے۔ جو شخص ان دونوں کے بارے میں کسی ایک کے متعلق مجھ سے جھگڑا کرے گا تو میں اسے آگ میں داخل کروں گا اور مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ "قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِنْھُمَا قَذَفْتُہٗ فِی النَّارِ"[3] (خدا نے فرمایا کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا لباس ہے، جس نے ان دونوں میں سے کوئی چیز مجھ سے لینے کی کوشش کی تو میں اسے دوزخ میں ڈال دوں گا)۔

نفس کا مقام کچھ ایسا بنایا گیا ہے کہ جو کوئی قیامت کے روز خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے تو اس کا ٹھکانا جنت ہے جیسا کہ فرمایا گیا "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰیo فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی"[4] (اور جو ڈرتا رہا ہوگا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اپنے نفس کو روکتا ہوگا ہر بُری خواہش سے یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگا)۔ سورۂ رحمٰن میں بھی ہے کہ "وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِo"[5] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور (پیشی کیلئے) کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اُس کیلئے دو جنتیں ہیں)۔

نفس اور روح دونوں ہی لطائف میں سے ہیں جو بدن انسان (قالب) میں موجود ہیں۔ جس طرح اس عالم میں شیاطین و ملائکہ، بہشت و دوزخ متضاد وجود رکھتے ہیں لیکن ایک کا محل خیر اور ایک کا محل شر ہے۔

حضرت علی الہجویریؒ "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں کہ نفس کی مخالفت میں تمام عبادات کا راز

---

[1] عمدۃ القاری، بدر الدین العینی، متوفی ۸۵۵ھ، جلد ۷، صفحہ ۲۸۷، بیروت۔ [2] الفرقان ۲۵:۴۳۔

[3] سنن ابی داؤد، ابوداؤد سلیمان بن الاشعث، حدیث ۴۰۹۰، جلد ۴، صفحہ ۵۹، دار الفکر، بیروت۔

[4] النازعات ۷۹:۴۰، ۴۱۔ [5] الرحمٰن ۵۵:۴۶۔

ہے اور کمال مجاہدہ بھی نفس کی مخالفت میں ہے، بندہ بجز مخالفتِ نفس واصل بحق نہیں ہوسکتا اس لئے کہ نفس کی موافقت بندے کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اور اس کی مخالفت بندے کی نجات کا سبب ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف بیان فرمائی ہے جو نفس کی مخالفت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو نفس کی موافقت کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان میں قرآن کریم نے خبر دی ہے "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ "[2] (اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرمادے)۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بذریعہ وحی ارشاد فرمایا "یَا دَاوٗدُ عَادِ نَفۡسَکَ فَاِنَّ وُدِّیۡ فِیۡ عَدَاوَتِہَا"[3] (یعنی اے داؤد اپنے نفس سے عداوت رکھ کیونکہ میری محبت اس کی عداوت میں رکھی گئی ہے)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ الٰہی میں کس طریقے سے تیرے پاس آسکتا ہوں تو فرمایا کہ اپنے نفس کو چھوڑ دو اور آ جاؤ۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ نفس اپنی فطرت اور جبلت میں خبیث ہے۔ اس کی خباثت پر آپؒ نے بہت کچھ لکھا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ نفس ایک ایسی صفت ہے جسے باطل پرستی کے بغیر سکون نہیں۔ محمد بن علی ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک نفس باقی ہے بندہ خدا کو کیا خود کو بھی نہیں پہچان سکتا کیلئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا "کفر کی جڑ مُرادِ نفس پر قیام کرنا ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے سب سے بڑا حجاب نفس کا پاک کرنا ہے اور اس کی تدبیروں کی اتباع کرنا ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔

ایہو نفس اساڈا بیلی جو نال اساڈے سِدّھا ہو جو کوئی اس دی کرے سواری نام اللہ اس لدھا ہو
لکھ ہزار کتاباں پڑھیاں پر ظالم نفس نہ مردا ہو باجھ فقیراں کوئی نہ مارے ایہہ ظالم چور اندر دا ہو

ایک اور جگہ آپؒ نے فرمایا۔

جد دا مرشد کاسہ دتڑا تددی بے پرواہی ہو کیہ ہویا جے راتیں جاگے جے مرشد جاگ نہ لائی ہو
باجھ حضوری نہیں منظوری پے پڑھن بانگ صلوٰتاں ہو روزے نفل نماز گزارن، پے جاگن ساریاں راتاں ہو
باجھ قلب حضور نہ ہووے پے کڈھن سے زکوٰتاں ہو باجھ فنا رب حاصل ناہیں ناں تاثیر جماتاں ہو
نہ رب عرش معلےٰ اُتے، نہ رب خانے کعبے ہو نہ رب علم کتابیں لبھا، نہ رب وچ محرابے ہو

---

[1] کشف المحجوب، صفحہ ۲۱۰۔ [2] یوسف ۱۲:۵۳۔ [3] کشف المحجوب ۲۸۷۔

گنگا تیرتھ مول نہ ملیا، کیتے پینڈے بے حسابے ہُو ‏ جد دا مرشد کامل پھڑیا باہُو چھٹے کل عذابے ہُو

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ نفس اپنی فطرت اور جبلت میں خبیث ہے جبکہ دل ایک نورانی چیز ہے اور گناہوں کی وجہ سے اس دل پر جو زنگ یا سیاہی چھا جاتی ہے تو اسے ذکرِ الٰہی سے دور کر لیا جاتا ہے مگر نفس کو جتنا بھی ذکر کی ضربوں سے صاف کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی چونکہ اصل خباثت ہے اس لئے اس کی خباثت کو دور کرنا ناممکن ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے نفس کے متعلق فرمایا ہے کہ جب تک نفس قلب کی ریاست کے ماتحت رہ کر بمطابق سنت اور اتباعِ شریعت اور فضلِ خداوندی سے پاک و مطہر نہ ہو جائے اس کا خبث ذاتی دور نہیں ہو سکتا۔ نفس امارہ جاہ اور سرداری کی محبت پر پیدا کیا گیا ہے۔ آپؒ نے نفس کی خواہشات اور عادات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ احادیث میں ہے کہ خدا کے ساتھ نفس کا دعویٰ ہمسری کا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ صرف وہی حاکم ہو اور باقی اس کے محکوم ہوں۔ حدیث قدسی میں ہے۔ "عَادِ نَفْسَکَ فَإِنَّهَا انْتَصَبَتْ بِمُعَادَاتِي" [1] (نفس سے عداوت رکھ کیونکہ یہ میری مخالفت پر کمربستہ ہے)۔

"کشف المحجوب" میں ایک بزرگ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ نفس ایک سرکش کتا ہے اور کتے کی جلد بغیر دباغت اور رنگائی کے پاک نہیں ہوتی۔ "کشف المحجوب" میں ہے کہ شیخ ابو علی مروزیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے نفس کو اپنی اصل شکل میں دیکھا کہ کسی نے اسکے بال پکڑ رکھے ہیں اور اس شخص نے وہ بال میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ میں نے اسے درخت سے باندھ کر مارنے کا عزم کیا تو نفس نے مجھے کہا کہ اے ابو علیؒ محنت نہ کرو میں اللہ کی مخلوق میں سے ہوں۔ تم مجھے مٹا نہیں سکتے۔ حضرت محمد بن علیان لسویؒ، حضرت جنید بغدادیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ابتداء میں نفس کی آفات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے دل کے کونے میں اس کی کمین گاہ معلوم کر لی تھی اور مجھے اس سے سخت دشمنی تھی۔ ایک دن بلی کی صورت میں کوئی چیز میرے حلق میں سے نکلی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی شناخت کروائی اور میں نے جان لیا کہ یہ میرا نفس ہے۔ میں نے اسے زمین پر ڈال کر پیروں سے روندنا شروع کر دیا لیکن جوں جوں میں اس کو لاتیں مارتا تھا توں توں وہ بڑھتا جاتا تھا، میں نے کہا اے خبیث ہر چیز مار پیٹ سے گھٹتی ہے تو کس لئے بڑھتا جاتا ہے۔ نفس بولا کہ حضرت میری پیدائش مخلوق کے برعکس ہے، جو چیزیں آپ کیلئے رنجیدہ نما ہیں میرے لئے وہ موجب راحت ہیں اور جو چیزیں آپ کیلئے راحت کا سبب ہیں میرے لئے موجب رنج ہیں۔ [2] ابو قاسم گرگانیؒ جو داتا صاحبؒ کے زمانے میں قطب مدار تھے اپنے ابتدائی احوال سناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں، میں نے نفس کو

---

[1] الاحکام الآمدی، علی بن محمد الآمدی، ۶۳۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۹۷، دار الکتاب العربی، بیروت۔

[2] کشف المحجوب، صفحہ ۳۰۶۔

سانپ کی صورت میں دیکھا۔ کئی بزرگوں نے کتے کی صورت میں اور کسی نے چوہے کی صورت میں دیکھا۔ یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ نفس ایک عین ہے اور ہم صرف اس کی خصلتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ نفس نہ ہوتا تو انسان کے درجات بلند نہ ہوتے۔ جس طرح فرشتوں میں نفس نہ ہونے کی وجہ سے درجات بلند نہیں ہوتے۔ لہٰذا درجات کی بلندی نفس کی مخالفت میں رکھی گئی ہے۔ نفس ایک کتا ہے۔ ریاضت اور اصلاح کے بعد کتے کا باندھ کر رکھنا مباح ہے اور اس کے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ باندھا ہُوا کتا بھونکتا ضرور رہتا ہے۔ مجاہدات، نفس کی اصلاح کیلئے ہیں نہ کہ اس کے عیب فنا کرنے کیلئے۔

مشائخ عظامؒ اپنے مریدوں کے نفس کا علاج ذکرِ الٰہی سے کرتے ہیں۔ حضرت شیخ سرہندیؒ نے فرمایا کہ کلمہ نفی اثبات (لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہ) کا اعتبار اوّل یہ ہے کہ یہ باطل خداؤں کی عبادت کی نفی کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ غیر مقصود باتوں کی نفی کرتا ہے یعنی لغو باتوں کی جو فائدہ مند نہیں ہیں، آپؒ نے فرمایا ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا ہے یا سنا گیا ہے یا جانا گیا ہے سب غیر ہے، اس کی نفی کرنا چاہیے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ذکر کرنے سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' میں ذکر میں روحانی کمالات کے عنوان سے ذکرِ الٰہی کے متعلق پینتیس نکات بیان کئے گئے ہیں اور ان نکات میں ذکر سے پیدا ہونے والے کمالات وتصرفات اور روحانی قوت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں طریقۂ ذکر اور ذکر کے چند خوبصورت نکات بھی بیان کئے گئے ہیں جس سے ذکر میں موجود بہت سی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ذکر مجاہدات سالک میں شمار ہوتا ہے، اس کتاب میں مجاہدات کے ذریعے نفس کا علاج ہونا ظاہر کیا گیا ہے، مجاہدات میں ذکرِ الٰہی کے علاج کی طرح اتباعِ شریعت کو بھی نفس کے علاج کیلئے ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی کامل شیخ سے بیعت کرنے میں بھی نفس کا علاج مخفی ہے۔ اس کتاب میں شیخ طریقت کی بیعت کرنا بھی نہایت ضروری امر بیان کیا گیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں ذکر کرنے سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے جیسے مجاہدے سے گھوڑے کے اندر پوشیدہ صفتِ اطاعت ظاہر ہوتی ہے جو گھوڑے کو پھرائے بغیر ظاہر نہیں ہوتی۔ کلمہ طیبہ افضل ترین اور بھاری عبادت ہے، کیونکہ اس کلمہ کا پہلا حصہ ماسویٰ کی نفی کرتا ہے چاہے آسمان ہو یا زمین، عرش ہو یا کرسی، لوح یا قلم، خواہ عالم یا آدم اس سے سب کی نفی ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ (الا اللہ) معبودِ برحق کو ثابت کرتا ہے، جو سب کا خالق ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی چیز پڑھنے کیلئے بتائیں جس کو میں پڑھتا رہوں تو اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ پڑھنے کیلئے فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یا اللہ یہ کلمہ تو عام

لوگوں کیلئے ہے میرے لئے تو اس سے کوئی بڑی چیز بتائیں، فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تمہیں نہیں معلوم کہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کیا چیز ہے؟[1]

مکتوبات امام ربانی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور غصہ کو ٹھنڈا کرنے میں کوئی چیز بھی اس کلمہ سے زیادہ نافع نہیں جبکہ یہ کلمہ دوزخ کی آگ میں پڑنے سے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے تو دوسرے غضبوں کو جو اس سے کم ہیں بدرجہ اولیٰ ٹھنڈا کرتا ہے اور تسکین دیتا ہے۔ پہلی امتوں میں گناہ کبیرہ بہت کم تھے، جس قدر معافی اور مغفرت اللہ تعالیٰ اس امت کیلئے کام میں لائے گا، معلوم نہیں کہ پہلی امتوں کیلئے بھی کام میں نہ لائے۔ ننانویں رحمتیں شاید اسی امت کیلئے ذخیرہ کے طور پر رکھی گئی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ کوتاہ نظر لوگ تصور کرتے ہیں کہ صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے سے دخول جنت کیسے میسر آئے گا۔ یہ لوگ اس کلمہ کی برکات سے واقف نہیں۔ اس فقیر کو محسوس ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام عالم کو صرف اس کلمہ کے طفیل بخش دے اور جنت میں بھیج دے تو گنجائش رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشاہدے میں آتا ہے کہ اگر اس کلمے کی برکات کو تمام عالم پر تقسیم کرتے رہیں تو سب کو ہی کفایت کرتا اور سیراب کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کی برکات کس قدر بڑھ جاتی ہیں جبکہ اس کے ساتھ کلمہ مقدسہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع ہو جائے۔ ان دو کلمات کا مجموعہ ولایت اور معرفت کے کمالات کا جامع ہے۔ اے اللہ ہمیں اس کلمے کی برکات پر ثابت قدم رکھ اور ہمیں اس کی تصدیق پر موت نصیب فرما آمین! اس معاملہ میں آپؒ کا بیان طویل ہے۔

''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' وہ کلمہ ہے جو سالک کو اس ذات کی برائیوں سے دور کرتا ہے اور اگر وہ خود سے دور ہے تو وہ حق تعالیٰ عَزَّ وَجَلَّ وعلا کے قریب جا پڑتا ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے کہ جس کو اگر ایک کافر ایک بار صدقِ دل سے پڑھے تو اس سے کفر کی لعنت دور ہو جاتی ہے اور اس کا دل ایمان کے نور سے مزین ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی مومن اس کو دن میں ہزار بار پڑھے تو دن میں اس کے بے انتہا مراتب بلند ہوں گے۔ حقیقت میں یہ نفس برائی کا سرچشمہ اور شرارت کا راہنما ہے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ برے کاموں کا سبب نفس ہی ہے۔ اس سے اخلاق رزیلہ (تکبر، حسد، بخل، غصہ اور کینہ وغیرہ) اور افعال خبیثہ کے ارادے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کے اندر جو وصف اطاعت پوشیدہ ہے اس کو ظاہر کرنے کیلئے مجاہدہ و ریاضت سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھوڑا پھیرائے بغیر اپنی صفت باطنی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ چونکہ گدھے میں یہ صفت نہیں ہے اس لئے گدھے کا عین بدل کر گھوڑا نہیں بنایا جا سکتا۔ آسٹریلیا اور بعض دیگر پہاڑی علاقوں میں جنگلی گھوڑے بہت بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ گھوڑے اتنے سرکش ہوتے ہیں

---

[1] صحیح ابن حبان، محمد بن حبان، متوفی ۳۵۴ھ، حدیث ۶۲۱۸، جلد ۱۴، صفحہ ۱۰۲، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت۔

کہ آسانی سے قابو نہیں آتے، ان کو بڑی ہوشیاری سے پکڑتے ہیں کیونکہ وہ کسی انسان کو پاس بھٹکنے نہیں دیتے۔ ان گھوڑوں کو نکیل ڈال کر پندرہ بیس من کی لکڑی گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر پھیراتے ہیں اور انہیں صبح و شام تک بھوکا رکھتے ہیں۔ اس قدر روزانی لکڑی کو وہ صبح سے شام تک سزا کی صورت میں کھینچتے ہیں۔ اس قدر محنت کے بعد گھوڑا کمزور اور بے بس ہو جاتا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ اب وہ ان لوگوں کا اسیر ہے کیونکہ صبح سے شام تک اس سے محنت کروا کے سرکشی ختم کر دیتے ہیں۔ آخر وہ وقت آتا ہے کہ گھوڑا اپنے مالکوں کے ادنیٰ اشاروں کو بھی سمجھ کر بہت بڑے بڑے کرتب دکھاتا ہے۔ عین اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانیت کیلئے شریعتِ محمدی ﷺ کو مقرر کیا ہے جس میں نماز، روزہ، جہاد وغیرہ کے سخت گیر اعمال مسلمانوں کی اصلاح کیلئے نافذ کئے گئے ہیں۔ ان اسلامی ارکان کی ادائیگی سے مسلمانوں کے اندر وہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو ایک مومن کیلئے لازم ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ انسان میں نفس کے خباثت رکھے جانے کے باوجود اس کو نفس کی آلائشوں سے بچنے کیلئے کیوں حکم دیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی مخالفت میں اللہ تعالیٰ کا قرب رکھا گیا ہے اور اس کی مخالفت سے اس کے درجے بلند کئے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو نفس کی آلائش سے محفوظ رکھا گیا ہے اور اسی وجہ سے نہ ان کے درجات کم ہوتے اور نہ ہی درجات میں بلندی عطا کی جاتی ہے۔ انسان کو نفس اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ اس کی مخالفت کر کے خدا کی رضا کو حاصل کرے تا کہ اس کے درجات بلند کر دیے جائیں۔ نفس کی مخالفت کرنا بہت بڑی ہمت کی بات ہے۔ اس لئے انسان کو اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں نفس کی آفات اور اس سے نجات کے راستوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ خیر و کمال کے ساتھ شر بھی چاہیے۔ حسن و جمال کیلئے نقص کا آئینہ درکار ہے اور آئینہ شے کے مقابل ہوتا ہے، لہٰذا خیر کیلئے شر اور کمال کیلئے نقص کا آئینہ ضروری ہے۔ ہر وہ شے جس میں نقص اور شرارت زیادہ ہوگی وہ خیر و کمال کی نمائندگی بھی زیادہ کرے گی۔ اس طرح ذم نے مدح کے معنی پیدا کر دیئے اور یہ شر اور کمال کا محل بن گیا۔ اسی لئے مقامِ عبدیت تمام مقامات سے بلند ہے کیونکہ یہ معنی عبدیت میں اتم اور اکمل ہیں۔ یہ مقام محبوں کیلئے خاص ہے۔

اگر انسان کو فساد اور خونریزی کے ساتھ علم اور آگہی نہ دی جاتی تو وہ فساد اور ظلم کا منبع قرار دیا جاتا لیکن منشاء الٰہی تھا کہ یہ جنگ و جدل کے باوجود شر کی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوگا اور ظلم و استحصال کے خاتمے کیلئے انقلابی جدوجہد کرے گا اور اعلائے کلمۂ حق کی خاطر جان کی بازی بھی لگا دے گا۔ جو کفر میں تیز ہوتا ہے وہی اسلام میں بھی تیز ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے خلاف اگر کوئی نازیبا حرکت کرتا تو

حضرت عمرؓ اس کی گردن اُڑانے کیلئے تلوار سونت لیتے۔ مسلمانوں میں کچھ غنڈوں اور فتنہ فساد کرنے والوں نے ہندوؤں کو اپنے علاقوں سے نکال کر باہر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خونریزی اور جنگ و جدل کسی قوم میں موجود نہ ہو تو ان کی شخصیت دائمی طور پر ناقص رہ جاتی ہے اور پسماندہ قوموں میں ان کا شمار ہوتا ہے، اسی لئے جہاد کو اسلام میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک جاہل عرب قوم کے سامنے خیر و شر کا فرق ظاہر کیا گیا تو وہ دنیا کی سب سے بہترین قوم بن گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر یہ ظاہر فرمایا کہ اے فرشتو! تم کامل عابد ہو، عابد کیلئے محراب اور عالم کیلئے خلافت کا تخت و تاج ہوتا ہے۔ تمہارا تعلق عالم ارواح سے ہے اور آدم کا تعلق عالم ارواح اور عالم اجسام سے ہے۔ تمہاری عبادت جبری ہے اور آدم کی عبادت اختیاری ہے کیونکہ تمہاری خوراک ہی عبادت ہے اور تمہاری عبادت میں کوئی چیز حائل نہیں مگر ان کی عبادت میں ہزاروں مشاکل، مراحل اور مشاغل حائل ہوں گے اور یہ لوگ ان سب پر لات مار کر میری اطاعت کی طرف آئیں گے۔ اس لئے ان کا ایک سجدہ تمہارے ہزاروں سجدوں سے افضل ہوگا (اس کتاب میں مقامِ آدم کے باب کا مطالعہ کریں تو یہ فرق بہت واضح کر کے بیان کیا گیا ہے جس میں علامہ اقبالؒ کے کلام کے موتی پروئے گئے ہیں)۔ فرشتوں سے یہ کہا گیا کہ انسان میں اگرچہ شہوت اور غصہ کی آگ بھری ہوگی مگر جب یہ غصہ میرے لئے ہوگا تو بڑے نتائج اخذ ہوں گے۔ ان کے دل میں میرا عشق ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عاشق، حضرت ایوب علیہ السلام جیسے صابر اور معروف کرخیؒ، جنیدؒ و بایزیدؒ جیسے عاشق ہونگے۔ یہ وہ عبادت کریں گے جو تم نہیں کر سکو گے یہ دین کی سختیاں برداشت کریں گے، ان کے ایک ایک سانس میں میرا ذکر ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ ان پر جان نثار کریں گے بلکہ فرشتوں کو مختلف انداز میں انسان کی خدمات پر معمور کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے درج ذیل شعر میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ کلمہ لَا اِلٰـہَ کا اقرار کر لینے کے بعد مسلمانوں پر تمام اسلامی احکامات واجب ہو جاتے ہیں جس طرح ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرنے کے بعد اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا پابند ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

چو میگویم مسلمانم بلرزم ۔۔۔ کہ دانم مُشکلاتِ لا الٰہ را

(جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز جاتا ہوں کیونکہ میں لا الٰہ کی مشکلات کو جانتا ہوں) (ار:۵۹)

علامہ اقبالؒ نے نفس کو قابو میں لانے پر کافی کلام کیا ہے اور آپؒ کی شاعری کا اکثر حصہ انسان کو شیطانی قوتوں سے نبٹنے کے متعلق بات کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خودی اور بے خودی، سخت کوشی، فلسفۂ خطر، فلسفۂ تخریب و تعمیر، دولتِ یقیں، حیاتِ جاوداں، حکمت لا و اِلّا، آرزو کی دل پسندی، آزمائش، تدبیر و توکل،

جہاد، مقامِ آدم، عشقِ الٰہی، فلسفۂ ذکر، کمالات وفیوضاتِ قرآن، مسلمانوں کی پستی اوراس کے علاج پر بہت سا کلام پیش کیا ہے۔ جوانسانی نفس کے اسباق سکھانے کیلئے لوگوں کے سامنے بطور علاج نفس پیش کرتا ہے۔اگر آپؒ کے کلام کا مزید مطالعہ مطلوب ہوتو کلیات اقبالؒ (فارسی اوراُردو) کا مطالعہ کیا جائے ۔یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ مسلمانوں کی کم ظرفی اور کم کوشی کو سامنے رکھتے ہوئے علامہؒ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ اس کم کوش قوم کو دنیاوی کاموں سے اتنی فراغت اور وسعتِ دولت عطا کر کہ وہ نفس کے ہر امتحان سے چھوٹ جائیں کیونکہ دنیا کی کشمکش کے ہوتے ہوئے وہ نفس کے امتحان سے پاس نہیں ہوسکتے۔فرماتے ہیں کہ ہمارے ماڈرن لوگ پرانی روایات کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ابلیس بڑھاپے میں بھی پہلے ہتھکنڈے پر عمل پیرا ہے مگر اس ماڈرن دنیا کیلئے شیطان اب تازہ گناہ کہاں سے لائے۔

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے — کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطان کہنہ اندیش — گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے!

(ا ح:۶۷۱)

علامہ اقبالؒ نے نفس انسان کو تلوار قرار دیا ہے اور خودی کو تلوار تیز کرنے کا آلہ تصور کیا ہے تا کہ نفس کو اپنی حرکتوں سے باز رکھا جاسکے۔آپؒ نے فرمایا کہ لوگ عمرِ جاوداں پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ زمانے کی گردشوں پر اپنے نفس کا مقابلہ کرتے ہوئے غالب آئیں۔یہ اہل ہمت لوگوں کا کام ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

(ب ج:۴۱۹)

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے — جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

(ض ک:۵۶۳)

علامہ اقبالؒ نے ''اسرار ورموز'' میں فرمایا ہے کہ خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں۔پہلا مرحلہ اطاعت الٰہی دوسرا ضبطِ نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی ہے۔اس نظم میں آپؒ نے اونٹ کی ذات میں موجود مختلف صفات کا ذکر کیا ہے اوراُونٹ میں موجود بہت اعلیٰ خصائل کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔آپؒ نے انسان کو کہا ہے کہ وہ اونٹ والی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے۔اس کے بعد آپؒ نے فرمایا ہے کہ تیرا نفس بھی اونٹ کی طرح اپنی پرورش میں لگا رہتا ہے،وہ خود پرست ،خودسر اور سرکش ہے۔انسانی فطرت کے مطابق علامہ اقبالؒ نے باغی اور سرکش انسان کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔اس نظم میں انسانوں کیلئے بہت سی نصیحتیں ،تدابیر اور خطرات کا ذکر کیا ہے اوران کا علاج نفس کی اصلاح میں مضمر ہونا لکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں زکوٰۃ، نماز، روزہ، کلمہ طیبہ، حج، بھوک اور پیاس پر ضبط قائم کرنے کا ذکر کیا ہے جس سے بندہ صحیح معنوں میں مومن بن جاتا ہے۔ آپؒ نے فرمایا ہے عبادت کے بل بوتے پر انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو صاحب قوت بنائے تاکہ اپنے خاکی بدن کے اونٹ پر سواری کر سکے۔ اس اتباع کے بعد انسان کو نیابتِ الٰہی کا تاج عطا کیا جاتا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است　　خود پرست و خود سوار و خود سر است

(تیرا نفس باغی اور سرکش اونٹ کی طرح ہے، خود پرست اور خود سواری کرنے والا ضدی ہے)

مرد شو آور زمامِ او بکف　　تا شوی گوہر اگر باشی خزف

(مرد بنو اور اس کی لگام اپنے ہاتھ میں لو، تاکہ تم اگر سیپ ہو تو گوہر بن سکو)

ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

(جو اپنا حکم اپنے آپ پر نہیں چلا سکتا، تو اسے دوسروں کے احکام کو اپنی ذات پر نافذ کرنا پڑتا ہے)

تا عصائے لاالٰہ داری بدست　　ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

(اگر لاالٰہ کا عصا اپنے ہاتھ میں رکھتے ہو، تو خوف کا ہر جال توڑ دینا چاہیے)

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش　　خم نگردد پیشِ باطل گردنش

(ار:۴۲)

(ہر وہ شخص جس کے اندر حق ایسا سما جاتا ہے جیسے جسم میں روح، تو وہ باطل کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتا)

مذکورہ بالا نظم کا خلاصہ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل شعر میں دے دیا ہے آپؒ نے فرمایا کہ انسان کی جان کی حفاظت بے حساب ذکر و فکر میں ہے اور انسانی بدن کی حفاظت جوانی میں نفس کی حفاظت ہے۔ یہی درج ذیل شعر کا ترجمہ ہے۔

حفظ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب　　حفظ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

(ج ن:۲۰۳)

زیرِ نظر کتاب کے ایک باب میں حضرتِ آدم کے مقامات کی وضاحت کی گئی ہے جس میں فرشتوں اور انسانوں کی وسعتِ افکار کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا جو کلام اس باب میں شامل کیا گیا ہے وہ ان تمام غایتوں کا احاطہ کرتا ہے جس کیلئے انسان کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیا وجوہات تھیں، جس کی وجہ سے انسان کو خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ کا منصب عطا کیا گیا۔

اُوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو خلافت کی ذمہ داریاں نبھانے کی راہ

میں قدم قدم پر مشکلات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اسے تمام صلاحیتوں اور تصرفات پر مکمل دسترس عطا فرمائی ہے۔ وہ مضامین جو انسان کو اس کشمکش حیات میں کامیابی دلانے کیلئے ضروری ہیں ہر مسلمان کو اس کا علم سیکھنا بھی واجب ہے، چنانچہ اس کتاب میں نفس کے مقابلے کیلئے ضرورت طلب تمام مضامین کو شامل کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں نفس کے معاملات کو نہایت دلچسپ اور ماڈرن طریقے سے لکھا گیا ہے۔ آج کا مسلمان پہلے زمانے کے مسلمانوں سے کچھ زیادہ سہل پسند اور کم کوش ہو چکا ہے، اس لئے نفس کے معاملات کو بھی ان کے مزاج کے مطابق لکھا گیا ہے۔ نفس کے تمام تقاضے بیان کرنے کے بعد نفس کے موضوع پر پیدا ہونے والے تمام سوالات کے خوبصورت جوابات اس کتاب میں دے دیئے گئے ہیں۔ نفس کے بڑھتے ہوئے مطالبات، مدارج نفس، خطرات و آفاتِ نفس، نفس کی سرکشی اور اسکا علاج نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نفسیاتی امراض، ہوسِ نفس، غلبۂ نفس کے علاوہ محاسبہ، معاتبۂ نفس کو بھی یہاں بیان کیا گیا ہے۔ عیسائیت میں نفس کے بھیانک مجاہدات کا ذکر بھی اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ نفس کے قلب، روح اور عقل پر اثرات بھی بہت معروف طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ نفس کی آفات اور اس کے اثرات کے ازالہ کا بیان بھی اس کتاب کے صفحات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ بھوک اور شکم سیری، نفس کے ابواب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اہل طریقت نفس کا علاج بھوک سے کرتے ہیں، بھوک کی افادیت کا علم اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن رمضان کے روزوں سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس میں نفس کی نامرادی ہے۔ روزے کی غایت تقویٰ میں رکھی گئی ہے۔ روزے کی مخفی حکمتوں میں سے یہ ہے کہ یہ روح، جسم اور نفس کی تطہیر کرتا ہے اور اس کی وجہ سے خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے، اس کے باعث روح اور نفس کا علاج ہونے کی وجہ سے انسان میں بے بہا کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ رمضان میں مسلمان کو ہر عمل کے عوض بے پناہ اضافی ثواب دیا جاتا ہے اور رمضان المبارک قیامت کے دن روزے دار کی بخشش پر اپنی محبت کا اظہار کرے گا اور شفاعت کرے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت قبول فرمائے گا اور انسان کو بے پناہ مغفرتوں، رحمتوں کا ہجوم میسّر ہوگا۔ زیرِ نظر کتاب میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ نفس کو مارا نہیں جاتا بلکہ اس کی اصلاح مرشد سے وابستہ ہونے سے متعلق ہے اور مرشد اس کام کو کس طرح عالم ظہور میں لاتا ہے، اس بات پر ایک باب لکھ دیا گیا ہے۔ مریدوں کی تربیت کیلئے مرشد اپنے مریدوں کو مجاہدات نفس سکھاتا ہے اور اس سلسلے میں مرید کو اپنی باطنی توجہ اور فیض بھی عطا کرتا ہے۔ اس کتاب میں ایک باب ''الانسان فی القران'' کے نام سے دیا گیا ہے، جس میں انسان کی عام خامیوں، کمزوریوں، عادتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسان پر غلبہ شیطانیہ کو دور کرنے اور اس کے علاج کا ذکر بھی ایک باب میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مکمل مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ نفس کا علاج کن خطوط پر کیا جا سکتا ہے اور اس سے انسان کے مدارج نفس نفسِ امّارہ سے نفسِ لوّامہ اور پھر مطمئنّہ کے بعد نفس راضیّہ اور مرضیّہ میں کس طرح بدلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ عظامؒ عمر بھر محنت شاقہ میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے بعد ان کو وہ دن نصیب ہوتا ہے کہ ان کو نفس مرضیّہ کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور جب وہ اس مقام پر فائز ہوتے ہیں تو خدا بھی ان کی رضا کا طالب بن جاتا ہے جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کی اگلی حدود پر جا کر صوفی کو وہ مقام ملتا ہے جہاں اس کا بولنا خدا کا بولنا بن جاتا ہے اس کا چلنا پھرنا بھی خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ جس طرح کہ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ عبادت کے ذریعے میرا اتنا قرب حاصل کرتا ہے کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے میرا بندہ سنتا ہے، میں آنکھ بن جاتا ہوں جس سے میرا بندہ دیکھتا ہے اور میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے میرا بندہ پکڑتا ہے۔[1] اس بات کو مولانا رومؒ نے یوں لکھا ہے۔

گفتہ اُو گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم ُبود

(یعنی اس کا بولنا اللہ تعالیٰ کا بولنا کہلاتا ہے اگر چہ وہ بات بندے کے حلق سے نکلتی ہے)

خاکِ پائے اولیائے کرامؒ
پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ
سابق ڈائریکٹر محکمہ موسمیات لاہور

مورخہ یکم جنوری ۲۰۰۷
بمقام لاہور

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۶۱۳۷، جلد ۵، صفحہ ۲۳۸۴۔

غرضِ تصنیف

(از مصنف)

زیرِ نظر کتاب میں تربیتِ نفس پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔اس کتاب میں نفس کی جبلت، خصلت اور دیگر کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کو انسان کیلئے کیوں تجویز کیا ہے۔نفس کا حملہ انسان پر تاحیات جاری رہتا ہے۔ایک حدیث شریف میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ نفس اور شہوت کو انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے [1] جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اور شہوت سے انسان کو ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا پڑتا ہے۔نفس ایک ایسے موذی جانور کی طرح ہے جس کی ایذارسانی سے ماسوائے انبیاء علیہم السلام اور چند برگزیدہ ہستیوں کے اور کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔شیطان کی دسترس سے بچنے کیلئے اہل اللہ نے عزم بلند اور ناقابل تسخیر اہلیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شرعی مجاہدات اور استقلال کے ساتھ زندگیاں گزاریں۔اس مقصد کے حصول کیلئے اتباع شریعت ہر اُس شخص کو درکار ہو گی جو نفس کے حملوں سے بچنا چاہے۔سہل پسندی اور عیش وعشرت میں زندگی گزارنے والے لوگوں کیلئے نفس کی ایذارسانی سے بچنا بعید از قیاس ہے۔موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشی زندگی کا یہ حال ہے کہ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کے باعث پوری دنیا میں ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔مسلمانوں کی کم ہمتی، آرام طلبی اور غفلت شعاری کے باعث اُن کو درجہ ذلالت تک پہنچا دیا گیا ہے اور کیوں نہ ہو کہ ایسی قوم کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی سزا ہے اور ایسی قوموں کی تباہی کے متعلق دنیا کا ایسا سلوک ہونا بالکل جائز ہے کیونکہ وہ ذلت آمیز مقام پر آنے کے پورے حقدار ہیں۔

مصلحین اُمت عرصہ دراز سے ہدایت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔مگر اُن کے ساتھ اُن کی قوم نے وہی سلوک کیا جو حضرت ہود اور حضرت نوح علیہما السلام کی قوموں نے اُن کے ساتھ کیا۔ان پیغمبرانِ اسلام پر بہت قلیل (دس یا بیس) افراد ایمان لائے حتیٰ کہ قرآن اور احادیث کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سالہ تبلیغ کے بعد صرف ۸۰ آدمی مسلمان ہوئے۔ان قوموں نے پیغمبران عظام علیہم السلام کی نصیحتوں پر کان نہ دھرے اور اُسی طرح کفر کی حالت میں زندگیاں گزارتے رہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ مبلغین اسلام کو آج بھی اِنہی حالات کا مقابلہ کرنا ہے جیسا کہ مذکورہ انبیاء علیہم السلام کی قوموں نے اپنے پیغمبروں سے روا رکھا۔اسلام کے احکامات اور ارشادات پر چلنا انسانی بس سے باہر کی بات نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے سخت احکامات کبھی نازل نہیں فرماتا جو قابل عمل نہ ہوں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط" [2] (اللہ کسی جان کو

---

[1] کشف المحجوب، صفحہ ۳۵۵۔ [2] البقرۃ ۲:۲۸۶۔

اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا)۔

افسوس کی بات ہے کہ دینِ اسلام کے اس قدر سہل ہونے کے باوجود لوگ دین کی طرف جوانی میں تو کیا آئیں گے؟ ان کو تو بڑھاپے میں بھی اس طرف آنے کا خیال تک نہیں آتا۔ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے جو کہا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ اس کی تفصیل درج ذیل آیات میں ملاحظہ فرمائیں: "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ○ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ○ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ○"[1] (اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، اس نے کہا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟○ (اور شیطان یہ بھی) کہنے لگا: مجھے بتا تو سہی کہ یہ وہ شخص ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟ (آخر اس کی کیا وجہ ہے؟) اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے (اپنے قبضہ میں لے کر) جڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ اللہ نے فرمایا: جا (تجھے مہلت ہے) پس ان میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو بے شک دوزخ (ہی) تم سب کی پوری پوری سزا ہے○ اور جس پر بھی تیرا بس چل سکتا ہے تو (اسے) اپنی آواز سے ڈگمگا لے اور ان پر اپنی (فوج کے) سوار اور پیادہ دستوں کو چڑھا دے اور ان کے مال و اولاد میں ان کا شریک بن جا اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر، اور ان سے شیطان دھوکہ و فریب کے سوا (کوئی) وعدہ نہیں کرتا○ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا تسلط نہیں ہو سکے گا، اور تیرا رب ان (اللہ والوں) کی کارسازی کیلئے کافی ہے)۔

اس جگہ قارئین کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مردود قرار دیا ہے اور اسے جنت سے باہر نکال دیا ہے مگر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ابلیس کو اس بات کی پوری طاقت دی گئی ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کر سکے اور انسانوں کو بھی شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے تمام طریقے بتا دیئے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ شیطان تو اپنی طاقت کو پورے زور و شور سے استعمال کرتا ہے لیکن انسان اپنی سستی، غفلت اور کم ظرفی کے باعث مدافعتِ شیطان کے اُن تمام طریقوں کو استعمال میں نہیں لاتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان سے بچنے کیلئے بتائے گئے ہیں۔ یعنی وہ اِتباعِ شریعت سے بالکل عاری ہے جس کے نتیجے

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۶۱-۶۵۔

میں شیطان اب انسان پر اس قدر حاوی ہو گیا ہے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے سامنے فریاد کرتا ہے کہ میں انسان کی صحبت سے بالکل تنگ آ چکا ہوں۔علامہ اقبالؒ نے ایک نظم میں فرمایا ہے کہ ابلیس کو یہ شکایت ہو گئی ہے کہ انسان کسی وقت بھی میرے مکر سے منہ نہیں موڑتا۔یہ (انسان) اپنی عظمت کو بھلا چکا ہے۔یہ ایسا شکار ہے کہ وہ خود شکاری کو کہتا ہے مجھے پکڑ لے۔وہ ابلیس کا اتنا فرماں بردار ہے کہ خدا کی پناہ۔ابلیس یہ بھی کہتا ہے کہ اے باری تعالیٰ مجھے اس قسم کے شکار سے نجات دے۔اس میں جو خوبیاں تو نے رکھی تھیں یہ اس سے بالکل نا آشنا ہے۔شیطان کہتا ہے کہ اے الٰہی مجھے تو صاحب نظر بندہ چاہیے، جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرح میری گردن مروڑ دے اور جس کی نگاہوں سے مجھ پر کپکپی طاری ہو جائے۔شیطان نے کہا کہ الٰہی مجھے ایسا مردِ حق پرست عطا فرما جس سے شکست کھا کر مجھے لذت محسوس ہو۔ابلیس انسان کی صحبت سے نالاں ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں نالۂ ابلیس کے نام سے جو کلام پیش کیا ہے اس کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب من شدم از صحبتِ آدم خراب!

(اے نیکی اور بدی کے مالک خدا! مجھے آدمی کی صحبت نے خراب کر دیا ہے)

ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت چشم از خود بست و خود را در نیافت!

(یہ کسی وقت میرے حکم سے منہ نہیں موڑتا اس نے اپنے آپ سے آنکھیں بند کر لی ہیں)

فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف

(اس کی فطرت خام اور عزم کمزور ہے، یہ میرا حریف تو میری ایک بھی ضرب کی تاب نہیں لا سکتا) (ج:ن:۱۳۷)

بندۂ باید کہ پیچد گردنم لرزہ اندازد نگاہش در تنم

(مجھے ایسا بندہ چاہیے جو میری گردن مروڑ دے، جس کی نگاہ سے میرے بدن میں کپکپی طاری ہو جائے)

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست!

(اے خدا مجھے ایسا زندہ مردِ حق دے کہ شاید میں اس سے شکست میں لذت پا سکوں) (ج:ن:۱۳۸)

یہ نظم کافی طویل ہے اس کیلئے ہماری تصنیف ''سنت مبارکہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔نیز اس باب میں قرآن اور حدیث کا درجہ جو اقبالؒ کی نظر میں ہے وہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں نائب مقرر کیا ہے اور نیابتِ الٰہی کیلئے جسے چنا جاتا ہے وہ ایسا شخص ہوتا ہے کہ کسی ملک میں اس کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام کے مطابق عمل کرائے۔اس نیابت کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو محض شرف بخشنے کیلئے خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا

گیا تا کہ وہ خدا کے حکم کے مطابق عمل کرائے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور اس دن کوئی خلیفہ نہیں ہوگا۔ انسان اگرچہ ضعیف اور جہول بھی ہے لیکن اس دنیا میں اس کو انتہائی بلند تصرفات بھی عطا کیے گئے ہیں۔

انسان کو ایک پوشیدہ قوت عطا کی گئی ہے کہ وہ انوار ربانی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسلامی تربیت وریاضت کے بعد وہ عالم محسوسات سے عالم ملکوت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اطاعتِ الٰہی واطاعتِ رسول ﷺ کے ذریعے روح کیلئے عالمِ جبروت ولاھوت کی راہیں کھلتی ہیں۔ انسان ایک ذرہ ہے جس کے سامنے آسمان کی وسعتیں سرنگوں ہیں۔ یہ وہ قطرہ ہے جس میں سمندر کی گہرائیاں ہیں۔ مخصوص بندوں کو اللہ تعالیٰ نے وہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ جو خدا کی قدرت کا نمونہ بن سکے۔ خلیفۃ اللہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس کو سلطان کی قدرت حاصل ہو اور روحانیت میں بھی پورے عالم سے برتر ہو۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں حکومت الٰہی، زمین کا اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہونا اور حکمت کثیر پر بہت کلام کیا ہے۔ علامہؒ نے فرمایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کیلئے مسخر کر دی گئی ہے بشرطیکہ وہ اپنا منصب پہچانے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کیلئے فرمایا ہے کہ وہی لوح اور وہی قلم ہے۔ تمام عالم انسان میں سما جاتا ہے مگر انسان عالم میں نہیں سما سکتا۔ عالم اس کیلئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس کو وہ درجہ دیا ہے کہ اس کی خلوت تک حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی رسائی نہیں۔ مسلمان اپنے نفس پر ہر وقت نگاہ رکھتا ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی لوح کسی اور کا نقش اختیار کر لے۔ انسان کو پوری دنیا کا امین بنا کر اور پیغامِ خدا دے کر بھیجا گیا ہے تا کہ وہ اپنے کردار سے اسلام کو پوری دنیا تک پھیلا سکے، مگر آج کل یہ حالت ہے کہ مغربیت کے نقوش اور عیش وعشرت کی زندگی مسلمانوں کے دلوں پر چھا چکی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے احتیاط اور سنبھل کر چلنے کے موضوع پر طویل کلام پیش کیا ہے تا کہ مسلمان اس کلام کو پڑھ کر سنبھل جائیں۔ روحانی زندگی کو اپنانے کیلئے آپؒ نے بہت زیادہ زور دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ مسلمان (ذکر وفکر) کی طرف توجہ نہیں دیتے تو وہ طبیعت میں نرم رہتے ہیں (یعنی صورتِ فولاد نہیں رکھتے)۔ ایسے لوگ زندگی کو صحیح طرح نہیں گزار سکتے۔ آپؒ نے ایک کبوتر کی مثال دی ہے کہ وہ اپنے بچے کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنی نرم طبیعت کو روا نہ رکھے بلکہ سختیوں کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرے۔ وہ اپنے بچے کو کہتا ہے کہ تم ''اللہ ھُو'' کا ذکر اس مستی، شوخی اور گرم جوشی سے کرو کہ تمہارے اندر بے بہا طاقت پیدا ہو جائے اور بجائے اس کے کہ تم شاہین کا شکار بن جاؤ تم اپنی روحانی طاقت سے شاہین کے سر سے اس کی بہادری کا تاج چھین سکو۔ (ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت توکل شاہؒ کے دروازے کے سامنے بیٹھنے والے کتے میں بھی ایسی طاقت تھی کہ وہ شیروں اور چیتوں کو بھی پھاڑ سکتا تھا۔) حضور عالمِ انسانی (ارمغان حجاز) میں علامہ اقبالؒ

کے درج ذیل شعر پر غور فرمائیں۔

اگر "یاھو"، زنی از مستیٔ شوق   کُلہ را از سرِ شاہیں بگیری

(اگر تو مستیٔ شوق سے ھُو،ھُو کا نعرہ لگائے تو شاہین کے سر سے بھی تاج چھین سکتا ہے)(ا ح:۱۰۹)

''زبورِ عجم'' میں علامہ اقبالؒ خدا سے عرض کرتے ہیں کہ تیرے جلال کی قسم میرے دل میں کوئی اور آرزو نہیں ہے سوائے اس کے کہ تو کبوتروں (یعنی مسلمانوں) کو عقابی شان عطا فرما دے۔

''جاوید نامہ'' میں علامہ اقبالؒ اپنے فرزند کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ اے بیٹے ذکر و فکر اور دیگر روحانی معاملات کو مجھ سے سیکھو تا کہ تمھاری ذات درجہ کمال تک پہنچ جائے۔ روحانی معاملات ذوقِ نظر سے سیکھے جاتے ہیں اور یہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان خود کو ذکر کی حالت میں جلنا (یعنی فنا) حاصل کر لے۔ اس قسم کے ذکر سے انسان کا جسم بھی روح کی طرح لطیف ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر   سوختن در لاالٰہ از من بگیر!

(اے بیٹے ذوقِ نگاہ کا حاصل کرنا ہم سے سیکھو، لاالٰہ میں جل جانا (فنا ہونا) ہم سے سیکھو)

لاالٰہ گوئی؟ بگو از روے جاں   تاز اندامِ تو آید بوے جاں

(لاالٰہ کہو تو روحانی حالت میں کہو، تا کہ تیرے بدن سے روح کی خوشبو آئے) (ج ن:۷۸۷)

ایں دو حرف لاالٰہ گفتار نیست   لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

(یہ لاالٰہ کے دو حرف کہنے کی بات نہیں، لاالٰہ تو بجز بے پناہ تلوار کے کچھ نہیں) (ج ن:۱۹۹)

نگاہِ شوق کو جذبہ و تحقیق اور کشف کو اسرار کا جنوں بخشا گیا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ کے مطابق خدا اور انسان کے درمیان ستر ہزار پردے حائل ہیں لیکن ذکر و فکر کرنے والوں کو ایسی نگاہ حاصل ہو جاتی ہے کہ ان کے سامنے یہ پردے بہت باریک محسوس ہوتے ہیں اور اس حالت میں مومن آسمان پر موجود فرشتوں کے چہروں پر مخفی سے تبسم کا بھی نظارہ کر سکتا ہے بلکہ ایسا بھی کہا گیا ہے (بقول ثناء اللہ پانی پتیؒ اور دیگر مشائخ کے) کہ ذکر الٰہی ہر چیز کو جلا دیتا ہے۔ ''اَلْعِشْقُ نَارٌ یُحْرِقُ مَاسِوَی اللّٰہِ'' (عشق وہ آگ ہے جو اللہ کے سوا سب کچھ جلا دیتی ہے)۔

یہ ستر ہزار پردے بھی خاص مشائخ کیلئے اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اگر انسان مسلسل طور پر معمولی سی کوشش بھی کرتا رہے تو کچھ عرصہ کے بعد اس کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کا تعلق عالمِ امر کے ساتھ ہو جاتا ہے، مگر یہ تمام باتیں آج کل کے آرام طلب لوگوں پر واضح نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ روحانیت کی طرف آنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

(ا ح:۲۹۳)

اگر مسلمان اسلام میں موجود روحانی کمالات کو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ ہر مسلمان اگر ہمت اور استقامت سے کام لے تو وہ ستاروں کی دنیا پر رسائی تو کجا، وہ تو اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر بھی کمند ڈال سکتا ہے۔ ایک مسلمان کو حاصل ہونے والے کچھ کمالات کا ذکر اس کتاب میں اسی لئے کیا ہے کہ ہر مسلمان اپنی خودی سے آگاہ ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نائب (خلیفہ) کو دنیا میں کتنے بڑے بڑے کمالات عطا کرنا چاہتا ہے اور کمال وتصرفات کو عام لوگوں کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تمام کمالات انسان کو اس وقت عطا ہوتے ہیں جب کہ وہ عقل کے ساتھ ذکر وفکر اور خونِ جگر میں گرمی بھی رکھتا ہو جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ندرت فکر وعمل میں انسان نئے افکار اور عمل میں انوکھا پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعل و ناب!

(ب ج:۴۴۴)

جس قوم کے افراد اپنی بہتری کیلئے کوشاں نہیں رہتے ان کو دنیا میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ آج عمل پیرا نہیں ہوسکتے ان کا کل خرابی اور تباہی لے کر آتا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے!

(ض ک:۶۰۳)

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

(ب ج:۳۱۶)

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا
جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

(ض ک:۶۳۰)

مذکورہ بالا کلام سے مسلمان کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر وہ عمل کی دنیا میں انقلاب لانے میں کامیاب ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کے گرد زمانہ طواف کرتا ہے۔

ہر مسلمان کیلئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کو نگاہ میں رکھے تاکہ اس دنیا میں اسے شادمانی اور کامرانی نصیب ہو اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کو حاصل کرنے کے قابل بنے، روحانی زندگی میں قدم رکھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ایسی زندگی کو حاصل کرنے کا یہ تقاضا ہے کہ انسان پانچ وقت نماز پڑھنے والوں میں شامل ہو جائے اور اسلام کے دوسرے ارکان کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دے، (یعنی روزہ، زکوٰۃ اور حج کو بھی حسب توفیق ادا کرے)۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ محرمات اسلام (چوری چکاری، رشوت، چور بازاری اور زنا جیسے کبیرہ گناہوں) سے بچتا رہے تو ایسا شخص یقینی طور پر ولی اللہ ہوتا ہے۔ (جو لوگ اپنی پچھلی زندگی میں گناہوں کے مرتکب رہے تو وہ بھی توبہ کے بعد ایسے ہو جاتے ہیں جیسے ان کا کوئی گناہ ان کے اعمال نامے میں نہیں ہے)۔ اگر کوئی سرسری طور پر روحانی دنیا میں قدم رکھے تو انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد وہ روحانی دنیا میں ایک مضبوط ستون کی کیفیت حاصل کرلے گا۔ دنیائے اسلام میں بڑے بڑے بزرگ رونما ہوئے مثلاً جنیدؒ و بایزیدؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، معین الدین چشتیؒ، بہاؤالدین نقشبندؒ اور حضرت داتا گنج بخشؒ جو اس راستے سے اوپر آئے اور ان کے علاوہ ہزاروں مشائخ گزر چکے ہیں لیکن اس سے یہ مراد نہیں لینا چاہیے کہ اب ایسا کوئی بزرگ رونما نہیں ہوسکتا۔ مولانا رومؒ کا قول ہے:

تو مگو اندر جہاں یک بایزیدؒ بود و بس ہر کہ واصل شد زجاناں بایزیدؒ دیگر است

(تو یہ نہ کہہ کہ جہاں میں ایک بایزیدؒ ہے بلکہ جو بھی واصلِ حق ہو وہ دوسرا بایزیدؒ ہے) (۱۱،۱)

اس بات سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو بھی سچی نیت سے اس راہ پر چلا وہ بھی اگرچہ بایزیدؒ کی طرح نہ ہو سکے تو بھی اس کا مقام آپؒ کے قریب جا پہنچتا ہے یعنی بے مراد نہیں رہے گا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ انسان یہ سوچ کر کہ میں تو اُن بزرگوں کی طرح نہیں ہوسکتا اس لئے راہ سلوک اور طریقت کو چھوڑتا ہوں بلکہ جو شخص بھی اس راہ پر قدم رکھتا ہے تو رحمتِ الٰہی اس کی مددگار بنتی ہے اور وہ بھی کسی نہ کسی مقام پر جا پہنچتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک طالب صادق جو راہِ طریقت پر چلنا چاہے تو اس کو اس راہ کے تقریباً تمام لوازمات پر دسترس حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا جائے۔ اس کتاب میں نفس کے تمام عوارضات کی وضاحت اور ان کا علاج بذریعہ مُرشد کامل تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نفسِ انسانی کے عقل، روح اور قلب پر وارد ہونے والے اثرات اور اس کے علاوہ الانسان فی القرآن کا بھی

ذکر کیا گیا ہے۔ تزکیہ و تصفیۂ باطن، محاسبہ و مشارطہ اور معاتبۂ نفس، مراقبہ و بھوک و شکم سیری کے نفس پر اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ نفس کے خطرات اور آفات، نفس کی سرکشی اور نفس کشی کے علاوہ ہوس اور جذبات کا غلبہ اور ان کے تدارک کی بھی وضاحت اس کتاب میں کی گئی ہے۔ اس کتاب میں روحانی مقامات کو حاصل کرنے کیلئے ایک طویل مضمون بھی شامل کیا گیا ہے جس سے انسان از سرِ نو زندگی شروع کرسکتا ہے۔ اس کتاب میں حقیقتِ انسان پر بھی بحث کی گئی ہے۔ نفس کی مخالفت پر مشائخ کے اقوال، خواہشات، شہوات اور انسان پر غلبۂ شیطانیہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ مضامین کے مطالعہ سے ایک عام مسلمان کو نفس کی آفات کا علم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام آفات سے محفوظ رہنے کے اقدامات سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ہی قاری اگر کسی شیخ کامل کی صحبت بھی اختیار کرے تو نفس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے مریدوں کی غلط حرکات و سکنات سے آگاہ ہوتے تھے اور اکثر اوقات مریدوں کے سامنے حاضر ہو کر انہیں بدکاریوں سے محفوظ فرما دیتے تھے۔ سورہ یوسف کی اس آیت ''لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ''[1] (اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی روشن دلیل) میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

مذکورہ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد کی انگلی کا اشارہ دیکھا تو وہ اس کمرے سے بھاگ نکلے حالانکہ وہ کمرہ مقفل تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ کچھ مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں شیخ کامل کی روح پہنچ جاتی ہے۔ بعض اولیاءؒ سے منقول ہے کہ وہ ایک وقت میں کئی ایک جگہوں پر حاضر ہوتے ہیں اور ان سے مختلف اعمال وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مکتوبات شریف میں آپؒ نے فرمایا ہے کہ حاجت مند لوگ اولیاء اللہؒ سے زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی مصائب اور مہالک میں امداد طلب کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اولیائے کرامؒ کی صورتیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور ان کے مصائب کو دور کر دیتی ہیں۔ اس موضوع کی تفصیل جاننے کیلئے ہماری تصنیف ''رابطۂ شیخ'' کا مطالعہ فرمائیں۔

---

[1] یوسف ۱۲:۲۴۔

زیرِ نظر کتاب کا ہر گھر میں مطالعہ ضروری ہے تا کہ وہ نفس کے مہالک اور آفات کا علم حاصل کر کے اس کی ایذا رسانی سے محفوظ رہ سکیں۔ ''صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍوّٓاٰلِہٖ وَسَلَّمَ''۔

خادم الفقراء

پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ

سابق ڈائریکٹر محکمہ موسمیات لاہور

تاریخ: یکم جنوری ۲۰۰۷ء

حصّہ اول

نفس اور اس کے متعلقات

باب نمبر ا

حقیقتِ انسان

خود شناسی کی ضرورت

خود شناسی ہر طالبِ حق پر لازم ہے کیونکہ جو شخص اپنی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، وہ اپنے غیر سے بدرجہ اولیٰ ناواقف ہوگا، اور بندہ معرفتِ حق کے ساتھ مکلّف ہے۔ ظاہر ہے کہ معرفتِ حق اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک معرفتِ نفس حاصل نہ ہو۔ معرفتِ نفس کے بعد بندہ جان سکتا ہے کہ وہ خود معرضِ فنا میں ہے اور ذاتِ باری معرضِ بقا میں۔ وہ سراپا احتیاج ہے اور ذاتِ حق سراپا غنی اور اس پر نصِ قطعی وارد ہے کہ کفار اپنے نفس کے بارے میں جاہل ہیں، ارشادِ خداوندی ہے ''وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ'' [1] (اور کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے رُوگرداں ہو سوائے اس کے جس نے خود کو مبتلائے حماقت کر رکھا ہو)۔ اسلئے مشائخ میں سے کسی نے فرمایا ہے ''مَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَيْرِ اَجْهَلُ'' [2] (یعنی جو اپنے نفس کو نہیں جانتا وہ دوسروں کے بارے میں زیادہ جاہل ہوگا)۔

امام رازیؒ نے فرمایا حدیث پاک میں ہے ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' (جس نے خود کو پہچانا اس نے اللہ کو پہچان لیا) [3] البتہ بہت سے علماء کو ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس قول کو حدیث کا درجہ حاصل نہیں ہے مگر کشف المحجوب میں بھی اس کو حدیث کا ہی درجہ دیا گیا ہے۔ اس حدیث کی بہت سی تشریحات ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا) ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ'' [4] (جس نے اپنے نفس کی معرفت فنا کے حوالے

---

[1] البقرة ۲:۱۳۰　[3] التفسير الكبير، امام فخر الدین رازی، متوفی ۶۰۴ھ، جلد ۱، صفحہ ۸۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔
[2] کشف المحجوب، صفحہ ۳۳۹۔　[4] البرهان المؤيد، احمد الرفاعی، متوفی ۵۷۸ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۳۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

سے حاصل کرلی اس نے اپنے رب کی معرفت بقا کے حوالے سے بھی حاصل کرلی)۔

۲) ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالذُّلِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْعِزِّ " (جس نے اپنے نفس کی ذلت کو جان لیا اس نے اپنے رب کی عزت کو پہچان لیا)۔

۳) "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْعُبُوْدِيَّةِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالرُّبُوْبِيَّةِ "(جس نے اپنے نفس کو عبودیت کے حوالے سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو ربوبیت کے حوالے سے پہچان لیا)۔[1]

لفظ انسان کا اطلاق کس پر ہوتا ہے

ان تمام تشریحات سے مقصود انسان کی حقیقت کو پہچاننا ہے۔اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ ''لفظِ انسان'' کا اطلاق کس پر ہوسکتا ہے اور انسان کہلانے کا سزاوار کون ہے۔حقیقتِ انسان کے بارے میں محققین کے بہت سے اقوال ہیں۔ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان کی حقیقت سوائے روح کے کچھ نہیں، انسانی جسم تو صرف اس روح کی قیام گاہ ہے تا کہ وہ جسم میں رہ کر طبائع کے خلل سے محفوظ رہے۔حس وعقل روح کی صفات ہیں۔حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ یہ خیال باطل ہے اسلئے کہ اگر انسان صرف روح کا نام ہوتا تو روح نکل جانے کے بعد جسدِ انسانی پر لفظِ انسان کا اطلاق درست نہ ہوتا حالانکہ ہم مردہ جسم کو بھی ''مردہ انسان'' کہتے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ روح تو گھوڑے میں بھی ہوتی ہے۔لیکن محض روح ہونے کی بنا پر ہم گھوڑے کو انسان نہیں کہتے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ لفظِ انسان کا اطلاق انسان کی روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے اور اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو یہ اطلاق ساقط ہو جاتا ہے۔مثلاً گھوڑے پر اگر دو رنگ جمع ہو جائیں یعنی وہ سفید اور سیاہ ہو تو اسے ابلق کہتے ہیں۔اگر ایسا نہ ہو اور گھوڑا صرف سفید ہو تو اسے سفید، اور سیاہ ہو تو اسے سیاہ کہیں گے۔حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ از روئے قرآن انسان کی یہ تعریف بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا'' [2] (بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جو کہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا)۔

اس آیتِ کریمہ میں بے جان مٹی پر لفظِ انسان کا اطلاق کیا گیا ہے جبکہ نہ اس کا قلب تھا نہ روح۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان ''جُزْءٌ لَا يَتَجَزّٰى ''(جسے مزید تقسیم نہ کیا جائے) ہے اور اس کا مقام دل ہے لیکن یہ قول بھی درست نہیں کیونکہ اگر انسان کو مار ڈالیں اور اس کے سینے سے دل کو نکال لیں تب بھی لفظ انسان

---

[1] کشف المحجوب، ۳۳۹۔

[2] الدھر ۷۶:۱۔

کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

صوفیاء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان کی حقیقت اسرارِ الٰہیہ میں سے ہے انسان درحقیقت نہ تو کھانے پینے والا ہے اور نہ اس کی حقیقت (جو اسرارِ الٰہیہ میں سے ایک سر ہے) تغیر و تبدل کو قبول کرتی ہے۔ یہ جسم دراصل حقیقتِ انسانیہ کا ایک لباس ہے اور اس میں امتزاجِ طبع اور اتحادِ روح و جسد پایا جاتا ہے۔ یہ قول بھی حضرت علی ہجویریؒ کے نزدیک درست نہیں ہے اسلئے کہ جملہ عقلائے زمانہ اس امر پر متفق ہیں کہ پاگل، فاسق اور کافر بھی انسان ہیں حالانکہ ان کے وجود میں اسرارِ الٰہیہ میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کہتے ہیں کہ انسان ''حی'' ہے اور اس کے اندر اتنی صفات محمودہ ہیں کہ موت بھی ان صفات کی موجودگی کے باعث اسمِ انسان کا اطلاق اس پر سے نہیں اٹھا سکتی۔

سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کو یوں بیان کیا ہے ''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝''[1] (اور بے شک ہم نے انسان کی تخلیق (کی ابتداء) مٹی (کے کیمیائی اجزاء) کے خلاصہ سے فرمائی، پھر اسے نطفہ (تولیدی قطرہ) بنا کر ایک مضبوط جگہ (رحم مادر) میں رکھا، پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلق وجود بنا دیا، پھر ہم نے اس معلق وجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے، پھر ہم نے اس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت (اور پٹھے) چڑھائے، پھر ہم نے اسے تخلیق کی دوسری صورت میں (بدل کر تدریجاً) نشوونما دی، پھر (اس) اللہ نے (اسے) بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہے)۔

لفظِ انسان کا اطلاق ان مذکورہ تمام چیزوں کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ جو آیت مذکورہ میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ انسان صورت، اعضاء، طبائع اور مزاجوں سے مرکب ہے اور مختلف اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

انسان پورے عالم کا نمائندہ ہے

انسان فی نفسہٖ نمونۂ عالم ہے اور عالم دو جہاں کا نام ہے۔ اور دونوں جہان کے آثار و علامات انسان کے وجود میں پائے جاتے ہیں۔ اس مادی جہان کے آثار تو پانی، آگ، مٹی اور ہوا کی صورت میں ہیں اور ان کی ترکیب خون، بلغم، سودا اور صفرا ہے۔ اس جہان کے آثار بہشت، دوزخ اور عرصاتِ محشر ہیں۔ اس

[1] المومنون ۲۳: ۱۲-۱۴۔

لحاظ سے روح بمنزلہ بہشت کے ہے لطائف کے اعتبار سے، نفس بمنزلہ دوزخ کے ہے اپنی آفات و وحشت کے اعتبار سے اور جسدِ انسانی بمنزلہ عرصۂ محشر کے ہے اور اس عرصۂ محشر (جسم انسانی) میں ظہورِ جمال بھی دو صورتوں میں ہوگا یا بصورتِ انس یا بصورتِ قہر۔ پس بہشت رضائے دوست ہے اور دوزخ علامتِ قہر۔ اسی طرح مومن کی روح اپنی روح سے معرفت حاصل کرتی ہے اور اپنے نفس سے حجاب و ضلالت۔ جب تک دنیوی زندگی میں مومن اپنے وجود میں پوشیدہ ہے دوزخ سے خلاصی نہیں حاصل کرے گا نہ بہشت میں داخل ہو سکتا ہے نہ اسے حقیقتِ دیدارِ الٰہی و حقیقتِ محبت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بندہ دنیا میں جب تک اپنے نفس کی گرفت سے آزاد نہیں ہوتا تحقیقِ ارادت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک تحقیقِ ارادت نہ ہو تو قربِ خداوندی اور معرفتِ ذات اسے میسر نہیں آ سکتی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جو دنیا میں معرفت حاصل کرلے گا وہ لازماً غیر اللہ سے اعراض کرلے گا، جادۂ شریعت پر قائم ہوگا اور قیامت کے دن اسے پل صراط پر سے گزرنا ہوگا، نہ جہنم کو دیکھنا ہوگا۔ مومن کی روح چونکہ نمونہ بہشت ہے اسلئے کل قیامت کے دن بہشت اسے اپنی طرف بلائے گی اور نفس چونکہ نمونہ دوزخ ہے اسلئے جس نے دُنیوی زندگی میں اس سے رستگاری حاصل نہ کی ہوگی قیامت کے دن جہنم اسے بلائے گی۔ مومن کا قائد و مدبر عقل ہے اور اپنے عین کے ساتھ قائم ہے۔ چنانچہ روح کے ساتھ عقل، نفس کے ساتھ ہوا اور جسم کے ساتھ حس قائم ہے۔ فاسق کا قائد ہوا و ہوس ہے۔ لہٰذا طالبِ حق کیلئے ضروری ہے کہ مسلسل و متواتر نفس کی مخالفت میں لگا رہے اور اس طرح اپنی روح و عقل کی مدد کرے اسلئے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ہیں۔

انسان کی پیدائش کا مقصد

انسان مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ اس کی صورت کا تعلق عالمِ محسوس سے ہے اور اس کی روح کا تعلق عالمِ غیب اور ملکوت سے ہے۔ صورت و روح کے علاوہ اس میں ایک پوشیدہ قوت ہے جو کہ انوارِ ربانی کے فیض کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ اچھی تربیت سے وہ عالمِ محسوس سے ترقی کرکے عالمِ غیب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور رسالت مآب ﷺ کی سچی پیروی سے اس کیلئے عالمِ جبروت و ملکوت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ وہ نورِ الٰہی جو اس اطاعت اور پیروی کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اس سے وہ جمال و جلال کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انسان کو جو لوگ صرف خاک کا پُتلا سمجھتے ہیں۔ کاش اس کی حقیقت پر غور کریں تا کہ ان میں اپنے بلند مقام پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو۔ یہ وہ ذرّہ ہے جس کے سامنے آسمان کی رفعتیں سرنگوں ہیں اور یہ وہ قطرہ ہے جس میں سمندروں کی گہرائیاں ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی تخلیق اسلئے نہیں کی گئی کہ وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر کے بزمِ عالم سے رخصت ہو جائے بلکہ اس کی زندگی کا سفینہ طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے بنایا گیا ہے۔ خطرات و مصائب سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب اس کا حمل رحمِ مادر میں قرار پکڑتا ہے، تو اس وقت سے ہی طرح طرح کے خطرات اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں اور ہر لحظہ اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو بیماریاں، ناکامیاں، محرومیاں، مخالفین کی مخالفتیں اور نفس اور شیطان کی ریشہ دوانیاں قدم قدم پر اس راستے پر سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ اور اس کی زندگی کے کارواں کو انہی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گویا انسان کی زندگی کا مقصد مصیبتوں اور تکالیف سے نبرد آزما ہونا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس میں مضمر امکانی قوتیں اور صلاحیتیں کبھی نشو ونما نہ پا سکیں اور یہ ایک قطرہ کبھی بھی دُرِ شہوار نہ بن سکے۔

اس کے باوجود کہ مصائب و آلام نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اس کے گھمنڈ کا یہ عالم ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس سے بالاتر کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس سے باز پرس کر سکے یا جس کے سامنے یہ سر جھکانے پر مجبور ہو۔ یہ اس کی کم فہمی ہے اس کی بے بسی کی تو یہ کیفیت ہے کہ حادثات کا ایک ریلا اس کا کچومر نکال دے اور اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔

عقل اور روح کا تعلق

روح کا تعلق عقل سے ہے اس لئے کچھ اس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ عقل روحِ علوی کا جوہر ہے وہی اس کی راہنما اور ترجمان ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عقل کا محل دماغ ہے مگر حقیقتاً عقل کو ایک جگہ قرار نہیں۔ جب عقل نافرمانی کی تدبیر کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس کا مقام دماغ ہوتا ہے۔ اور جب عقل فرمان پذیر اور نیکوکاری کی طرف رخ کرے تو اس کا مقام قلب ہوتا ہے۔

حس اسیر عقل باشد اے فلاں　　عقل اسیر روح باشد ہم بداں

(اے شخص حواس عقل کے پابند ہیں۔ عقل روح کی پابند ہے، یہ بھی سمجھ لو)

اس سے مراد یہ ہے کہ نفس عقل کی اور عقل روح کی اسیر ہے۔

دست بستہ عقل راجاں باز کرد　　کارہائے بستہ راہم ساز کرد

(روح نے جکڑی ہوئی عقل کو آزاد کر دیا، الجھے ہوئے کاموں کو سلجھا دیا)

دست بستہ عقل کو روح ہی آزادی بخشتی ہے اور اس کی رکاوٹیں دور کرتی ہے۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ میں نے ۷۰ کتابوں میں پڑھا ہے کہ اب تک جتنی عقل عالم کو عطا کی گئی وہ رسول اللہ ﷺ کی

عقل کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تمام عالَم کی ہواؤں کے مقابل میں ایک ذرہ ہو۔

کبھی نفس اپنی فطری خواہش کی وجہ سے عالم ارضی کی طرف متوجہ ہوگا اور چونکہ روحِ حیوانی اس کی ہم جنس ہے، نفس کو عالم سفلی کی طرف کھینچتی ہے اور ادھر اس کا رجحان غالب ہوتا ہے۔ اس حالت میں نفس کی توجہ عالم امر کی طرف ہو جاتی ہے۔ "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ" [1] (اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان (آیتوں کے علم وعمل) کے ذریعے بلند فرما دیتے لیکن وہ (خود) زمینی دنیا کی (پستی کی) طرف راغب ہو گیا اور اپنی خواہش کا پیرو بن گیا۔) اسلئے بزرگوں نے کہا کہ:

۱) نفس سے تمام مذموم افعال اور اخلاق کا صدور ہوتا ہے اور اس کا علاج مجاہدہ اور ریاضت شرعیہ سے ہو سکتا ہے۔ اخلاقِ حمیدہ کا صدور روح سے ہے جس کا مقام قلب ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ کی اطاعت وہی کرتا ہے جو عقل سے بہرہ مند ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایک شخص مسجد کی طرف جاتا ہے اور وہاں نماز ادا کرتا ہے مگر اس کی نماز مچھر کے بازو کے برابر نہیں ہوتی۔ دوسرا شخص مسجد میں داخل ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز احد کے پہاڑ کے برابر ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس سے زیادہ عقلمند ہو۔ آپ ﷺ نے عقلمندی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ عقلمند وہ ہے جو لوگوں میں زیادہ حرام کاموں سے بچے اور نیک کاموں کا زیادہ آرزومند ہو خواہ عمل اور نوافل میں ان سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا عقل کی تقسیم لوگوں میں بہت مختلف ہے۔ نیکیاں لوگوں کی برابر ہو سکتی ہیں مگر عقل میں اتنا فرق ہوتا ہے جیسے کوہِ احد اور ذرّہ میں: "لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِى الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝" [2] (اے اللہ کے بندے!) کافروں کا شہروں میں (عیش وعشرت کے ساتھ) گھومنا پھرنا تجھے کسی دھوکہ میں نہ ڈال دے، یہ تھوڑی سی (چند دنوں کی) متاع ہے، پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے)۔

سالک کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اپنے دل کی اچھی طرح نگہبانی کرے یعنی اپنے دل میں کسی اور کو جگہ نہ دے۔ اور نگاہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رکھے۔ ایسا شخص اپنے احوال میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتا رہے گا۔ جس نے اس میں تغافل کیا، وصل کے ابتدائی مدارج تک بھی نہیں پہنچ سکتا چہ جائکہ قربت کے حقائق کو پالے۔

حضرت جریریؒ فرماتے تھے کہ جس شخص نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تقویٰ اور مراقبہ کو مضبوط نہیں کیا۔ وہ شخص کشف اور مشاہدہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو نگاہ میں رکھتا ہے

[1] الاعراف ۷:۱۷۶۔ [2] آل عمران ۳:۱۹۶، ۱۹۷۔

اللہ تعالیٰ اس کے اعضا کو گناہ سے بچا دے گا۔ حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں کہ مراقبہ کی علامت یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کو پسند کرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ ان چیزوں کی تعظیم کرے جن کی اللہ تعالیٰ نے تعظیم کی اور ان کو حقیر جانے جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حقیر جانا۔

مقام آدم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے زیادہ شرف عطا فرمایا اور اس کو خالصتاً اپنے ساتھ محبت کرنے کیلئے پیدا فرمایا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ میرا دل اللہ تعالیٰ کی تنہائیوں کو دیکھ کر جلتا ہے کیونکہ پوری کائنات میں اس جیسا اور اس کا ہم جنس کوئی نہیں، لہٰذا میں انسان کی حیثیت سے اس کی بزم آرائی یعنی دل لگی کا سامان مہیا کر رہا ہوں۔ درجِ ذیل شعر کا ترجمہ بھی یہی ہے ۔

مرا دل سوخت بر تنہائی اُو کنم سامانِ بزم آرائی اُو

(ز،ع:٥٦٦)

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت کو اس نہج پر بنایا ہے کہ وہ خدا سے محبت کے تعلقات قائم رکھ سکتا ہے۔ خدا جیسی بلند ہستی سے محبت کے تعلقات کو اس قدر کمزور اور پست فطرت انسان استوار کرے تو بظاہر یہ بعید اَز قیاس معلوم ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لائق بنایا ہے۔ انسان کو اُسکی محبت کیلئے کیوں چنا گیا اور اس کو اپنی دوستی کے لائق کس طرح بنایا گیا؟ اس کا ماجرا ہم اپنی تصنیف ''حضورِ قلب'' میں بیان کر چکے ہیں۔ تخلیقِ آدم علیہ السلام کن مراحل میں اور کس طرح ہوئی اس کی روئیداد ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں بیان کی جا چکی ہے۔ انسان کی تخلیق کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی محبت میں اپنی زندگی بسر کرے یہاں تک کہ اس دنیا میں اس کو بھیجنے کا مقصود اور نصب العین اللہ تعالیٰ کی اطاعت، محبت اور تابعداری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک طرف انسان کے ہاتھ میں پوری کائنات کی باگ دوڑ نیابت کی صورت میں تھما دی گئی اور دوسری طرف اسے ایسے بے شمار بشری تقاضوں میں جکڑ دیا گیا جو اس کے امورِ نیابت کی انجام دہی میں سدِّ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں اور مصیبتیں پیدا کی گئی ہیں یہ اس کیلئے آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ انسان کہاں تک ذاتِ حق کی وفاداری میں استوار اور قائم رہتا ہے اور پیدا کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ انسانوں میں سے کون لوگ اللہ تعالیٰ کی قربت اور نیابت کا حق ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے'' اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ''(جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں

آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے)۔[1]

حضرت انسان کے دیگر مخلوقات سے اشرف واعلیٰ ہونے کے بے شمار اسباب میں سے ایک نہایت خوبصورت، ممتاز و منفرد سبب اس کو اچھے اور بُرے ہر دو قسم کے کاموں پر قدرت کا حاصل ہونا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے سامنے بدی کو دلکش اور آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کیا جاتا ہے اور اس کی فطرت میں ایسی کمزوریاں ودیعت کر دی گئی ہیں جو اسے برائی کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہیں لیکن واضح رہے کہ منشاء ایزدی یہ ہے کہ انسان برائی کی دلفریبیوں سے محفوظ و مامون رہ کر اپنے رب کی رضا و خوشنودی کو تلاش کرتا رہے تاکہ وہ اس امتحان میں کامیاب و شادکام ہونے کے بعد خود کو قربِ خداوندی اور وصلِ الٰہی کی منزلوں سے ہمکنار کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے انسان کا صلہ یہ رکھا کہ اس کو پورے عالم میں تصرف کی انتہائی قوتیں عطا کر دی جاتی ہیں یہاں تک کہ تسخیر کائنات کا ملکہ بھی اسے عطا کر دیا جاتا ہے۔

اگر یہ اچھی یا بُری صفات انسان میں نہ رکھی جاتیں تو انسان کی تخلیق کا مقصد ہرگز پورا نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے جس چیز کو بھی اس نے تخلیق فرمایا اس میں اس کے حُسنِ تخلیق کے جوہر نظر آتے ہیں۔ اگر انسان میں برائیوں کا مجموعہ دیکھا جاتا ہے تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور ان برائیوں سے بچنا اور خوبیوں کا پایا جانا انسان کو مکرم اور مشرف بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ برائیاں جو انسان میں پائی جاتی ہیں وہ اسلیئے ہیں کہ اگر وہ ان سے بچتا ہوا زندگی کے دھاروں سے گزر جائے تو یہی اس کے درجات کی بلندی کا باعث بن جائیں گی، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی برائیاں اور خوبیاں دونوں حکمت پر مبنی ہیں اور ان برائیوں سے بچنا اس کی خوبیوں کا سبب بنتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں فرمایا ہے کہ ''اگر انسان میں فساد کا مادہ رکھا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کو علم و آگہی کا شرف بھی عطا فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جمال و کمال کے ساتھ نقص بھی ہونا چاہیے۔ حسن و جمال کیلئے نقص کا آئینہ درکار ہے اور آئینہ شے کے مقابل ہوتا ہے لہٰذا خیر کیلئے شر اور کمال کیلئے نقص کا آئینہ ضروری ہے۔ ہر وہ شے جس میں نقص اور شرارت زیادہ ہوگی وہ خیر اور کمال کی نمائندگی بھی زیادہ کرے گی۔ فرماتے ہیں کہ اس طرح ذم نے مدح کے معنٰی پیدا کر دیئے ہیں اور (انسان کا) یہ شر خیر و کمال کا محمل بن گیا۔ انسان میں چونکہ شر کا بھی مادہ رکھا گیا ہے اسلیئے بندے کو دیا گیا مقام عبدیت تمام مقامات سے بلند ہے کیونکہ یہ معنٰی عبدیت میں اتم اور اکمل درجے کا پایا جاتا ہے اور یہ مقام محبوبوں کیلئے خاص ہے''۔

---

[1] الملک ۶۷:۳۔

اگر انسان کو فساد اور خونریزی کے ساتھ علم وآگہی نہ دی جاتی تو وہ صرف فساد اور ظلم ہی کا منبع قرار دیا جاتا لیکن منشاءِ الٰہی یہ تھا کہ انسان جنگ وجدل کے باوجود شر کی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوگا اور ظلم واستحصال کے خاتمے کیلئے انقلابی جدوجہد کریگا اور اعلائے کلمۂ حق کیلئے جان کی بازی بھی لگادے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ جو کفر میں زیادہ ہوتا ہے وہ اسلام میں بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ زمانۂ کفر میں رسالت مآب ﷺ کی سخت مخالفت پر آمادہ تھے لیکن آپ نے اسلام قبول کرلیا تو ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ'' کے مصداق بن گئے اور ہر نازیبا حرکت کرنے والے کافر کی گردن اڑا دینے کیلئے تلوار کھینچ لیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خونریزی اور جنگ وجدل کسی قوم میں موجود نہ ہو تو اس قوم کی شخصیت دائمی طور پر ناقص رہ جاتی ہے اور پسماندہ قوموں میں اس کا شمار کیا جانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کو اسلام میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جب عرب قوم میں شر اور خیر میں تمیز کرنے کا شعور پیدا ہوا تو وہ دنیا کی بہترین قوم بن گئی۔ اسی طاقت کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

(ب،ج:۳۶۲)

مذکورہ بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان میں خیر اور شر دونوں قوتوں کا موجود ہونا ہی اس کی بزرگی اور شرف کا ضامن ہے۔ انسان کی بُرائیوں سے بچنے کی صفت انسان کو بلندیوں تک لے اُڑتی ہے اگر وہ ان بُرائیوں کو عبور کرتا ہوا نکل جائے۔ چنانچہ انسان کی فطرت میں بُرائیوں کا ودیعت ہونا انسان کا اچھائیوں کی منزل تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ اس میں برائی کا کوئی پہلو نہیں سوائے اس کے کہ جو قوم ان برائیوں کو ترک نہ کرنے پر آمادہ ہو وہ ان برائیوں کی زد میں آکر تباہ ہوجاتی ہے۔ بُرائی اسی معنٰی میں بُرائی ہے جب انسان اس پر قائم رہے اور اس کے ترک کا ارادہ نہ کرے۔

فطرت اور جبلّت میں فرق

جبلّت: جبلت کی تعریف کرتے ہوئے ابو القاسم حسین بن محمدؒ لکھتے ہیں: اس کے معنٰی طبیعت، سرشت، خلقت، خاصیتِ پیدائشی، خمیر، قدرتی، خلقی، حقیقی اور اصلی کے ہیں۔ یہ وہ احوال ہیں جس پر کسی چیز کو پیدا کیا گیا ہو۔ اس سے مراد وہ راستے ہیں جن پر چلنے کیلئے کوئی چیز فطرتاً پابند ہو۔ جیسے فرمایا ''قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ'' [1] (فرما دیجیے: ہر کوئی (اپنے) اپنے طریقہ وفطرت پر عمل پیرا ہے)۔ اس میں اس بات کی مثال ہے کہ فلاں شخص پہاڑ کی طرح غلیظ الجسم ہے) [2]

---

[1] الاسرائیل ۱۷:۸۴۔　[2] المفردات، الحسین بن محمد، متوفی ۵۰۲ھ، جلد ا، صفحہ ۸۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

فطرت: فطرت کے معنیٰ تخلیق کے ہیں جیسے بکری کا دودھ دوہنا، آٹا گوندھ کر روٹی پکانا، "فَطَرَ اللّٰهُ الْخَلْقَ" کے معنیٰ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اس طرح کی کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے۔ ارشادِ ربانی ہے "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا" [1] (مضبوطی سے پکڑلو) اللہ تعالیٰ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے) [2]

اس میں معرفت کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کو عطا کی گئی۔ فطرت اللہ تعالیٰ سے معرفتِ الٰہی کی استعداد ہے جو انسان کی جبلت میں پائی جاتی ہے۔ فطرت سے مراد دینِ اسلام ہے جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَامِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا عَلَی الْفِطْرَةِ" [3] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے)۔

انسان دو تقاضوں سے مرکب ہے۔ ایک فطری اور دوسرا جبلی۔ جبلی تقاضے میں ہم با اختیار ہیں اور فطری تقاضے میں کسی حد تک با اختیار ہیں مگر اس تقاضے کو کلیتاً رد کرنے پر اختیار نہیں رکھتے۔ ماں کی بیٹے سے محبت جبلی ہے۔ اگر یہ فطری ہوتی تو بچے کے مرجانے سے وہ بھی مرجاتی یا حواس کھو بیٹھتی۔ بھوک اور نیند وغیرہ فطری تقاضے ہیں۔ بھوک اور نیند میں کمی بیشی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کبھی نہ کھائے یا کبھی نہ سوئے۔ ساری عمر جاگنا یا سونا ممکن نہیں۔ ان دونوں کا تعلق خیالات سے رہتا ہے۔ جب تک تقاضا خیال کی صورت میں نہ ہوگا ہم اس سے بے خبر رہیں گے۔ ہمارے اوپر حواس (دیکھنا، سونگھنا، چکھنا، محسوس کرنا اور سماعت) کا انکشاف نہ ہوگا۔

تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کے دلائل

۱۔ تسخیر کائنات کا ملکہ مسلمانوں میں برگزیدہ انسانوں کیلئے یہ بات قرآن میں آئی ہے کہ "وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ" [4] (اور اس نے مسخر کردیا تمہارے لیئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے)۔

لغت کی کتاب الصحاح للجوہری میں "سَخَّرَهٗ تَسْخِیْرًا" کے معنیٰ "کَلَّفَهٗ عَمَلاً بِلَااُجْرَةٍ" کے ہیں۔ یعنی کسی کو اجرت اور معاوضہ دیئے بغیر کام کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ [5] علامہ ابن منظورؒ نے بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندروں کو انسان کی خدمت کیلئے مقرر کیا ہے۔ یہی خدمت دنیا کی ہر شئے انسان کیلئے انجام

۱۔ الروم ۳۰:۳۰۔ ۲۔ المفردات، جلد ۱، صفحہ ۱۱۲۳۔

۳۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، حدیث ۱۲۹۳، جلد ۱، صفحہ ۴۵۶، دار الفکر، بیروت۔

۴۔ الجاثیہ ۴۵:۱۳۔ ۵۔ مختار الصحاح، محمد بن ابی بکر الرازی، متوفی ۷۲۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۳۲۶، مکتبۃ لبنان، بیروت۔

دے رہی ہے۔ گویا جہاں کی ہر چیز انسان کی خدمت پر مامور ہے۔ [1] علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے   جہاں ہے ترے لئے تو نہیں جہاں کے لیے

(ب ج: ۳۴)

۲۔ مسجودِ ملائکہ کا شرف: اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ پر واضح فضیلت دی کہ آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائکہ بنایا۔ مسجود لامحالہ ساجد سے افضل ہوتا ہے۔ قرآن کی آیات اور احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کو انسان کا خادم بنایا، نیز فرشتوں کو مقامِ عبادت سے آگے ترقی نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے کچھ کو اپنا دوست اور محبوب بنایا، کسی کو روح اللہ علیہ السلام، کسی کو کلیم اللہ علیہ السلام، کسی کو ذبیح اللہ علیہ السلام اور کسی کو خلیل اللہ علیہ السلام کہہ کر پکارا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی دوستی کے لائق سمجھا: اللہ تعالیٰ نے کم وبیش اٹھارہ ہزار مخلوقات میں سے فقط انسان کی طرف اپنے رسول، کتابیں اور صحیفے بھیجے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی نگاہوں میں اس کی محبت کے قابل ہیں ورنہ وہ یہ کلام اور رسول نہ بھیجتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے لاکھوں کو اپنا ولی (دوست) بنایا اور یہ سب شرف اپنی مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں بخشا۔

۴۔ انسان کے دل کو لامکانیت کا درجہ بخشا گیا: ہماری تصنیف ''حضورِ قلب'' کے مطالعہ سے اس بات کی مکمل تفصیل واضح ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو کیا کیا خصائص عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا، اس کے دل کو لامکانیت کا درجہ عطا فرمایا۔

۵۔ مومن کی جان ومال کی حرمت کعبہ سے بھی زیادہ ہے: انسان کامل اللہ تعالیٰ کا مظہر اتم ہے اور کعبہ بھی اللہ تعالیٰ کا مظہر ہے، لیکن انسان کامل کا مرتبہ خانۂ کعبہ سے بہت بلند ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانۂ کعبہ کو مخاطب کر کے فرمایا ''ایک مومن کی جان ومال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تجھ سے زیادہ ہے''۔ [2]

فرشتوں پر انسان کی فضیلت

اکابرینِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کا وہ حصہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسدِ مبارک سے مس ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہے وہ عرشِ اعظم سے بھی رتبے میں بلندتر ہے۔ یہ امر بھی متفقہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ انسان کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ خاص فرشتوں پر خاص مسلمانوں کو اور عام فرشتوں پر عام مسلمانوں کو فضیلت حاصل ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام پر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

---

[1] لسان العرب، علامہ ابن منظور، متوفی ۷۱۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۳۲۶، دار صادر، بیروت۔

[2] سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، متوفی ۲۷۵ھ، حدیث ۳۹۳۲، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹۷، بیروت۔

فضیلت حاصل ہے اور قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام رساں اور دربان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جز ایں چیزے نہ دانم زجبریلؑ   کہ او یک جوہر از آئینۂ تست
(ار:۵۴)

(میں جبرائیل علیہ السلام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نوریا آئینے کے ہی ایک جوہر ہیں)

نہ خاک من غبار رھگذارے   نہ در خاکم دل بے اختیارے
(نہ میری خاک راہ گزار ہے اور نہ ہی میرے بدن میں بے اختیار دل ہے)

بجبریلِ امیں ھم داستانم   رقیب و قاصد و درباں نہ دانم
(زع:۱۳۶)

(میں تو جبرائیل علیہ السلام کا ہم داستان ہوں، میں اسے رقیب اور قاصد اور نہ ہی کوئی دربان سمجھتا ہوں)

حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے پیغمبر ہیں کہ ان میں ہزاروں جبرائیل علیہ السلام جیسے نوری فرشتوں کی روحانیت موجود ہے۔ خلیفہ عبدالحکیمؒ یہ شعر فرماتے ہیں۔

آنسے ھزاراں جبرائیلؑ اندر بشر   بھرِحق سوئے غریباں یک نظر
(یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی بشری ذات مبارکہ میں ہزاروں جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ خدا کیلئے ہم غریبوں کی طرف ایک نظر فرمائیں)۔

اگر کسی کو زیادہ تفصیل حاصل کرنے کا ذوق ہو تو ہماری تصنیف ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال'' میں ملکیت اور بشریت کے باب میں مقام آدم کا مطالعہ فرمائیں۔ اس تحریر سے معلوم ہوگا کہ فرشتوں سے بشریت کا مقام بہت بلند ہے۔ انسان کو مقامِ عاشقی میسر ہے جس سے فرشتے محروم ہیں کیونکہ وہ صرف عبادت کیلئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ انسان کی پیدائش کا مقصد فرشتوں کی تخلیق سے عظیم تر ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر   زنوری سجدہ می خواھی زخاکی بیش زاں خواھی
(بندگی کا مقام اور ہے عاشقی کا کچھ اور، اللہ تعالیٰ نوری مخلوق سے صرف سجدہ چاہتا ہے اور خاکی سے اس سے کچھ زیادہ چاہتا ہے)
(زع:۴۳)

قصور وار غریب الدیار ہوں، لیکن   ترا خرابہ فرشتے نہ کرسکے آباد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں   انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد
(ب ج:۳۰۰)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ محض عبادت کا شرف حاصل کر لینا ہی کوئی خاص خوبی کی بات نہیں جب تک مقاصد عبادات پر عبور حاصل نہ ہو جائے۔ انسان کو عبادت کے علاوہ ذوق و شوق اور اضطراب کی عظیم صفات بھی میسر ہیں۔ انسانی عقل اور گرفت میں تمام مخلوق اسیر ہے۔

پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا　　اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

(ب ج:۳۸۷)

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں　　میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(ب ج:۲۹۷)

مقامِ آدم کو بیان کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی خلوت میں جبرائیل علیہ السلام کا بھی گزر نہیں (نیست رہ جبریل را درخلوتش) (جاوید نامہ:۶۸)۔ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کو گو سجدہ کرنے کی استطاعت بخشی گئی ہے لیکن ان کو وہ سوز و گداز حاصل نہیں جو انسان کو بخشا گیا ہے۔ ویسے تو دنیا کی ہر شے عبادت کرتی ہے جیسے کہ فرمایا "کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ"[1] (ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور اپنی تسبیح کو) لیکن انسان کو جو دردِ دل کی دولت ملی ہے وہ کسی کو نہیں دی گئی۔ جذب و مستی صرف انسان کا ہی حصہ ہے۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی　　تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(ب ج:۳۱۵)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام کو بہشت میں عوالم بالا میں آنے جانے کے باعث بلندیٔ بام (اونچی چھت پر جانے) کا شرف حاصل ہے لیکن آدم خاکی جیسا شرف اس کو کب حاصل ہے۔ سوز و ساز میں غرق رہنا، ھَا وَھُوْ کے نعرے لگانا اور نت نئی جستجو کے درد سے مجروح رہنا اسے کب میسر ہے۔ علامہ اقبالؒ اللہ تعالیٰ کے سامنے عرض کرتے ہیں کہ تیری راہ کی تڑپ، لگن اور اضطراب اپنے بندۂ بیچارہ یعنی انسان سے پوچھ جس کو آرزو سے دن رات پالا پڑتا ہے۔ علامہؒ نے فرمایا کہ یہ سوز و تڑپ، اضطراب اور بے بسی کے عالم کا کسی نوری مخلوق کو ملنا میسر نہیں جب کہ اس بیچارے انسان کو ہر وقت مشکلات میں جلنا اور تڑپنا ہوتا ہے۔ اس دنیا کے ہر معاملے میں صحیح راستہ اختیار کرنے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور عالم غیب کی پہچان کیلئے انسان

---

[1] النور ۲۴:۴۱۔

کو دلائل کا محتاج ہونا پڑتا ہے مگر یہ کام جبرائیل علیہ السلام کی فکر سے بہت بلند و بالا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ بندے اور خدا کے درمیان خانہ کعبہ کے متعلق کیا راز سربستہ ہیں۔

باوج مشت غبارے کجا رسد جبریلؑ بلند نامی او از بلندی بام است

(جبرائیل امین علیہ السلام اس مشت خاک کی عظمت کو کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ان کی بلند نامی تو بلندئ بام کے سبب ہے) (زع:۶۶)

نداند جبریلؑ ایں ھا و ھو را کہ نشناسد مقام جستجو را!

(جبرائیل علیہ السلام اس ہائے وھو سے واقف نہیں، کیونکہ وہ مقام جستجو کے (فراق) سے واقف نہیں)

بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش کہ داند نیش و نوش آرزو را!

(اے اللہ! اپنے اس بندۂ ناچیز سے پوچھ، کہ وہ آرزو کی زہر اور تریاق سے واقف ہے) (ارح:۱۴)

نہ جبریلےؑ، نہ فردوسے، نہ حورے نے خداوندے کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزو مندے!

(نہ جبرائیل علیہ السلام نہ جنت نہ حور اور نہ ہی خدا کو ان مشکلات میں جلنا میسر ہے مگر انسان ہی ان سب کو جانتا ہے جو اپنی جان آرزو مند سے جل رہا ہے) (ج ن:۱۵۲)

جہاں پیدا و محتاج دلیلے نمی آید بفکرِ جبرئیلےؑ

(زع:۵۶۴)

(جہاں اگرچہ ظاہر ہے مگر دلیل کا پھر بھی محتاج ہے اور دلیل کا یہ سلسلہ فکرِ جبرائیل علیہ السلام میں بھی نہیں سماتا)

علامہ اقبالؒ نے مختلف مقامات پر انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے کمالات کا ذکر کیا ہے اور اس کو اس کے اختیارات اور کمالات سے آگاہ کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کا منشا صرف یہی ہے کہ وہ مسلمان کو اس کی ذات میں پوشیدہ کمالات اور تصرفات سے آگہی فراہم کریں۔ ایک جگہ فرمایا۔

ترا جوہر ہے نُوری 'پاک ہے تُو فروغ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تو!

(ب ج:۳۷۶)

علامہ اقبالؒ مسلمانوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس قدر بلند صلاحیتیں عطا فرمائیں لیکن تم کو کیا ہو گیا ہے کہ دنیا میں کسی معرکہ آرائی کے قابل نہیں رہے۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک!
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک!
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

(ا۔ح:۶۶۹)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں سے تسخیرِ خلق کی ایک خوبی بھی ہے۔ انسان کو جو عشق اور جنوں کی طاقت دی گئی ہے اس سے تو وہ جبرائیل علیہ السلام کو بھی شکار کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو شوق و ذوق اور محبت کی کمند سے کھینچ کر اپنے سامنے لا سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک انسان کو وہ قوت حاصل ہے کہ جبرائیل علیہ السلام جو نوری مخلوق میں سب سے زیادہ سر بلند ہیں، کو اپنی انگلی پر سدھائی ہوئی چڑیا کی طرح بٹھا سکتے ہیں اور اس کے پروں کو جلے ہوئے بال سے بھی باندھ سکتے ہیں۔ انسان تمام اسرار خدائی کو سمجھنے والا ہے اور اس کو اس قدر بلند فکری کی قوت عطا کی گئی ہے کہ ہر کمال کے مقام پر اپنے فکر کے زینے سے پہنچ سکتا ہے اور اس اعتبار سے اس کی آنکھ جبرائیل امین علیہ السلام سے بھی زیادہ بیدار ہے کیونکہ ان کو اُن تمام باتوں کی خبر تک نہیں جو انسان کو اس کی اپنی حیثیت کی وجہ سے حاصل ہیں ۔

در دشتِ جنونِ من جبریلؑ زبوں صیدے ‏ ‏ ‏ ‏ یزداں بکمند آور اے همت مردانه

(میرے جنون کے صحرا میں جبرائیل علیہ السلام ایک معمولی شکار ہیں۔ اگر ہمت مردانہ ہے تو اپنی قوت سے اللہ پر کمند ڈال) (پ م:۱۶۶)

می تواں جبریلؑ را گنجشک دست آموز کرد ‏ ‏ ‏ ‏ شهپرش باموئے آتش دیده بستن می تواں

(پ م:۱۶۰)

(جبرائیل علیہ السلام کو ہاتھ پر سدھائی ہوئی چڑیا بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے شہپر کو جلے ہوئے بال سے باندھا جا سکتا ہے)

راه داں اندیشهٔ اُو بے دلیل ‏ ‏ ‏ ‏ چشم او بیدار تر از جبریلؑ

(ج ن:۱۵)

(مسلمان کی فکر بغیر کسی کی مدد کے صحیح راہ معلوم کر لے گی اور اس کی آنکھ جبرائیل امیں علیہ السلام سے بھی زیادہ بیدار ہو گی)

علامہؒ لکھتے ہیں کہ خانہ کعبہ محض قلب و نظر کیلئے قبلہ کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس میں بہت سے اسرار و رموز موجود ہیں جن کو محض خدا اور بندۂ مومن ہی سمجھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ انسانوں کے کچھ اعمال (اور بالخصوص نیتِ قلب مومن) کو فرشتے بھی نہیں جان سکتے، لہٰذا ایسے اعمال کو لکھنے پر وہ قادر نہیں۔ اسی طرح بندۂ مومن اور بیت اللہ کے درمیان کچھ اسرار ایسے ہیں جس سے حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی آگاہ نہیں (دیکھئے راقم الحروف کی کتاب "حُسنِ نماز" میں باب معرفتِ کعبہ)۔ علامہؒ فرماتے ہیں۔

حرم جز قبلهٔ قلب و نظر نیست ‏ ‏ ‏ ‏ طواف اُو طواف بام و در نیست

(حرم قلب و نظر کے قبلے کے سوا کچھ نہیں، اس کا طواف چھت اور دروازے کا طواف نہیں)

میانِ ما و بیت الله رمزیست ‏ ‏ ‏ ‏ که جبریلؑ امیں را هم خبر نیست

(ہمارے اور بیت اللہ میں ایسی راز کی بات ہے کہ جس کی خبر جبرائیل امیں ؑ کو بھی نہیں) (ا ح: ۱۰۴)

درج ذیل اشعار میں علامہ اقبالؒ اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ جب قلبِ انسان میں اللہ تعالیٰ بھی موجود ہے تو اس میں آفاق اور انفس کی تمام اشیاء یعنی بہشت و حور اور جبرائیل امین ؑ بھی موجود ہیں۔ مگر عام آدمی کی نگاہ اس کا ملاحظہ نہیں کر پاتی۔ انسان وہ مٹھی بھر خاک ہے جس کے جنوں کے سامنے تمام عوالم اس کا شکار بن جاتے ہیں اور اس کو اپنی نگاہ سے ہر چیز کا ادراک حاصل ہو جاتا ہے یہ وہ خاک ہے کہ جس کی عظیم صلاحیتوں کو دیکھ کر جبرائیل امین ؑ بھی اپنی قبا کو چاک کرتے ہیں اور اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہیں۔ انسان کے پھندے میں تمام اشیاء شکار ہیں۔ معمولی چیزیں تو اس کو نظر نہیں آتیں۔ زمان و افلاک سے تو اس کی دائمی کشاکش رہتی ہے۔ اگر چہ انسان خاکی ہے مگر خاک سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اگر چہ انسان بخارا و بدخشاں کو اپنا ٹھکانا نہیں بناتا مگر یہ جبرائیل امیں ؑ کا ہمسایہ بھی ہے اور ہر جگہ پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے۔

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبریلؑ بھی ہے　　　تری نگاہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں

(ب ج: ۳۳۶)

وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صَیقلِ ادراک　　　وہ خاک کہ جبریلؑ کی ہے جس سے قبا چاک

(ب ج: ۳۶۱)

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور　　　کہیں اس کے پھندے میں جبریلؑ و حور

(ب ج: ۴۱۸)

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　　جبریلؑ و سرافیلؑ کا صیاد ہے مومن!

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن!

(ض ک: ۵۰۷)

ہمسایۂ جبریلِ امیںؑ بندۂ خاکی　　　ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

(ض ک: ۵۲۲)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ نوری مخلوق یعنی جبرائیل ؑ اور خاکی مخلوق یعنی انسان کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ایسی نوری مخلوق کو تو سوائے پیغام رسانی کے اور کچھ کام نہیں آتا جب کہ یہ خاکی انسان اس سے کہیں بہتر کام کرتا ہے اور اپنی آغوش میں آسمان اور آفاق کو سموئے ہوئے ہے۔ (ز ع: ۵۴)

فرماتے ہیں کہ جبرائیل ؑ تو جب کسی عاشق انسان کے قریب سے گزرتے ہیں تو اپنے سینے کو کھول کر جاتے ہیں کہ شاید اس کے دل سے نکلنے والی عشق کی چنگاری سے ایک چنگاری میرے سینے کو بھی مل جائے۔

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را
(کہاں فرشتے (نوری) کہ جو سوائے پیغام رسانی کے کچھ نہیں جانتے، کہاں وہ خاکی جو اپنی آغوش میں پورے آسمان کو سمو لیتا ہے) (زع:۵۴)

سینہ کشادہ جبریلؑ از برعاشقاں گذشت تا شررے با و فتد آتش آرزوئے تو
(جبرائیل علیہ السلام عاشقوں کے سامنے سے گزریں تو سینہ کھول کر جاتے ہیں کہ شاید تیری آرزو کی ایک چنگاری ان کے سینے میں جا پڑے) (زع:۴۷)

''جاوید نامہ'' اور ''زبورِ عجم'' میں انسان کی بلند پروازی بیان کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ مولانا رومیؒ جیسے انسان نے اپنی شرابِ عشق کی صراحی کو رکھنے کیلئے آسمان کو طاق بنایا ہے۔ وہ اپنے فکر کے کلام کی تصدیق جبرائیل امین علیہ السلام سے چاہتے ہیں یعنی جبرائیل علیہ السلام ان کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگرچہ فرشتہ آفاقی طلسمات سے باہر ہے (یعنی مشکلات اور مصائب سے متاثر نہیں) لیکن اس کی نظر خاکی انسانوں کے کمالات پر لگی رہتی ہے۔ وہ حیران ہیں کہ انسان کے دل میں وہ کیسا نور ہے کہ اس کیلئے مغیبات بھی حضور سے کم نہیں (یعنی وہ غیب کی باتوں کو بھی جانتا ہے)۔ کبھی انسان کے دل میں دلائل کی آگ ہوتی ہے اور کبھی وحی کا نور اس کے سینے کو گرما جاتا ہے۔ اس کی روح کا نور اس کی جان کو چمکا دیتا ہے اور سینے کو گرم رکھتا ہے جو سورج سے زیادہ گرمی رکھتا ہے۔ فرشتوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انسان کیا بنایا ہے کہ کبھی وہ کلیم اللہ علیہ السلام، مسیح اللہ علیہ السلام اور خلیل اللہ علیہ السلام کا روپ رکھتا ہے اور کبھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا ہے اور کبھی کتاب اللہ اور جبرائیل علیہ السلام کی شان والا ہو جاتا ہے۔ وہ معنوی صورتیں اس قدر تبدیل کرتا ہے کہ معنوی قرآن، معنوی جبرائیل علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے دین کا نگہبان بن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شیشۂ خود را بگردوں بستہ طاق فکرش از جبریلؑ می خواہد صداق
(ج ن:۳۵)

(رومی نے اپنی صراحی کیلئے آسمان کو طاق بنایا ہے۔ اس کا فکر جبرائیل علیہ السلام سے تصدیق چاہتا ہے)

فرشتہ گرچہ بروں از طلسمِ افلاک است نگاہ او بہ تماشائے ایں کفِ خاک است
(فرشتہ اگرچہ طلسم افلاک سے باہر ہے، مگر اس کی نظر اس کفِ خاک (آدم) کی کوشش اور محنت پر ہے) (زع:۶۹)

درونِ سینۂ آدم چہ نور است چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است
(سینۂ آدم کے اندر یہ کیا نور ہے کہ اس کا غیاب بھی حضور ہے)

گہے نارش ز برہان و دلیل است گہے نورش ز جان جبرائیل است
(کبھی اس کی برہان و دلیل آگ بن جاتی ہے اور کبھی وہ جبرائیل علیہ السلام کی وحی سے نور حاصل کرتا ہے)

چہ نورے جاں فروزے سینہ تابے　　نیرزد با شعاعش آفتابے

(ز ع:۱۴۸)

(یہ کیا نور ہے جو جان کو چمکا دیتا ہے اور سینے کو گرم کر دیتا ہے اس کی ایک شعاع آفتاب سے بڑھ کر ہے)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ　　او محمدؐ او کتاب، او جبرائیلؑ

(وہی کلیم علیہ السلام ہے، وہی مسیح علیہ السلام ہے اور وہی خلیل اللہ علیہ السلام وہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وہی کتاب ہے اور وہی جبرائیل علیہ السلام ہے)

آفتاب کائنات اہل دل　　از شعاع او حیات اہل دل

(وہ اہل دل کی کائنات کا آفتاب ہے، اہل دل کی زندگی اسی کی شعاع سے ہے) (ج ن:۲۰۷)

معنی جبریلؑ و قرآں است او　　"فِطْرَةُ اللّٰه" را نگہباں است او

(پ چ:۱۲)

(نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی جبرائیل علیہ السلام اور قرآن پاک کا عملی نمونہ ہے، وہ دین اسلام کا نگہبان ہے)

ہر کہ از سر نبیؐ گیرد نصیب　　ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب

(جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت سے حصہ پاتا ہے وہ جبرائیل علیہ السلام (جو حکمت کی علامت ہے) کے بھی قریب ہو جاتا ہے) (پ چ:۳۲)

اگر علامہ اقبالؒ کے کلام کے علاوہ قرآن اور حدیث سے استنباط کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بجا طور پر تمام مخلوقات پر برتری عطا فرمائی ہے مگر ایسا کلام اگر جمع کیا جائے تو یہ ایک کتاب کی ضخامت سے کم نہیں ہوگا۔

پیدائش سے پہلے انسانی عروج کی کیفیات

یہ بیان بہت طوالت طلب ہے کہ انسان کو کب اور کیسے پیدا کیا گیا۔ اس کی کچھ تفصیل ہماری تصنیف ''اسلام وروحانیت اور فکر اقبالؒ'' میں شامل کی گئی ہے۔ اس کی کچھ مزید تفصیل ''انسان کی تخلیق کے کمالات'' کے تحت اگلے صفحہ پر دی جا رہی ہے۔ یہاں اس حقیقت کا انکشاف کرنا لازم ہے کہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح پرنور کو پیدا کیا گیا اور اس کو اربوں سال اللہ تعالیٰ کے قرب میں رکھا گیا۔ آپ کی اس روح کو تعین اول کہا جاتا ہے اور اس تعین اول سے ہی تمام مخلوقات کو پیدا کیا گیا۔ تمام انسانوں کی روحوں کو ایک گنبد نما جگہ میں اس طرح محفوظ کیا گیا جس طرح چھتے میں شہد کی مکھیاں پیدا ہوتی ہیں، ہر خانے میں ایک روح ارب ہا سال رہی اور اس کے بعد کسی روح کو دنیا میں آنے کا حکم ہوتا ہے تب وہ دنیا کی طرف سفر کرتی

ہےاور اپنے والد کی صلب میں سے ہوتی ہوئی ماں کے رحم میں نطفہ قرار پاتی ہے اور پھر دنیا میں آتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ روحیں جب عالم ارواح میں اپنے گھر میں قیام پذیر تھیں اس وقت ان کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ہمہ وقت اپنے خالق اور محبوب حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف نظریں جمائے رہتی تھیں کیونکہ وہاں ان کو دنیوی آلائشوں میں سے کسی آلائش سے واسطہ یا سروکار نہ تھا۔ اس بات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عالم ارواح میں تمام روحوں کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز تھی چنانچہ بنابریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی اصل تو پلید نہ تھی انسان اس حالت میں پاکیزہ اور طاہر تھا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو   فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور   کہ شاہین شہِ لولاک ﷺ ہے تو

(ب ج:۳۷۶)

انسان کی تخلیق کے کمالات

تخلیقِ انسان اور تخلیقِ کائنات کے متعلق قرآنِ مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں اور کئی آیات میں تخلیقِ کائنات کے کمالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تخلیقِ کائنات میں غور کرنے کے متعلق بھی قرآنِ مجید میں بار بار تاکید کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے ہر ذرے میں اللہ تعالیٰ کے نادر الوجود راز مخفی ہیں جن کو انسان ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ مغرب کے بہت سے سائنسدانوں نے اگر اس کائنات کی کسی ایک بات پر تحقیق کی تو ان کو یہ معلوم ہوا کہ ابھی وہ اس ایک بچے کی حیثیت سے کھڑے ہیں جو سمندر کے کنارے پر کھیل رہا ہو اور اگر کسی سائنسدان کو کوئی زیادہ خوبصورت سنگریزہ مل گیا ہو تو وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ حقیقت کا بحرِ زخار ابھی پوشیدہ ہے جس کا اسے کوئی علم نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق پر غور وفکر اور تحقیق کرنے کی قرآن میں جابجا تاکید فرمائی ہے اور حضور ﷺ نے ایک گھڑی بھر تفکر کو ستر سال کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ زیرِ بحث موضوع میں ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں تخلیق کے سلسلہ میں کس انداز میں غور کرنے کو کہا ہے۔ اس کی مثال ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کو پیدا کیا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ" (کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے۔ [1]

معلوم ہوا ہے کہ اونٹ کی تخلیق تمام جانوروں سے الگ ہے۔ اگرچہ اس کی وضع قطع عجیب اور بے ڈھنگی معلوم

---

[1] الغاشیہ: ۸۸:۱۷۔

ہوتی ہے مگر اس میں اس قدر خوبیاں رکھی گئی ہیں کہ اتنے بڑے جانور کو اگر نکیل ڈال دی جائے تو ایک چھوٹے سے بچے کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس پر کتنا ہی بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تو یہ گرم ریگستانوں کو عبور کرتا ہوا سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر لیتا ہے۔ لگا تار دس دن بھی پانی نہ ملے تو گزارہ کر لیتا ہے۔ یہ وہ جانور ہے کہ اُن جڑی بوٹیوں کو بھی کھا لیتا ہے جنہیں عام جانور کھانا پسند نہیں کرتے۔ کچھ جانور تو صرف بوجھ اٹھاتے ہیں، کچھ دودھ دیتے ہیں اور کچھ کھانے کیلئے صرف اپنا گوشت مہیا کرتے ہیں مگر اونٹ اکیلا ان تینوں معاملات میں انسان کی خدمت کرتا ہے۔ اس کی ساخت پر غور کریں تو کئی عجائبات نظر آتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے اسی طرح زمین، پہاڑوں، بادلوں، سمندروں اور کائنات کی دیگر چیزوں پر غور کرنے کیلئے کہا ہے' یہاں تک کہ دھاتوں کے ذرات جن کو ہم Atoms کہتے ہیں ان کی ساخت پر بھی غور کرنے کو کہا ہے اور سورۃ الملک آیت نمبر ۳ میں ہے کہ تم اس کائنات کی کسی تخلیق میں فتور نہ پاسکو گے، تو پھر انسان کی تخلیق میں جو اشرف المخلوقات ہے کوئی فتور کس طرح نظر آئے گا۔

غور و تدبر کرنے اور افادیت معلوم کرنے پر مغربی دنیا نے بہت کام کیا ہے اور تحقیقات کے میدان میں وہ پیش رفت کی ہے جو اس کتاب کے احاطہ سے باہر ہے لہٰذا اس پر زیادہ تفصیل مہیا کرنا ایسی کتاب کیلئے مناسب نہیں۔ مولانا رومؒ نے تحقیق اور تفکّر کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے کہ جس شخص کے تفکّر میں جمود آ چکا ہو اس کیلئے ذکرِ الٰہی کو جاری کرنا ضروری ہے۔ تفکّر کا جمود ذکر کی کثرت سے توڑا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس کا فکر جامد ہو گیا ہو اسے کہو کہ ذکر کرے ایسا کرنے سے اس کا فکر کھل جائے گا اور فکر اگر کھل جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہ کھل جائے گی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اس راہ کے کھل جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس راہ کے ذریعے خدا تک پہنچ جائے گا۔ مولانا رومیؒ کا جمودِ فکر پر مثنوی سے ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

فکر میں اگر جمود ہو تو ذکر سے کھل جاتا ہے

فکر وہ ہے جو راہ کو کھول دے اور راہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملا دے۔ مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ ایک صوفی درویش کو شیطان نے بہکایا کہ تیرے اس رات دن کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ کیونکہ تیرے اللہ اللہ کہنے پر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ چنانچہ صوفی نے ذکر بند کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ میرے اس بندے سے کہہ دو میں ہی ہوں کہ ایک دفعہ اللہ کہنے کے بعد دوسری بار اللہ کہنے کی توفیق دیتا ہوں تو لفظِ اللہ تمہاری زبان سے نکلتا ہے۔ یہی میرا لبیک (میرا جواب) ہے کیونکہ پہلی بار تیرا کہا ہوا ''اللہ'' اگر قبول نہ ہوتا تو دوبارہ تیری زبان سے ''اللہ'' نہ نکلتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست — آں نیاز و دردو سوزت پیک ماست
(اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تیرا دوسری بار "اللہ" کہنا ہی ہمارا جواب ہے، یہ تیرا دردو نیاز گویا ہمارا ہی پیغام ہے)(م،۳۔۳۲)

نے ترا در کارِ من آوردہ ام — نے کہ من مشغول ذکرت کردہ ام
(نہیں بلکہ اس کام میں تجھے لگانے والا ہی میں ہوں نہیں بلکہ تجھے ذکر میں مشغول کرنے والا بھی میں ہوں)

ترس و عشقِ تو کمندِ لطف ماست — زیرِ ہر یاربّ تو لبیک ہاست
(تیرا خوف اور عشق ہی میرے لطف کی ڈوری ہے، تیرے ایک مرتبہ یارب کہنے میں میرے، بہت سے لبیک ہیں)
(م،۳،۳۳)

ایں قدر گفتیم و باقی فکر کُن — فکر اگر جامد بُود رو ذِکر کُن
(جو میں نے کہہ دیا ہے اس پر سوچ بچار کرو، اگر فکر منجمد ہوگئی ہے تو ذکر کرو (کھل جائیگی))(م،۶۔۱۵۳)

ذِکر آرد فکر را در اھتزاز — ذِکر را خورشید ایں افسردہ ساز
(ذکر کی گرمی فکر کو حرکت میں لاتی ہے، اس افسردہ جمود کیلئے ذکر کو آفتاب خیال کرو)(م،۶۔۱۵۴)

فکر آں باشد کہ بکشاید رھے — راہ آں باشد کہ پیش آید شہے
(فکر تو وہ ہے کہ جو راستہ کھول دے، اور راستہ وہ (مفید) ہے جو شاہِ حقیقی سے ملادے)(م،۲۔۳۰۲)

تخلیقِ آدم کے مختلف مراحل

قرآنِ مجید میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق زیادہ تفصیل نہیں دی گئی بلکہ اس کا بیان احادیث اور دیگر مستند روایات میں آیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کو مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اس میں بجتی ہوئی مٹی کا ذکر بھی آیا ہے، جو اصل میں بدبودار گارا تھا (الحجر:۲۶)۔ مفسرینِ قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق کافی تفصیل بیان کی ہے مگر عام اہلِ اسلام کے لائق جو معلومات ضروری ہیں یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے تا کہ ان کو آدم علیہ السلام کی تخلیق کے دلچسپ قصے کا علم ہو سکے۔

"خزینۃ المعارف" میں حضرت عبدالعزیز دباغؒ نے احمد بن مبارکؒ کو کچھ دلچسپ معلومات قلمبند کروائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کیلئے فرشتوں اور جنات کو حکم دیا کہ وہ کچھ مٹی جمع کریں، چنانچہ اپنی اپنی ہمت کے مطابق سب نے اس کام میں حصہ لیا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سب سے زیادہ مٹی اکٹھی کی کیونکہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس مٹی کی مخلوق سے بہتر کوئی مخلوق نہ ہوگی۔ آدم علیہ السلام کیلئے تمام دنیا سے ہر قسم کی مٹی اکٹھی کی گئی۔ اس مٹی میں سے کچھ سیاہ، سرخ وسفید رنگ کی مٹی تھی اور کچھ کھاری مٹی بھی تھی۔

روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی مٹی گوندھنے کیلئے شام کے چشمے کا پانی لیا گیا اور دنیا کے مختلف

مقامات سے ہر قسم کا پانی مٹی میں شامل کیا گیا۔شام کے چشمے کا پانی نسیان کیلئے مفید ہے۔مٹی اسی چشمے کے نزدیک رکھی گئی اور یہیں آدم علیہ السلام کا جسم بنایا گیا اور یہیں سے جنت میں منتقل کیا گیا۔کچھ روایات میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ہاتھ سے حضرت آدم علیہ السلام کا بت بنایا (اس کے چہرے کو اپنے جیسا بنایا جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ "خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ" [1] "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا"۔اور پھر یہاں سے جہاں خانہ کعبہ ہے وہاں لے جایا گیا اور وہاں سے جنت میں منتقل ہوئے۔

حضرت عبدالعزیز دباغ کا قول ہے کہ یہ مٹی دس دنوں میں جمع کی گئی۔بیس دنوں کیلئے اسے پانی میں چھوڑا گیا، چالیس دن میں اس کی صورت بنائی گئی اور بیس دن تک ان کو پانی میں چھوڑے رکھا اور پھر آپ وجود میں آئے۔تفسیر نعیمی میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کو تین ماہ رجب، شعبان اور رمضان کا عرصہ لگا۔ابلیس آدم علیہ السلام کے جسم خاکی کو دیکھنے کیلئے آتا تو ان کے منہ کے ذریعے داخل ہو جاتا اور دبر سے نکل جاتا۔روایات میں ہے کہ ابلیس نے انسان کے جسم کے ہر عضو کے مقصد کو سمجھ لیا لیکن دل کے راز کو سمجھنے سے قاصر رہا اور کہتا تھا کہ معلوم نہیں اس میں کیا راز کی بات ہے کہ اس برتن کو الٹا کر کے لٹکایا ہوا ہے۔اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

آدم علیہ السلام کو جنت میں لے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور جنات کے سامنے آدم علیہ السلام کی پیدائش کی غرض و غایت کا مقصد بیان فرمایا اور فرمایا کہ "میں جب اس میں جان ڈال دوں گا تو تم اس کو سجدہ کرنا۔فرشتوں نے بارگاہِ رب العزت میں بڑی عاجزی سے عرض کی کہ الٰہی تو ایسے شخص کو خلیفہ بنائے گا جو دنیا میں خون بہائے گا۔ایسے آدم سے تو ہم بہتر ہیں کہ ہمہ وقت تیری پاکی اور تقدس کو بیان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک حقیقت حال سے میں بہتر واقف ہوں اور میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم سچے ہو تو ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ جو تمہارے سامنے رکھی جا رہی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں (مثلاً چاند، سورج، ستارے، درخت، لہسن، پیاز اور ادرک وغیرہ) کو پیش کیا مگر فرشتوں نے کہا اے اللہ تعالیٰ تو ہی بہتر جاننے والا ہے، ہمیں ان چیزوں کے نام بتائے ہی نہیں گئے۔اللہ تعالیٰ نے فطرتی طور پر آدم علیہ السلام کے ذہن میں ان تمام چیزوں کا شعور ڈال دیا اور ان سے کہا کہ اب آدم علیہ السلام ان چیزوں کے نام بتایئے۔آدم علیہ السلام کو نام بتانے کا شعور اسطرح دیا جس طرح مرغی کا بچہ انڈے سے نکلنے کے بعد ٹھونگے مارنے شروع کر دیتا ہے اور انسان کا بچہ ماں کا دودھ چوسنے لگتا ہے۔آدم علیہ السلام اس امتحان میں پاس ہوئے۔آدم علیہ السلام کا یہ علم دیکھ کر فرشتوں پر وجد طاری ہو گیا اور وہ آدم علیہ السلام کو قبلہ بنا کر سجدہ

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۸۷۳، جلد ۵، صفحہ ۲۲۹۷۔

کرنے لگے (حقیقتاً یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کو ہی تھا اور آدم علیہ السلام محض مسجود الیہ بنائے گئے)۔ ابلیس نے سجدہ نہ کیا کیونکہ وہ خود کو آدم علیہ السلام سے افضل سمجھ رہا تھا کہ وہ آگ سے بنا ہے اور آدم علیہ السلام کو خاک سے بنایا گیا تھا۔

فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے وہ ملعون ٹھہرایا گیا اور اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا گیا۔ جب فرشتوں نے دیکھا کہ ابلیس کو ملعون قرار دے دیا گیا ہے اور اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے تو انہوں نے شکرانے کا ایک اور سجدہ کر دیا، یہی وجہ ہے کہ نماز میں دو سجدے کرنے کا حکم آیا ہے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کا یہ واقعہ بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ تفاسیر قرآن میں (بالخصوص تفسیر نعیمی اور روح البیان میں) بیان کر دیا گیا ہے۔ جن حضرات کو زیادہ تفسیر مطلوب ہو تو وہ مذکورہ تفاسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

تخلیقِ انسان قرآن کے حوالہ سے

قرآن مجید میں تخلیقِ انسان کے کچھ حوالہ جات ملتے ہیں لیکن ان کی وضاحت احادیثِ نبویہ ﷺ کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایسے علوم جن سے تخلیقِ آدم کا پتہ چلتا ہے عموماً تفاسیرِ قرآن سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ جو مفسر ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے مایۂ ناز فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے آیت "حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا"[1] (اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے (پیٹ میں) اٹھائے رکھا اور اسے تکلیف کے ساتھ جنا) کی تفصیل میں ان تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے جنین کو دورانِ حمل گزرنا پڑتا ہے۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ رحمِ مادر میں جب قطرہ پہنچتا ہے تو وہاں کی حرارت کی وجہ سے اس کی ہیئت میں گوناگوں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ چھٹے دن وہ جھاگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، پھر اس جھاگ میں خون کے تین نقطے ظاہر ہوتے ہیں۔ درمیانی نقطہ بعد میں جا کر دل بنتا ہے اوپر والا دماغ اور دائیں طرف والا جگر پھر سرخ رنگ کے دھاگے ظاہر ہوتے ہیں جو ان کو آپس میں ملاتے ہیں۔ یہ عمل تین دن میں ہوتا ہے۔ نو دن کے بعد یہ سارا مادہ خون میں بدلنے لگتا ہے اور چھ روز کی مدت میں وہ لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پندرہ روز کے بعد یہ لوتھڑا گوشت کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ بارہ دن کے اندر تینوں اعضاء متمیز ہونے لگتے ہیں اور مغز کا گودا پھیلنے لگتا ہے۔ ستائیس روز کے بعد پانچواں مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اور سر، کندھوں سے الگ ہونے لگتا ہے۔

---

[1] الاحقاف ۴۶:۱۵۔

پسلیاں، بازو اور پیٹ اپنی ابتدائی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس تبدیلی میں نو دن لگتے ہیں۔ چھٹا مرحلہ جو چار دن کا ہے اس میں مختلف اعضاء اپنی مخصوص شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح چالیس دن کے عرصہ میں حضرتِ انسان کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ عرصہ پینتالیس دن کا ہوتا ہے اور اس کی کم از کم مدت تیس دن ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ ان طبی تحقیقات نے حضور ﷺ کے اس ارشاد کی تصدیق کر دی "یُجْمَعُ خَلْقُ اَحَدِکُمْ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا" [1] (یعنی ماں کے شکم میں تمہاری آفرینش چالیس دن میں پوری ہو جاتی ہے) باقی عرصہ اس ڈھانچہ کو کامل و مکمل کرنے اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں صرف ہوتا ہے۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک عورت پیش کی گئی جس نے شادی کے چھ ماہ بعد بچہ جنا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس پر رجم نہیں، کیا آپ رضی اللہ عنہ نے ملاحظہ نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَحَمْلُہٗ وَفِصَالُہٗ ثَلٰثُوْنَ شَھْرًا" [3] (اور اس کا (پیٹ میں) اٹھانا اور اسکا دودھ چھڑانا (یعنی زمانۂ حمل و رضاعت) تیس ماہ (پر مشتمل) ہے) پھر فصال کی مدت کے متعلق فرمایا "وَفِصَالُہٗ فِیْ عَامَیْنِ" [4] (اور جس کا دودھ چھوٹنا بھی دو سال میں ہے) اس کے بعد حمل کیلئے صرف چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی بات سُن کر، حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔ [5]

اس آیت سے اہلِ علم نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے کیوں کہ یہ تیس مہینے حمل اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں "وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ" [6] (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال اس کے بعد چھ ماہ بچتے ہیں اور یہ حمل کی اصل مدت ہے)۔

جدید تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بچے کو کم از کم اٹھائیس ہفتے یعنی ایک سو چھیانوے دن رحم میں رہنا پڑتا ہے۔ یہ چھ ماہ اور سولہ دن بنتے ہیں۔ دنوں کا شمار عورت کے حیض سے فارغ ہونے اور طہر کے آغاز سے ہوتا ہے، جس میں حمل قرار پاتا ہے۔

جب انسان چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی جسمانی اور ذہنی قوتیں پورے شباب پر ہوتی ہیں۔ اس وقت نہ تو عنفوانِ شباب کا وہ اندھا جوش باقی رہتا ہے نہ بڑھاپے کی کمزوریوں نے پنجے گاڑے

---

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث ۷۶، جلد ۱ صفحہ ۲۹۔　[2] تفسیر الکبیر، جلد ۲۵، صفحہ ۱۵　[3] الاحقاف: ۴۶، ۱۵۔
[4] لقمان: ۳۱، ۱۴۔　[5] کنز العمال، علاء الدین علی المتقی، متوفی ۹۷۵ھ، حدیث ۱۵۳۶۲، جلد ۶، صفحہ ۸۵، دار الکتب العلمیہ۔
[6] البقرہ ۲: ۲۳۳۔

ہوتے ہیں۔ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے وہ اس وقت بڑا معتدل ہوتا ہے۔ اسلیئے عمومی طور پر رسالت کی عمر چالیس سال مقرر کی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ آدمی جس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہو اور پھر بھی وہ تائب نہ ہو تو شیطان اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے (لعنت کرتا ہے) اور کہتا ہے کہ یہ ایسا چہرہ ہے جو کبھی سرخرو نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس ؓ سے منقول ہے کہ "مَنْ اَتٰی عَلَیْہِ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً فَلَمْ یَغْلِبْ خَیْرُہٗ شَرَّہٗ فَلْیُجَھِّزْہُ اِلَی النَّارِ" [1] (جس کے چالیس سال گزر جائیں پھر بھی اس کی نیکی برائی پر غالب نہ ہو تو ایسے شخص کو دوزخ کی تیاری کرنی چاہیے)۔

انسان بہترین شکل میں پیدا کیا گیا

یہ مضمون بہت طوالت طلب ہے کہ انسان شکل وصورت، قد وقامت، عقلی وذہنی قوتوں، قلبی وروحانی صلاحیتوں سے متصف کر کے پیدا فرمایا گیا ہے۔ ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے بہتر اور زیادہ خوبصورت کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان عظیم صفات کے ساتھ متصف فرمایا کہ وہ حی وقیوم، عالم، بااختیار، صاحب ارادہ، متکلم، شنوا، بینا، مدبر اور حکیم ہے۔

دنیا کی کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ کوئی جانور یا کسی عظیم پہاڑ، دریا یا کسی اور چیز کو لے لیں انسان کے آگے سب لاشی نظر آتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت کو وہ اپنی علمی قوت سے مسخر کر کے اپنی چاکری میں لگالیتا ہے۔ عقل فکر ونظر، قیاس واستنباط کی بے نظیر قوتیں جو اسے بخشی گئی ہیں۔ کائنات کی کوئی شے اس کی برابری نہیں کرسکتی، غرضیکہ "سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" [2] (فرمانبردار بنا دیا ہے تمھارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) انسان کی شان میں وارد ہوا ہے۔

ضیاء القرآن میں ایک واقعہ علامہ قرطبیؒ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمیؒ کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہو تو تجھے تین طلاقیں۔ یہ معاملہ خلیفہ منصور کے پاس پہنچا تو تمام علماء نے کہا کہ طلاق واقع ہوگئی' مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ایک شخص خاموش بیٹھا رہا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ ارشادِ الٰہی ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" [3] (بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا (عقل وشکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر ہے) کے مطابق انسان سب چیزوں سے زیادہ حسین ہے لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوئی۔ خلیفہ منصور نے اس فیصلے کو قبول کیا اور اس عورت کو کہا کہ عیسیٰ بن موسیٰ کے گھر میں آجاؤ۔

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۳۴۴، جلد ۲، صفحہ ۲۸۶۔ [2] لقمان: ۳۱: ۲۰ [3] التین: ۹۵: ۴۔

افسوس اس بات کا ہے کہ انسان کو اتنا بڑا مقام عطا ہونے کے باوجود کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں، نفس کی پیروی اور اپنے رسول ﷺ کی تعلیمات سے منہ موڑ لیتے ہیں اس نافرمانی کے باعث ان کے سر سے "اَحْسَنِ تَقْوِیْم" کا تاج اتار لیا جاتا ہے اور معاشرے کی نگاہوں میں وہ حقیر اور ذلیل ہو جاتے ہیں اور ایسے شخص کے متعلق اگلی آیت میں فرمایا ہے کہ "ہم نے پھر لوٹا دیا اسے پست ترین "اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ" حالت کی طرف" [1]

ہماری تصنیف "اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبال" میں ایک مضمون مقامِ آدم کے عنوان سے دیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ انسان کو تمام مخلوق میں سے اعلیٰ ترین مقام عطا کیا گیا ہے اور فرشتے بالخصوص حضرت جبرائیل علیہ السلام انسان کے مقام پر رشک کرتے ہیں۔

---

[1] ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ، جلد ۵، صفحہ ۶۰۶، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور۔

باب نمبر۲

نفس کے لغوی اور اصطلاحی معنٰی

تعارفِ نفس

دنیا کی تخلیق میں نفس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ نفس ہر جاندار مخلوق کو ودیعت کیا گیا ہے مگر انسانوں میں نفس کا پایا جانا دوسری مخلوق سے مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا"[1] (جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے)۔

عمل کا بہتر ہونا نفس کے اعتبار سے ہی پہچانا جا سکتا ہے کیونکہ نفس کی موجودگی کے بغیر عمل کے بہتر ہونے کی شناخت قطعاً ناممکن ہے۔ عمل کے بہتر ہونے کی راہ میں نفس ہر قدم پر مزاحمت کرتا ہے اور اس کی مزاحمت سے بچنا ہی انسان کیلئے جوانمردی اور سربلند مقامات کے حصول کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سمع و بصر، فہم و تدبر اور تصرفات کی جو بے پناہ صلاحیتیں عطا کی ہیں وہ صرف اسی صورت میں بامراد ہوتا ہے جب کہ انسان نفس کی بغاوت، سرکشی اور باہمی کشمکش کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نفس کے مکر و فریب اور شرارتوں سے بچنے کے عمل و سعی میں صرف وہی انسان کامیاب ہو سکتا ہے جو احکاماتِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے نفس کی حائل کردہ رُکاوٹوں سے بچنا جانتا ہو اور ممنوعہ حدود سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ دنیا کی زندگی میں کامیابی اور سربلندی حاصل کرنے اور نفس کی آزمائش سے بچنے کا سب سے بڑا آلہ نفس کی شناخت اور اس کی آفات سے خود کو محفوظ رکھنا ہے اور اس عمل میں کامیاب ہونا ہی

---

[1] الملک ۶۷:۲۔

کسی شخص کی سر بلندی اور عظمت کا معیار ہے۔ نفس اگر چہ انسان کی بلندیوں کی راہ میں مزاحمت کرتا ہے مگر اس کی مخالفت میں انسان کو جو اعلیٰ مقامات ملتے ہیں وہ انسان کو نفس کے نہ ہونے کی صورت میں ممکن نہیں ہیں گویا انسان میں نفس کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بیش بہا عطیہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نفس جس کی مخالفت کرتے رہنے سے انسان کے لحہ بہ لحہ درجات بلند ہوتے رہتے ہیں اور یہ وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس سے نوری و دیگر مخلوق محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ کوئی دوسری مخلوق انسانی بلندیوں کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتی۔

اہلِ علم کے نزدیک کسی چیز کی ذات کو اس کا نفس کہتے ہیں۔ نفس کی حقیقت اس کی روح ہے اور روح کی حقیقت حق تعالیٰ ہے۔ حق تعالیٰ نے محمد ﷺ کے نفس کو اپنی ذات سے پیدا فرمایا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی ذات کو محمد ﷺ کی ذات کا ایک نسخہ بنایا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ چاہے کوئی اللہ تعالیٰ کو مانے یا نہ مانے، مگر اس کی ذات کو کسی نہ کسی انداز میں ضرور مانتا ہے اور اس کو مانے بغیر اس کا چارہ نہیں (اس کی مفصل گفتگو اگلے ابواب میں انشاء اللہ آئے گی)۔

لطیفۂ نفس کی وجہ سے آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کو کھایا اور دنیا میں لوگوں کا حکم خداوندی سے کنارہ کشی کرنا اس نفس کی راہ سے ہے اور شیطان اسی نفس کو لوگوں کے بہکانے کا آلہ بناتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ نفس ہی ایک چیز ہے کہ جس کی مخالفت کرنے کے عمل کے باعث انسان کو دنیا میں خلیفہ بنایا گیا۔ گویا نفس کی وجہ سے انسان خلیفہ فی الارض بنا اور یہی نیابتِ الٰہی کا باعث بنا اور فرشتوں کو نفس نہ دیے جانے کی وجہ سے انسانوں جیسے روحانی درجات اور بلند مقامات پر فائز ہونے سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ فرشتوں کو اگر نفس دے دیا جاتا تو اس کی مخالفت کرنے سے ان کے درجات بھی بلند ہو سکتے تھے اور اب نفس کی غیر موجودگی میں تمام فرشتے جس درجے پر پیدا ہوئے اسی درجے پر عمر بھر قائم رہیں گے، گویا ان کی تقدیر میں بلندیٔ مقامات مفقود ہے اور یہی وجہ ہے جو انسانوں کو فرشتوں پر مقدم کرتی ہے۔

نفس کی سرشت میں اگر چہ شرارت، فساد، خونریزی اور دیگر فسادات اور نقائص شامل ہیں لیکن یہی نفس انسان کیلئے حصولِ کمالات کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ حضرت مجددالف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ حسن و جمال کیلئے ایک نقص کا آئینہ درکار ہے اور آئینہ چیز کے مقابل ہوتا ہے، لہٰذا خیر کیلئے شر اور کمال کیلئے نقص کا آئینہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس میں نقص اور شرارت زیادہ ہوگی وہ خیر اور کمال کی نمائندگی بھی زیادہ کرے گی۔ اس طرح ذم (برائی) نے مدح کے معنی پیدا کر لیے ہیں اور (نفس کا) یہ شر خیر کا محل بن گیا۔ اسی لئے مقام عبدیت تمام مقامات سے بلند ہے کیونکہ (یہ خیر و کمال) کے معنی عبدیت میں اتم اور اکمل طور پر موجود ہیں اور یہ وہ مقام ہے کہ جو محبوبوں (خاص الخاص بندوں) کیلئے مخصوص ہے۔

حضرات اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ اگر انسان کو فساد اور خونریزی (یعنی شر) کے ساتھ ساتھ علم اور آگہی (یعنی روحانی علوم) نہ دیے جاتے تو انسان محض فساد اور ظلم کا منبع قرار دیا جاتا لیکن منشاءِ الٰہی یہ تھا کہ انسان جنگ وجدل کی سرشت کے باوجود شر کی طاقتوں سے نبرد آزما ہوگا اور ظلم واستحصال کے خاتمے کیلئے انقلابی جدوجہد کرے گا۔ انسان شر وفساد کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اعلائے کلمۂ حق کیلئے اپنی جان کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرے گا۔ یہ بات مشاہدے میں آچکی ہے کہ کچھ لوگ کفر کی حالت میں ظلم اور تشدد کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جاتے ہیں مگر جب وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو ایسے ظالم اور سفاک لوگ، دوسروں سے نیک کاموں میں بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ اگر کسی قوم میں خونریزی اور جنگ وجدل کی اہلیت نہ پائی جاتی ہو تو اس قوم کا تشخص دائمی طور پر ناقص رہ جاتا ہے اور پسماندہ قوموں میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے، کیونکہ ظلم وتشدد کو دبانے کیلئے قوتِ بازو کا اظہار کسی قوم کو زندہ رکھنے کیلئے اشد ضروری ہے۔ زمانہ رسالت مآب ﷺ میں جب مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی اور ان پر بات واضح کی گئی کہ شر اور خیر کے مقامات میں کیا فرق ہے تو اس حقیقت کو ان پر کھول دینے کے بعد ان میں جہاد کا ممتاز جذبہ پیدا کیا گیا۔ جب مسلمانوں پر یہ حقیقت کھل گئی تو دنیا کی یہ پس ماندہ قوم جو انتشار سے ہم آہنگ تھی اور ناز یبا امور کی عادی تھی، ایک مختصر مدت میں دنیا کی بہترین قوم بن کر ابھری۔ اس تجزیہ سے معلوم ہوا کہ جہاں نفس انسانی شرارت اور عیب کا محل ہے وہاں یہی نفس انسان کا رہبر اور راہنما بھی بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ مردِ مسلمان کی شناخت میں حسب ذیل چار عناصر ضروری بنیادوں پر قائم کیے گئے ہیں اور ان چاروں میں جباری اور قہاری کی صفات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(ض ک:۵۲۲)

نفس کی جبلّت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نفس کی جبلّت اور فطرت خبیث ہے اور دوسری یہ کہ جب اس کا خبثِ ذاتی دور ہو جائے تو یہی نفس خیر وکمال کا محل بن جاتا ہے۔ مکتوبات شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ نفس اپنی فطرت اور جبلّت میں خبیث ہے اور تاریکی اس کی ذات کی صفت ہے۔ جب تک نفس قلب کی سلطنت اور حکومت کے تحت رہ کر بمطابق سنت اور اتباعِ شریعت اور فضل خداوندی پاک ومطہر اور منزکی نہ ہو جائے تو اس کا خبثِ ذاتی دور نہیں ہو سکتا۔ اس کا نفس لمّارہ جاہ، وقار اور سرداری کی محبت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا ارادہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصر لوگوں پر بلندی اور فوقیت حاصل کرے۔ اس کی ذات کا تقاضا ہے کہ ساری مخلوق اس کی محتاج ہو اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور اس پر کوئی حکم نہ چلائے۔ دراصل یہ اس کی طرف سے دعویٰ خدائی ہے کیونکہ یہ تمام صفات

اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہیں جو وہ اپنے لیئے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا دعویٰ ہمسری ہے۔ یہ نفس شرکت پر بھی راضی نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ صرف وہی حاکم ہو اور باقی سب اس کے محکوم اور تابع ہوں اور وہ خود کسی کا تابع نہ ہو۔ نفس یہ بھی چاہتا ہے کہ اس پر کوئی حکم نہ چلائے اور یہی اس کی طرف سے دعویٰ خدائی ہے کیونکہ یہ تمام صفات صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہیں جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ حدیث قدسی جسے امام آمدیؒ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی ''عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّھَا اِنْتَصَبَتْ لِمُعَادَاتِیْ'' [1] (اپنے نفس پر عداوت رکھ کیونکہ یہ میری مخالفت پر کمربستہ ہے)۔

مشائخ عظامؒ نے فرمایا ہے کہ نفس ایک سرکش گھوڑے کی مانند ہے جو احکاماتِ الٰہیہ کی مخالفت کیلئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے جب تک اس کو شریعت کی اتباع کے ساتھ اور محنت شاقہ کے ذریعے مہذب نہ کیا جائے اس وقت تک اس کی سرکشی سے نجات پانا ممکن نہیں۔ اتباع شریعت سے بڑھ کر نفس کی سرکشی کا کوئی علاج متصور نہیں کیونکہ اتباع شریعت میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی سختیوں سے نفس کی سرزنش کی جاسکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ نفس پر اتباع شریعت سے بھاری اور کوئی چیز تصور نہیں کی جاتی۔ شکم سیری نفس کی قوتوں کو بیدار کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ شکم سیری نفس کی مرادوں کو پورا کرتی ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک پیٹوں کو بھوکا، جگروں کو پیاسا نہ رکھا جائے اور امیدوں کو کوتاہ نہ رکھا جائے تب تک مسلمان اللہ کے نور کو دیکھنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ [2] نفس کو قابو میں لانے کیلئے مذکورہ تمام باتوں کا خیال رکھا جانا ضروری ہے تاکہ خودی کے مراحل طے کیے جاسکیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے یہ ضروری ہے کہ قدم قدم پر نفس کی آزمائش کی جائے، اس کے خلاف جہاد کیا جائے تاکہ ان مجاہدات سے نفس کی بیخ کنی کی جاسکے۔ جہادِ نفس کیلئے احتسابِ نفس، معرفتِ نفس، تزکیۂ نفس، افعالِ نفس اور اس کی شناسائی اشد ضروری ہے۔ مشائخ عظامؒ خواہشاتِ نفس کے انسداد کیلئے توجہ اِلی اللہ، ذکرِ الٰہی، اتباع سنت، تعلق مع اللہ قائم کرنے کیلئے صبر واستقامت، ایثار اور دیگر اوصافِ حمیدہ کے پیدا کرنے کو لازمی تصور کرتے ہیں۔

سالک اگر اسلام کے صحیح مفہوم کو سمجھ لے، اخلاق کے نظم وضبط کو اختیار کرے تو اسلام کی حکمت اور ''تَفَقُّہُ فِی الدِّیْنِ'' اور بصیرت کے حاصل کرنے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی۔ راہ طریقت پر چلنے والے صوفیوں کو اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ خرابیٔ نفس کے تمام ذرائع کا مطالعہ کریں، غفلتِ عمل کو ترک کردیں اور حُبّ دنیا اور خواہشاتِ دنیا کی پیروی کی طرف توجہ نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ پر چلنے والوں

[1] الاحکام الآمدی، علی بن محمد الآمدی، متوفی ۶۳۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۹۷، دار الکتاب العربی، بیروت۔

[2] احیاء علوم الدین، محمد بن محمد الغزالی، متوفی ۵۰۵ھ، جلد ۳، صفحہ ۸۱، دار المعرفہ، بیروت۔

کا ندامت، توبہ واستغفار اور نیک صحبت کی طرف میلانِ طبع اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عباداتِ الٰہیہ کو سمجھ کر ادا کرنا ضروری ہے۔انسان کا اس وقت تک کامل انسان بننا مشکل ہے جب تک وہ اصلاحِ نفس کی طرف کوشاں نہ رہے اور شیطان سے بچنے کی تدابیر نہ کر سکے۔حضرت علی ؓ کے ایک قول کا مفہوم ہے کہ دنیا کے حصول کی خواہش سانپ کی طرح زہریلے اثرات رکھتی ہے اور اس دنیا (یعنی سانپ) کو اپنے پاس رکھنے والوں کیلئے اس کے زہر کے تریاق کا علم ہونا لازمی ہے۔

حضرت مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ نفس اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کسی کامل پیر کے سایۂ عاطفت میں نہ آ جائے کیونکہ اس کی صحبت ہی نفس کش ہے۔مولانا رومیؒ کے اس نظریے کی وضاحت انشاءاللہ اس کتاب کے آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔مولانا رومیؒ نے فرمایا۔

هیچ نه کشد نفس را جز ظلِّ پیر دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

(نفس کو مرشد کے (سایۂ عاطفت کے) بغیر کوئی چیز نہیں مار سکتی، ایسے نفس کو مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی سے تھام لو)۔ (م۲:۲۴۴)

نفس کی عائد کردہ رکاوٹیں اسی قدر دقیق ہیں جس قدر اس کی رکاوٹوں کا علاج کرنا دقیق ہے۔بڑی مشکلات وآفات کو دور کرنا بھی بڑا کام ہے۔حضرت امیر معاویہ ؓ ایک جنگ میں صف آرائی کرتے ہوئے مجاہدین سے فرما رہے تھے کہ بڑے کاموں کی تکمیل کیلئے بڑی ہمت، صلاحیت اور بڑی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نفس انسان کا ایک بہت بڑا دشمن ہے اس لئے اس کے شر سے بچنا، اس کی تدبیروں کی مزاحمت کرنا اور نفس کی خواہشات کے خلاف جہاد کرنا، دین اسلام کا بنیادی منشاء ہے۔نفس کے خلاف جہاد کو سمجھنے اور اس کے خلاف تمام ممکنہ تدابیر کو اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے تا کہ ہر مسلمان آفاتِ نفسانیہ سے اپنی حفاظت کر سکے۔نفس کے اس تعارف واہمیت کے بعد اس کی مزید توضیح کیلئے نفس کے لغوی و اصطلاحی معانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نفس کے لغوی معنی

لفظ نفس لغت میں کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) لغت میں عام طور پر نفس کے معنی روح کے آتے ہیں جیسے کہ فرمایا گیا ہے "اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط" (تم اپنی جانیں جسموں سے نکالو)۔[۱]

---

[۱] الانعام:۶:۹۳۔

(۲) نفس کا لفظ دل یا قلب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے فرمایا "اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ" (یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے) ۱؎

(۳) ابو القاسم حسین بن محمدؒ لکھتے ہیں کہ نفس کا لفظ غضب اور غصے کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے "وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ" ۲؎ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے (عذاب) سے (یعنی غضب سے) اس آیت میں نفس کے معنی ذات بھی لیا جاتا ہے۔

(۴) نفس کے معنی سانس کے بھی لئے جاتے ہیں اور اس سانس کا اندر جانا اور باہر آنا روح کیلئے معنوی غذا ہیں۔ نفس کے معنی کشائش اور فراخی کے بھی آتے ہیں۔ تکلیف دور کرنے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے "اَللّٰھُمَّ نَفِّسْ عَنِّیْ" (یعنی اے اللہ میری تکلیف دور فرما)۔ عمدہ ہوا چلنے کو "تَنَفَّسَتِ الرِّیْحُ" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عورت کے بچہ جننے یا حالتِ زچگی میں ہونے کو "اَلنِّفَاسُ" کہتے ہیں۔ دن کے چڑھنے کو "تَنَفَّسَ النَّھَارُ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۳؎ کسی چیز کو عزیز جاننے کو "نَفِیْسٌ جِدًّا" کہا جاتا ہے۔ نفس کے معنی عمدہ چیز یا قیمتی چیز کیلئے جاتے ہیں۔

علماء کے بیان کردہ نفس کے معانی

بہت سے علماء نے نفس کے مختلف معانی بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ نیچے دیا جا رہا ہے:

۱۔ مولانا مجدالدین فیروز آبادیؒ، امام زبیدیؒ، زجاجؒ وغیرہ کے بیان کردہ معانی

نفس (ف پر سکون) کے علماء لغت نے متعدد معانی بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ مشہور لغت دان امام مجدّ دالدین فیروز آبادیؒ نے پندرہ معانی بیان کیے ہیں اور علامہ زبیدیؒ نے دو معانی مزید بیان فرمائے ہیں، ذیل میں ہم اختصاراً یہ معانی ذکر کر رہے ہیں۔

۱) نفس بمعنی روح۔ اس معنی کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ہے کہ آپ فرماتے ہیں ہر انسان کیلئے دو نفس ہیں، ایک نفسِ عقل جس کے ذریعہ اشیاء میں تمیز ہوتی ہے اور دوسرا نفسِ روح جس پر حیات کا دارومدار ہے۔ امام زجاجؒ فرماتے ہیں نفسِ عقل حالتِ نیند میں جدا ہو جاتا ہے اسی لئے تمیز نہیں رہتی اور نفسِ روح جب نکل جائے تو حیات باقی نہیں رہتی۔ درجِ ذیل آیت میں نفس بمعنی روح اور نفس بمعنی عقل دونوں ثابت ہیں۔ "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ج فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط" ۴؎ (اللہ نفس کو اُن کی موت کے وقت قبض

۱؎ البقرہ ۲:۲۳۵۔ ۲؎ آل عمران ۳:۳۰ ۳؎ المفردات، جلد ۱، صفحہ ۵۰۲۔ ۴؎ الزمر ۳۹:۴۲۔

کر لیتا ہے اور اُن (نفس) کو جنہیں موت نہیں آئی ہے اُن کی نیند کی حالت میں، پھر اُن کو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم صادر ہو چکا ہو اور دوسرے (نفس) کو مقررہ وقت تک چھوڑے رکھتا ہے)

۲) نفس بمعنی عقل۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوا۔

۳) نفس بمعنی دم (خون)۔ کہا جاتا ہے ''سَالَتْ نَفْسُهٗ'' (اس کا خون بہہ پڑا) اور حدیث شریف میں ہے ''مَالَانَفْسَ لَهٗ سَائِلَةً فَاِنَّهٗ لَایَنْجِسُ الْمَاءَ'' (جس جانور کا خون جاری نہ ہو تو وہ پانی کو نجس نہیں کرتا) [۱] اس حدیث میں نفس بمعنی خون ہے۔ [۲]

۴) نفس بمعنی جسد۔ امام زبیدیؒ فرماتے ہیں یہ مجازی معنی ہے۔

۵) نفس بمعنی نظر بد۔ حدیث میں ہے کہ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے دم کرنے سے منع فرمایا، سوائے تین چیزوں کے یعنی ''اِلَّافِیْ التَّمْلَةِ وَالْحُمَّةِ وَالنَّفْسِ'' (سوائے تین چیزوں کے پھنسی میں، زہر کے ڈنگ میں اور نظر بد میں)۔ [۳]

۶) نفس بمعنی غیب۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قرآن کریم میں قول ہے ''تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ'' [۴] (تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے)۔

۷) نفس بمعنی کسی چیز کی اصل۔ اس کی حقیقت اور اس کا جوہر مثلاً ''رَأَیْتُ فُلَانًا نَفْسَهٗ'' (میں نے فلاں کو یعنی بعینہٖ خود اسی کو دیکھا)۔

۸) نفس بمعنی عظمت۔ بڑائی

۹) نفس بمعنی غلبہ وعزت۔

۱۰) نفس بمعنی ''انفة''۔ غالب وزبردست

۱۱) نفس بمعنی ارادہ۔

۱۲) نفس بمعنی ''الھمة''۔ ہمت

۱۳) نفس بمعنی ''عقوبة''۔ سزا ''وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَهٗ'' [۵] (اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے)''

۱۴) نفس بمعنی حقیقت۔ کہا جاتا ہے ''نَفْسُ الْاَمْرِ'' یعنی حقیقت مسئلہ یہ ہے کہ۔

---

[۱] تفسیر القرطبی، ابوعبداللہ محمد بن القرطبی، جلد ۱، صفحہ ۳۶۹، دار الشعب، القاھرہ۔

[۲] تاج العروس، جلد ۱۶، صفحہ ۵۵۹۔

[۳] سنن نسائی، امام احمد بن شعیب، متوفی ۳۰۳ھ، حدیث ۱۰۰۸۶، جلد ۶، صفحہ ۷۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

[۴] المائدۃ ۱۱۶:۷ [۵] آل عمران ۲۸:۳

۱۵) نفس بمعنی "عِنْدَ"۔ یعنی نزدیک "تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ" ۱؎ میں بعض کے نزدیک نفس "عِنْدَ" کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا "تو جانتا ہے اسے جو میرے پاس ہے اور میں اسے نہیں جانتا جو تیرے پاس ہے"۔

ب۔ علامہ زبیدیؒ کے بیان کردہ مزید دو معانی

علامہ زبیدیؒ نے مزید دو معنی یہ بیان فرمائے ہیں۔

۱) نفس بمعنی "اَلْاَخ"۔ ابن خالویہ نے کہا نفس بمعنی "اَلْاَخ" یعنی بھائی اور اس کی دلیل یہ آیت ہے "فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ" ۲؎ (پھر جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے (گھر والوں) پر سلام کہا کرو)۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے "لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا" ۳؎ (ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس (بہتان) کو سنا تھا تو مومن مرد اور مومن عورتیں اپنوں کے بارے میں نیک گمان کر لیتے)۔ ان دونوں آیتوں میں "اَنْفُسْ" سے مراد (دینی) بھائی ہیں۔

۲) نفس بمعنی انسان مع روح اور جسم۔ قرآن کریم میں ہے "اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ" ۴؎ (ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہنے لگے: ہائے افسوس! اس کمی اور کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے حق (طاعت) میں کی۔) ۵؎

زیرِ نظر کتاب میں ہماری بحث نفس کے حسب ذیل معانی پر مبنی ہے۔ نفس بمعنی عقل، ہمت، ارادہ، غیب، عند، جوہر، اصل، غلبہ، انسان اور حقیقت۔ اگر غور کیا جائے تو یہ سب معانی پہلے تین معانی میں منضم نظر آئیں گے بلکہ ایک ہی معنی میں تمام معانی کی اصل نظر آئے گی اور وہ ہے نفس بمعنی عقل کہ اسی کے ذریعے کھوٹے اور کھرے، خیر و شر، نفع و ضرر اور ثواب و عذاب میں تمیز ہوتی ہے اور یہ نہ رہے تو انسان مجنوں، دیوانہ اور پاگل کہلاتا ہے اور مکلف (یعنی شریعت کا پابند) نہیں رہتا بلکہ مرفوع القلم ہو جاتا ہے۔

ج۔ سید شریف الجرجانیؒ کا قول

آپؒ فرماتے ہیں کہ نفس ایک لطیف بخاری جوہر ہے جو قوتِ حیاۃ، حس اور حرکتِ ارادی کا حامل (اٹھانے والا) ہے۔ حکماء اسے روحِ حیوانیہ کا نام دیتے ہیں۔ بدن اسی کی شعاع سے حرکت پذیر ہوتا ہے۔ موت کے وقت اس کی شعاع بدن کے ظاہر اور باطن دونوں سے منقطع ہو جاتی ہے اور نیند کی حالت میں فقط ظاہر بدن سے منقطع ہوتی ہے باطن سے نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ نیند اور موت ایک ہی جنس سے ہیں۔ اس لئے

۱؎ المائدہ ۵:۱۱۶۔ ۲؎ النور ۲۴:۶۱۔ ۳؎ النور ۲۴:۱۲۔ ۴؎ الزمر ۳۹:۵۶۔

۵؎ تاج العروس، جلد ۱۶، صفحہ ۵۶۲۔

کہ موت انقطاعِ کلی کا نام ہے اور نیند انقطاعِ ناقص کا۔ پس ثابت ہوا کہ قادر و حکیم نے جوہرِ نفس کا بدن سے تین طرح کا تعلق قائم فرمایا ہے۔

۱) اگر نفس کی روشنی بدن کے جمیع ظاہری اور باطنی اجزا کی طرف پہنچے تو یہ "یَقْظَةٌ" (بیداری) ہے۔

۲) اگر اس روشنی کا تعلق صرف باطن کے ساتھ ہو اور ظاہر کے ساتھ نہ ہو تو یہ "نَوْمٌ" (نیند) ہے۔

۳) اور اگر کلیۃً یہ روشنی منقطع ہو جائے تو یہ موت ہے۔[1]

کیا نفس اور روح سے کوئی ایک چیز مراد ہے یا دو؟

علمائے اسلام کے مابین اس امر میں شدید اختلاف ہے کہ نفس اور روح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا یہ الگ دو چیزیں ہیں۔ اکثر اہلِ علم انہیں ایک ہی چیز تصور کرتے ہیں اور مذکورۃ الصدر (علامہ جرجانیؒ) کی تحریر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اہلِ تحقیق کے نزدیک نفس اور روح دو ممتاز حقیقتیں ہیں۔ یہاں ہم صاحب تاج العروس کی تحقیق پیش کر رہے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں امام سُہیلیؒ نے "اَلــرَّوْضُ الْاَنُفُ" میں فرمایا ہے کہ نفس اور روح میں بکثرت اقوال ہیں۔ آیا یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں یا نفس روح کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ ایک جماعت نے احادیث کے ظاہر سے یہ سمجھا ہے کہ روح ہی نفس ہے جیسا کہ حضرت بلالؓ نے بارگاہ نبوی ﷺ میں عرض کیا تھا "اَخَذَ بِنَفْسِکَ" جس ذات نے حضور ﷺ کے نفس کو قبض کر لیا (یعنی نیند طاری فرما دی) اسی ذات نے میرے نفس کو بھی قبض فرمالیا"۔ جبکہ حضور ﷺ نے یہی بات بایں الفاظ ارشاد فرمائی "اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا" (بے شک اللہ تعالیٰ نے ہماری روحیں (حالت نیند میں) قبض فرمالی تھیں)[2]۔ اور ارشادِ باری ہے کہ "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا"[3] (اللہ جانوں کو اُن کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے)۔

اللہ نفسوں کو وفات دیتا ہے۔ حالانکہ مقبوض روح ہوتی ہے اور اہل علم نے قبض اور وفات میں فرق نہیں رکھا اور الفاظ حدیث بھی تاویل کا احتمال رکھتے ہیں اور اہلِ عرب کے مجازات (یعنی مجازی طور پر ایک کی جگہ دوسرا لفظ بول دینا) اور ان کی زبان کا پھیلاؤ بہت وسیع ہے (اس لئے وہ نفس کی جگہ روح اور روح کی جگہ نفس بول دیتے ہیں) حالانکہ حق یہ ہے کہ ان دونوں کے مابین فرق ہے۔ اگر یہ دونوں نام ایک ہی چیز کے ہوتے جیسا کہ "اَللَّيْثُ وَالْاَسَدُ" لیث اور اسد دونوں نام ایک ہی چیز (یعنی شیر) کے ہیں تو البتہ نفس اور روح

---

[1] کتاب التعریفات، علی بن محمد الجرجانی، متوفی ۸۰۷ھ، جلد ۱، صفحہ ۳۱۲، دار الصادر، بیروت۔

[2] معرفۃ السنن والآثار، ابوبکر البیہقی، حدیث ۹۸۱، جلد ۲، صفحہ ۸۷، دار الفکر، بیروت۔　[3] الزمر، ۳۹: ۴۲

کا ایک دوسرے کی جگہ ذکر کر دینا صحیح ہوتا۔ مثلاً ارشادِ الٰہی ہے "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" ۱؎ (اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے) یہاں "مِنْ نَّفْسِيْ" نہیں فرمایا۔ نیز قرآن مجید میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی "تَعْلَمُ مَافِيْ نَفْسِيْ" (تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے) آپ نے "مَافِيْ رُوْحِيْ" نہیں کہا اور نہ ہی یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کی زبان سے اچھا لگتا ہے۔ ایک اور مقام پر قرآن کریم میں ہے "وَيَقُوْلُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ" ۲؎ (اور وہ اپنے نفسوں میں کہیں گے) اور یہاں "يَقُوْلُوْنَ فِيْ اَرْوَاحِهِمْ" (وہ اپنی روحوں میں کہیں گے) استعمال کرنا حسین نہ ہوتا۔ نیز ارشادِ ایزدی "اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ" (کوئی شخص کہے گا)، یہاں یوں نہیں فرمایا "اَنْ تَقُوْلَ رُوْحٌ" (کوئی روح کہے گی) اور ایسا کوئی بھی عربی شخص نہیں کہے گا۔

پس اگر نفس اور روح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں تو پھر یہ فرق کیسا؟ یقیناً ان دونوں کے مابین تعبیری فرق ہے (کہ لفظِ نفس بول کر روح مراد لے یا روح بول کر نفس مراد لے، ورنہ ذہن میں معنایہ تعبیری فرق نہ ہو تو حقیقی معنوں میں انہیں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنا درست نہیں ہوگا) اس امر کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام عبدالرؤف نے اپنی مشہور تصنیف "فیض القدیر" میں ذکر فرمایا ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ اٰدَمَ وَجَعَلَ فِيْهِ نَفْسًا وَرُوْحًا فَمِنَ الرُّوْحِ عِفَافُهٗ وَفَهْمُهٗ وَحِلْمُهٗ وَسَخَاؤُهٗ وَ وَفَائُهٗ وَمِنَ النَّفْسِ شَهْوَتُهٗ وَ طَيْشُهٗ وَسَفْهُهٗ وَغَضْبُهٗ" ۳؎ (بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اس میں نفس اور روح رکھی۔ پس روح کی بدولت آدمی کی عفت، فہم، حلم، سخاوت اور وفا ہے اور نفس کی وجہ سے اس کی شہوت، طیش، بیوقوفی اور غضب ہے)۔

پس نفس کو مطلقاً روح نہیں کہا جائے گا جب تک کہ اُسے مقید بالمفہوم نہ کیا جائے اور نہ ہی روح کو نفس کہا جائے گا جیسا کہ (کھولتے پانی) کو انسان نہیں کہا جاتا یا جیسا کہ انگوروں کے اندر موجود پانی کو خمر (شراب) یا سرکہ نہیں کہا جاتا، یہاں تک کہ اس پانی میں وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جن کی وجہ سے اُسے خمر یا سرکہ کہا جا سکے۔ پس الفاظ کو مقید معنٰی کے ساتھ ادا کرنا ہی کلام کا مقصود ہے اور ہر لفظ کو اس کے مقام پر لانا ہی بلاغت ہے۔ علامہ سہیلیؒ کا کلام بہت طویل ہے اور طوالت سے ہم اکتا جاتے ہیں، خصوصاً ہمارے زمانے میں۔ اس لئے ہم نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ بہرکیف حضرت امام سہیلیؒ کا طویل ترین کلام اپنی افادیت میں بہت نفیس ہے۔

علامہ زبیدیؒ کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ نفس اور روح کو مجازاً اور اعتباراً ایک دوسرے کی

۱؎ الحجر: ۱۵: ۲۹۔ ۲؎ المجادلہ: ۵۸: ۸۔

۳؎ فیض القدیر، عبدالرؤف مناوی، جلد ۲، صفحہ ۴۲۳ دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

جگہ استعمال کر دیتے ہیں ورنہ حقیقتاً جس طرح یہ الفاظ دو ہیں اسی طرح ان الفاظ کے مدلول (جن پر ان الفاظ کی دلالت ہے) بھی دو ہیں [1]

ہم اپنی اس کتاب میں اصلاحِ نفس کے درپے ہیں تاکہ نفس کے وہ اوصاف رذیلہ زائل کر کے اُسے روح کے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ آپ نے مذکورہ حدیث پاک میں نفس اور روح کے جو اوصاف پڑھے ہیں اُنہیں ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیں۔ نفس و روح کے اس فرق کو مزید واضح کرنے کیلئے حقیقتِ نفس کی وضاحت بہت اہم ہے۔

حقیقتِ نفس

نفس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا نفس بدن کا جز ہے یا عرض ہے، یا جسم ہے جو جسم کے ساتھ رہتا ہے اور جسم میں رکھ دیا گیا ہے، یا جوہرِ مجرد ہے۔ کیا نفس بعینہ روح ہے یا روح سے جداگانہ حقیقت ہے۔ کیا ایک ہی نفس امارہ، لوامہ اور مطمئنہ ہے یا تین ہیں۔ ان مسائل پر لوگوں نے قلم اٹھایا اور بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ان کے بیانات میں بھی تصادم ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو غلطیوں سے بچایا ہے اور ان کے بیانات قابلِ بھروسہ ہیں۔ یہاں ہم کچھ لوگوں کے اقوال نقل کر کے ان پر تبصرہ کرتے ہیں اور پھر صحیح بات بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ ابوالحسن اشعریؒ کی رائے　روح، نفس اور حیات میں اختلاف ہے اور اس میں بھی کہ روح حیات ہے یا غیر حیات اور روح جسم ہے یا غیر جسم؟

۲۔ نظامؒ کا قول: نظام کہتے ہیں کہ روح جسم ہی کا نام ہے اور وہی نفس ہے اس کے نزدیک روح بالذات زندہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حیات وقوت کے معنیٰ حَیٌّ اور قَوِیٌّ ہی کے ہیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ روح عرض ہے۔

۳۔ جعفر بن حربؒ کی رائے: جعفر بن حربؒ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ روح جوہر ہے یا عرض کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ''وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ'' [2] (دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق۔ (انہیں) بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ روح کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض۔ جعفرؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حیات روح کے علاوہ ہے اور یہ بھی کہ حیات عرض ہے۔

۴۔ جبائیؒ کے نزدیک　روح جسم وغیرہ حیات ہے اور حیات عرض ہے کیونکہ لغت میں کہا جاتا ہے کہ انسان کی

---

[1] تاج العروس، جلد ۱، صفحہ ۲۱۶۴۔
[2] بنی اسرائیل، ۱۷:۸۵۔

روح نکل گئی۔اس کے نزدیک روح اعراض میں داخل نہیں۔

۵۔ بعض کے نزدیک روح اعتدالِ طبعی کا نام ہے۔ان کے نزدیک دنیا کی تمام چیزیں چار عناصر، آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے بنی ہیں۔اور سب میں طبعی حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست (خشکی یا سوکھا پن) پائی جاتی ہے۔جبکہ حرارتِ غریزی کو ہی حیات کہتے ہیں۔

یہ تمام لوگ جن کے اقوال ہم نے روح کے بارے میں نقل کیے ہیں۔اصحاب طبائع کہلاتے ہیں۔جو ثابت کرتے ہیں کہ حیات ہی روح ہے۔

۶۔اصمؒ کی رائے: اصمؒ حیات و روح کیلئے جسم کے علاوہ کچھ اور ثابت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ صاحب عقل اور شعور جسم ہی ہے۔جس میں طول و عرض و عمق پایا جاتا ہے اور جسے ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ کہتے تھے کہ نفس بعینہٖ یہی بدن ہے کچھ اور نہیں۔

۷۔ارسطو کے نزدیک: نفس پر تدبیر و نشو و نما اور بوسیدگی طاری نہیں ہوتی۔یہ ایک بسیط جوہر ہے اعمال و تدبیر کی جہت سے تمام عالم حیوانات میں پھیلا ہوا ہے۔یہ قلت و کثرت سے متصف نہیں ہوتا۔یہ ذات اور اصل کے اعتبار سے قابل تجزی (جز کو قبول کرنے والا) ہے۔

۸۔ابوالہذیل کے نزدیک: نفس غیر روح ہے اور روح غیر حیات ہے اور حیات عرض ہے اس کے نزدیک انسان حالت خواب میں مسلوب النفس روح ہوسکتا ہے لیکن مسلوب الحیات نہیں ہوسکتا جس کی دلیل "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ" ہے۔[1]

۹۔ابن سینا کا قول ہے: بعض کا گمان ہے کہ نفس کا بدن سے تعلق نہ تو پڑوس کی وجہ سے ہے نہ سکونت کی وجہ سے نہ چمٹنے کی وجہ سے۔اس کیلئے محض تدبیر بدن ہے۔ابن سینا وغیرہ کا یہی قول ہے۔یہ قول سب سے ردی اور صحت سے بہت دور ہے۔

۱۰۔ابن حزمؒ کی رائے: تمام اہلِ اسلام اور وہ مذاہب جو زندگی بعد الموت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ نفس ایک جسم ہے جسم میں طول و عرض و عمق پایا جاتا ہے۔جو مکان والا ہے اور جسم میں متصرف ہے۔ہمارا بھی یہی قول ہے کہ نفس اور روح ایک ہی چیز ہیں۔

نفس کے اصطلاحی معانی

صوفیائے عظام، محدثین اور فقہائے اسلام کی کتب کا غور و خوض اور گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ منبع فساد اور موجب شر جو چیز ہے وہ نفس ہے، لہٰذا تمام اخلاق رذیلہ اور صفات ذمیمہ

---

[1] الزمر ۳۹:۴۲۔

کے ارتکاب پر برانگیختہ کرنے والی قوت کا نام ہی نفس ہے۔اس لحاظ سے نفس کے وہ آخری منتخب لغوی معانی (جنہیں ہم مذکورالصدر سترہ معانی سے منتخب کر کے الگ ذکر کرآئے ہیں) مراد ہیں اور اصطلاحی معنٰی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

ذیل میں امام ابن مندہؒ، حضرت علی الہجویریؒ اور حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے اقوال درج کئے جارہے ہیں۔

۱۔ امام ابن مندہؒ جوکہ عظیم محدث ہوگزرے ہیں ان کا نقطہ نظر لکھتے ہوئے علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں ''روح اور نفس میں ذاتی فرق ہے۔ نفس کی بقاء روح پر ہے اور نفس ایک صورت ہے اور خواہشات وشہوات سے مرکب ہے۔ انسان کا نفس سے زیادہ کوئی دشمن نہیں ہے۔ نفس دنیا چاہتا ہے اور دنیا ہی سے اُسے رغبت ہے اور روح آخرت کی طرف دعوت دیتی ہے اور آخرت کو ہی ترجیح دیتی ہے۔ خواہش کو نفس کے تابع بنادیا گیا اور شیطان کو نفس وہوا کی تکمیل کا محرک بنادیا گیا۔ فرشتہ عقل وروح کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ اِن دونوں (عقل وروح) کی الہام وتوفیق سے مدد فرماتا ہے، (بلکہ وحی یعنی قرآن وسنت سے مدد فرماتا ہے)'' [۱]۔

۲۔ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ: فرماتے ہیں ''تمام بزرگ اس امر پر متفق ہیں کہ نفس کی حقیقت شر وفتنہ کا سرچشمہ ہے اور نفس برائی پر آمادہ کرنے والی قوّت ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ نفس ایک ذات ہے جو بندہ کے قالب یعنی ڈھانچہ کے اندر ودیعت (رکھی) ہوئی ہے جس طرح کہ روح۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نفس بندہ کے قالب کیلئے ایک صفت ہے جیسا کہ زندگی۔ اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ بُرے اخلاق اور مذموم افعال کا سبب نفس ہی ہے'' [۲]۔

۳۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ مشہور صوفی اور محدث شیخ شہاب الدین سہروردیؒ لکھتے ہیں ''بعض بزرگانِ دین کا ارشاد ہے کہ روح ایک پاکیزہ نسیم ہے اور اسی پر زندگی کا مدار ہے اور نفس ایک گرم ہوا ہے جس سے مذموم حرکات اور خواہشات وشہوات کا صدور ہوتا ہے اور اسی سے یہ محاورہ بنا ہے '' فُلَانٌ حَـارُ الرَّأسِ '' فلاں کے سر میں بہت گرمی (یعنی غصہ) ہے۔

اس موضوع پر اس فصل میں ہم نے مشائخ عظامؒ کے جن ارشادات کو پیش کیا ہے اور نفس کی ماہیت بیان کی ہے اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ نفس ہی سے تمام مذموم افعال واخلاق کا صدور ہوتا ہے اور اس کا تدارک مجاہدہ اور ریاضت سے ممکن ہے اور اس کی صفاتِ مذمومہ کو ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ صفاتِ محمودہ میں

---

[۱] کتاب الروح، ابن قیم، صفحہ ۳۳۱، نفیس اکیڈمی، کراچی۔ [۲] کشف المحجوب، صفحہ ۳۳۷۔

بدلا جاسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب یہ آیت تلاوت فرماتے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا " [1] (پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھادی) تو ٹھہر جاتے اور یوں دعا فرماتے "اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا" [2] (اے اللہ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما اور تو ہی اس کو پاک فرما، تو بہترین پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا مالک اور مددگار ہے)۔

نفس کی تعریف حضرت امام غزالیؒ، داتا گنج بخشؒ اور شہاب الدین سہروردیؒ کے مطابق

نفس کی تعریف میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی حسب ذیل عبارت میں صوفیاء کی مکمل ترجمانی ہے۔ آپ فرماتے ہیں لفظ نفس کئی معنوں میں مشترک ہے اور ہمارا مقصود یہاں صرف دو معنوں میں ہے جن میں سے اصطلاحی معنی نیچے دیئے جارہے ہیں "اَحَدُهُمَا اَنَّهٗ يُرَادُ بِهِ الْمَعْنٰى الْجَامِعُ الْقُوَّةِ الْغَضَبِ وَالشَّهْوَةِ فِى الْاِنْسَانِ وَهٰذَا الْاِسْتِعْمَالُ هُوَ الْغَالِبُ عَلٰى اَهْلِ التَّصَوُّفِ لِاَنَّهُمْ يُرِيْدُوْنَ بِالنَّفْسِ الْاَصْلِ الْجَامِعِ لِلصِّفَاتِ الْمَذْمُوْمَةِ مِنَ الْاِنْسَانِ فَيَقُوْلُوْنَ لَابُدَّ مِنَ الْمُجَاهَدَةِ النَّفْسِ وَكَسْرِهَا" [3] (ان میں سے ایک یہ ہے کہ نفس انسان کے اندر غضب اور شہوت کی ایک جامع قوت ہے اور اہل تصوف کے ہاں لفظ نفس اکثر اسی معنی میں استعمال ہے، اس لئے کہ وہ نفس کو صفات مذمومہ کی اصل جامع قوت قرار دیتے ہیں جو انسان سے ظاہر ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ فرماتے ہیں کہ نفس کی حدت (تیزی) کو توڑنے کیلئے مجاہدۂ نفس لازمی ہے)۔

امن و حزن نفس کے نقیب ہیں۔ جب نفس فانی ہو جائے تو بندہ کی صفت رضا ہو جاتی ہے اور جب رضا حاصل ہوگئی تو وہ اپنے حال میں مستقیم ہو گیا اور رویتِ محبوب میں محو (مشغول) ہو گیا اور باقی تمام احوال سے اعراض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت ولایت کا دل پر کشف ہوتا ہے۔ اور ولایت کے تمام اسرار اس پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا: نفس کے لغوی معنی شی یا شئی ذات ہیں، یا حقیقت و ذات کے معنی میں مروج ہے۔ صوفیائے کرامؒ نے اس کے معنی خصائلِ رذیہ، اخلاقِ سیئہ، عاداتِ سفلیہ اور خواہشاتِ رذیلہ کے کیئے ہیں۔ [4]

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں: جب مطلق نفس کہا جائے تو اس سے وجود مراد نہیں ہے اور نہ ہی وہ ڈھانچہ مراد ہے۔ نفس کے موضوع سے مراد بندے کے اوصاف ہیں۔ جن میں خامی یا کجی پائی جاتی

---

[1] الشمس ۹۱:۹۔ [2] السنہ عمر بن ابی عاصم الشیبانی، متوفی ۲۸۷ھ، حدیث ۳۱۹، جلد ۱، صفحہ ۱۳۹، المکتب الاسلامیہ، بیروت۔
[3] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۴۔ [4] کشف المحجوب، صفحہ ۳۲۷۔

ہے یا اخلاقِ مذمومہ مراد ہیں۔ دونوں ارواح کی جدائی اس طرح سے ناگوار ہے جیسے کہ موت۔ ان کی جدائی موت ہے اور روحِ علویہ سے روحِ حیوانیہ کو تسکین حاصل ہوئی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو کر نفس بن گئے۔ اس پیار کے نتیجہ میں قلب پیدا ہوا۔ (قلب وہ لطیفہ ہے جس کا محل گوشت والا قلب ہے) گوشت والا قلب عالمِ خلق سے اور لطیف قلب عالمِ امر سے۔ قلب امری روح سے بہت محبت رکھتا ہے۔[1]

نفس اور روح سے متعلق قاضی ثناء اللہؒ کی تحقیق مفید

قاضی ثناء اللہؒ نے واضح کیا ہے کہ نفسِ انسانی ایک جسمِ لطیف ہے، جو اس کے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے۔ اور وہ انہی مادی عناصرِ اربعہ سے بنا ہے۔ فلاسفہ اور اطباء اسی کو روح کہتے ہیں مگر درحقیقت روحِ انسانی ایک جوہرِ مجرد اور لطیفۂ ربانی ہے، جو اس طبعی روح یعنی نفس کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے اور طبعی روح یعنی نفس کی حیات خود اس لطیفۂ ربانی پر موقوف ہے۔ گویا اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں کیونکہ جسم کی زندگی نفس سے ہے اور نفس کی زندگی روح سے وابستہ ہے۔ اس روحِ مجرد اور لطیفۂ ربانیہ کا تعلق اسی جسمِ لطیف یعنی نفس کے ساتھ کیا اور کس طرح کا ہے اس کی حقیقت ان کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔

قاضی ثناء اللہؒ نفس کو جسمِ لطیف کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اسے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آئینہ کی مثال بنایا ہے جو آفتاب کے بالمقابل رکھ دیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آ جاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی طرح روشنی پھیلاتا ہے۔ نفسِ انسانی اگر تعلیمِ وحی کے مطابق ریاضت و محنت کر لیتا ہے تو وہ بھی منور ہو جاتا ہے، ورنہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہوتا ہے۔ یہی وہ جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں جب کہ وہ منور ہو چکا ہو۔ یہی جسمِ لطیف ہے جس کے بارے میں حدیث مذکور ہے کہ ہم نے اس کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں اس کو لوٹائیں گے، پھر اس سے دوبارہ پیدا کریں گے۔ یہی جسمِ لطیف نیک اعمال سے منور اور خوشبودار بن جاتا ہے اور کفر و شرک سے بدبودار ہو جاتا ہے۔

روحِ مجرد کا تعلق جسمِ لطیف کے واسطے سے جسمِ کثیف کے ساتھ ہوتا ہے اور اس پر موت طاری نہیں ہوتی۔ قبر کا عذاب و ثواب بھی اسی جسمِ لطیف یعنی نفس سے وابستہ ہے اور اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے اور روحِ مجرد علیین میں ہوتی ہے اور روحِ مجرد اس کے عذاب و ثواب سے بالواسطہ متاثر ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کا قبر میں ہونا طبعی نفس کیلئے صحیح ہے۔ یعنی جیسے کہ پہلے مذکور ہے کہ قبر کے ساتھ نفس کا تعلق ہے اور

[1] عوارف المعارف مترجم، شہاب الدین سہروردی، متوفی ۶۳۲ھ، صفحہ ۲۲۸، مدینہ پبلشرز کراچی۔

اس کا عالمِ ارواح یا علیین میں رہنا طبعی روحِ مجرد ہے۔

نفس کی عقل اور روح سے دشمنی

اس کتاب میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ نفس انسان کو ہمیشہ بُرائی کی طرف راغب کرتا ہے مگر فطرتاً دل کا تقاضا اچھائی کی طرف رہتا ہے۔ عقل نورانی ہے اور بہتر چیز کی طلبگار ہے تو پھر تاریک نفس اس پر کیوں غالب آ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس اپنے گھر میں ہے اور تیری عقل گھر سے باہر ہے۔ تو عقل سے بیگانہ ہو گیا ہے اور تو نے (بے عملی کے باعث) اسے اپنے سے دور کر دیا ہے اور اپنے دل کے اندر نفس کو بسالیا ہے (کیونکہ تو اسکے ہر حکم کو مانتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اگر روح کمزور ہو جائے تو نفس انسان کے دل کو اپنی چونچ میں دبا کر وسوسے پیدا کرتا ہے مشائخ کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو نفس دل پر سوار ہو جاتا ہے ورنہ روح اگر قوی اور مضبوط ہو تو نفس کو دل کی طرف نگاہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی)۔ اب وہ نفس کا کتا اپنے گھر میں رہ کر شیر بن گیا ہے اور عقل ماری ماری بے سروسامان پھرتی ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں کیونکہ اس کا گھر تو دل تھا مگر تم نے اس کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ جب عقل اپنے اصلی گھر میں مقیم ہو جائے تو نفس کے کتے پر اس کی حکومت واضح ہو جائے گی اور نفس کو دل کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔

عقل نورانی ونیکو طالب ست　　　نفس ظلمانی بروچوں غالب ست

(عقل نورانی اور بہترین چیز کی طلبگار ہے، نفس تاریک اس پر کیوں غالب آ جاتا ہے) (۳-۲۴۷)

آشنائی نفس باهر نفس پست　　　تو یقیں می داں کہ هر دم کمترست

(نفس کی ہر پست نفس سے شناسائی ہے، تو یقین کر (کہ عقل) ہر دم گھٹتی ہے) (۳-۲۵۹)

نفس کی معاونت نفس ہی کرتا ہے اور شیطان اس سے کام لیتا ہے

نفس کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً نفسِ امّارہ، نفسِ حیوانی، نفسِ رحمانی، نفسِ کُل، نفسِ کلی، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ، نفسِ ناطقہ اور نفسِ ناطقہ انسانی وغیرہ۔ ان سب کے اعمال اور اوصاف الگ الگ ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر اس کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب ایک نفس دوسرے نفس کی تائید میں کام کرنا شروع کر دیتا ہے تو عام انسان کی عقل جو عموماً ناقص ہوتی ہے معطل اور بے سود ہو جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر کمزور سی روح سے بہت زیادہ طاقتور بن جاتے ہیں۔ اس طرح کا مضبوط نفس کمزور عقل کی راہوں کو چھپا دیتا ہے اور روح پر ظلمت چھا جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر نفس کے ذرائع

مسدود کر دیئے جائیں تو یہ عارضی طور پر بے حس وحرکت اژدھے کی طرح بے جان یا مردہ نظر آتا ہے مگر جب موقع مل جائے تو دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ شیطان بھی نفس کو اپنی پیروی اور اتباع میں لانا چاہتا ہے۔ نفس اور شیطان شروع سے ہی آدم علیہ السلام کی دشمنی اور مخالفت میں مصروف رہتے تھے۔ یہ ازل سے ہی دونوں ایک تھے اور حقیقت میں نفس اور شیطان ایک ہی چیز ہیں جنہوں نے دو مختلف صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں۔

نفس با نفسِ دگر چوں یار شد　　عقل جزوی عاطل و بیکار شد

(ایک نفس جب دوسرے نفس کا یار بنا، تو ناقص عقل معطل و بے کار ہو گئی)

نفس با نفس دگر دوتا شود　　ظلمت افزوں گشت ورہ پنہاں شود

(نفس نفس کے ساتھ مل کر دوگنا ہو جاتا ہے، اندھیرا بڑھ جاتا ہے اور (عقل کا) راستہ چھپ جاتا ہے) (۲-۱۸)

نفست اژدرہا ست اُو کے مردہ است　　از غم بے آلتی افسردہ است

(تیرا نفس اژدہا ہے وہ مردہ کہاں ہے، ذرائع نہ ہونے کے غم میں ٹھٹھرا گیا ہے) (۳-۱۰۸)

نفس مومن اسفرے آمد یقیں　　کو بزخم ورنج زفت ست سمیں

(مومن کا نفس یقیناً اسفر ہے، جو چوٹ اور رنج سے قوی اور موٹا ہوتا ہے) (۴-۲۱)

نفس و شیطاں بود ز اوّل واحدے　　بود آدمؑ را عدوّ وحاسدے

(نفس اور شیطان شروع سے ایک تھے آدم علیہ السلام کے دشمن اور حاسد تھے) (م ۳:۳۰۹)

نفس و شیطاں ہر دو یک تن بودہ اند　　در دو صورت خویش را بنمودہ اند

(نفس اور شیطان دونوں ایک تھے، انہوں نے دو صورتوں میں اپنے آپ کو دکھایا ہے) (۳-۳۸۶)

نفس بے وفا گردن زنی کے قابل ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس ریاضت کے بغیر قابو نہیں آتا اور اس ریاضت کے دوران نفس کو گھوڑے کی دولتیاں بھی کھانا پڑتی ہیں۔ نفس بے وفا ہے اور کسی سے وفا نہیں کرتا ہے اور یہ گردن زنی کے قابل ہے۔ اس کا امام یا قبلہ گاہ بھی کمینہ ہے۔ یہ دنیا کمینی ہے اور کمینے نفس کیلئے بہت موزوں ہیں۔ نفس ایک ایسے گور وکفن کی مانند ہے جو مردوں کیلئے ہی تیار کیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں نفس اور شیطان کی ہی حکمرانی ہے اور یہاں صرف ان دونوں کی بات چلتی ہے کیونکہ جب کوئی شخص شیطانی اور بے حیائی کا کام کرتا ہے تو اس کے شائقین سب اکٹھے ہو کر اس کیلئے رنگ وراگ کی محفلوں کو سجاتے ہیں لیکن اگر کوئی روحانی مجلس کا انعقاد کرے

تو وہاں صرف چند لوگ ہی پہنچتے ہیں۔ نفس کے ساتھ رافت اور رحمت سے یا نرمی سے پیش آنے والے کو نفس ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

نفسہا را تا مروّض کردہ ام — زیں ستوراں بس لگدھا خوردہ ام

(میں نے جب سے نفسوں کو ریاضت کرنے والا بنایا ہے ان گھوڑوں کی بہت سی دولتیاں کھائی ہیں)(م۴:۱۹۵)

نفس بے عہد ست زاں رُو کُشتنی ست — اُو دنیّ و قبلہ گاہ اُو دنیّ ست

(نفس بے وفا ہے اس لئے گردن زنی کے قابل ہے، وہ کمینہ ہے اور اس کا قبلہ گاہ (بھی) کمینہ ہے)

نفسہا را لائق ست ایں انجمن — مردہ را در خور بُود گور و کفن

(نفسوں کیلئے یہ انجمن مناسب ہے، گور و کفن مردہ کیلئے مناسب ہوتا ہے) (۴:۱۶۴)

نفس و شیطاں خواهش خود پیش برد — واں عنایت قہر گشت و خرد و مُرد

(نفس اور شیطان کی اپنی خواہش چلتی ہے اس کیلئے مہربانی مغلوب اور ریزہ ریزہ ہوگئی ہے)(۵:۲۹۷)

نفس روح کا نور نہیں یہ فرعون ہے اس کو بھوکا رکھو

نفس میں شہوت اور فرعونیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ نفس میں روح جیسا نور موجود نہیں ہوتا۔ اس میں تو نفس کی تاریکیاں اور خدا کیلئے نافرمانی اور سرکشی کا شر موجود رہتا ہے۔ دِل کی کیفیت کو دیکھ کر نفس انسان کی کمزوری کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ جب نفس اس بات کا مشاہدہ کر لیتا ہے کہ روح بالکل کمزور اور ضعیف ہوگئی ہے تو یہ شیر کی طرح روح پر حملہ آور ہو کر اسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے ورنہ اگر روح طاقتور ہو تو نفس کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس کی طرف میلی آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس فرعون کی طرح متکبر اور مطلق العنان فطرت کا مالک ہے۔ فرماتے ہیں کہ خبردار اس نفس کی آرزوؤں کو پورا کر کے اس کا پیٹ نہ بھرو اور خود کھانا زیادہ نہ کھاؤ۔ اپنے پیٹوں کو بھوکا رکھو، جگروں کو پیاسا رکھو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے نور کو دیکھ سکو اور زیادہ کھانے سے نفس اپنے پرانے کفر کی طرف لوٹ نہ آئے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

نفس شہوانی نہ دارد نورِ جاں — من بہ دل کوریت می دیدم عیاں

(شہوت والا نفس روح کا نور نہیں رکھتا، میں دِل کے ذریعے تیرے اندھے پن کا مشاہدہ کر رہا تھا)

نفس شہوانی ز حق کرّ ست و کور — من بدل کوریت می دیدم ز دُور

(۴:۳۴)

(شہوت والا نفس اللہ تعالیٰ سے بہرا اور اندھا ہے میں نے دِل کے ذریعے دور سے تیرے اندھے پن کو دیکھ لیا تھا)

نفس فرعونیست هاں سیرش مکن — تـــانیـــا رد یـــاد زاں کُـفـر کُـهـن
(نفس فرعون ہے خبردار اس کا پیٹ نہ بھرنا' تا کہ وہ پرانے کفر کو یاد نہ کرے) (۴:۳۴۲)

حضرت داتا گنج بخشؒ نے ''کشف المحجوب'' میں لکھا ہے کہ بزرگوں نے نفس کو مختلف شکلوں میں دیکھا ہے۔ کسی نے لومڑی کی شکل میں اور کسی نے خرگوش کی شکل میں دیکھا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا خرگوش صفت نفس ہر وقت اِدھر اُدھر منہ مارنے میں مشغول رہتا ہے اور انسان فلسفہ اور دلائل کی حجتوں میں گمراہ رہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات نفس اچھی باتوں کی طرف بلا کر بھی گمراہ کر دیتا ہے اور اگر وہ بھلائی کی طرف دعوت دے تو یقیناً اس کی اس دعوت میں کوئی نہ کوئی مکروفریب ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ نے ''کیمیائے سعادت'' میں ایک عابد کا قصہ لکھا ہے کہ کسی جنگل میں لوگ کسی درخت کی پوجا کے بارے میں اُلجھ گئے تو وہ عابد رسی اور کلہاڑی لے کر اس درخت کو کاٹنے کیلئے نکل پڑا۔ راستے میں انسان کی شکل میں شیطان نے اسے منع کیا مگر وہ نہ مانا اور آخر اس کی اور شیطان کی کشتی ہوگئی تو عابد نے شیطان کو تین بار چت کر لیا۔ شیطان نے کہا کہ تم فلاں وظیفہ کرو تو تمہیں روز تین دینار تکیہ کے نیچے سے ملیں گے جن میں سے ایک دینار اللہ تعالیٰ کے نام پر دے دیا کرو اور باقی خود کھاؤ پیو۔ وہ عابد مان گیا اور تین چار دن کے بعد وہ دینار تکیے کے نیچے سے برآمد ہونا بند ہو گئے تو وہ عابد پھر کلہاڑی لے کر چل نکلا مگر اس بار شیطان نے اس کو تین بار چت کر دیا۔ شیطان نے اسے چت کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ پہلی بار تو خدا کیلئے گھر سے نکلا تھا لیکن دوسری بار خدا کیلئے نہیں بلکہ تین دیناروں کیلئے نکلا تھا۔ شیطان کی ہر حرکت میں کوئی نہ کوئی خرابی کی صورت ہوتی ہے۔ کبھی وہ نیکی کی طرف بلاتا ہے تو اس میں بھی اس کا مقصد آخرکار برائی کی طرف لے جانا ہوتا ہے۔ کبھی وہ زیادہ بُری شے سے کم بُری شے کی طرف راغب کر دیتا ہے لیکن آخرکار مکمل برائی میں پھنسا دیتا ہے۔ زنا سے منع کرتا ہے تو شراب میں لگا دیتا ہے اور شراب کے نشے میں سب کچھ کروا دیتا ہے۔

نفس خرگوشست بصحراء درچرا — تو بقعر ایں چۂ چوں و چرا
(تیرا خرگوش (صفت) نفس جنگل کے اندر چرنے میں مشغول ہے اور تو چوں وچرا کے اس کنویں کی گہرائی میں ہے)

نفس حسّ گر جویدت کسب شریف — حیلہ و مکرے بود آں را ردیف
(حسّی نفس اگر تجھ سے اچھی کمائی کا مطالبہ کرے تو ضرور کوئی حیلہ اور مکر اس کے پس پشت ہوگا) (م-۲-۲۲۸)

نفس را زاں نیستی وا می کشی — زانکہ بے فرماں شد اندر بیہُشی
(آپ نفس کو اس نیستی سے اس لئے جدا کر دیتے ہیں کیونکہ وہ بغیر حکم کے بے ہوش ہوا ہے) (م-۶-۳۰۶)

هیچ کس را تا نگردد او فنا — نیست رہ دربارگاہ کبریا

(کسی شخص کیلئے جب تک وہ فنا نہ ہو جائے کبریا کی بارگاہ میں راستہ نہیں ملتا) (م-٦-٣٦)

نفس را زیں صبر می کن منحنیش — کہ لئیم ست و نسازد نیکوئیش

(نفس کو صبر کے ذریعے کمزور بنا کیونکہ وہ کمینہ ہے بھلائی اس کے ساتھ ساز نہیں کرتی ہے) (م-٣-٢٨٧)

نفس زینسان ست زاں شد کشتنی — "اُقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ" گفت آں سُنی

(نفس ایسا ہی ہے اس وجہ سے وہ گردن زنی کے قابل ہے تم اپنے نفسوں کو قتل کرو یہ خدائے بزرگ نے فرمایا ہے) (٣-٤٨)

ابلیس کا سامانِ مکر وفریب ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کی بہت سی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں۔ کہیں وہ تسبیح اور قرآن سے گمراہ کرتا رہتا ہے اور کبھی حج وزکوٰۃ سے گمراہ کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ مختلف بھیس بدل کر لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔ بٹیر باز بٹیروں کی فصل میں جال لگا کر بٹیروں کی سی آواز نکالتا ہے اور کھیت کے بٹیر دھوکے میں آکر اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مولاناؒ نے اس تدبیر کی مثال جعلی پیروں کے متعلق دی ہے اور کہا ہے کہ ان جعلی پیروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں کیونکہ جعلی پیر بٹیروں کو گمراہ کرنے والوں کی طرح لٹیروں کی شکل میں آکر لوگوں کو پھانس لیتے ہیں اس لئے ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے دینا چاہیے۔

نفس را تسبیح و مصحف در یمیں — خنجر و شمشیر اندر آستیں

(نفس کے داہنے ہاتھ میں تسبیح اور قرآن ہے، آستین کے اندر خنجر اور تلوار ہے)

مصحف سالوس او باور مکن — خویش با او همسر و همسر مکن

(اس کے مکر کے قرآن پر اعتماد نہ کر اپنے آپ کو اس کا ہمراز اور ہمرتبہ نہ بنا) (٣-٢٤٧)

علامہ اقبالؒ نے بھی مذکورہ حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ عقل مکار ہے اور سو بھیس بدل کر لوگوں کو گمراہ کرتی ہے اور جن لوگوں کو عشق کی دولت ملی ہے وہ اس کے قابو میں نہیں آتے لیکن جب عشق خام نہ ہو تو عقل کی چالوں سے بچ جاتا ہے اس وقت عقل، عقل سلیم کی صورت میں آجاتی ہے چنانچہ فرمایا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

(ب ج:٣٥٢)

نفس کی چالیں بہت باریک ہوتی ہیں

اہلِ نفس اپنی غرض کی طلب کیلئے صاحبِ جنوں ہوتے ہیں اور ہر حالت میں اپنی طلب کو حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ دراصل اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی شیطانی مُحرّک ہوتا ہے جو انسان کے دِل میں خواہشات کا

جال ڈال کر اس کو اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ بیچارہ انسان اس کے سامنے دم بخود ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہر لحہ کسی نہ کسی شے کی محویت کا گرویدہ رہتا ہے۔ انسان کی یہ خواہش اس کی معرفت کا اور روحانی جذبات کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اپنی غلط خواہش کے معمول کیلئے نفس ہزاروں جواز اور تاویلات تلاش کرتا ہے اور اگر انسان اس نفس کو ختم کر دے تو ان تمام کشمکشوں سے لبریز زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ نفس کی بہت سی بیماریاں ہیں جن کو معلوم کر لینا چاہیے اور بچنے کی تدابیر کرنا چاہیے۔ اگر علاج ہو گیا تو نفس کے آزار سے بچ جاؤ گے۔

زانکہ نفسش گرد علت می تند   معرفت را زود فاسد میکند
(کیونکہ اس کا نفس کسی غرض کا چکر کاٹتا ہے اور معرفت کو بہت جلد خراب کر دیتا ہے) (م-۳-۲۵۹)

از سموم نفس چوں باعلتی   ہرچہ گیری تو مرض را آلتی
(چونکہ تو نفس کی زہریلی ہوا سے بیمار ہے تو جو بھی لے گا وہ بھی مرض کا آلہ (کار) بنے گا) (۳-۲۶۰)

نفس تُست آں مادر بدخاصیت   کہ فساد اُوست در ہرناحیت
(تیرا نفس تیری وہ بدعادت ماں ہے کہ ہر جانب اسی کا فساد ہے) (۲-۸۵)

نفس کشتی باز رستی زاعتذار   کس ترا دشمن نہ ماند در دیار
(اگر تو نے نفس کو مار ڈالا تو عذر خواہی سے چھوٹ جائے گا دنیا میں تیرا کوئی دشمن نہ رہے گا)(م-۸۵۲)

نفس کے عزائم بدخلقی پر استوار ہیں

نفس کے مقاصد اور عزائم نہایت برائی پر استوار ہیں اور وہ انسان کو ویران کرنا چاہتا ہے لہٰذا جو بات یا جو مشورہ تم کو نفس کی طرف سے ملے تو اس کے برعکس عمل کرو۔ انسان کا یہی کمال ہے کہ نفس کی تجاویز کے اُلٹ سمت میں کام کرے۔

روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص کو رات کے وقت غسل کی ضرورت پڑی۔ سردی کا موسم تھا اور دریا کا پانی بہت ٹھنڈا تھا تو اس کا دِل کسمسایا کہ اتنی سردی میں غسل نہ کیا جائے اور رات کی عبادت اس مجبوری کے پیشِ نظر ترک کر دی جائے لیکن اس کے دِل نے نفس کے خلاف عمل کیا اور گرم چوغے کے ساتھ خود کو دریا میں ڈال دیا اور پھر نفس کو سزا دینے کیلئے گیلے اور گرم کپڑوں کو اپنے جسم پر ہی خشک کیا تا کہ آئندہ اُسے احکامِ الٰہی سے کسمسانے کی جرأت نہ ہو۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اور دیگر مشائخ نے اپنے نفس کی کن باتوں سے تادیب کی ہے وہ ہم اپنی دیگر کتب مثلاً ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' اور ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں بیان کر چکے ہیں۔

جس نے بھی طریقت میں اپنا مقام بنایا ہے اس نے بہت مشقتوں اور مجاہداتِ نفس سے مقام بنایا ہے۔

حضرت بایزیدؒ سے جب کسی نے ان کے مجاہدات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کو بتایا کہ تم میرے بڑے مجاہدات تو کیا ادنیٰ مجاہدات کو بھی نہیں سُن سکتے۔ فرمایا ایک بار میرے نفس نے پلاؤ کھانے کی خواہش کی تو میں اس کو ٹالتا رہا۔ آخر مجھے کہا گیا کہ نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ میں نے نفس کو کہا کہ اچھا تمہیں اس شرط پر پلاؤ کھلاتا ہوں کہ پھر اور کوئی خواہش نہیں کرے گا۔ نفس نے اس شرط کو تسلیم کر لیا مگر پلاؤ کھانے کے بعد نفس نے جب پانی مانگا تو میں نے اسے اس شرط سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس وعدہ خلافی کے بدلے میں اب تمہیں ایک سال تک پانی نہیں پلاؤں گا چنانچہ ایک سال تک میں نے پانی نہیں پیا۔[1] مولانا فرماتے ہیں۔

نفس می خواھد کہ تا ویراں کند　　خلق را گمراہ و سرگرداں کند

(نفس چاہتا ہے کہ تباہ کردے، مخلوق کو گمراہ اور پریشان کردے)

نفس خود را زن شناس از زن بدتر　　زانکہ زن جز و ست نفست کُل شر

(اپنے نفس کو عورت سمجھ، عورت سے بھی بدتر اس لئے کہ عورت تو شر کی جزو ہے اور تیرا نفس پورا شر ہے)

مشورت بانفس خود گرمی کنی　　ھرچہ گوید کن خلاف آں دنی

(اگر تو اپنے نفس سے مشورہ کرے تو جو وہ کہے اس کمینہ کے خلاف کر)

مشورت با نفس خویش اندر فعال　　ھرچہ گوید عکس آں باشد کمال

(تم کاموں میں اپنے نفس سے مشورہ (کر سکتے ہو) مگر جو کچھ وہ کہے اس کے برعکس کرنا کمال ہے)(۲-۲۱۹)

نفس اوصافِ مذمومہ کا محل ہے

صوفیاءؒ فرماتے ہیں: نفس ایک لطیف چیز ہے جو قالب میں موجود ہوتی ہے اور اُسی سے صفاتِ مذمومہ اور اخلاقِ سیئہ کا صدور ہوتا ہے، جس طرح روح ایک لطیف چیز ہے اور جس کا محل و مقام قلب ہے اور جمیع اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ محمودہ کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس طرح آنکھ دیکھنے کا، کان سننے کا، ناک سونگھنے کا اور منہ قوّت ذائقہ کا محل ہے اسی طرح نفس اوصافِ مذمومہ کا محل ہے اور روح اوصافِ محمودہ کا۔

نفس کی بنیاد طیش اور طمع پر ہے

صوفیاءؒ فرماتے ہیں: نفس کے تمام اخلاقِ ذمیمہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک طیش اور دوسری طمع۔ طیش جہل سے پیدا ہوتا ہے اور طمع لالچ اور حرص سے۔ طیش کے لحاظ سے نفس ایک مستدیر (گول) کُرے کے

---

[1] تذکرۃ الاولیاء، فریدالدین عطار، صفحہ ۱۱۰، شمع بک ایجنسی، لاہور۔

مشابہ ہوتا ہے جو ایک شفاف اور چکنے مقام پر رکھا ہو، یہ کرّہ بالطبع حرکت کرتا رہے گا اور اپنی ساخت کے اعتبار سے کبھی غیر متحرک نہیں ہوگا اور حرص کے اعتبار سے ایک ایسے پروانے کے مشابہ ہے جو فقط چراغ کی روشنی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خود کو چراغ پر گرا دیتا ہے اور یہی گرنا اس کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ طیش (کی جبلت کے وجود میں آنے) کا باعث جلد بازی اور بے صبری ہے اور ظاہر ہے کہ صبر جوہرِ عقل ہے اور طیش صفتِ نفس ہے اور اس کی خواہشات اور اس کی اصل پر صبر ہی سے قابو پایا جاسکتا ہے اور عقل کے ذریعے خواہشات کا قلع قمع ہوتا ہے۔[1]

مذکور الصدر تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ہوا و حرص، طمع و لالچ، بغض و حسد، شہوت و غضب اور تمام اخلاقِ رذیلہ اور صفاتِ ذمیمہ کا منبع و مرکز نفس ہے لہٰذا درج ذیل الفاظ مثلاً مجاہدہ، تزکیہ، تصفیہ، محاسبہ اور معاقبہ و معاتبہ وغیرہ جب نفس کی طرف مضاف (اشارہ کررہے) ہوں تو اس سے یہی نفس مراد ہوتا ہے یعنی جب یوں کہا جائے مجاہدۂ نفس، محاسبۂ نفس علیٰ ھٰذا القیاس تو اس سے یہی صفاتِ مذمومہ کا منبع نفس مراد ہے۔

مفہومِ انسان

مفہومِ انسان میں چار اقوال ہیں: انسان فقط روح ہے یا فقط بدن ہے۔ یا دونوں کا مجموعہ ہے۔ یا ان میں سے ہر ایک ہے۔ ان میں ناطق اور اس کے نطق میں بھی اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں امام رازیؒ کے چھ اقوال ملتے ہیں۔

۱) بعض کے نزدیک اس جسم سے اخلاط اربعہ مراد ہیں جن سے یہ بدن پیدا ہوتا ہے۔

۲) بعض کے نزدیک یہ جسم خون ہے۔

۳) بعض کے نزدیک یہ جسم روح لطیف ہے جو دل سے پیدا ہو کر شریانوں کے ذریعہ تمام اعضا میں پھیلتی ہے۔

۴) بعض کے نزدیک یہ جسم روح ہے جو دل میں پیدا ہو کر دماغ کی طرف چڑھتی ہے اور حفظ، فکر و ذکر کی صالح کیفیت سے متصف ہوتی ہے۔

۵) بعض کے نزدیک یہ جسم دل میں ایک ناقابل تجزی جز ہے۔

۶) بعض کے نزدیک یہ ایک جسم ہے جو ماہیت میں اس جسمِ محسوس سے الگ ہے اور وہ ایک علوی نورانی

---

[1] عوارف المعارف مترجم، صفحہ ۲۱۴۔

لطیف جسم ہے جو زندہ اور متحرک ہے۔ اور تمام اعضا میں جاری وساری ہے۔ جیسے گلاب میں عرق، زیتون میں روغن اور کوئلہ میں آگ ہوتی ہے۔ پھر جب تک ان اعضاء میں اس جسمِ لطیف سے پیدا شدہ آثار کی قبولیت کی صلاحیت رہتی ہے۔ یہ جسم لطیف ان اعضاء میں گھسا ہوا رہتا ہے اور ان پر حس اور ارادے کا فیضان کرتا رہتا ہے اور جب یہ اعضاء غلیظ اخلاط کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں اور روح کے آثار قبول کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں تو روح بدن سے جدا ہو کر عالم ارواح میں چلی جاتی ہے۔

چھٹا قول ہی صحیح ہے: اس موضوع پر ہماری رائے کے مطابق یہی قول صحیح ہے۔ اس کے سوا کوئی اور قول صحیح نہیں۔ اسی پر قرآن وحدیث، اجماع صحابہ کرام ﷺ کے عقلی اور وجدانی دلائل بھی قائم ہیں۔ اب ہم اس قول کی حمایت میں اُن دلائل کو نقل کرتے ہیں جنہیں امام ابن قیمؒ نے کتاب الروح میں نقل کیا ہے۔

پہلی دلیل: ''اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا''[1] (اللہ جانوں کو اُن کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور اُن (جانوں) کو جنہیں موت نہیں آئی ہے اُن کی نیند کی حالت میں، پھر اُن کو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم صادر ہو چکا ہو اور دوسری (جانوں) کو مقررہ وقت تک چھوڑے رکھتا ہے۔ بے شک اس میں اُن لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں)۔ اس میں اٹھانا، روکنا اور چھوڑ دینا تین دلیلیں ہیں۔

چوتھی دلیل: ''وَلَوْتَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ''[2] (اور اگر آپ (اس وقت کا منظر) دیکھیں جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں (مبتلا) ہوں گے اور فرشتے (ان کی طرف) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے اور (ان سے کہتے ہونگے) تم اپنی جانیں جسموں سے نکالو۔ آج تمہیں سزا میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا)۔ اس میں چار دلیلیں ہیں۔ روح لینے کیلئے فرشتہ کا ہاتھ پھیلانا، روح کا نکلنا اور اس کا نکل آنا۔ اس دن روح پر ذلت والا عذاب ہونا اور روح کا رب کے سامنے ہونا۔[3]

آٹھویں دلیل: ''وَهُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ''[4] (اور وہی ہے جو رات کے وقت تمہاری روحیں قبض فرما لیتا ہے اور جو کچھ تم دن کے وقت کماتے ہو وہ جانتا ہے پھر وہ تمہیں دن میں اٹھا دیتا ہے تاکہ (تمہاری زندگی کی) معینہ میعاد پوری کر دی جائے پھر تمہارا پلٹنا اسی کی طرف ہے پھر وہ (روزِ محشر) تمہیں ان (تمام اعمال) سے آگاہ فرما دے گا جو تم (اس زندگانی میں) کرتے رہے تھے اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر (فرشتوں کو بطور) نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے (تو) ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ خطا (یا کوتاہی) نہیں کرتے)۔

---

[1] الزمر:۳۹:۴۲۔ [2] الانعام:۶:۹۳۔ [3] کتاب الروح صفحہ ۹۱۔ [4] الانعام ۶:۶۰۔

اس میں مکرر تین دلیلیں ہیں۔(۱) روحیں رات کو اٹھالی جاتیں ہیں۔(۲) انہیں دن میں جسموں میں لوٹا دیا جاتا ہے۔(۳) موت کے وقت فرشتے روحیں قبض کرتے ہیں۔[۱]

گیارھویں دلیل: "یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ......"[۲] (اے اطمینان پا جانے والے نفس، تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب) پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جا)۔

(اس میں تین دلیلیں ہیں۔ روح کا لوٹنا، اس کا داخل ہونا اور اس کا راضی ہونا۔ سلف کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ موت کے وقت کہا جائے گا یا دونوں موقعوں پر ایک حدیث پاک میں ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ بات تم سے موت کے وقت فرشتہ کہے گا۔ زید بن اسلمؒ کا قول ہے کہ روح کو تین موقعوں پر جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ ابو صالحؒ فرماتے ہیں کہ خوشی خوشی لوٹنے کی بشارت موت کے وقت دی جاتی ہے اور دخولِ جنت کی بشارت قیامت کے دن دی جائے گی)۔[۳]

پندرھویں دلیل: جب روح قبض کی جاتی ہے (اور اوپر چڑھتی ہے) تو آنکھ اسے دیکھتی ہے۔ اس میں دو دلیلیں ہیں۔ روح کا قبض کیا جانا اور آنکھ کا اسے دیکھنا۔[۴]

سترھویں دلیل: حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا جیسے میں رحمت عالم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کر رہا ہوں۔ میں نے آپ ﷺ کو خواب سنایا تو فرمایا کہ روح روح سے ملاقات کرتی ہے۔ پھر رحمتِ عالم ﷺ نے اپنا سر اٹھالیا اور میں نے آپ ﷺ کی پیشانی پر اپنی پیشانی رکھ دی۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ روحیں خواب میں ملاقات کرتی ہیں۔[۵] نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق خواب میں مردوں اور زندوں کی روحیں ملاقات کر لیتی ہیں اور آپس میں ایک دوسری سے پوچھ گچھ کر لیتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ مردوں کی روحیں روک لیتا ہے۔[۶]

اٹھارھویں دلیل: حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری روحیں قبض کر لی تھیں اور اس نے جب چاہا انہیں تمہاری طرف لوٹا دیا۔[۷] اس میں دو دلیلیں ہیں کہ روح قبض بھی کی جاتی ہے اور لوٹائی بھی جاتی ہے۔

بیسویں دلیل: مومن کی روح پرندہ ہے جو جنت کے درختوں میں سے کھاتا ہے اس میں دو دلیلیں ہیں۔

---

[۱] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۰۔ [۲] الفجر ۸۹:۲۹۔ [۳] کتاب الروح، صفحہ ۸۰
[۴] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۰۔ [۵] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۲۱۹۱۳، جلد ۵، صفحہ ۲۱۴۔
[۶] کتاب الروح، صفحہ ۲۶۱۔ [۷] معرفۃ السنن والآثار، حدیث ۹۸۱، جلد ۲، صفحہ ۸۷۔

روح کا پرندہ ہونا اور جنت کے درختوں پر اس کا اٹھنا، بیٹھنا یا ان کے پھل کھانا۔

بائیسویں دلیل: فرمایا شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں جہاں چاہتی ہیں جنت میں چگتی پھرتی ہیں اور قندیلوں میں جو عرش سے لٹکی ہوئی ہیں بسیرا کرتی ہیں۔ پھر تمہارے رب نے ان سے جھانک کر پوچھا کیا خواہش ہے۔ اس میں چھ دلیلیں ہیں: روح کا پرندے کے پیٹ میں ہونا، اس کا جنت میں چگنا، اس کا جنت کے پھل کھانا، درختوں کی نہروں کا پانی پینا، قندیلوں میں بسیرا کرنا، حق تعالیٰ کا ان سے بات چیت کرنا اور ان کا جواب دینا اور ان کا دنیا میں لوٹ آنے کی خواہش کرنا۔ ان سب سے معلوم ہوا کہ ان میں روح کی صلاحیت ہے۔[1]

انتیسویں دلیل: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ والی حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ میں غابہ میں اپنے کھیتوں پر گیا۔ رات ہوگئی میں عبداللہ بن عمرو بن حزام کی قبر کے پاس ٹھہر گیا۔ میں نے قبر سے قرآن پاک کی بہترین قرأت اپنے کانوں سے سنی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحیں قبض کر کے زبرجد یا یاقوت کی قندیلوں میں رکھ دیں۔ پھر انہیں جنت کے درمیان لٹکا دیا۔ رات کو ان کی روحیں لوٹا دی جاتی ہیں۔ پھر صبح کو اسی جگہ چلی جاتی ہیں۔ جہاں ٹھہری ہوتی ہیں۔ اس میں چار دلائل ہیں۔ روحیں قندیلوں میں ہیں۔ روحیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ روحیں قبروں میں قرآن پڑھتی ہیں اور باتیں کرتی ہیں اور روحیں ایک مکان میں رہتی ہیں۔[2]

تینتیسویں دلیل: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث[3] میں بھی بیس دلیلیں ہیں۔ ملک الموت کا روح سے رب کی طرف لوٹ جانے کا خطاب جو ارباب عقل وفہم سے ہی کیا جاتا ہے۔ روح سے یہ کہنا کہ اپنے رب کی بخشش و رضا کی طرف نکل۔ روح کا مشک کے منہ سے پانی کے قطرے کی طرح نکل آنا۔ روح کو ملک الموت کے ہاتھ میں نہ رہنے دینا اور فرشتوں کا ان سے فوراً لے لینا۔ روح کو جنت کا کفن دیا جانا اور اسے جنت کی خوشبو میں بسانا۔ روح کو آسمان پر چڑھا کر لے جانا، روح سے مشک سے بھی زیادہ پیاری خوشبو کا پھوٹ پڑنا۔ روح کیلئے آسمانوں کے دروازوں کا کھولا جانا۔ روح کو آسمان کے تمام مقرب فرشتوں کا رخصت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روح کو زمین کی طرف لوٹایا جانا۔ روح کا جسم میں لوٹایا جانا۔ کافروں کی روح قبض کرتے وقت اس کے ساتھ رگوں اور پٹھوں کا بھی کھچ آنا۔ اس سے انتہائی بدبو کا پھوٹ پڑنا۔ اس کی روح کو آسمان سے پٹخ دیا جانا اور زمین پر گرنا۔ فرشتوں کا اچھی روحوں کو مبارک باد دینا اور بری

---

[1] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۱۔ [2] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۲۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، حدیث ۱۲۰۵۹، جلد ۳، صفحہ ۵۴، مکتبہ الرشید، الریاض۔

روحوں سے بےزار ہونا، منکر نکیر کا اٹھا کر بٹھانا اور سوال کرنا۔ اگر سوال براہِ راست روح سے ہے تو ظاہر ہے اور اگر بدن سے ہے تو تب ہے جب اس کی روح آسمان سے لوٹ کر آئے۔ روح کو رب کے پاس لے جا کر کہا جانا کہ اے رب یہ تیرا فلاں بندہ ہے۔ رب کا حکم ہونا کہ میں نے اس کیلئے جو نعمتیں تیار کی ہیں، انہیں اسے دکھا دو اور روح کا اپنا جنتی یا جہنمی ٹھکانا دیکھنا۔ فرشتوں کا روح پر صلوٰۃ پڑھنا جیسے انسانی جسم پر صلوٰۃ پڑھتے ہیں۔ روح کا قیامت تک اپنا جنتی یا جہنمی ٹھکانہ دیکھنا جب کہ بدن کا نام ونشان بھی نہیں رہتا۔[1]

چوونویں (۵۴) دلیل: حضرت موسیٰ علیہ السلام والی روایت میں ہے کہ جب مومن کی روح نکلتی ہے تو اس سے مشک سے بھی زیادہ پیاری خوشبو پھوٹ پڑتی ہے۔ فرشتے اسے لے کر چلتے ہیں اور آسمان کے نیچے والے فرشتوں کے پاس سے گزرتے ہیں۔ اور اس کا اچھے اچھے عملوں سے ان کا تعارف کراتے ہیں اور نام بتاتے ہیں۔ یہ فرشتے لانے والے فرشتوں کو بمعہ روح کے مبارکباد دیتے ہیں پھر روح کو اس دروازے سے آسمان پر چڑھاتے ہیں جس سے اس کے عمل چڑھا کرتے تھے اور روح آسمانوں میں سورج کی طرح جگمگاتی جاتی ہے یہاں تک کہ عرش تک پہنچ جاتی ہے اور جب کافروں کی روح کو لے کر چڑھتے ہیں تو فرشتے پوچھتے ہیں یہ کون ہے؟ یہ اس کے برے عمل بتا کر کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں ہے وہ بیزار ہو کر کہتے ہیں واپس لے جاؤ۔ چنانچہ روح سب سے نیچے کی زمین میں لوٹا دی جاتی ہے۔[2] اس میں دس دلیلیں ہیں۔ روح کا نکلنا اس سے خوشبو کا پھوٹنا، فرشتوں کا اسے لے کر جانا۔ ملنے والے فرشتوں کا اسے مبارک باد دینا۔ اسے لے لینا اسے لے کر اوپر چڑھنا۔ آسمانوں کا اس کی روشنی سے جگمگا اٹھنا۔ روح کا عرش تک پہنچنا۔ فرشتوں کا یہ پوچھنا کہ یہ کون ہے۔ یہ سوالات اور حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اسے سب سے نیچے والی زمین کی طرف لوٹا دو مستقل ذات کے بارے میں ہوتا ہے۔[3]

چونسٹھویں (۶۴) دلیل: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ جب مومن کی روح نکلتی ہے تو اسے دو فرشتے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ آسمان والے کہتے ہیں یہ پاکیزہ روح ہے جو زمین سے آئی ہے، اے روح تجھ پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اور اس جسم پر بھی جو تجھ سے آباد تھا۔ پھر مشک کا ذکر ہے پھر اسے رب کے پاس لے کر چڑھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے اسے پچھلی مقررہ مدت تک لوٹا دو۔ اس میں چھ دلیلیں ہیں۔ دو فرشتوں کا لینا۔ لے کر آسمان کی طرف چڑھنا۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ یہ پاکیزہ روح زمین سے

---

[1] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۲۔ [2] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۱۲۰۶۱، جلد ۳، صفحہ ۵۴۔

[3] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۳۔

آئی ہے۔ فرشتوں کا اس پر نماز پڑھنا اس کی خوشبو کا پاکیزہ ہونا اور اسے لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھنا۔ [۱]

اکہترویں (۷۱) دلیل: حضرت ابو ہریرہ ﷺ والی حدیث میں دس دلائل ہیں۔ روح کا پاکیزہ ہونا یا گندے جسم میں ہونا اس جگہ حال و محل دونوں ہیں۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ اے روح نکل آ، تو قابلِ تعریف ہے۔ اسے راحت و روزی کی بشارت دینا۔ یہ بشارت اس مقام کی ہے جس کی طرف روح بدن سے نکل کر جارہی ہے۔ آسمان تک برابر ان بشارتوں کا قائم رہنا۔ روح کیلئے آسمان کا دروازہ کھلوانا اس سے یہ کہنا کہ تعریفوں کی حالت میں جنت میں داخل ہو جا۔ روح کا اس آسمان تک پہنچ جانا جس میں اللہ تعالیٰ کے انوار بہت لطیف ہیں۔ کافر کی روح کیلئے یہ کہنا کہ مذمت کی حالت میں لوٹ جا۔ اس کیلئے آسمان کا دروازہ نہ کھلنا۔ اسے زمین کی طرف چھوڑ دینا پھر اس کا قبر میں لوٹ آنا۔ [۲]

اکیاسویں (۸۱) دلیل: رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا، روحیں جمع شدہ لشکر ہیں پھر جن میں تعارف ہو جاتا ہے۔ ان میں موافقت و محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں نہیں ہوتا ان میں اختلاف رہتا ہے۔ [۳] اس میں روحوں کو جمع شدہ لشکر بتایا گیا ہے اور لشکر جواہر ذات پر قائم ہیں۔ پھر بتایا گیا کہ ان میں تعارف و عدمِ تعارف ہوتا ہے جو جواہر کی صفات ہیں۔ ظاہر ہے کہ لشکر اعراض نہیں ہوتے اور نہ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عالم میں نہ داخل ہوں نہ خارج ہوں اور نہ ان کا جز و کل ہوتا ہے۔ [۴]

بیاسویں (۸۲) دلیل: حضرت ابن مسعود ﷺ والی حدیث میں ہے کہ روحیں ملاقات کرتی ہیں اور گھوڑوں کی طرح اچھی اور بُری ہوتی ہیں، گزر چکی ہے۔ [۵]

تراسویں (۸۳) دلیل: ابن عمر ﷺ والی حدیث شریف میں ہے کہ روحیں دو دن کی مسافت سے ملاقات کر لیتی ہیں حالانکہ پہلے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہوتا۔ [۶]

چوراسوین (۸۴) دلیل: وہ آثار ہیں جو ہم تخلیقِ آدم کے سلسلے میں بیان کر چکے کہ جب روح حضرت آدم علیہ السلام کے سر میں داخل ہوئی تو انہیں چھینک آئی اور الحمد للہ کہا۔ پھر جب آنکھوں میں پہنچی تو جنت کے پھل دیکھ لئے پھر جب پیٹ میں پہنچی تو بھوک لگ گئی۔ ابھی پیروں میں پہنچی بھی نہ تھی کہ اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہ روح کے داخل ہوتے وقت بھی تکلیف ہوتی ہے اور خارج ہوتے وقت بھی۔ [۷]

---

[۱] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۴۔　[۲] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۴۔　[۳] صحیح بخاری، حدیث ۳۱۵۸، جلد ۲، صفحہ ۱۲۱۳۔
[۴] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۴۔ [۵] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۵۔ [۶] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۵۔ [۷] کتاب الروح، صفحہ ۲۸۵۔

پچاسویں (۸۵) دلیل: وہ آثار ہیں جن میں حق تعالیٰ کا روحوں کو نکالنے اور اچھوں بُروں کو الگ کرنے اور نور و ظلمت میں تفاوت اور چراغوں کی طرح انبیائے کرام علیہم السلام کی روحوں کا بیان ہے۔

چھیاسویں (۸۶) دلیل: تمیم داری رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ مومن کی روح حق تعالیٰ کے سامنے پہنچ کر سجدہ کرتی ہے اور تمام فرشتے اسے بشارت دیتے ہیں اور حق تعالیٰ ملک الموت سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کی روح کو لے جاکر فلاں فلاں جگہ رکھو۔

ستاسویں (۸۷) دلیل: وہ آثار ہیں جو ہم نے مستقر ارواح کے بارے میں بیان کیے ہیں اور اس میں لوگوں کا اختلاف اور اس اختلاف کے ضمن میں اجماع سلف کا بیان کہ موت کے بعد روح کیلئے مستقر ہے گو اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔

اٹھاسویں (۸۸) دلیل: رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ لوگوں کے جسم قبروں میں پیدا ہوں گے پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ہر روح اپنے جسم میں داخل ہوگی، پھر جب وہ اس میں داخل ہوگی تو زمین پھٹ جائے گی اور لوگ قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

باب نمبر ۳

انسان فی القرآن

اس عنوان کے تحت انسان کی ان صفات کا ذکر کیا جائیگا جو انسان میں پیدائشی طور پر رکھی گئی ہیں۔ اگر یہ اچھی یا بُری صفات انسان میں نہ رکھی جاتیں تو انسان کی تخلیق کا مقصد ہرگز پورا نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے جس چیز کو بھی اس نے تخلیق فرمایا اس میں اس کے حسنِ تخلیق کے جوہر نظر آتے ہیں۔ اگر انسان میں برائیوں کا مجموعہ دیکھا جاتا ہے تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور ان برائیوں سے بچنا اور خوبیوں کا پایا جانا انسان کو مکرم اور مشرف بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ برائیاں جو انسان میں پائی جاتی ہیں وہ اس لیے ہیں کہ اگر وہ ان سے بچتا ہوا زندگی کے دھاروں سے گزر جائے تو یہی اس کے درجات کی بلندی کا باعث بن جائیں گی، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی برائیاں اور خوبیاں دونوں حکمت پر مبنی ہیں اور ان برائیوں سے بچنا اس کی خوبیوں کا سبب بنتا ہے۔

انسان کی آزمائش کیلئے کچھ منفی خصائل کا ودیعت کیا جانا

قرآن اور حدیث کے بغور مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں کچھ ایسے خصائل رکھ دیئے گئے ہیں جن کی مدافعت کرنا مسلمانوں کیلئے واجب قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ المعارج میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝''[1] بے شک انسان بے صبر اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اسے مصیبت (یا مالی نقصان) پہنچے تو گھبرا جاتا ہے اور جب

---

[1] المعارج، ۷۰:۱۹ تا ۲۱

اسے بھلائی (یامالی فراخی) حاصل ہوتو بخل کرتا ہے)۔

قرآنِ کریم کی مذکورہ آ عدیات میں انسان کی سرشت میں پائے جانے والے تین عیوب کا ذکر ملتا ہے جن کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں دی جارہی ہے۔

ا۔ھَلُوْع اس سے مراد وہ شخص ہے جو حلال اور حرام کی تمیز نہ کرے اور ایسا حریص اور کم ظرف انسان جو ہر قیمت پر دولت سمیٹنے اور ایسی چیزوں کو ہڑپ کرنے کیلئے بے تاب رہتا ہے جو اس کیلئے حلال نہیں ہوتیں۔ دولت خواہ رشوت، لوٹ کھسوٹ، ڈاکہ زنی، چور بازاری، بلیک مارکیٹنگ، ملک وملت سے غداری سے ہی کیوں نہ ملے۔

۲۔جَزُوْع جزوع کا لفظ جزع سے مشتق ہے جس کے معنی جزع فزع کرنے والا یعنی بہت زیادہ گھبرانے والا۔ مصیبت میں بے صبرا ہو کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ مصیبت سے نکلنے کیلئے اُمید کی کوئی کرن اُسے نظر نہیں آتی۔ جلد مایوس ہو جاتا ہے۔

۳۔مَنُوْع کے معنی سخت کنجوس اور بخیل کے ہیں۔ یہ تیسرا نقص اور عیب انسان کی سرشت میں پایا جاتا ہے۔ ایسا انسان کسی ملی یا قومی مفاد کیلئے، کسی نادار اور فقیر کی امداد کیلئے ایک دمڑی بھی خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی محتاج، محروم، سائل اور ضرورت مند کی حاجت روائی کی اُسے توفیق نہیں ہوتی۔

فطری اور جبلی کمزوریوں سے نمازیوں کا استثناء

یہ تمام کمزوریاں انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہیں مگر جو انسان قوانینِ قدرت کے تابع ہو جائیں ان کے اندر یہ فطری اور جبلی یعنی پیدائشی کمزوریاں نہیں رہتیں۔ اسی لیے پروردگارِ عالم نے حرفِ استثنا "اِلَّا" لگا کر اپنے احکام کی پاسداری کرنے والوں کو مذکورہ کمزوریوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ارشاد فرمایا "اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ"[1] (مگر وہ نماز ادا کرنے والے، جو اپنی نماز پر ہمیشگی قائم رکھنے والے ہیں)۔

غور کیجیے! جب پیدائشی کمزوریاں احکامِ خداوندی پر عمل کرنے کی بدولت ختم ہو رہی ہیں تو مزید کس قدر فوائد مرتب ہوتے ہوں گے؟ اس حقیقت کا اگر عملی مشاہدہ درکار ہو تو کسی کامل اور متبع شریعت انسان کی شخصیت میں نگاہِ بصیرت کے ساتھ غور فرمائیں۔ حق یہ ہے کہ اگر انسان کو غور وفکر کرنے والی عقل حاصل ہو تو اُسے شریعت پر کاربند انسان اور شریعت سے روگرداں انسان کے مابین فرشتے اور حیوان کا فرق نظر آئے گا۔

---

[1] المعارج: ۷۰، ۲۲ تا ۲۳۔

بیشک شریعت پر کاربند انسان قدسی صفات کا حامل بن جاتا ہے اور شریعت سے منحرف شخص جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

''کشف المحجوب'' میں ہے کہ ھوٰی بھی نفس کی صفات میں سے ایک صفت ہے (''اَلْھَوٰی یا ھَوَا'' کے معنی خواہشاتِ نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ ھوٰی انسان کو شرفِ انسانی کی منزل سے گرا دیتی ہے اور مصائب میں مبتلا کر دیتی ہے اور آخرت میں اسے ھاویۃ (دوزخ کا ایک طبقہ) میں ڈال دیتی ہے)۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ''اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاهُ'' (کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے)۔[1]

حضرت مخدوم علی بن عثمان الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ ایک گروہ کے نزدیک ھوٰی ایک ارادے کا نام ہے جو نفس میں مدبّر اور متصرف ہے، جیسے عقل سے روح مدبر ہے۔ وہ روح جس میں عقل کی قوت نہ ہو ناقص ہے۔ نفس کی دعوت ھوٰی سے ہوتی ہے۔ ہر بندے کو عقل اور ھوٰی کی طرف سے دعوت ملتی رہتی ہے۔ جو عقل کے پیچھے لگا ایمان حاصل کر لیتا ہے اور جو ھوٰی کے پیچھے لگا وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

صاحب ''کشف المحجوب'' فرماتے ہیں کہ ھوٰی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک لذت و شہوت، دوسری ھوٰیٔ جاہِ خلق و ریاست۔ اول قسم والا شراب، زنا اور جوا وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دوسری قسم والا عبادت خانوں میں بیٹھ کر فتنۂ خلق پیدا کرتا ہے (اور مذہبی تعصب پھیلاتا ہے) اور مخلوق کو گمراہی کے رستے پر لے جاتا ہے۔ ایسا شخص خواہ کتنا بڑا کمال ہی کیوں نہ پیدا کر لے تقربِ الٰہی سے محروم رہتا ہے اور جس کو حرص وھوٰی سے برأت ہو وہ خواہ بت خانے میں ہی کیوں نہ بیٹھے مقرّبِ حق ہو گا۔ جب بندے کے قلب میں گناہ کی جرأت ہوتی ہے تو شیطان اُسے اپنے جال میں لے کر خوبصورت گناہوں کی طرف لاتا ہے اور اس کے دل پر اپنی ظلمت کی تجلی ڈالتا ہے۔ اس کو وسواس کہتے ہیں۔ لہٰذا گناہ کی ابتدا ھوٰی سے ہوتی ہے اور شیطان ان کو گمراہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندے نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی نہیں مگر یقیناً شیطان اس پر غالب ہے سوائے عمر فاروق ؓ کے کہ وہ شیطان پر غالب ہیں یعنی اپنی ھوٰی پر غالب ہیں۔

انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا گیا مگر وہ ماحول سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل میں پیدا کیا مگر جب وہ اپنے بُرے ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو صفاتِ محمودہ عطا فرمائیں وہاں اس میں کچھ ایسی

---

[1] الجاثیہ، ۴۵:۲۳۔

صفات بھی رکھی ہیں کہ وہ پستی کی طرف لڑھکنے لگتا ہے۔انسان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ان دونوں صفات میں سے اچھی صفت کو اپنائے اور بری باتوں سے خود کو بچائے رکھے۔اس طرح بچنے میں ہی اس کی کامیابی ہے۔ اب ان دونوں خصلتوں کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

ھویٰ اور حرص انسان کی طینت اور سرشت میں داخل ہیں

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ یہ یاد رہے کہ ھوٰی وحرص بنی نوع انسان کی طینت اور سرشت میں داخل ہیں۔حدیث شریف میں ہے کہ "اَلْھَوٰی وَ الشَّھْوَۃُ مَعْجُوْنَتَانِ بِطِیْنَۃِ ابْنِ اٰدَمَ" [1] (یعنی ھوٰی اور شہوت انسان کی طینت (مٹی یا خمیر) میں شامل ہیں)۔

آپؒ فرماتے ہیں کہ آنکھوں کی شہوت ہے دیکھنا، کانوں کی شہوت ہے سننا، جسم کی شہوت ہے چھونا اور دل کی شہوت ہے سوچنا۔لازم ہے کہ انسان ان پر نگرانی کرے اور ان پر حاکم ہو جائے اور دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ قلب سے یہ وسواس دور کرے۔جو اِن میں پھنس گیا وصالِ حق سے دور ہو گیا۔ انسان اگر ریاضت اور مجاہدوں سے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ھویٰ کے دفع کرنے میں ضرور مدد کرے گا۔

انسان کی سرشت میں اگر ھوٰی غالب ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے بھی فریب کرتا ہے اور اللہ کی اطاعت سے دور رہتا ہے۔روایات میں آیا ہے ایک شخص کافر تھا اور بھوک میں مبتلا تھا۔اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی اگر مجھے ایک روپیہ مل جائے چار آنے تیری راہ میں تقسیم کرونگا۔اتفاق سے اسے ایک کھوٹا روپیہ مل گیا تو ایک دوکاندار نے اسے کہا کہ یہ روپیہ کھوٹا ہے، اس کے بارہ آنے ملیں گے، چنانچہ اس نے بارہ آنے لے کر جیب میں ڈال کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر اعتبار نہ تھا اس لیے اس نے اپنے چار آنے پہلے ہی کاٹ کر بارہ آنے مجھ کو دلوائے۔قرآنِ مجید میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ سے مکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی تدبیر کرتا ہے۔کچھ لوگ زکوٰۃ کی رقم ایک گھڑے میں اناج کے نیچے دبا دیتے ہیں پھر گندم اور رقم سمیت وہ گھڑا کسی سائلہ عورت کو تھما دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب تم اس سب کچھ کی مالکہ ہو اور جب زکوٰۃ لینے والی وہ عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو اُن کے گھر کا ہی ایک فرد وہ مٹکا خرید لیتا ہے اور اس طرح زکوٰۃ کی رقم واپس گھر میں ہی آجاتی ہے۔یہ اللہ تعالیٰ سے مکر ہے۔کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

زینہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبیؐ را بدرودے

(ایسے لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جا جو اللہ کو سجدوں سے اور نبی ﷺ کو درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

جو لوگ ھوٰی کی شرارتوں سے بچنا چاہتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق

---

[1] لسان المیزان، ابن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، حدیث ۴۸۰، جلد ا، صفحہ ۱۵۰، دار الفکر، بیروت۔

فرائض کی ادائیگی میں دل لگائیں اور گناہِ کبیرہ سے بچتے چلے جائیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو چاہتا ہے تو اس کیلئے لازم ہے کہ اتباعِ سنت اور ماموراتِ اسلام (احکاماتِ الٰہیہ) پر قائم رہنے کی کوشش کرے۔ عبادات اور مجاہدات میں لگے رہنے سے انسان نفس کے فریب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس باب کے آخر میں راقم الحروف نے ان امور کا ذکر کیا ہے جو انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا موجب بن جاتے ہیں۔

انسان کی سرشت میں رکھے گئے وہ عیوب جن کو قرآن نے صراحتاً بیان کیا ہے

حسب ذیل عبارت میں انسان کے ان عیوب اور کمزوریوں کا ذکر کیا جائے گا جن کو قرآن نے صراحتاً بیان کیا ہے۔ یہ وہ عیوب ہیں جن کی وضاحت طوالت طلب ہے لیکن چونکہ یہاں اس قدر تفصیل میں جانا مقصود نہیں لہٰذا ان عیوب کی وضاحت قرآن مجید کی تفسیروں میں دیکھی جا سکتی ہے اس لئے یہاں اختصار سے کام لیا جائے گا۔

ا۔ انسان جلد باز ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا"[1] (اور انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے)۔ "خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط"[2] (انسان (فطرتاً) جلد بازی میں سے پیدا کیا گیا ہے)۔ انسان بالعموم جلد بازی کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ کسی چیز کو اس کے وقت مقررہ سے پہلے طلب کرنا عجلت پسندی کہلاتا ہے۔ دینِ اسلام نے ایک کامیاب اور پرسکون زندگی بسر کرنے کے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں ان میں ہمیں صبر و تحمل، ضبط و برداشت، توازن اور بردباری کا سبق ملتا ہے۔ مزاج میں جلد بازی کا عنصر ہمیشہ کسی خطرناک انجام کی طرف لے جاتا ہے۔ اکثر لوگوں کا پے در پے ٹھوکریں کھانے کا سبب فطرتاً عجلت پسندی ہے۔ جلد بازی عام لوگوں کا شیوہ ہے۔ عرب لوگ جلد باز آدمی کیلئے کہتے ہیں "خُلِقَ مِنْ عَجَلٍ" کہ یہ شخص عجلت سے پیدا ہوا ہے۔ مرزا غالب نے انسانی نفسیات کے اس پہلو کو یوں بیان کیا ہے کہ "عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب" انہوں نے عاشقی کی جو شرائط بیان کی ہیں ان میں صبر کی تلقین کی ہے۔ علاوہ ازیں معاشرے میں رشوت ستانی، چور بازاری، دھوکہ دہی جیسے قبیح افعال صرف وہ لوگ انجام دیتے ہیں جو جلد باز ہوتے ہیں، جو راتوں رات امیر بننے کے سپنے دیکھتے ہیں اور اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق حلال میں برکت عطا فرمائی ہے اور حرام میں تباہی اور عذاب ہے۔ مگر اپنے رنگین خوابوں کی جلد تعبیر پانے اور اپنے ارمانوں کی دنیا کو سنوارنے اور آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کب کوئی صبر سے کام لیتا ہے۔ فوراً حرام

---

[1] بنی اسرائیل ۱۱:۱۷۔ [2] الانبیاء ۳۷:۲۱۔

مال کمانے پر تیار ہو جانا جلد باز لوگوں کا کام ہے۔ ایک حدیث مبارکہ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کو پیدا فرمایا تو اس کو کہا کہ اے دنیا جو شخص میرا تابع فرمان ہو، تم اس کے تابع فرمان ہو جانا اور جو تیرا تابع فرمان ہے تو تم اس کو تھکا دینا آج ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی رنج اور پریشان حال صرف وہی لوگ ہیں کہ جو دنیا کے پیچھے پڑے رہتے ہیں انسان کو سوچنا چاہیے کہ اگر دنیا میں کامیابی درکار ہے تو اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان بننے کا انتظام کریں دنیا خود بخود تمھاری تابع فرمان ہو جائے گی گویا دنیا کے پیچھے مت بھاگو۔

۲۔ انسان ناشکرا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا'' [۱] (اور انسان بہت ہی تنگ دل اور بخیل واقع ہوا ہے)۔ ''إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ'' [۲] (بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے)۔

انسان کو نیکی کے کاموں پر مال خرچ کرنا بڑا مشکل نظر آتا ہے۔ اپنے پیسے کو سنبھال کر رکھتا ہے۔ زکوٰۃ سے مال میں برکت ہوتی ہے مگر زکوٰۃ ادا کرنے سے گھبراتا ہے۔ یتیموں اور غریبوں کو کھانا کھلانے سے رزق میں برکت ملتی ہے مگر انسان سمجھتا ہے کہ اس کا مال کم ہوتا ہے۔ یہ بات آزمودہ ہے کہ جو لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں ان کے رزق میں برکت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ''وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ'' [۳] اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے آگاہ فرمایا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے)۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اگر تم کو نعمت اور مال عطا کیا گیا ہے تو غریبوں کا حق بھی ادا کرو اور یہ ہمارے مال کی نعمت کا شکرانہ ہوگا۔ اگر علم دیا ہے تو بے علموں کو علم دو۔ صحت دی ہے تو مریضوں کی خدمت کرو۔ یہ تمام باتیں شکر میں داخل ہیں۔ زبانی کہہ دینا کہ ''اللہ کا شکر ہے'' یہ بات شکر نہیں کہلاتی جب تک اس کا عملی نمونہ پیش نہ کیا جائے۔

روایات میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بہت عبادت گزار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جاؤ اس آدمی سے پوچھو کہ تمہاری کیا خواہش ہے؟ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ مجھے ڈیڑھ سیر چاول درکار ہیں۔ اس کو کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ دینے پر مائل ہے تم اس سے کوئی اور چیز مانگو لیکن اس نے کہا کہ بس مجھے ڈیڑھ سیر چاول لا دیں۔ جب اس کو چاول دے دیئے گئے تو اس نے

---

[۱] بنی اسرائیل، ۱۷:۱۰۰ [۲] العٰدیٰت، ۱۰۰:۶ [۳] ابراہیم، ۱۴:۷

چاول پکا کر خود بھی کھائے اور لوگوں میں بھی تقسیم کیے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ دس گنا ہے، چنانچہ اس کو اس کے بدلے میں پندرہ سیر چاول ملے یہ معاملہ یہاں تک بڑھتا گیا کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ اس شخص کے ہاں تین سو دیگیں چاول کی پک رہی ہیں اور لوگوں میں بٹ رہی ہیں۔ آپ علیہ السلام نے پوچھا ارے میاں اتنے چاول تمہیں کہاں سے ملے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ وہی ڈیڑھ سیر چاول جو آپ دے گئے تھے اس کی برکت میں ملے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک فقیر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے ہیں لھذا آپ اللہ تعالیٰ سے پوچھیں کہ کیا میں ساری عمر ہی غریب رہوں گا یا میرے دن بھی کبھی پھریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے آخری ۱۰ سال اچھی حالت میں گزریں گے۔ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ وہ دس سال میرے ابھی شروع کر دیں کیونکہ بڑھاپے میں اگر مال ملا تو اس کا کیا فائدہ؟ چنانچہ اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ جلد ہی امیر ہو گیا۔ دس سال گزر گئے اور پندرہ سال بھی گزر گئے لیکن اس کی امیری کا دور ختم نہ ہوا۔ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بدستور امیری کی حالت میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم دس سال گزرنے کے بعد بھی امیر ہو۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ جب اللہ تعالیٰ دس سال دے کر بھول گیا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کروا دیں اور میری غریبی پھر لوٹ کر آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا وہ شخص سمجھتا ہے کہ ہم اسے بھول گئے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ فرمایا ہم نے دیکھا کہ جب اس کو مال و دولت عطا کیا گیا تو اس نے اس کا شکر ادا کیا اور غرباء کو بھی ان کا حصہ دیتا رہا چنانچہ ہم نے دس سے تیرہ، اور پھر پندرہ سال تک امارت کی مدت بڑھا دی کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو ہم اور بڑھا دیں گے۔

ان واقعات کو راقم الحروف نے بھی آزمایا اور درست پایا ہے۔ عرصہ چالیس سال سے ہم ہر جمعہ کے روز مجلس ذکر کرواتے ہیں اور سب حاضرین کو اچھا کھانا کھلاتے ہیں چنانچہ اس کھانے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے رزق میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ یاد رکھیں اناج یا کھانے پینے کی شکل میں اگر لوگوں پر مال خرچ کیا جائے تو اس میں نقد مال دینے کی نسبت بہت زیادہ برکت ہوتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ کے گھر میں رات کو بیس مہمان آ گئے اور گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ آپ نے سنا کہ دروازے پر ایک فقیر صدا لگا رہا ہے تو آپ نے خادمہ کو کہا کہ یہ دونوں روٹیاں اس فقیر کو دے دیں۔ پھر ایک آدمی آیا اور آپؒ کیلئے دس روٹیاں لایا آپ نے خادمہ سے پوچھا کتنی ہیں اس نے کہا کہ دس روٹیاں ہیں۔ فرمایا کہ یہ روٹیاں ان کے لانے والے کو واپس کر دو اور کہو کہ یہ ہماری نہیں ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر کوئی شخص روٹیاں لایا تو وہ بیس تھیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ ہاں یہ ہماری روٹیاں ہیں۔ یہ مہمانوں کو کھلا دو۔

آپؐ نے اللہ سے دو روٹیاں دے کر سودا کیا تھا کہ دو روٹیاں جب ہم اللہ کی راہ میں دے دیں تو اس کے بدلے میں دس گنا یعنی بیس روٹیاں آنی چاہیے تھیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ دَہ (۱۰) در دنیا اور ستر (۷۰) در آخرت دیتا ہے۔

۳۔ انسان کی اپنی اصلیت کی طرف توجہ نہیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ"[1] (کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک تولیدی قطرہ سے پیدا کیا، پھر بھی وہ کھلے طور پر سخت جھگڑالو بن گیا)۔ انسان کو اسکی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی تخلیق ایک بدبودار نطفہ سے کی گئی ہے یعنی یہ اس کی اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن وہ اپنی اصلیت کو بھول کر گھمنڈ اور تکبر اختیار کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں سے جھگڑتا ہے۔ وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں اور خود کو بہت بلند اور اعلیٰ و ارفع تصور کرتا ہے۔ انسان اگر اپنی حقیقت کو دیکھے تو کبھی اس میں رعونت پیدا نہ ہو۔ یہ بات بہت عجیب ہے کہ نیک اور نمازی لوگ بھی گھمنڈ اور تکبر کرتے ہوئے خود کو اس مرض سے بَری سمجھتے ہیں۔

۴۔ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَھِیْدٌ ۝ وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝"[2] (بیشک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر گذار ہے اور وہ اس پر (خود) گواہ ہے اور بلاشبہ وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے)۔ انسان کا ناشکرا ہونا اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انسان پر کتنے ہی احسانات ہیں جو شمار میں نہیں آتے اور انسان کو اس کے رب نے کیا کچھ نہیں دیا لیکن وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ انسان اپنی ناشکری کو خود بھی جانتا ہے اور اس کا رب بھی اس پر گواہ ہے کہ بندہ اس کی نعمتوں کا حق ادا نہیں کرتا۔

تیسری آیت میں فرمایا ہے کہ انسان اپنے فائدے کی بات کیلئے بہت شدت اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں اس کو ذرا سا فائدہ معلوم ہوتا ہے وہاں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور یہ انسان مال و دولت کا بہت مشتاق ہے۔ اس کا دین چلا جائے تو پروا نہیں کرتا مگر جہاں پیسہ آتا نظر آتا ہے وہاں نماز و روزہ بھی ترک کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نماز و روزہ کی طرف دھیان نہیں دیتی مگر مجال ہے کہ دنیاداری کے کاموں میں وہ ذرا پیچھے رہ جائیں۔

۵۔ انسان سب سے بڑھ کر جھگڑالو ہے

قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۝"[3] (اور انسان

---

[1] یٰسین، ۳۶۔۷۷۔ [2] العٰدیٰت، ۱۰۰۔۶ تا ۸۔ [3] الکھف، ۱۸:۵۴۔

جھگڑنے میں ہر چیز سے بڑھ کر ہے)۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر شے میں جھگڑا پیدا کر دیتا ہے۔یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہبی معاملات میں خواہ کسی شخص کا علم کچھ بھی نہ ہو لیکن اگر اس کی بحث کی طرف دھیان کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی عالم نہیں۔اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جاہل شخص بھی اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ''خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں'' اسی جھگڑا فساد کی وجہ سے اسلام میں اتنے فرقے پیدا ہو گئے ہیں کیونکہ ہر ایک نے اپنی فہم کے مطابق قرآن کو ڈھال لیا ہے اور تہتر فرقوں کو جنم دیا ہے۔ویسے عام باتوں میں بھی انسان جھگڑالو ہے۔اس کے برعکس مسلمان کو تو ایک خدا، ایک قرآن، ایک نظام، ایک کعبہ اور ایک ہی اسلام کو اپنے ذہن میں رکھنا ضروری تھا مگر یہاں تو ہر بات اور ہر پہلو میں اختلاف ہی اختلاف نظر آتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

تنگ برما رھگزار دیں شد است ہر لئیمے راز دار دیں شد است

(دین کی راہ ہم پر تنگ ہوگئی ہے، کیونکہ ہر کم ظرف دین کا رازدار بن بیٹھا ہے) (ا۔ر:۱۲۵)

۶۔انسان ابتداء سے ہی کمزور ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ'' ۱؎ (اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کمزور چیز (یعنی نطفہ) سے پیدا فرمایا)۔''وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا'' ۲؎ (اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے)۔روزمرہ کی زندگی میں اگر انسان کے رویے کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ابتداء سے ہی ضعیف ہے۔اس میں اتنی ہمت نہیں کہ برائی اور شیطانیت کا مقابلہ کر سکے۔ ہماری تصنیف ''سنتِ مبارکہ'' میں ایک عنوان ''قرآن اور سنت علامہ اقبالؒ کی نظر میں'' کے نام سے لکھا گیا ہے۔یہ مضمون علامہ اقبالؒ کے شعری مکالمہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس میں ابلیس کی گفتگو کو جو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کی تھی بیان کی گئی ہے۔اس مکالمہ میں ابلیس اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتا ہے کہ وہ انسان کی صحبت سے بہت خراب ہو چکا ہے کیونکہ انسان اس کی ایک چھوٹی سی رکاوٹ کا مقابلہ کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا یعنی جب شیطان انسان کو کسی برائی کی طرف بلاتا ہے تو وہ فوراً اپنے ہتھیار پھینک دیتا ہے اور شیطان کا شکار بن جاتا ہے۔ابلیس نے کہا کہ انسان ایک ایسا شکار ہے جو شکاری کو خود دعوت دیتا ہے کہ آؤ مجھے شکار کر لو اور اب تو یہ انسان قوتِ مدافعت سے بالکل محروم ہو گیا ہے۔شیطان نے کہا کہ اے ایسے کمزور آدمیوں سے مقابلہ میں ذرا برابر بھی لطف نہیں آتا اس لیے خدایا! اس پانی اور مٹی کی گڑیا (انسان) کو میرے مقابلہ سے واپس لے لے۔ابلیس یہ کہتا ہے کہ مجھے تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے مرد سے مقابلہ کرنے میں مزہ آتا ہے کیونکہ انہوں نے شیطان کو کہا تھا ''اِدْفَعْ یَا لَعِیْنُ'' (اے لعنتی دور ہو جا)۔علامہ اقبالؒ کی پوری نظم جو ''سنتِ مبارکہ'' میں نقل کی گئی ہے انسان کے ضعیف ہونے

۱؎ الروم ۳۰:۵۴۔ ۲؎ النساء ۴:۲۸۔

کی واضح مثال ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے کہ یہ صوفی لوگ جب کسی طرف سے اشارہ پاتے ہیں تو ان کا پرہیز ٹوٹ جاتا ہے۔

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز (ب ج:۳۰۸)

آپ لوگوں کو اکثر دیکھتے ہیں کہ معمولی فائدے کیلئے قرآنِ مجید کی جھوٹی قسم اٹھا لیتے ہیں، قبروں کی تجارت کرتے ہیں، بھوکے ہوں تو ایمان بھی لٹانے سے گریز نہیں کرتے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کی بغل میں خواہشات کے بت نظر آتے ہیں اور آخر تنگ آ کر آپ نے فرمایا کہ فقط اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہی اپنے پیسے کی پرستش سے محفوظ ہیں ورنہ ہر کسی کی گردن میں خواہشات کے زنار نظر آتے ہیں۔

یہ ترے مومن و کافر تمام زناری وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد

(ض ک:۵۰۵)

ایک حدیث شریف میں ہے "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" [1] (قریب ہے فقر (تنگدستی) انسان کو کفر تک لے جائے) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ غریب آدمی کا کسی وقت بھی کفر میں گر جانا ممکن ہے کیونکہ جب یہ کفر کے اردگرد چکر کاٹتا ہے تو اس کا کفر میں گر جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

۷۔ انسان بڑا ناقدرا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَکَانَ الْاِنْسَانُ کَفُوْرًا" [2] (اور انسان بڑا ناشکرا واقع ہوا ہے)۔ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ" [3] (بے شک انسان صریحاً بڑا ناشکر گزار ہے)۔ انسان کے ناشکرا ہونے کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور جب یہ شکر نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کا مجرم ہو جاتا ہے۔ اس خدا نے اس کیلئے کئی قسم کی آسائشیں اور نعمتیں پیدا کیں، مگر انسان کو ان سب کا احساس تک نہیں۔ انسان کی یہ بے حسی اسے عتاب الٰہی کا سزاوار بنا دیتی ہے۔

۸۔ انسان کو مشقت پر پیدا کیا گیا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" [4] (بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں (مبتلا رہنے والا) پیدا کیا ہے)۔ انسان کی پوری زندگی مشقت میں گزر جاتی ہے۔ نیک آدمیوں کو بھی مصیبتیں گھیرے رکھتی ہیں۔ ایک بلا ٹلی تو دوسری سر پر آ دھمکتی ہے۔ یہ مصائب اس لیے ہیں کہ اس سے ان کے درجات بلند کیے جائیں اور کچھ مصائب اس لیے آتے ہیں کہ شاید انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اس وقت سے اس کا رونا شروع ہو جاتا ہے اور ساری

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، محمد بن عبداللہ، حدیث ۵۰۵۱، جلد ۳، صفحہ ۱۴۰۳، المکتب الاسلامی، بیروت۔

[2] الاسراء ۱۷:۶۷۔ [3] الحج ۲۲:۶۶۔ [4] البلد ۹۰:۴۔

عمر روتا ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سوز و درد جو انسان کو دیا ہے اس پر تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رنج و غم انسان کی غذا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک شکستہ دل لوگ زیادہ عزیز ہیں۔

۹۔ انسان بڑا ظلم کرنے والا ناشکرا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ'' [۱] (بے شک انسان بڑا ہی ظالم بڑا ہی ناشکر گزار ہے)۔ ''قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ'' [۲] (ہلاک ہو (وہ بدبخت منکر) انسان کیسا ناشکرا ہے (جو اتنی عظیم نعمت پا کر بھی اس کی قدر نہیں کرتا)۔

انسان اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے کیونکہ جس چیز کا حق اس کے ذمے ہے وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ ظلم کسی چیز کے بے محل رکھنے کو کہتے ہیں ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّهٖ'' [۳]۔ جو ذمہ داریاں انسان کے سپرد کی گئی ہیں ان کی تو وہ پرواہ نہیں کرتا اور جو ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمۂ کرم پر لی ہیں ان کی اسے زیادہ پرواہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس نے ہر شخص کا رزق مقرر فرما دیا ہے اور اس کے اس رزق میں دنیا کی کوئی ہستی کمی بیشی نہیں کر سکتی، لیکن انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو شاید یہ رزق اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے بھاگے گا نہیں، چنانچہ وہ نماز و روزے کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور ہر وقت رزق کو سمیٹنے میں لگا رہتا ہے۔

۱۰۔ بے شک انسان سرکشی کرتا ہے

سورۃ عبس میں فرمایا ''قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَ'' [۴] (ہلاک ہو (وہ بدبخت منکر) انسان کیسا ناشکرا ہے (جو اتنی عظیم نعمت پا کر بھی اس کی قدر نہیں کرتا)۔ ''كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى'' [۵] (مگر) حقیقت یہ ہے کہ (نافرمان) انسان سرکشی کرتا ہے، اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو (دنیا میں ظاہراً) بے نیاز دیکھتا ہے)۔ انسان کے ہاتھ میں جب مال و دولت آ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب اس کی اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہے حالانکہ اس کی ہر چیز اللہ کی عطا کردہ ہے۔ حضرت ایازؒ ایک گڈریا تھے لیکن محمود کے وزیرِ اعلیٰ ہونے کے بعد بھی وہ رات کو تہجد کی نماز کیلئے گڈریے والا لباس نکال کر پہنتے اور پھر شیشے میں اپنی شکل دیکھ کر اپنے آپ سے کہتے ''یہ ہے تیری اصلیت۔ اپنی اصلیت کو بھول نہ جانا''۔ آپ کی اس سادگی اور خودشناسی کے باعث آپ کو اتنا بڑا رتبہ ملا کہ جس پر بڑے بڑے وزیر بھی رشک کرتے تھے۔ حضرت ایازؒ کا یہ واقعہ ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں موجود ہے جس میں یہ

---

[۱] ابراہیم، ۱۴:۳۵ [۲] عبس، ۸۰:۱۷ [۳] تفسیر القرطبی، جلد ۵، صفحہ ۱۵۷۔
[۴] عبس، ۸۰:۱۷ [۵] العلق ۹۶:۶،۷

واقعہ مثنویٔ مولانا رومؒ کے اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔ انسان ظلمتِ عدمی اور جہل از غیر اللہ کا مرکب ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ''[۱] (بے شک وہ (اپنی جان پر) بڑی زیادتی کرنے والا (ادائیگیِ امانت میں کوتاہی کے انجام سے) بڑا بے خبر و نادان ہے)۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظلوماً جھولاً کہا ہے جس کا عام طور پر کچھ مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ انسان ظالم اور جاہل ہے لیکن ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں سرِّ دلبراں کے حوالے سے تشریح بیان کی گئی ہے کہ انسان کی ظلمتِ عدمی یعنی انسان کے نہ ہونے کی ظلمت کی طرف اشارہ لفظِ ظلوم میں ہے اور جھولاً یعنی جہل از غیر اللہ کی صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہوا گویا انسان ظلمت محض اور نور محض کا مرکب ہے۔ اس بوجھ کو زمین اور آسمان نہ اٹھا سکے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں ظلمت عدمی نے زنگار کا کام کیا (یعنی ظلمت محض سے) اور جہل از غیر اللہ نے شیشے کا کام کیا (یعنی نور محض سے) چنانچہ اس آئینہ میں انسان ذاتِ باری تعالیٰ کے نور کو دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ (آئینہ نور محض ہے یعنی شیشہ اور ظلمت محض یعنی زنگار شیشے کے ساتھ کا مرکب ہونے کی وجہ سے انسان کے اپنے اندر اللہ تعالیٰ کا عکس دیکھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی)۔[۲]

۱۲۔ انسان تمام بہانے کرتے ہوئے بھی اپنے حال سے آگاہ ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِیْرَهٗ''[۳] (بلکہ اِنسان اپنے (اَحوالِ) نفس پر (خود ہی) آگاہ ہوگا، اگرچہ وہ اپنے تمام عذر پیش کرے گا)۔ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنے معاملات پر پوری نظر رکھتا ہے اور اپنے مطلب کے کاموں میں بہت تندہی اور تیزی سے کام کرتا ہے لیکن جہاں کوئی اللہ تعالیٰ کے دین یا اطاعت کی بات ہو تو بہانوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ راقم الحروف لیبیا میں پاکستانیوں کے گھروں میں اکثر جایا کرتا اور انہیں ذکر اور درس کی دعوت دیتا لیکن بہت سے لوگ چھٹی کے دن شطرنج، تاش اور فلمی گانوں کے سننے میں مگن دیکھے جاتے تھے، مگر جب ذکر کی مجلس میں حاضری کی بات ہوتی تو وہ کہتے کہ ہمیں فرصت نہیں ملتی۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی ہوتی ہے اور اس میں اپنے تمام ذاتی کام انجام دینے ہوتے ہیں اس لیے ذکر میں نہیں آ سکتے۔ (جب کہ وہ شطرنج، تاش اور بے ہودہ گانوں میں وقت گذارتے دیکھے جاتے تھے)۔

---

۱ الاحزاب، ۷۲:۳۳۔ ۲ حُسنِ نماز، صفحہ ۹۲، ۹۳۔ ۳ القیمۃ، ۷۵: ۱۴، ۱۵۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے بیشتر لوگ شام کے چھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہتے ہیں مگر ان کیلئے دینی کتابوں کے مطالعہ کیلئے وقت نکالنا مشکل نظر آتا ہے۔

۱۳۔ انسان اپنے لیے بھلائی مانگتے ہوئے نہیں تھکتا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "لَا یَسْـئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ" [۱] (انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا)۔ انسان چونکہ دنیاوی زندگی میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اس لیے وہ ہر وقت طلبِ دنیا کیلئے دعائیں مانگتا ہے۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" مگر دین کے حصول کیلئے کبھی منہ پر دعا نہیں آتی اور نہ دل میں یہ خواہش چٹکیاں بھرتی ہے۔

راقم الحروف کے دفتر کا ایک افسر خود بیان کرتا ہے کہ محلے والوں نے اسے کہا کہ آپ نماز کیلئے مسجد میں آیا کریں تو اس نے جواب دیا کہ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا کرے۔ ایک محلہ دار نے کہا کہ بھائی دفتر تو آپ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں مگر اس کیلئے ایسی دعا تو کبھی نہیں کروائی کہ میں دفتر میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں تو پھر مسجد کیلئے کیوں دعا کرواتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر تمہارا کوئی دوست گھر پر آجائے اور تم اپنی بیوی سے کہو کہ دو پیالی چائے بنا دو تو کیا وہ یہ کہہ سکتی ہے کہ آپ دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے تو چائے بنا دوں گی؟ (یہ دعا دینی کاموں کے کرنے کیلئے منگوائی جاتی ہے مگر دنیا کے کاموں کیلئے دعا نہیں کروائی جاتی بلکہ وہاں تو ہمت کو کام میں لایا جاتا ہے)۔

۱۴۔ انسان کو برائی پہنچے تو گڑگڑاتا ہے اور اگر نعمت ملے تو نافرمانی کرنے لگتا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ٥" [۲] (اور جب ہم انسان پر (کوئی) انعام فرماتے ہیں تو وہ (شکر سے) گریز کرتا اور پہلو تہی کر جاتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے (گویا نہ شاکر ہے نہ صابر)۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب اس پر مال و دولت کی کشادگی کر دی جاتی ہے تو وہ اُسے اپنا کمال سمجھتا ہے اور خدا سے منہ پھیر لیتا ہے اور اگر مشکلات میں پھنس جائے یا کچھ دیر کیلئے رزق میں تنگی اور عسرت کی حالت آجائے تو اللہ تعالیٰ سے بدظن ہو جاتا ہے اور کئی لوگ تو اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا انداز میں گلے شکوے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

۱۵۔ انسان کی اوقات ہی کیا ہے لیکن وہ کیا سمجھتا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ" [۳] (اسی نے انسان کو ٹھیکری

---

[۱] حٰم السجدہ، ۴۱:۴۹۔ [۲] الاسراء، ۱۷:۸۳۔ [۳] الرحمٰن، ۵۵:۱۴۔

کی طرح بجتے ہوئے خشک گارے سے بنایا)۔اس آیت میں انسان کواس کی اوقات بتائی جارہی ہے کہ تمہاری پیدائش بجتی ہوئی مٹی سے ہےاورتم اس قدر مغرور کیوں ہورہے ہو۔اگراللہ تعالیٰ رزق میں برکت عطا کردے تواہلِ زر نہ صرف اپنے مالک وخالق اور رازقِ حقیقی کوفراموش کر بیٹھتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر یوں اکڑکراورغرور وتکبر کی گردن کواٹھا کر چلتے ہیں گویا دوسری سب انسانیت ان کے سامنے ہیچ ہے۔

۱۶۔انسان کوکس چیز کا گھمنڈ ہے

ارشادِباری تعالیٰ ہے"یَـآیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِo" [۱] (اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِّ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا)۔انسان اس دنیا سے فریب خوردہ ہے اوراپنے کرم والے رب کو بھلا چکا ہےاور قیامت کے دن کوبھی ذہن سے نکال چکا ہے حالانکہ اس کومعلوم ہے کہ کراماً کاتبین اس کے ہر فعل کولکھ لیتے ہیں پھربھی وہ پرواہ نہیں کرتا۔یادالٰہی سے غفلت اورخودفریبی میں مبتلا اپنی زندگی کے شب وروز بسر کرتا جارہا ہے۔وہ کسی کی نصیحت کی ندا کونہیں سننا چاہتا۔

۱۷۔انسان پر وہ وقت بھی تھا کہ وہ قابل ذکرشئی نہ تھا

ارشادِباری تعالیٰ ہے"هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" [۲] (بے شک انسان پر زمانے کا ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذِکر چیز ہی نہ تھا)۔اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ انسان کے عالمِ عدم کا نقشہ کھینچ رہا ہے کہ انسان پر ایسا بھی وقت آیا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ تھا کہ اس کا کوئی ذکر کرتا،لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے نہ صرف زندگی جیسی نعمت سے مالا مال کیا بلکہ اسے خلافت کا بھی سزاوار ٹھہرایا۔ہر چیز کواس کے تابع فرمان بنایا لیکن اگر وہ خدا کا نافرمان ہوکر مرے تو بھی اس کا کوئی شخص ذکر نہ کرے گا۔البتہ نیک آدمیوں کے نام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اوران کی ارواح پیدا ہونے سے پہلے بھی اہمیت کی حامل تھیں۔حضرت علی ؓ پیدائش سے پہلے بھی اس منصب پر تھے جو وہ اپنی زندگی میں رکھتے تھے۔کئی انسانوں کے کارنامے پیدا ہونے سے قبل بھی مشہور تھے جیسے امام غزالیؒ ،بابا آب ریزؒ،حضرت ابوالحسن خرقانیؒ وغیرہ۔

۱۸۔انسان مال کو جوڑتا ہےاوراس سے محبت کرتا ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے"وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا" [۳] (اورتم مال ودولت سے حددرجہ محبت رکھتے ہو) "اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ" [۴] (خرابی وتباہی ہےاس شخص کیلئے) جس نے مال جمع کیااوراسے

---

[۱] الانفطار،۸۲:۶۔　[۲] الدھر،۷۶:۱۔　[۳] الفجر،۸۹:۲۰۔　[۴] الھمزہ،۱۰۴:۲۔

گن گن کر رکھتا ہے)۔

ان دونوں آیات میں انسان کی اس فطرت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ مال کے جمع کرنے کی بہت تمنا رکھتا ہے اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف دھیان نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ انسان جمع کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے کام آنے والی چیز صرف یہی مال ہے۔ ایسے لوگ جہنم کی آگ میں جلیں گے جو اپنے مال کو دینی احکام کے مطابق خرچ نہیں کرتے۔

۱۹۔ بھلا کیا انسان کو اس کی ہر آرزو مل سکتی ہے

قرآن مجید میں ہے: ''اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی'' [۱] (کیا انسان کیلئے وہ (سب کچھ) میسر ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے؟)۔ انسان دنیا میں یہ چاہتا ہے کہ اسے وہ تمام چیزیں ملیں جس کی وہ تمنا رکھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے ہر انسان اور ہر جاندار کو اس کا رزق پہنچاتا ہے جتنا کہ وہ مناسب سمجھتا ہے۔

یُرِیْدُ الْمَرْءُ اَنْ یُّوْتٰی مُنَاهُ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّا مَا یَشَآءُ

(انسان چاہتا ہے کہ اس کی ہر مرضی پوری کی جائے لیکن اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو وہ چاہے)

انسان کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ ہر بات کو اللہ پر چھوڑ دے اور اپنی تمام تر توجہ کو اس کے احکام کی بجا آوری میں صرف کر دے اگر ایسا ہو جائے تو ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے''۔

۲۰۔ انسان رحمتوں کے چھن جانے پر روتا ہے اور ملنے پر خوش ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ○وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّیْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ'' [۲] (اور اگر ہم انسان کو اپنی جانب سے رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں پھر ہم اسے (کسی وجہ سے) اس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ نہایت مایوس (اور) ناشکر گزار ہو جاتا ہے، اور اگر ہم اسے (کوئی) نعمت چکھاتے ہیں اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچ چکی تھی، تو ضرور کہہ اٹھتا ہے کہ مجھ سے ساری تکلیفیں جاتی رہیں، بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا (اور) فخر کرنے والا (بن جاتا) ہے)۔

تخلیقِ انسان کا اصل مقصد یہ دیکھنا ہے کہ جو عقل و عمل کی گرانقدر نعمت اس کو بخشی گئی ہے انہیں کس طرح استعمال کرتا ہے۔ کیا وہ اپنی زبان اور اپنے قلم کو انسانیت کے چاک گریبانوں کو رفو کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے یا وہ انسان کی قباءِ شرف کو تار تار کر دیتا ہے۔ کیا اس نے اپنی ساری صلاحیتیں نفس پرستی، عیش کوشی

---

۱ النجم، ۵۳:۲۴۔ ۲ ھود، ۱۱:۹، ۱۰۔

اور فتنہ پردازی میں ہی صرف کردیں یا اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرنے کیلئے انہیں استعمال کیا۔ اسی آزمائش کیلئے انسان کو پیدا کیا گیا۔

۲۱۔ انسان کا نفس اس کو وسوسوں میں مبتلا کرتا ہے

قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے" وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ " [۱] (اور بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اُن وسوسوں کو (بھی) جانتے ہیں جو اس کا نفس (اس کے دل ودماغ میں) ڈالتا ہے۔ اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اس کو کس طرح وسوسوں میں مبتلا کرتا ہے۔ شیطان اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے اور اگر انسان دین کی دولت سے مالا مال ہو اور باقاعدگی سے ذکر وفکر میں مشغول رہے تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل سے ہٹالیتا ہے۔ ذاتِ حق کے ساتھ تعلقِ ذکر کی مضبوطی شیطان کی ہرزہ سرائیوں سے انسان کو بچائے رکھتی ہے، ورنہ شیطان کے کئی وسوسے اس کے نہاں خانۂ دل میں اس قدر پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے کئی گوشے انسان کی اپنی نگاہ سے بھی اوجھل ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا علم اس کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔

۲۲۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق اور بیان سکھایا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" خَلَقَ الْإِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ " [۲] (پیدا فرمایا انسان (کامل) کو نیز اسے قرآن کا بیان سکھایا)۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق و گویائی کی خوبی عطا فرمائی تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو نہایت وضاحت اور حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرسکے اور دوسروں کی بات سمجھ سکے۔ اپنی اس صفت کی بدولت وہ خیر وشر، ہدایت وضلالت، ایمان وکفر اور دنیا و آخرت کی باتوں کو سمجھتا اور سمجھاتا ہے اور اسی کو کام میں لاکر فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے" خَيْرُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ " [۳] بہترین کلام و بیان وہ ہے جو مختصر اور جامع ہو مگر دلائل و براہین قاطعہ کا حامل ہو۔ اگر کوئی انسان اس بیان کی خداداد صلاحیت کو شر و فساد کیلئے اور قرآن وسنت کے احکام کو غلط انداز میں بیان کرنے کیلئے استعمال کرے تو یہ اس نعمتِ گویائی کی نہ صرف سراسر ناشکری ہوگی بلکہ سخت گنہگار بھی ہوگا۔

۲۳۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

فرمانِ باری تعالیٰ ہے" عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ " (جس نے انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ

---

[۱] ق، ۵۰:۱۶۔ [۲] الرحمٰن، ۵۵:۳،۴۔

[۳] کتب ورسائل وفتاوی ابن تیمیہ، احمد عبدالحلیم ابن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، جلد ۱۴، صفحہ ۶۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔

(کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا)۔[1] اس آیتِ کریمہ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جملہ علوم وفنون، اسرار ومعارف، انکشافات وایجادات خداوندِ قدوس وبرتر کے بے پایاں علم کی نہریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی منشا اور انسان کے ظرف کے مطابق اس نعمت سے سرفراز کرتا ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کو علم الاسماء اسی ذاتِ حق نے تعلیم کیا۔ اسی طرح دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے سینوں کو رشد وہدایت کے نور سے اسی نے منور کیا۔ لہٰذا جس کو قدرت نے اس نعمتِ علم سے نوازا ہو وہ اپنے بحرِ علمی پر غرور کرنے لگ جائے اور اسے اپنے ذاتی کمال اور لیاقت وقابلیت کا سبب جانے تو یہ ایک روشن حقیقت کا انکار ہوگا۔ اولیائے کرامؒ کے علاوہ اکثر لوگ نفس کے پیدا کردہ تکبر کے چکر میں آجاتے ہیں۔

۲۴۔ انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا

فرمانِ باری تعالیٰ ہے "اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ "[2] (کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو (جو مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گی) ہرگز اِکٹھا نہ کریں گے)۔ بہت سے لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے وہ قدرتِ الٰہیہ پر حرف گیری کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جب ہماری ہڈیاں خاک ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ ان چُور چُور ہڈیوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک مرید کی ماں آ گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا بچہ شیخ کی خدمت کرتا ہے مگر اسے خوراک ٹھیک نہیں ملتی اور روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتا ہے۔ اس نے حضرت شیخ کو کہا کہ آپؒ خود تو مُرغ وغیرہ کھاتے ہیں مگر میرے بیٹے کو دال اور سوکھی روٹی ملتی ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ جب وہ مُرغ کھانے کے قابل ہو جائے گا تو وہ بھی مُرغ ہی کھایا کریگا۔ اس نے پوچھا کہ قابل ہونے کا کیا مطلب ہے۔ آپؒ نے مُرغ کی ہڈیوں کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور یہ آیت پڑھی "مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ" (کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔[3] اس آیت کا پڑھنا تھا کہ مرغ زندہ ہو گیا۔

۲۵۔ مرنے کے بعد انسان خدا کے سامنے جواب دِہ ہوگا

قرآن میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ" (اے انسان! تو اپنے رب تک پہنچنے میں سخت مشقتیں برداشت کرتا ہے بالآخر تجھے اسی سے جاملنا ہے)۔[4] انسان تمام عمر مصیبت اور مشقت میں رہتا ہے اور آہستہ آہستہ لحہ بہ لحہ اپنی زندگی کے اختتام کی

---

[1] العلق، ۹۶:۵۔ [2] القیامۃ، ۷۵:۳۔
[3] یٰسین، ۳۶:۷۸۔ [4] الانشقاق، ۸۴:۶۔

طرف پہنچ رہا ہے اور پھر بالآخر اس نے اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ مرنے کے بعد اس کو دو گھروں میں سے ایک گھر میں ضرور جانا ہے یعنی یا تو دوزخ میں جائے گا یا بہشت میں۔ اس بات کا علم اس کو آخر عمر تک نہیں ہوتا کہ اسے کونسے گھر میں جانا پڑے گا، لہٰذا اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق گزارے تا کہ اس کی عاقبت محمود ہو سکے۔ اگر وہ دنیا میں ہی عیش وعشرت کی زندگی گزارتا رہے اور آخرت کی پرواہ نہ کرے تو لازمی طور پر عاقبت نامحمود ہوگی۔ اور اسے مرتے ہی قبر میں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور پھر ذلیل کر کے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے انسان سے کوئی لمبے چوڑے مطالبات نہیں بلکہ سیدھی سادھی بات ہے کہ نماز وروزہ کا اہتمام کرتے رہو۔ نماز کیلئے پورے دن میں تقریباً آدھ گھنٹہ درکار ہے اور اگر انسان اس آدھ گھنٹہ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہ صرف کرے تو اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ اس لیے عقلمندی کی بات یہ ہے کہ نماز وروزہ کی باقاعدگی رکھے اور حرام باتوں (مثلاً شراب، زنا، جوا، سود، چوری چکاری وغیرہ) سے الگ رہے تو اللہ تعالیٰ کے فضل کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

۲۶۔ انسان کی فطرت کثرت نعمت پر نظر رکھتی ہے

قرآن میں فرمایا گیا ہے "فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ" [1] (مگر انسان (ایسا ہے) کہ جب اس کا رب اسے (راحت وآسائش دے کر) آزماتا ہے اور اسے عزت سے نوازتا ہے اور اسے نعمتیں بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھ پر کرم فرمایا، لیکن جب وہ اسے (تکلیف ومصیبت دے کر) آزماتا ہے اور اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا)۔

اس آیت سے قبل ثمود اور فرعون کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عذاب کا کوڑا لگایا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ گھات لگائے رہتا ہے کہ انسان کیا کرتا ہے اور اس کا کیا حشر ہوگا۔

زیرِ غور آیات میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب نعمت دی جاتی ہے اور انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے تو وہ بہت خوش رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت بخشی مگر جونہی ذراسی سختی پہنچی یا رزق تنگ ہوگیا تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ذلیل کر دیا ہے۔ انسان کو ذلیل اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑ لے اور یتیم کی خدمت نہ کرے یا مسکین کو کھانا کھلانے کی رغبت نہ

---

[1] الفجر، ۸۹: ۱۵، ۱۶۔

رکھے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ جہاں داؤ لگے یتیموں کا مال کھاتے ہیں اور کثرتِ مال کو بہت دوست رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں بہت ناپسند ہیں اس لیے ان مذموم باتوں سے بچنا چاہیے۔

۲۷۔ انسان کو دنیا کی حقیقت کا آخرت میں علم ہوگا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ ۭ بِجَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى'' [۱] (اور پیش کی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی مگر (اب) اسے نصیحت کہاں (فائدہ مند) ہوگی)۔ جب انسان اپنی زندگی میں عیش وعشرت کا دلدادہ ہو اور مذکورہ بالا ترجیحات (یتیم کو نہ کھلانا، مال کی کثرت سے پیار کرنا اور خدا کی یاد سے بیگانہ رہنا) کے مقامات کو نظر انداز کردے تو پھر وہ یکا یک قیامت کے عذاب میں گرفتار ہو جائے گا اور اسے اس عذاب سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئے گی۔ یہ بات اس لیے قرآن مجید میں ارشاد کی گئی ہے کہ موت سے پہلے توبہ کرلو اور نماز و روزہ کو اپنے لیے لازم قرار دو کہ یہاں تک نوبت نہ آسکے کہ تم قیامت میں بے یار و مددگار چھوڑ دیئے جاؤ۔ ذرا سی بات ہے کہ نماز وغیرہ کا اہتمام کرو تو اللہ تعالیٰ باقی تمام مشکلات دنیوی سے بھی نکال لے گا۔ ایک بار بسم اللہ تو کرو۔ نماز جاری کرو اس کیلئے ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' نماز جاری کرنے اور اس میں دوام حاصل کرنے کے لیئے سودمند ثابت ہوسکتی ہے اور وہ لوگ جو اپنی نماز میں حسن لانا چاہتے ہیں ان کے لیئے ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' کارگر اور مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ راقم الحروف نے تو یہ اعلانِ عام کیا ہے کہ جو شخص نمازی بننا چاہے تو ایک دو گھنٹوں کیلئے ہماری صحبت میں آجائے تو انشاء اللہ نماز جاری ہو جائے گی۔

۲۸۔ قیامت کے دن انسان کا کوئی مفر و مقر نہ ہوگا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ'' [۲] (اس روز) انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے)۔ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ سخت غصے میں ہوگا اور فرمائے گا ''لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ'' (کس کی بادشاہی ہے آج؟) تو کسی کو بولنے کی جرأت نہ ہوگی اور پھر اللہ تعالیٰ خود ہی فرمائے گا ''لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ'' [۳] (صرف اللہ کی جو واحد اور قہار ہے۔) اس روز کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی گرفت سے فرار حاصل نہ کرسکے گا۔ عقلمند انسان کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ آج سے ہی توبہ کرلے اور باقاعدگی سے نماز و روزہ شروع کردے تاکہ اس روز کی ذلت سے بچے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے روایت ہے کہ آپؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اپنے تخت پر بیٹھا تھا

---

[۱] الفجر: ۸۹: ۲۳۔ [۲] القیامۃ، ۷۵: ۱۰۔ [۳] المؤمن، ۴۰: ۱۶۔

اور میرے سامنے ایک آئینہ تھا۔ میں نے اس آئینے میں دیکھا تو اپنے بچپن، جوانی اور بادشاہی کے دن تک کا نقشہ میرے سامنے گھوم گیا اور پھر مجھے اپنی آخری منزل قبر میں نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ گھاٹی بہت مشکل ہے، امتحان کڑا ہے اور ممتحن اتنا سخت ہے کہ وہ کسی کا لحاظ نہیں کریگا لہٰذا اس کی تیاری کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا کہ ایک نہایت باتمکنت شخص پہرے کے باوجود دربار شہنشاہ میں گھس آیا اور اس کی شکل پر اتنا رعب تھا کہ کسی کو روکنے کی جرأت نہ ہوئی (روایت میں ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے) وہ فقیر کے بھیس میں آنے والا شخص بادشاہ کے تخت کے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ بادشاہ سلامت آپ ایک طرف ہو جائیں، میں مسافر ہوں اور مجھے سخت نیند آ رہی ہے میں یہاں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ بابا آرام کیلئے تو ہم نے ایک سرائے تعمیر کی ہے۔ آپ اس میں جا کر آرام کریں۔ اس فقیر نے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے؟ شاہ نے کہا کہ یہ تخت ہے۔ پوچھا یہ کس کا تخت ہے؟ فرمایا میرا تخت ہے۔ پوچھا اس سے پہلے کس کا تھا؟ فرمایا میرے باپ کا، پھر پوچھا کہ اس سے پہلے یہ کس کا تخت تھا؟ فرمایا میرے دادا کا۔ فقیر نے کہا کہ پھر یہ بھی تو ایک سرائے ہے جہاں ایک بادشاہ آتا اور ایک جاتا ہے۔ یہ کہہ کر فقیر چلا گیا اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ اس چکر میں پڑ گئے کہ واقعی یہ تخت تو ایک سرائے ہے۔ دو چار واقعات اور پیش آئے تو آپ نے تخت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی اور حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ ہم نے بادشاہی چھوڑ دی ہے اب کیا کریں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا علم حاصل کریں۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا ہم نے ایک حدیث پڑھی کہ "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ" [1] (کہ یہ دنیا (کی محبت) تو تمام خطاؤں کی جڑ ہے) تو ہم نے اس پر عمل کیا اور تخت چھوڑ دیا۔ پوچھا اے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ آپ نے کتنی حدیثیں پڑھی ہیں اور ان پر کتنا عمل کیا؟ حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ بے ہوش ہو گئے اور پھر فرمایا کہ آپ کو علم کی ضرورت نہیں آپ اولیاءؒ کی صحبت اختیار کریں۔ اس کے بعد آپ نے فقر اختیار کیا۔ آپ کی پوری کہانی ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبال'' کے باب میں دے دی گئی ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔ یہ مثال اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے سوا انسان کا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس میں کوئی مفر یعنی جائے پناہ نہیں۔

۲۹۔ انسان کی پیدائش جمے ہوئے خون سے ہے

فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ؀'' [2] (پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے)۔ اس آیہ مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی پیدائش ایک جمے ہوئے

---

[1] آدابِ النفوس، ابوعبداللہ حارث بن اسد، متوفی ۲۴۰ھ، جلد ا، صفحہ ۱۳۶، دار الصادر، بیروت۔

[2] العلق، ۹۶:۲۔

لہو سے ہوئی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مہربانی سے نوازا کہ اسے علم اور دنیا کے دوسرے لوازمات سے سرفراز فرمایا۔ مگر کتنا افسوسناک مقام ہے کہ وہ اپنے رب سے ہی سرکشی کرنا شروع کردے۔ جس خدا نے اس پر اتنے احسانات کیے ہیں انسان اس کے حکم سے روگردانی کرتا ہے اور اس کی اتباع سے نہ صرف منہ موڑے ہوئے ہے بلکہ اس کی نافرمانی پر کمربستہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن اس کو عنقریب علم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ اپنے رب سے روگردانی نہ کرے اور اپنی زندگی میں ہی اس کی طرف رجوع کرلے۔

۳۰۔ انسان کو اس کے کرتوتوں سے آگاہ کردیا جائے گا

فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ '' [۱] (آگاہ کردیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا)۔ سورہ القیامۃ میں ان لوگوں کو جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اس کو دوبارہ پیدا کرسکے۔ اگر وہ آج اس بات کا احساس نہیں رکھتا تو اس کو جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس دن اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی اس کا مددگار ہوگا۔ قیامت کے روز جب اس کا اعمالنامہ اس کے سامنے رکھا جائیگا تو وہ خود حیران ہوگا کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس کے اعمالنامے میں کیسے لکھ دیا گیا ہے اور اس دن اُس کو اپنے تمام کئے ہوئے اعمال کا علم ہو جائے گا اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ وہ اپنی کافرانہ یا فاسقانہ زندگی کے جو آثار و نشانات پیچھے چھوڑ آیا ہے اس کی وجہ سے کتنے لوگ گمراہی کا شکار ہوئے۔ ہر انسان کی زندگی دوسروں پر بھی کچھ اثرات چھوڑتی ہے اور جو لوگ اس کی وجہ سے گمراہ ہونگے اس کا بھی گناہ اسی کو پہنچے گا۔

راقم الحروف نے ۲۰۰۰ء کے دورۂ امریکہ میں ایک امریکی پولیس افسر کی بیٹی اور ایک پاکستانی تاجر کی بیوی سے تبلیغی امور کے سلسلے میں یہ پوچھا کہ صحیح مذہب کون سا ہے؟ جب وہ جواب نہ دے سکیں تو اس سے یہ پوچھا کہ تم بتاؤ کہ اتنی بڑی کتاب قرآن مجید مسلمانوں کو کس طرح یاد ہو جاتی ہے۔ اس نے انگلی اوپر اُٹھائی اور کہا اللہ۔ اس کے بعد بہت طویل لیکچر میں قرآن کے حفظ کرنے کے اعجاز کے بارے میں اسے بتلایا گیا کہ قرآن کیوں حفظ ہو جاتا ہے اور پوچھا کہ تم نے اپنے اسلام لانے سے پہلے یعنی عیسائی ہونے کے زمانے میں کبھی یہ نہیں سوچا کہ صحیح مذہب کونسا ہے، تو وہ کہنے لگی کہ میں نے کبھی اس نکتے کے بارے میں نہیں

---

[۱] القیامۃ، ۷۵:۱۳۔

سوچا تھا اور وہ اس لیے کہ ہمارے ماں باپ، چچا، بھائی سب عیسائیت میں پھنسے ہوئے تھے، اس لیے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اسلام کے بارے میں کچھ سوچتی۔ معلوم ہوا کہ انسان کے وہ رشتے دار جو اپنے کافرانہ اور فاسقانہ تاثرات چھوڑ جاتے ہیں وہ دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث بنتے ہیں۔

۳۱۔ انسان کی ہڈیاں حشر کے دن جمع کی جائیں گی

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ'' [1] (کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم ہرگز جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیوں کو)۔

سورۃ القیامۃ کی آیت ۱۳ کی تشریح میں اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ کچھ لوگ دوبارہ زندہ کیے جانے سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ کیا جو خدا انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کر سکتا ہے تو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کی ہڈیوں کو دوبارہ جمع کر کے اپنے سامنے کھڑا کر دے؟ اس سلسلے میں بہت سی روایات نظروں سے گزرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور بزرگوں کو بھی یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں آیا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کرتے تھے۔ منقول ہے کہ ایک عیسائی شخص نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے یہ ذکر کیا کہ ان کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا قرآن میں منقول ہے اس لیے نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درجہ تمہارے نبی سے بڑا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو بہت اونچی شان رکھتا ہے لیکن یہ کام تو میرے جیسا امتی بھی کر سکتا ہے چنانچہ انہوں نے ۲۰۰ سال پرانا مردہ ایک قبر سے زندہ کھڑا کیا۔ ایک امتی مردے کو کیسے زندہ کر سکتا ہے اس کی تفصیل ہماری تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں مکاشفۂ ذاتی کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں۔

۳۲۔ انسان ایک منی کا قطرہ تھا

قرآن میں ارشادِ باری ہے ''اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی'' [2] (کیا وہ (ابتداء میں) منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے)۔ سورہ القیامۃ میں ہی اس بات کا ذکر ہے کہ کیا انسان ابتدا میں ایک منی کا قطرہ نہ تھا کہ جس سے ہم نے اس کو پیدا کیا۔ اس آیت کے بعد اس بات کا ذکر ہے کہ یہ منی کا قطرہ علقہ خون کا لوتھڑا بنا اور پھر مختلف حالات سے گزرتا ہوا انسان بنا اور پھر اس سے مرد اور عورت کو بنایا اور یہ مثال اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ ہم (اللہ تعالیٰ) مردوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ جو لوگ کافر تو نہیں اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ دیکھیں گے کب مریں گے، کب دوبارہ زندہ ہوں

---

[1] القیامۃ، ۷۵:۳۔ [2] القیامۃ، ۷۵:۳۷۔

گے؟ اس خیال میں وہ نماز روزے کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔

۳۴۔ کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے خواہ مخواہ چھوڑ دیا جائے گا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی'' [1] (کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے مہمل چھوڑ دیا جائیگا)۔ سورہ القیامۃ کے آخری حصے میں ابوجہل کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر کہا ''اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی'' [2] (تیری خرابی آ گئی اب آ گئی)۔ چنانچہ اس آیت کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ قتل ہوا، لیکن جب یہ آیت اس کے کپڑے کو پکڑ کر پڑھی گئی تو وہ گھبرا گیا تھا کیونکہ آپ ﷺ نے جب بھی جو کچھ بھی فرمایا ہے سچ ثابت ہوا۔ ابوجہل کہنے لگا اے محمد (ﷺ)! تم مجھ کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہو جب کہ میرا قبیلہ میرے ساتھ ہے۔ اس مثال کے بعد (کہ ابوجہل کی موت آپ ﷺ کے فرمانے کے کچھ عرصہ بعد ہی آئی) انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ جیسے ابوجہل کو معاف نہیں کیا گیا اسی طرح تم بھی نہ سمجھو کہ تم کو بھی خواہ مخواہ چھوڑ دیا جائیگا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ تم اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر چھوڑ نہیں دیئے جاؤ گے جب تک تمہیں آزما نہیں لیا جاتا۔ اگر خدا کی یاد سے غفلت کرو گے تو سمجھ لو کہ جو حشر ابوجہل کا ہوا تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل رہتے ہیں ان کی زندگی دنیا میں بھی تنگ کر دی جاتی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے تباہی کے سوا اور کچھ نہیں، لہٰذا یہ وقت ہے کہ آج سے ہی توبہ کر لو اور نماز و روزہ کا اہتمام شروع کر دو۔ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی کا حکم کب آ جاتا ہے۔ یہ حکم ایک لمحہ کے بعد بھی آ سکتا ہے اور کچھ دیر بعد بھی۔ لہٰذا آج سے ہی نماز و روزہ کا اہتمام شروع کر دو۔ ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں نماز شروع کرنے کا آسان طریقہ دیا جا چکا ہے۔

جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سیدھا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے

مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو خواہ مخواہ چھوڑ نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر ضروری ہو تو انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی مواخذہ کر سکتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت لے لینے اور پھر دوبارہ ملنے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور روایت پیش کی جاتی ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خیالات کو بھی نظر انداز نہ کیا گیا۔

منقول ہے کہ ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی کہ الٰہی مجھ کو ایسی سلطنت عطا فرما جو نہ کسی کو ان سے پہلے دی گئی ہو اور نہ ان کے بعد ہی کسی کو دی جائے۔ چنانچہ پوری دنیا پر ان کی حکومت قائم کر دی

[1] القیامۃ، ۷۵:۳۶۔　[2] القیامۃ، ۷۵:۳۵۔

گئی۔آپ کا تخت سلیمانی مشہور ہے اور ہوائیں آپ علیہ السلام کے تابع فرمان تھیں جدھر آپ علیہ السلام چاہتے تخت اسی رخ کو چلا جاتا۔ایک روز آپ تخت پر جا رہے تھے اور آپ کے ساتھ بہت سے مصاحب بھی بیٹھے ہوئے کسی منزل کی طرف جا رہے تھے کہ یکا یک آپ کے دل میں خیال آیا کہ میری سلطنت کتنی وسیع ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کسی کو بھی نہیں دی گئی۔آپ کے دل میں ایسے خیال کا آنا ہی تھا کہ تخت لڑکھڑانے لگ گیا۔آپ نے تخت پر اپنے کوڑے کو دے مارا اور تخت کو حکم دیا کہ سیدھے ہو کر چلو! اس پر تخت کو بھی اللہ تعالیٰ نے زبان دی اور اس نے کہا اے سلیمان علیہ السلام آپ بھی سیدھے ہو جائیں گے تو میں بھی سیدھا ہو جاؤں گا۔آپ نے اپنے خیال پر استغفار پڑھی تو تخت ٹھیک سے ہوا میں چلنے لگا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ سیدھا ہو کر چلے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ہر کام میں مدد فرمائے گا جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے کہ "مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ"[1] (جو اللہ تعالیٰ کا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کا ہو جاتا ہے)۔

مذکورہ بالا تمام آیات کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں جو کمی یا کمزوری ہے اس کو دور کرتا چلا جائے حتیٰ کہ اتباع شریعت کی مدد سے زندگی گزارے تو اللہ تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس کی زندگی کی راہ اور آخرت کو ہموار کر دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دنیا کی عیش وعشرت میں آخرت کو بھلا نہ دے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہو جائے۔اس اطاعت کیلئے سب سے ضروری بات نماز وروزہ کی پابندی کرنا ہے اور اسلام کی حرام کی ہوئی تمام چیزوں کا ترک کر دینا ہے۔نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کی خوبیاں انسان کو روحانیت کی دیگر منازل کو طے کرنے میں مدد دیتی ہیں۔نماز کی اقامت کیلئے ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' اور ''حسنِ نماز'' کے مطالعے سے نماز کو جاری کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔جو لوگ راقم الحروف کے پاس اس غرض سے آجائیں کہ نماز قائم ہو جائے تو یہ ایک دو گھنٹوں کی بات ہوگی۔

خلاصۂ کلام ان آیات میں انسانی نفسیات کا ایک نہایت خوبصورت انداز میں حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو امن وعافیت، اقبال مندی، خوشحالی اور دولت وثروت کی فراوانی کی صورت میں رحمت سے نوازا جاتا ہے تو اس پر وہ اترانے لگتا ہے اور وہ ان سب چیزوں کا اپنی ذاتی اہلیت اور قابلیت کی وجہ سے اپنے آپ کو ان خوبیوں کا مستحق سمجھتا ہے۔اس طرح سمجھنے سے گویا وہ ان گوناگوں نعمتوں کی ناشکری کر بیٹھتا ہے۔اپنے مالک کا شکر ادا نہ کرنے کی وجہ سے وہ نعمتیں جب چھین لی جاتی ہیں

---

[1] مرقاۃ المفاتیح، علی بن سلطان القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، جلد ۵، صفحہ ۳۴، المکتب الاسلامی، بیروت۔

تو قرآن کے مطابق ایسا انسان یاس وقنوطیت کی دلدل میں جا گرتا ہے۔ یہ مایوسی رنج وحزن کے اس دور میں اُس کیلئے تباہ کن ہوتی ہے۔ اس تھوڑی سی تکلیف اور امتحان پر وہ دوسرے بے شمار انعاماتِ خداوندی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ناکامی ونامرادی کے وقت حوصلہ ہار کر اور پاؤں توڑ کر بیٹھنے والے انسان کو پھر اگر اللہ تعالیٰ فارغ البالی اور آسائش عطا کر دے تو بھی یہ انسان دوبارہ کبروغرور سے زمین پر اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگتا ہے۔ اس کے عروج کا زمانہ لوگوں کیلئے مصیبت اور بدبختی کا زمانہ ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی زندگی کبھی مثالی نہیں بن سکتی۔ مختلف حالات میں انسان کا ردعمل اور طریقہ کار مذکورہ آیتوں میں بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان اپنی بھلائی اور وقار کی خاطر بہتر رویہ اختیار کر سکے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''مومن کی عجیب شان ہے۔ اس کی ہر حالت اس کیلئے بہتر ہے۔ اگر اسے آرام وراحت پہنچے تو وہ اس پر شکریہ ادا کرے تو یہ آرام وآسائش اس کیلئے خیروبرکت کا باعث بن جاتی ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچے اور اس پر صبروشکر کرے تو یہ تکلیف بھی اس کیلئے خیروبرکت کا سبب بن جاتی ہے''۔[1]

پہلی آیات میں انسان کی فطرت کا اظہار کیا گیا ہے تاکہ وہ ان کمزوریوں کو اپنی نظروں میں رکھ کر اپنی زندگی صحیح زاویوں کے مطابق گزارے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا پہلے سے زیادہ حقدار بن جائے۔ اللہ تعالیٰ کو انسان سے یہ شکایت ہے کہ وہ جہاں اپنی بھلائی دیکھتا ہے وہاں برسرِ پیکار ہو جاتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جلد تیار ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا خالق اس کی کن باتوں سے راضی ہوتا ہے اور کن حالات میں انسان پر غیظ وغضب کا عذاب نازل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو انسان کی جلد بازی اور عجلت سازی کی عادت بھی پسند نہیں۔ انسان کی اپنے رب سے سرکشی اور بغاوت کا رویہ تو سخت ناگوار ہے۔ انسان اگر اپنے اوقات کے متعلق سوچے تو اس کا بغض، سرکشی، غصہ، ضد، تکبر اور باقی تمام عاداتِ ذمیمہ دور ہو سکتی ہیں۔

حدیث شریف کی رو سے انسان کیلئے ایک کارآمد نصیحت

قرآن کی آیات اور احادیث کے مجموعہ سے ایک بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے جس پر انسان عمل کرے تو دنیا اور دین کی سلامتی میسر آ سکتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کو پیدا کیا تو اس کو مخاطب ہو کر فرمایا ''اے دنیا! جس شخص کو تو میرا تابع فرمان دیکھے تو تم اس کی تابع فرمان ہو جانا اور جو تیرا تابع فرمان ہو تو تم اس کو تھکا دینا''۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جتنے لوگ اللہ تعالیٰ کی تابع فرمانی پر مامور رہے دنیا بھی ان کی تابع فرمان رہی اور باقی نافرمانوں کیلئے یہ دنیا پریشانیوں کا سبب بنتی رہی (یہ دیکھا گیا ہے کہ جس نے بھی اس کا تجربہ کیا اُس نے اسے درست پایا)۔

---

[1] الاحادیث المختارہ، ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد، متوفی ۶۴۳ھ، حدیث ۱۰۲۸، جلد ۳، صفحہ ۲۲۳، دار الکتب الاسلامیہ، بیروت۔

شاید لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کی تابع فرمانی کیسے ہوسکتی ہے۔اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ بات کچھ مشکل نہیں۔اللہ تعالیٰ کی تابع فرمانی کیلئے یہ ضروری ہے کہ نماز وروزہ کی پابندی کی جائے اور تمام کبیرہ گناہوں سے (زنا، چوری، شراب، جواوغیرہ) سے پرہیز کیا جائے تو بس یہی اطاعتِ الٰہی کا خلاصہ ہے۔ ایسا شخص رفتہ رفتہ تمام دیگر اخلاقِ محمودہ سے متصف ہوتا چلا جائے گا۔اگر کسی کو کسی نیک بزرگ کی صحبت میسر آجائے تو ''شبانی سے کلیمی دوقدم ہے'' والی بات ہے اس کے بعد اس کیلئے روحانیت کے دروازے کھل جائیں گے اور وہ بہت بلند مقام پر جا کھڑا ہوسکے گا جس کے بعد اس کے سر پر تسخیرِ خلق کا تاج پہنا دیا جائے گا۔

مذکورہ بالا حدیث شریف میں بیان کردہ نقطہ حقیقت کا راز ہے جو اللہ تعالیٰ کی عادات میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انہی اندازوں اور عادات پر قائم کیا ہے اور اس میں وہ انحراف نہیں کرتا۔قوت القلوب میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزی بانٹنے کے آداب بھی مقرر کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کسی کو وہ کہتا ہے کہ تم خود کماؤ اور خود کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تمہارا روزی کمانا اور خود کھانا میری طرف سے ہے دوسرا یہ کہ وہ خواص کو کہتا ہے کہ تم عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اسے کوئی رزق دے اور اس کے خاص بندوں کو بھی کوئی رزق دے۔اللہ تعالیٰ کچھ بندوں کے سپرد ان کی روزی کر دیتا ہے اور دینے والوں کے رزق میں برکت ڈال دیتا ہے۔ایسے عابدوں کا رزق اللہ کے ذمے ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے ذریعے اس کی مدد کر دیتا ہے یعنی وہ عابدوں کو کہتا ہے کہ تم عبادت کرو اور تمہارا معاملہ ہمارے ذمے ہے۔تیسرا گروہ خاص الخاص بندوں کا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو کہتا ہے کہ جاؤ تم عبادت کرو بلکہ لوگوں کی خدمت بھی کرو تمہارا کھانا میرے ذمے ہے۔تمہاری اس خدمت کا کام اپنے لیے کھانے کی جگہ ہے یعنی خدمت کے بدلے اس کو سب کچھ دیا جاتا ہے۔اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے یعنی انہیں دین کی طرف راہنمائی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس کام کے بدلے اس کے رزق کی خود کفایت کرتا ہے لہٰذا یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا کام کرنے والوں کو یہ سعادت حاصل ہوجاتی ہے۔اس کی تفصیل ہماری تصانیف ''سرمایہ ملت'' اور ''مکتوباتِ لطیف'' جو عنقریب شائع ہونے والی ہیں دی گئی ہے۔

ایک اور زریں اصول جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ یہ کہ صوفی وہ کہلا سکتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے راضی ہو۔جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اس پر گلہ شکوہ نہ کرے بلکہ اس پہ راضی رہے۔ایک روایت میں ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ بیمار ہوگئے تو ان کے ایک دوست نے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کو تندرست کر دے۔فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا مگر اس نے یہ جواب دیا ''تم ہماری مخلوق ہو اور ہماری مِلک ہو۔ہم اپنی ملک میں جو چاہیں کریں گے۔تم کون ہو جو ہماری ملک میں دخل

دیتے ہو" فرمایا یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ ایسی باتوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنی رضا سمجھنا بہتر ہے اور اس کو اس طرح راضی کر لیا جائے تو یہ خود انسان کیلئے بہتر ہے۔ راقم الحروف نے جب اس روایت کا مطالعہ کیا تو ایک نظم لکھ دی جسکا پہلا شعر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

منظورِ حق جو ہے وہی منظور ہے ہمیں   کس سادگی سے ہم نے خدا کو منا لیا

خواہشاتِ نفس کو کیونکر قابو میں لایا جا سکتا ہے؟

امام بوصیریؒ نے اپنے مشہور نعتیہ قصیدہ بردہ شریف میں نفس کے بارے میں دو باتیں لکھی ہیں ایک یہ ہے کہ نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے، جب تک بچے کا دودھ چھڑایا نہ جائے وہ خود دودھ پینا نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح جب تک نفس کو بُرائی سے روکا نہ جائے تو یہ بُرائی سے نہیں رکتا۔ دوسری بات یہ کہ بالعموم اگر کسی سے اچھائی سے پیش آئیں تو اس کا بدلہ اچھائی سے ملتا ہے مگر نفس حُسنِ سلوک کا جواب بُرائی سے دیتا ہے یعنی اگر اس کی بات توجہ سے سُنی جائے تو یہ بُرا مشورہ دیتا ہے۔

مولانا رومیؒ نے ایک بڑی دلچسپ حکایت لکھی ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک گاؤں واقع تھا۔ ایک دن اُس گاؤں کے لوگ کسی کام سے پہاڑ پر گئے۔ انہوں نے وہاں برف میں ایک بہت بڑا اژدھا پایا، جو کہ مردہ حالت میں تھا۔ وہ اسے باندھ کر پہاڑ کے نیچے اپنے گاؤں میں لے آئے۔ اژدھا کو جب دھوپ کی گرمی ملی تو اُس نے ہلنا جلنا شروع کر دیا۔ بالآخر ساری رسیاں توڑ کر آزاد ہو گیا۔ مولانا رومیؒ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چند حالات میں انسانی نفس بظاہر تو مردہ ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ مرتا نہیں۔ جب بھی اسے شہوت یا حرص یا خودنمائی کی گرمی پہنچے تو یہ ساری رسیاں توڑ تاڑ کر پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

سورۃ الاعراف میں ایک ایسے شخص کا بیان ہے کہ جو پہلے اچھے درجہ پر تھا مگر بعد میں نفس کے کہنے میں آ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝"[1] (اور پڑھ سنائیے انہیں حال اس کا جسے دیا ہم نے (علم) اپنی آیتوں کا تو وہ کترا کر نکل گیا ان سے تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو ہو گیا وہ گمراہوں میں اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر اسے چھوڑ دے تب بھی

[1] الاعراف، ۷: ۱۷۵-۱۷۶۔

ہانپے یہ حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو آپ سنائیں (انہیں) یہ قصہ شاید وہ غور و فکر کرنے لگیں)۔

مذکورہ آیاتِ کریمہ میں ''زبان نکالنا'' کسی شئے پر لالچ سے لپکنے کا اشارہ ہے۔ یعنی جیسے کتا دوڑتا ہوا بھی زبان نکالے ہانپتا رہتا ہے اور ٹھنڈی جگہ پر آرام سے بیٹھا ہوا بھی زبان نکالے رہتا ہے۔ اسی طرح سے بعض لوگ ذہنی اور روحانی لحاظ سے اچھے درجات رکھتے ہوئے بھی ہوائے نفسانی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

قدیم مذاہب کا نظریہ یہ تھا کہ نفس کو مارا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں دعوت کے عمدہ کھانے یا مرغن غذاؤں سے مکمل پرہیز کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جدید مغربی سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے اثرات سے بچنا ناممکن ہے۔ اس لیے یہ لوگ جنت وغیرہ کے بارے میں کھلی چھٹی کے قائل ہیں جبکہ اسلام کے نظریۂ تربیت و اصلاحِ نفس کے مطابق نفس کو کلیتاً مارا نہیں جاسکتا اور نہ ہی یہ مرتا ہے البتہ سرکش گھوڑے کی طرح اسے سدھایا جاسکتا ہے، جیسے گھوڑے کے پیچھے بھاری وزن باندھ کر ایک کھلے میدان میں چابک کے اشارے پر دوڑایا جاتا ہے تو وہ ہانپ کر تھک جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد مالک کی لگام کے اشارے سے چلتا اور مالک کا حکم بجالاتا ہے، اسی طرح نفس پر بھی عبادت و ریاضت اور ذکر و فکر سے قابو پایا جاسکتا ہے اور مجاہدات کے ذریعے احکامِ الٰہیہ کا مطیع بنایا جاسکتا ہے۔

حضرت حاتمؒ نے ارشاد فرمایا ''نفس کی خواہشات تین ہیں اور انہی پر قابو پالینا ہی اصل مردانگی ہے۔ وہ تین یہ ہیں۔ (۱)۔لذتِ طعام (۲)۔لذتِ کلام (۳)۔لذتِ نظر''۔

مذکورہ خواہشات میں سے ہر ایک پر قابو پانے کا طریقہ مختلف ہے۔ لذتِ طعام پر قابو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی رزاقیت پر کامل اعتماد کرے۔ اسے یقین ہو کہ وہی رازقِ مطلق ہے۔ کسی انسان کا رزق کسی آدمِ خاکی کے ہاتھ میں نہیں۔ رزق کیلئے کوشش کی جائے اور جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے اس کو کافی سمجھے لذتِ کلام پر کنٹرول کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو حق اور صداقت کا سختی سے پابند کرے۔ دل میں پختہ عہد کرلے کہ جب بھی بولے گا سچ بولے گا، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو یہ سمجھ کر وہ جو بھی بات کرے گا تول کر، سوچ سمجھ کر کرے گا۔ ہر بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کرے گا لذتِ نظر کا علاج یہ ہے کہ انسان اپنی نظر کو نظرِ عبرت بنائے۔ اس سے عبرت حاصل کرنے کا کام لے۔ نظر ایک زہر میں بجھا ہوا تیر ہے اگر اس کی حفاظت نہ کرو گے تو یہ گناہ کی ایسی اندھیری غار میں گرادے گی جہاں سے نکلنا آسان نہ ہوگا۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہر شئے پر عبرت کی نگاہ ڈالو۔ اس طرح تمہاری نگاہ حقیقت رس اور دیدۂ عبرت بن جائے گی اور اس طرح تم ان تمام گناہوں اور عیبوں سے فلاح پاجاؤ گے جو بُری نظر سے پیدا ہوتے ہیں۔ بُری نظر عموماً عورتوں کی طرف اُٹھتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ

جب وہ کسی عورت کو دیکھتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں جیسے ان کے سامنے کوئی مٹی کی کوئی دیوار ہو۔ آپؒ کا مطلب یہ ہے کہ سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں فقط نقش ونگار کا فرق ہوتا ہے۔ جب سب عورتیں ایک جیسی ہیں تو ایک ہی کے مثل نظر آئیں گی۔

ہر مرض کا ایک علاج ہوتا ہے۔ ہر بیماری کو دور کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور سب سے بہتر علاج پرہیز ہے۔ امراضِ نفس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، یہی اس کا علاج اور پرہیز بھی ہے۔ مردانگی یہ نہیں ہے کہ انسان کسی پہلوان کو پچھاڑ دے بلکہ مردانگی یہ ہے انسان نفسِ امارہ کی سرکوبی کرے۔ استاد ابراہیم ذوق کہتے ہیں۔

نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انسان کسی حال میں بھی شریعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے کیونکہ شریعت سب سے برتر اور سب سے فائق ہے۔ اصلاحِ نفس کے اصولوں میں پیر راہ دان کی صحبت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے استفادہ کرتا رہے اصل راستہ قرآن کا راستہ ہے اور اصل پیروی نبی محتشم ﷺ کی پیروی ہے۔ جس کسی نے خلاف پیغمبر ﷺ راستہ اختیار کیا وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواهد رسید

(پیغمبر ﷺ کے خلاف جو شخص راستہ اپنائے گا، ہرگز منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے گا)

باب نمبر۴

نفس کی وضاحت قرآن کی زبان میں

نفسِ انسانی کی منفی خواہشات وعادات

قرآن کریم نے نفسِ انسانی کی منفی خواہشات و عادات کا تذکرہ نہایت خوبصورت اور دل نشین پیرایہ میں کیا ہے۔ اسلوبِ کلام مذمتی اور تردیدی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ایسے خوب صورت انداز میں دنیا کی بے ثباتی ودھوکہ سامانی کا بیان ہے کہ بات سامع کے دل میں اترتی ہے۔ منفی خواہشات وعادات کا ضرر ونقصان انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی پر واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ انسان کی سیاسی، تمدنی، عمرانی، نفسیاتی، تعلیمی اور معاشی زندگی خواہشات کی منفی رو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان منفی خواہشات کی رَو میں بہتا ہے تو گھاٹا وخسران میں پڑ جاتا ہے۔ اسلام کے فطری احکامات کے خلاف جنگ میں کوئی قوم یا شخص فاتح نہیں ہو سکتا اسے بالآخر ہار ماننا پڑتی ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کریم نے بعض رشتوں سے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ جن کو محارم کہا جاتا ہے۔ اگر لوگ شہوات سے اتنے مغلوب ہو جائیں کہ وہ محارم سے توالد وتناسل کا سلسلہ چلانے پر آمادہ ہو جائیں تو بوجہ نافرمانی وسرکشی انسانیت تباہ ہو کر رہ جائے۔ (اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) ذیل میں قرآنی نقطۂ نظر سے نفس انسانی کی منفی خواہشات وعادات کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مثبت طرزِ عمل کے عنوان سے اس کا علاج بیان کیا جائے گا۔

حبِ مال

انسان کی منفی عادات میں سے ایک مال کی محبت ہے۔ مال کی محبت اسے دوڑائے پھرتی ہے۔ اس

کی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اس کے پاس جمع ہو جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ" [1] (اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے)۔

خیر سے مراد یہاں مال و دولت ہے اور مال و دولت سے انسان کی محبت اظہر من الشمس ہے۔ گناہوں کا یہ سیل بے پناہ، مظالم کی یہ آندھیاں، مزدور اور سرمایہ داروں کے درمیان یہ خونریز تصادم، سب کے پسِ پردہ دولت کی یہی بے پناہ محبت اور لالچ کارفرما ہے۔ دوست، دوست کو لوٹ رہا ہے، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، انسان انسان کے درپے آزار ہے۔ یہ سب کچھ دولت کے لالچ کے باعث ہو رہا ہے۔ تمام تعلقات، تمام دوستیاں، تمام رشتہ داریاں، دولت کے طلسم ہوش ربا کے سامنے بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ انسان کا عمل اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کو جتنی ہوس سیم وزر کی ہے، اس کے دل میں جتنی چاہت دولت وثروت کی ہے اتنی اور کسی چیز کی نہیں۔ اس کے حصول کیلئے جوانتھک محنتیں کرتا ہے، اپنے وطن کو چھوڑتا ہے، اپنی آسائش سے دست کش ہوتا ہے اور بعض اوقات اپنی عزت وآبرو کو بھی خاک میں ملا دیتا ہے اور اپنی زندگی کو طرح طرح کے خطرات سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

انسان میں مال کی شدید محبت

شدتِ حب مال کی وضاحت کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں حُب مال ایک ایسی بیماری ہے جس سے کئی بیماریاں پھوٹتی ہیں اور انسان روحانی امراض کی آماجگاہ بنتا چلا جاتا ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ حُب مال کی بیماری سے پھوٹنے والی سب سے بڑی بیماری جمعِ مال کی بیماری ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اَلَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ" [2] (جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھتا ہے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے لافانی بنا دیا ہے)۔

دوسرے لوگوں پر زبانِ طعن دراز کرنے کی عادت اس میں اس لیے ہے کہ یہ بڑا مال دار اور دولت مند ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے لگا ہے اور دوسرے لوگوں کو بنظرِ حقارت دیکھتا ہے لیکن دولت مند ہونے کے باوجود بڑا کنجوس ہے۔ گن گن کر بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھتا ہے۔ ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اگر اس کی دولت اس کے پاس رہی تو موت کا فرشتہ اس کے قریب نہیں پھٹکے گا اور اسی کروفر کے ساتھ یہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بعض علماء نے اس کا یہ مطلب

---

[1] العٰدیٰت، ۱۰۰:۸۔ [2] الھمزۃ، ۱۰۴:۲،۳۔

بیان کیا ہے کہ یہ مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ کبھی فنا ہوگا، نہ ختم ہوگا۔ [1]

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" [2] (تمہیں کثرتِ مال کی ہوس اور فخر نے (آخرت سے) غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے)۔ امام ابو القاسم الحسین بن محمدؒ "مفردات القرآن" میں فرماتے ہیں: اَللَّھْوُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے۔ [3]

پیر کرم شاہ الازہریؒ نے اَلتَّکَاثُرُ کے دو معنی ذکر کیے ہیں (۱) مال جمع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا (۲) مال و دولت کی کثرت پر فخر کرنا۔ جو لوگ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں ان کو بڑی اہم اور ضروری چیزیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ جب دولت سمیٹنے کی خواہش جنون کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس وقت انہیں نہ خدا یاد رہتا ہے، نہ موت یاد آتی ہے اور نہ قبر کا وہ تاریک گڑھا جس میں انہوں نے ایک نہ ایک دن آ کر فروکش ہونا ہے۔ بس ایک ہی خیال میں مگن رہتے ہیں کہ جیسے بھی بن پڑے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لی جائے۔ خدا ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ قوم سے خیانت، اپنے ملک سے غداری، اپنے فرائض کی ادائیگی میں بددیانتی کے جرائم سرزد ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے بدنصیب لوگ خوفِ خدا اور آخرت کو ہی نہیں بھولتے بلکہ پرلے درجے کے خود فراموش بھی ہوتے ہیں۔ اپنی ذات، اپنی آبرو، اپنی شہرت سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور اکثر یہ بازی ہار جاتے ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں: تم اسی دھن میں مست رہتے ہو یہاں تک کہ حیاتِ مستعار کا سورج ڈوب جاتا ہے۔ موت کا فرشتہ آ کر تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور تم ہمیشہ کیلئے قبر کی آغوش میں لٹا دیے جاتے ہو۔ جو شخص مر جائے اہل عرب کہتے ہیں مَنْ زَارَ قَبْرَہٗ گویا زیارتِ قبر کا لفظ قبر میں دفن ہونے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ [4]

انسان کی جمعِ مال کی ہوس اور بخیلی و کنجوسی کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ایک اور جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: "قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَکْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَکَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا" [5] (فرما دیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تب بھی (سب) خرچ ہو جانے کے خوف سے تم (اپنے ہاتھ) روکے رکھتے، اور انسان بہت ہی تنگ دل اور بخیل واقع ہوا ہے)۔

حُبِّ مال و جمعِ مال پر وعید

موقع کی مناسبت سے ان وعیدوں کا تذکرہ بھی مناسب ہے جو مال سے محبت کرنے والوں اور اسے جمع کرنے والوں اور اسے گن گن کر رکھنے والوں کے بارے میں قرآن کریم نے ارشاد فرمائی ہیں:

---

[1] ضیاء القرآن، جلد ۵، صفحہ ۶۵۸۔　[2] التکاثر، ۱۰۲: ۱،۲۔　[3] مفردات، جلد ۱، صفحہ ۴۵۵۔

[4] ضیاء القرآن، جلد ۵، صفحہ ۶۴۷ تا ۶۴۸۔　[5] الاسراء، ۱۷: ۱۰۰۔

''وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍo یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ''[1] (اور جولوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔ جس دن اس (سونے، چاندی اور مال) پر دوزخ کی آگ تاپ دی جائے گی پھر اس (تپے ہوئے مال) سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور ان سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی (مال) ہے جو تم نے اپنی جانوں (کے مفاد) کیلئے جمع کیا تھا سو تم (اس مال کا) مزہ چکھو جسے تم جمع کرتے رہے تھے)۔

قرآن کریم میں ایک اور مقام پر انسان کی مال سے محبت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے ''فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِo وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَھَانَنِo کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَo وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِo وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّاo وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا''[2] (مگر انسان (ایسا ہے) کہ جب اس کا رب اسے (راحت و آسائش دے کر) آزماتا ہے اور اسے عزت سے نوازتا ہے اور اسے نعمتیں بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھ پر کرم فرمایا، لیکن جب وہ اسے (تکلیف و مصیبت دے کر) آزماتا ہے اور اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا، یہ بات نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ عزت اور مال و دولت کے ملنے پر) تم یتیموں کی قدر و اِکرام نہیں کرتے، اور نہ ہی تم مسکینوں (یعنی غریبوں اور محتاجوں) کو کھانا کھلانے کی (معاشرے میں) ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو، اور وراثت کا سارا مال سمیٹ کر (خود ہی) کھا جاتے ہو (اس میں سے افلاس زدہ لوگوں کا حق نہیں نکالتے اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہو)۔

بعض لوگوں کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ رہنے کیلئے آرام دہ شاندار مکانات ہوتے ہیں۔ اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ معاشرے میں بھی انہیں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے برعکس بعض لوگ مفلس اور تنگ دست ہوتے ہیں اور کئی قسم کی محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کا ردِعمل یکساں نہیں ہوتا۔ جو لوگ مادہ پرست ذہنیت کے ہوتے ہیں اگر ان کے پاس مال و دولت ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی علامت ہے۔ اور اگر وہ مفلس ہو جائیں تو اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی دلیل سمجھتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ایمان والے ہر دو حالتوں میں صبر و شکر کرتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم کی ان آیات میں ان دونوں حالتوں کو ابتلاء و آزمائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[1] توبہ، ۹:۳۴، ۳۵۔ [2] الفجر، ۸۹:۱۵، ۲۰۔

جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دولت کی قلت و کثرت اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضگی کا معیار نہیں۔ آیت کریمہ میں "کَلَّا" فرما کر ان نادانوں کے اس نظریہ کا بطلان کر دیا کہ دولت اس کی رضا کی نشانی نہیں اور افلاس اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے نہیں اور فرمایا کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے اور تمہاری بستی میں، محلہ میں اور پڑوس میں کئی لوگ فاقہ کا شکار ہوتے ہیں لیکن تم اپنی رنگ رلیوں میں مصروف رہتے ہو۔ تمہیں کبھی ان مسکینوں کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ اگر تمہارا کوئی رشتہ دار مر جائے تو تم اس کی ساری جائیداد بھی ہڑپ کرنا چاہتے ہو اور نہ اس کی بیوی اور یتیم بچوں اور نہ اس کے بوڑھے ضعیف والدین کو کچھ دینا چاہتے ہو۔ مال و دولت کی محبت اس قدر تمہارے رگ و ریشہ میں سما گئی ہے کہ تم نے دولت کی ہوس میں حرام و حلال کی پرواہ کرنا بھی چھوڑ دی ہے۔ رشوت، جوا، سود، ڈاکہ، چوری، کسی طرح بھی مال حاصل ہو تم اس پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ اگر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ مال کی یہ مجنونانہ خواہش ہی معاشرے میں ہزاروں خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں سے اس کی یہ بے محابا چاہت ختم ہو جائے تو جرائم کا دائرہ بہت محدود ہو جائے گا اور مظالم کی یہ شدت بھی باقی نہ رہے گی۔

حُبِّ مال وجمعِ مال کا تدارک

قرآن کریم نے حُبِّ مال وجمعِ مال یعنی بخل کا علاج "انفاق فی سبیل اللہ" تجویز کیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ ہی وہ کام ہے جس سے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی ہوس اور دوڑ میں کمی آ سکتی ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے ہی فلاحی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے ہی معاشرے میں غربت، افلاس اور طرح طرح کی پریشانیوں اور بیماریوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے بغیر کسی فلاحی اور عوام دوست معاشرے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی بدولت ہی کسی معاشرے میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان کو کم کیا جا سکتا ہے کیونکہ بہت سے جرائم غربت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جیسے چوری، ڈاکہ، جسم فروشی۔ تو جب انفاق فی سبیل اللہ کی وجہ سے غربت ختم ہو جائے گی تو لامحالہ وہ جرائم جنہیں غربت نے جنم دیا ہے وہ بھی خود بخود ختم ہو جائیں گے اور بہت سے جرائم مال کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جیسے رشوت، سود خوری، قتل، بم دھماکے، ملکی مفادات سے غداری، ملکی دفاع، صنعتی اور زراعتی سودوں میں کمیشن جب انفاق فی سبیل اللہ جو حُبِّ مال وجمعِ مال کا واحد اور تیر بہدف علاج ہے کی وجہ سے معاشرے میں حُبِّ مال وجمعِ مال کا مرض ختم ہوتا چلا جائے تو لامحالہ وہ جرائم جنہیں مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوس جنم دیتی ہے وہ ختم ہوتے چلے جائیں گے۔ قرآن کریم جو انسانی فلاح کا سب سے بڑا علمبردار اور انسانی حقوق کا

سب سے بڑا محافظ ہے اس میں انفاق فی سبیل اللہ کی بے پناہ تاکید ہے جس کا تذکرہ ہم آنے والے صفحات میں کریں گے۔ پس ثابت ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے بغیر کسی معاشرے میں امن، چین اور سکون ممکن نہیں کیونکہ اس کے بغیر کچھ لوگ تو آتشِ ہوس میں جل مرتے ہیں اور کچھ لوگ محرومیوں کے آنسوؤں میں بہہ جاتے ہیں۔

اب کچھ تذکرہ ہو جائے ان آیاتِ قرآنیہ کا جن میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح کے اس اہم پہلو کی طرف نہایت شاندار اور عمدہ اسلوب سے توجہ دلائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" [1] (اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہی ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو، بے شک اللہ نیکوکاروں سے محبت فرماتا ہے)۔

گویا آیتِ مبارکہ میں تنبیہ کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اپنے آپ کو اور اپنے معاشرہ کو تباہی سے نہ بچا سکو گے۔ لہٰذا انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ پہلے گزر چکا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ نہ کرنے کی وجہ سے ایک معاشرہ کس طرح بدترین انجام سے دوچار ہو جاتا ہے اور بدامنی کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے "مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○" [2] (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال (اس) دانے کی سی ہے جس سے سات بالیاں اگیں (اور پھر) ہر بالی میں سو دانے ہوں (یعنی سات سو گنا اجر پاتے ہیں) اور اللہ جس کیلئے چاہتا ہے (اس سے بھی) اضافہ فرما دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا خوب جاننے والا ہے)۔

ایک اور مقام پر انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کے بے پناہ اجر اور خلوص کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ مثال بیان فرمائی۔ "وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" [3] (اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی رضا حاصل کرنے اور اپنے آپ کو (ایمان و اطاعت پر) مضبوط کرنے کیلئے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک ایسے باغ کی سی ہے جو اونچی سطح پر ہو اس پر زوردار بارش ہو تو وہ دوگنا پھل لائے اور اگر اسے زوردار بارش نہ ملے تو (اسے) شبنم (یا ہلکی سی پھوار) بھی کافی ہو، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے)۔

یہ الفاظ انتہائی قابل غور ہیں۔ مال خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کے مخلص اور پاکباز بندوں کی ایک غرض تو یہ ہوتی ہے کہ ان کا رب کریم ان پر راضی ہو جائے اور اس کے علاوہ دوسری غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ دلوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان قربان کرنے کی استعداد پختہ اور ملکہ راسخ ہو جائے۔ مال بڑی پیاری

---

[1] البقرہ، ۲:۱۹۵۔ [2] البقرہ، ۲:۲۶۱۔ [3] البقرہ، ۲:۲۶۵۔

چیز ہے اس کا خرچ کرنا ابتدا میں بے شک گراں گزرتا ہے لیکن جب انسان خرچ کرنا شروع کر دیتا ہے تو دل آہستہ آہستہ اس کا خوگر اور اس کی لذتوں سے آشنا ہو جاتا ہے اور راہِ خدا میں سب کچھ لٹانے کی استعداد پختہ ہو جاتی ہے۔ پھر مال تو مال رہا وہ اپنی جانِ عزیز تک نثار کرنے کو سب سے بڑی سعادت یقین کرنے لگتا ہے اور اپنی جان، مال اور اولاد سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹانے کیلئے بے چین ہو جاتا ہے۔

باطنی امراض کے ختم ہونے سے انسان کی روحانی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی اس پر آتا ہے کہ اسے مال جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے سے پریشانی اور بے چینی ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس مال خرچ کرنے سے اسے خوشی اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں خوشی اور اطمینان محسوس ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایسا شخص بلند روحانی مراتب طے کر رہا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے انفاق فی سبیل اللہ انسان کی فطرت میں رچ بس جاتا ہے اور حبِ مال اور بخل کی بیماری سے مستقلاً اس کی جان چھوٹ جاتی ہے۔

انسان میں بے صبری و جلد بازی

انسان کی منفی عادات میں سے ایک بے صبری و جلد بازی ہے۔ قرآنِ کریم میں اس بارے میں ارشاد ہے ''خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ'' [1] (انسان (فطرتاً) جلد باز پیدا کیا گیا ہے)۔ ابن منظورؒ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے مقررہ وقت سے پہلے طلب کرنے کو عجلت کہتے ہیں۔ ''اَلْعَجَلَةُ طَلَبُ الشَّیْءِ وَ تَحَرِّيْهِ قَبْلَ اَوَانِهٖ'' [2]

انسان کی عجلت پسندی اظہر من الشمس ہے اور اس کے پے در پے ٹھوکریں کھاتے چلے جانے کا یہ بھی ایک بڑا سبب ہے۔ ''قَالَ اَعْرَابِیٌّ اِيَّاكُمْ وَالْعُجْلَةَ فَاِنَّ الْعَرَبَ تُكَنِّيْهَا اُمَّ النَّدَامَاتِ'' (ایک اعرابی کا قول ہے خبردار جلد بازی سے بچنا اہلِ عرب اس کو ام الندامات (ساری ندامتوں کی اصل) کہا کرتے ہیں)۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں کہ اہلِ عرب کا یہ محاورہ ہے کہ جو وصف کسی میں بکثرت پایا جائے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو اس سے پیدا ہوا ہے اور جو زیادہ غصہ ور ہو اسے کہتے ہیں ''خُلِقَ مِنْ غَضَبٍ'' اور جو زیادہ کریم ہو اسے کہتے ہیں ''خُلِقَ مِنْ كَرَمٍ''۔ کیونکہ جلد بازی بھی لوگوں کا شیوہ ہے اس لیے ''خُلِقَ مِنْ عَجَلٍ'' کہا گیا۔ [3]

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاO اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاO وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا'' [4] (بے شک انسان بے صبر اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اسے مصیبت (یا مالی نقصان)

---

[1] الانبیاء،۲۱:۳۷۔
[2] لسان العرب، محمد بن مکرم ابن منظور، متوفی ۷۱۱ھ، جلد ۱۱، صفحہ ۴۲۵، دار صادر، بیروت۔
[3] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۶۵۔
[4] المعارج، ۷۰:۱۸، ۲۱۔

پہنچے تو گھبرا جاتا ہے اور جب اسے بھلائی (یا مالی فراخی) حاصل ہو تو بخل کرتا ہے)۔

صاحبِ تفسیر ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ان آیات میں بڑی وضاحت سے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اسلام نے عبادات کا جو نظام اپنے ماننے والوں کیلئے تجویز کیا ہے وہ محض پوجا پاٹ اور بے مقصد رسومات نہیں جن سے انسان کی اصلاح اور تربیت کا دور کا واسطہ بھی نہ ہو بلکہ یہ وہ انقلاب آفرین پروگرام ہے جو انسان کی صرف تربیت ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی سرشت میں جو عیوب اور کمزوریاں ہیں ان کا بھی قلع قمع کرتا ہے۔ اور اس کو ایسی خوبیوں اور کمالات سے مزین کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے، اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے ملک کیلئے باعث صد عزو افتخار بن جاتا ہے۔ اس کے دم سے حق کا بول بالا ہوتا ہے اس کی دل نوازیوں سے دکھی انسانیت کے مصائب و آلام میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ پیکرِ یمن و برکت جدھر سے گزر جاتا ہے مسرتوں کے پھول کھل جاتے ہیں، خوشحالی کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں، بے کسوں اور بے بسوں کو نئی زندگی، نئی امنگ مل جاتی ہے۔[1]

مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی سرشت میں تین عیب ہیں ایک تو وہ حریص اور کم ظرف ہے، ایسی چیزوں کو بھی ہڑپ کرنے کیلئے بے تاب رہتا ہے جو اس کی اپنی نہیں ہوتیں۔ اس کی کوشش ہر قیمت پر دولت سمیٹنے کیلئے وقف رہتی ہے۔ خواہ دولت رشوت سے ملے، لوٹ کھسوٹ سے ملے، چوری، رہزنی سے ملے قوم کی غذائی اجناس کو سمگل کر کے ملے یا قوم و وطن سے غداری کر کے ملے، وہ باز نہیں آتا۔ ایسے لالچی کو عربی میں ''هَلُوْعٌ'' کہا جاتا ہے۔ دوسرا نقص اس میں یہ ہے کہ وہ جزوع ہے۔ بہت گھبرا جانے والا جب مصائب کی گھٹا اس کی زندگی کے افق پر نمودار ہوتی ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اوسان خطا ہو جاتے ہیں، امید کی کوئی کرن اس کو نظر نہیں آتی۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ وہ سخت کنجوس، سخت بخیل ہے کسی ملی یا قومی مقصد کیلئے کسی نادار اور فقیر کی امداد کیلئے ایک دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا۔ اب خود سوچیے کہ جس شخص میں حرص اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو کہ وہ حلال و حرام کی تمیز سے بھی قاصر ہو، مصیبت کے وقت اپنے اوسان خطا کر بیٹھے اور مایوس ہو کر اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر ڈال دے یا جب وہ دولت مند اور مالدار ہو تو کنجوس مکھی چوس بن جائے تو کیا ایسے شخص کا وجود اپنے ملک و ملت کیلئے باعثِ ننگ و عار نہیں ہوتا۔ اس سے اس کی بستی والے بھی نفرت کرتے ہیں اس کے گھر والے بھی اس سے بے زار ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کیلئے بھی وبال بن جاتا ہے۔

ایسی فطری کمزوریوں کا پیکر جب اسلام کی تعلیمات کو اپنا لیتا ہے، اس کے ارشادات پر عمل پیرا ہوتا

[1] ضیاء القرآن، جلد ۵، صفحہ ۳۶۳، ۳۶۴۔

ہے، اپنی زندگی کے شب و روز قرآن کریم کے پیش کیے ہوئے اس قالب میں ڈھال لیتا ہے تو اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ حریص نہیں رہتا، غنی ہو جاتا ہے۔ اس کا دل غنی اور آنکھیں سیر ہو جاتی ہیں۔ مصائب کے تند و تیز طوفان جب اس سے آ کر ٹکراتے ہیں تو اسے فولاد کی چٹان کی طرح مضبوط پاتے ہیں۔ ان حالات میں اس کی امید کا چراغ اور زیادہ ضیا بار ہوتا ہے۔ سیل حوادث سے وہ گھبراتا نہیں بلکہ اس وقت اس کی خفیہ توانائیاں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں، وہ ان سے فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ شیر کی طرح ان پر جھپٹتا ہے اور جب اس پر خوشحالی کا دور آتا ہے تو وہ محتاجوں اور مسکینوں کو ڈھونڈ کر ان کی امداد کرتا ہے وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ جب تک وہ کسی کی تکلیف کو دور نہ کرے اسے چین نہیں آتا۔

یہ وہ تبدیلی ہے جو اسلام کے پیش کیے ہوئے نظامِ عبادات پر عمل کرنے سے انسان میں رونما ہوتی ہے۔ ہماری شومئی قسمت ملاحظہ ہو کہ آج کا مسلمان اس بابرکت پروگرام کو اپنے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ، ایک ناروا پابندی اور ایک غیر دلچسپ مصروفیت گردانتا ہے اسی وجہ سے وہ فطری کمزوریاں عود کر آئی ہیں اور بڑی قوت سے انہوں نے ہمارے قلب ونظر پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔

بے صبری و جلد بازی کا تدارک

قرآن کریم نے عجلت پسندی و جلد بازی کا علاج ''صبر'' تجویز کیا ہے۔ ''صبر'' قرآن کریم کی ایک جامع و مانع اصطلاح ہے۔ جو انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر مشکل موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔ بسترِ علالت ہو یا میدانِ جنگ ''صبر'' انسان کیلئے ایک روشن راستہ ہے لیکن صبر کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

صبر کا مروّج مفہوم

صبر کا مروّج مفہوم جو عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے وہ قرآن وسنت سے متصادم اور مسلم سوسائٹی کو اضمحلال زدہ کرنے کی ایک سازش ہے۔ یاد رکھیئے ظلم کو برداشت کرتے رہنا، ظالموں کے خلاف کچھ مزاحمت نہ کرنا، حالات کی سختیوں اور ناموافقت کے سامنے ہتھیار ڈال کر بیٹھ جانا، مایوس ہو کر جدوجہد ترک کر دینا اور کوئی کوشش کیے بغیر ہی نتائج کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈال کر بیٹھ جانا یہ صبر نہیں ہے بلکہ یہ تساہل پسندی، کم ہمتی اور بزدلی ہے۔ پروین شاکر نے کیا خوب کہا ہے۔

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا
خامشی بھی تو ٹھہری پشت پناہی کی طرح

صبر کا درست مفہوم

صبر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط'' [1] (اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو)۔

صبر کے معنیٰ ہیں باندھنا، یعنی نفس کو صبر سے باندھ کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑے رہنا۔ یہودیوں میں لذتِ دنیا کی طرف رغبت زیادہ ہے اور مسیحی راہب اپنے اوپر دنیاوی لذتوں کو حرام کر لیتے ہیں۔ یہودی ایام حیض میں عورتوں کو بالکل دور کر دیتے ہیں اور عیسائی ان کی طرف زیادہ شفقت اور انتہائی ناز برداری کرتے ہیں مگر اسلام کا نظریہ دونوں سے بالکل مختلف ہے۔

بعض مذاہب میں نفس کی سرکشی کے لئے سخت اقدامات کیے جاتے ہیں لیکن اسلام میں نفس سرکش کی سرکوبی کے لیے حلال چیزوں کی حرمت کو روا نہیں رکھا گیا بلکہ اعتدال اور پرہیز کو بلند مقام دیا گیا ہے جیسے جسمانی طبیب بعض اشیاء کو صحت جسمانی کے لیے مضر خیال کر کے مریض کو ان کے استعمال سے روک دیتا ہے۔ اسی طرح روحانی معالج بعض روحانی مناصب کے پیش نظر بعض چیزوں سے وقتی طور پر اجتناب کے لیے حکم دیتے ہیں اگر چہ ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا جاتا۔

قرآنِ کریم نے صبر کا مفہوم بعض آیات کے ذریعے متعین کر دیا ہے لیکن جہالت کے عام ہونے اور قلتِ تدبّر فی القرآن کی وجہ سے لوگ عام طور پر اس مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہنا مناسب ہے کہ لوگ اس درست مفہوم سے یکسر اجنبی ہیں اور ان کا ذہن اسے قبول کرنے کیلیے بھی تیار نہیں۔ ذیل میں ہم صبر کی چند اقسام کا تذکرہ کریں گے جن سے انشاء اللہ تعالیٰ صبر کا صحیح مفہوم قارئین کے اذہان میں نقش ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق

(۱) کفار کے مقابلہ میں صبر کرنا

صبر کی سب سے بڑی اور عالی شان قسم کفار کے مقابلہ میں میدان جنگ میں صبر کرنا ہے۔ اس لحاظ سے جن آیات میں میدانِ جنگ میں کفار کے روبرو صبر کرنے کا تذکرہ ہے۔ ان مقامات پر ہم صبر کا معنیٰ کفار کے مقابلہ میں پوری قوت سے ڈٹ جانا اور بڑی جگری و بہادری سے لڑنا مراد لیں گے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے ''یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ط اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ'' [2] (اے نبی (مکرّم!) آپ ایمان والوں کو جہاد کی ترغیب دیں (یعنی حق کی خاطر لڑنے پر آمادہ کریں)، اگر تم میں سے (جنگ میں) بیس (۲۰) ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دوسو (۲۰۰) (کفار) پر

---

[1] البقرہ، ۲:۱۵۳۔ [2] الانفال، ۸:۶۵۔

غالب آئیں گے)۔دیکھیے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے ان آیات میں ایمان کے ساتھ صرف صبر کی شرط لگائی گئی ہے۔یعنی اگر انسان کے پاس ایمان کی دولت ہو اور وہ صبر کو پوری شرائط کے ساتھ اختیار کرنے والا ہو، پھر یہ ایمان والے ایک وحدت کی شکل میں ہوں تو کفار کا ان کے مقابلے میں مغلوب ہو جانا یقینی ہے اور اس غلبہ کیلئے کوئی بہت بڑا لشکر درکار نہیں ہے۔ بلکہ دو سو کافروں کو مغلوب کرنے کیلئے صرف بیس صابر مومن ہی کافی ہیں۔

صاحب تفسیر ضیاء القرآن فرماتے ہیں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ وعدہ نام نہاد مسلمانوں سے نہیں جو مصیبت اور آزمائش کے لمحات میں ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ان سچے اہل ایمان سے ہے جو راہِ حق میں پیش آنے والی ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔حالات کی سنگینیوں میں ان کا جوشِ ایمانی بڑھ جاتا ہے اور دشمن کی قوت و تعداد کو دیکھ کر وہ صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور فولادی چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔قرآنِ کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ'' [1] (اور کتنے ہی انبیاء علیہم السلام ایسے ہوئے جنہوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت سے اللہ والے (اولیاء) بھی شریک ہوئے، تو نہ انہوں نے ان مصیبتوں کے باعث جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ جھکے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کے تین اوصاف ذکر فرمائے ہیں۔ پہلا وصف یہ ہے کہ وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کی وجہ سے ہمت ہار کر نہیں بیٹھتے اور دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں کمزور نہیں پڑتے بلکہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور تیسرا اور آخری وصف یہ ہے کہ وہ حالات کی ناموافقت کی وجہ سے ہار مان کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ برابر کوشش میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ انہیں گوہرِ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

(۲) کفار کی اذیتوں پر صبر

صبر کی ایک اور قسم جس کا قرآن کریم میں کثرت سے تذکرہ ہے اور خاص طور پر نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے، وہ کفار کی طعن و تشنیع اور ایذاء پر صبر کرنا ہے۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے ''فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا'' [2] (سو آپ اپنے رب کے حکم کی خاطر صبر (جاری) رکھیں اور ان میں سے کسی کاذب و گنہگار یا کافر و ناشکر گزار کی بات پر کان نہ دھریں)۔اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے پیارے رسول ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ اے محبوب ﷺ! آپ کو اپنے رب کی طرف سے جو احکام ملے ہیں ان کی پابندی کرتے رہیں۔کسی مخالفت کی ہرگز پرواہ نہ کریں۔یہ بدکردار، ناہنجار اور احسان فراموش آپ ﷺ کو اگر

---

[1] آل عمران، ۳:۱۴۶۔

[2] الانسان، ۷۶:۲۴۔

فرمانِ خداوندی سے منحرف کرنا چاہیں تو آپ ﷺ ان کا کہنا ہرگز نہ مانیں۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ رسولوں نے اپنی اپنی امتوں سے کہا"وَمَا لَنَآ اَنْ لَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا اٰذَيْتُمُوْنَا" [1] (اور ہم کیوں نہ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر حالانکہ اس نے دکھائی ہیں ہمیں ہماری (کامیابی کی) راہیں اور ہم ضرور صبر کریں گے تمہاری اذیت رسانیوں پر)۔یعنی تم ہمیں جی بھر کر اذیت پہنچالو۔مقدور بھر ہم پر ظلم وستم کرلو۔ہم بڑی استقامت سے ان تمام مصائب کو برداشت کریں گے اور صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پائے گا کیونکہ ہم اپنے رب پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اور جن کا بھروسہ قادر وتوانا پروردگار پر ہوتا ہے انہیں گھبراہٹ اور بے صبری سے کیا واسطہ؟

ایک اور مقام پر ارشاد ہے"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" [2] (اے حبیب ﷺ) پس آپ صبر کیے جائیں جس طرح (دوسرے) عالی ہمت پیغمبروں نے صبر کیا تھا)۔اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں"کہ اے محبوب ﷺ! کفار کی شرانگیزیوں،فتنہ پردازیوں اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں سے دل برداشتہ نہ ہونا بلکہ صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا۔آپ ﷺ سے پہلے بھی جو انبیاء ورسل علیہم السلام ہم نے مبعوث فرمائے تھے ان کے ساتھ بھی ان کی قوموں کا سلوک بڑا ظالمانہ اور سنگدلانہ تھا،انہوں نے ہمیشہ عزیمت وحوصلہ سے کام لیا،ان کی مخالفتوں کی پروانہ کی اور اپنا فریضۂ دعوت انجام دیتے رہے۔آپ ﷺ بھی انہی کی سنت پر عمل کرتے رہیں۔بڑی اولوالعزمی اور پامردی سے اسلام کی دعوت دیتے رہیں۔فریضۂ تبلیغ پوری قوت سے انجام دیتے رہیں۔اگر یہ کفر وعصیان سے باز نہیں آتے تو خود ہی پچھتائیں گے۔"

(۳) مصیبت اور سختی میں صبر

صبر کی ایک اور اہم قسم جس کا قرآنِ کریم میں تذکرہ ہے وہ بیماری،تنگدستی اور سخت حالات میں صبر کرنا ہے۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے"وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" [3] (اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدت (جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں،یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں)۔

یعنی بیماری میں انسان ہمت اور حوصلے سے کام لے اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہ کرے بلکہ محض اس کی رضا کو ہر چیز سے مقدم جانے اور اس حالت میں بھی حتی المقدور شریعت پر عمل پیرا رہے اور اگر انسان مالی طور پر تنگ دست ہو جائے تب بھی ناشکری اور ہائے ہائے کرنے سے باز رہے بلکہ جتنا بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو رزق دیا ہے اس پر قانع رہے۔کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہو قناعت گر زندگی کا اصول تنگدستی فراخ دستی ہے

---

[1] ابراہیم،۱۴:۱۲۔ [2] الاحقاف،۴۶:۳۵۔ [3] البقرہ،۲:۱۷۷۔

باب نمبر۵

نفس پر ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

لفظ نفس کا معنوی دائرہ بہت وسیع ہے۔جس کا کچھ اندازہ آپ کو کتاب ھذا کے باب ''نفس کے لغوی و اصلاحی معانی'' کے مطالعہ سے ہو چکا ہے۔ ذیل میں انہی مختلف معانی کے تناظر میں چند احادیث مبارکہ پیش کی جارہی ہیں۔

معرفتِ نفس کی اہمیت

معرفتِ نفس پر مشہور روایت ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ''[1] جسے علماء کی تحقیق کے مطابق حدیث کا درجہ حاصل ہے کا ذکر آئے گا،مگر یہاں معرفتِ نفس کی اہمیت کے حوالے سے اولاً اس روایت کو درج کیا جارہا ہے۔

حضرت حاتم اصمؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت شقیق بلخیؒ نے فرمایا اگر کوئی شخص دوسو سال قیام کرے تب بھی جہنم سے نہیں بچ سکتا جب تک ان چار چیزوں کی پہچان پیدا نہ کرلے۔(۱) معرفتِ الٰہی (۲) معرفت نفس (۳) اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی معرفت (۴) اللہ تعالیٰ اور اپنے نفس کے دشمن کی معرفت۔

اصلاح نفس میں اوّلیت

آیتِ قرآنی ''اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ''[2] (کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم (اللہ کی)

---

[1] کشف الخفاء، اسماعیل بن محمد الجراحی، متوفی ۱۱۶۲ھ، حدیث ۲۵۳۲، جلد۲، صفحہ ۳۴۳، موسسۃ الرسالہ، بیروت۔

[2] البقرہ، ۲:۴۴۔

کتاب (بھی) پڑھتے ہو، تو کیا تم نہیں سوچتے؟) کے تحت درج ذیل حدیث نقل کی گئی ہے "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ لِعِیْسٰی ابْنِ مَرْیَمَ عِظْ نَفْسَکَ فَاِنْ اتَّعَظْتَ فَعِظِ النَّاسَ وَاِلَّا فَاسْتَحْیِ مِنِّیْ وَمِثَالُ مَنْ عَجَزَ عَنْ اِصْلَاحِ نَفْسِہٖ وَطَمَعَ فِیْ اِصْلَاحِ غَیْرِہٖ مِثَالُ الْاَعْمٰی اِذَا اَرَادَ یَھْدِی الْعُمْیَانَ" [1] (حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اپنے نفس کو نصیحت کرو! اگر وہ نصیحت پالے تو پھر لوگوں کو نصیحت کرو۔ خبردار! میری ذات کا حیا کرو۔ جو شخص اپنی اصلاح سے عاجز ہو اور لوگوں کی اصلاح کی طمع کرے اُس کی مثال اس اندھے شخص جیسی ہے جو اندھوں کی راہنمائی کا ارادہ کرے۔

سخاء نفس کے حاملین کے لئے جنت

نفس کے متعلقات میں سے ایک اہم چیز سخائے نفس ہے۔ یعنی نفس کا بخل سے پاک ہونا۔ ایسے ہی خوش نصیبوں کے لیے قرآن وحدیث میں جنت کی بشارت ہے حدیث نبوی ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا۔ اس کی ایک اینٹ سفید موتی، ایک سرخ یاقوت اور ایک سبز زبرجد کی لگائی۔ اس کی مٹی مشک کی ہے۔ اس کی کنکریاں موتی ہیں۔ اس کا گھاس زعفران ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا بولو! تو جنت یوں گویا ہوئی "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" [2] (بے شک مومن کامیاب ہوگئے)۔ تو اللہ رب العزت نے فرمایا مجھے میری عزت وجلال کی قسم تیرے اندر میرے قرب میں کوئی بخیل نہیں رہے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی "وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○" [3] (اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا پس وہی لوگ ہی بامراد و کامیاب ہیں)۔ [4]

شحِ نفس سے بچنے کا طریقہ

حضور نبی اکرم ﷺ نے شحِ نفس سے بچنے کا طریقہ بھی عطا فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی ہے "عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَقُوْلُ ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ فَقَدْ بَرِءَ مِنَ الشُّحِّ مَنْ اَدّٰی زَکَاةَ مَالِہٖ وَقَرَی الضَّیْفَ وَاَعْطٰی فِی النَّوَائِبِ" [5] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص میں تین چیزیں ہوں وہ شحِ نفس سے بری ہے۔ (۱) اپنے مال کی زکوۃ ادا کرے۔ (۲) مہمان نوازی کرے۔ (۳) نیک کاموں میں خرچ کرے۔

---

[1] کنز العمال، حدیث ۴۳۰۸۷، جلد ۳، صفحہ ۱۸۳۔　[2] المؤمنون، ۲۳:۱۔　[3] الحشر، ۵۹:۹۔

[4] المعجم الاوسط، ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، متوفی ۳۶۰، حدیث ۵۵۱۸، جلد ۵، صفحہ ۳۴۹، مکتبۃ العلوم۔

[5] کنز العمال، حدیث نمبر ۴۳۰۸۷، جلد ۳، صفحہ ۱۸۳۔

شحِ نفس کے دیگر مفاہیم

شحِ نفس کا عمومی مفہوم تو نفس کا بخل لیا جاتا ہے۔لیکن احادیث مبارکہ کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مزید مفاہیم بھی سامنے آتے ہیں۔حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے "وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ" کی تفسیر میں مروی ہے کہ شحِ نفس یہ نہیں کہ آدمی اپنا مال کسی کو نہ دے یہ تو بخل ہے اور یہ بھی بُری چیز ہے۔ مگر شح یہ ہے کہ انسان کی آنکھ اُس (مال، چیز) کی طرف اُٹھے جو اُس کی نہیں۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غیر عورت پر نظر ڈالنا بھی شحِ نفس ہے۔[1]

خواہش نفس جب حق کی راہنما ہو جائے

کوئی انسان مومن کامل تو اُس وقت بنتا ہے جب اُس کی ہوائے نفس آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے تابع ہو جائے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے "وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبِعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ" [2] (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی خواہش نفس اُس دین کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔امام نووی ؒ نے اربعین میں کہا ہے کہ یہ حدیث مبارکہ صحیح ہے۔

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی یہ خبر بھی دے دی گئی کہ ایک وقت آنے والا ہے جب لوگ حق کو راہنما بنانے کی بجائے خواہشِ نفس کی پیروی کریں گے بلکہ خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیں گے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے "اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ط اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا" [3] (کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے تو کیا آپ اس پر نگہبان بنیں گے)۔

بقول اقبالؒ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں" وہ روایت یہ ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اَنْتُمْ فِيْ زَمَانٍ يَقُوْدُ الْحَقُّ الْهَوٰى وَسَيَاْتِيْ زَمَانٌ يَقُوْدُ الْهَوٰى الْحَقَّ فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ الزَّمَانِ" [4] (تم اُس زمانے میں ہو جہاں (دین) حق خواہش نفس کی راہنمائی کرتا ہے اور عنقریب ایک زمانہ آئے گا جب خواہشاتِ نفس، حق کی راہنما بن جائیں گی۔پس ہم اُس زمانے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)۔

دنیا کا بدترین ساتھی

تخلیق انسان میں نفس کو جزو لاینفک بنایا گیا ہے، مگر یہ ایک ایسا ساتھی ہے جس کی عزت و تکریم کی

---

[1] الدر المنثور، امام جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جلد ۸، صفحہ ۱۰۸، بیروت۔ [2] مشکوٰۃ المصابیح، حدیث ۱۶۷، جلد ۱، صفحہ ۵۹۔
[3] الفرقان، ۲۵: ۴۳۔ [4] تفسیر قرطبی، ابوعبداللہ قرطبی، جلد ۱۹، صفحہ ۲۰۸، دارالشعب القاہرہ۔

جائے تو بگڑ جاتا ہے اور اگر اس کے برخلاف اس کی تادیب کی جائے بھوکا پیاسا رکھا جائے تو سنور جاتا ہے۔
ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا "مَا تَقُولُونَ فِيْ صَاحِبٍ لَكُمْ اِنْ اَنْتُمْ اَكْرَمْتُمُوْهُ وَ اَطْعَمْتُمُوْهُ وَ كَسَوْتُمُوْهُ اَفْضٰى بِكُمْ اِلٰى شَرِّ غَايَةٍ وَ اِنْ اَهَنْتُمُوْهُ وَ اَعْرَيْتُمُوْهُ وَ اَجَعْتُمُوْهُ اَفْضٰى بِكُمْ اِلٰى خَيْرِ غَايَةٍ، قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذَا شَرُّ صَاحِبٍ فِي الْاَرْضِ، قَالَ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهَا لَنُفُوْسُكُمُ الَّتِيْ بَيْنَ جُنُوْبِكُمْ" [1] (تم اپنے ایسے ساتھی کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ اگر تم اس کی تکریم کرو اور اس کو کھلاؤ پلاؤ اور اس کو پہناؤ تو پہنچا دے تمہیں برائی کی انتہا کو اور اگر اس کی اہانت کرو، ننگا اور بھوکا رکھو تو پہنچا دے تمہیں بھلائی کی انتہا کو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ وہ روئے زمین پر بدترین ساتھی ہے، فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ تمہارے نفوس ہیں جو تمہارے پہلوؤں کے درمیان موجود ہیں)۔ سیّدِ عالم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے "اَلنَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَ تَشْتَهِيْ وَ الْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ اَوْيُكَذِّبُهٗ" [2] (نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تائیداً انکار کرتی ہے)۔

"اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى" نفس کس قدر موذی ساتھی ہے۔ حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا تھا کہ "جو شخص ہر وقت اپنے نفس کو مُتَّہم (مجرم) نہ ٹھہرائے اور تمام احوال میں اس کی مخالفت نہ کرے اور اس کی ناپسند باتوں کی طرف (یعنی اعمالِ حسنہ) اسے مجبور نہ کرے تو وہ دھوکہ میں ہے اور جو نفس کو اچھی نگاہ سے دیکھے تو وہ تباہ ہو گیا کیونکہ نفس ہلاکتوں کی طرف بلاتا ہے۔ انسان کے دشمنوں کا مددگار رہتا ہے، ہر قبیح فعل کی طرف لپکتا ہے، ہر برائی کی پیروی کرتا ہے غرضیکہ یہ طبعی طور پر ہمیشہ میدانِ مخالفت میں کوشاں رہتا ہے۔ پس انسان کیلیے یہ بات بہت بڑی نعمت ہے کہ وہ نفس کے دام میں نہ آئے"۔

اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِيَّ" [3] (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو جانے (یعنی اس کا محاسبہ کرے) اور مرنے کے بعد والے زمانے کیلیے عمل کرے اور وہ شخص عاجز ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی اتباع کرے اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سے آرزو رکھے)۔

حدیث "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ" کی تحقیق

نفس کے متعلق کتبِ تصوف میں یہ الفاظ بطورِ حدیث آئے ہیں "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" [4] (جس شخص نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔ اکثر کتبِ تصوف اور کتبِ مواعظ اور تفاسیر میں ان الفاظ کو حدیثِ رسول ﷺ سمجھا گیا ہے، لیکن محققین نے اس کو بزرگانِ دین کا قول ہونا لکھا ہے

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹، صفحہ ۲۱۰۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۶۲۳۸، جلد ۶، صفحہ ۲۴۳۸۔
[3] سنن ترمذی، حدیث ۲۴۵۹، جلد ۴، صفحہ ۲۳۸۔
[4] تفسیر الکبیر، جلد ۱، صفحہ ۸۲۔

اور بعض ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن سے اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ یہ الفاظ حدیث کے ہوں، جیسا کہ ہم نے تفسیر کبیر کے حوالے سے نقل کیا۔ ابن الفرس نے کہا ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی ؒ اور دیگر صوفیاء کی کتب میں اس کو بطور حدیث ہی لکھا گیا ہے اور اکثر اولیائے کرامؒ نے اس کو حدیث ہونا ہی خیال کیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس حدیث کے ترجمے کے بعد لکھا ہے کہ جو اپنے کو نہ جانے تو وہ کل کی خبر سے محجوب ہے۔ آپؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا یقیناً اس نے اپنے رب کو بھی جان لیا آپؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کی فنا کو سمجھ لیا ہے اس نے یقیناً ذاتِ باقی کی بقا کو جان لیا ہے۔ بعض نے کہا جس نے اپنے نفس کو ذلت کے ساتھ جان لیا اس نے اپنے رب کی عزت کو مان لیا۔ اس کے بعد آپؒ نے اس بات کی تشریح کی ہے کہ انسان کے نام سے کیا مراد ہے۔ یہ تشریح کافی طویل ہے، شائقین حضرات ''کشف المحجوب'' میں حقیقتِ نفس اور ھویٰ کے باب میں ملاحظہ فرمائیں[1] آپؒ نے یہ فرمایا کہ جس نے خود کو بندہ سمجھ لیا اس نے خدا کو خدا ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ ''کشف المحجوب'' جیسی کتاب کے علاوہ کوئی جو بھی کہے ہمارے نزدیک وہ معتبر نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تو اس حدیث کی بنا پر پورا فلسفۂ خودی لکھا ہے اور اس میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ ''اپنی خودی پہچان''۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے اِن الفاظ پر بہت تفصیلی گفتگو فرمائی ہے اور چونکہ لفظِ نفس کا اطلاق روح پر بھی ہوتا ہے (جیسا کہ ہم لفظِ نفس کی لغوی بحث میں اس امر پر روشنی ڈال چکے ہیں) اسی لیے امام سیوطیؒ کی بحث کا رُخ روح کی طرف بھی ہو گیا۔ علامہ عزالدینؒ کہتے ہیں اس حدیث کا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس لطیف روح کو اس کثیف جسم میں رکھا اور اس جسم کی کثافت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربانیت پر حسب ذیل وجوہ سے دلالت کرتی ہے۔

(۱) اس جسم کو یہ روح حرکت دیتی ہے اور اس کی تدبیر کرتی ہے تو جب یہ جسم ایک مدبر اور محرک کا محتاج ہے تو یہ عالم بھی ایک مدبر اور محرک کا محتاج ہوگا۔

(۲) جب اس جسم کا محرک اور مدبر واحد ہے تو اس عالم کا مدبر اور محرک بھی واحد ہوگا۔

(۳) جب یہ جسم روح کے ارادہ کے بغیر حرکت نہیں کرتا تو معلوم ہوا کہ اس عالم کی کوئی چیز بھی خواہ خیر ہو یا شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی قضا و قدر کے بغیر حرکت نہیں کرتی۔

(۴) جسم کی ہر حرکت کا روح کو علم ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر حرکت اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔

(۵) روح سے زیادہ کوئی چیز جسم کے قریب نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز سے سب سے

---

[1] کشف المحجوب، صفحہ ۳۳۹۔

زیادہ قریب ہے۔

(۶) روح جسم کے پیدا ہونے سے پہلے موجود تھی اور اس کی فنا کے بعد بھی موجود رہے گی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات سے پہلے بھی تھا اور بعد میں بھی رہے گا۔

(۷) ہمیں روح کی حقیقت معلوم نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقت بھی معلوم نہیں ہے۔

(۸) ہمیں جسم میں روح کا مکان، اس کی جہت اور کیفیت معلوم نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مکان، اس کی جہت اور کیفیت بھی معلوم نہیں ہے (بلکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مکان ہے نہ جہت)۔

(۹) روح کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا نہ اس کی تصویر بنائی جا سکتی ہے نہ مثال، اسی طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کو بھی نہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے نہ اس کی صورت اور مثال بنائی جا سکتی ہے۔

(۱۰) روح کو مس نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی جسم اور جسمانیت سے پاک ہے، اسے بھی مس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسی قول کی تشریح ہے کہ جس نے اپنے نفس کو جان لیا اس نے اپنے رب کو جان لیا۔ سو اس کو مبارک ہو جس نے اپنے رب کو جان لیا اور اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔

اس قول کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم اپنے نفس کو جان لو سو تمہارے رب کی صفات اس کی ضد ہیں لہٰذا جس نے اپنی فنا کو جان لیا اس نے اپنے رب کی بقا کو جان لیا اور جس نے اپنی بقا کو جان لیا اس نے اپنے رب کی وفا کو جان لیا اور جس نے اپنی خطا کو جان لیا اس نے اپنے رب کی عطا کو جان لیا۔

علامہ قونویؒ نے شرح ''التعرف'' میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں ایک ناممکن کو دوسرے ناممکن سے سمجھایا گیا ہے کیونکہ جو انسان اپنے نفس اور روح کی معرفت آج تک حاصل نہیں کر سکا تو وہ اپنے رب کی معرفت کیسے حاصل کر سکے گا۔ انسان آج تک قطعی طور پر یہ نہیں جان سکا کہ اس کے کلام کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے حواس میں سُننے، دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی حقیقت کیا ہے کیونکہ ان کی تعریفات میں بہت اختلاف ہے مثلاً دیکھتے وقت کسی چیز کی صورت ہماری آنکھوں میں مرتسم ہو جاتی ہے یا ہماری آنکھوں سے شعاعیں نکل کر اس چیز پر پڑتی ہیں۔ کلام اور حواس بالکل ظاہر ہیں جب ہم اس کی حقیقت کو نہیں جان سکے تو روح جو مخفی ہے اس کی حقیقت کو جاننے میں تو ہم اور بھی عاجز ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو جاننے میں تو ہمارا عجز اور بھی زیادہ واضح ہے، سو جو اپنے نفس کی حقیقت کو نہیں جان سکتا وہ اپنے رب کی حقیقت کو کیسے جان سکتا ہے۔ اس لیے فرمایا: اگر انسان اپنے نفس کی حقیقت کو جان لیتا تو اپنے رب کی حقیقت کو جان لیتا سو اس حدیث میں ایک محال کو دوسرے محال پر معلق کیا گیا ہے۔[۱]

---

[۱] الحاوی، جلد۲، صفحہ ۲۳۹ تا ۲۴۱۔

نفس کے بارے میں چند احادیث

۱) نفس کی دنیا سے بے رغبتی حقیقتِ ایمان کی دلیل ہے

''حضرت حارث بن مالک انصاری ﷺ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: اے حارث! تو نے کیسے صبح کی؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے سچے مومن کی طرح (یعنی حقیقت ایمان کے ساتھ) صبح کی، حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یقیناً ہر ایک شے کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے، سو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا: (یا رسول اللہ ﷺ!) میرا نفس دنیا سے بے رغبت ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے اپنی راتوں میں بیدار اور دن میں (دیدارِ الٰہی کی طلب میں) پیاسا رہتا ہوں اور حالت یہ ہے گویا میں اپنے رب کے عرش کو سامنے ظاہر دیکھ رہا ہوں اور اہل جنت کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور دوزخیوں کو تکلیف سے چلاتے دیکھ رہا ہوں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے حارث! تو نے (حقیقتِ ایمان کو) پہچان لیا، اب (اس سے) چمٹ جا۔ یہ کلمہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا۔''[1]

۲) سخاوتِ نفس ابدال کی علامت ہے

''حضرت علی ﷺ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے ابدال کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ساٹھ آدمی ہیں۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے ان کی صفات بیان فرمائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ نہ تو تکلف سے کام لینے والے ہوں گے اور نہ ہی بدعتی اور چرب زبان ہوں گے اور انہوں نے جو مقام بھی حاصل کیا ہے وہ کثرتِ نماز و روزہ اور صدقہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ مقام سخاوتِ نفس اور دلوں کی سلامتی اور اپنے ائمہ کرام کے لئے خیر خواہی سے حاصل کیا ہے اور اے علی! بے شک وہ میری اُمت میں سرخ سلفر (گندھک) سے بھی کم ہیں۔''[2]

۳) نفس کو حقیر نہ جانو

لَا يَحْقِرُ اَحَدُكُمْ نَفْسَهٗ. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، كَيْفَ يَحْقِرُ اَحَدُنَا نَفْسَهٗ؟ قَالَ: يَرَى اَمْرًا لِلّٰهِ عَلَيْهِ فِيْهِ مَقَالٌ ثُمَّ لَا يَقُوْلُ فِيْهِ. فَيَقُوْلُ اللهُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَقُوْلَ فِيْ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُوْلُ: خَشْيَةُ النَّاسِ فَيَقُوْلُ فَاِيَّايَ كُنْتَ اَحَقَّ اَنْ تَخْشٰى''

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۰۴۲۵، جلد ۶، صفحہ ۱۷۰۔ [2] بغیۃ الطالب، جلد ۳، ص ۱۱۵۴، دار الفکر، بیروت۔

(حضرت ابوسعید خدری ﷜ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے نفس کو حقیر نہ جانے۔ صحابہ کرام ﷢ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی کیسے اپنے نفس کو حقیر جان سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح کہ تم میں سے کوئی شخص کوئی معاملہ دیکھے اور اسے اس بات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم بھی معلوم ہو پھر بھی بیان نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن فرمائے گا: تجھے فلاں معاملہ میں (حق بات) کہنے سے کس نے منع کیا تھا؟ وہ جواب دے گا: لوگوں کے خوف نے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہیں (ان سب سے بڑھ کر) مجھ سے ڈرنا چاہیے تھا)۔[1]

۴) نفسانی خواہشات کو چھوڑ کر اللہ سے لو لگاؤ

صحیح مسلم میں نبی کریم نے ایک حدیث قدسی بیان کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ اپنی خواہشاتِ نفس کو چھوڑ کر میرے ساتھ لو لگاؤ حضرت ابوذر غفاری ﷜ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خدائے بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے۔

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اسے تمہارے اوپر بھی حرام کر دیا ہے، پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب بے راہ ہو مگر جس کو میں سیدھی راہ پر چلاؤں، پس مجھ ہی سے ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھانا کھلاؤں، پس تم مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب عریاں ہو مگر جس کو میں پہناؤں، تم مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں سب کے گناہ بخشنے والا ہوں، تم سب مجھ سے بخشش مانگو، میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے کہ مجھے ضرر پہنچاؤ، نہ تم مجھے نفع پہنچا سکتے ہو کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ متقی دِل والے آدمی کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بڑھ نہیں جائے گا۔ اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ بدکار، دِل والے آدمی کی طرح بن جائیں تو اس سے میرے ملک میں کوئی نقصان واقع نہیں ہو گا۔ اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے (اپنی مرادیں) مانگیں اور میں ہر ایک کی مراد پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانوں میں اس سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا جتنا کہ سوئی کو دریا میں داخل کر کے نکال لینے سے (دریا کا پانی کم ہوتا ہے)۔ اے میرے بندو! یہ

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث ۴۰۰۸، جلد ۲، صفحہ ۱۳۲۸۔

تمہارے اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے لئے ہی گن گن کر رکھتا ہوں اور پھر تمہیں وہ پورے پورے دوں گا۔ پس جو بھلائی پائے وہ خدا کی حمد کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔ [1]

۵) اپنے نفس پر قابو پانا ہی جوانمردی ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَیۡسَ الشَّدِیۡدُ بِالصُّرۡعَةِ إِنَّمَا الشَّدِیۡدُ الَّذِیۡ یَمۡلِکُ نَفۡسَهٗ عِنۡدَ الۡغَضَبِ"

''پہلوان وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہی ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکے''[2]

۶) انسان کے نفس کو سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ

" لَوۡ أَنَّ لِابۡنِ آدَمَ مِلۡءُ وَادٍ مَالًا ، لَأَحَبَّ أَنۡ یَّکُوۡنَ إِلَیۡهِ مِثۡلُهٗ ، وَلَا یَمۡلَأُ نَفۡسَ ابۡنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ" (اگر ابن آدم کے پاس مال کی ایک وادی بھری پڑی ہو تو وہ ایک اور وادی کی تلاش میں ہوتا ہے اور یہی اس کے لیئے پسندیدہ ہوتا ہے، ابن آدم کے نفس کو سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی)۔[3]

۷) خواہش نفس کی پیروی انسان کو جبارین میں شامل کر دیتی ہے

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت بیان فرماتے ہیں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "لَا یَزَالُ الرَّجُلُ یَذۡهَبُ بِنَفۡسِهٖ حَتّٰی یُکۡتَبَ فِی الۡجَبَّارِیۡنَ فَیُصِیۡبُهٗ مَا أَصَابَهُمۡ "

(آدمی اپنے نفس کی برابر پیروی میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اسے ظالموں میں لکھ دیا جاتا ہے اور اسے وہی انجام دیا جاتا ہے جو ان (ظالموں) کو دیا جاتا ہے)۔[4]

۸) خواہش نفس کی پیروی کرنے والا سب سے بُرا ہے

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا اپنی طویل حدیث میں بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا بِئۡسَ الۡعَبۡدُ عَبۡدٌ هَوًی یُضِلُّهٗ بِئۡسَ الۡعَبۡدُ عَبۡدٌ رَغَبٌ یُذِلُّهٗ" (سب سے بُرا بندہ وہ ہے جس کو خواہشاتِ نفس گمراہ کر دیں، سب سے بُرا وہ ہے جسے خواہشات ذلیل کر دیں)۔[5]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۵۷۷، جلد ۴، صفحہ ۱۹۹۴۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۵۷۶۳، جلد ۵، صفحہ ۲۲۶۷۔
[3] صحیح مسلم، حدیث ۱۰۴۸ جلد ۲، صفحہ ۲۵ ۷۔
[4] سنن ترمذی، حدیث ۲۰۰۰، جلد ۴، صفحہ ۳۶۲۔
[5] سنن ترمذی، حدیث ۲۴۴۸، جلد ۴، صفحہ ۶۳۲۔

۹) سوتے انسان کے سر میں شیطان کا گرہیں لگانا اور اس کا علاج

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

''یَعْقِدُ الشَّیْطَانُ عَلیٰ قَافِیَۃِ رَأسِ اَحَدِکُمْ اِذَا ھُوَ نَامَ ثَلاثَ عُقَدٍ یَضْرِبُ کُلَّ عُقْدَۃٍ مَکَانَھَا عَلَیْکَ لَیْلٌ طَوِیْلٌ فَارْقُدْ فَاِنِ اسْتَیْقَظَ فَذَکَرَ اللّٰہَ اِنْحَلَّتْ عُقْدَۃٌ فَاِنْ تَوَضَّأَ اِنْحَلَّتْ عُقْدَۃٌ فَاِنْ صَلّٰی اِنْحَلَّتْ عُقْدَۃٌ کُلُّھَا فَاَصْبَحَ نَشِیْطًا طَیِّبَ النَّفْسِ وَ اِلَّا اَصْبَحَ خَبِیْثَ النَّفْسِ کَسْلَانَ''

(شیطان تم میں ہر ایک کے سر کی گدی میں، جب وہ سوتا ہے تو تین گرہیں لگا دیتا ہے، ہر گرہ لگاتے وقت تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے سو جاؤ بہت لمبی رات ہے۔ جب آدمی بیدار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، اگر وہ وضو کرتا ہے تو ایک اور گرہ کھل جاتی ہے، وہ اگر نماز پڑھتا ہے تو ساری گرہ کھل جاتی ہیں، پس آدمی چستی کے ساتھ پاکیزہ نفس ہو کر صبح کرتا ہے اور (اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کرتا) تو سستی کے ساتھ خبیث نفس ہو کر صبح کرتا ہے)۔[1]

نفس کی اصلاح کیلئے چند دُعائیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفس کی اصلاح کیلئے دُعائیں مانگا کرتے، ہر چند کہ ان دُعاؤں میں صیغۂ متکلم سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لیے دُعا فرما رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم اُمت مقصود تھی۔ چند دُعائیں یہاں درج کی جا رہی ہیں تاکہ انہیں اپنے معمولات میں شامل کر کے نفس کی اصلاح اور اس کے شر سے امان حاصل کی جا سکے۔ سب سے پہلے تو وہ جامع اور کامل دُعا پیشِ خدمت ہے جس میں حمدِ الٰہی بھی ہے، ہدایت کی دُعا بھی ہے، استغفار بھی ہے اور نفس کی شرارتوں سے پناہ کی طلب بھی ہے اور وہ یہ ہے:

۱) نفس سے بچنے کی کامل ترین دعا

اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْھَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ. اَللّٰھُمَّ آتِ نَفْسِي تَقْوَاھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا''

''حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں تم سے اسی طرح کہتا ہوں جس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے: اے اللہ! میں عجز، سستی، بزدلی، بخل، بڑھاپے اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما، اس کو پاکیزہ کر، تو سب سے

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۳۰۹۶، جلد ۳، صفحہ ۱۱۹۳۔

بہتر پاک کرنے والا ہے اور تو اسی کا ولی اور مولیٰ ہے۔ اے اللہ! جو علم نفع نہ دے، جو دل ڈرتا نہ ہو، جو نفس سیر نہ ہو اور جو دعاء قبول نہ ہو اس سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔"[1]

۲) نفس اور قلب کی اصلاح کیلئے جامع دعا

حضرت عبداللہ بن اوفیٰ ﷜ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے فرماتے ہیں کہ،

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ کَانَ یَدْعُوْا فَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ طَھِّرْنِیْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ اَللّٰھُمَّ طَھِّرْقَلْبِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا طَھَّرْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ ذُنُوْبِیْ کَمَا بَاعَدْتَّ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَدُعَاءٍ لَا یُسْمَعُ وَعِلْمٍ لَا یَنْفَعُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھٰؤُلَاءِ الْاَرْبَعِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِیْشَةً تَقِیَّةً وَمِیْتَةً سَوِیَّةً وَمَرَدًّا غَیْرَمُخْزٍ"

(رسول اللہ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے اے اللہ تعالیٰ مجھے پاک کردے برف کے ساتھ، اولوں کے ساتھ اور ٹھنڈے پانی کے ساتھ۔ اے اللہ تعالیٰ میرے دل کو خطاؤں سے پاک کردے جس طرح تو نے سفید کپڑے کو میل کچیل سے پاک کیا ہے، میرے اور میرے گناہوں میں اتنی دوری پیدا کردے جتنی دوری تو نے مشرق اور مغرب میں ڈالی ہے۔ اے اللہ تعالیٰ میں تم سے پناہ مانگتا ہوں ایسے دل کی جو (تم سے) ڈرتا نہ ہو، ایسے نفس کی جو سیر نہ ہوتا ہو، ایسی دعا کی جو سنی نہ جاتی ہو، اور ایسے علم کی جو نفع نہ دیتا ہو۔ اے اللہ تعالیٰ میں پناہ مانگتا ہوں ان چار چیزوں سے، اے اللہ تعالیٰ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسی زندگی جو پاکیزہ ہو، ایسی موت جو صحیح راستے پر ہو اور (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری رسوائی کے ساتھ نہ ہو)۔[2]

۳) نفس کے شر سے اللہ کی پناہ حاصل کرنا

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَھْدِیْہِ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا" (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں، ہم اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور اسی سے ہدایت طلب کرتے ہیں اور اسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے شروں اور بُرے اعمال سے)۔[3]

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود ﷜ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خود کو اپنے نفس کے حوالے

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۷۲۲، جلد ۴، صفحہ ۲۰۸۸۔ [2] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۱۹۴۲۱، جلد ۴، صفحہ ۳۸۱۔

[3] المستدرک، حدیث ۲۷۴۴، جلد ۲، صفحہ ۱۹۹۔

کرنے سے محفوظ رہنے کے لیئے یہ دعا مراحمت فرمایا کرتے تھے۔

''اِنْ تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ تقرِّبْنِیْ اِلَی الشَّرِّ وَتبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَیْرِ وَاِنِّیْ لَا اَثِقُ اِلَّا بِرَحْمَتِکَ فَاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَکَ عَھْدًا تَوَفِّیْنِیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ'' (پس اگر تو مجھے میرے نفس کے حوالے کرے، تو تو نے مجھے شر کے قریب کر دیا اور بھلائی سے دور کر دیا، مجھے آپ کی رحمت پر پورا یقین ہے پس میرے لیئے اپنے ساتھ ایک عہد کر دجسے قیامت کے دن پورا فرمانا بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا)۔[1]

۴) حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیش قدر وظیفہ

حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک دن اپنے نبی کریم ﷺ کے در اقدس پر حاضر ہوئے اور عرض کی ''مُرْنِیْ بِکَلِمَاتٍ اَقُوْلُھُنَّ اِذَا اَصْبَحْتُ وَاَمْسَیْتُ قَالَ قُلْ اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ وَ مَلِیْکَہٗ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ فَقَالَ قُلْھَا اِذَا اَصْبَحْتَ وَاَمْسَیْتَ وَاِذَا اَخَذْتَ مَضْجَعَکَ''

''مجھے ایسے کلمات کا حکم دیجیے جن کو میں صبح وشام پڑھتا رہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہو اے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والے، چھپی ہوئی اور ظاہر چیز کو جاننے والے، ہر چیز کے پالنے والے ، میں تم سے اپنے نفس کے شر اور شیطان کے شر سے پناہ مانگتا ہوں ،فرمایا (اے ابوبکر) تو یہ کہا کر جب تو صبح کرے، شام کرے اور جب تو اپنے بستر پر جائے۔[2]

۵) رشد کی طلب اور نفس کے شر سے پناہ

حضرت حصین بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے رسول ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا اے حصینؓ کتنے معبودوں کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا سات معبودوں کی، ان میں چھ تو زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان میں سے شوق اور خوف سے کس کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا اس کی جو آسمانوں میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسلام قبول کر ہم تمہیں ایسے کلمات سکھائیں گے جن سے تمہیں نفع پہنچے گا۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے انہیں یہ کلمات تعلیم فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ انہیں پڑھا کرو ''اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَ قِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ''[3] (اے اللہ تعالیٰ! مجھے ہدایت الہام فرما اور مجھے نفس کے شر سے بچا)۔

---

[1] مجمع الزوائد، جلد ۱۰، صفحہ ۱۷۷۔ [2] سنن نسائی، حدیث ۷۶۹۹، جلد ۴، صفحہ ۴۰۳۔

[3] سنن ترمذی، حدیث ۳۴۸۳، جلد ۵، صفحہ ۵۱۹۔

۶) نفس کو اللہ کے تابع کرنا

''اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَ وَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَ اَلْجَأْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَۃً وَ رَھْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَأً وَلَا مَنْجَأً مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ'' (اے اللہ! میں اپنے نفس کو تیری بارگاہ میں جھکاتا ہوں اور اپنا چہرہ تیری طرف کرتا ہوں اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں اور اپنی پشت تیری بارگاہ میں خم کرتا ہوں، تیری ذات کی طرف رغبت کرتا ہوں اور تیری ذات کا خوف کرتا ہوں، تیرے سوا کوئی پناہ کی جگہ اور قرار گاہ نہیں ہے)۔[1]

۷) حصولِ نفسِ مطمئنہ کیلئے دُعا

امام ابنِ عساکرؒ نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو یوں دُعا مانگنے کی تلقین فرمائی ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ نَفْسًا بِکَ مُطْمَئِنَّۃً تُؤْمِنُ بِلِقَائِکَ وَ تَرْضٰی بِقَضَائِکَ وَ تَقْنَعُ بِعَطَائِکَ ''(اے اللہ! میں تجھ سے نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں جو تیری ملاقات پر ایمان رکھتا ہو، جو تیرے فیصلہ پر راضی ہو اور تیری عطا پر قناعت کرے)۔[2]

۸) نفس کے لمحہ بھر کے شر سے حفاظت

''اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَکَ اَرْجُو فَلا تَکِلْنِی اِلٰی نَفْسِی طَرْفَۃَ عَیْنٍ اَصْلِحْ لِی شَأْنِی کُلَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ''

(اے اللہ میں تیری رحمت پر امید رکھتا ہوں، آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نفس کے مجھے حوالے نہ کر، میرے تمام کاموں کی اصلاح فرما، تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)۔[3]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۲۹۲۹۴، جلد ۶، صفحہ ۳۷۔ [2] المعجم الکبیر، حدیث ۷۴۹۰، جلد ۸، صفحہ ۹۹۔

[3] مسند احمد، حدیث ۱۹۵۳۵، جلد ۳۱، صفحہ ۳۹۴۔

باب نمبر ٦

اقسام اور مدارجِ نفس

نفس اور اس کی تقسیمات

نفس: تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (۱) نفسِ انسانی (۲) نفس بمعنٰی سانس (۳) نفس بمعنٰی ذات۔ نفسِ انسانی کے متعلق فرمایا ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (جس انسان نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) اور سانس کا اس آیت میں اشارہ ہے۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ [۱] (اور پھونک دوں میں اس میں خاص روح اپنی طرف سے)۔

حضرت شیخ الاکبرؒ نے فرمایا "وَقَدْ عَرَفْتُ اَنَّ النَّفَسَ فِي الْمُتَنَفِّسِ" [۲] یعنی سانس بیچ ہر متنفس کے اور نفس بمعنٰی ذات حق اس لیے ہے کہ نفسِ الٰہی اور نفسِ رحمانی استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور تقسیم کے لحاظ سے نفس کی تین اقسام ہیں۔ (۱) نفسِ حیوانی (۲) نفسِ انسانی (۳) نفسِ رحمانی۔ نفسِ رحمانی سے مراد ذات باری تعالٰی ہے جو سب حقائق کی حقیقت ہے جو اسمِ رحمٰن سے ہے جو موجبِ تخلیقِ عالم ہے۔ فرمایا "وَسِعَتْ رَحْمَتِيْ كُلَّ شَيْءٍ" [۳] (اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر)۔

انسان تین اجزاء کا مجموعہ ہے۔ روح، جسم اور نفس ان سب کو اللہ تعالٰی نے اپنی صورت پر پیدا

---

[۱] ص، ۲۹:۱۵۔　[۲] نعمۃ الذریعہ فی نصرۃ الشریعہ، علامہ ابراہیم حلبی، متوفی ۹۵۶ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۴، دار الصادر، بیروت۔

[۳] الاعراف، ۱۵۶:۷۔

کیا۔روح عالمِ ارواح سے ہے اور اسی پر زندگی کا مدار ہے۔یہ جسم کی صفات کھانے، پینے اور سونے وغیرہ سے پاک ہے۔اور عالمِ علوی سے ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔جسم وہ تعین اور تشخص جسمانی ہے کہ وہ گوشت، پوست، ہڈیاں وغیرہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

نفس سے مراد عقل بھی ہے جو روح اور جسم کے درمیان برزخ ہے۔ایک طرف روح سے ملی ہوئی ہے اور اس کی صفات سے متصف ہے، مثلاً لطیف ہے، جسمانی صفات سے پاک ہے اور دوسری طرف جسم سے متعلق ہے۔عارفین باللہ ان تین اجزا کے علاوہ چوتھا جزو بھی بیان کرتے ہیں اس کا نام قلب ہے۔اسی قلب کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تحقیق آدمی کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اس لوتھڑا میں قلب ہے اور قلب میں روح ہے اور روح میں نور ہے اور نور میں سر ہے اور سر میں (حق تعالیٰ) ہے۔''[1] اس کے علاوہ قرآن پاک میں جو بیان ہے اس کے مطابق اسی قلب صنوبری جو سینے کے بائیں طرف ہے اوندھا لٹکا ہوا ہے۔جس سے معلوم ہوا کہ تین قلب ہیں۔(۱) قلبِ منیب (۲) قلبِ سلیم (۳) قلبِ شہید۔

۱) قلبِ منیب: اس سے مُراد ایسا دل جو اخلاص کے ساتھ اطاعت کی طرف متوجہ رہے۔اسی کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا ''مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ ''[2] جو ڈرتا تھا رحمٰن سے بن دیکھے اور ایسا دل لیے ہوئے آیا جو یادِ الٰہی کی طرف متوجہ تھا۔

۲) قلبِ سلیم: اس سے مراد مومن کا دل ہے۔ایسا دل جو کفر و نفاق کی بیماریوں سے محفوظ ہے۔ارشادِ ربانی ہے ''اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ'' [3] (مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلبِ سلیم)۔

۳) قلبِ شہید: اس سے مُراد ایسا دلِ بینا ہے جو حقیقت کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔اس کے متعلق فرمایا ''اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ '' [4] (بے شک اس میں نصیحت ہے اس کیلئے جو دل (بینا) رکھتا ہو یا (کلامِ الٰہی کو) کان لگا کر سنے متوجہ ہو کر)۔

ایسے قلب والوں کے متعلق حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں ''زِیَارَۃُ اَھْلِ الْقَلْبِ خَیْرٌ مِّنْ زِیَارَۃِ الْکَعْبَۃِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً'' یعنی اہلِ دل کی زیارت کعبہ کی ستر بار زیارت سے بہتر ہے۔اور اسی دل کے متعلق مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۲، جلد ۱، صفحہ ۲۸۔ [2] ق، ۵۰:۳۳۔ [3] الشعراء، ۲۶:۸۹۔
[4] ق، ۵۰:۳۷۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است   از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

(کسی کے دل کی دست آوری کرنا حجِ اکبر کی طرح ہے، ہزاروں کعبوں سے ایک دل بہتر ہے)

ایسے ہی اہلِ دل کی صحبت کے متعلق فرماتے ہیں۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(اولیاء اللہؒ کی صحبت میں کچھ دیر رہنا سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے)

عارف باللہ کا قلب: قلب سے مراد یہاں عارف باللہ کا قلب ہے۔ جس کے متعلق فرمایا ہے "قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْتُ الرَّحْمٰنِ" یعنی مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قلب تجلی گاہِ الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات سے موصوف ہے اور جس خاص صفت سے متصف ہے وہ ہے مقلب اور متحول ہونا مختلف صورتوں میں یعنی مختلف صورتوں میں متجلی ہوتا ہے۔ کبھی ایک صورت میں اور کبھی دوسری صورت میں بدلتا رہتا ہے۔

عارف باللہ کا قلب: یہ دل اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے بلکہ اللہ کی رحمت سے بھی وسیع تر ہے کیونکہ اس نے حق تعالیٰ اور اس کی رحمت کو سمولیا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "کہ نہیں سماتا ہوں میں کسی شئے میں مگر سماجاتا ہوں میں قلب مومن میں۔" [1]

مومن یعنی عارف باللہ کا قلب حق تعالیٰ کو سمولیتا ہے۔ قلب عارف سے مراد قلبِ صنوبری نہیں ہے بلکہ یہ حقیقی دل ہے اور کم از کم قلب مطمئنہ مراد ہے۔ کیونکہ "قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْتُ الرَّحْمٰنِ ، قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰهِ تَعَالٰى" [2] یعنی مومن کا قلب رحمٰن کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ پس جس نے مومن عارف باللہ کو دیکھا اس نے رحمٰن کو دیکھا۔

اولیاء اللہ و اللہ اولیاء   انبیاء و اولیاء را حق بداں

(اولیاء اللہؒ کے دوست یا اللہ اولیاءؒ کا دوست ہونا ایک ہی بات ہے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کو برحق سمجھ)

ہیچ فرق درمیان نہ بود روا   سرِ پنہانی بتو گفتم عیاں

(ان دونوں میں فرق نہیں ہے، راز کی بات میں نے تم سے واضح طور پر کہہ دی)

قلبِ عارف کی علامات

قلبِ عارف کی اسی وسعت کے متعلق شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے فرمایا کہ قلبِ عارف حق تعالیٰ سے پُر ہو جاتا ہے تو غیر حق کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور حق تعالیٰ کی معیت میں غیر حق نہیں رہتا۔ جب ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ قلبِ عارف میں رہتا ہے اور حق تعالیٰ تجلی فرماتا رہتا ہے مختلف صورتوں میں اور قلب ہی

---

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۱۲۔ [2] تفسیر ابن عربی، ابوبکر محی الدین ابن عربی، متوفی ۶۳۸ھ، جلد ۲، صفحہ ۲۶۲، بیروت۔

ان مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس لیے قلب کو قلب کہتے ہیں۔ پس قلب پر ہر آن نئی تجلی ہوتی ہے جو کہ پہلے نہ تھی اور نہ مکرر ہوگی۔ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ" [1] (ہر روز وہ ایک نئی شان سے (تجلی فرماتا ہے) اور قلب چونکہ مظہر رحمٰن ہے ہر آن نئی شان ہے، ایک حالت میں نہیں رہتا بلکہ ہر آن، ہر لحہ نئی حالت ہوتی ہے۔

عارفینِ کاملین کے حالات میں ایسے واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی ایک صورت میں اور کبھی دوسری صورت میں ظاہر ہو جاتے ہیں کیونکہ صورتیں مثل صفات اور مثل لباس کے ہیں۔ کبھی ایک صفت کے ساتھ ظاہر ہوئے تو کہیں دوسری صفت کے ساتھ ظاہر ہوئے۔

جن عُشاقِ الٰہی اور عارفینِ حقیقی کی نظر ذات پر ہوتی ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کو خوب پہچانتے ہیں اور ایک لحہ بھر بھی ان کی نظر ذات سے نہیں اٹھتی وہ صورتوں کے تبدل اور اختلاف سے نہیں بھٹکتے بلکہ ہر صورت میں یار ہی کو ملاحظہ فرماتے ہیں۔ ان کیلئے فرمایا "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط" [2] (سو جدھر بھی تم رُخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے)۔ ان ہی کو مشاہدہ حاصل رہتا ہے۔ وہ ذات کی مختلف صفات میں ظہور سے متاثر اور محجوب نہیں ہوتے بلکہ ہر صفت میں ذات باری تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں اور ایمان بالعرفان لاتے ہیں اور مشاہدہ دائمی میں محو و مستغرق رہتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے "اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" [3] (بے شک اس میں انتباہ اور تذکر ہے اس شخص کیلئے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے) یا کان لگا کر سُنتا ہے (یعنی توجہ کو یکسو اور غیر سے منقطع رکھتا ہے) اور وہ (باطنی) مشاہدہ میں ہے (یعنی حسن و جمالِ الوہیت کی تجلیات میں گم رہتا ہے)۔ یہاں اہلِ عقل کے واسطے نہیں فرمایا کیونکہ دل یعنی قلب مطلق ہے اور عقل مقید ہے۔ قلب مختلف صورتوں اور صفتوں میں مقلب ہے یعنی ذاتِ حق کا بے حد و شمار صورتوں میں جلوہ نما ہونا اور بے حد و شمار صفات سے موصوف ہونا ہے۔

حیاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور عام پیدائش کی طرح نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام کا جسم مطہر، روح مطہر اور آپ علیہ السلام کی حقیقت حق ہے۔ آپ علیہ السلام کا جسم مبارک اطہر ہے اس لیے کہ طبیعت بشری سے نہیں اور نہ ہی آپ علیہ السلام کا جسم اطہر آپ علیہ السلام کی روح کیلئے قید خانہ ہے۔ جسمانیات کی کوئی صفت آپ کے جسم مبارک میں نہیں ہے کیونکہ وہ عالم سفلی سے نہیں ہے جس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے، جس کو فنا ہے کیونکہ جسم انسانی کی ایک عمر ہے اس کیلئے ایک مدت مقرر ہے اور یہ فنا ہونے والا ہے۔ نفسِ

---

[1] الرحمٰن، ۵۵:۲۹۔ [2] البقرہ، ۲:۱۱۵۔ [3] ق، ۵۰:۳۷۔

انسانی کی کوئی صفت آپ میں نہ تھی مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، جوڑے سے جمع ہونا، بھوک، پیاس، ہوس اور شہوت وغیرہ ایک لحاظ سے آپ کا جسم بھی روح تھا۔ آپ علیہ السلام کا جسم چونکہ جسم نہ تھا اس لیے اس کیلئے فنا نہیں تھی۔ طبعی موت نہ تھی اس لیے آپ علیہ السلام کو اٹھالیا گیا یا آپ علیہ السلام اٹھ گئے جیسے روح عالم سفلی سے عالم علوی کی طرف پرواز کرجاتی ہے۔ اس واسطے آپ علیہ السلام ابھی تک اسی جسمِ اطہر کے ساتھ حیات ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح اللہ سے ہے اس لیے آپ علیہ السلام کا لقب روح اللہ ہے یعنی آپ علیہ السلام کی روح اللہ کی روح سے ہے اور اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور پرندوں بلکہ سب مخلوق کو پیدا کرتا ہے۔ یہ دو معجزے مثال کے طور پر بیان فرمائے۔ پس جو معجزات آپ علیہ السلام سے سرزد ہوتے تھے وہ افعالِ الٰہی تھے۔ روح اللہ کی خاصیتوں میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ روح جس سے مس کرتی ہے اس کو زندہ کردیتی ہے۔ روح حسی ہے اور حیات بخشتی ہے۔ چونکہ اس بات کو سامری جانتا تھا اس لیے اس نے روح الامین علیہ السلام کے پاؤں کے نقش سے مٹھی بھر خاک لے کر بچھڑے میں ڈالی اور وہ زندہ ہوگیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی روح کی صفت لے لی اس لیے جسم بھی مثل روح کے ہوگیا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارا جسم ہماری روح کی طرح ہے اور ہماری روح ہمارے جسم کی طرح ہے۔ موت جسم کیلئے ہے، روح کیلئے نہیں۔ اس لیے جو لوگ روح کی صفت سے متصف ہوجاتے ہیں وہ دائمی زندگی پاتے ہیں طبعی موت کے وقت بھی مرتے نہیں بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''اَوْلِیَآءُ اللّٰہِ لَایَمُوْتُوْنَ بَلْ یَنْتَقِلُوْنَ مِنَ الدَّارِ اِلَی الدَّارِ'' (اولیاء اللہؒ مرتے نہیں بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں)۔

دوسری وجہ اولیاء اللہؒ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مراتب سے فائز ہوکر حیات دائمی سے حیّ ہوتے ہیں۔ اس لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا''[1] (مرجاؤ مرنے سے پہلے) مطلب یہ کہ اپنی خواہشات سے مرجاؤ حتیٰ کہ جملہ ماسویٰ اللہ سے مرجاؤ اور فنا فی اللہ ہوجاؤ۔

فنا کی قسمیں

فنا عدمِ شعور کو کہتے ہیں۔ ذاتِ احد میں اس درجہ استغراق کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے۔ بے خودی یعنی اپنی خودی کا بھی ہوش نہ رہنا۔ اولیائے کرامؒ نے فنا کی قسمیں بیان کی ہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ فنا کی تین قسمیں ہے۔

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۶۶۹، جلد ۲، صفحہ ۳۸۴۔

پہلی قسم کی فنا

یہ ہے کہ تم اپنی صفات، اخلاق اور مزاج کی قید سے آزاد ہو جاؤ اور اس حالت پر اپنے اعمال سے دلائل بہم پہنچاؤ کہ خوب محنت و ریاضت کرو اور اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف عمل کرو۔ جو کچھ تمہارا نفس چاہتا ہے اس کی بجائے اسے وہ چیز دو جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔

دوسری قسم کی فنا

یہ ہے کہ تم اپنے نفس سے بالکل دستبردار ہو جاؤ یہاں تک کہ طاعات میں جو لذت ایک عابد و زاہد کو ملتی ہے اس کا احساس بھی تم سے جاتا رہے۔ تم خود خدا کے اور صرف خدا کے ہو جاؤ۔ تمہارے اور ذاتِ حق کے درمیان کوئی واسطہ نہ رہے۔

تیسری قسم کی فنا

یہ ہے کہ تجلیاتِ ربانی کا تم پر اتنا غلبہ ہو جائے کہ تمہارے وجود کی حقیقت تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ ایسی حالت میں تم ایک ایسا وجودِ فانی ہو جاؤ گے جو وجودِ ابدی کے ساتھ متحد ہو کر خود بھی ابدی ہو گیا ہو۔ تمہارا وجود وجودِ خداوندی کے سبب ہی ہوگا اس لیے کہ تمہاری فنا تو محقق ہو چکی۔ تمہاری رسم یعنی ظاہری شکل باقی رہے گی لیکن تمہارا نام اور تمہاری انفرادیت مٹ جائے گی۔

حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ فرماتے ہیں کہ فنا کی تین قسمیں ہیں (۱) فنائے اول ''فَنَا عَنِ الْخَلْقِ'' ہے۔ یعنی تو مخلوق سے فنا ہو جا۔ ان سے نہ تو نفع کی امید رکھے اور نہ نقصان کا خوف، مطلب یہ کہ تیری نظر حق تعالیٰ پر ہو اور مخلوق سے نظر کلی اٹھ جائے۔

تعین سے جب اٹھ جائے نظر   تو پھر ذات ہے ذات ہے سربسر

(۲) فنائے دوم ''فَنَا عَنِ النَّفْسِ'' ہے یعنی تو اپنے نفس سے فانی ہو جا جس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا نفس تابع خدا اور رسول اللہ ﷺ ہو جائے اور خواہشات نفس سے فنا ہو جائے۔ (۳) فنائے سوم ''فَنَا عَنِ الْاِرَادَةِ'' ہے یعنی تو اپنے ارادہ سے فنا ہو جائے تیری اپنی کوئی خواہش نہ رہے۔ کوئی آرزو نہ رہے۔ کوئی ارادہ نہ رہے بلکہ تو ارادۂ الٰہی میں پوری طرح فنا ہو جائے۔ تو تقدیر کے سامنے ایسا ہو جائے جس طرح مردہ غُسّال کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ غُسّال جس طرح چاہتا ہے مردہ کو الٹتا پلٹتا ہے مردہ کی اپنی کوئی مرضی نہیں اور اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تیرا کوئی ارادہ نہ رہا تو میں اور تو نہ رہا۔ جب تو نہ رہا تو تجھے فنا نصیب ہوئی۔ یہ فنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی۔ اس لیے مردے زندہ کرتے تھے۔ کوڑھی کو تندرست کرتے تھے۔

نفس کی قسمیں

نفس تو ایک ہی ہے مگر اس کی صفات بدلتی رہتی ہیں جیسے لوہا ایک ہے مگر اس کی اقسام بہت سی ہیں۔ مثلاً عام لوہا، دیگ کا لوہا اور فولاد وغیرہ۔ اسی طرح اوصاف کے اعتبار سے نفس کے بھی کچھ درجے ہیں۔ پہلا درجہ جب نفس سیر ہو جائے تو سرکش ہو جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ''وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ'' [1] (اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمائے)۔ جیسے فرمایا امّارۃ لفظ امر سے مبالغہ کا صیغہ ہے کیونکہ وہ ہر وقت برے کاموں کا کثرت کے ساتھ حکم دیتا رہتا ہے۔ اس لیے اسے نفس امارہ کہتے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جائے اور تہذیبِ نفس سیکھنا شروع کر دے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نفس کی ذات کے عیوب اس پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اس پر وہ پشیمان ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ اس کو نفسِ لوامہ کہتے ہیں یعنی دوسرا درجہ نفسِ لوامہ ہے جیسا کہ ''لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ'' [2] (میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی۔ اور میں قسم کھاتا ہوں (برائیوں پر) ملامت کرنے والے نفس کی)۔ حسن بصریؒ کے نزدیک نفسِ لوامہ مومن کا نفس ہے۔ جو ہر وقت اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں پر اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے۔

قرآنِ مجید میں نفس اور اس کی جمع نفوس سے انفس مختلف صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔ (۱) بیشتر مقامات پر ان کا مطلب ہے ذاتِ انسانی یا شخصِ انسانی ''فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَکُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ'' [3] (پس آپ کے پاس علم آ جانے کے بعد جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں آپ ﷺ سے جھگڑا کرے تو آپ ﷺ فرما دیں کہ آ جاؤ ہم (مل کر) اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو بھی اور تمہیں بھی (ایک جگہ پر) بلا لیتے ہیں، پھر ہم مباہلہ (یعنی گڑگڑا کر دعا) کرتے ہیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجتے ہیں)۔

اپنی ذات کی نفس کی مثال قرآن میں ایسے آئی ہے ''وَقَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ'' [4] (اور بادشاہ نے کہا: انہیں میرے پاس لے آؤ کہ میں انہیں اپنے لیے (مشیر) خاص کر لوں)۔ ایک اور جگہ فرمایا ''وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۙ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ'' [5] (اور زمین میں صاحبانِ ایقان (یعنی کامل یقین والوں) کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں (بھی ہیں)،

---

[1] یوسف، ۱۲:۵۳۔　[2] القیامۃ، ۷۵:۱،۲۔　[3] آل عمران: ۳:۶۱
[4] یوسف، ۱۲:۵۴　[5] الذٰریٰت، ۵۱:۲۰،۲۱

سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو)۔

ذیل کی آیات میں نفس کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ ''وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ ط اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ O'' [1] (اور میں ان (باتوں) کو نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہیں۔ بے شک تو ہی غیب کی سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے)۔ یہاں نَفْسِکَ سے مراد ذات الٰہی اور اس کے غیوب ہیں۔

''وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ'' [2] (اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے)۔ مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے یعنی نفس سے مراد عتاب اور عذاب ہے اور یہ ڈرانا بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رافت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات قطعاً پسند نہیں ہے کہ اس کے بندے عذاب میں مبتلا ہوں۔ ''کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ'' (اس نے لازم کر لیا ہے اپنے آپ پر رحمت فرمانا)۔ یہ بات آیت ۵۴ میں دہرائی گئی ہے۔ ''وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ O'' [3] (اور (اب) میں نے تمہیں اپنے (امرِ رسالت اور خصوصی انعام کے) لیے چن لیا ہے)۔ یہاں نَفْسِیْ سے مراد وحی و رسالت اور منشاء و ارادۂ الٰہی ہے۔

قرآن مجید میں اَنْفُسُ اپنی جانوں، اپنے آپ اور اپنی ذات کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے ''لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ط'' [4] (وہ اختیار نہیں رکھتے اپنے لیے بھی کسی نفع کا اور نہ کسی نقصان کا)۔ یہی بات سورۂ الفرقان، آیت ۳ میں دہرائی گئی ہے۔ سورۃ الانعام، آیت ۱۳۰ میں اَنْفُسَنَا اور اَنْفُسَہُمْ سے مراد بھی اپنی ذات ہے۔ سورۃ الانعام میں بصورت جمع جان اور روح کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ''وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْہِمْ ج اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط'' [5] (کاش تم دیکھو جب ظالم موت کی سختیوں میں (گرفتار) ہوں اور فرشتے بڑھا رہے ہوں (ان کی طرف) اپنے ہاتھ (اور انہیں کہیں کہ) نکالو اپنی جانوں کو)۔

''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ'' [6] (اور بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم (خوب) جانتے ہیں اس کا نفس جو وسوسے ڈالتا ہے)۔ ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْہَوٰی O فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی'' [7] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات و شہوات سے باز رکھا، تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر حرام خواہشوں سے اپنے آپ کو بچا لینے والا یقیناً جنت کا حقدار ہو جاتا ہے۔

---

[1] المائدہ، ۱۱۶:۵۔ [2] آل عمران، ۳۰:۳۔ [3] طہٰ، ۴۱:۲۰۔
[4] الرعد، ۱۶:۱۳۔ [5] الانعام، ۹۳:۶۔ [6] ق، ۱۶:۵۰۔ [7] النازعات، ۷۹: ۴۰، ۴۱۔

نفس کی مزید اقسام

نفس کی کئی تقسیمیں ہیں۔ ایک تقسیم کے اعتبار سے نفس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) نفس الروح جو زندگی کا سبب اور باعث ہے اور (۲) نفس العقل جس سے برے بھلے میں تمیز کی جاتی ہے، اس لیے نفس الروح کو نفس الحیات اور نفس العقل کو نفس التمیز بھی کہتے ہیں۔ حالت نیند میں نفس العقل انسان سے جدا ہو جاتا ہے، البتہ نفس الروح اس کے ساتھ رہتا ہے۔ روح نکل جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

نفس کی دو اقسام یوں بھی بیان کی گئی ہیں۔ (۱) نفس الارضیہ جس میں نفس نباتیہ، نفس حیوانیہ اور نفس انسانیہ شامل ہیں، (۲) نفس مطمئنہ۔ صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ روح کے مختلف نام ہیں۔ صوفیا اور حکماء کے ہاں ان ناموں کی مختلف توضیحات وتشریحات ملتی ہیں۔ حکماء نفسِ بشریہ کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ (تفصیلات کیلیے دیکھیے التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون بذیل مادہ نفس)۔

مدارجِ نفس

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک ہی نفس پیدا فرمایا ہے جسے اس کی مختلف حالتوں کے باعث متعدد اسماء دیئے گئے ہیں۔ قرآنِ کریم میں بالصراحت فقط تین حالتوں کا ذکر آتا ہے اور صوفیاءِ عظام نے مزید کچھ حالتیں قرآن وسنت سے مستنبط فرمائی ہیں اور ہر حالت کے لحاظ سے نفس کو ایک نیا نام دیا گیا ہے۔ سطورِ ذیل میں ہم نفس کی وہ مختلف حالتیں اور اسماء ذکر کر رہے ہیں۔

(۱) نَفْس اَمَّارَہْ

نفس کی پہلی قسم نفس امّارۃ کہلاتی ہے یہ وہ نفس ہے جو حکم چلاتا ہے "نفس امارہ برائی پر برانگیختہ کرنے والا نفس ہے" حالانکہ اس کا لفظی معنی ہے "حکم کرنے والا نفس" اور "بِالسُّوْء" کا لفظ شامل کیا جائے تو پھر معنی بنتا ہے "برائی کا حکم کرنے والا نفس" تاہم عام بول چال میں بغرض آسانی ایسے مخففات ہر زبان میں مستعمل ہوتے ہیں اور یہی اصول یہاں بھی کارفرما ہے، قرآنِ حکیم میں اس نفس کا تذکرہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانِ اقدس سے یوں آیا ہے "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ج اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ م بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ"[۱] (اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرمادے)۔

صوفیاءِ کرامؒ جب مطلقاً لفظِ نفس استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد نفس امارہ ہی ہوتی ہے چنانچہ امام

---

[۱] یوسف، ۱۲:۵۳۔

قشیریؒ فرماتے ہیں: ''صوفیاء کے نزدیک لفظِ نفس کا اطلاق محض کسی چیز کے وجود یا ڈھانچے پر نہیں ہوتا، جب وہ لفظِ نفس بولتے ہیں تو ان کی مراد بندے کے معلول اور مذموم افعال اور اخلاق ہوتے ہیں'')۔ مذموم افعال واخلاق کا مرکز یہی نفسِ اَمّارہ ہے۔ شیخ الاسلام زکریا الانصاریؒ فرماتے ہیں ''اسی لیے اس نفس کو انسان کے جملہ دشمنوں سے بڑا دشمن شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے خلاصی پانا انتہائی مشکل ہے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ انسان جب اپنے تمام دشمنوں سے صلح کرلے تو ان کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جب نفس کے ساتھ صلح کرے تو نفس اسے مزید ہلاکت وتباہی کی طرف لے جاتا ہے، اسی لیے اس کے خلاف جہاد کرنا جہادِ اکبر کہلاتا ہے''۔[1]

(۲) نَفْسِ لَوَّامَۃُ (بہت ملامت کرنے والا نفس)

اگر کوئی شخص ذکرِ الٰہی میں کوشاں ہو جائے یا اسے ذکرِ الٰہی اور وعظ ونصائح کی مجالس ہاتھ آجائیں یا کسی اچھے انسان کے ساتھ اُس کی دوستی ہو جائے یا دینی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگ جائے تو پھر اس کا نفس اَمّارہ ذرا اُوپر کے درجے کی طرف چلا جاتا ہے۔ پہلے جو ہر وقت برائی پر اکساتا رہتا تھا اب برائی کرنے پر ملامت کرنے لگتا ہے اور نیکی کے ترک کرنے پر بھی انسان کو ندامت کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس نفس کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے ''وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ہ''[2] (اور میں قسم کھاتا ہوں (برائیوں پر) ملامت کرنے والے نفس کی)۔

علمائے کرامؒ کے مابین اختلاف ہے کہ ''لَوَّامَہ'' تلوم (ملامت کرنے) کی وجہ سے کہا جاتا ہے یا تلوّن (رنگ بدلنے) کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ بہرکیف اسلاف کرامؒ کی عبارات انہی معانی کے گرد گھومتی ہیں۔

۱) چنانچہ علامہ ابن قیم الجوزیؒ لکھتے ہیں ''حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا ''مَا اللَّوَّامَۃُ؟'' (لوّامہ کسے کہتے ہیں؟) آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''یہ ملامت کرنے والا نفس ہے''۔ ھِیَ النَّفْسُ اللَّؤُوْمُ[3]

۲) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: یہ وہ نفس ہے جو اعمالِ حسنہ کے فوت ہونے پر نادم ہو اور انسان کو اس پر ملامت کرے۔

۳) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ خیر کے ترک پر اور شر کے کرنے پر ملامت کرتا ہے اور حضرت عطاء سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر نفس قیامت کے دن ملامت کرے گا، نیکی کرنے والے شخص کو

---

[1] الرسالۃ القشیریہ، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری، متوفی ۴۶۵ھ، صفحہ ۷۷، مکتبہ حنفیہ۔

[2] القیامۃ، ۷۵: ۲۔　[3] اغاثۃ اللھفان، محمد بن ابوبکر، متوفی ۷۵۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۷۷، مکتبۃ المدینۃ، بیروت۔

کہے گا کہ اس نے زیادہ نیکی کیوں نہ کی اور برائی کرنے والے شخص کو کہے گا کہ وہ برائیوں سے باز کیوں نہ آیا۔

(۴) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں خدا کی قسم تم مومن کو نہیں دیکھو گے مگر اس حال میں کہ ہر وقت خود کو ملامت کرتا ہوگا کہ جو کچھ اس نے نیک عمل کیا ہے وہ بہت کم ہے سو وہ ندامت و ملامت میں رہے گا اور فاجر شخص برائیوں میں بڑھتا چلا جائے گا اور کبھی اپنے نفس پر عتاب نہیں کرے گا۔[1]

(۳) نفسِ مطمئنہ (اطمینان والا نفس)

نفسِ لوّامہ کی مسلسل ملامت سے بندہ اعمالِ حسنہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اعمالِ سیّئہ (برائیوں) سے کنارہ کش ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آ ہی جاتا ہے کہ اسے صرف نیکیوں میں ہی قرار اور سکون ملتا ہے اور بدی سے اس کی طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ نفس کی اس وصفی حالت کا ذکر قرآنِ حکیم میں یوں کیا گیا ہے ”یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝“ (اے اطمینان پا جانے والے نفس۔ تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)۔[2]

علامہ ابنِ قیم الجوزیؒ لکھتے ہیں ”نفس جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ سکون حاصل کرے، اس کے ذکر کے ساتھ مانوس ہو، اس کی طرف راجع ہو، اس کی ملاقات کا مشتاق ہو اور اس کی قربت سے انس حاصل کرے تو وہ نفسِ مطمئنہ ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ تصدیق کرنے والا نفس ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یہ مومن نفس ہے اس کو ان وعدوں پر ایمان ہے جو اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں یہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرنے والا نفس ہے اور یہ نفسِ ”مُخْبِتَةٌ“ ہے، ”مُخْبِتَةٌ“ یہ قرآنِ حکیم کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے ”وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِیْمِی الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝“[3] (اور (اے حبیب!) عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں (یہ) وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو مصیبتیں انہیں پہنچتی ہیں ان پر صبر کرتے ہیں اور نماز قائم رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)۔ یعنی یہ وہ نفوس ہیں جنہیں اللہ کے رب ہونے پر یقین ہے۔

طمانیت کی حقیقت سکون اور قرار ہے۔ پس نفسِ مطمئنہ وہ ہے جو رب تعالیٰ کی اطاعت، اس کے امر اور اس کے ذکر کے ساتھ سکون اور قرار پکڑے اور اس کی نہی پر بھی مطمئن رہے اور رب تعالیٰ کے رب ہونے

---

[1] اغاثۃ اللفھان، جلد ۱، صفحہ ۸۸۔ [2] الفجر، ۸۹: ۲۷، ۲۸۔ [3] الحج، ۲۲: ۳۵۔

پر، اسلام کے دین ہونے پر اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو اور رب تعالیٰ کی تقدیر پر بھی راضی ہو۔[1] علامہ میر سید شریف جرجانیؒ لکھتے ہیں "اَلنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ هِيَ الَّتِي تَنَوَّرَتْ بِنُوْرِ الْقَلْبِ حَتّٰى تَخَلَّتْ عَنْ صِفَاتِهَا الْمَذْمُوْمَةِ وَ تَخَلَّقَتْ بِالْاَخْلَاقِ الْحَمِيْدَةِ "[2] (نفس مطمئنہ وہ ہے جو قلب کے نور کی بدولت روشن ہوتا ہے حتٰی کہ اس کی مذموم صفات ختم ہو جاتی ہیں اور وہ اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہو جاتا ہے)۔

اے نفسِ مطمئنہ لوٹ آ! (روایت)

۱) نفسِ مطمئنہ کو یہ خطاب کس وقت کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب بندۂ مومن وفات پانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کو اس کی طرف بھیجتا ہے۔ وہ اسے کہتے ہیں اے نفسِ مطمئنہ! اس دارِ فانی سے نکل اور راحت و آرام کی طرف چل اور آجا کیونکہ تیرا رب تجھ سے راضی ہے۔[3]

۲) صحیح حدیث میں ہے کہ سیدنا ابنِ عباسؓ کا جسدِ اطہر جب نمازِ جنازہ کیلئے رکھا گیا تو ایک سفید پرندہ آیا اور آپ کے کفن میں داخل ہو گیا پھر باہر نہ آیا اور اسے تلاش کیا گیا تو نہ مل سکا اور جب تدفین کے وقت آپ کی قبر کی مٹی برابر کردی گئی تو ایک آواز سُنی گئی "يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝" لیکن آواز دینے والا کوئی نظر نہ آیا۔[4]

۳) حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ جب متذکرہ بالا آیت نازل ہوئی اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر تھے۔ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! ﷺ یہ کس قدر اچھی بات ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! جب تم اس دنیا سے رخصت ہو گے تو تمہیں بھی یہ مژدۂ جاں افزا سُنایا جائے گا۔[5]

حصولِ نفسِ مطمئنہ کیلئے دُعا

امام ابنِ عساکرؒ نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو یوں دُعا مانگنے کی تلقین فرمائی "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَ تَرْضٰى بِقَضَائِكَ وَ تَقْنَعُ

---

[1] اغاثۃ اللھفان، جلد۱، صفحہ ۸۷۔

[2] التعاریفات، علی بن محمد الجرجانی، متوفی ۸۱۶ھ، جلد۱، صفحہ ۸۱۶، دار الکتاب العربی، بیروت۔

[3] تفسیر ابن ابی حاتم، عبد الرحمٰن بن محمد الرازی، متوفی ۳۲۷ھ، حدیث ۱۹۲۸۶، جلد۱۰، صفحہ ۳۴۲۹، دار صادر، بیروت۔

[4] تفسیر ابن ابی حاتم، حدیث ۱۹۲۹۹، جلد۱۰، صفحہ ۳۴۳۱۔

[5] الدر المنثور، امام جلال الدین السیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جلد۵، صفحہ ۵۱۳، دار الفکر، بیروت۔

بِعَطَائِکَ ''(اے اللہ! میں تجھ سے نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں جو تیری ملاقات پر ایمان رکھتا ہو، جو تیرے فیصلہ پر راضی ہو اور تیری عطا پر قناعت کرے)۔[1]

۴) نَفْسِ مُلْهِمَةُ (الہام کرنے والا نفس)

صوفیاء کرامؒ نے نفس کی سات قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ علامہ آلوسیؒ نے سورۃ الفجر کی آخری آیات کے تحت اسی طرف اشارہ کیا ہے اور انہوں نے اس کی تحقیق کیلئے کتاب ''سیر السلوک'' کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔ یہ کتاب تو ہمیں دستیاب نہ ہو سکی تاہم یہ مکمل اقسام اختصار کے ساتھ شیخ احمد صاوی مالکیؒ نے بیان فرمائی ہیں۔ متذکرۃ الصدر (اوپر بیان ہونے والی) تین اقسام کے علاوہ دیگر چار قسمیں ملاحظہ فرمایئے۔

شیخ احمد صاوی مالکیؒ ''نفسِ مُلہمہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ نفس ہے جو فسق و فجور اور تقوی الہام کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا''[2] (پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیز گاری (کی تمیز) سمجھا دی)۔

۵) اَلنَّفْسُ الرَّاضِيَةُ

یہ وہ نفس ہے جو جمیع حالات میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے راضی رہتا ہے۔ یہ رضا اس وقت تک جب تک کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، دین اسلام کی حقانیت اور نبی کریم ﷺ کی عظمت اور رحمت پر اپنے نفس کو رضا کے درجے پر نہ لے آئے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے اقرار کیا ''رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا''۔[3]

۶) اَلنَّفْسُ الْمَرْضِيَّةُ

یہ وہ نفس ہے جسے مقامِ رضا پر فائز ہونے کی وجہ سے رضوانِ الٰہی سے نواز دیا جاتا ہے اس لیے کہ جو احکامِ الٰہی پر راضی ہو اس کی جزا رضا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے متعلق یوں فرمایا ہے کہ انسان خود اپنے انتہائی مراتب پر فائز ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی رضا کیلئے سوال کرتا ہے کہ بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے جیسا کہ آپ کے شعر سے واضح ہوتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

(ب ج:۳۴۷)

۷) اَلنَّفْسُ الْكَامِلَةُ

یہ گزشتہ تمام مراتب کا انتہائی اعلیٰ ترین رتبہ ہے۔ ''وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ''[4]

---

[1] المعجم الکبیر، حدیث ۷۴۹۰، جلد ۸، صفحہ ۹۹۔ [2] الشمس، ۸:۹۱۔ [3] صحیح بخاری، حدیث ۵۱۵، جلد ۱، صفحہ ۲۰۰۔ [4] المطففین، ۲۶:۸۳۔

(اس کیلئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے)۔ نفس راضیہ اور مرضیہ کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے اولیائے کرامؒ کے وہ واقعات ذہن میں لے آیئے کہ جب ایک ولی کو بتایا گیا کہ اُن کا بچہ انتقال کر گیا تو انہوں نے کہا الحمد للہ پھر دوسری اطلاع آئی کہ انتقال کی خبر غلط تھی بچہ زندہ ہے تب بھی انہوں نے کہا الحمد للہ، وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ دونوں حالتوں میں ہم نے اپنے دِل کو ٹٹولا تو ربّ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی پایا۔

نفس کے مزید مدارج

بعض علماء کرام نے نفس کے چند مزید مدارج بیان کیئے ہیں جن کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جارہا ہے۔

۱) اَلنَّفْسُ الدَّسَاسَةُ

یہ نفسِ معکوس (اُلٹے) اخلاق میں رنگ بدلتا رہتا ہے اور اس کی غذا گناہوں سے لذت حاصل کرنا ہے اور اس کی کیفیتوں اور شکلوں کی پہچان نہایت مشکل ہے۔ یہ انسان کو وہم وخیال میں غرق رکھتا ہے، فرمانِ الٰہی "وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" ۱؎ (اور بے شک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)، میں اسی طرف اشارہ ہے)۔ اس نفس والے شخص کی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس نفس کو ریاکار لوگوں، فاسقوں اور فاجروں کے میل ملاپ سے دور کر لے اور گناہوں کی لذت کی غذا کا دروازہ اس پر بند کر دے اور خواہشات کا دودھ اس سے چھڑا لے اور ذکرِ الٰہی کا دودھ اسے پلانا شروع کر دے یہاں تک کہ اپنی اصل فطرت پر لوٹ آئے اور مردہ صفت سے خلاصی پالے۔

۲) اَلنَّفْسُ الْمُشْتَرَاةُ

یہ محبوب کے ہاتھ پر فروخت شدہ نفس ہے۔ یہ نفس بشری ملکیت اور اس کے تصرف سے نکل کر سرمدی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ یہ وہ نفس ہے جس نے جہاد کیا تو اسے غنیمت حاصل ہوئی، پھر اس نے شہادت پائی تو اسے نعمت حاصل ہوئی، اس نے زُہد کی تلوار سے اپنے "قَرِيْنٌ مِّنَ الْجِنِّ" شیطان ساتھی کو ہلاک کر دیا اور اپنے سلطان جلّ جلالہ کے عہد کو قبول کر لیا۔ اس فرمانِ الٰہی "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" ۲؎ (بے شک اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال، ان کیلئے جنت کے عوض خرید لیے ہیں)۔ اس نفس والا شخص فتح و کامرانی، سیادت و قیادت میں امام ہوتا ہے کیونکہ اس نے حقیقی جمال کو پانے کی خاطر حسّی تعلقات کو خیر باد کہہ دیا ہے اس کی لذت کی تکمیل محبوبِ حقیقی کے

۱؎ الشمس:۹۱:۱۰ ۲؎ التوبہ:۹:۱۱۱۔

جلووں سے ہوگئی ہے اس کی سماعت اور بصارت کو ہر آن نئی مدد پہنچتی رہتی ہے۔

۳) اَلنَّفسُ السَّوَّالَۃُ

یعنی برائی کو مزین کر کے انسان کو تباہ کرنے والا، یہ نفس انسان کو فضائل وعبادت کے لباس میں آ کر گمراہ کرتا ہے۔ سامری کے قصے میں اسی طرف اشارہ ہے۔ سامری نے جو بچھڑا تراشا اور اس میں جبرائیل علیہ السلام کی سواری کے قدموں کی مٹی ڈالی تو وہ آواز دینے لگا اور قوم اس کی پوجا پر لگ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے سوال وجواب کیے تو وہ کہنے لگا ”وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ“ ۱؎ (اور اسی طرح میرے نفس نے مجھے (یہ بات) بھلی کر دکھائی)۔ غرض کہ یہ نفس شہد میں زہر ملا کر پلاتا ہے، عقل وقیاس کے قید خانہ میں جکڑے رکھتا ہے اور ایمان بالغیب سے روکے رکھتا ہے۔ عابدین اور زاہدین کو عجب ریا کاری کے جال میں پھنسائے رکھتا ہے، اس کا علاج کوئی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اسے اس کی تعظیم کرنے والوں کے سامنے رسوا وذلیل کیا جائے یہاں تک کہ یہ تواضع اور عاجزی کے ساتھ حق کو قبول کرے اور تمرد وانحراف کی عادت ترک کرے۔

۴) اَلنَّفسُ الزَّاكِيَۃُ

یہ اس شخص کا نفس ہے جس نے اپنے نفس کا مکمل تزکیہ کرلیا ہو۔ اس کی حقیقت کا آفتاب ہر وقت روشن رہتا ہے اور اس کی قبولیت کا ماہتاب (چاند) فطری سعادت کو پانے کیلئے خیر کے راستوں پر رواں دواں رہتا ہے۔ پس اس کا کلمہ (کلمہ طیبہ) اپنے معنوی ظہور کے ساتھ تام (مکمل) ہوتا ہے اور اس کی توحید کا دن اپنے مکمل اُجالے کے ساتھ شرک ومعصیّت کی صورتوں کو مٹا دیتا ہے۔ یہ اپنے رب کے ہاں سکون پاتا ہے اور اس پرکیف سکون کے سامنے دنیوی لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں، فرمانِ الٰہی ”قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا“ ۲؎ (بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کرلیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی)۔ اس نفس والے شخص کی بصیرت (قلب) کو الہام کی دولت سے نوازا جاتا ہے۔ یہ شخص ظاہر اور باطن میں ظاہر ہوتا ہے، مصوِرِ حقیقی جل جلالہ اس کیلئے تمام صورتوں سے حجاب ہٹا دیتا ہے تو اسے ہر صورت میں جلوۂ ذات نظر آتا ہے اور اس نفسِ زاکیہ کی برکات سے ایک جہاں مستفید ہوتا ہے۔

۵) اَلنَّفسُ الذَّاكِرَۃُ

یہ نفس بزبانِ حضورِ ذاتِ باری تعالیٰ کے اسمائے شریفہ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے، فرمانِ الٰہی ”وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً“ ۳؎ (اور اپنے رب کا اپنے دل میں ذکر کیا کرو عاجزی و

۱؎ طٰہٰ، ۲۰:۹۶۔ ۲؎ الشمس، ۹۱:۹۔ ۳؎ الاعراف، ۷:۲۰۵

زاری اور خوف و خستگی سے) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کبھی یہ نارِ خوف کی حرارت محسوس کرتا ہے اور کبھی اُمید کی گود میں راحت کے مزے لیتا ہے اور یہ جب کھلی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اسے مقامِ وسطیٰ (رجا اور خوف کے درمیان) پر رسائی حاصل ہوتی ہے، اس وقت اس پر عیاں ہوتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی چیز حرکت اور قوت نہیں رکھتی۔ یہاں پہنچنے کے بعد یہ تمام ترحیلے وغیرہ ترک کر دیتا ہے اور اس کی آواز اپنے مولا کے حضور پست ہو جاتی ہے اور یہ مقامِ تمکین پر فائز ہو جاتا ہے۔

۶) اَلنَّفْسُ الْمَمْلُوْکَۃُ

نفس کی یہ قسم اپنی اصل وضع میں قدرت کی طرف سے مملوک ہوتی ہے۔ عالمِ سماعت میں پرورش پاتی ہے اور اسے نفسِ علمیہ (سیکھا سکھایا نفس) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تلقی (تلقین) اور الہام کے جلووں میں تربیت پاتا ہے اور یہ تلقی اور الہام اسے ربِ ذُوالجَلَالِ وَالاِکْرَام کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر جب یہ اپنے شباب پر آتا ہے اور اصلی صورت حاصل کرتا ہے تو اس کے حامل، یعنی جس کے اندر یہ نفس موجود ہوتا ہے اسے وصل کے حجاب کے پیچھے سے ندا کی جاتی ہے "لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْفَصْلِ" (خوف نہ کر جدائی کے صدموں سے تجھے نجات مل گئی) اور جب اسے بلایا جائے تا کہ صراحتاً اُسے حضرتِ حق سے سماع کا شرف حاصل ہو اور ردی مشاغل سے آزاد ہو، پھر اُسے صدق و کیف کی پوشاک پہنا دی جاتی ہے اور اس پر واضح کر دیا جاتا ہے کہ جو کچھ تجھے آج تک پہنچا ہے وہ سب ہماری جانب سے ہے اور اس نفس کے حامل شخص کو کہا جاتا ہے کہ بیشک میں نے تجھے اپنے لیے چن لیا ہے سو جو میں تجھے عطا کروں اسے مضبوطی سے پکڑو، اس لیے کہ تم اپنی مراد سے نکل کر رب کی مراد پر راضی ہو گئے ہو۔ غرضیکہ اس نفس والے شخص کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا جاتا ہے جسے عمل و کوشش سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے "رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ" [1] (موسیٰ علیہ السلام نے) عرض کیا اے میرے رب! میں اپنی ذات کے سوا (کسی پر) اختیار نہیں رکھتا)۔ اس نفس والے شخص کا ہر دن عیش و عشرت میں رہتا ہے اور وہ ہر رات قرب میں ترقی کرتا ہے۔ اس کے تمام احوال قرب پر مبنی ہوتے ہیں، عاجزی اور تواضع اس کا سرمایہ ہوتا ہے اور قوتِ باہرۃ (دلائل کی قوت) میں یہ معروف ہوتا ہے۔

"اَلنَّفْسُ الْمَمْلُوْکَۃُ" کی تعریف میں روئے سخن مکمل طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں اس بحث سے کیا فائدہ ہوگا آیا صرف علم میں اضافہ کی صورت میں جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہی یا اس کے سوا فائدہ کی کوئی اور صورت بھی ہے؟ یقیناً یہ فائدہ بھی دِل کی تقویت کا باعث ہے اور یقیناً

---

[1] المائدہ، ۵:۲۵۔

حصولِ رحمت کا سبب بھی ہے۔ علاوہ ازیں امام نبھانیؒ نے کچھ اولیائے کرامؒ کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں، آٹھ افراد ایسے ہوئے ہیں جنہیں قوتِ الٰہیہ کے رجال کہا جاتا ہے۔ اسماءِ الٰہیہ سے انہیں وافر حصّہ نصیب ہوا ہے۔ یہ عظیم الشان قوت کے مالک ہوتے ہیں، معاملاتِ خداوندی میں کسی قسم کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے اور انہیں "رِجَالُ الْقَهْرِ" بھی کہا جاتا ہے۔ اِن کو لوگوں کے نفوس پر توجہ ڈالنے کیلئے نہایت قوی ہمت حاصل ہوتی ہے اور یہی ہمت اُن کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ فارس میں ان میں سے ایک شخص کو پایا گیا جسے ابو عبداللہ الدقاق کہا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے ہم نے کبھی کسی شخص کی غیبت نہیں کی اور نہ ہمارے رُوبرو کسی شخص کو کسی کی غیبت کرنے کی جرأت ہوئی۔

ان کے علاوہ پانچ افراد اولیائے کرامؒ کی جماعت میں اور ہوتے ہیں اور ہر زمانے میں ان کی تعداد پانچ ہی رہتی ہے، کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ قوت کے لحاظ سے متذکرہ بالا آٹھ افراد کی طرح ہوتے ہیں، البتہ ان میں نرمی بھی ہوتی ہے جو مذکورہ آٹھ افراد میں نہیں ہوتی، سو اس لحاظ سے یہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے قدموں پر ہوتے ہیں۔ ان کی نرمی کی دلیل یہ آیت ہے "فَقُوْلَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا"[1] (سو تم دونوں اس سے نرم (انداز میں) گفتگو کرنا)۔ اور یہ آیت بھی "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ"[2] ((اے حبیبِ والا صفات!) پس اللہ کی کیسی رحمت ہے کہ آپ ان کیلئے نرم طبع ہیں)۔

پس یہ حضرات قوت کے باوجود بعض مقامات پر نرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ البتہ عزیمت کے مقامات پر یہ مذکورہ آٹھ افراد کی طرح سخت ہوتے ہیں اور کبھی ان سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ جامع کراماتِ اولیاء میں منقول ہے کہ حضرت شیخ اکبر سیدی محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے ان میں سے بعض حضرات سے ملاقات کی ہے اور ان سے مستفید ہوئے ہیں۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ ان اولیائے کرامؒ میں سے بعض حضرات، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قدم پر بھی ہوتے ہیں جن میں صلابت (سختی)، عزیمت اور قوت بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے اور نرمی اور تواضع بھی موجود ہوتی ہے۔

۷) اَلنَّفْسُ الْعِلْمِيَّةُ

یہ نفس کمالات کا مرکز، تفصیل و اجمالات کی کتاب، عرش پر جلوہ فگن معانیٔ لاھوتیہ کا صحیفہ اور کلماتِ ناسوتیہ کا منبع ہے۔ یہی وہ نفس ہے جس نے نسب اور اضافتوں کی ردائیں اوڑھ رکھی ہیں اور صفاتِ عُلیا کی

---

[1] طٰہٰ، ۲۰:۴۴۔ [2] آل عمران، ۳:۱۵۹۔ [3] جامع کراماتِ اولیاء، جلد ۱، صفحہ ۶۳۔

خلعت پہن رکھی ہے۔ ان خلعتوں اور رداؤں کے حجاب کے پیچھے حضرت الذات مستور ہے۔ پس اس نفس پر نورِ وحدت کے پردے ہیں تا کہ اغیار کی آنکھیں اس تک رسائی حاصل نہ کرسکیں۔ ایسے نفس والا شخص ہر زمانے میں صرف ایک ہوتا ہے۔ تمام موجودات کا سبب اور کون و مکان کی روح یہی نفس مبارکہ ہے اور رحمٰن جل شانہ کے بیان کا مبلغ یہی ہے۔

علامہ زبیدیؒ نے "اَلنَّفْسُ الْعِلْمِيَّة" کی تعریف میں سیدِ عالم ﷺ کے نفس مبارکہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ بات یقیناً حق ہے کہ اس نفس کی حقیقت کسی شخص پر آشکار انہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ نفس سے مراد اگر روح ہو تو یہ روح تمام مخلوق سے پہلے موجود تھی اور علمائے کرامؒ مثلاً امام سبکی، امام ابنِ رجب حنبلی، امام سیوطی اور امام قسطلانیؒ وغیرہم نے لکھا ہے کہ "كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" (میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے)[1] میں حضور ﷺ کی روح کی طرف اشارہ ہے یا آپ ﷺ کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور حقائق کی معرفت سے ہماری عقلیں قاصر ہیں۔

اور متعدد علمائے حق نے کہا ہے کہ آپ ﷺ اُسی وقت سے چونکہ نبی ہیں لہٰذا قرآن کریم کے امین اور اس کے عالم بھی آپ ﷺ اُسی وقت سے ہیں اس لیے کہ نبی کیلئے اس شریعت کا عارف ہونا ضروری ہے جو اس کیلئے مقرر کی گئی ہو۔ سو جب آپ ﷺ تخلیقِ آدم علیہ السلام سے قبل نبی تھے تو لامحالہ اپنی شریعت سے بھی باخبر تھے اور چونکہ آپ ﷺ کی شریعت کا دارو مدار قرآن کریم پر ہے لہٰذا آپ ﷺ اسی وقت سے حاملِ قرآن کریم ہیں۔ پھر سوچئے کہ افرادِ اُمت قرآن کریم کے ذریعے تزکیۂ نفس کر کے نفسِ امارہ، پھر نفسِ لوامہ اور آخر نفسِ مطمئنہ کے درجے پر فائز ہوتے ہیں اور جس ذاتِ اقدس کی روح یا اس کی حقیقت کا عالمِ انسانیت کے وجود میں آنے سے بھی پہلے قرآن سے تعلق ہو اس کے نفس کی حقیقت کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

اور اگر عالمِ شہود (دنیا) میں تشریف لانے کے بعد دیکھا جائے تو کتبِ سیرت میں مذکور ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کا بچپن میں شقِ صدر کیا گیا تو اس وقت ملائکہ نے کہا تھا "لِسَانُكَ صَادِقٌ وَّ نَفْسُكَ مُطْمَئِنَّةٌ"[2] (آپ ﷺ کی زبان صادق اور آپ ﷺ کا نفس مطمئنہ ہے)۔ سو جس ہستی کا نفسِ مبارکہ اس وقت بھی مقامِ مطمئنہ پر فائز تھا تو بعد میں اس نفس نے کس قدر ترقی فرمائی ہوگی؟ یہ وہ عقدہ ہے جو نہ کسی پر منکشف ہوا اور نہ ہوگا، البتہ اتنی بات سمجھی جاسکتی ہے کہ یہی وہ نفس ہے جسے قرآن کریم میں

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۶۵۵۳، جلد ۷، صفحہ ۳۲۹۔

[2] سنن الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، حدیث ۵۳، جلد ۱، صفحہ ۴۲، دار الکتب العربی، بیروت۔

دوسرے نفوس کیلئے مُزکّی یعنی تزکیہ کرنے والا بتایا گیا۔ اسی لیے ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ "صَلُّوا عَلَیَّ فَاِنَّ الصَّلَاۃَ عَلَیَّ زَکَاۃٌ لَّکُمْ" (مجھ پر درود بھیجا کرو بیشک مجھ پر تمہارا درود بھیجنا تمہارے لیے طہارت ہے)۔[1]

مطلب یہ ہے کہ درود پڑھ کر مجھ سے تعلق استوار کرو کیونکہ جس کا جتنا میرے ساتھ رابطہ ہوگا اسے اتنا ہی تزکیۂ نفس حاصل ہوگا اور چونکہ تزکیہ صرف مؤمنین ہی کا ہوتا ہے اسی لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ"[2] (نبی کریم ﷺ مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں)۔ لہٰذا یہ بات طے پا گئی کہ مدارجِ نفس میں کوئی شخص ترقی حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ اُس کا ذاتِ مصطفےٰ ﷺ سے قلبی اور روحی رابطہ نہ ہو جائے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۸۷۰۴، جلد ۲، صفحہ ۲۵۳۔
[2] الاحزاب، ۳۳:۶۔

باب نمبر ۷

روح پر اثراتِ نفس

روح، قلب اور عقل پر اچھی خاصی تحریریں ہماری دیگر کتب (مثلاً حضورِ قلب، اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ، عقل و عشق اور علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی) میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اس جگہ نفس پر مرتب ہونے والے اثرات کے ضمن میں قلب، روح اور عقل کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

روح پر نفس کے اثرات

روح کیا ہے؟ اس بارے میں بنی نوع انسان میں بڑا اختلاف ہے اور یہ اختلاف بہت قدیم ہے حتیٰ کہ اس معرکۃ الآراء مسئلہ میں قبل از نزولِ قرآن کریم بھی سلسلۂ بحث گرم تھا چنانچہ عالمِ ما کان و ما یکون سید الانبیاء ﷺ کی بارگاہ میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا جس کی تفصیل سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۵ کے تحت تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قرآنِ کریم کے اس مثبت جواب کے بعد یہ بحث کافی حد تک سرد پڑ گئی حتیٰ کہ امتِ مسلمہ کے بڑے بڑے اہلِ عقل اس مسئلہ پر بحث کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں مثلاً حجۃ الاسلام، فیلسوفِ انام ابو حامد امام غزالیؒ لکھتے ہیں ''اِنَّ تَحْقِیْقَهٗ یَسْتَدْعِیْ اِفْشَاءَ سِرِّ الرُّوْحِ وَذٰلِکَ مِمَّا لَمْ یَتَکَلَّمْ فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَیْسَ لِغَیْرِهٖ اَنْ یَّتَکَلَّمَ فِیْهِ'' [۱] اس کی (زیادہ) تحقیق روح کے سربستہ راز

---

[۱] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۴۔

کو افشاء کرنے کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ مسئلہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے کلام نہیں فرمایا، پھر کسی دوسرے شخص کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اس میں کلام کرے)۔

غور کیجئے امام غزالیؒ نے یہ نہیں کہا کہ حضور اس مسئلہ کو نہیں جانتے تھے بلکہ یوں کہا کہ آپ ﷺ نے اس میں کلام نہیں فرمایا، یہ امام غزالیؒ کا ادب ہے۔ آج کے کچھ منہ پھٹ مُلّاں تو فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضور ﷺ اس مسئلہ کو جانتے ہی نہ تھے۔ ''اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی'' بہر حال ہمیں یہاں یہ بحث نہیں کرنی کہ حضور ﷺ روح کی حقیقت جانتے تھے یا نہیں کیونکہ ہم بغیر کسی بحث وتکرار کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سید الکونین ﷺ کو آپ کے رب نے ہر اس بات کا علم دے دیا ہے جسے آپ نہیں جانتے تھے، تاہم اگر قارئینِ کرام کو اس سلسلے میں زیادہ تفصیل درکار ہو تو تفسیر ضیاء القرآن جلد دوم اور تفسیر نعیمی جلد پندرہ کا مطالعہ فرمائیں۔

ہر چند کہ اُمت پر یہ سربستہ راز کما حقہ واضح نہیں کیا گیا مگر ''وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا'' [1] (اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے)۔ یہ خطاب اگر تمام بنی نوع انسان سے ہے تب بھی اس سے اتنا ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ علم تو دیا گیا ہے اور اگر یہ خطاب یہود سے ہے تو یقیناً اہلِ اسلام یہود سے بہت زیادہ عقلمند اور زیادہ اہلِ علم ہیں کیونکہ یہ صاحبِ قرآن ہیں۔ سو اہل اسلام علمائے کرامؒ نے روح کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ہیں ان کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

روح کے لغوی معنٰی

امام راغب اصفہانیؒ روح کے لغوی معنٰی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''رَوْح'' اور ''رُوْح'' دراصل ایک ہی ہیں۔ روح کا اطلاق سانس پر بھی ہوتا ہے کیونکہ سانس روح کا ایک جزو ہے، اور روح کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے زندگی، حرکت، منافع کا حصول اور مضرات (ضرر رساں چیزیں) سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے ''وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ'' [2] (اور یہ (کفار) آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، فرما دیجیے: روح میرے رب کے امر سے ہے)۔

''وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ'' [3] (اور اس پیکر (بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی) روح پھونک دوں)۔ اِن دونوں آیتوں میں روح اسی معنٰی میں مستعمل ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافتِ مِلکیہ کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ''اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۝'' [4] (کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں

---

[1] اسراء ۱۷:۸۵۔ [2] اسراء ۱۷:۵۔ [3] الحجر ۱۵:۲۹۔ [4] البقرۃ ۲:۱۲۵۔

اوراعتکاف کرے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کیلئے پاک (صاف) کردو) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف اعزازی ہے۔[1]

امام ابن منظورؒ اور علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں ''ر کے پیش کے ساتھ ''رُوح'' کا معنٰی نفس ہے اور آیت کریمہ ''وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوْحِ'' میں روح کی تاویل یہ ہے کہ روح وہ امرِ ربی ہے جس سے نفوس کی حیات قائم ہے اور امام فراء نے کہا ہے کہ روح وہ قوت ہے جس سے انسان کی حیات قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے کسی کو اس کی حقیقت کی خبر نہیں دی اور میں نے ابوالہیثم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ روح وہ ہے جس کے ذریعے انسان سانس لیتا ہے اور یہ پورے جسم میں جاری وساری ہوتی ہے پھر جب یہ نکلتی ہے تو انسان سانس نہیں لے سکتا اور جب مکمل طور پر جسم سے خارج ہو جائے تو انسان کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں یہاں تک کہ انہیں بند کرنا پڑتا ہے۔ فارسی میں اسے جان کہتے ہیں۔[2]

لفظِ روح کے مختلف اطلاقات

قرآن حکیم میں لفظ روح کا اطلاق چھ چیزوں پر کیا گیا ہے:

۱۔ قرآنِ مجید	۲۔ وحی	۳۔ امرِ الٰہی
۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۵۔ جبرائیل علیہ السلام	۶۔ النفخ

اس کی تفصیل یوں ہے:

۱) ''وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا'' [3] (سو اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قلوب وارواح) کی وحی فرمائی)۔

۲) ''يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ'' [4] (وہی فرشتوں کو وحی کے ساتھ کے ساتھ نازل کرتا ہے (جو جملہ تعلیماتِ دین کی روح اور جان ہے) اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے)۔

۳) ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ'' [5] (انہیں بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے)۔

۴) ''اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ'' [6] (حقیقت صرف یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جسے اس نے مریمؑ کی طرف

---

[1] مفردات القرآن، جلد۱، صفحہ ۵۹۵۔ [2] تاج العروس، جلد ۶، صفحہ ۴۰۷۔

[3] الشوریٰ، ۴۲:۵۲۔ [4] الشعراء، ۲۶:۱۹۲۔

[5] آل عمران، ۳:۴۹۔ [6] النساء، ۴:۱۷۱۔

پہنچادیا اور اس (کی طرف) سے ایک روح ہے)۔

۵) ”نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ“[1] (اسے روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) لے کر اترا ہے)۔

۶) قرآنِ مجید میں جہاں بھی نفخِ روح کا ذکر ہے وہاں روح بمعنی ”ریح“ ہے کیونکہ ”ریح“ ہوا کو کہتے ہیں اور ہوا کو ”ریح“ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ روح سے پیدا ہوتی ہے اور یہ ہوا جب کسی خاص چیز میں داخل کی جائے تو اس عمل کو پھونکنا کہتے ہیں۔قرآنِ حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول منقول ہے ”اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ“[2] (میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پتلا) بناتا ہوں پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے)۔”نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ، فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا“ دونوں آیات میں یہی معنی مراد ہیں جیسا کہ علامہ زبیدیؒ وغیرہ نے لکھا ہے۔[3]

قرآن اور وحی کو روح کہنے کی وجہ

جس طرح بدن کی حیات کیلئے روح ہے اسی طرح روح کی حیات کیلئے وحی ہے۔قرآن حکیم میں کافر کو میّت (مردہ) اور مومن کو حی (زندہ) کہا گیا ہے ”اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ“[4] (بھلا وہ شخص جو مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کیلئے نور پیدا فرما دیا وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں چلتا ہے)۔صدر الافاضل مفتی نعیم الدین مراد آبادیؒ لکھتے ہیں ”مردہ سے کافر اور زندہ سے مومن مراد ہے کیونکہ کفر قلوب کیلئے موت ہے اور ایمان حیات ہے۔[5]

اکثر مفسرینِ کرامؒ نے سورۃ الشوریٰ کی آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں قرآنِ کریم کو روح کہا گیا ہے کیونکہ جس طرح روح جسم کو زندہ کرتی ہے اسی طرح قرآنِ حکیم دلوں کو دائمی زندگی عطا کرتا ہے اور جہالت و کفر کی موت سے نجات بخشتا ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں ”روح سے وحی مراد ہے۔جس طرح روح سے ہر چیز کی زندگی ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ وحیِ الٰہی حیات بخش ہے۔زندہ ہونے کو تو لوگ نزولِ قرآن سے پہلے بھی زندہ تھے لیکن اس روحِ پاک کے نزول کے بعد حجاز کے صحراؤں میں جس حسین و جمیل زندگی کے چمنستان آباد ہوئے اس سے تو دنیا کی نگاہیں آشنا نہ تھیں۔[6]

علامہ زبیدیؒ نے کہا ہے کہ قرآن، وحی اور امرِ الٰہی کو روح اس لیے کہا گیا ہے ”لِاَنَّهٗ حَيَاةٌ مِنَ

---

[1] الشعراء:۱۹۳۔ [2] آل عمران:۴۹۔ [3] تاج العروس، جلد ۷، صفحہ ۳۶۰۔ [4] الانعام،۶:۱۲۲۔
[5] خزائن القرآن، نعیم الدین مراد آبادی، صفحہ ۱۸۵، قدرت اللہ کمپنی، لاہور۔ [6] ضیاء القرآن جلد ۴، صفحہ ۵۵۶۔

مَوْتِ الْکُفْرِ“ (کیونکہ یہ کفر کی موت سے حیات ہے)۔[1]

روح کو امرِ ربی کہنے کی وجہ

ہر ایک چیز رب تعالیٰ کے امر سے وجود میں آئی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ”اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ“ [2] (اس کا امر (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہوجا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے (اور ہوتی چلی جاتی ہے)۔ پھر جب تک اللہ کا حکم ہوتا ہے وہ چیز اپنے وجود کے ساتھ قائم رہتی ہے ورنہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا ط“ [3] (ہر سماوی کائنات میں اس کا نظام ودیعت کر دیا)۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر چیز کی طرف رب تعالیٰ کی جو توجہ ہے وہی اس کا امر ہے اور یہی امر ہر چیز کی بقا کیلئے روح ہے۔ اگر روح کی توجہ نہ ہو تو کوئی چیز باقی نہ رہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط“ [4] (اللہ، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند)۔ کسی بیدار شخص کے ہاتھ پر پانی سے بھرا ایک گلاس موجود ہو اور اُسے اونگھ یا نیند آ جائے تو وہ گلاس گر جائے گا آپ خود سوچیئے جس ذاتِ اقدس نے کائنات کو اپنی توجہ سے برقرار رکھا ہوا ہے اسے اگر اُونگھ اور نیند آ جائے تو کائنات کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ ”اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ“ [5] (اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے)۔

مذکورہ بالا آیت میں ”اَرَادَ“ سے اس کی توجہ مراد ہے اور ”کُنْ“ سے اس کا امر مراد ہے۔ خالقِ کائنات نے کسی بھی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو امرِ ”کُنْ“ سے اسے وجود بخش دیا پھر اُس توجہ کو اُس نے برقرار رکھا تو چیز کا وجود قائم رہا، سو اللہ سبحانہ کے اسی ارادے اور امر و توجہ کا نام روح ہے اور اسی کے باعث کائناتِ پست و بالا کا وجود قائم ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ہ“ [6] (اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، حکم اسی کا ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

---

[1] تاج العروس، جلد ۶ صفحہ ۳۰۹۔
[2] یٰسین، ۳۶:۸۲۔
[3] حم السجدہ، ۴۱:۱۲۔
[4] البقرہ، ۲:۲۵۵۔
[5] یٰسین، ۳۶:۸۲۔
[6] القصص، ۲۸:۸۸۔

حضرت عیسیٰ و حضرت جبرائیل ؑ کو روح کہنے کی توجیہ

روح سے ہر چیز کی زندگی ہے اور اسی سے ہر چیز حرکت پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ؑ کو اپنی طرف کی روح فرمایا تو اُن کے روح اللہ ہونے کا یہ عالم تھا کہ وہ مٹی سے بنی ہوئی بے جان مورتیوں میں پھونک دیتے تو اُن میں جان آجاتی اور وہ پرندہ بن کر اڑنے لگتیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۴۹ اور سورۂ المائدۃ آیت ۱۱۰ میں صراحتاً اس حقیقت کا ذکر ہے اور حضرت جبرائیل ؑ کو روح القدس اور روح الامین اس لیے کہا گیا کہ آپ امینِ وحی تھے اور وحی سے دلوں کو حیاتِ جاوداں عطا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کو روح کہنے کی وجہ تسمیہ میں آپ نے پڑھا۔ نیز حضرت جبرائیل ؑ اس قدر سراپا روح ہیں کہ آپ جس گھوڑی پر سوار تھے وہ جہاں قدم رکھتی وہاں فوراً سبزہ اُگ آتا۔ سامری ملعون نے جو بچھڑا تراشا تھا اُس میں اُسی گھوڑی کے قدموں کی مٹی ڈالی تھی تو وہ آواز نکالنے لگ گیا تھا۔

اہلُ اللہ سراپا روح ہو جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے وحی اور قرآن پاک کو روح فرمایا، یہی وجہ ہے کہ جس طرح صاحب قرآن ﷺ کے جسمِ اقدس کے ساتھ تمسک کرنے والی اشیاء میں زندگی آجاتی تھی جیسا کہ اُستنِ حنانہ (کھجور کا خشک تنا) رونے لگ گیا تھا[1] اور پتھر کلمہ پڑھنے لگے، پہاڑ وجد کرنے لگے۔ اسی طرح اولیاءِ امت قرآن وسنت (کہ یہ دونوں وحی اور روح ہیں) پر عمل پیرا ہو کر سراپا روح بن جاتے ہیں تو جہاں یہ بیٹھتے ہیں وہاں کی تمام اشیاء میں زندگی آجاتی ہے اور جس بے جان چیز کی طرف ان کی توجہ ہو جائے اس میں جان آجاتی ہے اور مردے ان کی توجہ سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کی تائید حسب ذیل واقعات سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامت

اس سلسلے میں حسب ذیل کرامت کو بغور پڑھیے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ۔

''بغداد میں کھجور کے دو درخت تھے جو ایک عرصہ سے خشک ہو گئے تھے اور ان پر چار سال سے میوہ نہیں لگا تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک درخت کے پاس وضو فرمایا اور دوسرے درخت کے پاس نماز ادا کی دونوں سرسبز وشاداب ہو گئے اور ان پر پھل آنے لگا۔

ایک اور کرامت

مردے زندہ کرنے کی بے شمار کرامتیں منقول ہیں، حافظ ابن کثیر نے ''اَلْبِدَایَۃُ وَالنِّھَایَۃُ'' میں

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۵۰۵، جلد۲، صفحہ ۳۷۹۔

ایسی کرامات بکثرت ذکر کی ہیں لیکن ہمارا مقصود یہاں کرامات کا اندراج نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اہل اللہ کے اندر روحِ قرآن اور روحِ سنت جب سرایت کر جاتی ہے تو وہ سراپا حیات ہو جاتے ہیں اور اُن سے بے جان اشیاء زندگی پا جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ لکھتے ہیں ''ایک دفعہ ایک عورت حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ عرض کرنے لگی، یا حضرت! اس بچے کو آپ کی تربیت میں دیتی ہوں، آپ نے اس بچے کو قبول فرمالیا اور اسے مجاہدہ وریاضت میں مشغول کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے اس کی ماں ملنے آئی اور اس نے دیکھا کہ شیخ تو بُھنا ہوا مرغ تناول فرمارہے ہیں جبکہ اس کا بیٹا نہایت کمزور، نحیف ونزار ایک کونے میں بیٹھا جو کی روٹی کھا رہا ہے۔ وہ مرغ کی ہڈیوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی حضرت! آپ مرغ کھاتے ہیں اور میرا بیٹا نانِ جویں پر گزارا کر رہا ہے۔ آپ نے یہ بات سنتے ہی مرغ کی ہڈیوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ زندہ ہو گیا اور بانگ دینے لگا۔ پھر آپ ؒ نے فرمایا جب تیرا بیٹا ایسا ہو جائے تو وہ جو چاہے کھاتا رہے۔ اس واقعہ میں جو فائدہ ہے اس کی طرف اوپر اشارہ کر دیا گیا ہے۔

روحِ انسانی

لفظِ روح اور اس کے مختلف معانی پر گفتگو کرنے کے بعد آیئے روحِ انسانی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

علامہ میر سید شریف جرجانی ؒ لکھتے ہیں، روحِ انسانی انسان کے اندر وہ لطیفہ ہے جو علم اور ادراک رکھنے والا ہے اور روحِ حیوانی پر سواری کرتا ہے۔ یہ عالمِ امر سے نازل ہوا ہے تمام عقلیں اس کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہیں اور یہی وہ روح ہے جو کبھی مجرد (تنہا) ہوتی ہے اور کبھی بدن کے ساتھ مرکب (ملی ہوئی) ہوتی ہے۔[1]

امام غزالی ؒ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔[2]

پیدائش سے پہلے انسان معدوم تھا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے '' هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ''[3]

(بے شک انسان پر زمانے کا ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا)۔ یہاں ھل استفہام کیلئے نہیں بلکہ بمعنی قد ہے۔ یعنی ضرور انسان پر ایک ایسا وقت گزرا ہے جبکہ یہ قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔

دہر کی تعریف: '' اَلدَّهْرُ فِي الْاَصْلِ اِسْمٌ لِمُدَّةِ الْعَالَمِ مِنْ مَّبْدَءِ وُجُوْدِهٖ اِلٰى اِنْقِضَائِهٖ ''[4] وجودِ عالم کی ابتدا سے لیکر انتہا تک کے عرصہ کو دہر کہتے ہیں ان الفاظ کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب آیت کا معنیٰ سمجھیے۔

---

[1] التعریفات، صفحہ ۸۲۔　[2] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۴۔　[3] الدھر، ۷۶: ۱۔　[4] المفردات، جلد ۱، صفحہ ۱۷۳۔

ارشاد ہے دنیا کی لمبی عمر میں ایک وقت ہر شخص پر ایسا گزرا ہے کہ جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے تو یہ ویسے ہی معدوم تھا تو اس کے ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب رحمِ مادر میں اس نے قرار پکڑا تب بھی کسی کو کیا خبر تھی کہ اس صدف میں کس نوعیت، کس آب و تاب اور کس قدر و قیمت کا موتی پرورش پا رہا ہے اور جب وہ پیدا ہوا تو کمزور سا بچہ نہ چل سکے نہ بول سکے۔ بہر حال ہر شخص پر کوئی نہ کوئی ایسا دور گزر چکا ہے جب کہ یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ آج اگر وہ شہریار و تاجدار بن گیا ہے، آج اگر وہ لشکر جرار کا سپہ سالار ہے، آج اگر دولت و ثروت کے انبار اس کے قدموں میں لگے ہیں تو اس کو مغرور ہو کر اپنے پروردگار کو فراموش نہیں کر دینا چاہیے بلکہ ہر لحظہ اپنی اصلیت پر نگاہ رکھنی چاہیے۔

علامہ اقبالؒ اور روح

اللہ رب العزت نے روح کو امرِ ربی کہا ہے اس کے بارے میں دنیا کے بہت سارے مفسروں، مفکروں اور محدثوں نے لکھا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں روح کے دو معنٰی ہیں (۱) روحِ طبعی جو ایک قسم کا بخار ہے جس کا منبع تجویفِ قلب کا سیاہ خون ہے۔ وہاں سے وہ رگوں کے ذریعہ سارے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ گویا یہ گھر کا چراغ ہے کیونکہ اسی سے سارے گھر میں روشنی پھیلتی ہے۔ اطباء اسی پر روح کا اطلاق کرتے ہیں۔ (۲) روح وہ ایک لطیفۂ ربانی ہے جو دراصل حقیقتِ قلب ہے روح اور قلب دونوں اس لطیفے سے منسلک ہیں۔ زیادہ دلچسپ اور ترقی پسندانہ خیال امام قشیریؒ نے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روح کے معنٰی نفسِ حیات کے بھی ہیں یعنی روح کسی انا کا نام نہیں بلکہ ایک طرح کی لطیف قوت سے تعبیر ہے علامہ اقبالؒ کے نزدیک بھی روح کے یہی معنٰی ہیں آپؒ نے اس موضوع پر زیادہ بحث تو نہیں کی ہے لیکن آپؒ کے اشعار روح کی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے کافی ہیں۔

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی — روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے؟
میری مشکل مستی و شور و سرور و درد و داغ — تیری مشکل مے سے؟ ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے!
ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن — جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے!

(ض،ک:۵۱۷)

علامہ اقبالؒ مزید فرماتے ہیں مسلمان تیرے جسم میں روح یعنی جان نہیں ہے تو کمزور اور ڈرپوک ہے اس لیے خدا تیری فریاد نہیں سنتا اللہ جل جلالہٗ ان لوگوں سے بیزار ہے جو کمزور ہیں اور جن کے جسم بے جان ہیں خدا خود زندہ ہے اس لیے وہ زندہ اور جاندار لوگوں کو عزیز رکھتا ہے تم اگر خدا سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے جسم میں جان پیدا کر داور دنیا میں سعی اور کوشش کرو تا کہ خدا اس میں برکت ڈالے۔

تیرا تن روح سے نا آشنا ہے عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے
(ب ج:۳۸۲)

اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ نے روح کے متعلق بہت سارے اشعار دنیا والوں کیلئے پیش کئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
(ب ج:۳۹۹)

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں بے پردہ روحِ قرآنی
(ب ج:۴۹۳)

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں وجودِ حضرتِ انساں، نہ روح ہے، نہ بدن!
(ض ک:۵۱۹)

اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام
(ا ح:۶۷۷)

علامہ اقبالؒ اپنے فارسی کلام میں فرماتے ہیں کہ روح ایک ایسی چیز ہے جسکا تعلق اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے ساتھ زندہ و پائندہ رہتا ہے اگر یہ تعلق کسی وجہ سے کٹ جائے تو پھر وہ مردہ ہو جاتی ہے یعنی اس میں زندگی کی رمق باقی نہیں رہتی۔

روح باحق زندہ و پائندہ ایست ورنہ ایں را مردہ آں را زندہ ایست

(روح، اللہ تعالی کے ساتھ تعلق کی وجہ سے زندہ و پائندہ ہے، اگر یہ تعلق نہ رہے تو پھر وہی ایک اعتبار سے زندہ ہے اور دوسرے اعتبار سے مردہ ہے) (ز ع:۱۹۱)

علامہ اقبالؒ مزید فرماتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ جس کا کام زمانے کے باطل اثرات کو مٹانا ہے اس کے ضمیر کے اندر دین و وطن کی کشمکش دیکھتا ہوں ایمان کی کمزوری سے مسلمان کے بدن میں روح مر چکی ہے اس لیے وہ دینِ مبین کی قوت سے ناامید ہے۔

در ضمیر ملت گیتی شکن دیدہ ام آویزشِ دین و وطن

(ملت اسلامیہ جس کا کام زمانے کے باطل اثرات کو مٹانا ہے اس کے ضمیر کے اندر دین و وطن کی کشمکش دیکھتا ہوں)

روح در تــنِ مــردہ از ضـعفِ یـقیـن نــــاامیــد از قــوتِ دیــنِ مُبیــن
(ج ن:۶۲)

(ایمان کی کمزوری سے مسلمان کے بدن میں روح مر چکی ہے اس لیے وہ دینِ مبین کی قوت سے ناامید ہے)

سّرِحق بــر مــردِ حق پوشیدہ نیست روحِ مومن هیچ میدانی که چیست؟

(مردِ حق سے رازِ حق پوشیدہ نہیں کیا تو جانتا ہے کہ روحِ مومن کیا ہے؟) (پ چ:۹)

قطـرۂ شبـنـم کـه از ذوقِ نمود عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

(وہ ایسا قطرۂ شبنم ہے جو اظہارِ ذات کے شوق میں اپنی مشکل اپنے ہاتھ سے حل کرتا ہے)

از خـودی انـدر ضـمیرِ خود نشست رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست

(وہ تحفظِ ذات کی خاطر اپنے ضمیر کے اندر رہتا ہے جو افلاک کی خلوت سے سفر اختیار کرتا ہے)

رُخ سـوئـے دریـائـے بے پـایاں نکرد خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

(جو بحرِ بے پایاں کی طرف رخ نہیں کرتا اپنے آپ کو سیپ میں پوشیدہ کرتا ہے)

انــدر آغـوشِ سحــر یک دم تپید تـا بـکـامِ غـنـچـۂ نورس چـکید

(بلکہ وہ صبح کی آغوش میں ایک لحہ کیلئے چمک کر اپنے آپ کو نومیدہ غنچہ کے منہ میں ٹپکا دیتا ہے)

اقبال کا فلسفۂ تخلیق

علامہ اقبالؒ نے انسان میں پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں پر بہت طویل اور قابلِ ذکر کلام کیا ہے۔ جسکا مکمل تذکرہ اس محدود تحریر کے احاطہ سے باہر ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے ارد گرد ہی گھومتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ علامہؒ کے فلسفۂ خودی کی غرض و غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ انسان اپنے اندر اللہ تعالی کی ودیعت کردہ خوابیدہ صلاحیتوں کی شناخت کر کے انہیں اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بروئے کار لائے آپؒ کی شاعری کا واحد نصب العین بھی یہی تھا کہ مسلمان قوانینِ الٰہی کا مطالعہ کریں اور آئینِ خداوندی پر عمل پیرا ہو کر اپنی مخفی طاقتوں کو اس طرح ابھار سکیں کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کر لیں علامہ اقبالؒ کے نظریہ تخلیق کے مطابق انسان کی تخلیقی فعلیت (تخلیقی کام کرنے کی استطاعت) نہ صرف اس کے اپنے وجود کے اثبات، اپنی کلی ذات کی تکمیل اور شعور کی پختگی کیلئے ضروری ہے، بلکہ تخلیق ایک ایسا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی قابلیت اور ہنر کا معائنہ بھی کر سکتا ہے اس کے علاوہ انسان تخلیق کے ذریعے اپنے اس خالقِ حقیقی کی ہدایت پر عمل پیرا بھی ہوتا ہے جس طرح کبھی انسان کو حکمِ عدولی کی سزا میں جنت سے نکالا تھا۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس تخلیقی لذت کو کام میں لانے کے احکام موجود ہیں جب کہ

ایک حدیث شریف میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ '' مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ''[1] (جس نے اپنے آپ کو (اور اپنی صلاحیتوں) کو پہچانا، گویا اس نے خدا کو پہچان لیا)۔

فطرت پر انسانی روح کو برتری حاصل ہے اور انسان فطرت کی مہمات سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی ایسی قوت حاصل کرتا ہے جو اُسے تمام دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے قابل بنا دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور صحت کا انحصار نفس اور فطرت کی مہمات کے خلاف مزاحمت کرنے پر ہے اور اس کی یہ صلاحیت انسان کے پاس جو کچھ '' ہے '' کے مقابلے میں جو کچھ '' ہونا چاہیے '' کی تخلیق کرتی ہے۔ اگر یہ عملِ تخلیق قائم نہ رہے تو انسان پر انحطاط طاری ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ خدا اور انسان دونوں ہی تخلیقِ مسلسل سے موصوف ہیں۔ اس طرح انسان خدا کا ہم نفس بن جاتا ہے اور اپنی روح میں زمان و مکاں کی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ (انسان کے اپنے اندر بھی پوری کائنات مخفی ہے) علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فطرت کی حیثیت تو '' ہے '' کی مانند ہے اور اس کی کارکردگی '' ہونا چاہیے '' کی راہ میں ہماری کوششوں کے خلاف روڑے اٹکاتا ہے۔ لیکن فنکار تو اس راہ کی مخالفتوں کے خلاف راہ ہموار کرتا ہے اور یہ عشق و محبت کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

از محبت گشت ظاهر هر چه هست　　　وز محبت می نماید نیست هست

(محبت سے جو چیز مخفی ہو ظاہر ہو جاتی ہے، اور محبت سے نیست (نہ ہونا) ہونا بن جاتا ہے)

علامہؒ کے نزدیک فنونِ عمارت، موسیقی، مصوری حتیٰ کہ شاعری وغیرہ ابھی نامکمل ہیں اور ان سب کو ابھی جنم لینا ہے۔ انسان کو ابھی ایسا فن پیدا کرنا ہے کہ جو '' تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ''[2] (اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے اخلاق پیدا کرو) کے مطابق انسان میں صفاتِ ربانی کا انجذاب کرتے ہوئے اُسے '' اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ '' کی آواز کی بیکرانی سے ہمکنار کر دے اور جب ایسا ہو جائے تو پھر انسان نیابتِ الٰہی کا منصب حاصل کر لیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ زبورِ عجم کے حصہ دوم میں '' انسان کے نام '' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

مقام آدم خاکی نهاد دریا بند　　　مسافرانِ حرم را خدا دهد توفیق

(تا کہ وہ آدمِ خاکی کا مقام متعین کر لیں (یا پا لیں) خدا مسافرانِ حرم کو یہ توفیق دیتا ہے) (زع: ۱۱۳)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ انسان فطرت کی تسخیر کیلئے اپنے فن اور تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے سکتا ہے، اس حد تک کہ نیابتِ الٰہی کا منصب بھی پا سکتا ہے ایسی تسخیر اس آدم علیہ السلام کیلئے بڑا اعزاز ہے، جسے کبھی جنت سے بے دخل کیا گیا تھا۔ یہ راستہ جدوجہد، تحرک اور بے چینی کا راستہ ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس راہ

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۵۳۲، جلد ۲، صفحہ ۳۴۳۔　　[2] التفسیر الکبیر، جلد ۲۳، صفحہ ۱۵۷۔

سے انسان تخلیق کی لذت سے سرشاری کو حاصل کر لیتا ہے مگر خدا تک نہیں پہنچ سکتا علامہؒ اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس راستے کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے اور وہ راستہ عشق کا راستہ ہے یہ راستہ بھی جدوجہد، تحرک، اضطراب اور بے چینی کا راستہ ہے البتہ راہِ عشق سے انسان نہ صرف خدا تک پہنچ سکتا ہے بلکہ یہ عشق اس راستے کی تمام رکاوٹیں بھی دور کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرامؒ اس راہ پر چل کر سفر کرتے ہیں جس میں طریق رابطۂ عشق شیخ کے باعث ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(ب ج:۳۱۰)

ارواح کی تخلیق اجسام سے قبل ہوئی

روحوں کی تخلیق جسموں سے پہلے ہوئی کیونکہ روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے اس کے بغیر جسم کی حیات کا کوئی تصور نہیں ہے چنانچہ ایک حدیث پاک میں ہے کہ: "اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْاَرْوَاحَ قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ الْاَ جْسَادَ"۔[۱] (بے شک اللہ تعالیٰ نے روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا فرمایا)۔

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے دل کو جسم سے سات ہزار برس قبل پیدا فرمایا اور مقامِ قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے سات ہزار برس پہلے پیدا فرما کر درجۂ وصل میں رکھ کر ہر روز تین سو ساٹھ باران پرظہورِ جمال فرمایا۔[۲]

بعض لوگ ان احادیث جن میں روح کی قبل الجسد تخلیق کا ذکر ہے پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان میں کوئی استبعاد نہیں ہے اور ان کی تائید حسب ذیل متفق علیہ حدیث سے ہو جاتی ہے جسے امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں کہ ''سیدہ عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ روحیں فوج کی طرح جمع ہیں جن میں وہاں آشنائی ہوگئی ان کے درمیان یہاں الفت ہوگی لیکن جو وہاں ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں وہ یہاں بھی بیگانہ رہیں گی''۔

علامہ ابنِ قیمؒ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''روحیں پہلے سے مخلوق تھیں۔ صورت رکھتی تھیں اور سمجھ رکھتی تھیں اس سے قبل کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ بجالانے کا حکم ہوا اور اس سے بھی پہلے کہ انہیں جسموں میں داخل کیا جائے اور جسم اس وقت مٹی اور پانی تھے۔[۳]

ابنِ قیم نے یہ ابن حزم کا قول نقل کیا ہے۔ ان کا اپنا موقف یہ ہے کہ روح بعد میں پیدا ہوتی ہے

---

[۱] کنز العمال، حدیث ۱۵۲۲۶، جلد ۶، صفحہ ۶۴۔　[۲] کشف المحجوب، صفحہ ۴۶۷۔　[۳] کتاب الروح، صفحہ ۱۲۲۔

جب بچہ ماں کے پیٹ میں چار ماہ کا ہوتا ہے لیکن ابن قیم کے دلائل میں وزن نہیں ہے۔

روحیں باہم مجتمع تھیں، اس کا معنیٰ؟

متذکرہ بالا حدیث شریف کا معنیٰ سمجھنے کیلئے ہم اپنے قارئین کی خدمت میں ایک اور حدیث پیش کر رہے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ جوزی حنبلی لکھتے ہیں ''حضرت سالم بن عبداللہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کا علم آپؓ کے پاس ہوگا وہ میں نے پوچھنی تھیں۔ حضرت علیؓ نے کہا وہ کیا ہیں؟ آپؓ نے کہا ایک شخص کسی دوسرے شخص سے محبت کرتا ہے حالانکہ اس نے اس شخص سے کوئی خیر نہیں دیکھی ہوتی اور ایک شخص کسی دوسرے شخص کے ساتھ بغض رکھتا ہے حالانکہ اس نے اس شخص سے کوئی شر (برائی) نہیں دیکھا ہوتا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہاں! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ روحیں باہم جمع ہیں۔ وہ فضا میں ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات کرتی ہیں، سو جن کا وہاں آپس میں تعارف ہو جائے ان کی یہاں ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے اور جو وہاں ایک دوسرے سے جدا رہیں وہ یہاں آپس میں اختلاف رکھتی ہیں''۔[1]

اگلے دو سوال ہم نے بنظرِ اختصار ذکر نہیں کیے۔ جن حضرات کو مکمل حدیث دیکھنے کا شوق ہو وہ کتاب الروح لابن قیمؒ یا امام حاکم کی مستدرک کی طرف رجوع فرمائیں۔

عالمِ ارواح کی معرفت کی بدولت دنیا میں معرفت

بعض قوی روحیں عالمِ ارواح کی سابقہ جان پہچان کی وجہ سے دنیا میں بن دیکھے ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں چنانچہ امام اصبہانی'' لکھتے ہیں'' حافظ ابونعیمؓ حارث بن عمیرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حارثؓ نے کہا کہ میں مدائن گیا تو وہاں ایک آدمی دیکھا جس کے کپڑے پرانے تھے اور ایک سرخ چمڑے کو وہ رگڑ رہا تھا۔ اس شخص نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور فرمایا بندۂ خدا اپنی جگہ رُک جا، میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ اس نے جواب دیا حضرت سلمانؓ ہیں۔ وہ اپنے گھر تشریف لے گئے سفید کپڑے پہنے پھر تشریف لائے، میرا ہاتھ پکڑ کر پھر مصافحہ فرمایا اور حال پوچھا۔ میں نے کہا اے ابوعبداللہ! ماضی میں نہ آپ نے مجھے دیکھا ہے اور نہ میں نے آپ کو دیکھا ہے، پھر آپ نے مجھے کس طرح پہچان لیا؟ انہوں نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے جب میں نے آپ کو دیکھا تو میری روح نے آپ کی روح کو پہچان لیا، کیا آپ حارث بن عمیر نہیں ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں حارث

---

[1] کتاب الروح، صفحہ ۴۲۔

ہی ہوں فرمانے لگے میں نے امام الانبیاء ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا ہے کہ روحیں متحد لشکر ہیں جو ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ الفت کرنے لگتی ہیں اور جو نہیں پہچانتی وہ اختلاف کرنے لگتی ہیں''۔[1]

بیعت میں مناسبت کا خیال رکھا جائے

مذکور الصدر حدیث کے تحت اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں ''یہ امر تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوضِ باطنی کیلئے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ اس حدیث کے عموم میں یہ مناسبت بھی داخل ہے کیونکہ نفع عادۃً الفت پر موقوف ہے اور نصِ حدیث الفت عالمِ ارواح کے تعارف پر موقوف ہے جو مناسبت فطری کی حقیقت ہے اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخ' طالب کو اپنے پاس سے بعض دفعہ دوسرے شیخ کے پاس جس سے مناسبت مظنون یا مکشوف ہو بھیج دیتے ہیں کیونکہ اس طریق (سلوک) میں مُصلح کے ساتھ مناسبت ہونا بڑی ضروری چیز ہے۔ بدوں مناسبت کے طالب کو نفع نہیں ہو سکتا''۔[2]

عالمِ ارواح اور ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُم'' کا وعدہ

اِس اِقرارِ ربوبیت کی کیا نوعیت تھی؟ آیا یہ روحوں کو عقل و فہم اور قوتِ سماعت دیکر ان سے پوچھا گیا اور پھر اُنہیں قوتِ نُطق دے کر اُن سے ''بَـلٰـی'' کہلوایا گیا یا بغیر کسی گفت و شنید اور قول و اقرار کے محض فطرتِ سلیمہ کی قبولیت کو لفظِ ''بَـلٰـی'' سے تعبیر کر دیا گیا۔ اس مسئلہ میں بڑا اختلاف ہے اور اس اختلاف کا باعث ایک اور اختلاف ہے، وہ یہ کہ روح کی جسم سے پہلے تخلیق ہوئی یا بعد میں پیدا ہوئی ہے؟ علامہ ابن قیم الجوزی حنبلیؒ نے بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ روح جسم سے پہلے پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرشتہ ماں کے پیٹ میں روح پھونکتا ہے۔ انہوں نے کہا حدیثِ پاک میں یوں نہیں کہا گیا کہ ''فرشتہ روح لیکر آتا ہے پھر اُسے بدن میں داخل کر دیتا ہے''۔[3]

علامہ ابن قیمؒ کے علاوہ اور بھی بہت علماء نے یہی قول پیش کیا ہے۔ بہرکیف ہم اپنی تصانیف میں مسلکِ صوفیا کی ترجمانی بلکہ پیروی کر رہے ہیں اور علماءِ صوفیاء ارواح کے پہلے پیدا ہونے کے قائل ہیں۔ اسی لیے وہ اس امر کے بھی قائل ہیں کہ رب تعالیٰ اور ارواح کے درمیان باقاعدہ مکالمہ (کہنا سننا) ہوا اور روحوں نے ''بَـلٰـی'' کہہ کر اللہ سبحانہ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ لہٰذا اس سلسلے میں پہلے ہم قرآنِ کریم کی آیات، پھر احادیثِ مبارکہ اور بعد میں علماء صوفیا کے اقوال پیش کریں گے۔

---

[1] جامع کرامات اولیاء، ھبۃ اللہ بن الحسن، متوفی ۴۱۸، جلد ۱، صفحہ ۴۱۲، دار الفکر، بیروت۔

[2] شریعت و طریقت، صفحہ ۶۷، ادارہ اسلامیات، لاہور۔　[3] کتاب الروح، صفحہ ۲۲۵۔

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ

یہ سوال حضرت آدم علیہ السلام کے مسجودِ ملائکہ ہونے سے بھی پہلے ہوا کیونکہ قرآن مجید میں ہے "وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ"[1] (اور بے شک ہم نے تمہیں (یعنی تمہاری اصل کو) پیدا کیا پھر تمہاری صورتگری کی پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو)۔

سورۂ الانفطار میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے کہ پہلے تخلیق کا ذکر ہے پھر صورت بخشنے کا۔ تخلیق سے عالمِ ارواح کی طرف اشارہ ہے اور تصویر (یعنی صَوَّرْنَاکُمْ) سے عالمِ اجسام کی طرف اشارہ ہے پھر اس کے بعد ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ آیتِ مبارکہ میں لفظِ "ثُمَّ" کا یہی تقاضا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ ارواح کی تخلیق اجسام پر مقدم ہے۔ اس لیے حسبِ ذیل آیت میں جو مکالمہ ہے برطریقِ تمثیل نہیں بلکہ حقیقت ہے:

"وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۚ"[2] (اور (یاد کیجیے!) جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو انہی کی جانوں پر گواہ بنایا (اور فرمایا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے: کیوں نہیں؟)۔

۱) امام ابن جریر طبریؒ امام ابوالشیخ حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ روحوں نے ایمان اور معرفت کا جسموں کی تخلیق سے پہلے اقرار کیا۔

۲) امام ابن ابی شیبہؒ حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو اجسام سے پہلے پیدا کیا پھر اُن سے میثاق لیا۔

۳) امام ابن ابی حاتمؒ اور امام ابن جریر طبریؒ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اُن کی پشت سے ان کی تمام اولاد نکالی وہ چیونٹیوں کی مانند تھے۔ پھر اُنہیں ان کے ناموں کے ساتھ ذکر کیا۔ پس فرمایا یہ فلاں بن فلاں ہے، یہ ایسا اور ایسا عمل کرے گا۔ اور یہ فلاں بن فلاں ہے اور یہ ایسا اور ایسا عمل کرے گا۔ پھر رب تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے دو مرتبہ مٹھی بھری اور فرمایا یہ جنت میں ہونگے اور یہ جہنم میں۔[3]

(۴) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ "پھر اس ذُرِّیَّت کو دوبارہ حضرت آدم علیہ السلام کی صلب (پشت) میں لوٹا دیا۔

---

[1] الاعراف، ۷:۱۱۔ [2] الاعراف، ۷:۱۷۲۔

[3] تفسیر ابی سعود، ابی سعود العمادی، متوفی ۹۵۱ھ، جلد ۳، صفحہ ۲۹۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

۵) امام مالک، امام احمد، امام عبد بن حمید، امام بخاری اپنی تاریخ میں، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم، امام ابن حبان، امام آجری، امام ابوالشیخ، امام حاکم، امام ابن مردویہ، امام لالکائی اور امام بیہقیؒ نے مسلم بن یسار الجہنیؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سورۂ الاعراف کی متذکرہ آیت نمبر ۱۷۲ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت پر اپنا (بے مثل) ہاتھ پھیرا تو ان کی ذرّیت کو نکالا پھر فرمایا یہ جنت کیلئے ہیں اور یہ اہل جنت کے عمل کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیر کر ان کی ذرّیت کو نکالا اور فرمایا یہ نار کیلئے ہیں اور یہ اہلِ نار کے عمل کریں گے۔

۶) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے کہ "فَجَعَلَهُمْ اَرْوَاحًا فِيْ صُوَرِهِمْ ثُمَّ اسْتَنْطَقَهُمْ فَتَكَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ"[1] (پھر ان کی روحوں کو ان کی صورتوں میں کیا پھر انہیں قوت گویائی دی تو وہ کلام کرنے لگیں پھر ان سے عہد و میثاق لیا)۔ اس حدیث میں آگے چل کر یہ الفاظ ہیں کہ "فَكَانَ رُوْحُ عِيْسٰى مِنْ تِلْكَ الْاَرْوَاحِ الَّتِيْ اَخَذَ عَهْدَهَا وَمِيْثَاقَهَا فِيْ زَمَنِ اٰدَمَ"[2] (اُن ارواح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح بھی تھی جن سے عہد و میثاق لیا گیا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں)۔ علامہ ابنِ قیمؒ نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

اس حدیث میں واضح ہے کہ روحوں کو صورت بخشی گئی اور ان کے ساتھ کلام کیا گیا اور حدیث نمبر "۳" میں آپ نے پڑھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اولاد نکالی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اسماء کا ذکر کیا اور روح پر فلاں بن فلاں کا اطلاق احادیث کی رو سے ثابت ہے چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پاک میں ہے کہ فرشتے جب کسی شخص کی روح قبض کر کے لیجاتے ہیں اور آسمانوں میں دیگر فرشتوں کی جماعت کے قریب سے گزرتے ہیں تو وہ دریافت کرتے ہیں کہ "مَا هٰذَا الرُّوْحُ الطَّيِّبُ! فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ" (یہ کیسی پاکیزہ (اور خوشبودار) روح ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی ہے)۔ اور اگر وہ کسی کافر کی روح ہو تو ملائکہ کو بدبو آتی ہے اور وہ کہتے ہیں "مَا هٰذَا الرُّوْحُ الْخَبِيْثُ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ" (یہ کیسی خبیث روح ہے وہ جواب دیتے ہیں یہ فلاں بن فلاں کی ہے)۔[3]

صاف ظاہر ہے کہ فرشتے انسان کا بدن تو آسمانوں کی طرف نہیں لے کر جاتے فقط روح ہی لے

[1] الدر المنثور، جلد ۳، صفحہ ۶۰۰۔

[2] درء التعارض، تقی الدین احمد بن عبد السلام، متوفی ۷۲۸ھ، جلد ۸، صفحہ ۴۴۰، دار الفکر، بیروت۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۱۲۰۵۹، جلد ۳، صفحہ ۵۵۔

کرجاتے ہیں اور روح ہی پر فلاں بن فلاں کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ سورۂ میثاق میں بھی روح کو فلاں بن فلاں کہا گیا اور دنیا سے کوچ کرنے کے بعد بھی روح پر فلاں بن فلاں کا اطلاق ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ اصل چیز روح ہے اور اصل ہمیشہ فرع سے پہلے ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روح جسم سے پہلے موجود تھی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

میثاقِ اَلَسْتُ پر امام شعرانیؒ کا کلام (سوالاً جواباً)

امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے اس مسئلہ کو بڑے اچھوتے اور سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ ہم اپنے قارئینِ کرام کی ضیافتِ علمی کی خاطر عبارت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

سوال نمبر ۱: کس مقام میں یہ عہد لیا گیا؟

جواب۔ وادیٔ نعمان کے بطن میں جو کہ مقام عرفات کے پہلو میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سراندیپ میں جو ہند کی سرزمین کا ایک مقام ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے تھے۔ اِن میں پہلا قول حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور کلبی نے کہا مکہ اور طائف کے درمیان یہ عہد لیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ عہد جنت میں لیا گیا۔ یہ تمام احتمالات ایک دوسرے کے قریب ہیں تاہم ان میں کسی قول کے تعین میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے البتہ میثاق پر پختہ اعتقاد رکھنا لازمی ہے۔

سوال نمبر ۲: انہوں نے لفظِ بلیٰ سے کیسے جواب دیا، آیا وہ زندہ اور عاقل تھے یا زبانِ حال سے جواب دیا؟

جواب۔ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے آواز کے ساتھ جواب دیا اور وہ زندہ تھے کیونکہ عقل کے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اس حالت میں حیات، عقل اور نطق (بولنے کی قوت) عطا فرمائے، بے شک اس کی قدرت کے سمندر وسیع ہیں اور ہماری وسعت اسی میں ہے کہ ہم ثابت شدہ مسئلہ کے جواز کے قائل ہوں اور اس کی کیفیت اسی ربِّ قدیر کے سپرد کر دیں۔

سوال نمبر ۳: کیا وہ ذرّات (جن سے میثاق لیا گیا) آدمی کی صورت میں تھے یا نہیں؟

جواب۔ ہمیں اس بارے میں کوئی نقل موصول نہیں ہوئی مگر عقل کے قریب یہ بات ہے کہ وہ ذرات (ارواح) صورت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ قوتِ سماعت و نطق صورت کی محتاج نہیں ہے، ہاں صرف اس بات کیلئے محلِ حیات ضروری ہے سو جب اللہ تعالیٰ حیات اور فہم عطا فرما دے تو جائز ہے کہ ذرّات کو بھی سماعت اور نطق حاصل ہو اگرچہ وہ صورت نہ رکھتے ہوں، اور یہ احتمال ہے کہ وہ ذرّات مثل آدمی کے صورت رکھتے ہوں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" اور لفظ "ذُرِّيَّةٌ" کا اطلاق صورت والی چیزوں پر ہوتا ہے۔

امام شعرانیؒ کو شاید وہ حدیث مستحضر نہیں ہوگی جسے ہم نمبر ۶ پر ذکر کر چکے ہیں۔ایک مرتبہ اُسے دوبارہ پڑھ لیجئے۔

سوال نمبر۴: روحوں کا تعلق اُن ذرّات کے ساتھ پشتِ آدم علیہ السلام سے نکلنے سے پہلے قائم ہوا یا بعد میں؟

جواب ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ذرّات کو زندہ نکالا اس لیے کہ اُنہیں ذرّیت سے موسوم فرمایا اور ذریت کا اطلاق زندوں پر ہوتا ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:''وَاٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ''[1] (اور ایک نشانی اُن کیلئے یہ (بھی) ہے کہ ہم نے ان کے آباءواجداد کو (جو ذُریّتِ آدم تھے) بھری کشتیِ (نوح) میں سوار کر (کے بچا) لیا تھا)۔

پس احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں روحیں پیدا فرمادیں اور وہ اپنے باپوں کی پشتوں کے اندھیروں میں ہوں اور انہیں دوسری بار پیدا کیا ہو جبکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹوں کے اندھیروں میں ہوں اور پھر انہیں تیسری بار پیدا کیا ہو جبکہ وہ زمین کے پیٹوں کے اندھیروں یعنی یکے بعد دیگرے تخلیق تین اندھیروں میں کی گئی اس طرح اللہ تعالیٰ کی سنت جاری ہے۔

سوال نمبر۵: ان ذرات سے میثاق لینے میں کیا حکمت ہے؟

جواب۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی ان لوگوں پر حجت قائم ہو جو اس عہد کو پورا نہیں کرتے جیسا کہ اس دارِ تکلیف (دنیا) میں انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیج کر حجت قائم فرمادی۔

سوال نمبر۶: پھر ان ذرات کو پشتِ آدم علیہ السلام میں زندہ واپس لوٹایا یا روح کے بغیر مردہ لوٹایا؟

جواب۔ ظاہر یہ ہے کہ بلا روح لوٹایا تاکہ انہیں جب زمین پر بھیجا جائے تو وہ روح دوبارہ ان میں لوٹادی جائے (چار ماہ کے اختتام پر ماں کے پیٹ میں)۔

سوال نمبر۷: اُن ذرات کے واپس پشتِ آدم علیہ السلام میں لوٹ جانے کے بعد ارواح کہاں ٹھہریں؟

جواب: بلاشبہ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے نہ اس تک عقل کو رسائی ہے اور نہ اس بارے میں کوئی نص موصول ہوئی ہے،سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں کچھ اطلاع بخشے اسے چاہیے کہ وہ ہماری کتاب کے اس مقام میں بطور فائدہ لکھ دے۔

یہ ناکارہ عرض کناں ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ روحیں جہاں پہلے تھیں بعد میں بھی وہاں رہیں ہونگی اور یہ بات اسی طرح احتمالی ہے جس طرح امام شعرانیؒ نے اوپر کئی جوابات احتمالاً دیئے ہیں۔

---

[1] یٰسین،۳۶:۴۱۔

کیا میثاقِ اَلَسْتُ کسی کو یاد ہے؟

سوال نمبر ۸: امام شعرانیؒ نے ایک سوال یہ بھی قائم فرمایا ہے کہ وہ عہد جو ہم نے روزِ ازل کیا تھا وہ ہمیں آج یاد کیوں نہیں ہے؟

جواب۔ ہمیں وہ عہد اس لیے یاد نہیں ہے کہ اس پر کئی زمانے اور کئی حالتیں گزر گئیں۔ انسان نے آباؤ اجداد کی پشتوں اور ماؤں کے رحموں میں وقت گزارا پھر کئی مراحل سے گزرا کبھی لوتھڑا، کبھی گوشت اور کبھی ہڈی کی حالت وغیرہ میں۔ ایسے میں اس پر نسیان کا واقع ہونا قرینِ قیاس ہے، تاہم اربابِ ہمت حضرات کو اب تک وہ میثاقِ الست یاد ہے۔ ''کَانَ عَلِیٌّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ اِنِّیْ لَاَذْکُرُ الْعَھْدَ الَّذِیْ عَھِدَاِلَیَّ رَبِّیْ وَ اَعْرِفُ مَنْ کَانَ ھُنَاکَ عَنْ یَمِیْنِیْ وَمَنْ کَانَ عَنْ شِمَالِیْ'' [1] (حضرت علی بن ابی طالب ؓ فرماتے تھے بیشک میں اب تک اس میثاق کو یاد رکھتا ہوں جو مجھ سے میرے رب نے لیا تھا اور میں یہ بھی پہچانتا ہوں کہ وہاں میری دائیں جانب اور بائیں جانب کون کون تھا)۔ پھر آپ ؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم سے لیے گئے اس میثاق کی خبر دی تا کہ ہم پر حجت قائم ہو پس اس خبر دینے میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے۔

حضرت سہل تستریؒ کا قول

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں، اسی طرح ہمیں حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کا قول بھی پہنچا ہے کہ آپؒ فرماتے تھے میں اپنے تلامذہ کو ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' کے دن سے برابر پہچانتا ہوں اور میرا لطیفہ مسلسل ان کی تربیت میں مشغول رہا جبکہ وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے حتیٰ کہ ہمارے اس زمانے تک پہنچے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا قول

علامہ اسماعیل حقیؒ اور علامہ سید محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ ''سُئِلَ عَنْ ذِی النُّوْنِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنْ سِرِّ مِیْثَاقِ مَقَامِ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ھَلْ تَذْکُرُہٗ فَقَالَ کَاَنَّہٗ اَلْاٰنَ فِیْ اُذُنِیْ'' [2] (حضرت ذوالنون ؓ سے ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' کے میثاق کے راز کے متعلق سوال کیا گیا کہ آپ کو وہ یاد ہے؟ انہوں نے فرمایا گویا اب بھی میرے کانوں میں وہ آواز آ رہی ہے)۔

روزِ میثاق صفتِ ربوبیت کے ذکر میں حکمت

اللہ سبحانہ نے میثاق لیتے وقت اپنی الوہیت کی بجائے ربوبیت کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس پر علمائے

---

[1] الیواقیت والجواہر، جلد ا، صفحہ ۲۰۴۔

[2] روح البیان، شیخ اسماعیل حقی، جلد ۳، صفحہ ۲۷۵، مکتبہ عثمانیہ کوئٹہ۔

کرام نے خوب گوہرافشانی فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کے سوال سے ارواح میں اپنی ربوبیت کی معرفت کی ایک خاص استعداد عطا فرمادی اور اس سوال سے یہ بتادیا کہ ہماری پہچان ہماری صفتِ ربوبیت سے ہوگی۔ ہماری شانِ ربوبیت ہماری جملہ صفات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، پس ربوبیت کے باب سے ہماری جملہ صفات کی معرفت حاصل ہوجائیگی''۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کو معرفت میں بڑا دخل ہے کیونکہ سارے عالم میں اسی کی ربوبیت کا کارخانہ چل رہا ہے جسے شب وروز ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، دن رات کا آنا جانا، گرم وسرد ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، موسموں کا بدلنا غرض ہر درخت، پھل، پھول اور ہر پتی اور اس کے رگ وریشہ میں اسی کی ربوبیت کارفرما ہے اور ہر ذرے کے ساتھ اس کی ربوبیت کا خاص تعلق ہے۔ اسی لیے اُس نے ارشاد فرمایا ''فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج''[1] (پس یہی (عظمت وقدرت والا) اللہ ہی تو تمہارا سچا رب ہے، پس (اس) حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا ہوسکتا ہے)۔ تمام مصنوعات اور مخلوقات میں تربیت کے سارے تصرفات اللہ تعالیٰ ہی کے دستِ قدرت سے ہورہے ہیں۔ اس کی ربوبیت کے آئینہ میں اس کی ذات بالکل عیاں ہے۔ ارشاد فرمایا ''وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝'' (اور زمین میں صاحبانِ ایقان (یعنی کامل یقین والوں) کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں (بھی ہیں)، سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو)''[2]

''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' میں ایک لذت ہے

جب حق تعالیٰ نے ارواح سے یہ سوال فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو اس سوال کے اندر ربوبیت کے انوار موجود تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک نور ہے اس کا کلام نور ہے، اس سوال کے ساتھ انوارِ ربوبیت ارواح پر پھیل گئے۔ ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ''کیا میں تمہارا اللہ نہیں ہوں؟'' رب فرما کر اپنی ربوبیت کی تجلی دکھلادی۔ اسی سوال میں ارواح نے اپنے رب کو دیکھا اور رب کی ربوبیت کو دیکھا اور دیکھ کر کہا ''بَلٰی'' (کیوں نہیں) یعنی بیشک تو ہمارا رب ہے۔

نور کی شان ''ظَاهِرٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مُظْهِرٌ لِّغَيْرِهٖ'' یعنی نور خود ظاہر ہوتا ہے اور اپنے غیر کو بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ پس حق تعالیٰ شانہ کی صفتِ ربوبیت کی جب ارواح پر تجلی ہوئی تو ارواح پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تفصیلی کمال اور اپنی تفصیلی احتیاج وفقر کا انکشاف ہوگیا اور دیکھ کر اقرار کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب

---

[1] یونس، ۱۰:۳۲۔

[2] الذریٰت، ۵۱:۲۰،۲۱۔

ہیں۔جس وقت "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" فرمایا تو اسم رب کے انوار نے ارواح کو مست کر دیا بقول شخصے ۔

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمعِ محفل کی — پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

کہیں کون و مکاں میں جو نہ رکھی جا سکی اے دل — غضب دیکھا وہ چنگاری مری مٹی میں شامل کی

اس تصور کو مولائے رومؒ نے یوں بیان کیا ہے ۔

جرعۂ چوں ریخت ساقیٔ الست — برسرِ ایں شورہ خاك زیر دست

(اَلَسْتُ کے ساقی نے جب ایک گھونٹ بہایا اِس نچلی بنجر زمین پر)

مطلب یہ ہے کہ ساقیٔ الست نے عالمِ ارواح میں اپنی محبت کی شراب کا جو مٹی کا گھڑا اس خاک پر ڈال دیا تھا اس کے فیض سے خاک کا ہر ذرہ مست ہو گیا اور اسی دیوانگی اور محبت میں اس خاکی پتلے نے اس امانت کا بار اٹھالیا، جس بار سے ہفت آسمان اور زمین کانپ اٹھے تھے۔

الغرض انسان نے روزِ میثاق "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے سوال میں جو انوار و تجلیاتِ ربوبیت دیکھے تھے اس کی لذت اور کیفیت نے اس امانتِ الٰہیہ کو یعنی احکامِ شرعیہ کے بار کو اٹھانے پر آمادہ کر دیا اور خوشی خوشی بزبانِ حال ارواح نے کہا۔

رو رو اے جـــاں زود زنـجیــر بیــار

(اے جان جلد جا (اور) اس زنجیرِ محبت کو لے لے)

آسماں بارِ امانتت نہ توانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بارِ امانت نہیں اٹھا سکا اور قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام نکال دیا)

رب تعالیٰ نے پیدا فرما کر اپنی تربیت میں رکھ کر پھر فرمایا کہ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، تھے تو اس وقت چیونٹی جیسے مگر بیج ہی میں تو پورا درخت ہوتا ہے لھذا ارواح نے اپنے وجود کو اور اپنے وجود پر تربیت کے آثار کو دیکھ کر عرض کیا بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔"

عالمِ ارواح سے منتقل کرنے کی حکمت

عالمِ ارواح میں انسانی معرفت کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ روحِ مجرد میں بھوک و پیاس کا داعیہ نہ تھا۔عبادت کیلئے اعضاء نہ تھے کہ رکوع، سجدہ اور قیام میں وہ اعضاء مختلف شکلوں میں طاعت اور بندگی بجالاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس جسم کے ساتھ سراپا محتاج بنا کر اس عالم میں بھیج دیا تا کہ ہر قدم پر حاجت مند ہو کر اسی کو حاجت روائی کیلئے پکارے اور ہر حاجت سے اس کی معرفت حاصل کرلے۔

روحِ مجرد کو عالمِ ارواح میں نہ بھوک لگتی نہ پیاس، ایسے میں بندہ رب کی ربوبیت اور رزّاقیت کو کیا

سمجھتا۔اب جس وقت بھوک اور پیاس سے بے قرار ہوگا تو کھانا کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر بے اختیار رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا۔ جب اپنے گناہوں سے توبہ کرے گا اور ندامت کے آنسو بہائے گا تو رحمتِ حق اس کی توبہ قبول کرے گی۔اس وقت بندے کو رب تعالیٰ کی رحمانیت، غفاریت اور توابیت کی معرفت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں انسان کے گناہوں کو دیکھتے ہوئے اس کی پردہ پوشی کروں گا تو اس وقت انسان کو میری ستاریت کی معرفت ہوگی اور باوجود میرے قادرِ مطلق ہونے کے میری طرف سے انتقام نہ لینے کو دیکھ کر انسان کو میرے کرم اور حلم کی معرفت حاصل ہوگی اور کبھی حد سے گزر جانے پر کسی سرکش قوم پر عذاب نازل کروں گا اس وقت میرے ذُو انْتِقَامٍ اور شَدِیْدُ الْعِقَابِ ہونے کی معرفت حاصل ہوگی۔

علیٰ ھٰذا القیاس سارے عالم میں میری ربوبیت کے ساتھ میرے تمام اسماءِ حسنیٰ کا ظہور ہوگا، مخلوقات میں ہر وقت مشاہدہ کر کے میرے رب العالمین ہونے کی معرفت حاصل ہو جائے گی، پس عالمِ ارواح سے دنیا میں بھیجنے کا اور بے شمار حاجتوں کے ساتھ پیدا کرنے کا مقصد محض یہی ہے کہ میرے بندے مجھے مع میری صفات کے پہچان لیں اور میری محبت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔ یہ بات عالمِ ارواح میں روحِ محض کیلئے ممکن نہ تھی نہ وہاں حاجات تھیں اور نہ کوئی طلب، پھر انسان کو کیونکر معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی۔مذکورہ گفتگو کی روشنی میں مشہور حدیث مبارکہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ"[1] کو خوب سمجھا جا سکتا ہے۔اس پر تفصیل سے پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

سب سے پہلے کس نے "بَلٰی" کہا

جب تمام ارواح کو قوتِ سماعت اور قوتِ نطق عطا کی گئی تھی تو یہ امر غور طلب ہے کہ سب سے پہلے اقرارِ ربوبیت کرتے ہوئے "بَلٰی" کس نے کہا۔سطورِ بالا میں یہ وضاحت آ چکی ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی تربیتِ خاص میں رکھنے کے بعد تمام ارواح سے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" سے سوال کیا، لہٰذا جس روح نے زیادہ تربیت حاصل کی ہوگی اسی نے سب سے پہلے "بَلٰی" کہا ہوگا۔ آیئے اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ سب سے زیادہ کس روح نے تربیتِ الٰہی کا فیض حاصل کیا۔اس سلسلے میں کتبِ سیرت میں ہمیں حسبِ ذیل روایت دستیاب ہوئی ہے۔امام صالحی شامیؒ لکھتے ہیں "رَوٰی اَبُوْسَهْلِ بْنِ الْقَطَّانُ فِی اِمَالِیْهِ عَنْ سَهْلِ بْنِ صَالِحِ الْهَمْدَانِیِّ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا جَعْفَرَ مُحَمَّدَبْنَ عَلِیٍّ کَیْفَ صَارَ مُحَمَّدٌ ﷺ یَتَقَدَّمُ الْاَنْبِیَآءَ وَهُوَ اٰخِرُ مَنْ بُعِثَ؟ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ کَمَا اَخَذَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۵۳۲، جلد ۲، صفحہ ۳۴۳۔

اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ كَانَ مُحَمَّدٌ ﷺ اَوَّلَ مَنْ قَالَ بَلٰى، وَلِذٰلِكَ صَارَ يَتَقَدَّمُ الْاَنْبِيَآءَ وَهُوَ اٰخِرُ مَنْ بُعِثَ" [1] (ابی سہل قطان نے امالی کے ایک جزو میں سہل بن صالح ہمدانی سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے ابوجعفر محمد بن علی (یعنی امام محمد باقرؓ) سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو سب انبیاء علیہم السلام پر تقدم کیسے حاصل ہو گیا حالانکہ آپ ﷺ سب سے آخر میں مبعوث ہوئے، انہوں نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے ان کی اولاد کو (عالمِ میثاق میں) نکالا اور ان سب سے اپنی ذات پر اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب سے اول (جواب میں) بلٰی (کیوں نہیں) محمد ﷺ نے کہا اور اسی لیے آپ کو سب انبیاء علیہم السلام پر تقدم ہے گو آپ ﷺ سب سے آخر میں مبعوث ہوئے)۔ یہ روایت امام سیوطیؒ نے بھی ذکر فرمائی ہے۔[2]

فائدہ: خیال رہے کہ نبی اکرم ﷺ ساری مخلوق سے پہلے رب تعالیٰ کی تربیت میں رہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" (میں اس وقت بھی نبی تھا جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے)۔[3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ "میں اپنے رب کے حضور میں تھا" اور یہ اس طرف واضح اشارہ ہے کہ رب تعالیٰ کی تربیت میں تھا چنانچہ احکام ابن القطان میں منجملہ ان روایات کے جو ابن مرزوق نے ذکر کی ہیں حضرت علی بن الحسینؓ (یعنی امام زین العابدینؓ) سے روایت ہے وہ اپنے باپ حضرت امام حسینؓ اور وہ ان کے جدِ امجد یعنی حضرت علیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ: "كُنْتُ نُوْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَبِّىْ عَزَّوَجَلَّ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ اٰدَمُ بِاَرْبَعَةَ عَشَرَ اَلْفَ عَامٍ" [4] (میں آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے چودہ ہزار برس پہلے اپنے پروردگار کے حضور میں ایک نور تھا)۔

ایک اور روایت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ میں نے ایک نور کو بہتر ہزار (۷۲۰۰۰) بار دیکھا ہے جو ستر ہزار (۷۰۰۰۰) سال کے بعد نظر آتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ میرا ہی نور تھا سائنسدانوں نے کمپیوٹر کی تحقیق میں کائنات کے متعلق کچھ اعداد و شمار دیئے ہیں جس میں مذکورہ اقوال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس تحقیق کا مختصر جائزہ ہماری تصنیف "نشانِ منزل" میں شامل کیا گیا ہے۔

---

[1] سبل الھدیٰ والرشاد، جلد ۱، صفحہ ۸۳، ترجمہ از نشر الطیب، صفحہ ۹، تاج کمپنی، لاہور۔

[2] الخصائص الکبریٰ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، متوفی ۹۱۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۷، مکتبہ حقانیہ، پشاور۔

[3] المستدرک، حدیث ۴۲۰۹، جلد ۲، صفحہ ۶۶۵۔ [4] کشف الخفاء، حدیث ۸۲۷، جلد ۱، صفحہ ۳۱۲۔

دنیا میں علم وہدایت کے حصول کا عالمِ ارواح سے تعلق

سلسلۂ سہروردیہ کے امام شیخ الشائخ محدث کبیر امام شہاب الدین ابوحفص عمر سہروردیؒ نے اس سلسلے میں نہایت پرمغز کلام فرمایا ہے۔ آپ نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ جس کو بھی کوئی خیر اور کوئی علم اور ہدایت حاصل ہوئی نبی اکرم ﷺ کی بدولت حاصل ہوئی۔ شیخ نے اپنی مفید اور مشہور ترین تصنیف "عوارف المعارف" کے پہلے باب میں صوفیاء کے علوم کا تذکرہ کیا ہے اور اس باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "اَلْبَـــابُ الْاَوَّلُ، فِیْ ذِکْرِ مَنْشَاءِ عُلُوْمِ الصُّوْفِیَۃِ "اس باب کی دوسری حدیث کی ابتداء یوں ہے "مَثَلُ مَابَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِـہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا"[1] (جس ہدایت اور علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کثیر بارش زمین پر آئے)۔

آگے چل کر شیخ نے یہ اور اس کے علاوہ دیگر احادیث کو ملا کر بہترین گفتگو فرمائی ہے اور اس گفتگو کی کڑی عالمِ میثاق کے ساتھ ملائی ہے۔ ہم اپنے قارئین کرام کی ضیافتِ علمی وروحانی کی خاطر شیخ کی وہ عبارت یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

ہر ایک کو علم وہدایت حضور ﷺ کے قلب سے حاصل ہوتی ہے

شیخ سہروردیؒ لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا "مَنْ یُّـرِدِاللّٰـہُ بِـہٖ خَیْـرًا یُـفَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَاِنَّـمَـااَنَـاقَـاسِـمٌ وَاللّٰـہُ یُعْطِیْ "[2] (اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے)۔

شیخ فرماتے ہیں علم جب قلب میں پہنچ جائے تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ حق اور باطل کو پہچانتا ہے اور ہدایت اور گمراہی کے مابین واضح تمیز کر لیتا ہے۔[3] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ افضل عبادت دین کی سمجھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فقہ (دین کی سمجھ) کو قلب کی صفت فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا "لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا"، (وہ دل (ودماغ) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھ نہیں سکتے)۔

پس جب انہوں (صوفیاء) نے سمجھا تو جان گئے اور جب جان گئے تو عمل کیا اور جب عمل کیا تو معرفت حاصل کی اور جب معرفت حاصل کی تو ہدایت یافتہ ہوگئے۔ پس جو شخص زیادہ فقیہ ہے اس کا نفس اجابت کی طرف جلدی کرتا ہے اور دین کی معلومات کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے اور نور یقین سے وافر حصہ حاصل کر لیتا ہے۔ پس جملہ علم اللہ تعالیٰ کی جناب سے قلوب کیلئے عطیہ ہے اور معرفت اس جملہ علم میں

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۷۹، جلد ۱، صفحہ ۴۲۔ [2] صحیح بخاری، حدیث ۷۱، جلد ۱، صفحہ ۳۹۔

[3] عوارف المعارف، شہاب الدین سہروردی، متوفی ۶۳۲ ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۴۸، مدینہ گروپ کمپنی، کراچی۔

تمیز کرتی ہے اور ہدایت قلوب کا وجدان ہے۔ پس جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "مَثَلُ مَابَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ" [1] تو آپ نے خبر دی کہ آپ ﷺ کے قلب نے علم کو پالیا اسی لیے آپ ﷺ ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والے ہیں۔ آپ ﷺ کا علم آپکی طرف سے وہ وراثت ہے جو ابوالبشر آدم علیہ السلام میں رکھا گیا تھا اس حیثیت سے کہ انہیں تمام اسماء سکھا دیئے گئے تھے اور اسماء چیزوں کی علامت ہوتے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم کے ساتھ عزت بخشی اور یہ فیضانِ مصطفوی ﷺ تھا ارشاد فرمایا: "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۝" [2] جس نے انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ (کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا)

پس آدم علیہ السلام میں جب علم وحکمت رکھ دی گئی تو وہ فہم وفطانت (عقل)، معرفت، رأفت، لطف، حب وبغض، فرح وغم، رضا اور غضب اور ہر معاملہ میں سلیقہ مندی سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس عطیہ الٰہی نے ان تمام باتوں کو صحیح استعمال کرنے کا تقاضا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب کو بصیرت (قلب کی آنکھ) عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نور سے اپنی طرف راہ دی۔

سب سے پہلے طینتِ مصطفےٰ ﷺ سے جواب آیا

شیخ فرماتے ہیں "پس نبی کریم ﷺ اسی عطا فرمودہ موروثی نور کے ساتھ امت کی طرف بھیجے گئے" اور منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین وآسمان کو ان الفاظ سے خطاب فرمایا "اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ" [3] (کہ آجاؤ (تعمیل اور ادائے فرض کیلئے) خوشی سے یا مجبوراً دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں) حکم ہوا تو زمین کعبہ کے مقام سے بولی اور آسمان نے کعبہ کے مقابل سے مذکورہ جواب دیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اصل طینت (مٹی) مکہ مکرمہ میں زمین کی ناف (یعنی سنٹر) سے ہے۔ اس حقیقت کا ذکر کہ جغرافیائی علوم کے مطابق تمام زمین کا سنٹر مکہ میں خانہ کعبہ کا مقام ہے دیکھئے ہماری تصنیف "حسن نماز" باب "خانہ کعبہ" اس سے بعض علماءِ کرام نے یہ استنباط کیا ہے کہ زمین کے جس حصے سے جواب آیا تھا وہی نبی اکرم ﷺ کی مبارک طینت (مٹی) تھی اور کعبہ کے مقام سے ہی زمین کو پھیلایا گیا: "فَصَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الْاَصْلُ فِی التَّکْوِیْنِ وَالْکَائِنَاتُ تَبَعٌ لَهٗ" (تو ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کائنات کی اصل ہیں اور ساری کائنات حضور ﷺ کی فرع ہے)۔ اسی حقیقت کی طرف آپ ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے "کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ" (میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے درمیان تھے)۔ [4]

بعض روایات میں "بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" [5] (روح اور جسم کے درمیان تھے) کے الفاظ ہیں

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۷۹، جلد ۱، صفحہ ۴۲۔ [2] العلق: ۵ [3] حم السجدہ، ۴۱: ۱۱

[4] کشف الخفاء، حدیث ۲۰۱۷، جلد ۲، صفحہ ۱۰۱۲۔ [5] سنن الترمذی، حدیث ۳۶۰۹، جلد ۵، صفحہ ۵۸۵۔

اور کہا گیا ہے کہ آپ کو اسی لیے اُمّی کہا جاتا ہے اور اسی لیے مکہ مکرمہ ام القریٰ (تمام شہروں کی اصل) ہے اور حضور اُم الخلیقہ (تمام مخلوق کی اصل) ہیں۔

انسان کا خمیر ہی اس کا مدفن ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کا مدفن مکہ المکرمہ ہوتا کیونکہ آپ ﷺ کی تربت (مٹی) وہیں سے تھی لیکن کہا گیا ہے کہ پانی نے جب موجیں اور طغیانیاں ماریں تو اس نے مٹی کو اطراف واکناف میں پھیلا دیا، سو نبی کریم ﷺ کی مٹی کا جوہر وہاں جا پہنچا جہاں آج آپ ﷺ کا روضہ مقدسہ ہے، بایں وجہ رسول اللہ ﷺ مکی بھی ہیں اور مدنی بھی کہ آپ ﷺ کی طینت پاک مکی ہے اور تُربتِ اطہر مدنی ہے اور جو ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ذرہ مبارکہ کا ذکر کیا ہے اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ''وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی'' [1] اور (اے محبوب) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنایا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا بیشک تو ہی ہمارا رب ہے)۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر اپنا دستِ قدرت پھیرا اور اس سے ان کی اولاد کو چیونٹیوں کی طرح نکالا'' وہ ذریت حضرت آدم علیہ السلام کے بالوں کے مسام کی جگہ سے نکلی جیسا کہ پسینہ نکلتا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعض ملائکہ نے پشت آدم علیہ السلام کو مس کیا تھا لیکن چونکہ حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اس لیے اس کی طرف یہ فعل منسوب ہوا اور ایک قول یہ ہے کہ زمین کے ساتھ پشت آدم علیہ السلام مس کی گئی اور یہ سب کچھ وادیٔ نعمان میں ہوا جو مکہ اور طائف کے درمیان میں ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' سے خطاب فرمایا تو ان ذروں سے آواز آئی ''بَلٰی'' پھر اس میثاق کو ایک نہایت سفید ورق پر لکھا اور اس پر ملائکہ کو گواہ بنایا اور اسے حجرِ اسود میں رکھ دیا۔ پس رسول اللہ ﷺ کے ذرے نے زمین میں سے جواب دیا اور علم اور ہدایت اُسی ذرۂ مصطفےٰ ﷺ میں مخزون تھا۔ پھر حضور ﷺ اسی موروثی اور موہوبی (عطا فرمودہ) علم کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ [2]

حضور ﷺ کی طینت کی تقدیس

مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام کو باری باری بھیجا کہ وہ زمین سے مٹی کا ایک قبضہ بھر کر لے آئیں تو زمین نے انکار کر دیا حتیٰ کہ عزرائیل علیہ السلام کو بھیجا گیا تو وہ زمین سے ایک قبضہ بھر مٹی لے گئے، اور ابلیس لعین نے زمین کو اپنے قدموں سے روند ڈالا تھا۔ اس طرح اکثر زمین اس کے قدموں

---

[1] الاعراف، ۷:۱۷۲۔
[2] تفسیر ابی سعود، جلد ۳، صفحہ ۲۹۰۔

کے روندنے کے مقامات کے درمیان میں آ گئی یا خود اس کے قدموں کے نیچے آ گئی۔

نفس کی مٹی کہاں سے لی گئی

نفس کو زمین کے اس مقام سے پیدا کیا گیا جس حصے کو ابلیس کے قدموں نے چھو لیا تھا۔ اسی لیے نفس شر اور شہوت کا منبع ہے، تاہم زمین کے بعض مقامات ابلیس کے قدموں سے پاک رہ گئے اور انہی مقامات سے انبیاء کرام ﷩ اور اولیاء عظام ؒ کی مٹی لی گئی اور رسول اللہ ﷺ کی پاک طینت اللہ سبحانہ کی نظرِ عنایت میں رہی، اس تک نہ حضرت عزرائیل ؑ کے قبضہ (مٹھی) کو رسائی حاصل ہو سکی اور نہ وہاں ابلیس لعین کے قدم پہنچ سکے۔ سو اس ذرۂ پاک کو جہالت نہ چھو سکی بلکہ وہ طینت پاک جہالت کی تمام صورتوں سے منزہ اور مبرّا ہے "خُلِقْتَ مُبَرَّءًا مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ" (آپ ﷺ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے)۔ سو اسی ہدایت اور علم کے ساتھ حضور ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ کے قلبِ اقدس سے دوسرے قلوب کی طرف یہ علم اور ہدایت منتقل ہوتے ہیں اور آپ کے نفسِ اطہر سے دوسرے نفوس کی طرف ہدایت وعلم کا انتقال ہوتا ہے۔ پس آپ ﷺ کے اور دوسرے قلوب کے درمیان وجہِ مناسبت طینت کی طہارت ہے۔ پس جو شخص طینت کی طہارت کے لحاظ سے حضور ﷺ کے زیادہ قریب ہوگا وہی زیادہ حصہ پائے گا۔ چونکہ صوفیا کے قلوب حضور ﷺ کے ساتھ زیادہ قرب رکھتے ہیں اسی لیے انہوں نے حقیقی علم سے وافر حصہ پایا ہے اور ان کے باطن زیادہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے زیادہ حاصل کیا اور آگے پہنچایا۔ [1]

امام سہروردیؒ کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جن کی اصل پاک ہے انہیں حضور ﷺ کے قلب اطیب سے علم وہدایت کا حصہ ملتا ہے کیونکہ "كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِه" (ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) اور پاک لوگوں کی اصل حضور ہیں اور علم وہدایت کے نور کا مرکز پاک مقام ہی ہوتا ہے اور حضور ﷺ کے قلبِ اقدس سے بڑھ کر کونسی چیز پاک ہو سکتی ہے؟ لہٰذا ازل سے ہی علم اور ہدایت کا ٹھکانہ حضور ﷺ کی روح مبارک، حضور ﷺ کی پاک طینت اور حضور ﷺ کا قلب اقدس ہے اسی لیے سب سے پہلے آپ ﷺ ہی نے "بلٰی" کہا اور آپ ﷺ ہی سے سن کر ساری مخلوق نے "بلٰی" کہا۔ معلوم ہوا کہ علم اور ہدایت کا پہلا سبق ساری مخلوق کو آپ ﷺ ہی کی مقدس روح سے ملا۔

بعض مفسرین کا بیان کردہ نکتہ

یہاں علامہ سید محمود آلوسی حنفیؒ نے ایک بہترین نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "بعض علمائے کرامؒ

---

[1] عوارف المعارف، صفحہ ۴۵۔

نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ ''ب'' ہی وہ پہلا حرف ہے جس کے ساتھ روح (بلیٰ سے) گویا ہوئی تھی اسی لیے دنیا میں بھی سب سے پہلے انسان کا منہ اسی حرف سے کھلتا ہے، بچہ جب شروع میں بولنے لگتا ہے تو حرف ''ب'' بکثرت استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اور بعض علمائے کرامؒ نے کہا ہے کہ ''ب'' میں اِنہی مخفی اسرار کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا افتتاح اسی سے فرمایا ہے کیونکہ ہر سورۃ کا آغاز ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے ہوتا ہے (ماسوا سورہ توبہ کے کہ اس کا آغاز لفظِ براءۃ سے ہوتا ہے) اور براءۃ کا پہلا حرف بھی ''ب'' ہے اور ہمزہ جسے عام لوگ الف کہتے ہیں اسے حروفِ تہجی میں سب سے اوّل اس لیے رکھا گیا ہے تا کہ اس سے ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ''[1] کی یاد تازہ رہے تاہم اسے بِسْمِ اللّٰهِ میں ظاہر نہیں کیا گیا جس میں ایک راز ہے جو ہم کتاب کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں۔

جو میثاق بھول گئے اُنہیں کیسے یاد ہو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر لوگ اس میثاق کو بھلا چکے ہیں تو انہیں کیسے دوبارہ یاد آئے؟ جواب صاف ظاہر ہے کہ جن حضرات کو یہ سبق یاد ہے اُن کی صحبت میں رہیں اور خدمت کا موقع حاصل کریں، کیونکہ یہ بات تو بداھتاً ہر شخص کو معلوم ہے کہ نہ جاننے والا جاننے والے سے ہی جانتا ہے اسی لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا''[2] ((وہ) رحمان ہے (اے معرفتِ حق کے طالب) تو اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ)۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا میثاق کے بارے میں ارشاد

سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی شخصیت متبرکہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کا شمار اُن ہستیوں میں ہوتا ہے جنہیں میثاقِ الست ہمیشہ یاد رہا۔ چنانچہ آپ معرفتِ توحید پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ''دفترِ توحید کب سے لپیٹا جاچکا ہے اور لوگ صرف اس کے حواشی پر کلام کر رہے ہیں اور فرمایا کہ سماع کے وقت لوگوں کے دل اور اعضاء کا مضطرب اور متحرک ہونا (وجد میں آنا) اس سبب سے ہے کہ ان کی ارواح سے اللہ تعالیٰ نے میثاقِ ازل میں خطاب فرمایا تھا ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' تو اس کے کلام کی مٹھاس کو ارواح نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا سو لوگ جب اس طیب نغمہ کو سنتے ہیں تو اس کی یاد پر حرکت میں آ جاتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا فقراء پر تین مقامات میں رحمت نازل ہوتی ہے۔ (۱) سماع کے وقت

---

[1] الاعراف، ۷:۱۷۲۔ [2] الفرقان، ۲۵:۵۹۔

(۲) طعام کھاتے وقت (۳) اور مذاکرۂ علم (یعنی مجالستِ علمی) کے وقت۔

آپ سے دریافت کیا گیا آپ نے یہ علم کہاں سے پایا ہے جبکہ آپ کے مشائخ سے یہ باتیں نہیں سنی گئیں؟ فرمایا تیس سال اس درجہ کے نیچے بیٹھنے (یعنی صحبت) کی برکت ہے۔[1]

ثابت یہ ہوا کہ میثاقِ اَلَستُ کا یہ سبق جنہیں بھول گیا وہ اسے یاد کرنا چاہتے ہوں تو عرفاءِ کرامؒ کی بارگاہ میں حاضر باشی خود پر لازم کرلیں۔ علامہ شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ لکھتے ہیں ''اللہ والے اپنے پیوند والے لباس اور بوریہ نشینی میں جس چین اور محبت الٰہیہ کی لذت میں رہتے ہیں، اگر سلاطین کو ان کی اس باطنی لذت کی خبر ہوجائے تو تلواریں لے کر چڑھائی کردیں لیکن یہ نعمت تلواروں سے نہیں ملتی، یہ نعمت تو کسی اللہ والے کے جوتے سیدھے کرنے ہی سے ملتی ہے اور وہ اللہ والا اپنی شکستہ حالی میں بزبانِ حال یہ کہتا ہے کہ۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(اگرچہ ہم قلاش اور دیوانے ہیں لیکن دنیا مردار کے طالب نہیں ہیں، اس ساقی ازل اور اس پیمانے کے مست ہیں جو اس نے روزِ ازل اپنے دستِ کرم سے ہمیں پلایا تھا) (۲-۲۴۶)

جرعہ چوں ریخت ساقیِ الست　　　بر سر ایں شورہ خاک زیر دست

(الست کے ساقی نے جب ایک گھونٹ بہایا اس نچلی بنجر زمین پر) (۵-۵۰)

یعنی اس خاکی انسان میں حق تعالیٰ کی محبت وہیں سے رکھ دی گئی تھی لیکن وہ علائقِ فانیہ اور رذائلِ نفسانیہ سے دبی ہوتی ہے۔ جو لوگ کسی اہلِ دل سے یعنی اللہ والے سے اپنی اصلاحِ نفس کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں ان کی وہ دبی ہوئی چنگاری روشن ہونے لگتی ہے اور محبت کا جو بیج ارواح میں حق تعالیٰ نے ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' فرما کر بودیا تھا وہ نشوونما پانے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معرفت اور محبت الٰہیہ کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک اس بندۂ عارف کو پہنچانا علمِ الٰہی میں تجویز ہوتا ہے۔ معرفت اور محبت کا پھل مجاہدہ پر موقوف ہے۔

برسائیں گے جب خونِ دل اور خونِ جگر ہم　　　دیکھیں گے تب ہی نخلِ محبت میں ثمر ہم

اس اقتباس میں یہ بات واضح ہے کہ جو عہد و پیمان ہم روزِ ازل میں کرچکے ہیں اور شرابِ محبت کا جو جرعہ ہم میثاقِ الست میں پی چکے ہیں، اس عہد کی تجدید اور شرابِ محبت کی لذت دوبارہ ہمیں اللہ والوں کے میخانوں ہی سے میسر ہوسکتی ہے اور روحانی دنیا کا لطف اور روح کی حقیقی توانائی کا ادراک بھی روحانی لوگوں کی معیت کے بغیر بہت مشکل امر ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ایک سوال کے جواب میں

---

[1] کشف المحجوب، صفحہ ۳۵۔

ارشاد فرماتے ہیں: ''محرك تن روح است ومحرك روح نور و محرك نورذات، عزيز من ایں مقام را کما ینبغی دانستن کمال محال است وشب وروزبذکروفکر وسیر و طیرانِ مقامات ماندن بجز طالب صادق وتوجہِ مرشد کامل حصولِ انتہانمی تواندشد'' (بدن کوحرکت دینے والی روح ہےاورروح کوحرکت دینے والانور ہے اورنور کی محرک ذات باری تعالیٰ ہے، میرے عزیز! اس مقام کوکما حقہ سمجھنا محال ہے، رات دن ذکروفکر، سیر ملکوتی اور عالمِ بالا میں پرواز سوائے طالبِ صادق اور مرشدِ کامل کی توجہ کے بغیر ناممکن ہے)۔

روح پر نفس کے اثرات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بلند پایۂ مقام اور باوقار صلاحیتیں دے کر پیدا فرمایا اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے تصرف کو ایک منفرد انداز سے ممتاز شکل عطا فرمائی کیونکہ اسے تمام مخلوقات کا سردار اور خلیفہ کی حیثیت عطا کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مخلوق کو بنی آدم سے وافر فیوضات نصیب ہوئے لہٰذا انسان کو خصوصی امتیازات سے نوازا جانا فہم سے بعید بات نہیں۔ جبرائیل علیہ السلام نے تخلیق آدم میں نمایاں فرائض انجام دیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ خبر دی کہ آدم علیہ السلام کو تمام مخلوق سے بڑھ کر فیض حاصل ہوگا اس لیے احادیث میں ہے کہ آپ نے بڑی تندہی سے تخلیق آدم میں حصہ لیا۔

انسان کو عطا کردہ فوقیت اور درجات کی بلندی کا ذکر قرآن پاک میں بھی متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطور یاددہانی پوچھا جارہا ہے کہ اے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اس وقت کو یاد کریں جب میں نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں اور جب تخلیقِ آدم علیہ السلام کی تکمیل ہوجائے تو تم اس کو سجدہ کردینا۔ درج ذیل آیت میں بھی انسان کو اس تخلیق کے متعلق یاد کرایا جارہا ہے''وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ '' [1] (اور بے شک ہم نے تمہیں (یعنی تمہاری اصل کو) پیدا کیا پھر تمہاری صورتگری کی (یعنی تمہاری زندگی کی کیمیائی اور حیاتیاتی ابتداء وارتقاء کے مراحل کو آدم علیہ السلام کے وجود کی تشکیل تک مکمل کیا) پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو)۔

سورۃ التغابن آیت نمبر ۳ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے''وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ''(اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہاری صورتیں بنائیں اور تمہاری صورتوں کو خوبصورت بنایا۔) ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے ایسا

[1] الاعراف،۷: ۱۱۔

بنایا جیسا کہ بنایا جانا چاہیے تھا تا کہ وہ اپنی تخلیق کے مقاصد کو صحیح طرح ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ چیونٹی کی اور ہاتھی کی ساخت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ ان جانوروں کا ایسا ہونا ہی ضروری تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت کو نہایت مناسبت سے بنایا ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں بلکہ ظاہری علامات کے علاوہ اسی طرح اس کے باطن کو بھی طرح طرح کی خوبیوں کا مخزن بنایا۔ اس مشت خاک میں فضا کو مسخر کرنے، سمندروں کو کھنگالنے، نیک و بد کی تمیز کرنے کی استعداد اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی۔ انسان کو ارادہ و عمل کے گوناگوں کمالات دے کر احسن تقویم کے مقام پر لا کھڑا کیا تا کہ وہ فرائض جن کو انجام دینا انسان کے ذمہ پر لگایا گیا ہے، ان کی ادائیگی کیلئے اس کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت مبارکہ ہے کہ جو کام انسان کی پہنچ سے باہر ہو اس کیلئے انسان کو مکلف نہیں کرتا یعنی احکام الٰہی انسانی وسعت سے باہر نہیں اور ہر وہ کام جس کیلئے انسان کو مکلف کیا گیا ہے اس کو انجام دینے کی قوت بھی اس کو ودیعت کر دی گئی ہے۔ یہ سب کچھ سوچ سمجھ لینے کے بعد انسان کو وہ امانت سونپی گئی جس کے باعث اسے خلیفۃ اللہ فی الارض مقرر کیا گیا' مگر انسان کو اس قدر قوتیں دینے کے بعد یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ انسان نے اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ' ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا مظاہرہ نہیں کیا اور پھر الٹا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرنے لگا کہ پہلے تو انسان پر اس قدر انعامات کی بارش کی گئی لیکن اب اسے دنیا میں تمام مخلوق میں ذلیل کیوں کر دیا گیا ہے۔ مرزا غالب نے انسان کے اس احساس کو یوں بیان کیا ہے۔۔

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

انسان پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعامات کی بوچھاڑ کی ہے کہ سورۃ التین میں ان الفاظ سے اظہار فرمایا کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ " [1] (بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل وشکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر) لیکن اس آیت سے اگلی آیت میں ہی یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر وہ اس مقصد کو نہ پہچانے تو جلد ہی نیچے سے نیچے والے درجے پر ہم لوٹا دیتے ہیں "ثُمَّ رَدَدْنٰـهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ o" [2] (پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیاo سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے)۔ انعامات الٰہیہ سے نوازے جانے پر قرآن مجید میں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ شاہد ہے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ " [3] (اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولادِ آدم کو)۔

سائنسدانوں کا قول ہے کہ انسان کو اس قدر قدرت عطا فرمائی گئی ہے کہ وہ جو کہتا ہے اس کو کر کے بھی

---

[1] التین، ۹۵:۴۔ [2] التین، ۹۵:۵۔ [3] بنی اسرائیل، ۱۷:۷۰۔

دکھاتا ہے۔ انسانی قدرت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ اگر چاہے تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس لاسکتا ہے۔ بعض انسان اس قدر تصرّف رکھتے ہیں کہ وہ تقدیر مبرم (اٹل تقدیر) کو بھی ٹالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

نگاہ ولی میں وہ تاثیر دیکھی بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

لیکن اگر انسان اس کا اہل بننے کی کوششوں سے رک جائے تو نیابتِ الٰہیہ کا تاج اس کے سر سے اتار لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پوری صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا مگر اس نے اپنے نفس کی آلائشوں سے مرعوب ہو کر اپنا وہ مقام کھو دیا جو اسے بارگاہِ ایزدی سے عطا ہوا تھا۔

انسان جب دنیا کی طرف بھیج دیا گیا تو دنیا میں آ کر اس کو خوراک، لباس، مکان، بیوی، بچوں اور دیگر کاروبار دنیا کی آرائشوں میں گرفتار کر دیا گیا اور ان چیزوں کی ضروریات نے انسان کو اپنی طرف اس طرح مائل اور منہمک کر لیا کہ عام انسان تو اللہ تعالیٰ کو قطعاً فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ رات دن طلبِ دنیا میں ہی غرق رہنے لگے۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو قرآن نے "اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ" کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ اولیائے کرامؒ نے جب لوگوں کی یہ حالت دیکھی تو ان کو ذکر الٰہی کا سبق دیا تا کہ اللہ اللہ کرنے سے یاد خدا ان کے دلوں میں دوبارہ موجزن ہو جائے۔ چنانچہ کچھ لوگ توبہ کرنے کے بعد راہِ راست پر آ کر اپنی عاقبت کو درست کر لیتے ہیں اور ان کے دل یادالٰہی سے منور ہونے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی بھی ہیں کہ جس طرح عالمِ ارواح میں ان کی روحیں یادالٰہی میں مشغول تھیں اسی طرح دنیا میں آنے کے بعد ان کی روحیں بدستور یادالٰہی میں ہمہ وقت مشغول رہتی ہیں اور ایک لمحہ کیلئے بھی وہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو اپنے دلوں سے محو نہیں ہونے دیتے۔ ایسے لوگوں کو محبوبانِ الٰہی کہا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کے متعلق قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ"[1] (وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یادِ الٰہی سے)۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ وہ جواں مرد ہیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے نیک مرد بھی ہیں جو اگر ایک لحظہ کیلئے بھی یادِ الٰہی سے غافل ہو جائیں تو خود کو مردہ تصور کرتے ہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کی کافی سے استشہاد

کوٹ مٹھن شریف والے حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی ایک کافی تبرکاً پیش کی جا رہی ہے، جس میں

---

[1] النور، ۲۴: ۳۷۔

انسان کی روح کی پاکیزگی اور نفس کی شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اولیائے کرامؒ اس بات سے آگاہ ہیں کہ کب لفظ "کُنْ" سے اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا۔ آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جب انسانوں کی روحوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے خارج کیا اور ان سے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب) کا وعدہ لیا تو "قَالُوْا بَلٰی" کا جواب دیتے ہوئے ہم نے بلٰی کا لفظ اپنے کانوں سے سنا ہے، کیونکہ جب یہ خطاب ہوا تو ہم گونگے بہرے نہ تھے۔ اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ ہم اب بھی "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" اور "قَالُوْا بَلٰی" کے عہد والی آواز اپنے کانوں سے سن رہے ہیں اور اس آواز کی گونج ابھی بھی ہمیں سنائی دے رہی ہے۔ حضرت بابا فریدؒ کوٹ مٹھن والوں کی کافی ملاحظہ فرمائیں۔

کُنْ فَیَکُوْن جد رب فرمایا اساں وی کولے ہاسے
قَالُوْا بَلٰی اَساں کَنی سُنیا کوئی گونگے بولے ناسے
اک لامکان مقام اَساں دا اتھاں آن بتاں وچ پھاسے
نفس فریدؔ پلیت چا کیتا اساں اصل پلیت تے ناسے

آخری دو شعروں کی وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ اگر انسان کا مقام (پیدائش سے پہلے) دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کو عالم ارواح میں لامکانیت کا درجہ حاصل تھا اور وہاں کے حالات اس قدر پاکیزہ تھے کہ وہاں ہر وقت انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف لگی رہتی تھی۔ کسی نافرمانی اور نفس کی سرکشی اور بغاوت کا اظہار ہرگز نہیں ہوتا تھا، لیکن جب ہم دنیا کے تنگ و تاریک مقام میں جسے مکانیت کا ایک حصہ قرار دیا جاتا ہے آئے تو دیکھا کہ وہ لامکان کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ خواجہ غلام فریدؒ نے بڑے افسوس اور یاس سے اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ اس دنیا میں جب سے ہم آئے ہیں تو مال و دولت، عزت و عظمت، صدارت و وزارت، نام و ناموس اور قوت و اقتدار کی جنگ و جدل میں الجھ گئے ہیں۔ آپ نے کس سادگی سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عالمِ ارواح میں تو یہ کیفیت نہ تھی مگر دنیا میں نفس کی آلودگیوں نے ہمیں پلید اور نامراد کر دیا ہے۔

عالمِ ارواح میں انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی تھی مگر جونہی وہ دنیا میں آیا تو اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہٹ کر اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے، کپڑا، خوراک، اور دیگر ضروریات زندگی کی طرف لگ گئی اور بعض انسان تو ایسے ہیں کہ صبح سے شام تک حصول دنیا کے چکروں میں کھوئے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت کم ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں کہ جس طرح عالم ارواح میں ان کی توجہ الی اللہ تھی عین اسی طرح

دنیا میں بھی وہ ہمہ وقت متوجہ الی اللہ رہتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مقام محبوبین کا ہے اور فاسق اور فاجر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو بالکل فراموش کر دیا، لہٰذا اسی دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ قائم کر سکے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ذلت اور خواری سے محفوظ رکھتا ہے۔

مذکورہ اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی اصل تو پاکیزہ ہے مگر کچھ لوگ دنیا میں آ کر بُری صحبت میں رہ کر بری عادات میں الجھ کر خدا کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے میسر ہے تونگری سے نہیں!

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں!

(ض ک:۴۸۴)

جسم اور روح کے ملاپ سے نفس پیدا ہوتا ہے

جسم اور روح کو ملا کر ملکوتیت اور بہیمیت کو یکجا کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دائمی کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ روح عالم بالا کی بلندیوں کے ساتھ تعلق ہونے کی وجہ سے تقاضا کرتی ہے کہ بندے کو بلندیوں کی طرف لے جائے۔ جسم چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق رکھتا ہے انسان کو سفلیت کی جانب کشش کرتا ہے اور انسان کو خواہشات نفس اور شہوات کا غلام بننے پر مجبور کرتا ہے اور یہ کشش اس لیے ہے کہ ''كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ'' (ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے)۔

روح اور جسم کو ملانے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ روح اور جسم کو ملانے سے ایک آئینہ پیدا ہوتا ہے جس میں اسماء و صفات حق تعالیٰ کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بحث کو جو ''اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ''[1] (بیشک ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے) سے تعلق رکھتی ہے ہم اپنی کتاب ''حسنِ نماز'' میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ بارِ امانت خلافتِ ارض اور نیابت الٰہی کا تھا۔ انسان کے روح اور جسم کے بنے ہوئے آئینے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء اور صفات کا رنگ روپ دیکھا یعنی اپنے حسن و جمال کا مشاہدہ کیا تو اس پر شیدا ہو گیا۔

---

[1] الاحزاب، ۳۳:۷۲۔

باب نمبر ۸

قلب اور عقل پر اثراتِ نفس

قلب پر نفس کے اثرات

دل کو لغتِ عرب میں قلب کہتے ہیں اس کے حِسّی اور معنوی لحاظ سے اس کے متعدد معانی ہیں۔ حِسّی طور پر قلب سے مراد گوشت کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو سینے کے بائیں جانب موجود ہے۔اس کا عمل یہ ہے کہ یہ پورے جسم میں خون کو گردش میں رکھتا ہے اور ایک آن کیلئے بھی اس کی حرکت بند نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ خون کو پمپ کرنے کیلئے ہر وقت متحرک رہتا ہے اسی لیے یہ جسم کے دیگر اعضاء سے زیادہ گرم رہتا ہے بلکہ یہ سارے جسم کیلئے بمنزلۂ انجن ہے اور انجن گرم ہو جائے (یعنی اعتدال سے زیادہ گرم ہو جائے) تو خطرہ ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پھیپھڑوں کو دل کیلئے پنکھا بنا دیا ہے جو اسے ہوا بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ طب اور میڈیکل سائنس کی تمام تر بحث کا تعلق اسی قلبِ صنوبری سے ہوتا ہے لیکن صوفیاء جب قلب کی بات کرتے ہیں تو ان کی مراد یہ قلب صنوبری نہیں ہوتا۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے لکھا ہے کہ اس قلب صنوبری کے اندر ایک اور نورانی دل ہے جس کو اصلی دل کہا جاتا ہے۔ یہ گوشت کا دل اصلی دل کا گھر ہے چنانچہ امام غزالی ؒ لکھتے ہیں: ''گوشت کا صنوبری (صنوبر چلغوزے کو کہتے ہیں اور دل بھی چلغوزے کی طرح لمبا اور گول ہوتا ہے اسی لیے دل کو قلبِ صنوبری کہتے ہیں) ٹکڑا جو سینے کے بائیں جانب ہے اور اس میں ایک خلاء ہے اور اس خلاء میں ایک سیاہ خون ہے اور وہی خون روح کا منبع اور مخزن ہے اور ہمارا مقصود یہاں اس کی شکل اور ہیئت پر بحث کرنا نہیں ہے، یہ بحث اطباء کے ساتھ مخصوص ہے اور اس بحث کا مقاصدِ دینیہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ قلب تو جانوروں کو بھی حاصل ہے بلکہ میت میں بھی ہوتا ہے، سو جب ہم لفظِ قلب استعمال کریں تو اس سے

ہماری مراد گوشت کا یہ ٹکڑا نہیں ہوگا کیونکہ اس کی کوئی قدر نہیں ہے یہ عالم شہادت (دنیا) کی چیز ہے اس کا ادراک سر کی آنکھ سے کیا جاتا ہے۔"[1]

قلب کی معنوی وضاحت

قلب ایک لطیفۂ ربانی ہے اور یہ روحانی چیز ہے اس کا جسمانی دل یعنی قلبِ صنوبری کے ساتھ تعلق ہے اور یہی لطیفہ انسان کی حقیقت ہے، انسان کے اندر ادراک کرنے، جاننے اور پہچاننے کی قوت یہی لطیفہ ہے اور خطاب، عتاب، عقاب اور مطالبہ کا تعلق اسی سے ہوتا ہے۔[2]

علامہ سید محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدیؒ لکھتے ہیں کہ بعض علمائے لغت کہتے ہیں کہ قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ہر وقت اپنی حالت بدلتا رہتا ہے اور ابن سیدہ کہتے ہیں کہ قلب سے مراد "فواد" ہے، علامہ لحیانی نے بھی اسی کی تصریح کی ہے۔[3] صاحبِ قاموس کہتے ہیں قلب فواد سے خاص ہے کیونکہ یہ حقائق میں سے ایک خاص حقیقت ہے اور اس کی تائید حدیثِ پاک سے ہوتی ہے "اَتَاکُمْ اَھْلُ الْیَمَنِ ھُمْ اَرَقُّ قُلُوْبًا وَّاَلْیَنُ اَفْئِدَۃً"[4] (تمہارے پاس اہلِ یمن آئے ہیں جو قلوب کے لحاظ سے رقیق اور فواد کے لحاظ سے نرم ہیں)۔

اس حدیثِ پاک میں قلوب کو رقت کے ساتھ اور فواد کو لین (نرمی) کے ساتھ متصف کیا ہے۔ اس لیے کہ قلب فواد سے مخصوص ہے اور اس بات کا انکار بھی نہیں کیا گیا کہ قلب سے مراد وہ سیاہ خون ہو جو دل کے اندر ہوتا ہے بعض کا قول ہے کہ فواد، قلب کا برتن ہے اور قلب کو عقل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام فراء نے "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ"[5] میں قلب سے عقل مراد لی ہے۔[6]

علامہ زبیدیؒ کی بیان کردہ یہ بات کہ قلب بول کر عقل مراد لی جاتی ہے، ہم اس کی توضیح مشہور محقق علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی کی تحریر سے پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں عقل اور ادراک کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے دماغ کی طرف نہیں کی گئی، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ عُرف اور ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے اور روزمرہ کی گفتگو، عرف، محاورات اور ادبی زبان میں علم وادراک، سوچ و بچار، احساسات، جذبات و خیالات بلکہ تقریباً دماغ کے تمام افعال کو سینے اور دل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ کسی چیز کے یاد ہونے کو کہتے ہیں کہ وہ تو میرے سینے میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل یہ کہتا ہے، میرا دل اس کو نہیں مانتا، حالانکہ دل

---

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۴۔
[2] کتاب التعریفات، جلد ۱، صفحہ ۱۲۶۔
[3] تاج العروس، جلد ۴، صفحہ ۶۹۔
[4] صحیح بخاری، حدیث ۴۱۲۷، جلد ۴، صفحہ ۱۵۹۴۔
[5] ق، ۵۰: ۳۷۔
[6] تاج العروس، ج ۴، صفحہ ۶۹۔

تو صرف خون پمپ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی پڑھے لکھے ادیب اور سائنس دان اپنی گفتگو میں الفت و محبت اور علم وادراک کی نسبت دل کی طرف کرتے ہیں دماغ کی طرف نہیں کرتے"۔

قرآن مجید میں عام لوگوں کے عرف اور محاورے کے مطابق خطاب ہے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" [1] (اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا)۔ حالانکہ یہ پانی بخارات کی صورت میں زمین سے اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے لیکن چونکہ عرف اور محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آسمان سے بارش ہوئی، اس لیے اس عرف کے مطابق ارشاد فرمایا۔ نیز ایک اور مقام پر ارشاد ہے "حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ" [2] (یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں)۔ حالانکہ عقل اور سائنس کے نزدیک سورج کبھی غروب نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اپنے مدار میں گھومتا رہتا ہے اور یہ تو بالکل بدیہی بات ہے کہ سورج چشمہ میں غروب نہیں ہوسکتا لیکن عرف میں ایسا ہی کہتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں "سورج پہاڑ کے پیچھے ڈوب گیا" اسی طرح عرف کے مطابق عقل کی جگہ قلب بول دیا گیا ہے۔ [3]

نفس کا قلب انسانی سے تعلق

قلب انسانی ایک نورانی چیز ہے اور اس میں ایک فرشتہ متعین ہے جو انسان کو نیکی کے کاموں کیلئے راغب کرتا ہے لیکن جب دل نفس کی ہمسائیگی سے زنگ آلود ہو جاتا ہے تو دل میں بُرے خیالات اور بُرے کام کرنے سے سیاہ دھبے لگتے رہتے ہیں حتیٰ کہ دل گناہوں کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے دل کو صیقل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ضرب لگاتا رہے تو ایک دن یہ دل بالکل سفید، شفاف اور چمکدار ہو جاتا ہے۔ نفس کا مقام انسانی ناف سے ذرا نیچے ہے اور نفس اپنی اصل خباثت پر قائم ہے اور قلب کی طرح ذکر کرنے سے نورانی نہیں ہوتا۔ نفس کی صفت خباثت پر رکھی گئی ہے اور اس کو جتنا بھی صاف کرنے کی کوشش کی جائے تب بھی یہ خبیث ہی رہے گا۔ اس کا علاج بزرگوں نے اس بات پر رکھا ہے کہ نفس کو مشقت میں ڈالا جائے تو یہ تھک کر اپنی عادت کو بدل لیتا ہے اور انسان کی تابع فرمانی میں آجاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغی اور سرکش گھوڑے کو سہاگے کی بھاری لکڑی کھینچنے کیلئے اس کے پیچھے باندھ دی جائے اور صبح سے شام تک اس کو بھگایا جائے تو کچھ دنوں کے بعد وہ گھوڑا تنگ آجائیگا اور مالک کی فرمانبرداری کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس آمادگی کے بعد مالک اس کی مزید تربیت کرتا ہے تو وہ مالک کے اشاروں پر بڑے بڑے کام

---

[1] البقرہ، ۲:۲۲۔ [2] الکھف، ۱۸:۸۶۔

[3] شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد ۲، صفحہ ۱۴۱، فرید بک سٹال، لاہور۔

کرنے لگتا ہے، مثلاً اونچی چھلانگ، لمبی چھلانگ اور زمین پر گرے ہوئے چابک کو اپنے منہ سے اٹھا کر مالک کو دینا وغیرہ۔ اسی طرح نفس کو اگر شریعت کے کاموں میں مبتلا کیا جائے تو نفس اس میں موجود مشقت سے بھی تابع فرمان ہو جاتا ہے اور انسان کو بڑی بڑی کرامات کا مالک بنا دیتا ہے۔ بزرگوں کے تصرفات بھی نفس کی اصلاح کے بعد ہی نظر آتے ہیں۔

اگر قلب کی صفائی ذکر کے انوار سے متجلی ہو تو نفس کی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ قلب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ اگر قلب کی حالت زنگ آلودہ ہو تو نفس انسان کے دل پر شیر کی طرح غالب ہو جاتا ہے۔ اس لیے قلب کو ذکرِ الٰہی سے مزکیٰ اور متجلی رکھنا ضروریاتِ تصوف میں سے ہے۔

اعمالِ انسانی کا دلوں پر مدار ہے

نیت دل کے ارادے کا نام ہے اور دل کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو تمام بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے اور ہر چیز اپنا کام صحیح کرنے لگتی ہے[1] حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کیلئے نیت کرے کہ میں ہر کام اللہ تعالیٰ کیلئے کر رہا ہوں کیونکہ کھانا، پینا، پہننا اور سونا وغیرہ اگرچہ اصلاً نفس کی راحت کیلئے ہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی نیت کرے تو معصیت سے محفوظ رہتا ہے اور اجر پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے کاموں میں معاون بن جاتا ہے۔ اگر نیت غیر اللہ کیلئے اور غیر صالح ہے تو وہ کام اس کیلئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''جس نے اللہ تعالیٰ کیلئے خوشبو لگائی تو قیامت کے دن اس کی خوشبو مشک اذفر سے زیادہ اچھی ہوگی اور جس نے غیر اللہ کیلئے خوشبو لگائی تو قیامت کے دن اس کی بدبو مردار سے بھی زیادہ ہوگی۔''[2]

روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری ہتھیلی کو مشک سے معطر کرو کیونکہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہیں اور میرے ہاتھوں کو چومتے ہیں۔ مقربین اچھا لباس اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔

ایک بزرگ نے اپنے بالوں کو صاف کرنے کی نیت سے بیوی کو آواز دی کہ کنگھی لاؤ۔ بیوی نے کہا کہ کیا آئینہ بھی لاؤں۔ اس بزرگ نے کچھ توقف کے بعد کہا لے آؤ تو اس کی بیوی نے پوچھا آپ نے توقف کیوں کیا تو اس بزرگ نے کہا جب میں نے نیت کر کے کنگھا لانے کیلئے کہا تو آپ نے اس میں شیشہ بھی شامل کر دیا جبکہ میں نے شیشہ کیلئے نیت نہ کی تھی اس لیے میں نے توقف کیا اور اس وقفہ میں اللہ تعالیٰ نے

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۵۶۴، جلد ۴، صفحہ ۱۹۸۶۔ [2] مصنف عبدالرزاق، حدیث ۷۹۳۳، جلد ۴، صفحہ ۳۱۹۔

شیشہ کیلئے نیت کرادی۔تب میں نے کہاہاں۔

قرآن اور حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ انسانی اعمال کا مدار دلوں پر ہے اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ " [1] (اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور عملوں کی طرف دیکھتا ہے) اسی حقیقت کے پیش نظر حضور ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" [2] (یعنی بے شک اعمال کا مدار نیتوں پر ہے)۔ اگر نیت درست ہو جائے تو دلوں میں نیک ارادے پیدا ہوتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کا صدور ہوتا ہے۔ صوفیائے کرامؒ کی عبادتوں اور مجاہدوں کی غرض وغایت دلوں کی درستی سے متعلق ہے۔

سید عالم ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ "بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ صحیح رہے تو پورا بدن صحیح رہتا ہے اور اگر وہ فساد کا شکار ہو جائے تو پورا بدن فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے"۔ [3] مشائخ کبار کا قول ہے کہ قلب کے فساد کا سبب نفس ہے "فَاِنَّ سَائِرَ اَمْرَاضِ الْقَلْبِ اِنَّمَا تَنْشَأُ مِنْ جَانِبِ النَّفْسِ فَالْمَوَادُّ الْفَاسِدَةُ كُلُّهَا اِلَيْهَا تَنْصَبُّ ثُمَّ تَنْبَعِثُ مِنْهَا اِلَى الْاَعْضَاءِ" [4] (پس بلاشبہ دل کے تمام امراض نفس کی طرف سے لاحق ہوتے ہیں اور تمام فاسد مواد نفس ہی کی طرف اٹھتے ہیں پھر اس سے اعضاء کی طرف جاتے ہیں)۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے "اَلنَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَتَشْتَهِىْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُهٗ اَوْيُكَذِّبُهٗ" (نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تائید یا انکار کرتی ہے)۔ [5] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں "یاد رکھو! وہ تمام اعمال جن کا انسان عزمِ مصمم (پختہ ارادہ) کرتا ہے اور وہ تمام صفات جو انسان میں راسخ ہیں ان تمام کی اصل نفسِ ناطقہ ہے"۔ [6]

غور وفکر کی اضافت قلب کی طرف کرنا حقیقت ہے، مجاز نہیں

مشہور حدیث ہے کہ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلَا وَاِنَّ فِى الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِىَ الْقَلْبُ " (سنو! بے شک جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۲، جلد ۱، صفحہ ۲۸۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۱، جلد ۱، صفحہ ۱۔
[3] صحیح البخاری، حدیث ۵۲، جلد ۱، صفحہ ۲۸۔
[4] اغاثۃ اللھفان، جلد ۱، صفحہ ۷۔
[5] صحیح بخاری، حدیث ۶۲۳۸، جلد ۶، صفحہ ۲۴۳۸۔
[6] حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ، جلد ۱، صفحہ ۵۹، دار الکتب الحدیثیہ، القاہرہ۔

بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے) [1]

اس حدیث میں قلب کو "مُضْغَةً" کہا گیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ "مُضْغَةً" (گوشت کا ٹکڑا) عقل نہیں، دل ہی ہو سکتا ہے۔ بہر کیف قلب بول کر عقل مراد لی گئی ہو تب بھی بات سمجھ آ سکتی ہے کیونکہ قلب تمام جسمِ انسانی کا بادشاہ ہے۔ قلب اگر دماغ کی طرف خون سپلائی نہ کرے تو دماغ میں عقل کام کرنا چھوڑ دے گی۔

یہاں ایک لطیف نکتہ ذہن میں آ رہا ہے جسے ہم قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ایک لطیف نکتہ: ہر چند کہ غور و فکر اور سوچ و تدبر دل کا نہیں عقل کا کام ہے لیکن جب انسان کفر و شرک اور معصیت و غوایت اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے تو قلب کا عقل پر صحیح کنٹرول نہیں رہتا، خود غور کیجئے کہ انسان سے تازہ تازہ کوئی جرم ہوا ہو اور وہ لوگوں پر بر وقت عیاں ہو جائے اور وہ اس کے تعاقب میں لگ جائیں اور یہ بھاگ کر کسی جگہ پناہ لے لے تو ایسی صورتِ حال میں اس کے قلب کی دھڑکن بہت تیز ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے عقل بھی کماحقہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار نہیں لا سکتی۔ اسی طرح جو لوگ قوانینِ فطرت کے خلاف زندگی گزارتے ہیں تو وہ ایک نامعلوم خوف، اضطراب، بے چینی اور بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں اسی لیے اُن کا قلب اس مسلسل پریشانی کے باعث دماغ کو خالص مواد فراہم نہیں کر پاتا یہاں تک کہ ان کے دماغ میں عقل کی کارکردگی ماند پڑنے لگتی ہے بالآخر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جسے قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ" [2] (اور اللہ نے تمہیں پیدا فرمایا ہے پھر وہ تمہیں وفات دیتا (یعنی تمہاری روح قبض کرتا) ہے۔ اور تم میں سے کسی کو ناقص ترین عمر (بڑھاپا) کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ (زندگی میں بہت کچھ) جان لینے کے بعد اب کچھ بھی نہ جانے (یعنی انسان مرنے سے پہلے اپنی بے بسی و کم مائیگی کا منظر بھی دیکھ لے)۔

سورۃ الحج کی آیت نمبر ۵ میں بھی یہی مضمون ہے۔ مگر اہلِ ایمان، صاحبانِ قرآن اور اعمالِ صالحہ کے پیکر حضرات "ارذل العمر" کی اس حالت سے مستثنیٰ رہتے ہیں چنانچہ حضرت عطاؒ سیدنا ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یہ خلل (کامل) مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوتا مسلمان کی عمر جوں جوں بڑھتی ہے اُسی قدر وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں عزت اور معرفت میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ قرآن کو بے عقلی کی عمر کی طرف نہیں لوٹایا جاتا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے، اور اسکی تائید اس فرمانِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝" [3] (پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور

---

[1] صحیح البخاری، حدیث ۵۲، جلد ۱، صفحہ ۲۸۔　[2] النحل، ۱۶: ۷۰۔　[3] التین، ۹۵: ۵، ۶۔

نیک عمل کرتے رہے تو ان کیلئے ختم نہ ہونے والا (دائمی) اجر ہے)۔[1]

حضرت عبدالملک بن عمیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دور میں کہا جاتا تھا کہ تمام لوگوں سے بڑھ کر بقائے عقل قرآن پڑھنے والے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔[2]

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ "مَنْ جَمَعَ الْقُرْاٰنَ مَتَّعَ اللّٰهُ بِعَقْلِهٖ حَتّٰى يَمُوْتَ" [3] (جو شخص قرآن پاک کی بکثرت تلاوت کرے (یا قرآن حفظ کرے) اللہ تعالیٰ مرتے دم تک اس کی عقل سے اُسے نفع دے گا)۔

قرآن مجید پر عمل پیرا حضرات ہی کامل مؤمنین ہیں یہ حضرات چونکہ محرمات اور ممنوعات سے بچتے ہیں اور حلال ہی تک خود کو محدود رکھتے ہیں اور اپنے بدن کو حرام خوری سے محفوظ رکھتے ہیں اس لیے ان کا قلب اعتدال پر قائم رہتا ہے اور دماغ کو صحیح مواد فراہم کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کی عقل تاحیات قائم رہتی ہے۔

ہمارے اس استدلال کی تائید متذکرہ بالا حدیث کے پہلے حصہ سے ہوتی ہے۔ یہاں ہم مکمل حدیث کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ امام مسلمؒ لکھتے ہیں "حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے اپنی دو انگلیوں سے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جن کا بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے، سو جو شخص مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جس شخص نے امور مشتبہ کو اختیار کر لیا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، جس طرح کوئی شخص کسی چراگاہ کی حدود کے گرد جانور چرائے تو قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی چر لیں۔ سنو! ہر بادشاہ کی چراگاہ کی ایک حد ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی حدود اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں، اور سنو! جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو! وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے"۔[4]

خود غور فرمائیے! حلال وحرام اور مشتبہ امور کے بیان کے بعد قلب کے ذکر کرنے میں آخر کیا حکمت ہے؟ یقیناً وہی کہ اگر حرام اور مشتبہ چیزوں سے نہیں بچو گے تو قلب فساد کا شکار ہو جائیگا اور قلب کے فساد کا اثر پورے جسم کے ساتھ عقل پر بھی پڑے گا۔ پھر حدیث پاک کے یہ الفاظ نہایت غور طلب ہیں "جو شخص مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا"۔ انسان اپنے اندر یا اپنے گرد و پیش کے ان

---

[1] شعب الایمان للبیہقی، حدیث ۲۷۰۶، جلد۲، صفحہ ۵۵۶۔ [2] شعب الایمان، حدیث ۲۷۰۸، جلد۲، صفحہ ۵۵۷۔

[3] کنز العمال، حدیث ۲۳۱۸، جلد۱، صفحہ ۲۶۱۔ [4] صحیح بخاری، حدیث ۵۲، جلد۱، صفحہ ۲۸۔

لوگوں پر نظر کرے جو حرام خوری سے، مشتبہات اور ممنوعات سے نہیں بچتے اُن کی عزتیں کس قدر پامال ہوتی ہیں، خدا کی پناہ! بعض ایسے گھرانے جن کی روزی حلال ذرائع سے نہیں ہوتی ہم نے ان کا مشاہدہ کیا ہے کہ ان کی عزتیں پامال ہوتی رہتی ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ہے اور ضمیر اس لیے مردہ ہو چکا ہوتا ہے کہ قلب کو خالص خون فراہم نہیں ہوتا اور قلب کو خالص خون کیونکر فراہم ہو سکتا ہے جب جسم میں حلال پہنچایا ہی نہیں گیا۔

ایسے ہی لوگ آہستہ آہستہ پورے معاشرے کیلئے دردِ سر بن جاتے ہیں اور جو جتنا حرام خوری اور حرام کاری کا مرتکب ہوگا وہ اتنا ہی بے عقل ہوگا اور پھر جس قدر بے عقلی میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا اسی قدر حیوانیت میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا حتیٰ کہ انسان درندہ بن جائیگا، ایسے ہی لوگوں کیلئے قرآن مجید میں ارشاد ہے ''اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ'' [1] (وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ)۔

یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کیلئے درندہ بن جائے۔ اس تفصیل کے بعد آپ سے گزارش ہے کہ آپ سورہ التّیْنِ کی آیت نمبر ۵ کی تفسیر ضیاء القرآن میں ملاحظہ فرمائیں، آپ پر واضح ہو جائیگا کہ قرآن وسنت سے روگردانی کرنے والے اور ممنوعات ومحرمات کے مرتکب ہونے والے لوگ کس طرح عقل سے محروم ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفس کی ناجائز خواہشات کی تکمیل کرنے سے قلب پر نہایت بُرا اثر ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ بن جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لے اور اس گناہ سے باز آ جائے تو قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ بار بار گناہ کرتا رہے تو وہ نقطہ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ پورے قلب پر چھا جاتا ہے سو یہ وہی نقطہ ہے جسے قرآن میں ''رَانَ'' کہا گیا ہے، ارشادِ الٰہی ہے ''کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ o'' (ایسا) ہرگز نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان اعمالِ (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے (اس لیے آیتیں ان کے دل پر اثر نہیں کرتیں)۔ [2] جب دل کی کارکردگی متاثر ہو جائے تو عقل کی کارکردگی صحیح نہج پر کیونکر رہ سکتی ہے؟

عقل پر نفس کے اثرات

اس سے پہلے کہ ہم عقل پر نفس کے اثرات کا جائزہ لیں، یہ جاننا ضروری ہے کہ عقل کیا ہے ذیل

---

[1] الاعراف، ۷:۱۷۹۔ [2] المطففین، ۸۳:۱۴۔

میں عقل کی لغوی اور اصطلاحی تعریفات اور اقوال آئمہ کا ذکر کیا جائے گا۔

عقل کیا ہے؟

عقل کیا ہے؟ اس بارے میں اربابِ عقل کے متعدد اقوال ہیں، جن کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ صاحب قاموس کہتے ہیں "علم کو عقل کہتے ہیں" اور کتاب الحکم میں ہے کہ "عقل حماقت کی ضد ہے" یا عقل اشیاء کی صفات حسنہ اور سیئہ اور ان کے نفع اور نقصان کو جاننے کی قوت کا نام ہے، یا عقل خیر اور شر میں تمیز کرنے کا نام ہے، یا مطلقاً تمام امور میں حسن اور قبح کو معلوم کرنے کی قوت کا نام عقل ہے، نیز انسان کی حرکات اور اس کے کلام کی محمودیّت پر عقل کا اطلاق ہوتا ہے۔[1]

وہ قوّت جو قبولِ علم کیلئے تیار ہوا سے عقل کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان اس قوت کی بدولت جو کچھ مستنبط (حاصل) کرتا ہے وہ بھی عقل ہے، اسی لیے حضرت علی ؓ نے ارشاد فرمایا عقل کی دو قسمیں ہیں (۱) عقلِ مطبوع (۲) عقلِ مسموع، سو عقلِ مطبوع اس وقت تک بیکار ہے جب تک عقلِ مسموع نہ ہو۔ جیسا کہ آفتاب کی روشنی سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ آنکھ کی روشنی نہ ہو۔ ان میں سے پہلے معنٰی کی طرف حدیث پاک میں یوں اشارہ کیا گیا ہے "مَاخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْرَمَ مِنَ الْعَقْلِ"[2] (اللہ تعالیٰ نے عقل سے زیادہ مکرم کوئی مخلوق پیدا نہیں فرمائی)۔ اور دوسرے معنٰی کی طرف یوں اشارہ فرمایا "مَاكَسَبَ اَحَدٌ شَيْأً اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ يَهْدِيْهِ اِلٰى هُدًى اَوْيَرُدُّهُ عَنْ رِدًى"[3] (کسی شخص نے عقل سے افضل کوئی چیز نہیں کمائی، وہ عقل جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور ضلالت سے منع کرے)۔

علامہ محمد فرید وجدیؒ کہتے ہیں "عقل انسان میں ادراک (جاننے) کی قوّت ہے اور یہ روح کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس کا مقام مُخ (مغز) ہے جیسا کہ ابصار روح کے خصائص میں سے ایک خاصہ ہے اور اس کا آلہ آنکھ ہے"۔[4]

علامہ میر سید شریف جرجانیؒ لکھتے ہیں "عقل وہ قوت ہے جس سے حقائقِ اشیاء کا ادراک ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا محل (مقام) سَر ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا محل قلب ہے"۔[5]

علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں "عقل وہ قوت ہے جس میں علوم اور ادراکات کی صلاحیت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عقل ایک جوہر ہے جس سے غائبات کا بالواسطہ اور محسوسات کا بالمشاہدہ ادراک ہوتا ہے"۔[6]

---

[1] القاموس، جلد۱، صفحہ ۱۳۳۶۔ [2] مرقاۃ المفاتیح، جلد۹، صفحہ ۲۶۱۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۵۱۳۹، جلد۷، صفحہ ۱۸۰۔ [4] دائرۃ المعارف القرن العشرین، جلد۶، صفحہ ۵۲۲۔

[5] کتاب التعریفات، صفحہ ۱۰۹۔ [6] شرح المقاصد، مسعود بن عمر التفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ، جلد۱، صفحہ ۱۶، دار المعارف، بیروت۔

علامہ ابن جوزیؒ لکھتے ہیں ''امام احمد بن حنبل ؒ نے فرمایا عقل ایک فطری چیز ہے اور حارث محاسبیؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے، نیز محاسبی سے یہ قول بھی منقول ہے کہ عقل ایک نور ہے، اور دیگر اہلِ علم نے کہا عقل ایک قوت ہے جس سے معلومات کی حقیقتوں میں تمیز کی جاتی ہے، ایک اعرابی سے عقل کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا یہ ایک نچوڑ اور خلاصہ ہے جو میں نے تجربات سے پایا ہے''۔[1]

علامہ ابن جوزیؒ نے مختلف اقوال درج کرنے کے بعد اپنی رائے یوں ظاہر فرمائی ہے ''جاننا چاہیے تحقیق یہ ہے کہ عقل ایک نام ہے جو چار مشترک معانی کیلئے بولا جاتا ہے''۔

۱) یہ ایک صفت ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور اسی کی بدولت انسان نظریاتی علوم کی قبولیت کی استعداد رکھتا ہے اور خفیہ اور فکری صنعت وحرفت کی تدبیر کرتا ہے، اور جن لوگوں نے اسے قوتِ غریزی (فطری) کہا ان کا مقصود یہی معنٰی ہے، گویا کہ یہ ایک نور ہے جسے قلب میں رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اشیاء کے ادراک کی استعداد پیدا ہو۔

۲) یہ طبیعتوں میں ممکنات اور ممتنعات کا رکھا ہوا ایک علم ہے۔

۳) تجربات سے مستفید شدہ علوم کا نام عقل ہے۔

۴) اس قوتِ غریزی کا انتہائی معنٰی یہ ہے کہ یہ شہوت کے اس داعیہ کو دبادے جو لذّتِ عاجلہ کو چاہتا ہے (یعنی جلد بازی سے روکے)۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادیؒ نے جو اپنا مختار قول لکھا ہے وہی دل کو زیادہ درست لگتا ہے، آپ فرماتے ہیں ''حق یہ ہے کہ عقل ایک روحانی نور ہے جس کے ذریعے نفس علومِ ضروریہ اور نظریہ کا ادراک کرتا ہے۔ اس کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں چھپا ہوتا ہے، پھر یہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے اور بلوغت کی عمر تک کامل ہو جاتا ہے۔[2]

عقل حقیقت شناس اور نفسِ امّارہ کی جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ مولاناؒ نے اس مضمون کو بہت سی مثالوں سے ظاہر فرمایا ہے مگر مجنوں اور اس کی اونٹنی کی مثال لاجواب ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجنوں لیلٰی کے شہر کی طرف جانے کیلئے اپنی اونٹنی پر سوار ہوا مگر اونٹنی کی توجہ تمام تر اپنے بچے کی طرف لگی رہتی تھی جس بچے کو مجنوں کے گھر میں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ مجنوں کے ہاتھ سے اونٹنی کی لگام جب عشق کے نشے میں ذرا ڈھیلی ہوتی تو اونٹنی اپنے گھر کی طرف واپس چلنا شروع کر دیتی اور مجنوں کو جب معلوم ہوتا کہ اونٹنی گھر کیطرف جا رہی ہے تو وہ پھر سے اس کی لگام کھینچ کر لیلٰی کے گھر کی طرف اس کا رخ کر دیتا۔ یہ واقعہ تین چار بار ہوا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقل انسان کو راہ راست پر لانا چاہتی ہے تاکہ انسان اپنی منزل مقصود

---

[1] بغیۃ المرتاد، عبدالحلیم ابن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، جلد ۱، صفحہ ۲۶۵، مکتبۃ العلوم، بیروت۔ [2] القاموس المحیط، جلد ۱، صفحہ ۱۳۳۶۔

تک پہنچے مگر ذرا سی غفلت ہو جائے تو طے کیا ہوا راستہ دوبارہ طے کرنا پڑتا ہے اور ساری عمر کولہو کے بیل کی طرح وہیں چکر پر چکر کاٹتا رہتا ہے۔ نفسِ امارہ سے خدا تک کا راستہ دو قدم کی مسافت ہے مگر انسان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح برسوں بیابانوں میں گھومتا رہتا ہے۔ مجنوں نے تنگ آ کر یہ کیا کہ جب اس کی اونٹنی واپس آنے سے باز نہیں آئی تو اس نے اپنے آپ کو اونٹنی سے نیچے گرا دیا کہ اس سے بہتر ہے میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔ جب چھلانگ لگائی تو پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس نے کہا کہ میں گیند کی طرح ہی لڑھکتا ہوا پہنچ جاؤں گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشقِ لیلیٰ عشقِ مولیٰ سے تو کم تر ہے۔ عشق مولیٰ میں بھی انسان کو اور مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

میلِ مجنوں پیشِ آں لیلیٰ رواں　　میلِ ناقہ پس پئے کرہ اش رواں

(مجنوں کی خواہش لیلیٰ کی طرف رواں ہے اونٹنی کی خواہش پیچھے کو بچہ کیلئے دوڑتی ہے) (۱۵۳/۴)

یک دم از مجنوں زخود غافل بُدے　　ناقہ گردیدے و واپس آمدے

(اگر مجنوں تھوڑی دیر کیلئے اپنے سے غافل ہو جاتا تو اونٹنی لوٹ جاتی اور واپس آ جاتی) (۱۵۳/۴)

لیک ناقہ بس مُراقب بوُد و چُست　　چوں بدیدے اُو مہارِ خویش سُست

(لیکن اونٹنی بہت نگران اور چست تھی جب وہ اپنی مہار کو ڈھیلا دیکھتی) (۱۵۳/۴)

جاں زہجرِ عرش اندر فاقہ　　تن زِعشقِ خار بُن چوں ناقہ

(روح عرش کی جدائی میں فاقہ میں ہے جسم جھاڑ کے عشق میں اونٹنی کی طرح ہے)

جاں کشایدُ سوی بالا بالہا　　در زدہ تن در زمیں چنگالہا

(جان اوپر کی طرف بازو کھولتی ہے جسم نے زمین میں پنجے گاڑ دیئے ہیں) (۱۵۴/۴)

مولاناؒ کی مراد یہ ہے کہ انسان کی روح اس کو آسمان کی طرف لے جانا چاہتی ہے مگر اس کا جسم زمین میں اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے۔

تقاضائے عقل و نفس کی تمثیل سے وضاحت

انسان نے عورت کو بہت سی ذمہ داریاں سپرد کی ہیں اور ان کو پورا کرنے کیلئے اسے کچھ اخراجات کی ضرورت رہتی ہے۔ بعض عورتوں کو فضول طریقے سے اخراجات کرنے کی عادت ہوتی ہے جس کیوجہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور گھر میں میاں بیوی کا تصادم رہتا ہے۔ اس مالی تنگی کی وجہ سے دیگر خانگی امور پر بھی گھریلو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اکثر علماء، بعض صوفیاء اور اکثر اہلِ کمال لوگوں کی بیویاں ان کی زندگیوں کو ناخوشگوار بنا دیتی ہیں۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورت کا تقاضا کچھ اور ہے اور مرد کا ذوق کچھ اور

ہے۔ان دونوں کی دلچسپیاں یکساں نہیں رہ سکتیں۔اس لیے بیشتر جوڑوں میں جھگڑا اور فساد رہتا ہے۔مولانا رومیؒ نے شیخ سعدیؒ کا ذکر کیا ہے کہ جب ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر آئے اور کھانا مانگا تو آپؒ کی بیوی نے سالن کی ہنڈیا ان کے سر پر دے ماری اور ہنڈیا کا طوق ان کے گلے میں آ گیا۔وہ اسی حالت میں دوستوں کے پاس آ گئے۔انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا تو فرمایا کہ شادی کی سنت پوری کرنے کیلئے میرے گلے میں یہ طوق ڈال دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ سقراط کی زندگی فلسفی بحثوں میں گذرتی اور کئی دن تک گھر نہ آتے۔ایک دن وہ گھر آئے تو بیوی برس پڑی اور پھر ایک بالٹی پانی کی ان کے سر پر دے ماری۔حکیم ہنس دیئے اور کہا کہ گرجنے کے بعد برسنا ضروری تھا۔ایک اور ولی اللہ کو ملنے کیلئے کوئی شخص ان کے گھر آیا تو ان کی بیوی نے اس کو کہا کہ تم ایسے شخص کے پاس کیا لینے آئے ہو؟ جب اس شخص نے اپنے پیر و مرشد کے سامنے ماجرا بیان کیا تو فرمایا کہ اس عورت کی تلخ بیانی پر صبر کرنے سے تو ہم کو ولی اللہ بنایا گیا ہے۔ایک اور بہت بڑے ولی اللہ (حضرت بایزید بسطامیؒ) کے مرید کو بھی اس کی بیوی نے یہی صلوٰتیں سنائیں تو جب اس کو معلوم ہوا کہ ان کے مرشد جنگل سے لکڑیاں لینے گئے ہیں تو مرید نے دیکھا کہ ان کے مرشد جنگل میں ایک شیر پر لکڑیاں لاد کر لا رہے ہیں۔وہ مرید یہ دیکھ کر حیران ہوا تو آپؒ نے فرمایا بھائی میں بیوی کی بات کو سن کر برداشت کرتا ہوں تو یہ شیر میری بات مانتا ہے۔مولانا رومیؒ یہ مثالیں دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ عورتوں کے جھگڑے کی مثال ایسے ہے جیسے نفس کا انسان کے ساتھ جھگڑا رہتا ہے۔یہ دونوں ایک ہی جسم میں رہتے ہیں اور ان کی سدا کشمکش رہتی ہے۔

ماجرائے مرد و زن اُفتاد نقل — ایں مثالِ نفس خود می دان و عقل

(مرد اور عورت کا قصہ ایک مثال واقع ہوا ہے اس کو اپنے نفس اور عقل کے جھگڑے کی مثال سمجھ) (۱/۲۷۸)

عقل پر علامہ اقبالؒ کا نظریہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعے انسان محسوساتِ دنیا کا مشاہدہ اور اِسے تسخیر کر سکتا ہے۔لیکن اس عالمِ محسوسات کے پیچھے ایک اور حقیقت ہے جو عقل کی پہنچ سے باہر ہے یعنی عرفانِ کائنات اور ذاتِ باری تعالیٰ کی پہچان عقل کے بس کی بات نہیں۔اس لیے آپؒ یوں گویا ہوتے ہیں۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

(ب ج:۳۳۹)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل اور عشق دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں اس لیے عشق کو عقل سے الگ نہیں کرنا چاہیے تاکہ یہ دونوں باہم مل کر ترقی کی راہ پر گامزن رہیں اور ایک نیا عالم پیدا کر سکیں۔ مشرق ومغرب میں عقل اور عشق کی ہم آہنگی کو ضروری سمجھتے تھے۔

غربیاں را زیرکی ساز حیات شرقیاں را عشق راز کائنات
(غربیوں کیلئے عقل ساز گار حیات ہے' اہلِ مشرق کیلئے کائنات کا راز ہے)

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود نقشبند عالم دیگر شود
(عشق جب عقل کا مددگار ہو جاتا ہے' تو یہ ایک نئی کائنات کا نقش بنانے لگتا ہے)

خیزو نقش عالم دیگر بنہ عشق را بازیرکی آمیزدہ
(اٹھو اور ایک نیا عالم بناؤ، عشق کو عقل کی آمیزش دو) (ج ن:۶۵)

جیسا کہ مجلسِ اقبال سے جام پینے والے حضرات جانتے ہیں کہ اقبال اپنا روحانی استاد و مرشد مولانا رومیؒ کو مانتے ہیں لیکن عقل کے بارے میں ان کے نظریات سے اقبال اپنے الگ نظریات رکھتے ہیں چونکہ رومیؒ تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے اور تصوف نے ہمیشہ عقل کو عرفان کے راستے میں ایک سنگِ گراں سمجھا ہے اس لیے وہ کہتے ہیں جس شخص کی حاکم یہ عقل ہے وہ محروم ہے، بدنصیب ہے، دراصل عاقل نہیں جاہل ہے، حقیقی اقتدار سے بے خبر ہے۔ لیکن اقبالؒ عقل کی پرواز کی کوتاہی کو مانتے ہیں اور کہیں کہیں اس کی کارکردگی کو عرفان کے راستے میں رکاوٹ بھی قرار دیتے ہیں۔

خرد بر چہرہ تو پردہ ہا بافت نگاہے تشنۂ دیدار دارم
(خرد نے تیرے اوپر پردے بن رکھے (اور) میری نگاہ تیرے دیدار کی پیاسی ہے) (پ م:۴۱)

مگر یہ اقبالؒ کا بنیادی میلان ہے چنانچہ وہ عرفان کے آخری مدارج کیلئے عقل کو مدد ومعاون سمجھتے ہیں۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغ رہ گزر ہے
(ب ج:۳۷۷)

کبھی کبھی اقبالؒ عقل کے بارے میں کہتے ہیں کہ عقل عرفانِ ذات کیلئے مددگار تو ہے لیکن خدا کے روبرو حاضر ہونا اسکی قسمت میں نہیں ہے عقل اور دل میں فرق یہ ہے کہ دل خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے یعنی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے جب کہ عقل دلائل کے ذریعے، خدا کے ادراک کی کوشش کرتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات وہ دانائی سے خدا کے ادراک کے قریب پہنچ جاتی ہے، مگر خدا کو دیکھ لینا جسے عین الیقین کہتے ہیں اس کی قسمت

میں نہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں اسکی تقدیر میں حضور نہیں

(ب ج: ۳۳۵)

چونکہ صرف عقل کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کے اشعار کم ملتے ہیں بلکہ آپؒ عشق اور عقل دونوں کو ساتھ ساتھ چلاتے ہیں کیونکہ ایک چیز کی اہمیت ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کی کوئی متضاد شے ہو۔ علامہ اقبالؒ جب یورپ میں تھے اس وقت انہوں نے عقل کی بہت ہی تعریف کی۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عقل کی مدد سے حکیمانہ انداز میں مسائل پر غور کرنا سیکھا۔ جب کہ عشق نے مجھے رندوں کی طرح بے باکی سے بات چیت کرنا سکھایا اور جرأتِ اظہار دیا۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ!

(ب،ج: ۳۳۳)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل اسباب پرست وظاہر پرست ہے اور دنیا وعقبیٰ کی جستجو میں لگی رہتی ہے علم کو پسند کرتی ہے مگر عشق کے پیشِ نظر حق تعالیٰ کی ذات ہے۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں خرد کھوئی گئی ہے چار سُو میں!

(ب ج: ۳۷۵)

عقل کی فضیلت پر ارشاداتِ نبویہ ﷺ

علامہ ابن جوزیؒ نے عقل کی فضیلت پر کچھ ارشاداتِ نبوی اپنی کتاب ''الاذکیاء'' میں نقل کیے ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے ام المؤمنینؓ! ایک شخص قیام کم کرتا ہے اور سوتا زیادہ ہے اور دوسرا شخص قیام زیادہ کرتا ہے اور سوتا کم ہے، اِن دونوں میں سے آپؓ کے نزدیک زیادہ بہتر کون ہے؟ آپؓ نے فرمایا جس طرح تم نے مجھ سے پوچھا اسی طرح میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اُن دونوں میں سے زیادہ عقل مند شخص افضل ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ان دونوں کی عبادت کے بارے میں پوچھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اے عائشہؓ! ان دونوں کی عقل کے بارے میں پوچھا جائے گا، پس جو شخص زیادہ عقل والا ہے وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہے۔[1]

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۱۷، جلد ا، صفحہ ۲۷۶۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا پھر "نون" یعنی دوات کو پیدا فرمایا پھر اسے حکم فرمایا، لکھ! اس نے کہا کیا لکھوں؟ فرمایا جو ہو چکا اور جو ہونے والا ہے، پھر عقل کو پیدا فرمایا اور اس سے ارشاد فرمایا مجھے میری عزت کی قسم یقیناً میں تجھے اس شخص میں زیادہ رکھوں گا جس سے میں محبت کروں گا اور اس شخص میں کم رکھوں گا جو مجھے ناپسند ہوگا۔ (کچھ لوگ عقل مند نظر آتے مگر وہ صرف چند باتوں کا علم جانتے ہیں مثلاً انگریز بھاپ اور مشینوں کا علم جانتے ہیں مگر عقلمند نہیں کیونکہ اگر عقلمند ہوتے تو اسلام کو قبول کر لیتے)۔ [1]

(۳) حضرت ابن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے اسلام کے بارے میں تعجب نہ کرو یہاں تک کہ تم اس کی عقل کی گرہ کو جانو۔ [2]

(۴) حضرت وھب بن منبہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت لقمان ؑ نے اپنے بیٹے سے کہا اے بیٹے! اللہ عزوجل سے عقل طلب کرو، بے شک زیادہ عقل مند شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ اچھے عمل والا ہوتا ہے، اور بے شک شیطان عقل مند شخص سے دور بھاگتا ہے اور اسے بھگانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اے بیٹے! عقل سے افضل اللہ تعالیٰ کی عبادت کسی چیز کے ذریعے نہیں کی گئی۔ [3]

(۵) حضرت ابوالعلاءؒ کہتے ہیں کہ حضرت مطرفؒ نے فرمایا ایمان کے بعد کسی بندے کو عقل سے افضل کوئی چیز نہیں دی گئی۔

(۶) خلیل بن دعلجؒ کہتے ہیں میں نے معاویہ بن قرۃؒ کو کہتے ہوئے سنا، بے شک قوم حج کرتی ہے، عمرہ کرتی ہے، جہاد کرتی ہے، نماز پڑھتی ہے اور روزے رکھتی ہے لیکن قیامت کے دن انہیں ان کی عقلوں کے مطابق اجر عطا ہوگا۔

(۷) عبداللہ بن ضریسؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابوزکریاؒ نے فرمایا جنت کی نعمتوں کی لذت انسان کو اُن کی عقل کے مطابق حاصل ہوگی۔ [4]

نفس اور اعمال کا عقل پر اثر

عقل پر نفس کا اثر وہی ہے جو قلب پر ہوتا ہے نیز علامہ ابن جوزیؒ کے بیان کردہ معانی میں چوتھے معنٰی (یعنی جس میں عقل انسان کی شہوت کو دبا دے) میں غور کیجیے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نفس

---

[1] مرقاۃ المفاتیح، جلد ۱، صفحہ ۲۷۰۔　[2] مسند الشھاب، حدیث ۹۴۳، جلد ۲، صفحہ ۸۸۔

[3] البدایہ والنھایہ، اسماعیل بن عمر، متوفی ۷۷۴ھ، جلد ۹، صفحہ ۲۸۰، مکتبۃ المعارف، بیروت۔

[4] کتاب الاذکیاء، صفحہ ۱۱۔

جب کسی لذت کے حصول میں جلدی کرتا ہے اس وقت عقل پر کس قدر برا اثر پڑتا ہے اور اسی طرح نفس جب حرص و ہوس کی دلدل میں انسان کو پھنساتا ہے اس وقت عقل بہت متاثر ہوتی ہے۔

دنیا اور اس کے نفس پر اثرات

دنیا کا لفظ دنیٰ سے مشتق (Derived) ہے۔ جس کا معنٰی ہے ''گھٹیا، ردی''۔ اس لحاظ سے دنیا کو کمینی کہا جاتا ہے اور حدیث شریف میں ہے ''اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ وَّ طَالِبُهَا كِلَابٌ [1]'' (دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں)۔ یہ بھی رسول ﷺ نے فرمایا ''اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ'' [2] (دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے اور کافر کیلئے جنت ہے)۔ دنیا کو قید خانہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں مشقت اور محنت کے بغیر چارہ نہیں اور قید خانے میں عیش و عشرت طلب کرنا عقل سے بعید بات ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی روح اگر دُنیاوی آلائشوں میں پڑ جائے تو طرح طرح کی بیماریوں میں پھنس جاتی ہے۔ اگر اس کا علاج اتباع سنت اور احکام ربانی کی پابندی سے کیا جائے تو روح جسمانی مصیبتوں کے باوجود خوش و خرم رہتی ہے جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ گرم ریت پر بھی خوش و خرم تھے۔

از پئے ایں عیش و عشرت ساختن صد ہزاراں جاں بباید باختن

(اس عیش و عشرت کو حاصل کرنے کیلئے ہزاروں جانیں قربان کرنا پڑتی ہیں)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا میں رنج و مصیبت نہ ہوتے تو اس کی جَو برابر بھی قدر نہ ہوتی۔ حوادثِ زمانہ اور مصائبِ زمانہ کڑوی دوائی کی طرح نفع دینے والے ہیں جس سے مرض زائل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''حُبُّ الدُّنْیَا رَاْسُ كُلِّ خَطِیْئَةٍ'' [3] (دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے)، اور آپ ﷺ نے فرمایا دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں، اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں، اس کو وہ جمع کرتا ہے جس کو کوئی عقل نہیں، اس کیلئے وہ ظلم کرتا ہے جس کو کوئی علم نہیں، اس کے اوپر وہ حسد کرتا ہے جس کو سمجھ نہیں اور اس کیلئے وہ کوشش کرتا ہے جس کو یقین نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تمہاری دنیا کو منہ کے بل گرا دیا ہے، اب میرے بعد اس کو اٹھنے نہ دینا۔ اس کو چھوڑے بغیر آخرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس اے حواریو! دنیا کو عبور کرو آباد نہ کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا دنیا تمہارے لیے بچھائی جائے گی اور تم اس کی پیٹھ پر بیٹھو گے مگر تم

---

[1] کنز العمال، حدیث ۸۵۶۴، جلد ۳، صفحہ ۲۸۷۔ [2] صحیح مسلم، حدیث ۲۹۵۶، جلد ۴، صفحہ ۲۲۷۲۔

[3] شعب الایمان، حدیث ۱۰۵۰۱، جلد ۷، صفحہ ۳۳۸۔

بادشاہوں اور عورتوں کا مقابلہ نہ کرنا (یعنی اگر تم دنیا چھوڑ دو گے تو بادشاہ تمہارے لیے مزاحمت نہیں کریں گے اور اگر تم نماز روزہ میں مصروف رہو گے تو عورتوں کا زور خود بخود ٹوٹ جائے گا)۔ فرمایا کہ دنیا طالب بھی ہے مطلوب بھی۔ اللہ والوں کو دنیا تلاش کرتی ہے (طالب ہے) اور دنیا داروں کی مطلوب ہے۔ دنیا دار دنیا کو طلب کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو موت آ جاتی ہے اور اس کی گردن پکڑ لیتی ہے۔[1]

ایک حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو کثرتِ مال کی خواہش نے خدا سے غافل کر دیا حالانکہ تمہارے مال سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں جو کچھ تم نے کھا لیا وہ فنا ہو گیا، جو تم نے پہن لیا بوسیدہ ہو گیا اور جو تم نے صدقہ وخیرات کیا وہ باقی رہا۔ ''کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ○ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ''[2] (حقیقت یہ ہے (اے کفار!) تم جلد ملنے والی (دنیا) کو محبوب رکھتے ہو اور تم آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو)۔

دُنیادار چار آفتوں میں مبتلا رہتا ہے: (۱) غم جو کبھی جدا نہ ہو، (۲) شغل جس سے کبھی فارغ نہ ہو (۳) احتیاج جو کبھی دولت مند نہ ہونے دے، (۴) خواہشات جن کی کوئی انتہا نہ ہو۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ قیامت کے روز ایسے لوگ بھی پیش کیے جائیں گے جن کے اعمال نامے پہاڑ کی طرح ہوں گے مگر جہنم میں پھینکے جائیں گے وہ نمازی اور تہجد گزار بھی تھے مگر جب وہ دنیا کو دیکھتے تھے تو کود پڑتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجھے دنیا کی تعریف بتا دیں۔ فرمایا طویل جواب دوں یا مختصر؟ اس نے عرض کی کہ مختصر۔ فرمایا: حلال میں حساب ہے، حرام میں عذاب ہے۔ ایک اور جگہ دنیا کے متعلق فرمایا کہ یہ ایسا گھر ہے کہ اس کے تندرست بھی بیمار ہیں اور اس کے جاننے والے پشیمان ہیں، اس کے محتاج غمگین ہیں، اس کے امیر مصیبت میں مبتلا ہیں، اس کے حلال میں حساب ہے، اس کے مشتبہ میں عتاب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام میں آئے تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اونٹنی پر سوار ہو کر ان کے استقبال کو آئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے مکان میں سوائے تلوار، ڈھال اور سواری کے اور کچھ نہ پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تم کچھ سامان بنا لو۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے۔[3] دنیا تمہاری نظروں میں حقیر معلوم ہوتی اور آخرت کو تم پسند کرتے۔ یہ روایت بیان کر کے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے مجھے علم کے ایسے ۷۰ باب تعلیم فرمائے جو کسی کو تعلیم نہیں فرمائے اور اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم جنگلوں کو نکل جاتے اور اپنی جانوں پر روتے اور اپنے مالوں کو بغیر کسی نگہبان

---

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۲۰۳۔ [2] القیامۃ، ۷۵: ۲۰، ۲۱۔

[3] صحیح مسلم، حدیث ۲۳۵۹، جلد ۴، صفحہ ۱۸۳۲۔

کے چھوڑ جاتے اور اس میں بقدرِ ضرورت اختیار کرتے لیکن لمبی لمبی امیدوں اور خواہشات نے تمہارے دلوں سے آخرت کی یاد مٹادی ہے اور دنیا تم پر غالب ہوگئی ہے اور بعض تو تم میں سے جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

نفس کی ارتعاشات یا لہریں

سائنس دانوں کے مطابق ہر جامد اور غیر جاندار چیز سے مخصوص لہریں یا ارتعاشات نکلتی ہیں۔ ہر شخص کے گرد بہت سی ارتعاشات کا ایک ہالہ ہوتا ہے جس کو حساس انسان دیکھ بھی سکتے ہیں۔ جو لوگ ان ارتعاشات کو نہیں پہچانتے تو جب وہ کسی کو دیکھتے ہیں تو ان کو اس شخص میں سے یا تو کچھ محبت کی کشش محسوس ہوتی ہے یا نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ہماری تصنیف ''حسن نماز'' میں ایک باب ''سائنسدانوں کے نزدیک عبادات کے اثرات'' پر لکھا گیا ہے جس میں اس موضوع پر کافی تفصیل دی گئی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ لہریں ہمارے جسم سے ٹکراتی ہیں تو خوشگوار یا ناخوشگوار محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تجربہ کار اور حسّاس شخص جب کسی کو دیکھتا ہے تو اس کی سیرت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ اولیائے کرامؒ میں بھی یہ بات موجود ہوتی ہے بلکہ کئی سو برس کے بعد پیدا ہونے والوں کی شکل وصورت اور سیرت کو بیان کر دیتے ہیں (جیسے حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے متعلق تمام احوال اور کوائف تین سو سال پہلے ہی بیان کر دیے تھے۔ اس کا ذکر ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں موجود ہے) بزرگ لوگ ہر شخص کی باتوں سے اس کی حرص وہوس اور تکبر وغیرہ کی بو سونگھ لیتے ہیں خواہ وہ انسان ان باتوں کی نفی کرتا رہے۔ اگر کوئی شخص پیاز کھاتا ہے تو اس کی بو سب لوگ محسوس کر لیتے ہیں۔

هم بیابد لیک پوشاند زما   بوئے نیک و بد بر آید بر سَما

(ہمارے عیب وہ محسوس کر لیتے ہیں لیکن ہم سے چھپاتے ہیں۔ اچھی اور بری بو ظاہر ہو جاتی ہے آسمان پر)

تو همی خُسپی و بُوئے آں حرام   می زند بر آسمان سبز فام

(تو سو جاتا ہے اور اس حرام کی بو نیلگوں آسمان پر پہنچتی ہے)

همره انفاسِ زشتت می شود   تا به بُو گیرانِ گردوں می رود

(وہ تیرے برے سانسوں کے ساتھ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آسمان کے خوشبو سونگھنے والوں (یعنی فرشتوں) تک پہنچ جاتی ہے)

بُوئے کبر و بُوئے خشم و بُوئے آز   در سخن گفتن بیاید چوں پیاز

(تکبر کی بو، غصہ کی بو اور لالچ کی بو زبان سے نکلتے ہی معلوم ہو جاتی ہے پیاز کی بو کی طرح)

پس دعاها رد شود از بوئے آں   آں دلِ کثر می نماید در زباں

(اس بو کی وجہ سے دعائیں رد کر دی جاتی ہیں وہ دل کی کجی زبان پر نمایاں ہو جاتی ہے)

گر جنیں را کس بگفتے در رحم　　هست بیروں عالمے بس منتظم

(اگر پیٹ کے بچے سے کوئی رحم میں کہتا کہ باہر ایک بڑی منظم دنیا ہے)

یک زمینِ خُرمی با عرض و طول　　اندرو بس نعمت و بے حد اکول

(ایک لمبی چوڑی دل کشا زمین ہے اسمیں بے شمار نعمتیں اور بے حد غذائیں ہیں)

آسمانے بس بُلند و پرُ ضیا　　آفتاب و ماهتاب و صد سُها

(بہت اونچا آسمان ہے اور منور آفتاب اور چاند اور سینکڑوں سُہا (ستارے) ہیں)

در صفت ناید عجائب هائے آں　　تو دریں ظلمت چه در امتحاں

(اس کے عجائب بیاں نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو اس اندھیرے میں آزمائش میں کیوں ہے)

اُو بحکمِ حالِ خود منکر بُدے　　زیں رسالت مُعرض و کافر شدے

(وہ اپنی حالت کے تقاضے سے منکر ہوتا، اس پیغام سے اعراض کرنے والا اور کافر ہوتا)

جنس چیزے چوں ندید ادراکِ اُو　　نشنود ادراکِ منکر ناکِ اُو

(اس کے ادراک نے چونکہ اس چیز کی جنس نہیں دیکھی، اس کا انکار کرنے والا احساس (ان باتوں کو) نہیں سنتا ہے)۔

ان تمام حلقوں کو مناسب غذا ملتی رہنی چاہیے۔ جس طرح غلط غذا سے جسم خراب ہو جاتا ہے اسی طرح نفس، عقل و دل بھی نامناسب غذاؤں سے بدہضمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنا وظیفۂ حیات ادا نہیں کر سکتے۔

حلق عقل و دل چو شد خالی زفکر　　یافت اُو بے هضم معده رزقِ بکر

(عقل اور دل کا حلق جب فکر سے خالی ہو گیا تو اس نے معدہ کے ہضم کے بغیر تازہ رزق پالیا)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی عمر میں انسان کی غذا میں تبدیلی آتی رہتی ہے بچہ ماں کے پیٹ میں خون سے پلتا ہے، پھر دودھ پر آنے کے بعد دوسری غذاؤں کو شروع کرتا ہے حتیٰ کہ گوشت ترکاری وغیرہ کھاتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو عقل وحکمت کا چسکا پڑتا ہے تو بدلتے ہوئے لقموں سے وہ لقمان حکیم بن جاتا ہے۔

پس حیات ماست موقوف فطام　　اندك اندك جهد کُن تمّ الکلام

(تو ہماری زندگی دودھ چھڑانے پر موقوف ہے بتدریج کوشش کر، بات ختم ہوئی)

چوں جنیں بود آدمی خونخوار بود　　بوُد اُورا بوُد از خوں تار و پود

(جب انسان ماں کے پیٹ میں خون کھانیوالا تھا اس کے وجود کا تانا بانا خون سے تھا)

از فطامِ خوں غذایش شیر شُد   وز فطامِ شیر لقمہ گیر شد

(خون چھڑانے سے اس کی غذا دودھ ہوئی اور دودھ چھڑانے سے وہ لقمہ کھانیوالا ہوگیا) (۱۹/۳)

وز فطامِ لقمہ لقمانے شود   طالبِ مطلوبِ پنہانے شود

(لقمہ چھڑانے سے وہ لقمان ہوجاتا ہے ایک پوشیدہ مطلوب کا طالب بن جاتا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ آدمی عالمِ جسمانی اور شہوتِ حیوانی کو چھوڑ کر عالمِ روحانی میں داخل ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کو معلوم نہیں ہے روحانی عالم میں اس کو کیا کچھ ملتا ہے۔ اس کی مثال مولاناؒ یوں دیتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں بچے کو پیٹ کے اندر کا جہاں ہی بھلا معلوم ہوتا ہے اسی طرح انسان عالمِ دنیا سے عالمِ روحانی میں پیدائش (دوسری پیدائش) سے گھبراتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے گرا تو مرا۔ اسی طرح بچہ دنیا میں آنے پر بھی رضامند نہ ہوتا اور ضرور کا فر اور منکر رہتا مگر فطرت اس کو جبراً کشادہ جہاں میں لے آتی ہے جہاں آسماں، طرح طرح کے پھل، چاند تارے اور پہاڑ و دریاؤں کی خوشنما دنیا آباد ہے جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔

باب نمبر ۹

اہمیتِ نفس

نظامِ کائنات نفس کے گرد گھومتا ہے

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی دو قسموں ''حیوانات اور ملائکہ'' کے درمیان انسان کو معتدل مزاج مخلوق بنایا ہے۔ نہ تو اسے بالکل حیوان ہی بنایا کہ اس کا مقصود صرف اکل و شرب (کھانا پینا) اور تکمیلِ شہوت ہو اور نہ ہی اسے فرشتہ بنایا کہ جو صرف اور صرف تسبیح اور تہلیل میں مشغول رہتے ہیں۔ انسان کے اندر اُس قادرِ مطلق نے نورِ عقل رکھا، تا کہ وہ رب تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اس کی رضا جوئی میں زندگی بسر کرے۔ انسان کے اندر عقل کے ساتھ نفس اور اس کی خواہشات بھی پیدا کیں تا کہ ان خواہشات کی بدولت نظامِ کائنات اور رونقِ کائنات بحال رہے اور خیر و شر کی کشمکش میں یہ معلوم ہو سکے کہ انسانوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرنے والے کون لوگ ہیں۔

اگر انسان صرف پیکرِ نورانیت ہوتا اور اس میں نفسانی خواہشات نہ ہوتیں تو وہ نہ اپنے مستقبل کیلئے منصوبے بناتا، نہ گھر تعمیر کرتا، نہ ہی باغات لگاتا، نہ بازار قائم ہوتے اور نہ ہی کاروبارِ حیات چلتا ''فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ'' (دانا کا کوئی کام دانائی سے خالی نہیں ہوتا)۔ رب تعالیٰ علیم و حکیم ہے اس نے انسان کے اندر نفس رکھا اور اس میں لذتوں کی طلب رکھی اور اُن لذتوں کا حصول زمین کے ساتھ وابستہ کر دیا تا کہ انسان اپنی کاوش سے زمین کے سینے سے ہر چیز کو نکال لائے اور سمندروں اور پہاڑوں سے اپنی حیات اور زینت کا سامان برآمد کرے، جانوروں اور پرندوں وغیرہ سے اپنی زینت و ضرورت کی تکمیل کرے تا کہ

اِس ساری تگ ودو کے نتیجے میں زمین کی رونق اور کاروبارِ حیات قائم رہے۔اب ہم اس تصور کوقرآن وسُنت کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان اور لذتوں کی محبت

قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ''[1] (لوگوں کیلئے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے)۔اس آیت کی جو تشریح حضرت العلاّم پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے فرمائی ہے اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر نفسانی خواہشات کیوں رکھی ہیں۔آپ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے انسان کے دِل میں ان اشیاء کے ساتھ طبعی لگاؤ اور رغبت پیدا فرما دی، اگر ایسا نہ ہوتا تو شادی کی تلخ ذمہ داریوں کو کون اُٹھاتا، نا تو اں اولاد کیلئے کون لمبی راتیں گزارتا اور ان کی پرورش کیلئے کون اپنی راحت وآسائش کو ترک کرتا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو نسلِ انسانی کی بقا کیسے ممکن ہوتی۔اسی طرح سونے، چاندی، عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی باڑی کے ساتھ میلان طبع نہ ہوتا تو دنیا کی ساری رونقیں ختم ہو کر رہ جاتیں۔[2]

اسی بقائے نظامِ کائنات کیلئے قادر وحکیم مولا نے انسان کے اندر ''اَمَلْ''(اُمید) رکھی ہے تا کہ وہ اپنے مستقبل کیلئے سکیمیں اور منصوبے بناتا رہے اور یوں جب تک قدرت کو منظور ہے دنیا کی رونق قائم رہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''دُنیا اُمید پر قائم ہے''۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے اُخروی شعور اور احساس پر ''غفلت'' یعنی باریک پردہ ڈال رکھا ہے تا کہ وہ سراسر آخرت کی فکر میں پڑ کر کاروبارِ حیات کو مکمل خیر باد نہ کہہ دے۔ انسان اور لذات کی محبت پر تفصیلی گفتگو حقوق نفس کے بیان میں کی جائے گی۔

اُمید اور غفلت دنیا میں دو عظیم نعمتیں ہیں

انسان اپنی زندگی میں کتنے حادثات سے دوچار ہوتا ہے اور کتنے انسانوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے اندر نفسانی خواہشات نہ ہوتیں تو انسان اپنی موت کو ایک آن کیلئے بھی نہ بھلا سکتا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے دفن کی ہوئی میت کا منظر اس کی نظروں سے کبھی اُوجھل ہوتا اور

---

[1] آل عمران، ۳: ۱۴۔　　[2] ضیاء القرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۱۳۔

ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیا کی ساری رونقیں دھری کی دھری رہ جاتیں بلکہ رونقِ حیات سرے سے وجود میں ہی نہ آتی۔

حدیث شریف میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک جنازہ لے جانے والے لوگوں پر ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے، پس لوگ اہتمام میں مصروف بھی ہوتے ہیں اور غمگین بھی ہوتے ہیں حتیٰ کہ ورثاء میت کو قبر میں لٹا دیتے ہیں اور واپس لوٹنے لگتے ہیں تو وہ فرشتہ مٹی کی ایک مٹھی بھر کر ان کی طرف پھینکتا ہے اور کہتا ہے: جاؤ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ! اللہ تعالیٰ نے تمہاری موت تم پر بھلا دی سو ورثاء میت کو بھی بھلا کر گھروں کو لوٹ آتے ہیں اور اپنے کاروبار اور خرید و فروخت میں مشغول ہو جاتے ہیں گویا نہ وہ میت ان سے تھی اور نہ یہ اس سے تھے۔ [1] حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی ایک حدیث شریف مروی ہے۔ [2]

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں: مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت نکالی تو فرشتے کہنے لگے یا رب! یہ تو زمین کو بھر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں موت پیدا کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا پروردگار! (موت کے صدمات کی وجہ سے) وہ زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اُمید پیدا کرنے والا ہوں۔ [3]

پس اُمید اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے اسی کی بدولت زندگی کے اسباب انتظام پذیر ہوتے ہیں اور اُمورِ دنیا مستحکم ہوتے ہیں، اسی اُمید کے بل بوتے پر کاریگر اپنی کاریگری کی طرف مائل ہوتا ہے اور عابد اپنی عبادت کی جانب راغب ہوتا ہے اور یہ اُمید جب طول پکڑ جائے تو انسان عاقبت کو بھول جاتا ہے اور اعمالِ صالحہ سے رہ جاتا ہے (اس لیے موت اور آخرت کو یاد کرنے کا حکم ہے)۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: غفلت اور اُمید دو عظیم نعمتیں ہیں اگر یہ دونوں نہ ہوتیں تو مسلمان راہ پر چلنے کی طاقت نہ رکھتے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے قلوب میں ہر وقت آخرت کا شعور بیدار رہتا، موت کا خوف ہمہ وقت سر پر منڈلاتا رہتا اور اُمید کی کوئی کرن نہ ہوتی تو وہ اسبابِ معیشت کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے اور جب ان کی زندگی کے اسباب مہیا نہ ہوتے تو وہ ہلاک ہو جاتے اور اسی طرح حضرت مطرف بن عبداللہؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر مجھے پتا چل جاتا کہ میری موت کب ہے تو اسی خوف کی وجہ سے میری عقل چلی جاتی لیکن اللہ سبحانہ کا اپنے بندوں پر بڑا کرم ہے کہ اس نے انہیں موت سے غفلت میں رکھا ہے اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو نہ لوگ خوشگوار زندگی گزار سکتے اور نہ شہر آباد ہوتے۔ [4]

---

[1] فردوس الاخبار، حدیث ۹۰۸، جلد ۱، صفحہ ۲۳۶۔
[2] شرح الصدور، امام جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱، حدیث ۲۳، جلد ۱ صفحہ ۱۰۸، دار المعرفہ، لبنان۔
[3] التذکرہ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۱۔
[4] التذکرہ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۱۔

مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان ایک لحہ بھر کیلئے دوزخ کا مشاہدہ کرلے (یا جنت کو دیکھ لے) تو وہ دنیا کے تمام کاموں سے ہٹ کر اپنا تمام وقت عبادت میں ہی گذارتا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کو آخرت کی باتوں کا مشاہدہ نہیں کروایا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام کاروبار حیات بند ہو جاتے۔

انسان عذابِ قبر کیوں نہیں سُنتے

قادرِ مطلق نے چونکہ "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" یعنی ایک مقررہ میعاد تک نظامِ کائنات اس خاک کے پتلے یعنی نفس اور روح سے مرکب انسان کے ذریعے چلاتا ہے اس لیے وہ کسی بھی صورت میں انسان کو اس حد تک دہشت اور وحشت زدہ نہیں کرنا چاہتا کہ انسان کاروبارِ حیات سے معطل ہو کر رہ جائے چنانچہ اہلِ قبور پر جوان کی قبروں میں عذاب ہوتا ہے اُسے جانور سماعت کرتے ہیں لیکن انسان نہیں سُن سکتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک یہودی بڑھیا آئی اور اس نے کہا کہ اہلِ قبور پر ان کی قبروں میں عذاب ہوتا ہے، میں نے اس کی بات کو رد کر دیا اور تصدیق نہ کی وہ چلی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھیا کی بات بیان کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس نے ٹھیک کہا ''اِنَّھُمْ یُعَذَّبُوْنَ عَذَابًا تَسْمَعُهُ الْبَھَائِمُ کُلُّھَا'' (بیشک اہلِ قبور پر عذاب ہوتا ہے جسے تمام کے تمام جانور سُنتے ہیں)۔ [1]

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ ''فَلَوْلَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ یُّسْمِعَکُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِیْ اَسْمَعُ مِنْهُ'' [2] (اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم ایک دوسرے کو دفن کرنے سے رُک جاؤ گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا کہ وہ تمہیں عذابِ قبر سُنائے جو میں سُنتا ہوں)۔ ان احادیث سے وجہِ استدلال یہ ہے کہ جب لوگ تدفین سے باز آ جاتے تو دیگر کاروبارِ حیات ان سے کیونکر ممکن ہوتا؟ اسی حقیقت کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ وَ اَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَّ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا'' [3] (بیشک میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ سُنتا ہوں جو تم نہیں سُنتے، اگر تم وہ جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور رُوتے زیادہ)۔

خود سوچیے! اگر انسان کو ہر وقت رونے سے کام ہوتا تو دنیا کے معاملات میں اُسے کس طرح دلچسپی ہوتی۔ ہم اپنے روزمرّہ مشاہدہ میں یہ بات آزما چکے ہیں کہ انسان جب مغموم ہو تو اُسے کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی اور نہ ہی وہ کھانے پینے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۶۰۰۵، جلد ۵، صفحہ ۲۳۴۱۔ [2] صحیح مسلم، حدیث ۲۸۶۷، جلد ۴، صفحہ ۲۱۹۹۔

[3] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۲۱۵۵۵، جلد ۵، صفحہ ۱۷۳۔

اِن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو بہت سی باتوں سے غافل رکھا گیا ہے اگر انسان کے ذہن سے غفلت کا پردہ ہٹا دیا جائے اور اس کا شعور مکمل بیدار ہو جائے اور عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کے حقائق اس پر عیاں ہو جائیں تو اس سے دنیا کا کوئی کام نہ ہو سکے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر انسان کے نفس پر غفلت اور اُمید کی تاثیر نہ ہوتی تو کارگہِ حیات میں اس سے کوئی کام نہ ہوتا۔ غفلت کا یہ حجاب انسان سے اس وقت اُٹھایا جائے گا جب وہ ذائقۂ موت سے دوچار ہو گا۔ اس حقیقت کو بَابُ مَدِینَةِ العِلْمِ سیدنا مولا علی رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمایا ہے "اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَهُوْا "[1] (لوگ سو رہے ہیں سو جب وہ مریں گے تو بیدار ہوں گے)۔ یہ انسان کی نیند ہی ہے کہ جانور تو عذاب کی آواز سُنتے ہیں لیکن انسان نہیں سُن سکتا اس لیے کہ کارِ دنیا انسان کے سپرد ہے جانوروں کے سپرد نہیں۔

حضور ﷺ کا مزاح فرمانا

علمائے کرامؒ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا صحابہ کرامؓ کے ساتھ ہنسنا مسکرانا اور مزاح فرمانا بھی اسی حکمت کے تحت تھا کہ صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کی ہیبت میں آ کر دنیوی معاملات سے نہ رہ جائیں کیونکہ آپ ﷺ کا رعب بہت دور دور تک تھا جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ" [2] (رعب و دبدبہ کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے)۔

اگر آپ ﷺ یہ رعب صحابہ کرامؓ کیلئے برقرار رکھتے تو وہ آپ ﷺ کے سامنے دم نہ مار سکتے لیکن حضور ﷺ ان کے ساتھ مزاح کو روا رکھتے تاکہ ان کے احساسات دب نہ جائیں۔ نیز اگر حضور ﷺ مزاح نہ فرماتے اور نہ ہی بالکل ہنستے مسکراتے تو یہی سمجھا جاتا کہ ہنسنا مسکرانا خلافِ سُنت ہے اور اس طرح دِل بوجھل ہو جاتے اور انسان سے کوئی کام نہ ہوتا۔ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ دِلوں کو بوجھل نہ ہونے دو انہیں کبھی کبھی راحت بھی پہنچاؤ۔

دِلوں کو کبھی کبھی راحت پہنچاؤ

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَسَاعَةً"[3] (دِلوں کو کبھی کبھی راحت پہنچایا کرو)۔ امام مناویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دِلوں کو بعض اوقات مشکل عبادات سے آزاد کیا کرو اور اُنہیں ایسے جائز کھیل اور شغل میں لگایا کرو جس میں نہ عذاب ہو اور نہ ثواب۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں کبھی جائز کھیل وغیرہ میں مشغول ہو جاتا ہوں

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۲۷۹۵، جلد ۲، صفحہ ۳۱۴۔
[2] مسند الشہاب، حدیث ۲۴۷، جلد ۱، صفحہ ۲۷۵۔
[3] مسند الشہاب، حدیث ۶۷۲، جلد ۱، صفحہ ۳۹۳۔

تا کہ پھر حق کیلئے تازہ ہو جاؤں۔ ایک مرتبہ سیّد عالم ﷺ کی بارگاہ میں قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی اور کچھ دیر بعد اشعار کہے جانے لگے تو حضرت ابو بکر صدیق ؓ کہنے لگے کبھی قرآن اور کبھی شعر؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! کبھی یہ اور کبھی وہ۔

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں ان دِلوں کو راحت پہنچاؤ بیشک یہ اسی طرح تھکتے ہیں جس طرح بدن تھک جاتے ہیں۔ حضرت حکیم ترمذی فرماتے ہیں: مسلسل ذکر سے نفس پگھلتا ہے لہٰذا کبھی کبھی نفوس کو راحت پہنچاؤ ورنہ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ [1]

عارف مناوی نے مذکور الصدر حدیث کی کافی تشریح کی ہے اور آخر میں کہا ہے کہ اس مطلب کی تائید میں حضرت حنظلہ ؓ کی حدیث ہے۔ ہم اپنے قارئین کی ضیافتِ علمی کیلئے اس حدیث کا مکمل ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

امام بخاری ؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت حنظلہ اُسَیدِیؓ رسول اللہ ﷺ کے کاتبوں میں سے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا اے حنظلہ ؓ تم کیسے ہو! میں نے کہا حنظلہ ؓ منافق ہو گیا، حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے کہا سبحان اللہ! تم کیسی بات کر رہے ہو؟ میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ہمیں جنت اور دوزخ کی نصیحت کرتے ہیں حتّٰی کہ ہم گویا جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اُٹھ کر اپنی بیویوں، بچوں اور زمینوں کے معاملات میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت ساری چیزیں بھول جاتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے کہا: بہ خدا اِس قسم کا معاملہ تو ہمیں بھی پیش آتا ہے۔ پھر میں اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، میں نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ حنظلہ منافق ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِس کا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ ہم آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، آپ ﷺ ہمیں جنت اور دوزخ کی نصیحت کرتے ہیں گویا کہ ہم اپنی آنکھوں سے جنت اور دوزخ کو دیکھتے ہیں اور جب ہم آپ ﷺ کے پاس سے اُٹھ کر اپنے بیوی، بچوں اور زمینوں میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم میرے پاس ذکر وفکر کی جس کیفیت میں ہوتے ہو اگر تمہاری وہ کیفیت ہمیشہ رہے تو تمہارے بستروں اور راستوں پر فرشتے تم سے مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ ؓ! یہ کیفیت ایک آدھ ساعت رہتی ہے، یہ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا۔ [2]

حضرت حنظلہ ؓ نے گھریلو ماحول کی جس صورت کو نفاق قرار دیا یہ نفسانیت کا ایک حصہ ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو نظامِ کائنات کیونکر چلتا؟

---

[1] فیض القدیر، جلد ۷، صفحہ ۳۴۱۵ تا ۳۴۱۶۔

[2] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۲۱۰۶۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے"وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ" [1] (اور اس کی (قدرت کی) نشانی ایک یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں تا کہ تم سکون حاصل کرو اُن سے اور پیدا فرمادی تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور وفکر کرتے ہیں)۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: زندگی کی شاہراہ بڑی ہی کٹھن ہے، قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں، ہجومِ مصائب ہیں، غموں کے اندھیرے ہیں، ناکامیوں کے چرکے اور مایوسیوں کی وحشتیں ہیں۔ زندگی کو ثبات بخشنے کیلئے، آلام ومصائب کے بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے اسی کی جنس سے بیوی کی صورت میں اسے ایک رفیقِ سفر بھی عطا کردیا۔ جنسی یگانگت کے علاوہ ان دونوں کے دِلوں کو محبت اور رحمت کے پاکیزہ اور پختہ تعلقات سے جوڑ دیا ہے۔ یہ سنگت صرف ان دنوں تک محدود نہیں جب صحت و شباب کا آفتاب چمک رہا ہو، جب حالات سازگار ہوں اور بخت بیدار ہو بلکہ محبت و پیار اور شفقت و ہمدردی کا یہ رشتہ کسی صورت میں بھی نہیں ٹوٹتا۔ غموں کے اندھیرے جیسے جیسے گہرے ہوتے جاتے ہیں، محبت کی یہ شمع زیادہ نور افشانی کرنے لگتی ہے۔ جب حالات ناسازگار ہوں اس کی رفاقت میں مزید پختگی آجاتی ہے نیز ان کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ دونوں کی حسرتوں، آرزوؤں، اُمنگوں اور خوشیوں کی تکمیل کا راز ایک دوسرے سے وابستہ رہنے میں ہے۔

خود سوچیے! اگر محبت کا چراغ زندگی کی اس کٹھن راہ کو روشن نہ کرتا اور رحمت کا جذبہ ایک دوسرے کی دستگیری نہ کرتا تو اس سفرِ حیات کا انجام کتنا حسرت ناک ہوتا، تو ہزار جانیں قربان ہوں اس خالقِ کریم پر جس نے مرد کی جنس سے عورت کو پیدا کیا اور پھر انہیں محبت اور رحمت کے رشتوں میں یوں پرو دیا کہ علیحدگی کا تصور تک پریشان کردیتا ہے۔ [2]

یہ محبت، مودّت، شفقت اور لطف ولذت سب نفس کی صفات ہیں۔ ماں باپ کی اولاد پر شفقت، اولاد کی ماں باپ سے محبت، میاں بیوی کی باہمی اُلفت ومحبت اور اقرباء ورشتہ داروں کی چاہت یہ سب نفس کی کرشمہ سازی ہے تو پھر خود سوچیے کہ اگر نفس نہ ہوتا تو نظامِ کائنات کیونکر چلتا؟

لیکن انسان کو نفس کے تقاضوں کی رو میں بہہ نہیں جانا چاہیے۔ نفس کے ساتھ ساتھ روحانیت کی تکمیل کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے اور زیادہ توجہ دینے کی یہ بات اس دور کیلئے نہایت ضروری ہے کیونکہ دورِ

---

[1] الروم، ۳۰:۲۱۔ [2] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۶۸۔

حاضر میں سراسر نفسانی خواہشات کی پیروی میں انسان سرگرداں ہے جب کہ قرونِ اولیٰ کے اہلِ اسلام روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہوتے تھے اور بہتری ان دونوں حالتوں کے درمیان میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ" [1] (بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کرو اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے، برے کاموں سے اور سرکشی سے، اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو)۔

علمائے کرامؒ فرماتے ہیں کہ عدل کا معنٰی ہر معاملہ میں میانہ روی ہے۔ عقائد ہوں، عبادات ہوں، اخلاق ہوں یا معاملات ہر چیز میں افراط وتفریط سے دامن بچاتے ہوئے میانہ روی اور اعتدال کے راستے پر گامزن رہنا عدل ہے۔ علامہ بیضاویؒ کہتے ہیں کہ قوتِ شہوانیہ کی متابعت میں افراط کو فحشاء کہتے ہیں اور قوت غضبیہ کے مشتعل ہونے کے جو کام کیا جائے اسے منکر کہتے ہیں۔ [2]

اللہ کریم ہم سب کو نفس کے معاملہ میں عدل پر قائم رکھے اور فحشاء اور منکر دونوں سے اجتناب کرنے کی سعادت مرحمت فرمائے۔ آمین۔

---

[1] النحل،۱۶:۹۰۔

[2] تفسیر بیضاوی، امام بیضاوی، جلد۳، صفحہ۴۱۶، دار الفکر، بیروت۔

باب نمبر ۱۰

نفس کے حقوق

نفس کے حقوق کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر چیز کو اس کے حقوق عطا فرمائے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے جائز حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی دشمنانِ حرب کے حقوق پامال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نفس بھی انسان کا دشمن ہے اس لیے اس کے بھی حقوق کی رعایت کرنا انسان کے ذمے واجب ہے۔ انسان پر اس کے نفس کے حقوق اگر معین کیے جائیں تو انہیں یوں شمار کیا جاسکتا ہے (۱) مناسب وقت اور مقدار میں پانی مہیا کرنا (۲) مناسب شکل اور مقدار میں کھانا (۳) مناسب لباس (۴) متوسط طور پر نیند (۵) سایہ دار جگہ کا مہیا کرنا (۶) عزیز واقارب سے ملاقات کرنا (۷) بے جا تنگی سے بچانا اور جائز راحت مہیا کرنا (۸) جسم کو اچھی حالت پر برقرار رکھنا یعنی غسل کرنا، تیل، سرمہ، کنگھا وغیرہ کرنا، خوشبو لگانا (۹) جائز جنسی عمل کا پورا کرنا (۱۰) روزمرہ کے عام ماکولات ومشروبات کے علاوہ رب تعالیٰ کی پیدا کردہ دیگر نعمتیں مثلاً پھل اور ثمرات بھی کبھی مہیا کرنا۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو انسانی نفس کیلئے ضروری ہیں۔ اب ہم قرآن اور احادیث کی روشنی میں شمار کردہ نفس کے دس حقوق کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

افراط وتفریط

نفس کے حقوق کی جب بات کی جائے تو لامحالہ اس کے مدمقابل کا بھی ذہن میں خیال آتا ہے اور وہ ہے ''روح'' اور انسان کے ذمہ ان دونوں کے حقوق ہیں۔ سو اگر کوئی شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ یا کم مائل ہوگیا تو اسے افراط وتفریط کہتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص تکمیلِ لذات میں ہی کھو جائے تو یہ نفس کی جانب افراط اور روح کے حق میں تفریط ہوگی۔

افراط کا معنٰی ہے عمداً کسی معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا اور تفریط کا معنٰی ہے عمداً کسی معاملہ میں حد سے کمی کرنا اور یہ دونوں صورتیں ہر معاملہ میں قرآن وسنت کی نگاہ میں مذموم ہیں، جبکہ اسلام، دینِ اعتدال ہے اور ہر چند کہ شریعتِ اسلامیہ میں روح کی نورانیت اور توانائی پر کافی زور دیا گیا ہے لیکن اس سے یہ باور کرلینا کہ نفس کا کوئی حق ہی نہیں ہے انتہائی سادگی اور بھولا پن ہے۔

اپنے امور میں اعتدال اپنایئے!

خالقِ کائنات نے امتِ مسلمہ کو امتِ وسط کے بہترین لقب سے نوازا ہے۔ ارشاد فرمایا ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا'' (اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا)۔ لفظِ وسط کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں، الوسط، اس حالت کو کہتے ہیں جو دو مذموم طرفوں کے درمیان ہو، یعنی معتدل جو افراط وتفریط کے درمیان ہوتا ہے۔ مثلاً جُـوْدٌ (سخاوت) بخل اور اسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنٰی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ ''عَدْلٌ، نِصْفَةٌ، سَوَاءٌ'' کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کیلئے بولا جاتا ہے مزید یہ کہ جو شخص اپنی قوم میں بلحاظِ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجہ کا ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے ''هٰذَا اَوْسَطُهُمْ حَسَبًا'' (یہ عمدہ ترین حسب والا ہے)۔[1] چنانچہ اسی معنٰی میں امتِ مسلمہ کے متعلق فرمایا ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا'' (اور اسی طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت)۔ قرآن حکیم میں ''عِبَادُالرَّحْمٰنِ'' (رحمٰن کے بندے) کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○'' [2] (اور (یہ) وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا (زیادتی اور کمی کی) ان دو حدوں کے درمیان اعتدال پر (مبنی) ہوتا ہے)۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے ''خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا'' [3] (تمام امور میں بہترین کام میانہ روی ہے)۔ اس لیے ہمیں حکم ہے کہ ہم حضور ﷺ کی پیروی کریں اور یہ بھی ارشاد ہے ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' [4] (کہ

---

[1] المفردات، جلد۲، صفحہ ۱۱۵۔ [2] الفرقان، ۲۵:۶۷۔

[3] شعب الایمان، حدیث ۳۸۸۷، جلد۳، صفحہ ۴۰۲۔ [4] الاحزاب، ۳۳:۲۱۔

تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں بہترین نمونہ ہے) اور حضور ﷺ نے اُمتِ مسلمہ کو حقوقِ نفس کی تلقین اس وقت فرمائی جب کچھ حضرات روح کی طرف اس قدر زیادہ مائل ہو گئے کہ اُن سے نفس کے معاملہ میں تفریط ہو گئی۔

حقوقِ نفس کی بات افراط و تفریط کے وقت کی گئی

قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب دو فریقوں کے درمیان کسی ایک کو زیادہ ترجیح دی جائے تو دوسرے کے حقوق کی بات اٹھائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہوں اور وہ اُن میں سے کسی ایک کی طرف غیر معمولی طور پر جھک جائے تو اسے دوسرے کے حقوق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ روحانیتِ اسلام کا بھرپور دور تھا، اور حضور ﷺ کی تقریر دلپذیر اور مواعظِ حسنہ کی تاثیر سامعین کے مَن میں اُتر جاتی تھی اسی لیے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سراسر روح کی طرف مائل ہو گئے اور نتیجتاً اُن سے حقوقِ نفس میں تفریط ہو گئی۔ مربی اُمت ﷺ کو جب اس افراط و تفریط کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس امر پر بڑی سخت تنبیہ فرمائی۔ اس سلسلے میں چند آیات اور احادیث پیش خدمت ہیں۔

حکمِ باری تعالیٰ ہے کہ اپنی جانوں پر سختی نہ کرو

اسلام دینِ فطرت اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے احکام نہایت آسان ہیں۔ اس کے احکام کی تعمیل میں انسانی طبیعتیں بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتیں اور نہ ہی اسلام کسی کو زبردستی اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے اور نہ ہی ناروا اور غیر شرعی پابندیاں اپنے پیروکاروں کیلئے پسند کرتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ فَیُشَدِّدُ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا فَشَدَّدَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ فَتِلْکَ بَقَایَاھُمْ فِی الصَّوَامِعِ وَالدِّیَارِ "[1]
(اپنے نفسوں پر سختی نہ کیا کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی سختی کرے گا۔ ایک قوم نے اپنے اوپر ناروا سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سختی کی۔ راہب خانوں اور خانقاہوں میں ان کے باقی ماندہ لوگ موجود ہیں ان کو دیکھ لو)۔

ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں ہم حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ہمارے ایک ساتھی نے ایسی جگہ دیکھی جس میں پانی کا چشمہ تھا اور سبزی بھی تھی۔ حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں اس جگہ عبادت میں اپنی زندگی بسر کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں یہودیت اور نصرانیت کے ساتھ

---

[1] سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، متوفی ۲۷۵، حدیث ۳۸۴۰، جلد ۲، صفحہ ۱۲۵۵، دار الفکر، بیروت۔

مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ ملت حنفیہ دے کر بھیجا گیا ہوں جس میں فراخی اور آسانی ہے۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے ایک صبح یا ایک شام راہ خدا میں جہاد کرنا دنیا و مافیہا سے افضل ہے اور تمہارا مجاہدین کی صف اول میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی (نفلی) نماز سے بہتر ہے۔[1]

چند جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ ہمیشہ روزہ رکھیں گے، ساری رات عبادت میں گزاریں گے، بستروں پر نہیں سوئیں گے، گوشت گھی وغیرہ نہیں کھائیں گے۔ عورتوں اور خوشبو سے بالکل اجتناب کریں گے۔ اونی لباس پہنیں گے اور دنیا سے قطع تعلق کرلیں گے۔ رحمتِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے انہیں بلا کر یہ حقیقت افروز ارشاد فرمایا ''اِنَّ لِاَ نْفُسِکُمْ عَلَیْکُمْ حَقًّا فَصُوْمُوْا وَاَفْطِرُوْا وَقُوْمُوْا وَنَامُوْا فَاِنِّیْ اَقُوْمُ وَ اَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَ اٰکُلُ اللَّحْمَ وَالدَّسَمَ اٰتِیَ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ'' [2] ((اے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم) بے شک تمہارے نفسوں کا بھی تم پر حق ہے اس لیے روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ راتوں میں جاگ کر عبادت بھی کرو اور آرام سے سوؤ بھی کیونکہ میں رات کو جاگتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ گوشت اور گھی بھی کھاتا ہوں۔ اپنی ازواج سے مقاربت بھی کرتا ہوں پس جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے)۔

اس آیت کی وجہ نزول بھی یہی ہے ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآاَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا ؕاِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ وَكُلُوْا مِمَّارَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○'' [3] (اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں (اپنے اوپر) حرام مت ٹھہراؤ اور نہ (ہی) حد سے بڑھو، بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور جو حلال پاکیزہ رزق اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے کھایا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو)۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۲۶۳۹، جلد ۳، صفحہ ۱۰۲۸۔

[2] صحیح مسلم، حدیث ۱۴۰۱، جلد ۵۲، صفحہ ۱۰۲۰۔

[3] المائدہ: ۸۷۔

چنانچہ ان آیات اور احادیث کی وجہ سے امت محمدیہ کیلئے رہبانیت کے دروازے بند کر دیے گئے اور دین فطرت کو مکمل کر دیا گیا۔

رہبانیت ایک بدترین بدعت

عیسائیوں کے ایک گروہ نے بزعم خویش رب تعالیٰ کو راضی کرنے کیلئے رہبانیت اختیار کر لی لیکن وہ اسے نباہ نہ سکے، چنانچہ حکیم مطلق جل جلالہ نے ارشاد فرمایا "ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ط وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ "[1] (پھر ہم نے ان رسولوں کے نقوشِ قدم پر (دوسرے) رسولوں کو بھیجا اور ہم نے ان کے پیچھے عیسٰی ابن مریم علیہ السلام کو بھیجا اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی اور ہم نے اُن لوگوں کے دلوں میں جو اُن کی (یعنی عیسٰی علیہ السلام کی صحیح) پیروی کر رہے تھے شفقت اور رحمت پیدا کر دی۔ اور رہبانیت (یعنی عبادتِ الٰہی کیلئے ترکِ دنیا اور لذّتوں سے کنارہ کشی) کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی، اسے ہم نے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر (انہوں نے رہبانیت کی یہ بدعت) محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے (شروع کی تھی) پھر اس کی عملی نگہداشت کا جو حق تھا وہ اس کی ویسی نگہداشت نہ کر سکے (یعنی اسے اسی جذبہ اور پابندی سے جاری نہ رکھ سکے)، سو ہم نے اُن لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائے (اور بدعتِ رہبانیت کو رضائے الٰہی کیلئے جاری رکھے ہوئے) تھے، اُن کا اجر و ثواب عطا کر دیا اور ان میں سے اکثر لوگ (جو اس کے تارک ہو گئے اور بدل گئے) بہت نافرمان ہیں)۔

رہبانیت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کیلئے لغت وحدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

---

[1] الحدید، ۵۷:۲۷۔

رہبانیت کی لغوی تعریف

ابوالقاسم حسین بن محمدؒ لکھتے ہیں ''وَالرَّهْبَانِيَّةُ غُلُوٌّ فِي تَحَمُّلِ التَّعَبُّدِ مِنْ فَرْطِ الرَّهْبَةِ'' (بوجہ خوف مشکل عبادات اپنانے میں حد سے تجاوز کرنا رہبانیت ہے)۔[1]

امام ابن اثیر جذریؒ فرماتے ہیں ''وَاَصْلُهَا مِنَ الرَّهْبَةِ، اَلْخَوْفُ، كَانُوْا يَتَرَهَّبُوْنَ بِالتَّخَلِّيْ مِنْ اَشْغَالِ الدُّنْيَا وَتَرْكِ مَلَاذِهَا وَالزُّهْدِ فِيْهَا وَالْعُزْلَةِ عَنْ اَهْلِهَا وَتَعَمُّدِ شَاقِهَا حَتّٰى اِنَّ مِنْهُمْ مَنْ كَانَ يَخْصِيْ نَفْسَهٗ وَيَقَعُ السِّلْسِلَةَ فِيْ عُنُقِهٖ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنْ اَنْوَاعِ التَّعْذِيْبِ'' (رہبانیت، ''رھبۃ'' سے ہے اور اس کا معنیٰ خوف ہے۔ راہب لوگ مشاغلِ دنیا چھوڑ کر، لذتوں سے کنارہ کش ہوکر، زُہد اپنا کر اور اہلِ دنیا سے یکسر قطع تعلق کر کے مشکل ترین عبادتوں میں لگ گئے حتیٰ کہ ان میں بعض نے خود کو خصی (نامرد) بنادیا اور اپنی گردن میں زنجیر کو ڈال لیا اور اس کے علاوہ وہ لوگ طرح طرح کے عذاب میں خود کو مبتلا رکھتے)۔[2]

رہبانیت کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں حسب ذیل حدیث شریف سے صحیح صورت حال معلوم ہوجاتی ہے:''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنْتُ رَدِيْفَ النَّبِيِّ عَلٰى حِمَارٍ فَقَالَ لِيْ يَا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ هَلْ تَدْرِيْ مِنْ اَيْنَ اتَّخَذَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ الرَّهْبَانِيَةَ فَقُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ظَهَرَتْ عَلَيْهِمُ الْجَبَابِرَةُ بَعْدَ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَعْمَلُوْنَ بِالْمَعَاصِيْ فَغَضِبَ اَهْلُ الْاِيْمَانِ فَقَاتَلُوْهُمْ فَهَزَمَ اَهْلُ الْاِيْمَانِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ اِلَّا الْقَلِيْلُ فَقَالُوْا اِنْ ظَهَرْنَا لِهٰؤُلَآءِ اَفْنَوْنَا وَلَمْ يَبْقَ لِلدِّيْنِ اَحَدٌ يَدْعُوْا اِلَيْهِ فَقَالُوْا تَعَالَوْا نَتَفَرَّقُ فِي الْاَرْضِ اِلٰى اَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ النَّبِيَّ الَّذِيْ وَعَدَنَا بِهٖ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَعْنُوْنَ مُحَمَّدًا فَتَفَرَّقُوْا فِيْ غِيْرَانِ الْجِبَالِ وَاَحْدَثُوا الرَّهْبَانِيَّةَ وَمِنْهُمْ مَنْ تَمَسَّكَ بِدِيْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ''[3] (حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں گدھے پر نبی کریم ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے اُمِ عبد کے فرزند! کیا تم جانتے ہو کہ بنی اسرائیل نے رہبانیت کو کہاں سے اختیار کیا۔ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر جابر لوگ غالب آ گئے اور انہوں نے فسق

---

[1] المفردات، جلد ا، صفحہ ۲۰۴۔

[2] النھایہ فی غریب الاثر، المبارک بن محمد الجزری، متوفی ۶۰۶ھ، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰، المکتبۃ العلمیہ، بیروت۔

[3] تفسیر القرطبی، جلد ۱۷، صفحہ ۲۶۵۔

وفجور کا بازار گرم کر دیا۔ اہلِ ایمان نے غیرتِ ایمانی سے ان کے خلاف جہاد کیا۔ ان کے ساتھ جنگ کی لیکن تین مرتبہ انہیں شکست ہوئی اور صرف چند لوگ زندہ بچے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ اگر ہم نے پھر ان کے ساتھ لڑائی کی تو وہ ہم سب کو فنا کر کے رکھ دیں گے اور ایک شخص بھی ایسا نہیں بچے گا جو دینِ حق کی طرف لوگوں کو بلائے۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ہم زمین میں منتشر ہو جائیں یہاں تک کہ اللہ (تعالیٰ) نبی مکرم ﷺ کو مبعوث کرے جس کی آمد کا وعدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمارے ساتھ کیا تھا وہ مراد لیتے تھے محمد ﷺ پس وہ پہاڑوں کی غاروں میں منتشر ہو گئے اور انہوں نے رہبانیت کا آغاز کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو اپنے دین کو مضبوطی سے پکڑے رہے اور بعض نے کفر اختیار کر لیا)۔

اس حدیثِ پاک سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جبر وتشدد کے ان اوقات میں ان کا یہ ایک اضطراری فعل تھا۔ ان کے ذہن میں قطعاً یہ بات نہ تھی کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کشی دینِ عیسوی کی روحِ رواں ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان روحانی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اسے قربِ الٰہی کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جابر اور ظالم بادشاہوں کے ظلم وستم سے اپنے آپ کو اور اپنے ایمان کو بچانے کیلئے مجبوراً یہ قدم اٹھایا تھا، لیکن بعد میں آنے والوں نے اسی کو دین بنا لیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس میں اختراعات کا اضافہ ہوتا گیا۔ لوگوں نے اپنے اوپر تشدد اور پابندیوں کا اتنا بوجھ لاد لیا کہ زندگی وبالِ جان ہو گئی۔ کلیسا کے خانقاہی نظام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنی جائز خواہشات کا گلا گھونٹا۔ ازدواجی زندگی کو خیر باد کہا۔ یہاں تک کہ جو شخص کسی مذہبی خدمت کو انجام دینے پر مقرر ہوتا اس کیلئے شادی شدہ ہونا بڑا عیب شمار ہوتا۔ غیر شادی شدہ آدمی اگر کلیسا کا عہدیدار بنتا تو اس کا شادی کرنا خارج از بحث تھا، لیکن جو لوگ پہلے سے شادی شدہ تھے ان پر لازمی تھا کہ وہ اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات منقطع کر دیں۔ اسی طرح عورتوں کو بھی شادی نہ کرنے پر طرح طرح سے ترغیب دی جاتی۔ سینٹ جیرون جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ ''جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس ہونے کا شرف حاصل ہے''۔

ماں باپ، بھائی بہن اور اولاد سے بھی قطعِ تعلق کرنا روحانی مدارج طے کرنے کیلئے شرطِ اول تھی۔ جو لوگ رہبانیت اختیار کرتے وہ عمر بھر اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے الگ تھلگ رہتے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں درج ہیں جنہیں پڑھ کر دل کڑھتا ہے اور رہبانیت کے اس سنگ دلانہ طرزِ حیات پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ ان لوگوں میں اپنے نفس کو اذیت پہنچانے کا ذوق بڑھنے لگا۔ انہوں نے عجیب عجیب اختراعات

اپنائیں۔ کسی نے اپنے آپ کو زنجیر و سلاسل میں جکڑ دیا۔ کسی نے بھاری بوجھ اپنے اوپر لاد لیا۔ کسی نے اپنے اوپر نیند حرام کر لی، چنانچہ اسکندریہ کا سینٹ مکاریو ہر وقت اپنے جسم پر اسی پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا۔ چھ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ یہ تحریک کچھ اس زور سے چلی کہ عیسائی دنیا میں ایسی خانقاہوں کی بھرمار ہوگئی جہاں راہب مرد یا راہبہ خواتین آ کر جمع ہوگئیں۔

انسانی فطرت کے تقاضوں سے جنگ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ عارضی فتوحات تو حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن کلیتًا ان کی بیخ کنی ناممکن ہے۔ بلکہ جب رکے ہوئے جذبات سیلاب کی طرح امڈ کر آتے ہیں تو سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال کلیسا کے خانقاہی نظام کا ہوا۔ بڑے بڑے پوپ اور سینٹ دولت و ثروت میں اپنے وقت کے قارونوں کو بھی مات دے گئے۔ جن محلات میں وہ رہائش پذیر تھے ان کے سامنے شاہی ایوانوں کی بھی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ خانقاہیں جو کنواری راہبات کیلئے تھیں، حرام کاری کے اڈوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ان کی فصیلوں کے قریب نوزائیدہ بچوں کی لاشیں اکثر پڑی ہوئی دکھائی دیتیں۔ کلیسا کی تاریخ کا یہ بڑا اندوہناک اور شرمناک باب ہے جو اُن کے اپنے مؤرخین نے لکھا ہے۔

ان ہی بدعنوانیوں اور بدکاریوں کو قرآنِ حکیم میں ''فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا''[1] کے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ انہوں نے ترہب کو طلبِ ریاست کیلئے بطور زینہ استعمال کیا اور اس طرح لوگوں کے مال ہڑپ کرتے رہے۔[2]

اسلام میں رہبانیت (ترکِ دنیا) کی قطعاً اجازت نہیں

حدیث شریف میں ہے: ''لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ''[3] (اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں)۔ البتہ رہبانیت کا نعم البدل امتِ مسلمہ کو ضرور عطا فرما دیا گیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ''[4] (ہر امت کیلئے رہبانیت ہوتی ہے اور اس امت کی رہبانیت اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد ہے)۔ نیز اعتکاف بھی رہبانیت کا بہترین بدل ہے۔ عنقریب اس پر بحث و تمحیص ہوگی۔

---

[1] الحدید، ۵۷:۲۷۔ [2] تفسیر القرطبی، جلد ۱۷، صفحہ ۲۲۳۔ [3] کشف الخفاء، حدیث ۳۱۵۴، جلد ۲، صفحہ ۲۱۵۵۔
[4] مسند احمد بن حنبل، احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، حدیث ۱۳۸۳۴، جلد ۳، صفحہ ۲۶۶، مؤسسہ قرطبہ، مصر۔

اسلام میں مل جل کر رہنا باعثِ فضیلت ہے

بیابانوں، صحراؤں، پہاڑوں اور غاروں میں جا کر مقیم ہو جانا اور آبادی کا رخ بھی نہ کرنا یہ جوانمردی نہیں ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے"رِجَالٌ لَّاتُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَابَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ"[1](وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید وفروخت یادِ الٰہی سے)۔

حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں "اَلۡمُؤۡمِنُ الَّذِیۡ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصۡبِرُ عَلٰی اَذَاهُمۡ خَيۡرٌ مِّنَ الَّذِیۡ لَايُخَالِطُ النَّاسَ وَلَايَصۡبِرُ عَلٰی اَذَاهُمۡ"[2](وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے اور ان کی تکالیف پر صبر کرے اس مومن سے بہتر ہے جو مل جل کر نہ رہے اور ان کی اذیت پر صبر نہ کرے)۔علمائے کرامؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں اُس شخص کی فضیلت ہے جو لوگوں میں قیام و سکونت اختیار کرے، اُنہیں اعمالِ صالحہ کی تلقین کرتا ہے اور برائیوں سے منع کرتا ہے اور تمام معاملات میں اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کو مدِنظر رکھے یقیناً یہ اس شخص سے بہتر ہے جو گوشہ نشین ہو جائے اور لوگوں کی اذیت پر صبر نہ کرے۔[3] معلوم ہوا کہ رہبانیت، عزلت اور خلوت سے زیادہ بہتر ہے اور صحبت، جلوت اور معیت ومخالطت (مل جل کر رہنا) ہے، تاہم بعض مخصوص اغراضِ دینی کیلئے خلوت وتنہائی ہی مناسب ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ۔

خودی کی خلوتوں میں گُم رہا میں خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں!

نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر جلوۂ دوست قیامت میں تماشا بن گیا میں!

(ب ج:۳۷۳)

خلوت کو اسلام میں پسند فرمایا گیا ہے چنانچہ خود حضور ﷺ متعدد بار غارِ حرا میں فروکش ہوئے اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے علاوہ بہت سے مشائخ عظام نے جنگلوں میں کچھ مدت کیلئے خلوت نشینی اختیار کی اور پھر لوگوں میں آ کر رشد وہدایت کی راہ اختیار کی۔ دراصل اس بات کا دارومدار مختلف اشخاص واحوال پر ہے اگر کوئی شخص لوگوں کے حق میں مفید ہو تو اس کے حق میں تنہائی سے زیادہ بہتر مل جل کر رہنا ہے اور اگر کوئی

---

[1] النور،۲۴:۳۷۔ [2] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۲۶۲۲۰، جلد ۵، صفحہ ۲۹۳۔

[3] تحفۃ الاحوذی، عبد الرحمٰن مبارکپوری، جلد ۷، صفحہ ۲۵۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

شخص لوگوں کے حق میں مضر ہو تو اس کیلئے خلوت و تنہائی ہی بہتر ہے۔ اس سلسلے میں ایک بزرگ نے کیا ہی ایمان افروز بات کہی۔

ایک بزرگ کا ایمان افروز قول: ''ایک مرتبہ ایک خلوت گزیں بزرگ سے کسی شخص نے گوشہ نشینی کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک کتا ہے جو نہایت خطرناک ہے میں اس کے شر سے لوگوں کو بچانے کیلئے گوشہ نشین ہو گیا ہوں۔ پوچھا گیا وہ کتا کہاں ہے؟ فرمایا وہ میرا نفس ہے''۔

اسلام نے تجرد (غیر شادی شدہ ہونے) سے منع فرمایا ہے اور ماکولات و مشروبات کو ترک کرنے سے سختی سے ممانعت فرمائی ہے بلکہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں رہتے ہوئے ماکولات و مشروبات اور ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہے تو حضور ﷺ نے اس کو رہبانیت فرمایا ہے۔ سطورِ ذیل میں ہم قرآن و سنت کی روشنی میں اس موضوع پر اسلام کا اعتدال اور توازن پیش کر رہے ہیں تا کہ ایک مسلمان شخص کو اسوۂ رسول ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی صحیح راہنمائی میسر ہو۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور رہبانیت فطرت کے خلاف ہے

اسلام دین فطرت ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دین کے قوانین وضع کرتا ہے اور ان قوانین میں رھبانیت کی کوئی گنجائش نہیں قرآن کریم کے چند ارشادات اس موضوع پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ '' هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا '' (اور وہی (اللہ) ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا فرمایا اور اسی میں سے اس کا جوڑ بنایا تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے)[۱]

۲۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً'' [۲] (اور یہ (بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان کی طرف سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی)۔

۳۔ ''وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ

---

۱ الاعراف، ۷:۱۸۹۔ ۲ الروم، ۳۰:۲۱۔

مِنَ الطَّيِّبٰتِ "[1] (اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا فرمائے اور تمہارے جوڑوں (یعنی بیویوں) سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے/نواسے پیدا فرمائے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا فرمایا)۔

۴۔ "وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا "[2] (اور وہی ہے جس نے پانی (کی مانند ایک نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا پھر اسے نسب اور سسرال (کی قرابت) والا بنایا)۔

انبیائے کرام ؑ سے بڑھ کر کون رضائے الٰہی کا خواہاں یا رب کریم کا پیارا اور پسندیدہ ہوگا لیکن انہوں نے بھی بھرپور معاشرتی، معاشی اور ازدواجی زندگی بسر فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ "[3] (اور (اے رسول ﷺ!) بے شک ہم نے آپ سے پہلے (بہت سے) پیغمبروں کو بھیجا اور ہم نے ان کیلئے بیویاں (بھی) بنائیں اور اولاد (بھی))۔

ان تمام آیات میں فطرتِ ایزدی کا ذکر ہے اور درج ذیل آیت میں اس امر کی زیادہ وضاحت ہے "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ "[4] (آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی)۔ لہٰذا جو قوم فطرت کے خلاف چلے گی جادۂ حق سے ضرور ہٹ جائے گی جیسا کہ آپ نے راہبوں کا بھیانک انجام پڑھا۔

ترکِ دنیا کا عزم رکھنے والے صحابہ کو تنبیہ

کچھ صحابہ کرام ؓ نے بھی رضائے الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر جاں گسل ریاضت و عبادت شروع کر دی۔ کھانے پینے سے اجتناب کر لیا اور ازدواجی تعلقات سے آزاد ہو گئے۔ ایسی صورتِ حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ نے اُنہیں تنبیہ فرمائی۔ اس سلسلے میں آیاتِ قرآنی کا ذکر پیچھے تفصیل سے کر دیا گیا ہے یہاں مرشدِ عالم ﷺ کی چند احادیث پیش کی جا رہی ہیں جو نفس کے حقوق پر دلالت کرتی ہیں۔

۱) امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں حضرت ابوجحیفہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

---

[1] النحل، ۱۶:۷۲۔
[2] الفرقان، ۲۵:۵۴۔
[3] الرعد، ۱۳:۳۸۔
[4] آل عمران، ۳:۱۴۔

(مواخات مدینہ میں) حضرت سلمان فارسی ؓ اور حضرت ابوالدرداء ؓ کو آپس میں بھائی بھائی بنایا۔ ایک دن حضرت سلمان ؓ حضرت ابوالدرداء ؓ سے ملنے گئے تو انہوں نے حضرت ام الدرداء ؓ کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھا، انہوں نے کہا یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ انہوں ؓ نے کہا آپ کے بھائی ابوالدرداء ؓ کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جب حضرت ابوالدرداء ؓ آئے تو آپ ؓ نے حضرت سلمان کیلئے کھانا تیار کرایا، حضرت سلمان ؓ سے کہا آیئے آپ بھی کھایئے۔ آپ نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان ؓ نے کہا جب تک آپ کھانا نہیں کھائیں گے میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ پھر حضرت ابوالدرداء ؓ نے کھانا کھایا۔ جب رات ہوئی تو حضرت ابوالدرداء ؓ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ حضرت سلمان ؓ نے کہا سو جائیں! وہ سو گئے، پھر نماز کیلئے کھڑے ہوئے، انہوں نے پھر کہا سو جائیں، جب رات کا آخری حصہ رہ گیا تو حضرت سلمان ؓ نے کہا اب کھڑے ہوں۔ پھر دونوں نے نماز (تہجد) پڑھی، پھر حضرت سلمان ؓ نے کہا آپ کے رب کا آپ پر حق ہے اور آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے اور آپ کے اہل (بیوی) کا آپ پر حق ہے، ہر حقدار کو اس کا حق ادا کریں۔ حضرت ابوالدرداء ؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ عرض کیا، آپ ﷺ نے فرمایا سلمان ؓ نے سچ کہا۔ [1]

۲) امام احمد بن حنبلؒ روایت کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت خویلہ بنت حکیم ؓ جو حضرت عثمان بن مظعون ؓ کے نکاح میں تھیں، وہ میرے پاس آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بہت خستہ حال میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اے عائشہ ؓ! خویلہ کس قدر خستہ حال ہیں۔ حضرت عائشہ ؓ نے کہا یارسول اللہ ﷺ جس عورت کا خاوند دن میں روزہ رکھتا ہو اور ساری رات نماز پڑھتا ہو، وہ اس عورت کی طرح ہے جس کا کوئی خاوند نہ ہو۔ سو اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کیلئے چھوڑ دیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون ؓ کو بلوایا۔ جب حضرت عثمان بن مظعون ؓ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عثمان ؓ! کیا تم میری سنت سے اعراض کرنے والے ہو؟

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۱۸۶۷، جلد ۲، صفحہ ۶۹۴۔

انہوں نے کہا نہیں، بخدا یا رسول اللہ ﷺ! بلکہ میں آپ کی سنت کا طالب ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور کھاتا پیتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان ؓ! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ تمہارے اھل (بیوی) کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، سو تم روزہ رکھو اور کھاؤ پیو بھی اور نماز پڑھو اور سوؤ بھی۔[1]

۳) مسند ابی یعلیٰ میں ہے کہ "حضور ﷺ نے فرمایا اے عثمان ؓ کیا تمہارے لیے میری سیرت میں نمونہ نہیں ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں اس ارشاد کا کیا سبب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو حالانکہ تمہارے اھل (زوجہ) کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے تم نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔[2]

۴) امام ابن جریر طبریؒ ایک حدیث مبارکہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ کے دس صحابہ ؓ نے (اُن میں حضرت علی بن ابی طالب ؓ اور عثمان بن مظعون ؓ بھی تھے) باہم مشورہ کیا اور کہا کہ اس وقت تک ہم عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنے لیے ایک الگ مشکل عبادت نہ اپنائیں۔ بے شک نصاریٰ نے اپنے نفسوں پر (دنیاوی چیزوں کو) حرام قرار دیا تھا لہٰذا ہم بھی اپنے آپ پر بہت سی چیزیں حرام کرتے ہیں۔ پھر بعض نے اپنے آپ پر گوشت اور چربی حرام کی اور بعض نے نیند حرام کی اور بعض نے خود پر اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت حرام کر دی۔ عثمان بن مظعون ؓ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خود پر بیویاں حرام کی تھیں۔ ایک مرتبہ عثمان ؓ کی اہلیہ ام المومنین سیدہ عائشہ ؓ کے پاس آئیں تو سیدہ عائشہ ؓ اور حضور ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن نے فرمایا اے خویلہ ؓ! یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے تیری رنگت تبدیل ہے، کیا تو کنگھی نہیں کرتی اور تیل نہیں لگاتی؟ اس نے کہا میں کیسے تیل کنگھی کروں جبکہ میرے شوہر نے اتنے عرصہ سے مجھ پر سے کپڑا نہیں ہٹایا۔ حضور ﷺ کی ازواج رضی اللہ عنھن اس کا یہ جواب سن کر ہنسنے لگیں، وہ ابھی ہنس رہی تھیں کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ

---

[1] مسند احمد بن حنبل، احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، حدیث ۲۶۳۵۱، جلد ۶، صفحہ ۲۶۸ موسسۃ قرطبہ، مصر۔

[2] مسندِ ابی یعلیٰ، حدیث ۸۹۸، جلد ۲، صفحہ ۹۳ [3] تفسیر طبری، امام جریر الطبری، متوفی ۳۱۰ھ، جلد ۷، صفحہ ۹، دار الفکر، بیروت۔

نے فرمایا کیوں ہنس رہی ہو؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے خویلہ ؓ سے اس کا حال پوچھا تو اُس نے یہ جواب دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان ؓ کو بلوایا وہ آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عثمان ؓ! یہ کیا ماجرا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے اسے اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیا ہے تا کہ دلجمعی کے ساتھ عبادت کروں اور پورا قصہ بیان کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ابھی جاؤ اور اپنی اہلیہ کا حق ادا کرو۔ انہوں نے کہا میرا روزہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا توڑ ڈالو۔ انہوں نے روزہ توڑا اور حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر خویلہ ؓ واپس آئی تو اس نے سرمہ لگا رکھا تھا تیل اور خوشبو لگا رکھی تھی سیدہ عائشہ ؓ اسے دیکھ کر مسکرانے لگیں اور فرمایا اے خویلہ ؓ کیا حال ہے؟ وہ کہنے لگیں کل میرے شوہر میرے قریب آئے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے آپ پر عورتیں، طعام اور نیند حرام کر رکھی ہے؟ میں نیند بھی کرتا ہوں، قیام بھی کرتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، کھاتا پیتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان ؓ! اپنے نفس پر زیادہ بوجھ مت ڈالو، بے شک یہ اعتداء یعنی حد سے بڑھنا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[1]

۵) مجیبہ باہلیہ ؓ اپنے والد یا چچا سے روایت کرتی ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے پھر واپس چلے آئے، پھر ایک سال کے بعد دوبارہ آپ ﷺ سے ملنے گئے۔ اس وقت ان کا جسم کمزوری کی وجہ سے بہت متغیر ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا فلاں باہلی ہوں جو ایک سال پہلے آپ ﷺ سے ملنے آیا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تم کس وجہ سے اس قدر بدل گئے تم تو بہت خوبصورت تھے؟ انہوں نے کہا میں جب سے آپ ﷺ کے پاس سے گیا ہوں، میں نے کبھی دن کو کھانا نہیں کھایا، صرف رات کو کھانا کھاتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے اپنے نفس کو کیوں عذاب میں ڈالا؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا رمضان کے روزے رکھا کرو اور ہر مہینہ میں ایک روزہ رکھ لیا کرو۔ انہوں نے عرض کی زیادہ کریں مجھ میں اس کی طاقت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر ماہ دو روزے رکھ لو۔ انہوں نے پھر عرض کی زیادہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا ہر ماہ تین روزے رکھ لو۔[2]

۶) حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اچانک ایک شخص کو

---

[1] تفسیر طبری، امام جریر الطبری، متوفی ۳۱۰ھ، جلد ۷، صفحہ ۹، دار الفکر۔ [2] سنن ابی داؤد، حدیث ۲۴۲۸، جلد ۲، صفحہ ۳۲۲۔

دھوپ میں کھڑے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ نے پوچھا یہ کون ہے؟ صحابہ ؓ نے کہا یہ ابو اسرائیل ؓ ہے اس نے منت مانی ہے کہ یہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں، نہ سایہ میں آئے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا اس سے کہو بات کرے، سایہ میں آئے اور بیٹھے اور اپنا روزہ پورا کرے۔[1]

۷) حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دیکھا، ایک بوڑھا شخص جو چل نہیں سکتا تھا، اس کے دو بیٹے اسے پکڑ کر چلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ صحابہ ؓ نے کہا اس نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے کہ یہ اپنے نفس کو عذاب دے اور اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔[2]

متذکرہ بالا احادیث میں زیادہ شب بیداری سے منع کیا گیا ہے اور نیند کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بے جا فاقہ کشی سے منع کیا گیا بلکہ حد سے زیادہ روزے رکھنے سے منع کیا گیا ہے اور کھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ دھوپ میں کھڑے رہنے سے منع کیا گیا ہے اور سایہ میں آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو لاغر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور جسم کو اچھی حالت پر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی کو خیر باد کہنے پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے اور روزہ تڑوا کر حقوقِ زوجیت ادا کرنے کا حکم کیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ پیدل چلنے سے منع کیا گیا ہے اور سوار ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اُلجھی ہوئی حالت کو ناپسند فرمایا گیا اور تیل، کنگھی، سرمہ اور خوشبو کو پسند فرمایا گیا ہے۔

مسندِ احمد کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو سفر میں ایک غار نظر آیا جس میں پانی بھی تھا اور سبزیاں بھی تھیں۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ اس غار میں آ کر رہے اور دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔ یہ خیال اُس نے حضور ﷺ کے سامنے ظاہر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں یہودیت اور نصرانیت کے ساتھ نہیں بھیجا گیا، میں ملتِ حنفیہ کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں جو بہت آسان ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ کی راہ میں ایک صبح کرنا یا ایک شام گزارنا دنیا و مافیھا سے بہتر ہے۔[3]

اس حدیث سے دیگر فوائد کے علاوہ ایک فائدہ یہ معلوم ہوا کہ تمدنی زندگی گزارنا نفس کا حق ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۱۸۶۵، جلد ۲، صفحہ ۳۲۲۔

[2] مجمع الزوائد، حدیث ۹۴۴۱، جلد ۵، صفحہ ۵۶۸۔　　[3] مسند احمد بن حنبل، جلد ۵، صفحہ ۲۲۶۔

اس لیے حضور ﷺ نے غار میں بسیرا کرنے سے نہ صرف منع فرمایا بلکہ اسے یہودیت اور نصرانیت قرار دیا اور بال بچوں سے محبت کرنا بھی نفس کے حقوق میں سے ہے۔ ایک صحابیٔ رسول (حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ) کو یہ بات روحانیت کے منافی محسوس ہوئی، چنانچہ وہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر جب اپنے گھر پہنچے تو اپنے بچوں سے پیار کرنے لگ گئے اچانک انہیں خیال آیا کہ ان کی یہ کاروائی درست نہیں ہے حتیٰ کہ انہوں نے اسے منافقت سے تعبیر کیا اور گھر سے واپس بارگاہِ نبوی ﷺ میں پلٹے اور کہنے لگے کہ حنظلہ رضی اللہ عنہ منافق ہو گیا، حنظلہ رضی اللہ عنہ منافق ہو گیا، راستہ میں حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ ملے تو استفسار کیا اے حنظلہ رضی اللہ عنہ کیا ہوا؟ کہنے لگے میں منافق ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، اصل بات بتاؤ کیا واقعہ ہوا؟ انہوں نے کہا جب ہم حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کے مواعظِ حسنہ سنتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ایک طرف جنت اور دوسری طرف جہنم ہو اور دنیا کی کوئی بات ہمارے نہاں خانہ میں نہیں ہوتی لیکن جب گھر میں آ کر بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو بچوں کو اٹھاتے ہیں اُن سے پیار کرتے ہیں غرض کہ ان میں گھل مل جاتے ہیں، تو بتلایئے وہاں وہ حالت اور یہاں یہ حالت یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی صورتِ حال تو ہمارے ساتھ بھی ہوتی ہے چلیئے حضور ﷺ کی بارگاہ میں چلتے ہیں دونوں حاضر ہوئے اور مدعا عرض کیا۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا اے حنظلہ رضی اللہ عنہ کبھی یہ حالت اور کبھی وہ حالت دونوں درست ہیں اور اگر تم صرف اُسی حالت میں رہو جو ہماری بارگاہ میں ہوتی ہے تو ملائکہ تم سے تمہارے بستروں پر آ کر مصافحہ کریں۔[1]

اس حدیث پاک سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بات نفس کے حقوق میں سے ہے کہ انسان اعتدال کے دائرے میں رہ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اُنس و محبت کرے۔ بہر کیف اللہ تعالیٰ نے بندوں کیلئے نعمتیں پیدا فرمائیں اور وہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اس کے بندے اس کی نعمتیں استعمال کریں چنانچہ نبی کریم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرُ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ "[2] (بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اُس کی نعمتوں کا اثر اُس کے بندوں پر دیکھا جائے)۔

مگر صرف نعمتوں کے استعمال پر ہی ساری توجہ نہ رہے بلکہ "مُنعم جلّ جلالہ" کی یاد بھی ہر وقت شاملِ

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۷۵۰، جلد ۴، صفحہ ۲۱۰۶۔ [2] سنن الترمذی، حدیث ۲۸۱۹، جلد ۵، صفحہ ۱۲۳۔

حال رہے ارشادِ نبوی ﷺ ہے ''اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے غذا فراہم کرتا ہے اور مجھ سے محبت کرو اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت سے محبت کرو مجھ سے محبت کی بنا پر''۔[1]

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ نکاح کرنا اور خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں کو استعمال کرنا ولایت اور محبوبیتِ خدا کے منافی ہے یقیناً یہ خیالاتِ فاسدہ جہالت کا نتیجہ ہیں۔ سورۃ الرعد کی آیت نمبر ۳۸ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے خیالات سے منع فرمایا ہے جس کا بیان گزر چکا ہے۔

حقوقِ نفس کے بارے میں مُریدین کی تربیت

حضرت امام غزالیؒ نے اس مسئلہ پر بہت مبسوط بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، آپؒ ارشاد فرماتے ہیں ''اور یہ وہ اسرار ہیں جنہیں آشکار کرنا کسی شیخ طریقت کیلئے جائز نہیں ہے بلکہ شیخ کو چاہیے کہ وہ فقط بھوک کی تعریف پر اختصار کرے اور مرید کو اعتدال کی طرف نہ بلائے اس لیے کہ جب وہ مرید کو اعتدال کی تلقین کرے گا تو وہ اعتدال پر قائم نہیں رہے گا بلکہ اس سے کوتاہی ہو جائے گی اور وہ نفس کی طرف مائل ہو جائے گا، لہٰذا شیخ کو چاہیے کہ وہ تمام تر کوشش اسے بھوک کی طرف راغب کرنے میں خرچ کرے حتیٰ کہ مرید کیلئے اعتدال پر آنا سہل ہو اور شیخ اپنے مرید کو یہ ہرگز نہ کہے کہ عارفِ کامل ریاضتِ نفس سے مستغنی ہوتا ہے اگر وہ ایسا کہے گا تو شیطان جو انسان کے قلب کے ساتھ لگا ہوا ہے ہر وقت اُس مرید کو یہ القاء کرتا رہے گا کہ تو بھی عارفِ کامل کے مقام پر فائز ہو گیا ہے اور یہی تصور اُسے معرفت و کمال سے محروم رکھے گا بلکہ شیخ کو چاہیے کہ وہ مریدین کی بھلائی کی خاطر اپنے مقام سے ذرا نیچے اتر کر ہر ریاضت میں مریدین کا ساتھ دے۔ حضرت ابراہیم الخواصؒ کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر سالک کی تربیت کرتے ہوئے خود بھی اس طریقہ پر کاربند رہتے جس کی مرید کو تلقین کرتے تاکہ مرید کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ شیخ نے جو طریقہ اُسے تلقین کیا ہے وہ خود کیوں نہیں کر رہے، یہ سوچ کر وہ اس ریاضت سے اکتا جائے گا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ قوی وہ ہے کہ غیر کی اصلاح کرتے ہوئے خود کو راہِ سلوک کے ضعفاً (کمزور) کے درجہ پر اتارے اور ان پر سایۂ لطف و شفقت پھیلاتے ہوئے ان کے احوال کی رعایت کرے

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۳۷۸۹، جلد ۵، صفحہ ۶۶۴۔

اورانہی کی مشابہت اختیار کرے (جیسا کہ غزوۂ خندق میں اگر صحابہ کرام ؓ کے پیٹوں پر ایک ایک پتھر تھا تو حضور ﷺ نے دو پتھر باندھے ہوئے تھے)۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کمزوروں کی روحانیت کو قوی کرنے کیلئے خود کو انہی کے درجہ پر اتارنا یہ انبیائے کرام ؑ اور ان کے بعد اولیائے کرامؒ کیلئے بڑا ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ اور چونکہ حدِّ اعتدال اکثر لوگوں پر مخفی ہے لہٰذا عزیمت و احتیاط کا دامن ہر حال میں ہر شخص پر لازم ہے، اسی احتیاط کے پیشِ نظر حضرت عمر ؓ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ ؓ کو ادب سکھایا۔ آپ ایک مرتبہ تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہؓ مکھن میں بُھنا ہوا گوشت تناول فرما رہے تھے تو آپ نے اپنا دُرہ بلند فرمایا اور ارشاد فرمایا تیری ماں مر جائے، ایک دن گوشت اور روٹی کھا، ایک دن روٹی اور دودھ، ایک دن روٹی اور مکھن، ایک دن روٹی اور زیتون، ایک دن روٹی اور نمک اور کبھی فقط روٹی کھا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اعتدال ہے لیکن گوشت اور دیگر شہوات مثلاً پھل وغیرہ پر ہمیشگی کرنا افراط اور اِسراف ہے اور گوشت کو بالکل ترک کر دینا نفس کے حق میں تنگی ہے، بہر کیف ہماری بیان کردہ تفصیل میں اعتدال کی طرف راہنمائی ہے۔

جوگیوں اور راہبوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے جسم اور جسمانی قوتوں کو روح کی ترقی میں مزاحم گردان لیا اور پھر مخالفتِ نفس کے نظریہ سے انہوں نے ایسی جاں گسل (جان کو پگھلانے والی) اور بھیانک ریاضتیں ایجاد کیں جن کے تصور سے ہی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور قلب کانپ اٹھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے سے روح کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ بجائے ترقی کے قلب و روح کو شدید نقصان پہنچا۔

حصّہ دوم

خطرات و آفاتِ نفس

باب نمبر ۱۱

خواطر اور نفس وشیطان کے غلبہ کی راہیں

خطرات وآفاتِ نفس کی پہچان اور تدارک

نفس تمام آفتوں کی جڑ اور ذلت کا مقام ہے۔ ابلیس کا یہی خزانہ ہے۔ بعض صالحین نے کہا ہے کہ نفس خبیث کی خست وجہالت کا یہ عالم ہے کہ جب کسی گناہ کا قصد کرے یا شہوت پر اُٹھ کھڑا ہوتو خدا، رسول اور قرآن کا واسطہ پیش کرنے یا موت، قبر، قیامت، جنت اور دوزخ اس کے سامنے پیش کرنے کے باوجود بھی گناہ سے نہیں رُکتا۔ ایک بزرگ نے کہا: " اَلنَّفْسُ اَخْبَثُ مِنْ سَبْعِيْنَ شَيْطَانًا" (ایک نفس کی خباثت ستر شیطانوں کی خباثت سے بھی زیادہ ہے)۔ نصر آبادی فرماتے ہیں کہ تمہارا نفس ہی تمہارا قید خانہ ہے جب تو اس سے نکل آیا تو تُو نے ابدی راحت حاصل کرلی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ کسی جانور کو اتنی سخت لگام کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی نفس کو ہوتی ہے۔ بندے اور اس کے آقا کے بیچ میں اس کا نفس ہی حجاب ہوتا ہے۔ جب تک نفس اپنی آفات وخطرات سے نجات نہیں پالیتا تب تک وہ دِل پر غالب رہتا ہے اور دِل کو اپنا قیدی بنائے رکھتا ہے۔ اس کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ انسان کی حرکت وعمل، افعال وتصرفات انہی خطرات کے تابع ہوتے ہیں۔ نفس کے اسقدر مضرت

رساں اور خطرناک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ''گھر کا چور'' ہے، جیسے حضرت بُلھے شاہؒ نے فرمایا ہے ''میری بُکل دے وچ چورنی''۔ گھر کا چور اور آستین کا سانپ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، کیونکہ عام طور پر انسان کا اس طرف دھیان نہیں ہوتا۔ نفس ایک محبوب دشمن ہے اور محبوب شے کے عیوب و نقائص نظر نہیں آتے۔ وہ محبت میں اندھا رہتا ہے، لہٰذا عیوب سے ناواقف شخص ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

چنانچہ نفس پروری کی آفات مثلاً غصہ، غیظ و غضب، حسد، کینہ، بغض، غیبت، چغلخوری، بدگمانی، عیب جوئی، کبر و نخوت، حرص و ہوا، شہوت پرستی، عجب و خود پسندی، حُبِ جاہ و منصب، مال و زر کا لالچ، فریب، کذب و افتراء، تہمت و قذف، دھوکہ بازی، ذوقِ مدح و ستائش کا حاصل ہونا اور خوشامد کرنا سب نفس کی آفات ہیں۔ جن کے مظاہر ہمیں روزانہ اپنے گرد و پیش میں اور خود ہمارے اندر ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح شکم سیری، لوگوں سے طمع رکھنا، جلد بازی اور عجلت پسندی، اعلیٰ مکان، زرق برق لباس، سامانِ تزئین و آرائش اور مال و دولت کے اکتساب کیلئے جائز و ناجائز طریقے اپنانا، بخل اور فقر و احتسابی کے خوف کا مسلط رہنا، محض سیاسی اور مذہبی کاروبار چمکانے کی کوشش میں منافرت اور کینہ پروری سے کام لینا، ذاتی دشمن کو پسپا کرنے کیلئے سازشوں کا جال بچھانا، محض ذاتی رعب و دبدبہ کی دھاک بٹھانے کیلئے جنگ و جدل تک اُتر آنا بلکہ قتل و غارتگری کے ذریعے اپنا سکہ چلانے کی منصوبہ بندی کرنا، آناً فاناً کروڑ پتی بننے کے رنگین خوابوں کی تعبیر کیلئے تگ و دو کرنا، یہاں تک کہ جھوٹے اور شیطانی عملیات کے ذریعے دوسروں کو اپنا تابع فرمان بنا کر اپنے سفلی جذبات اور گھٹیا مقاصد کی تکمیل کرنا، یہ سب خطراتِ نفس کے زمرے میں آتے ہیں۔ نفس کی پرورش کیلئے اسباب تلاش کرنا، اس کی مرادیں پوری کرنا، اس کی خواہشات کی تکمیل کیلئے پیش رفت کرنا، الغرض مذکورہ آفاتِ نفس اور خطرات کا راستہ نہ رُوکنا گویا نہ صرف اپنے دشمن بلکہ اللہ تعالیٰ کے دشمن کی مدد کرنا ہے اور اسے تقویت پہنچانا ہے۔

حدیث قدسی ہے ''عَادِنَفْسَکَ فَاِنَّهَا اِنْتَصَبَتْ بِمُعَادَاتِیْ''[1] (کہ (اے انسان!) اپنے نفس سے عداوت رکھ کیونکہ یہ میری مخالفت پر کمر بستہ ہے)۔ کیونکہ شیطان نفس کا خادم ہے اور ہوا، ہوس، برائی اور تکبر میں نفس اس قدر خدا کا سرکش ہوتا ہے کہ بسا اوقات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ بھی کر دیتا ہے، شرک پر بھی راضی نہیں ہوتا، خود حاکمِ مطلق بننے کی خواہش رکھتا ہے۔

---

[1] الاحکام للآمدی، جلد ا، صفحہ ۱۹۷۔

صوفیائے کرامؒ نے ہمیشہ خود کو بھی نفس کی ہرزہ سرائیوں سے بچانے کی کوشش کی ہے اور عامۃ الناس کو بھی اس کے خطرات اور آفات سے محفوظ رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ ہر وقت نفس کی سازشوں اور مکائد کے سامنے بند باندھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم دسوقیؒ فرماتے ہیں کہ نفس کے خطرات اور آفات جب سالکوں کو حائل ہوتے ہیں تو انہیں اذکار کی زیادتی اور طاعات سے بھی روکتے ہیں اور جب عارفوں کے بیچ میں آتے ہیں تو ان کو مشاہداتِ لذیذہ اور اُوپر کے درجوں میں ترقی سے روکتے ہیں۔ لہٰذا توحید میں نفس کو ''لا'' کی لگام ڈال دی جاتی ہے تاکہ اپنے دعوؤں سے باز رہے۔

مرد شو آور زمام اُو بکف تا شوی گوہر اگر باشی خزف

(مرد بن اور اس (نفس) کی لگام ہاتھ میں لے تاکہ تو ٹھیکری سے گوہر بن جائے)

سید ابراہیم دسوقیؒ فرماتے ہیں کہ فقیروں کی شان یہ ہے کہ وہ حسد، غیبت، سرکشی، فریب کاری، مکابرہ، باہمی شک وشبہ، چاپلوسی، دروغ گوئی، غرور، خود پسندی، شیخی، اکڑ بازی اور نفس کی لذتوں سے مبرا ہوں، مجلسوں میں صدر بن کر نہ بیٹھیں، دوسرے مسلمان بھائی کے مقابلے میں خود کو برتر نہ سمجھیں اور کبھی کسی صاحبِ خرقہ پر اعتراض نہ کریں۔ ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ نفس کی آفات اور مہلک خطرات سے بچنے کی تدبیر کرے۔ اگر نفس کا دِل پر غلبہ ہو جائے تو انسان مکمل طور پر نفس کا زیرِ فرماں ہو جاتا ہے۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں می شود فرماں پذیر از دیگراں

(ہر وہ شخص جو اپنے آپ (نفس) پر حکم کرنے والا نہیں وہ لامحالہ دوسروں (نفس کی خواہشات اور خطرات) کے زیرِ فرماں ہوتا ہے)

زیرِ نظر مضمون میں نفس کی اُن آفات اور خطرات کو تفصیلاً بیان کیا جاتا ہے جو انسان کو خواہشات کا بندہ بنا دیتے ہیں، خدا اور رسول ﷺ کے احکام اور قرآن وسنت کے ابدی اُصولوں کو نظر انداز کر کے نفسانی وساوس اور ھویٰ جس کی بدولت انسان مضطرب اور بے چین زندگی بسر کرتا ہے کی پیروی پر لگا دیتے ہیں۔ اس باب میں اِن خطرات و آفات سے بچنے کی تدابیر کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خطرہ ضمیر پر وارد ہونے والا خطاب ہے

ہر شخص کے مشاہدہ میں یہ حقیقت آتی ہے کہ انسان کے دِل میں کبھی کوئی نیک خیال آتا ہے اور کبھی کوئی بُرا خیال۔ اچھے اور بُرے خیالات کی اس کشمکش میں کبھی ایک خیال غالب آتا ہے تو کبھی دوسرا خیال ترجیح پا جاتا ہے۔ خیالات کی یہ ہماہمی دِل کو اضطراب کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔ دِل پر گزرنے والی اس کیفیت کو خطرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ واردات کو بھی خواطر یا خطرات کہا جاتا ہے۔ یہی خواطر یا وارداتِ قلبی انسان کو کسی فعل یا ترکِ فعل کا حکم دیتی ہیں۔ چنانچہ سرِّ دلبراں کے مطابق خطرہ ایک قسم کا خطاب ہے، جو ضمیر پر وارد ہوتا ہے یا خطرہ سے مراد وہ وارد ہے جو دِل میں خطاب کی صورت میں آتا ہے۔

اصطلاحاتِ صوفیا میں خواجہ شاہ محمد عبدالصمدؒ لکھتے ہیں کہ انسان کے دِل پر غیب سے جو واردات ہوتی ہیں اُن میں سے ایک جذبہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی اور محض عنایت سے بندہ کے دِل پر بغیر کسی کوشش کے ایسی کیفیت طاری ہو جو بندے کو حق تعالیٰ سے قریب کر دے اور مراتب سلوک اور منازلِ قرب طے کرا دے۔ دوسرے یہ کہ بندے کے دِل پر ایسی اضطراری کیفیت خدا کی طرف سے نازل ہو جو بندے کو مجبور کر کے خدا کی طرف متوجہ کر دے اور تمام بُرائیوں سے اُسے چھڑا دے۔ ایسی واردات خطرۂ داعیہ کہلاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ انسان کے دِل پر بطور خطاب اس کی صلاحیت اور اُس کی استعداد کے مطابق کچھ وارد ہوا اُسے خطرہ کہتے ہیں۔ جس کی طرف مذکورہ سطور میں سرِّ دلبراں کے حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ خطرہ کو خاطر بھی کہا جاتا ہے۔

خیال کی قسمیں اور اُن کا حکم

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کیلئے اُن کے خیالات سے تجاوز فرمایا ہے، جن کی وہ اپنے جی سے باتیں کرتے ہیں، جب تک کہ اُن کو منہ سے نہ نکالیں یا اُن کو عمل میں نہ لائیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ ان کے سینوں میں جو وساوس پیدا ہوں۔[1]

خیال کے مراتب پانچ ہیں۔ (۱) ہاجس (۲) خاطر (۳) حدیث النفس (۴) وہم (۵) عزم۔ پس جب کوئی بات قلب میں ابتداءً واقع ہوئی اور اس نے نفس میں کوئی حرکت نہیں کی، اُس کو ہاجس کہتے

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۲۰۵۴، جلد ا، صفحہ ۱۷۹۔

ہیں۔ پھر اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور اوّل ہی سے اس کو دفع کر دیا تو وہ بعد کے مراتب کی تحقیق کا محتاج نہ ہوگا اور اگر وہ نفس میں دورہ کرنے لگے یعنی وقوع ابتدائی کے بعد اس کے نفس میں اس کی آمدورفت ہونے لگے مگر اس کو کرنے یا نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے نہیں باندھا اس کو خاطر کہا جاتا ہے۔ اور جب نفس کرنے یا نہ کرنے کا برابر درجے میں منصوبہ باندھنے لگا اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوئی اس کو حدیث النفس کہتے ہیں۔

سو یہ تین درجے ایسے ہیں کہ ان پر نہ عتاب ہے اگر یہ شر میں ہے، اور نہ ثواب ہے اگر خیر میں ہے۔ پھر جب اس فعل کو کر لیا تب اس فعل پر عتاب یا ثواب ہوگا اور ہاجس، خاطر اور حدیث النفس پر نہ ہوگا۔ پھر جب نفس میں فعل یا عدمِ فعل کا منصوبہ ترجیحِ فعل کے ساتھ ہونے لگا لیکن وہ ترجیح قوی نہیں ہے بلکہ مرجوح ہے، جیسا کہ وہم ہوتا ہے اس کو ھــمّ بھی کہتے ہیں۔ اس پر ثواب بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ خیر میں ہے اور عتاب بھی ہوتا ہے اگر وہ شر میں ہے۔ پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا یہاں تک کہ پختہ ارادہ بن گیا اس کو عزم کہتے ہیں۔ اس پر بھی ثواب ہوتا ہے اگر خیر میں ہو ورنہ تو عتاب ہوتا ہے اگر شر میں ہو۔

خواطر کی اقسام

وہ خواطر جو قلبِ انسانی پر وارد ہوتے ہیں ان کو مشائخ طریقت نے چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱) خطرۂ حق

اگر ضمیر پر وارد ہونے والا خطاب حق تعالیٰ کی جانب سے ہو تو خطرۂ حق، خطرۂ رحمانی یا خطرۂ ربانی کہلاتا ہے۔ یعنی وہ خطرہ جو سالک کو ذاتِ حق سبحانہ کی طرف متوجہ کرے۔ یہ اس شان سے وارد ہوتا ہے کہ بندہ کو مغلوب کر لیتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سالکین راہِ حق اور اہلِ حضور کے دِلوں میں بلا واسطہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ خطرہ نیک ہو تو انسان کے اکرام واعزاز کیلئے ہوتا ہے اور اگر بظاہر بد ہو تو اس سے انسان کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ شیخ قطب الدین دمشقیؒ نے ''امداد السلوک'' میں لکھا ہے کہ خطرۂ حقانی وہ ہے جس کا مقابلہ کوئی شئے نہیں کر سکتی۔ جب اس کا غلبہ ظاہر ہوتا ہے تو

بدن کے سارے اجزاء انسان کے تابع ہو جاتے ہیں۔ بعض بزرگانِ تصوف وطریقت نے کہا ہے کہ یہ وہ وارد ہے جو قلب پر آتا ہے اور نفس کو جھٹلانے سے جھڑکتا ہے۔ پس شیطان اور نفس کی اتنی ہمت نہیں کہ اس کا اثر قبول نہ کریں۔ اس خطرہ کی پہچان یہ ہے کہ اس خطرہ کا دفعیہ محال ہے۔ یہ خیال راسخ، مضبوط اور پختہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ سید محمد ذوقیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'سرِّ دلبراں' میں لکھتے ہیں:

خطرۂ رحمانی، محبتِ الٰہی دہکانے اور عرفان کا شوق اُبھارنے اور ہمیشہ مشاہدۂ حق میں رہنے کا شوق پیدا کرنے آتا ہے۔ یہ خطرۂ مبارک جب آجاتا ہے تو جانے کا نام نہیں لیتا اور دِل میں مستقل مقام اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی وجہ اس کے متغیر ہونے کیلئے کافی نہیں ہوتی۔ یہ خطرہ دِل کو غیر کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔[1]

۲) خطرۂ ملکی

وہ القاء جو فرشتے کی طرف سے ہو خطرۂ ملکی کہلاتا ہے۔ یہ خطرۂ خیر ہے۔ یہ ایسی کیفیت ہے جس سے نیکیوں کی طرف رغبت، طاعات پر آمادگی اور گناہوں پر ملامت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ خطرۂ ملکی طاعات کا راستہ دکھاتا ہے، خواہ بندہ اس کی تعمیل کرے یا نہ کرے۔ سالک توحید کے نور کی بدولت خطرۂ ملکی قبول کرتا ہے اور نورِ ایمان سے نفس کو ڈانٹتا ہے۔ دینِ اسلام اور شریعتِ مطہرہ کے احکام کی بجا آوری سے شیطان کی تردید اور نفس کی توبیخ کرتا ہے۔ جب سالک مجاہدہ و ریاضت شروع کرتا ہے تو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب اور مراقبے میں کوشش کرتا ہے تو اس کا عالمِ ملکوت پر گزر ہوتا ہے اور اس کی حالت و کیفیت کے مطابق کبھی بطریقِ مکاشفہ اور کبھی رویائے صالحہ (نیک خواب) کے ذریعے واقعات کا اس پر کشف ہونے لگتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

مجھے رازِ دو عالم دِل کا آئینہ دکھاتا ہے وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

(ب د:۷۰)

خطرۂ ملکی میں ذکر کے دوران حالتِ استغراق طاری ہوتی ہے تو سالک کے سامنے سے محسوسات

غائب ہو جاتے ہیں۔اس حالت میں غیبی معاملات منکشف ہونے لگتے ہیں۔انکشاف اگر بیداری اور نیند کی درمیانی حالت میں ہو تو صوفیاء اسے ''واقعہ'' کہتے ہیں۔عین بیداری اور حضوری میں ہو تو ''مکاشفہ'' کہتے ہیں۔اگر کامل نیند کی حالت میں ہو تو ''رویائے صالحہ'' کہتے ہیں۔مکاشفہ بالعموم سچا ہوتا ہے لیکن اگر اس میں نفس شریک ہو جائے تو جھوٹ ہو جاتا ہے۔اگر سالک امرِ واقع میں نوری جانوروں اور چوپایوں کو کافروں سے لڑتا جھگڑتا دیکھے تو سالک کو چاہیے کہ وہ نفس کے مجاہدہ میں مشغول ہو جائے اور اگر لوگوں کو عزت کرتا دیکھے تو اس میں نفس کی آمیزش کی طرف اشارہ ہے۔

۳) خطرۂ نفسانی

ضمیر پر وارد ہونے والا خطاب اگر نفس کی جانب سے ہو تو اسے خطرۂ نفسانی کہتے ہیں۔صوفیائے کرامؒ نے اسے حدیث النفس اور ہواجس کا نام بھی دیا ہے۔یہ خطرہ سالک کو حظِ نفس اور خواہشاتِ دنیا کی طرف متوجہ کرتا ہے۔یہ القاء انسانی طبیعت کے موافق دِل میں پیدا ہوتا ہے۔اس خطرہ میں نفس کو لذت اور راحت ملتی ہے،اس لیے یہ نفسانی خواہشات کی تحصیل اور تابعداری اور جائز و ناجائز رجحانات و میلانات کے درپے ہونے کا حکم دیتا ہے۔یہ ہوائے نفس کے نام سے بھی موسوم ہے کیونکہ نفسانی اوصاف کو بڑھاتا ہے اور لذاتِ ممنوعہ کا شوق اُبھارتا ہے۔اس سے شہوت پر آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ایسے خطرات دیرپا ہوتے ہیں کیونکہ نفس ضدی ہے اور لذتِ نفسانی پر اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ان کا مقصد ہمیشہ گمراہی اور بُرائی کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے۔جب تک سختی نہ کی جائے یہ خطرہ آسانی سے مرعوب نہیں ہوتا اور نہ ہی ذکرِ حق سے کم ہوتا ہے۔حتیٰ کہ ذکر کرتے ہوئے بھی اپنے مطلوب کا تقاضا کرتا ہے۔اس سے دنیوی لذات اور باطل خواہشوں کی طلب برانگیختہ ہوتی ہے۔بدی کو زینت دینے میں خطرۂ نفس کا بہت دخل ہے۔

۴) خطرۂ شیطانی

القاء اگر شیطانی دعوت سے ہو تو انسان کے قلب کو بُرائی کی طرف بلاتا ہے۔یہ خطرہ کبھی استدراج (دھوکہ دینے) کیلئے اضطراب اور تردد کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔خطرۂ شیطانی میں معصیت کی خواہش دِل میں پیدا ہوتی ہے۔یہ خطرہ ذکر سے کم یا ختم بھی ہو جاتا ہے مگر ختم ہو جانے کے بعد لوٹ آنے کا بھی امکان ہوتا ہے۔حدیثِ پاک میں ہے کہ ذکر کے وقت شیطان بھاگ جاتا ہے اور غفلت کے وقت لوٹ آتا ہے۔حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ شیطان ہر وقت بہکانے کیلئے کمر بستہ رہتا ہے،اس لیے انسان کو چاہیے کہ دِل کو ہر وقت ذکر میں مشغول رکھے۔

یہ عام انسان کی نفسیات میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے دشمن کو اس کی طبیعت یا اصول کے خلاف کسی امر پر اکسانا چاہے تو اس کے ردِعمل کی توقع رکھتا ہے۔چنانچہ وہ بات کر کے پیچھے ہٹ جاتا ہے پھر موقع پا

کروی بات اس کے کان میں ڈالتا ہے جس پر اکسایا جارہا ہے۔ اگر وہ تیوری چڑھائے تو دبک جاتا ہے۔ یہ تسلسل جاری رہتا ہے بالآخروقت کے ساتھ ساتھ انسان کا ردِعمل کمزور پڑ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جس بات پر پہلے وہ برافروختہ ہوتا تھا اب خود اس کی طرف لپک جاتا ہے۔ یہی طریقہ شیطان کا ہے۔ وہ انسان کو گمراہ کرنے کیلئے تھکتا نہیں بلکہ لگاتار کوشش جاری رکھتا ہے۔ کبھی حملہ کرتا ہے اور کبھی دفاعی پسپائی کی صورت میں پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بڑے زیرک اور مدبر شخص کو بھی اگر رب کی پناہ حاصل نہ ہو تو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔ بیشک جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ ملے اس کی متاع جان و ایمان کا محفوظ رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ ہم سب مساکین کو بجاہ حبیبہ الکریم ﷺ شیطان کے حملوں اور مکروفریب سے بچائے اپنی اور اپنے رسول اللہ ﷺ کی پناہ میں رکھے۔ (آمین ثم آمین)

وہ راستے جن سے شیطان غلبہ پالیتا ہے

قلبِ انسانی ایک قلعہ ہے اور شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ اس قلعۂ قلب پر حملہ کر کے قبضہ کر لینا چاہتا ہے اس کی حفاظت تبھی ممکن ہے جب اس کے بڑے بڑے دروازوں کو بند کر دیا جائے جن میں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا امکان ہے چونکہ دِل کی حفاظت ہر ایک پر فرضِ عین ہے لہٰذا حفاظت کرنے کا علم حاصل کرنا بھی واجب ہے۔ چنانچہ جب تک سالک شیطان کی گزرگاہوں سے واقف نہ ہو شیطان کو دور نہیں کر سکتا۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ اُن طریقوں اور دروازوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے شیطان حملہ آور ہو کر انسان کے دِل میں خطرات پیدا کرتا ہے جب کہ ان کی تفصیل آفاتِ نفس کے باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۱) **غضب و شہوت** عطیہ بن عروہ سعدیؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کرلیا کرو[1]۔ اسی طرح شہوت بھی انسان کے دِل میں شیطان کے داخل ہونے کیلئے دروازے کا کام دیتی ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے لکھا ہے کہ شہوت ابنِ آدم کی طینت اور سرشت میں داخل ہے اور اس کی راحت جان ہو چکی ہے[2]۔ شیطان نے ایک ولی اللہ پر راز افشاں کیا ہے کہ میں ابنِ آدم پر اس وقت غالب آجاتا ہوں جب وہ شہوت یا غصے میں ہو۔

۲) **شکم سیری** معتدل غذا انسان کی زندگی کیلئے ایک جزوِ لاینفک ہے، مگر صوفیائے کرامؒ بسیار خوری اور شکم سیری کو راہِ حق کی بہت بڑی آفت گردانتے ہیں کیونکہ شکم سیری کی صورت میں شیطان کو قلبِ انسان پر حملہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''شیطان تو بنی آدم میں خون کی طرح جاری وساری ہے۔'' اس لیے فاقہ کے ذریعے اس کے بہاؤ کو کم کر دو اور اس کے تمام راستے بند کر دو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے دشمن شیطان پر فاقہ

[1] سنن ابی داؤد، حدیث ۴۷۸۴، جلد ۲، صفحہ ۶۶۴۔ [2] کشف المحجوب، صفحہ ۳۵۵۔

ایک قہر ہے اور خورد و نوش اور شکم سیری اس کا ایک اہم ہتھیار ہے، جس کے ذریعے وہ انسان میں داخل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ابنِ آدم کیلئے شدید تر ہلاکت یہی ہے کہ وہ پیٹ کی خواہش میں لگا رہے۔

۴) شراب نوشی عرب میں شراب کا عام رواج تھا۔ چند آدمیوں کے سوا سب ہی اس کے متوالے تھے۔ مگر شراب چونکہ ان گنت جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب تھی۔ اخلاقی اور معاشی خرابیوں کی جڑ اور فتنہ و فساد کی علامت ہے۔ اسلام کے پاکیزہ نظامِ حیات میں اس کی گنجائش نہ تھی اس لیے اس کو قطعی حرام کر دیا گیا۔ لیکن حرمت کا حکم آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل ہوا تا کہ لوگوں کیلئے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے چنانچہ سورۂ البقرہ میں فرمایا "فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" [1] (ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ (دنیوی) فائدے بھی ہیں)۔ کچھ عرصہ بعد فرمایا "وَ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى" [2] (اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ)۔ اس کے بعد حکم ہوا "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝" [3] (اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا اور (عبادت کیلئے) نصب کیے گئے بُت اور (قسمت معلوم کرنے کیلئے) فال کے تیر (سب) ناپاک شیطانی کام ہیں۔ سو تم ان سے (کلیتاً) پرہیز کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ)۔

جب حضور ﷺ نے مدینے کی گلیوں میں منادی کروائی تو کئی جگہ شراب کی مجلسیں آراستہ تھیں۔ پیانے گردش میں تھے۔ جونہی صحابہ کرام ؓ کے کان میں فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ کی صدا گونجی تو ہاتھوں میں تھامے ہوئے پیالے زمین پر پٹخ دیے گئے۔ ہونٹوں سے لگے ہوئے جام خود بخود الگ ہو گئے۔ جام و سبو توڑ دیے گئے۔ مشکوں اور مٹکوں میں بھری ہوئی مئے ناب انڈیل دی گئی۔ مدینے کی گلیوں میں شراب ہی شراب نظر آ رہی تھی۔ بعد میں بھی کسی صحابی ؓ نے شراب پینے کی خواہش وطلب کا اظہار نہ کیا۔ قرآن کریم کی اثر آفرینی، حضور ﷺ کے فیضِ تربیت، صحابہ کرام ؓ کی کامل ترین اطاعت و فرمانبرداری اور اسلام کی انقلاب آفرین قوت کا یہ وہ عدیم النظیر مظاہرہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی''۔

''ماذا اخسر العالم'' میں ہے کہ امریکہ میں جہاں ہر جدید سہولت موجود ہے، حکومت امریکہ شراب خوری بند کرنے کے لئے پورے چودہ سال کوشش کرتی رہی۔ اخبارات، رسالوں، فلموں اور دیگر ذرائع سے شراب نوشی کے نقصانات کی مہم چلائی گئی۔ ساٹھ کروڑ روپیہ خرچ کیا۔ پچیس کروڑ پونڈ کا خسارہ برداشت کیا۔ تین سو افراد کو پھانسی پر لٹکایا۔ پانچ لاکھ سے زیادہ افراد کو قید و بند کی سزائیں دیں۔ بھاری جرمانے کیے گئے بڑی بڑی جائیدادیں ضبط کی گئیں مگر سب بیکار ثابت ہوا۔ آخر کار حکومت امریکہ نے 1933 میں شراب کو قانوناً جائز قرار دے دیا۔

---

[1] البقرۃ ۲:۲۱۹۔　[2] النسآء ۴:۴۳۔　[3] المآئدہ ۵:۹۰۔

۴) **حسد اور حرص:** یہ دونوں شیطانی عوامل ہیں جو انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ حسد کی وجہ سے شیطان ملعون ہوا اور حرص کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو جنت میں پھل کھانے پر اُکسایا گیا۔ ابلیس کہتا ہے کہ اب میرا شکار حرص کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کتنے لوگ حرص کا شکار ہیں۔ شیطان نیکی کا دشمن ہے حسد میں مبتلا کر کے اس کی نیکیوں کو غارت کر ڈالتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "اِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"[1] (حسد نیکیوں کو اس طرح جلا کر راکھ کر دیتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو جلا دیتی ہے)۔

۵) **کینہ پروری کی آفت:** بعض اوقات اختیار اور دیانت سے غصہ اور غیظ کو برداشت نہیں کیا جا سکتا، البتہ عاجزی، بے بسی و بزدلی کی بنا پر انسان غضبناک معاملہ کو پی جاتا ہے۔ مگر اندرونی طور پر اس کا غصہ جمع ہوتا رہتا ہے اور آخر کار تکبر و کینہ کا منبع ثابت ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مومن کینہ پرور نہیں ہوتا"[2]۔ پس کینہ غصے کا بیٹا ہے جو ہلاکت کا سبب بنتا ہے جس کے خلاف دِل میں کینہ پیدا ہو جائے اس کی ہر خوشی کینہ پرور کیلئے باعثِ رنج ہوتی ہے اور اُس کی تکلیف پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس کے دِل میں روز بروز نفرت اور کینہ کی تہہ موٹی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُس کو ذلت آمیز اور حقارت انگیز نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کینہ کے تحت نفس اس قدر برائیوں کی دلدل میں جا گرتا ہے کہ اپنے آپ کو ظالموں اور فاسقوں کی صف میں کھڑا کر لیتا ہے۔

۶) **مکان، لباس اور سامان خانہ کے ساتھ زینت کرنا:** یہ تین چیزیں بھی شیطان کو دِل میں آنے کی دعوت دینے کے مترادف ہیں۔ ان کی محبت اگر انسان کے دِل میں وقعت پکڑ لے تو انسان ان کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یہ اشیاء اگر محض جائز ضروریات کیلئے ہوں تو فبھا ورنہ اِن کا استعمال نہ ناجائز ہے اور نہ ہی قابلِ اعتراض مگر دِل اگر ان اشیاء کی محبت میں اس قدر مگن ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ختم یا نظر انداز ہو جائے تو یہی نعمتیں عذاب بن جاتی ہیں۔ پھر شیطان کو ان کے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ خود بخود اس کا کام چلتا رہتا ہے بالآخر انسان کا خاتمہ انہی خواہشات نفسانیہ کی اطاعت گزاری میں ہی ہو جاتا ہے۔

۷) **لوگوں سے طمع رکھنا:** طمع رکھنا بھی شیطان کو دعوت دینا ہے۔ جب انسان دوسروں سے مختلف النوع توقعات اور اُمیدیں وابستہ کر لیتا ہے اور طمع کرنے لگتا ہے اور وہ طمع و حرص سے مطلوبہ چیزیں میسر نہیں آتیں تو شیطان کو موقع مل جاتا ہے۔ شیطان ان اشیاء کے حصول کی مختلف تدبیریں اور تراکیب کا مشورہ دیتا ہے اور ان پر عمل کر کے انسان گناہوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتا۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۲۶۵۹۴، جلد ۵، صفحہ ۳۳۰۔　[2] سنن الترمذی، حدیث ۱۹۷۷، جلد ۴، صفحہ ۳۵۰۔

۸) جلد بازی کرنا: حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے "اَلْعُجْلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ"[1] (جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے)۔ جلد بازی میں انسان نتائج کی پرواہ نہیں کرتا۔ عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ نقصان دہ انجام کا خیال تک ذہن میں نہیں آتا۔ لوگ اسی جلد بازی میں ہی تو راتوں رات امیر اور رئیس بننے کی خواہش کرتے ہیں اور پھر ان خوابوں کی تعبیر کیلئے نہ جانے کیا کیا ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ دینِ اسلام ہمیں اعتدال اور توازن کی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ ثبات واستحکام سے کوئی کام کیا جائے تو وہ زیادہ پائیدار اور خیر کا موجب ہوتا ہے۔ جب کہ شیطان انسان کو بے جا تیز روی پر اُکسا کر اس کیلئے ہلاکت کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

۹) دولت وثروت کا حصول: مال وزر، درہم ودینار، ڈالر، جائیداد اور زمین وغیرہ اگر ضرورت سے زائد ہوں تو یہ شیطان کی جائے رہائش بن جاتی ہیں۔ حضرت ثابت بنانی ؒ کا قول ہے کہ جب حضور ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے وقت ابلیس نے اپنے چیلوں سے کہا کہ اہم واقعہ پیش آیا ہے جاؤ دیکھو کیا ہوا ہے۔ شیطانی چیلے زمین پر پھیل گئے تھک ہار کر واپس آئے، کہنے لگے ہمیں معلوم نہیں ہو سکا ہم عاجز آ گئے ہیں چنانچہ ابلیس خود گیا اور حضور ﷺ کی بعثت کی خبر لے آیا، چنانچہ شیطان کے چیلے حضور ﷺ کے صحابہ کرام ؓ کے پاس جاتے اور بغیر کسی نقصان کے واپس آ جاتے اور کہتے کہ اس قسم کی قوم کی ہم رفاقت نہیں کر سکتے۔ پھر نماز میں وسواس کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے۔ آخر کار ابلیس نے کہا کہ تم انتظار کرو شاید اللہ تعالیٰ ان پر دنیا فراخ کر دے، پھر ہمارا کام بن سکتا ہے۔ گویا دولت وثروت اور مال ومنال کی کثرت شیطانی حملوں کو آسان کر دیتی ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی جاگزیں کیا جائے کہ کچھ اہلِ حق ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو قدرت نے دولت کے انبار عطا کیے ہوتے ہیں مگر وہ لوگوں میں تقسیم کر کے اپنے دِل کو اس کی محبت سے غنی رکھتے ہیں۔

۱۰) بُخل اور فقر واحتیاج کا خوف: شیطان انسان کے دِل میں بُخل کا داعیہ بھی پیدا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی بیش بہا نعمتوں کے باوجود بھی بعض لوگ اپنے آپ کو تہی دامن سمجھتے ہیں۔ فقیر ومحتاج ہو جانے کا اندیشہ ہمہ وقت انہیں صدقہ وخیرات سے روکے رکھتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اللہ غنی وکریم کے عطا کردہ مال و دولت کو عیاشی اور فضولیات میں خرچ کرتے ہیں۔ ضرورت مندوں، حاجت مندوں، غریبوں، مفلسوں اور غریب بیواؤں کی مدد کرنے کی طرف دھیان نہیں کرتے مگر عیاشیوں، نائٹ کلبوں، جواء بازی، شراب نوشی، بدکاری کے اڈوں اور حرام خوری میں لٹانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہلاکت ہے ایسے لوگوں کیلئے جو صحیح جگہ پر مال

[1] سنن الترمذی، حدیث ۲۰۱۲، جلد ۴، صفحہ ۳۶۷۔

خرچ کرنے میں بُخل سے کام لیتے ہیں۔ ایسا مال اُن کیلئے قیامت کے دن عذاب بن کر مسلط ہوگا۔

۱۱) **مذہبی منافرت اور دشمن کے خلاف کینہ پروری:** شیطان کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ کبھی بھی لوگ خیر اور نیکی کے کاموں میں جمع نہ ہونے پائیں۔ لوگوں کے درمیان منافرت اور حقارت، بُغض اور کینہ پیدا کر کے پھوٹ ڈالتا ہے۔ ان چیزوں سے عبادت گزار اور نافرمان سب ہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ مذہبی منافرت نے دینِ اسلام کے نام لیواؤں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ شیطان معمولی سی باتوں پر دشمنی کو ہوا دیتا ہے اور نسلوں تک دشمنی اور عداوت کی آگ جلتی رہتی ہے۔ ابلیس نے کہا محمد ﷺ کی اُمت کو میں نے گناہوں میں پھنسا دیا ہے مگر استغفار سے انہوں نے میری کمر توڑ دی۔ پھر میں نے انہیں ایسے گناہوں میں پھنسایا کہ وہ استغفار بھی نہیں کریں گے۔ اپنی جاہ و حشمت اور جھوٹے پندار کی پاسداری کی خواہشات انسان کو استغفار سے بھی غافل کر دیتی ہے۔

۱۲) **مسلمانوں کے بارے میں بدظنی کا شکار ہونا:** بدظنی بھی شیطان کی کارستانیوں میں سے ہے۔ عموماً لوگ دوسروں کے بارے بدظنی کا شکار رہتے ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی پر دھیان دیتے ہیں۔ پھر اُن کے عیوب کو لوگوں میں اچھال کر اپنی آخرت کی رسوائی کا سامان تیار کرتے ہیں۔ لوگوں کو باہمی نزاع اور جنگ و جدل پر اُکسانے کیلئے بدگمانی پیدا کرنا شیطان کا ایک اہم ہتھیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ "اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" (بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں)۔ اور مومنوں کے بارے حسنِ ظن رکھا کرو۔ مگر شیطان پھر بھی بدگمانی پھیلانے میں کامیاب واقع ہوا ہے۔

خطرات کی پہچان

خطرۂ نفسانی لذتوں کی خواہش ہے۔ خطرۂ شیطانی گناہوں کو خوشنما بنا دیتا ہے۔ خطرۂ ملکی عبادت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ خطرۂ حق کی آواز ہے۔ سالک توحید کے نور کی بدولت خطرۂ ملکی قبول کرتا ہے۔ نورِ ایمان سے نفس کو ڈانٹتا ہے۔ اسلام کے نور سے شیطان کی تردید کرتا ہے، چنانچہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ خطرۂ رحمانی اسرار کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ مَلکی طاعات کا راستہ دکھاتا ہے۔ خطرۂ نفس دنیا اور جاہ کی طرف کھینچتا ہے۔ خطرۂ شیطانی گناہوں اور شہوات کی طرف لے جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہوا جس نفس اور وسواس کا فرق یوں معلوم ہوتا ہے کہ نفس اگر کسی بات کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ اصرار کرتا ہے، خواہ کچھ عرصے کے بعد ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ اپنی مراد پالیتا ہے، البتہ اگر صدقِ دِل سے مجاہدہ جاری ہو تو اصرار نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر شیطان کسی گناہ کی طرف دعوت

دے یعنی القاء کرے اور سالک اس کی دعوت کو نہ مانے تو شیطان کسی گناہ کا وسوسہ ڈال دیتا ہے۔ جیسے زنا نہیں کرتے تو کباب ہی کھلا کر شراب کی طرف راغب کر دیتا ہے اور جب شراب پی لی تو زنا بھی کروا دیتا ہے کیونکہ شیطان کی یہ غرض ہے کہ انسان کسی نہ کسی گناہ میں پھنسا رہے۔ کسی مخصوص گناہ سے اس کو کوئی غرض نہیں۔

القائے شیطان، عقیدے کے اعتبار سے کفر و شرک کا حکم دیتا ہے۔ وعدۂ خداوندی کے (معاذ اللہ) جھوٹے ہونے اور پورے نہ ہونے کی شکایت پر اُبھارتا ہے۔ گناہ پر توبہ نہ کرنے، عمل کو التوا میں ڈالنے اور دنیا و آخرت کو تباہ کرنے والے کاموں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ خطرۂ نفس، خواہشات کی تکمیل اور جائز و ناجائز رجحانات و میلانات کے درپے ہو جانے کا حکم دیتا ہے۔ یہ دونوں خطرے القائے بد ہیں اور عام مسلمانوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ جب کہ القائے روحانی اور القائے ملکی دونوں طاعتِ خداوندی کا مشورہ دیتے ہیں۔ جس سے دنیا و آخرت میں سلامتی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں خواطر شریعت کے مطابق اُمور کا حکم دیتے ہیں اور خواص المسلمین میں پائے جاتے ہیں۔

القائے روح کبھی اس کا حکم دیتا ہے جو شیطان اور نفس کے موافق ہو اور کبھی ایسی بات کا حکم دیتا ہے جو روح اور ملک کے موافق ہو۔ عقل بُرائی اور بھلائی کو لے کر جسم میں داخل ہوتی ہے۔ عقل اور جسم دونوں مکلف ہونے کے محل ہیں اور احوال کی تبدیلی کے محل ہیں۔ جب عقل کا مقام قلب ہو تو بھلائی پر آمادہ کرتی ہے۔ جب دماغ میں ہو تو برائی کی طرف لے جاتی ہے۔

شہوت کی آگ

شہوت، نفس کی ہولناک آفات میں سے ایک آفت ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں شہوات کی غلامی کسی انسان کی غلامی سے بدتر اور سخت ہوتی ہے۔ کسی آقا سے مملوک کی آزادی حاصل کرنا آسان ہے لیکن نفس کی غلامی سے بندۂ شہوت کی خلاصی آسانی سے ممکن نہیں ہوتی۔ وہ خود عارضی لذات میں منہمک و مستغرق ہو کر خلاصی نہیں چاہتا اور یوں وہ رفتہ رفتہ گناہوں اور معصیت کی گہرائیوں میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

بندۂ شہوت بتر نزدیک حق — از غلام و بندگان مسترق

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہوت کا غلام زیادہ بُرا ہے، پوشیدہ بنائے ہوئے غلاموں سے) (۱-۳۸۷)

چنانچہ امام غزالیؒ اس فطرتی شہوت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کو غلام بنا دیتی ہے اور ترکِ ہوا و شہوت غلاموں کو بادشاہی کا مقام دے دیتی ہے۔ زلیخا اسیرِ شہوت ہونے کی بنا پر حقیر ہو گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام اسیر تھے مگر ترکِ ہوا و شہوت اور تقویٰ و طہارت کی بدولت امیرِ مصر بن گئے۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ

ھویٰ وشہوت ابنِ آدم کی فطرت میں گوندھی گئی ہیں۔[1] ایک دانا کا قول ہے کہ نفس مغلوب، شہوات کا قیدی اور بے ہودگی کے تابع ہوتا ہے۔ جس کسی نے بھی بدن کے اعضاء کو شہوت سے سیراب کیا، اُس نے دِل میں ندامت کاشت کی۔ نفسِ امارہ کے اندر قوی تر میلان جنسی شہوت کی تسکین ہے۔ شہوت کا رُخ جسمانیت سے عقل اور روحانیت کی طرف پھیرا جاسکتا ہے یہی قوتِ عقل میں تبدیل ہوسکتی ہے، اگر ایسی تخلیقی قوت کا رُخ بدن کی طرف ہوتو وہ جائز حدود سے متجاوز ہوکر انسان کو ذلیل کرتی ہے اور روح کی طرف ہوتو انسان کو شریف تر بنا دیتی ہے۔

نفس جب رذائل و ذمائم سے پاک نہیں ہوا تو لذاتِ مباحہ کی کثرت انسان کو اور بھی زیادہ مائل بشہوت اور دلدادۂ لذات کر دے گی۔ جس سے وہ مکروہات ومحرمات کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے گا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

شہوت نارے براندن کم نشد　　　اُو بماندن کم شود بے ہیچ بُد

(یہ شہوت مثلِ آتش ہے وہ پورا کرنے سے کم نہیں ہوتی (ہاں) البتہ وہ ساکن اور ضبط کرنے سے کم ہوسکتی ہے)(۱۔۳۷۶)

بعض اوقات لوگ شہوتِ مذمومہ کی نظر کا علاج شہوت پوری کر لینے میں سمجھتے ہیں کہ شہوت پوری ہو جائے اور طبیعت خالی ہو جائے تو پھر توبہ کر لی جائے۔ شیطان یہی دُھوکہ دے کر راہِ طریقت کے مبتدی حضرات سے معصیت صادر کرواتا ہے۔ مولانا رومؒ مرضِ شہوت کے علاج کیلئے اس کے اقتضا کو عمل میں لانا درست قرار نہیں دیتے بلکہ ہدایت کرتے ہیں کہ مطلق پرواہ نہ کی جائے اور اس کو ضبط کیا جائے۔ شہوت کی آگ کے بجھنے کی کوئی صورت نہیں سوائے عشقِ الٰہی کے، البتہ اس کا میلان ختم کیا جاسکتا ہے۔

نارِ بیرونی بآبے بفسرد　　　نار شہوت تا بدوزخ می برد

(ظاہری آگ تو پانی کے ساتھ بجھ جاتی ہے مگر شہوت کی آگ دوزخ تک لے جاتی ہے)

نار شہوت می نیا رامد بآب　　　زانکہ دارد طبع دوزخ در عذاب

(شہوت کی آگ پانی کے ساتھ تسکین نہیں پاتی کیونکہ وہ عذاب میں دوزخ کی طبیعت رکھتی ہے)

مولانا رومؒ نے آتشِ شہوت کو بجھانے کی ایک سبیل بیان کی ہے کہ

چہ کشد ایں نار را نورِ خدا　　　نورِ ابراھیمؑ را ساز اوستا

(یعنی اس آگ کو کیا چیز بجھا سکتی ہے خدا کا نور (بجھا سکتا ہے)، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نور کو ہی استاد بنالو) (م،۱۔۳۷۶)

دنیا کی دوستی

دنیا کی محبت تمام فتنہ وفساد کی جڑ ہے اور اس کی دوستی تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔ نفس کا دنیا کی

---

[1] الفردوس بماثور الخطاب، امام الدیلمی، متوفی ۵۰۹ھ، حدیث ۷۰۱۸، جلد۴، صفحہ ۳۵۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

دوستی کی طرف رغبت و میلان، دوستانِ حق سے دشمنانِ خدا کی دشمنی ہے۔ یہ دنیا دوستانِ حق کو اپنے دلفریب جلووں اور اپنی رعنائیوں اور عشوہ طرازیوں کا شکار کر لیتی ہے اور دشمنانِ خدا کو بھی مکر و فریب اور حیلے بہانے سے اپنی دوستی اور وفا کا قائل کر لیتی ہے اور بالآخر انہیں گھائل کر کے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں ذلیل ترین چیز دنیا ہے، جو اس کی دشمن ہے۔'' نیز فرمایا: ''یہ دنیا ہے کیا؟ بس اُجڑے ہوئے خانماں و برباد لوگوں کی سرائے ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ساری دنیا تجھے ایک بار ہی نہ دکھا دوں؟ یہ فرما کر میرا ہاتھ پکڑا اور ایک کوڑے کرکٹ کے بہت بڑے انبار پر لے گئے، جہاں ہڈیاں، انسانی کھوپڑیاں، چیتھڑے اور گوبر وغیرہ کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ فرمایا: اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! یہ سر بھی کبھی تمہارے سروں کی طرح حرص و ہوس اور غرور و تکبر سے بھرے ہوئے تھے۔ آج بغیر گوشت کے محض ہڈیوں کا مجموعہ ہیں اور بہت جلد یہ نشان بھی باقی نہ رہے گا اور بالکل خاک ہو جائیں گے اور یہ جو گندگی کے ڈھیر دیکھ رہے ہو یہ وہ طرح طرح کے کھانے ہیں جن کی فراہمی کیلئے خون پسینہ ایک کر دیا گیا تھا اور نہ صرف دور پھینک دیا گیا ہے بلکہ ان کے قریب تک جانا گوارا نہیں اور ہر کوئی ان سے دور بھاگتا ہے اور یہ جو چیتھڑے ادھر اُدھر پھرتے ہیں یہ عمدہ پوشاکیں اور زرق برق لباس ہیں جو کبھی فخریہ زیب تن کیے گئے تھے اور یہ حیوانی ہڈیاں اُن چوپایوں کی ہیں جنہیں بطور سواری استعمال کیا جاتا تھا اور جن کی پیٹھ پر بیٹھ کر دنیا جہان کے چکر لگائے جاتے تھے۔ بس یہی ہے تمام دنیا جو تجھے دکھا دی گئی۔ پس اگر کوئی اس پر روتا ہے تو اسے رونے دو کہ یہ رونے ہی کے قابل ہے، یعنی جائے عبرت ہے۔ چنانچہ جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب کے سب رو دیئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دنیا کو خدا نہ سمجھ بیٹھو تا کہ وہ تمہیں اپنا بندہ نہ بنا لے بلکہ کوئی ایسا خزانہ تیار کر لو، جس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور پھر وہ خزانہ کسی ایسے (ایمان دار) شخص کے پاس رکھو جو اسے ضائع نہ ہونے دے، کیونکہ دنیا کا خزانہ آفت و بلا سے خالی تو ہو نہیں سکتا کہ یہ شرف صرف خزانۂ حق کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔

ایک اور موقع پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو جسے دنیا سے رغبت ہوتی ہے اور اس سے لمبی چوڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں حق تعالیٰ اسی مقدار کے مطابق اس کے دِل کو نابینا کر دیتا ہے اور جو شخص اس دنیا میں زہد اور پرہیز گاری کی طرف مائل رہتا ہے اور اس کی اُمیدیں بھی نہایت مختصر ہوتی ہیں اسے کسی کی تربیت و راہنمائی کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف سے ایسا علم عطا کیا جاتا ہے جو اس کی رہبری اور راہنمائی کیلئے دلیلِ راہ ہوتا ہے۔

مال و دولت کی حرص

امام غزالی ''نسخہ کیمیا'' میں لکھتے ہیں کہ مال کی مثال سانپ کی سی ہے کہ اس میں جہاں زہر ہے وہاں تریاق بھی موجود ہے اور جب تک زہر کو تریاق سے اور تریاق کو زہر سے الگ الگ نہ کیا جائے اس وقت تک اس کے اسرار و رُموز اور اس کا مکمل علم آشکار و منکشف نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں کہ مال کی آفات دینی و دنیاوی دو طرح کی ہوتی ہیں۔[1] دینی آفات تین قسم کی ہیں۔ پہلی یہ کہ جب گرہ میں مال ہو گا تو آدمی فسق و فجور پر قادر ہوتا ہے اور پھر اپنی ان خواہشات اور دلی تمناؤں کی تکمیل کیلئے اُسے خرچ کرے گا جو گناہ کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ گناہ کی وادی میں گامزن ہو کر دین و ایمان کو غارت کر بیٹھتا ہے۔ دوسری آفت یہ ہے کہ اگرچہ دینی اُمور میں بڑا راسخ اور پختہ کار ہے اور کبیرہ گناہوں سے دور رہتا ہے مگر جائز اور مباح چیزوں کے استعمال سے عیش و عشرت کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ عیش و عشرت میں ایک مرتبہ پڑ جائے تو اس کا بدن عادی ہو جاتا ہے۔ تن آسانی اُسے صبر نہیں کرنے دیتی۔ تب دنیا کو ہی بہشت بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ پھر موت کے نام سے اُسے گھن آنے لگتی ہے۔ تیسری آفت یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ ایک آدمی گناہ نہیں کرتا، عیش و عشرت کی زندگی سے بھی پرہیز کرتا ہے، مال مشتبہ بھی نہیں کھاتا پرہیزگاری سے کام لیتے ہوئے، حلال کا مال حاصل کرتا ہے، مگر مال کی موجودگی دِل کے ساتھ وابستہ رہتی ہے جو اُسے ذکرِ الٰہی کی توفیق سے محروم رکھتی ہے۔ دولت کی نگہداشت اور حفاظت تو بہر حال کرنا ہو گی۔ کوئی چاہے کہ وہ دنیا کو بھی نہ چھوڑے اور فراغتِ دِل بھی اُسے حاصل ہو اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو چاہتا ہے کہ پانی میں رہے اور اس کا دامن بھی تر نہ ہونے پائے۔ حضور ﷺ نے اسی لیے اپنے اہلِ بیت کیلئے مال بقدرِ کفایت کی دُعا کی تھی اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اپنی اصلی حاجت سے زیادہ مال کیلئے ہاتھ پاؤں مارنا اپنی ہلاکت اور بربادی کی تیاری کرنا ہے۔

حرصِ مال ذلت و خواری اور رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کا انجام کار بھی شرمندگی، ندامت، اور خجالت ہوتی ہے۔ آدمی فطرتاً حریص واقع ہوا ہے۔ اس حرص کا علاج سوائے قناعت کے کوئی نہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ'' اگر آدمی کو سونے کے دو میدان بھی مل جائیں تو (بھی اُسے صبر نہیں آئے گا) اور تیسرے میدان کے حصول کی

---

[1] فتح الباری، جلد ۱۱، صفحہ ۲۲۸۔

بھی خواہش کرے گا پس قبر کی مٹی ہی ہے جو آدمی کو مطمئن کرتی ہے۔ [1] ابنِ مسعود ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک فرشتہ روزانہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے اولادِ آدم! بقدر کفایت مال اس زیادہ مال سے کہیں بہتر ہے جو زیادہ غفلت اور بالآخر زیادہ پشیمانی کا باعث ہو۔ حدیثِ شریف میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے ابنِ آدم! ساری دنیا اگر پوری کی پوری تیرے حوالے ہو تو پھر بھی اتنا ہی حاصل کر سکے گا جو تیرا پیٹ بھرنے کیلئے کافی ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ لالچی سے زیادہ کوئی شخص مبتلائے رنج وعذاب نہیں ہوتا اور صابر سے زیادہ عیش کسی کو میسر نہیں ہوتا اور حاسد سے زیادہ اندوہ وکرب کسی کو برداشت نہیں کرنا پڑتا اور تارک الدنیا سے زیادہ سبک سار (کمینہ یا رذیل) کوئی نہیں ہوتا اور عالمِ بدکردار سے زیادہ نادم و پشیمان کوئی نہیں ہوتا۔

جاہ وحشم کی محبت

اس گردشِ لیل ونہار کی لپیٹ میں آ کر کتنے لوگ ہلاک ہو گئے جو جاہ وحشم کے متلاشی، شان وتجمل کے طالب اور لوگوں سے اپنے قصیدے سُننے کے آرزو مند رہتے تھے۔ یہ عادت راسخ ہو جائے تو ایسے لوگ راہِ دین سے بھٹک کر منافقت اور اخلاقِ خبیثہ سے اپنے دلوں کو آلودہ کر دیتے ہیں اور باہمی عداوت اور جھگڑے سر اٹھاتے ہیں۔ یوں اُن کی پوری زندگی بدی اور گناہ کا بدترین نمونہ بن جاتی ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ نے فرمایا کہ مال اور جاہ وحشم کی محبت جب دِل میں گھر کر لیتی ہے تو اس میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح پانی کی جگہ پر سبزہ بے تحاشا اُگ آتا ہے اور فرمایا: دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ میں گھس کر وہ تباہی نہیں مچاتے جتنی جاہ ومال کی محبت مسلمان کے دِل کو ویران کر دیتی ہے۔ [2] حضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجھہ الکریم سے فرمایا کہ لوگوں کی ہلاکت کا باعث دو چیزیں ہوا کرتی ہیں، ایک تو خواہشات کے پیچھے مارے مارے پھرنا اور دوسری اپنی تعریف سُننے کو دوست رکھنا اور اس آفت سے نجات صرف اُسی شخص کو مل سکتی ہے جس نے تحسین وشہرت کی تلاش نہ کی اور گمنامی پر صابر رہا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا" (یہ) وہ آخرت کا گھر ہے جسے ہم نے ایسے لوگوں کیلئے بنایا ہے جو نہ (تو) زمین میں سرکشی وتکبر چاہتے ہیں اور نہ فساد انگیزی)۔ [3]

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "عُلُوًّا" سے مراد لوگوں پر اپنا غلبہ اور تسلط جمانا اور ان کو حقیر وذلیل سمجھنا، لوگوں کے حقوق کو پامال کرنا اور اُن کے اموال کو غصب کر کے سردار بننا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا قول ہے کہ جو شخص شہرت اور مقبولیت کا دلدادہ ہوتا ہے وہ دینِ حق میں صادق نہیں ہوتا۔ بشر حافیؒ کا قول ہے کہ مجھے تو کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا جو شہرت ومقبولیت کو عزیز رکھتا ہو اور بالکل ذلیل ورسوا

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۲۳۳۷، جلد ۴، صفحہ ۵۶۹۔
[2] مسند الشھاب، حدیث ۸۱۳، جلد ۲، صفحہ ۲۶۔
[3] القصص، ۲۸:۸۳۔

نہ ہوا ہو اور اس کا دین تباہ و برباد ہو کر نہ رہ گیا ہو۔

زبان کی آفات

نفس کی آفات میں سے اہم ترین زبان کی آفات ہیں۔ زبان بظاہر گوشت کی ایک بوٹی ہے مگر دنیا تو کیا آخرت کے اُمور پر بھی اس کا تصرف ہے۔ زبان عقل کی نائب اور دِل کی ترجمان ہے۔ انسان کی شخصیت، کیفیات، رجحانات، رویے، تقویٰ و ایمان الغرض ہر نیک و بد ارادے کا اظہار زیادہ تر اس کی زبان کے ذریعے ہوتا ہے اور زبان سے صادر ہونے والے ہر کلمے کا انسان کی ذات پر بھی اور معاشرے پر بھی اثر مرتب ہوتا ہے زبان سے کلمۂ حق کی ادائیگی دِل کو تابانی عطا کر دیتی ہے کلمۂ کفر یا لغویات دل کو کجروی اور آلودگی دیتے ہیں۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ جب تک دِل درست نہ ہو اُس وقت تک ایمان صحیح اور مستقیم نہیں ہو سکتا جب کہ دِل کی راستی کا انحصار زبان کی راستی پر ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو سعید ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ابنِ آدم جب صبح کرتا ہے تو بدن کے سارے اعضاء زبان سے عاجزی کرتے ہیں کہ ہمارے معاملے میں خدا سے ڈر کیونکہ تیرے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو اگر ٹھیک رہے گی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے۔[1] گویا نفس کی تہذیب اور تصفیہ کیلئے زبان کی آفات سے بچنا از حد ضروری ہے۔

کثرتِ کلام

زبان کی متعدد آفات میں سے ایک آفت کثرتِ کلام ہے یعنی غیر ضروری گفتگو کرتے رہنا۔ بعض لوگوں کی کثیر الکلامی کا مقصود اپنے تجرِ علمی، خوبیوں اور صلاحیتوں کا دوسروں پر رعب ڈالنا ہوتا ہے حالانکہ غیر متعلق اور غیر ضروری گفتگو بہت سی خرابیوں اور نفس کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ انسان خواہ مخواہ گناہوں کی دلدل میں گھرتا چلا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ غیر ضروری باتوں کا ترک کر دینا بھی حُسنِ اسلام ہے۔[2] زبان کی دوسری آفت باطل یا معصیت کی بات کرنا ہے۔ باطل سے مراد جو غیر شرعی اور ناجائز ہو اور معصیت سے مراد فسق و فجور کی باتیں، بدکلامی، فحش گوئی، ناشائستہ اور لغویات بولنا جو تمام نیک اعمال کو بھی غارت کر دیتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ کچھ انسان روزِ قیامت بہت غربت کی حالت میں اُٹھائے جائیں گے۔ صحابہ کرام ﷺ کے استفسار پر ارشاد فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جو کثیر اعمال لے کر اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے مگر سب اعمال اُن کی بدکلامی اور بدعملی کے باعث غارت ہو جائیں گے اور دیگر لوگوں کے گناہ اُن کے نامہ اعمال میں ڈال دیئے جائیں گے۔[3] بدکلامی اور بدزبانی کرنے والے شخص کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص پر جنت حرام ہے، ایسے شخص کو جب دوزخ میں لے جائیں گے تو

---

1 سنن الترمذی، حدیث ۲۴۰۷، جلد ۴، صفحہ ۶۰۵۔ 2 صحیح بخاری، حدیث ۲۲۹، جلد ۱، صفحہ ۴۲۶۔

3 صحیح مسلم، حدیث ۲۵۸۱، جلد ۴، صفحہ ۱۹۹۷۔

اس کے منہ سے اتنی بُو آئے گی کہ دوزخ والے بھی چیخ اُٹھیں گے۔

عیب جوئی اور فحش کلامی

زبان کی تیسری آفت جو نفس کے تزکیہ و تہذیب کی راہ میں رکاوٹ ہے وہ بات بات میں اختلاف کرنا اور معمولی بات پر جھگڑا کرنا ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کو ہمیشہ جاہل اور بے وقوف سمجھتے ہیں اور خود کو بہت بڑا عالم اور سکالر سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کا نفس خود پسندی، تکبر اور رعونت کا شکار ہوتا ہے حالانکہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنا، عیب جوئی کرنا اور نقائص و کمزوریوں کو اُچھالنا بھی گناہ ہے۔ مذہبی بحث میں جنگ و جدل تک نوبت آ جاتی ہے اور یہیں سے قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص بات کرتا ہے، کمالِ بیبا کی سے بات کرتا ہے لیکن وہ بات اس کو دوزخ کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے۔ دوسرا شخص بھی بات کرتا ہے کمال بیبا کی سے کرتا ہے مگر وہ بات اُسے سیدھی بہشت میں لے جاتی ہے۔ پہلا شخص ناجائز، لغو اور جھوٹ پر مبنی بات کرتا ہے جب کہ دوسرا شخص کلمۂ حق زبان سے بلند کرتا ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے اجر و ثواب میں بھی فرق واضح ہے۔

مال و زر کے حصول اور جاہ و منصب کے لالچ میں جھگڑا کرنا بھی زبان کی آفات میں سے ہے۔ بزرگوں نے کہا کہ مال و دولت کیلئے جھگڑنے سے بدتر کوئی چیز نہیں کیونکہ یہ دِل کو پراگندہ، سکون کو برباد اور مروتِ دین اور حلاوتِ ایمان کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔ مال و زر اور دولت و ثروت کے نزاع میں بدکلامی ہلاکتِ دین کا سامان ہے۔ اس بدکلامی کے دوران معمولی سی بات پر بعض ناعاقبت اندیش لوگ دوسروں پر لعنت کرنے لگتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مومن کسی پر لعنت نہیں کرتا۔[1] حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کسی شئے پر لعنت کرتا ہے وہ جواباً کہتی ہے لعنت ہو اس پر جو حق تعالیٰ کے نزدیک ہم سے بھی زیادہ گنہگار ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی چیز پر لعنت کی تو حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر! تو صدیق ہے اور تو نے لعنت کی؟ اور قسم ہے رب کعبہ کی تجھے یہ زیب نہیں دیتا۔ اس ارشاد کو آپ نے تین بار دہرایا۔ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے توبہ کی اور بطور کفارہ ایک غلام آزاد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ظالمین، فاسقین، کاذبین اور کافرین پر لعنت کی ہے اور ایسے لوگوں پر جو کفر و طاغوت کے علمبردار ہوں۔

قہقہے لگانا

ہر وقت ہنسی و مزاح اور قہقہے لگاتے رہنا بھی زبان کی آفت ہے جو دِل کو تاریک کرنے کا سبب بنتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا لوگو! جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو تم تھوڑا ہنسو اور زیادہ رویا کرو بلکہ ہنسنے کی بجائے رویا کرو۔[2] یہی وجہ ہے آپ ﷺ کبھی تبسم سے آگے نہیں بڑھے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۱۹۲، جلد ۱، صفحہ ۴۲۱۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۹۷، جلد ۱ صفحہ ۳۵۴۔

ہیں کہ جو شخص گناہ کرے اور اُلٹا ہنسا کرے اس کا ٹھکانا صرف اور صرف دوزخ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ٹھٹھا مزاح مت کیا کرو کیونکہ اس سے دِلوں میں کدورت پیدا ہوتی ہے اور بُرے کاموں کی بنیاد دِلوں میں قائم ہو جاتی ہے اور جب آپس میں ملا کرو تو قرآن مجید کی باتیں کیا کرو۔ البتہ شائستہ اور معقول مزاح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ بلند قہقہے لگانا اور فضول ٹھٹھا مزاح کی مذمت میں محمد بن واسع ؒ نے کہا کہ کتنی تعجب کی بات ہے کہ کوئی جنت میں روئے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں یہ تو واقعی عجیب بات ہے۔ پھر فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ہنسے اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر ہو کہ اس کا مقام جنت ہے یا دوزخ۔

الغرض مذکورہ بالا آفاتِ زبان کے علاوہ دوسروں کا مذاق اُڑانا، استہزاء کرنا، بدعہدی، وعدہ خلافی، بُرے القاب سے دوسروں کو پکارنا، کذب و افترا سے کام لینا، کسی پر تہمت لگانا، چغلخوری، جھوٹی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کرنا، جو بالعموم مریدین اپنے جھوٹے پیر کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور لگائی بجھائی کرکے باہمی نزاع کا سبب بننا سب آفاتِ زبان ہیں جن کی تفصیل یہاں مقصود نہیں بلکہ ہماری زیرِ طبع تصنیف ''متاعِ اخلاق'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آفاتِ لسانی سے بچاؤ کی تدابیر

آفاتِ لسانی سے بچاؤ کی تدابیر اور نفس کی آلودگی کے خاتمے کیلئے صوفیاء کرامؒ نے سکوت کو بہت اہمیت دی ہے۔ خلوت نشینی اور خاموشی اختیار کرنے سے شیطان کے بے شمار حملوں اور نفس کی بیماریوں سے انسان بچ جاتا ہے۔ تہذیبِ نفس کے طریقوں میں سے ایک طریقہ غیر ضروری کلام سے اجتناب کرنا ہے۔ زبان کا صحیح استعمال کیا جائے۔ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جائے جو شرعاً ناجائز، حرام اور لغو ہو اور جس پر گرفت ہو سکتی ہو۔ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ افضل ترین عمل کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبان پر انگلی سے اشارہ کیا کہ اسے بند رکھنا یعنی خاموشی اختیار کرنا افضل ترین عمل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھتے تو یوں سکوت اختیار کرتے جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھ گئے ہوں۔[1] اہل اللہ کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ ہر وقت محاسبۂ نفس کرتے رہتے ہیں۔ وہ تمام ذرائع جو نفس پرستی کی طرف لے جاتے ہوں اُن کو بند کرتے ہیں۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ حضرت ابو بکرِ صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو انگلیوں سے کھینچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا، اے خلیفۂ رسول! یہ کیا ہو رہا ہے؟ فرمایا: اس نے مجھے بے شمار اُمور میں اُلجھا رکھا ہے۔

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث ۱۵۴۹، جلد ۱، صفحہ ۴۹۴۔

تاجدارِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کی بیشتر خطاؤں کی ذمہ دار یہ زبان ہی ہوا کرتی ہے۔ نیز فرمایا کہ جسے حق تعالیٰ پر ایمان لانے کا دعویٰ ہے تو اسے کہہ دو اگر باتیں ہی کرنا ہیں تو اچھی اور پسندیدہ باتیں کرو۔ یعنی دینِ اسلام، قرآن وسنت کے احکام، تبلیغِ دین، انسانیت کی خیر وفلاح سے متعلق گفتگو سراسر خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے یعنی "قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" [1] (اور عام لوگوں سے (بھی نرمی اور خوش خُلقی کے ساتھ) نیکی کی بات کہنا)۔

ابوبکر شبلیؒ بغداد کے محلے میں جا رہے تھے کہ کسی نے کہا "اَلسُّکُوْتُ خَیْرٌ مِّنَ الْکَلَامِ" (خاموشی کلام کرنے سے زیادہ بہتر ہے) تو شبلیؒ نے فرمایا "سُکُوْتُکَ خَیْرٌ مِّنْ کَلَامِکَ وَ کَلَامِیْ خَیْرٌ مِّنْ سُکُوْتِیْ لِاَنَّ کَلَامَکَ لَغْوٌ وَ سُکُوْتَکَ ھَزْلٌ وَ کَلَامِیْ خَیْرٌ مِّنْ سُکُوْتِیْ لِاَنَّ سُکُوْتِیْ حِلْمٌ وَ کَلَامِیْ عِلْمٌ" (تیرا خاموش رہنا تیرے کلام کرنے سے بہتر ہے اور میرا کلام میرے سکوت سے بہتر ہے کیونکہ تیرا کلام لغو اور تیرا سکوت بکواس ہے جب کہ میرا کلام میرے سکوت سے بہتر ہے کیونکہ میرا سکوت حلم ہے اور میرا گفتگو کرنا (سراسر) علم ہے)۔

صحیح بخاری میں سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے اس امر کا عہد کرے کہ وہ اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان والی چیز (زبان) اور اپنی دونوں رانوں کے درمیان والی چیز (شرمگاہ) کی حفاظت کرے تو میں اس کیلئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں [2]۔ ایک اور مقام پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ "مَنْ صَمَتَ فَقَدْ نَجَا" [3] (جو چپ رہا وہ نجات پا گیا)۔ مزید فرمایا کہ "اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ اَللِّسَانُ" [4] (سب سے زیادہ جس کے بارے میں اندیشہ کرتا ہوں اپنی اُمت پر وہ زبان ہے)۔

اسی لیے مدعیانِ طریقت نفس کو آفات سے بچانے کیلئے خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ "مَنْ کَانَ سُکُوْتُہٗ حَیَاءً کَانَ کَلَامُہٗ حَیَاۃً" (جو حیا کے باعث خاموش رہا اس کا کلام حیات ہے)۔ کثرتِ کلام اور زبان کی آفات سے متعلق تفصیل ہماری تصنیف "متاعِ اخلاق" میں درج ہے۔ یہاں نفس کے آفاتِ لسانی سے بچاؤ کیلئے آیات واحادیث اور صوفیاء کے اقوال وارشادات کو اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تفصیل کیلئے مذکورہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

غصہ شیطان کی پیداوار ہے

نفس کی متعدد آفات میں سے اہم ترین آفت غصہ ہے۔ معمولی اور حقیر باتوں پر مشتعل ہو کر خارج از عقل ہو جانا غصہ کی علامت ہوتی ہے۔ غصہ بہت بُری چیز ہے۔ اس کی اصل آگ ہے اور غصہ کے

[1] البقرہ ۲:۸۳۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۶۱۰۹، جلد ۵، صفحہ ۲۳۷۶۔
[3] سنن الترمذی، حدیث ۲۵۰۱، جلد ۴، صفحہ ۶۶۰۔
[4] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۱۴۳، جلد ۱، صفحہ ۲۲۔

وقت انسان کی نسبت شیطان سے زیادہ اور آدم سے کم ہوتی ہے۔ غصہ کے عالم میں انسان سے کئی ایسے کام صادر ہو جاتے ہیں جو خلافِ شرم ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا غصے سے یکسر خالی ہونا ناممکن ہے البتہ اس کو برداشت کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غیظ وغضب پر قابو پانے والے کا یوں تذکرہ کیا ہے "وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" [1] (اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو غصہ پر قابو رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرماتا ہے، عذاب سے پناہ میں رکھتا ہے اور اس کی خطائیں بخش دیتا ہے۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ گھونٹ تو ہر شخص پیا ہی کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ترین گھونٹ وہ ہے جسے غصے کا گھونٹ کہتے ہیں۔ جو شخص غصے پر صبر وتحمل سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دِل کو نورِ ایمان سے معمور کر دیتا ہے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ، سفیان ثوریؒ اور دیگر بزرگانؒ کا قول ہے کہ غصہ کے وقت تحمل و بردباری اور طمع کے وقت صبر وقناعت سے کام لینا افضل ترین عمل ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک شخص نے بُرا بھلا کہا تو آپؒ نے سر جھکا لیا اور فرمایا کہ تو نے یہی کوشش کی تھی کہ میں طیش میں آ جاؤں اور شیطان سے مغلوب ہو کر اپنے آپ میں نہ رہوں اور تجھے اپنے غصے کا شکار بنا دوں تاکہ کل قیامت کو تو میرا دامن پکڑ سکے لیکن مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے غصے کو اس لیے پیدا کیا کہ انسان اس سے اسلحہ کا کام لے اور اس کے ذریعے نقصان دہ چیز سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔ دینِ اسلام اور حق کے معاملات میں غصہ از حد ضروری ہے۔ غصہ کی جڑ بالکل ختم نہیں ہوتی اُمورِ دین میں اگر غصہ ضعیف ہو جائے تو ناموسِ حرم اور حمیت دین بھی باقی نہیں رہتی۔ حضور ﷺ بھی جلال میں آ جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں آپ ﷺ کی ہر بات لکھ لیتا ہوں۔ کیا میں وہ الفاظ بھی لکھ لیا کروں جو غصہ کی حالت میں جناب کی زبان مبارک سے نکل جایا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک لکھ لیا کرو۔ مجھے قسم ہے اس خدائے بزرگ برتر کی جس نے مجھے رسولِ برحق بنا کر بھیجا ہے کہ غصہ کی حالت میں بھی میری زبان سے حق وصداقت کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ [2]

ایک مرتبہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو کسی بات پر غصہ آ گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا شیطان آ گیا۔ انہوں نے کہا، کیا آپ کا شیطان نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہے مگر حق تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب

---

[1] آلِ عمران، ۳:۱۳۴۔
[2] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۶۵۱۰، جلد ۲، صفحہ ۱۶۲۔

کر دیا ہے۔ وہ مجھے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دے سکتا جو خلاف شرع ہو۔[1] غصہ سے متعلق متعدد احادیث مبارکہ ہیں مگر یہاں طوالت کے پیشِ نظر انہیں بیان نہیں کیا جاتا۔ البتہ ان کی تفصیل ہماری تصنیف ''متاعِ اخلاق'' میں موجود ہے۔ تاہم یہاں چند ایک احادیث قارئین کیلئے بیان کی جاتی ہیں۔

۱) حضور ﷺ نے فرمایا بہادر وہ نہیں جو مقابل کو پچھاڑے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔[2]

۲) عطیہ بن عروہ سعدی ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ وضو کر لیا کرے۔[3]

۳) حضرت ابن عمر ؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ کے قہر سے بچا سکتی ہے تو آپ نے فرمایا غصے میں نہ آیا کرو۔ پھر فرمایا کہ غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جیسے سرکہ شہد کو۔[4]

۴) ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی نصیحت کیجیے مگر اتنی زیادہ نہ ہو کہ میں بھول جاؤں۔ فرمایا غصہ نہ کیا کرو۔[5] پھر فرمایا کہ بنی آدم تین طبقات پر ہیں۔ ایک وہ ہیں جو جلد غصہ قبول کر لیتے ہیں اور جلد ہی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دیر سے غصہ میں آتے ہیں اور جلد اپنی اصلی حالت پر آ جاتے ہیں۔ تیسرے دیر سے غصہ میں آتے ہیں اور دیر میں اپنی اصلی حالت پر لوٹتے ہیں۔ ان میں بہترین دوسری قسم کے لوگ ہیں اور بدترین تیسری قسم کے لوگ ہیں۔

غصہ کا باعث عموماً اپنی ذات کی انتہائی محبت، خودی، اپنے حقوق، جاہ و عزت، رتبہ کا مطالبہ، اپنی تحقیر کا احساس یا اپنے کسی عزیز کے متعلق ناروا الفاظ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسی حالت میں طیش کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ اس کو خبر نہیں رہتی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس سے وہ اپنی عزت اور احترام چاہتا ہے حالانکہ وہ اس سے اپنی حماقت کا ثبوت دے رہا ہوتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسان غیر منصف حاکم ہوتا ہے۔ معاملات میں مبالغہ اور خرابی کرنے والا ہوتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسان اس عینک سے دیکھتا ہے جس سے ہر چیز بُری نظر آتی ہے۔ چنانچہ غصے میں انسان اپنے عزیز ترین شخص پر بھی سخت احکام نافذ کر دیتا ہے۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ:

---

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۱۹۳۳، جلد ۵، صفحہ ۲۶۰۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۵۷۶۳، جلد ۵، صفحہ ۲۲۶۷۔
[3] سنن ابی داؤد، حدیث ۴۷۸۴، جلد ۲، صفحہ ۶۶۴۔
[4] المعجم الکبیر، حدیث ۱۰۰۷، جلد ۹، صفحہ ۴۱۷۔
[5] صحیح بخاری، حدیث ۵۷۶۵، جلد ۵، صفحہ ۲۲۶۷۔

۱) کیا میں اس بات میں حق پر ہوں؟
۲) کیا جس بات پر مجھے غصہ آیا وہ اس نوعیت کی ہے کہ اس پر اس قدر غصہ کیا جائے؟
۳) کیا جس شخص پر غصہ آیا ہے اس میں اس بُرائی یا کمزوری کے علاوہ دیگر خوبیاں نہیں ہیں؟
۴) کیا یہ غلطی مجھ سے نہیں ہو سکتی ہے؟
۵) کیا اللہ تعالیٰ میری خطاؤں پر رحم نہیں کرتا؟ کیا "مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ" درست نہیں؟
۶) اگر غلطی کرنے والے کی جگہ میں ہوتا اور مجھ سے ایسا سلوک کیا جاتا تو میں کیا محسوس کرتا؟

انجیل میں ہے کہ اے بندو! جب تمہیں غصہ آئے تو مجھے یاد کیا کرو اور جب مجھے غصہ آئے گا میں تمہیں یاد کروں گا۔ حضرت لقمان نے فرمایا کہ تین شخص تین صورتوں میں پہچانے جاتے ہیں (۱) حلیم الطبع انسان غصے کے وقت (۲) بہادر جنگ کے وقت (۳) اور بھائی ضرورت کے وقت۔

ایسا شخص جو اپنے اختیار سے غصہ پر قابو پالے وہ مبارک اور نیک خصلت ہے۔ ایسا شخص جس کا نفس غصہ کی آفت میں مبتلا ہو وہ تہذیب نفس کیلئے غصے کی قباحتوں سے کراہت پیدا کرے اور ان اُمور کی مخالفت کرے جو غصہ کا باعث بنتی ہیں اور ایسے لوگوں میں نہ بیٹھے جو غصے کے اسیر ہوں۔ ایسا انسان آخرت میں رونما ہونے والی آفات کا مطالعہ کرے۔ علاوہ ازیں غصہ آ جانے پر "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھے[1] یہ بھی احادیث میں آیا ہے کہ غصے کی حالت میں آدمی اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور ایک روایت میں ہے کہ سجدے میں گر جائے۔ پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے طہارت کرے[2] حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی پیداوار ہے اور ناک میں پانی ڈالنے سے دور ہو جاتا ہے۔

حسد میں دین و دنیا کی ہلاکت ہے

کسی شخص کے حسنِ کمال، لطافتِ جمال یا طمانیتِ مال و منال کو دیکھ کر رنجیدہ ہونا اور اس کے ان کمالات کی تباہی کا آرزومند ہونا حسد کہلاتا ہے۔ ابنِ منظور لکھتے ہیں "إِذَا تَمَنّٰى اَنْ تَتَحَوَّلَ اِلَيْهِ نِعْمَتُه وَ فَضِيْلَتُهُ اَوْ يَسْلُبَهَا هُوَ"[3] (کسی کی خوشحالی اور عزت و فضیلت کو دیکھ کر جلنا اور یہ آرزو کرنا کہ کاش یہ دولت اس کی بجائے مجھے ملتی یا اس سے چھن جاتی)۔ علامہ جرجانیؒ نے حسد کی تعریف یوں کی ہے کہ "اَلْحَسَدُ تَمَنّٰى زَوَالَ النِّعْمَةِ عَنْ صَاحِبِهَا الْمُسْتَحِقِّ"[4] (ایسے شخص سے نعمت کے زوال کی آرزو کرنا جو اس نعمت کا صحیح مستحق ہو)۔ یہ انسان کو لاحق ہونے والی ایسی مرض ہے جس سے جسم اور روح کو دِق لگ جاتی

---

[1] المستدرک، حدیث ۳۶۴۹، جلد ۲، صفحہ ۴۷۸۔
[2] سنن ابی داؤد، حدیث ۴۷۸۴، جلد ۲، صفحہ ۶۶۴۔
[3] لسان العرب، جلد ۳، صفحہ ۱۴۸
[4] التعریفات، جلد ۱، صفحہ ۱۱۷۔

ہے اور اس کی آگ دین کو بھی تباہ کر دیتی ہے اور جسم کو گھلا گھلا کر جلا ڈالتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حسد جیسی آفت سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے کہ "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ"[1] (اور میں پناہ مانگتا ہوں، حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے)۔ حضور ﷺ نے نفس اور روح کو لاحق حسد کے مرض کے بارے میں فرمایا "دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمُ الْبَغْضَاءَ وَ الْحَسَدَ هِیَ الْحَالِقَةُ الدِّیْنِ لَا حَالِقَةُ الشَّعْرِ"[2]۔ (آہستہ آہستہ تمہاری جانب پچھلی اُمتوں کی طرح کا مرض بڑھ رہا ہے وہ مرض بغض اور حسد ہے اور یہ مونڈ دینے والا ہے بالوں کو نہیں بلکہ دین کو)۔[3]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ چھ قسم کے لوگ چھ وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔ عرب عصبیت کی وجہ سے، امراء ظلم کی وجہ سے، سردار اور وڈیرے تکبر کی وجہ سے، تاجر لوگ خیانت اور بددیانتی کے باعث، اہلِ دیہات جہالت کے باعث اور علماء حسد کی وجہ سے۔[4]

کہا جاتا ہے کہ حاسد سردار نہیں بن سکتا اور حسد کا اثر دشمن میں ظاہر ہونے سے پہلے خود حاسد پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ حسد کرنے والے کی نشانی یہ ہے کہ اُسے غم رہتا ہے اور مظلوم سے بڑھ کر کوئی بھی حاسد کے مشابہ نہیں۔ وھب بن منبہؓ فرماتے ہیں کہ حاسد کی تین نشانیاں ہیں۔ (۱) جب سامنے آتا ہے تو چاپلوسی کرتا ہے (۲) پشت پیچھے غیبت کرتا ہے (۳) محسود پر مصیبت نازل ہو تو خوش ہوتا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی پر ایسا دشمن مسلط کرنا چاہتا ہے جو اس پر رحم نہ کرے تو اس پر حسد کرنے والے کو مسلط کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہر قسم کی دشمنی مٹ سکتی ہے سوائے حاسد کی دشمنی کے۔

واضح رہے کہ غصے سے کینہ جنم لیتا ہے اور کینہ سے حسد وجود میں آتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"[5] (کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے)۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی سے حسد کرتا ہے وہ نعمت کا دشمن ہے"۔ حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جسے موت اکثر یاد آتی رہے اُسے نہ حسد ہوتا ہے نہ خوشی۔

حسد سے نفس میں پانچ خرابیاں بالعموم پیدا ہوتی ہیں۔ (۱) اطاعت میں خرابی پیدا ہوتی ہے یعنی نفس اطاعتِ الٰہی سے سرکش اور باغی ہو جاتا ہے۔ (۲) گناہوں اور برائیوں کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے۔ (۳) حاسد بے چین رہتا ہے اور اسے بے مقصد غم اور فکر لاحق رہتا ہے اور ہر وقت مصائب میں دبا رہتا ہے۔

---

[1] الفلق، ۱۱۳:۵۔　　[2] سنن الترمذی، حدیث ۲۵۱۰، جلد ۴، صفحہ ۶۶۴۔

[3] معجم الصحابہ، ابن قانع، متوفی ۳۵۱ھ جلد ۱، صفحہ ۲۲۳، مکتبۃ الغرباء الاثریہ، مدینہ۔

[4] کنز العمال، حدیث ۴۴۰۳۱، جلد ۱۶، صفحہ ۱۲۵۔　　[5] سنن ابی داؤد، حدیث ۴۹۰۳، جلد ۴، صفحہ ۲۷۶۔

(۴) حاسد کا دل اندھا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ احکامِ الٰہی سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ (۵) حاسد ذلت اور محرومی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نامرادی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دشمن پر بھی غالب نہیں آ سکتا۔

حسد ہی سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں ابلیس سے سرزد ہوا اور زمین پر قابیل سے سرزد ہوا ہے۔ کفار و مشرکین بھی آنحضور ﷺ سے حسد اور بغض کی آگ میں ہی جلتے رہتے تھے۔

حسد کی وجوہات اور ان سے نجات

نفس کو حسد کی آفات سے نجات دلانے کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے حسد کی وجہ دریافت کی جائے۔ علماء کے نزدیک حسد کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱) حاسد جس شخص سے بغض رکھتا ہے اور اس کو کسی معاملہ میں خوشحال دیکھنا پسند نہیں کرتا ایسی صورت میں نفس کے علاج کیلئے ضروری ہے کہ اپنے نفس میں اس کیلئے موَدت اور رحمت پیدا کرے۔

۲) حاسد اس کامیابی یا نعمت کو باوجود کوشش کے حاصل نہ کر سکے جس کیلئے وہ حسد کرتا ہے اور صاحب کمال کی بربادی چاہتا ہے۔ اس صورت میں علاج یہ ہے کہ انسان اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے جس کے پاس وہ نعمت یا کمال نہیں ہے۔

۳) حاسد کیونکہ گھٹیا ہوتا ہے اور کمالات کا دشمن ہے لہٰذا جس کو صاحب کمال دیکھتا ہے تو رنج میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے نفس کا علاج یہ ہے کہ اگر حسد کی وجہ فضائل میں بخل ہو تو بخل کو دور کرے، جیسے فرمایا "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ"[1] (آپ برائی کو ایسے طریقہ سے دفع کیا کریں جو سب سے بہتر ہو)۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ حسد کے دو قسم کے علاج ہیں۔ ایک علمی اور دوسرا عملی۔ علمی علاج یہ ہے کہ حاسد کو معلوم ہو کہ اس کا دنیا میں بھی نقصان ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں نقصان یہ ہے کہ حاسد دنیا میں ہمیشہ رنج و غم، عذاب اور اضطراب میں مبتلا رہے گا اور اس کے دشمن کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کسی کی نعمت پر حسد کرنے سے اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر تو نہیں بدل جائے گی بلکہ اپنی نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور آخرت میں حاسد خسارے ہی میں رہے گا کیونکہ حاسد کی نیکیاں محسود کے حساب میں لکھ دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حاسد کیلئے حسد نقصان دہ ہے اور محسود کیلئے فائدہ بخش ہے۔

حاسد ابلیس کو خوش کرتا ہے۔ ابلیس جب یہ دیکھ لے کہ کوئی عالم، مال و منال سے محروم ہو رہا ہے تو اس تصور سے لرز اُٹھتا ہے کہ کہیں صابر اور شاکر نہ بن بیٹھے اور چاہتا ہے کہ ہر شخص دنیا اور آخرت دونوں میں محروم رہے۔ مگر حاسد شیطان کی بات مان کر آخرت میں بھی حسد کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ گویا حاسد کی مثال ایسے

---

[1] حٰم السجدہ، ۳۲:۳۴۔

ہے جیسے کوئی شخص اپنے دشمن کو پتھر مارے اور وہ پتھر واپس اُسی کو لگے اور اپنی آنکھ پھوڑے اور غصّے میں آ کر اور بھی پتھر مارتا جائے، یہاں تک کہ اپنا سب کچھ برباد کر لے اور شیطان یہ سب کچھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

عملی طور پر حسد کا علاج یہ ہے کہ ریاضت اور مجاہدے کے ذریعے نفس سے حسد کے اسباب کو دور کرے۔ حسد کی وجہ تکبر، غرور، عداوت، کینہ اور محبتِ مال و منال ہے۔ کبھی دِل میں حسد پیدا ہونے لگے تو دِل کو سمجھائے اور اس کی خلاف ورزی کرے۔ مثلاً کسی کو لعنت کرنے کو دِل کرے تو اس کے برعکس اس کی مدح کرے یا اس کیلئے دُعا کرے۔ اس کی دوستی کا مظاہرہ کرے، اس کی غیر حاضری میں اُس کی تعریف کرے۔ جب کہ شیطان ایسے سلوک سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم عاجزی اور فروتنی سے کام لو گے تو لوگ تمہیں بزدل سمجھیں گے۔ دین و دنیا کی نجات اسی صبر سے تلخی برداشت کرنے میں ہے اور حسد میں دنیا کی ہلاکت اور دین کی تباہی ہے۔ لہٰذا دِل میں حسد کی فصل کو مکروہ جانے اور اِسے دِل سے نکال پھینکے کیونکہ حسد کا سراسر نقصان ہے۔ لازم ہے کہ تمہارا کوئی دشمن نہ ہو سب کو خدا کی برابر مخلوق سمجھے اور ہر کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے۔

کبر و نخوت

اگر نفس کی پرورش کی جائے اور اس کی خواہشات کے سامنے مجاہدات و ریاضات کا بند نہ باندھا جائے تو بدفطرت نفس کی سرکشی اور معصیت کشی کے سبب انسان کو اپنے اندر ایسی صفات نظر آنے لگ جاتی ہیں جو دوسروں میں اُسے دکھائی نہیں دیتیں۔ ایسی صورتحال میں "ھم چوں ما دیگرے نیست" کے مصداق اپنے تئیں بے شمار صفات و کمال کا حامل سمجھتا ہے۔ اس کا نفس غرور و تکبر کا ایک بُت بن جاتا ہے۔ ان صفاتِ کمال کا پہلا سبب **علم** ہے۔ علم کی فضیلت کی بنا پر بعض اوقات تکبر پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ آخرت کے اُمور سمجھنے میں بھی خود کو سب سے بہتر تصور کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو بزرگ تصور کرنا علم کی آفت ہے۔ مگر حقیقی عالم وہ ہے جو آخرت کے خطرات کا علم رکھتا ہو اور پلِ صراط کی باریکی کی شناخت رکھتا ہو۔ جو یہ پہچان رکھتا ہو وہ تکبر کی آفت سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علم جس قدر زیادہ ہو جاتا ہے، مصیبت بھی اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ علمِ دنیا کے ساتھ علمِ دین نہ ہو تو اس سے کبر و نخوت پیدا ہوتی ہے اور دِل نورِ علم سے منور و تاباں ہونے کی بجائے تاریک ہو جاتا ہے۔ ایسے مغرور و متکبر انسان کا طرزِ تکلم بھی کبر سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایسے علماء تکبر کی بنا پر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کی ہمارے سامنے تو وقعت ہی کیا ہے؟ اس کے برعکس متواضع لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی قدر و منزلت کے حامل ہوتے ہیں جیسے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ نماز کی امامت فرما کر یہ کہہ دیا کہ کوئی دوسرا امام تلاش کرو کیونکہ میرے دِل میں یہ خیال جاگزیں ہوتا جا رہا ہے کہ میں تم سب سے بہتر

اور بلند درجے کا مالک ہوں۔

دوسرا سبب زہد وعبادت میں تکبر کرنا ہے: اپنی عبادت ومجاہدات پر فخر کرنے والے لوگ اپنی زیارت دوسروں کیلئے باعثِ اجر وثواب اور باعثِ نجات سمجھتے ہیں۔ ان کے مخالفوں پر آنے والی کسی مصیبت کو اپنی کرامت پر محمول کر کے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے گستاخی کرنے والے کا یہی حشر ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے قصہ کہانی لے بیٹھتے ہیں کہ فلاں نے ہماری بارگاہ میں گستاخی کی تھی، جس کی وجہ سے اس کا یہ نقصان ہوا ہے۔ دراصل اس طرح کی داستاں سرائی اور سخن وری سے دوسروں کو زبردستی اپنا اطاعتِ شعار اور تابع فرمان بنانے کی سعی ناکام ہوتی ہے حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو دوسروں کیلئے ہلاکت کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ چھین کر متواضع شخص کو دے دیتا ہے۔ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک عابد مشغولِ عبادت تھا۔ اس کے سر پر بادل کا سایہ رہتا تھا۔ ایک بدکار عورت نے اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش کی شاید اللہ تعالیٰ مجھ پر بھی فضل کر دے، مگر اس عابد نے دِل میں سوچا کہ یہ تو بہت بدکار عورت ہے اس جیسا بدکار تو دنیا میں نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اُسے اُٹھا دیا مگر بادل کا ٹکڑا بھی اس بدکار خاتون کے ساتھ ہو لیا اور پیغمبرِ وقت پر وحی آئی کہ اِن دونوں کو کہو کہ اپنے اپنے اعمال کا از سرِ نو آغاز کریں کیونکہ فاسقہ کو معافی مل گئی ہے اور عابد کی عبادت تکبر کی وجہ سے چھن گئی ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایسے عابد کو اگر کوئی ستائے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ حق تعالیٰ اس شخص کو ستانے کی کڑی سزا ضرور دے گا اور اپنی رحمت سے محروم کر دے گا حتیٰ کہ لوگوں سے کہتا ہے کہ لوگو! دیکھ لینا اس کو ستانے کی کس قدر بھیانک سزا ملے گی۔ اگر اتفاقاً یا تقدیراً کوئی تکلیف واقعی پہنچ جائے تو کہنے لگتا ہے کہ یہ سب میری کرامت کی وجہ سے ہوا ہے۔ دیکھو! اس کا کیا حشر ہوا ہے حالانکہ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کفار نے حضور ﷺ کو کتنی اذیت پہنچائی، کس قدر ستایا مگر حق تعالیٰ سے آپ ﷺ نے اُن کیلئے تو زحمت اور تباہی و بربادی کی بددعا نہ کی بلکہ جواباً دینِ اسلام جیسی عظیم نعمت سے سرفراز ہونے کی صرف دعا کی بلکہ عملاً جد وجہد بھی جاری رکھی۔ یہ عابد کس کی شریعت کی اتباع میں عبادت میں مشغول ہے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا درجہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ سے بھی بڑھ گیا ہے؟ اس کے برعکس دانائے راز عابد تو مخلوقِ خدا پر نازل ہونے والی آفت اور مصیبت کو اپنی بدبختی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوگوں کا کیا قصور؟ یہ تو ہماری خطاؤں اور منافقت کی نحوست ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ سے نہایت تشویش ناک انداز میں پوچھنے لگے، سچ سچ کہو تمہیں مجھ میں نفاق کی کون سی علامت دکھائی دیتی ہے؟ پس مسلمان کو پرہیزگار ہو کر ڈرتے رہنا چاہیے اور خوفِ خدا سے ہمہ وقت لرزتے رہنا چاہیے اور یہ خود کو قلندر کہنے والا عمل سے تہی دامن

رہتا ہے اور اپنے باطن کو کبر ونخوت اور زعم وپندار کی غلاظت سے گندار کھتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو اس قدر افضل سمجھا اس نے حماقت سے اپنی عبادت کو رائیگاں کر دیا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ علماء اور عابدوں کو اکثر یہ آفت گھیرے رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے تین گروہ ہیں۔

۱) پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کا دِل تو تکبر سے پاک نہیں مگر ظاہراً عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں تکبر کی جڑیں تو ہیں مگر شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں۔

۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو باتوں سے تکبر کا اظہار نہیں کرتے۔ خود کو بہت کمتر زبان سے کہتے ہیں مگر ان کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مجالس میں صدر نشینی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ چلنے والوں کے آگے آگے چلتے ہیں۔ علم کے زعم میں گردن ٹیڑھی رکھتے ہیں اور اپنے سے کمتر لوگوں میں تیوری چڑھا کر بیٹھتے ہیں کہ اس کے دیگر ہم نشین اس کے ہم پلہ نہیں۔

۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کو زبان پر قابو نہیں ہوتا، اُن کی گفتگو میں بھی تکبر اور نخوت ٹپکتی ہے۔ خود ستائی کے عادی ہوتے ہیں۔ خود کو صاحب کرامت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ کسی کو اپنا ہمسر نہیں مانتے اور بلا تأمل کہتے ہیں کہ جس نے مجھے ستایا اُسے مال یا اولاد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ فلاں میری وجہ سے تباہ ہوا، فلاں کا استاد بھی میرے سامنے جاہل ہے۔ کچھ ایسے الفاظ حفظ کر لیتے ہیں تا کہ مجلس میں اپنی فوقیت کے اظہار کا موقع پا سکیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کے دِل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکتا اور اس کے قریب بھی نہ جائے گا۔[۱]

تیسرا سبب متکبر ہونے کا حسب ونسب اور خاندان کی برتری کا خیال ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو ہیچ اور غلام تصور کرتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کو غصہ اور خفگی کے عالم میں کہتے ہیں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک روز غصے سے بے قابو ہو کر ایک شخص کو حبشی کہہ دیا۔ آنحضور ﷺ نے کہا، اے ابوذر! بے قابو کیوں ہوتے ہو، گورے کے بچے کو کالے کے بچے پر کس لحاظ سے فضیلت حاصل ہے۔ یہ بات سن کر ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنا منہ زمین پر رکھ دیا اور اس شخص سے کہا، اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دے۔ دو شخص آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا، میں فلاں ابنِ فلاں ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے اسی طرح اپنی نو پشتیں گنوائیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس کو کہہ دو کہ جن نو پشتوں پر تو فخر کر رہا ہے وہ تو جہنم میں جل رہے ہیں۔ ان پر تو رُسوائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو دوزخ میں جل کر خاکستر ہو گئے ان پر فخر کرنے سے کیا حاصل۔

۱؎ المعجم الکبیر، حدیث ۲۶۶۸، جلد ۷، صفحہ ۱۵۳۔

چوتھا سبب تکبرِ حسن و جمال ہے جو عموماً عورتوں میں ہوتا ہے۔ ہمہ وقت اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف رہتی ہیں۔ دوسری عورتوں کو اپنے سامنے بے حیثیت اور بے وقعت سمجھتی ہیں۔

پانچواں سبب مال و دولت اور جائیداد ہے جو مالدار، جاگیردار اور سرمایہ دار دوسرے کو کمینہ اور گھٹیا سمجھتا ہے اور دوسروں کو یوں مخاطب ہوتا ہے کہ میں تیرے جیسے لوگوں کو تو بطور غلام خرید سکتا ہوں۔

بعض اوقات تکبر کا ایک سبب جسمانی زور و قوت ہوتا ہے، جس کا اظہار طاقتور لوگ کمزوروں پر کرتے ہیں۔ ایک سبب تکبر و غرور کا دوسرے افراد سے کسی لحاظ سے فوقیت رکھنے کا بھی ہے۔ متکبر آدمی اپنے مریدوں، شاگردوں، غلاموں، ملازموں اور نوکروں پر اپنی برتری اور خواجگی جتایا کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان کا رازق تصور کرنے لگتا ہے۔ مذکورہ بالا اسباب کے پیشِ نظر نفس کو مجاہدات و ریاضات اور توجۂ مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔

علاجِ تکبر

پھر وہ عمل جو انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کا سبب ہو خواہ وہ معمولی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو اس کا علاج کرنا فرض ہے۔ پھر وہ شخص جسے خداوند تعالیٰ نے علم و فضل کی دولت سے نوازا ہو یا مال و منال اور جائیداد وغیرہ کا حامل ہو یا کسی بھی ایسی نعمت سے نوازا گیا ہو جس کے بل بوتے پر وہ تکبر کرنے لگے، اُسے اس مرض کا علاج بہر طور کرتے رہنا چاہیے۔ کبر و نخوت سے آلودہ نفس کی تہذیب اور محاسبہ کا علاج یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو اپنے ذہن میں جاگزیں کرلے کہ اصل ذاتِ کبریا خداوندِ عزوجل ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو شانِ کبریائی حاصل نہیں۔ مزید برآں انسان اپنی حقیقت کو بھی دیکھے کہ اسے ایک ناپاک نطفے سے پیدا کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ اُسے نیست سے ہست میں لایا ہے۔ ''هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا''[1] (بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جب کہ یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا) کے مطابق انسان کی کم مائیگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک وقت اس پر ایسا بھی آیا ہے جب یہ نا قابلِ مذکور شئے تھا اور اب یہ اپنے مقابل کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتا کبر و نخوت سے اس کی اکڑی ہوئی گردن اسے خدائی دعویٰ پر مجبور کر دیتی ہے۔ فرعون اور نمرود انسان ہی تھے جنہیں ناپاک نطفے سے پیدا کیا گیا تھا، مگر کبر و رعونت کے بُت بنے تو خدا نے اُنہیں کیسے سرنگوں کیا؟

انسان کو بے شمار انعامات و اکرامات اور صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے انہی خداداد صلاحیتوں کے طفیل وہ کائنات کو مسخر کرنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے پر آمادہ ہے، مگر اس کے ساتھ اُس کی حوائج اس قدر ضروری

---

[1] الدھر،۷۶:۱۔

رکھی گئی ہیں جن کی تکمیل میں پانچ منٹ بھی تاخیر ہو جائے تو بے حال ہو جاتا ہے۔ گرمی، سردی، پیاس، بھوک، بیماری اور خوف وغیرہ جیسی بلائیں اُس پر مسلط کر دی جاتی ہیں۔ انسان کے کسی عضو میں ذرّہ برابر تکلیف ہو تو اس کا اضطراب اور درد کی کیفیت ناقابلِ دید ہو جاتی ہے۔ پھر مر جاتا ہے تو جسم سے سخت تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ تبھی تو اُسے جلد از جلد دفن کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ پھر خاک میں مل کر خاک ہو جانا اس کا انجام کار ہے۔ صرف خاک میں ختم نہیں کیا جاتا بلکہ مرنے کے بعد اُسے خطرناک اور بھیانک مقام یعنی قہر، حشر اور قیامت کا دہشت ناک منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔ بروزِ قیامت جملہ مخلوقات کے سامنے اس کے تمام اعمال پیش کیے جائیں گے۔ پھر گناہ کی پرسش ہوگی، وہ اعضائے انسانی جن کی خوبصورتی اور حسن و لطافت پر دنیا میں تکبر کرتا تھا، روزِ حشر وہی اعضاء اُس کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے اور بداعمالیوں کے سبب سیدھا دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا اور یوں جہنم کے شعلوں کا ایندھن بن جائے گا۔

نہ گل کو ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ذوقِ مدح وستائش

اپنے وابستگان، متوسلین اور ارادت مندوں سے اپنی تعریف اور مدح وستائش سن کر لذت اندوز ہونا نفس کی آفتوں میں سے ایک بڑی آفت ہے۔ نفس عبادت کا بوجھ اُٹھاتا ہے تو بسا اوقات ریا اور نفاق اس پر غالب آ جاتا ہے۔ جب لوگ اس کی تعریف و توصیف کرنا چھوڑ دیں بلکہ برائی اور مذمت بیان کریں تو اس کی عبادت میں سستی اور کاہلی آ جائے گی۔ اس ذوقِ مدح کی وجہ سے غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے۔ اس فریب انگیز اور ریا آمیز مدح کی مثال ایسے لقمۂ خوش ذائقہ کی ہے جس کے اندر زہر ملا ہوا ہو۔ ایسے لوگ خود لوگوں میں اپنی خلوت کی تسبیح و تہلیل اور نوافل و عبادت کا چرچا کرتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں عابد و زاہد سمجھ کر اُن کی تعریف کریں اور عقیدت مندی میں اضافہ ہو۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ تیرا نفس تجھے دھوکا دیتا ہے کہ میں اس مدح کا خریدار اور اس تعریف کا طلبگار نہیں ہوں۔ یہ مداح تو محض اپنی غرض سے خوشامد کر رہا ہے مگر میں اس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ ذرا غور کرو کہ اگر وہی تعریف کرنے والا شخص انعام نہ پا کر تمہاری ہجو کرنے لگے تو تمہیں اس سے دُکھ ہوگا یا نہیں؟ انسان کا نفس مدح سے تو تب بے نیاز ہو سکتا ہے جب ہجو اور ذم کا بھی اس کے اوپر کوئی اثر نہ ہو۔ مدح حلوے کی طرح میٹھی اور مذمت خراب اور تلخ غذا کی طرح بدمزہ اور کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی تعریف سننے کا شوق بھی رفتہ رفتہ روح میں سرایت کرتا رہتا ہے اور انسان کی روحانی زندگی کو مسموم بنا دیتا ہے۔

باب نمبر ۱۲

نفس کی سرکشی اور فریب

مولانا رومؒ کی نظر میں

علم النفس

مثنوی (مولانا رومیؒ) میں علم نفس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جس میں سے چند باتیں اس باب میں بیان کی جا رہی ہیں۔ ماہرین نفس اس دور میں تقریباً ان باتوں پر تحقیق کر رہے ہیں جو سائنسی حقائق مولانا رومیؒ نے کئی سو سال پہلے بیان فرمائے ہیں۔ مولانا رومیؒ کے بیان کردہ حقائق آج بالکل درست ثابت ہو رہے ہیں۔ تحت الشعوری نفسیات کا ماہر فرائڈ کہتا ہے کہ انسان کے اندر سرچشمۂ حیات شہوت ہے جسے وہ "لبیڈو" کہتا ہے، اس نے کہا ہے کہ شہوت کا رخ بدل جائے تو اخلاق اور روحانیت پیدا ہوتی ہے۔

مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی امیر سے ایک گھوڑا طلب کیا تو اس امیر نے کہا کہ وہ سفید گھوڑا لے لو مگر اس شخص نے کہا کہ وہ یہ گھوڑا لینے کو تیار نہیں کیونکہ اس کو آگے کی طرف چلاؤ تو یہ پیچھے کی طرف چلنے لگتا ہے۔ امیر نے کہا کہ اس حالت میں اگر اس کی دُم گھر کی طرف کر دو گے تو یہ تمہیں گھر پہنچا دے گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ آدمی ارتقائے حیات میں (ترقی کیلئے) آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر یہ نفس پیچھے کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ رجعت اس کی فطرت ہے۔ فرماتے ہیں کہ شہوت کا رخ بھی جسمانیت سے عقل اور روحانیت کی طرف پھیر سکتے ہیں اور یہی قوت عقل میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ زندگی کی تخلیقی قوت شہوت ہے اور اسکا رخ بدن سے بدل کر روح کی طرف کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو انسان شریف بن سکتا ہے اور اگر بدن کی طرف جائز حدود میں رہے تو کوئی حرج نہیں مگر ان حدود سے بڑھ جائے تو انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ شہوت بذات خود نہ شریف ہے نہ ذلیل۔ پس اگر گھوڑے کی طرح اس کا رخ پلٹ دو تو منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

آں یکے اسپے طلب کرد از امیر   گفت رو آں اسپ اشہب را بگیر

(ایک شخص نے کسی امیر سے ایک گھوڑا طلب کیا اس نے کہا کہ جاؤ وہ سفید گھوڑا لے جاؤ) (۱۲۲/۶)

گفت آں را مَن نه خواهم گفت چوں   گفت اُو واپس روست و بس حروں

(اس نے کہا کہ وہ اس گھوڑے کو لینا نہیں چاہتا، پوچھا کیوں؟ کہا کہ وہ پیچھے کی طرف آنے والا ہے اور واپسی بھی تیزی سے) (۱۲۲/۶)

سخت پس پس می رود اُو سوئ بن   گفت دُمَش را بسُوئے خانه کُن

(وہ دُم کی جانب بہت ہی پیچھے کو ہٹتا ہے اس نے کہا کہ اس کی دم کو گھر کی طرف کر دو) (۱۲۲/۶)

دُمِ ایں استورِ نفست شہوتست   زاں سبب پس رود آں خود پرست

(تیرے اس جانور نفس کی دُم شہوت ہے اس لیے وہ خود پرست واپسی کی طرف پلٹتا چلا جاتا ہے)(۱۲۲/۶)

شہوت اُو را که دُم آمد زبن   اے مبدل شہوت عقبیش کُن

(اس نفس کے گھوڑے کی شہوت کو جو اصل میں دُم میں اس کی طرح ہے اے (مخاطب) اس کو آخرت کی شہوت میں تبدیل کر دے) (۱۲۲/۶)

چوں به بندی شہوتش را از رغیف   سر کُند آں شہوت از عقل شریف

(جب تو اس کی شہوت کو روٹی کی جانب سے بند کر دیگا تو وہ شہوت، عقل شریف میں سر ابھارے گی)(۱۲۲/۶)

همچو شاخے کش ببری از درخت   سر کند قُوّت زشاخ اے نیک بخت

(جس طرح کوئی درخت کی شاخ کاٹ دے تو اے نیک بخت اس کی قوت دوسری شاخ سے ظاہر ہوتی ہے)

نفس کا فریب

صد هزاراں دام و دانه ست اے خدا   ما چو مرغان حریص و بے نوا

(اے خدا ہمارے لیے ہزاروں جال اور دانے پھیلائے گئے ہیں ہم حریص اور بھوکے پرندوں کی طرح ان میں گرفتار ہونے کو ہیں) (۶۹/۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہم دنیاداروں کو بہت حرص وہوس کے پھندوں میں پھنسایا گیا ہے اور ہمارے

سامنے بہت سے دانے بکھیرے گئے ہیں تاکہ شیطان ہم کو اس جال میں پھانس کر اپنا شکار کرے اور ہم اس سے بچتے رہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم حریص پرندوں کی طرح اس میں گرفتار ہونے کو ہیں چنانچہ اے خدا تو ہی ہم کو اس فریب کار سے محفوظ فرما۔ درج ذیل شعر میں نفس کو شہوات میں الجھانے کا ذکر کیا جا رہا ہے یعنی جدھر بھی جاتے ہیں ہمارے اردگرد خواہشات کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ ہم جتنا بھی ان جالوں سے بچنا چاہیں نہیں بچ سکتے، یا الٰہی صرف تیرا فضل ہی ہے جو ہمیں اس جال سے بچا دے۔ ہم بچنے کی کوشش تو کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایسے گناہ کر بیٹھتے ہیں کہ ہماری وہ نیکیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں اس کا حل یہ ہے کہ اپنے دل کو شیطانی خیالات سے پاک کرو، اخلاقی کدورتوں سے شیشۂ دل کو صاف کرو تو پھر اعمال صالحہ کی برکت دیکھو گے۔ نماز جس کے متعلق حدیث پاک ہے "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" یعنی حضور قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ تو جان لیں کہ آدمی جب خدا کے حضور نماز کیلئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو خاص خدا کی طرف دل کو لگائے اور ایسا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ کوئی دوسرا خیال نہ آئے۔

عارف رومیؒ ایک لمبی داستان کے بعد سے عرض کرتے ہیں کہ شیطان ہر وقت ہماری کھوج میں لگا رہتا ہے اور ہم ہر وقت ایک نئے جال میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہم اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور یہ ظالم ہمارے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے لہٰذا تو ہمیں اس لعین کے شر سے بچا۔

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا　　ما چو مرغانِ حریص و بے نوا

(الٰہی (دنیا میں) لاکھوں جال اور دانے (ہمارے اردگرد پھیلائے گئے) ہیں۔ ہم حریص اور بھوکے پرندوں کی طرح ان میں گرفتار ہونے کو ہیں) (۶۹/۱)

می رہانی ہر دمے مارا و باز　　سوئے دامے می رویم اے بے نیاز

(تو ہمیں ہر وقت چھڑاتا ہے اور پھر ہم کسی جال کی طرف چل دیتے ہیں اے بے نیاز) (۶۹/۱)

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم　　چوں تو با مانی نباشد ہیچ غم

(اگر ہر قدم پر ہزاروں جال ہوں جب تو ہمارے ساتھ ہے تو کچھ غم نہیں) (۷۰/۱)

چوں عنایاتت شود با ما مُقیم　　کے بود بیمے ازاں دُزد لئیم

(جب تیری عنایتیں ہمارے ساتھ ہو جائیں گی تو اس کمینے چور (شیطان) کا ڈر کب ہو سکتا ہے) (۷۰/۱)

نفس کی مثال ایک سانپ اور جنگلی گھوڑے کی سی ہے

مولانا رومؒ نے نفس کی سرکشی اور فریب پر اچھا خاصہ کلام فرمایا ہے۔ آپ نے نفس کی آفات کا علاج اور اس کی سرکشی کو قابو میں لانے کا طریقہ بھی تجویز فرمایا ہے۔ نفس کی تمثیل مولانا رومیؒ نے ایک سانپ کے ساتھ دی ہے اور کہا ہے کہ سانپ نہایت موذی جانور ہے جو انسان کو تھوڑی ہی دیر میں ہلاک کر دیتا ہے۔ اس سانپ کا

بہترین تدارک یہ ہے کہ اس کو قابو میں لا کر اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔
''کشف المحجوب'' میں بھی نفس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ نفس ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہے جسے جنگلی گھوڑے کی طرح محنت اور مشقت میں مبتلا کر کے مہذب کیا جاتا ہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ نفس کی بے شمار آفات ہیں جو انسان پر مختلف پہلوؤں سے حملہ کرتی ہیں۔ انسان کی شہوات کا رونما ہونا، بے شرمی اور بے غیرتی کے اعمال کا سرزد ہونا، چوری چکاری اور رشوت وغیرہ ایسی آفات ہیں جو نفس کی شرارت سے ہی وجود میں آتی ہیں۔ نفس جب انسان پر غالب ہو جائے تو اس پر تمام اعمالِ حسنہ اور نیکیوں کے دروازے مسدود ہو جاتے ہیں۔ بے ایمانی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، عورتوں کو بے غیرتی پر آمادہ کرنا سب نفس کی ریشہ دوانیوں میں شامل ہیں۔ ابلیس کو جو اختیارات دیے گئے ہیں ان کے باعث وہ لوگوں کی اخلاقی، معاشرتی اور روحانی زندگی تباہ کرتا ہے۔

شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے بہت سے ہتھکنڈے تیار کیے ہیں جن سے وہ لوگوں پر حملہ کرتا ہے۔ قرآن میں بھی اس عداوت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا وَلاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ o''[1] (اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔ ایک اور مقام پر آیا ہے کہ وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بیشک (اسکا) جنت ہی ٹھکانا ہے۔
قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر برائی کا سرچشمہ نفس ہے اور انسان کی آزمائش نفس کا مقابلہ کرنے پر ہی موقوف ہے۔ نفس برائی کا حکم دیتا ہے اور جو اس برائی سے بچ گیا وہی فلاح پانے والا ہے۔

درجات کی بلندی نفس کی مخالفت میں ہے

راقم الحروف کا مضمون ''مقامِ آدم'' جو ہماری تصنیف ''اسلام و روحانیت اور فکر اقبال'' میں شامل کیا گیا ہے، اس میں اس بات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ انسانوں اور فرشتوں کی بلندی کس چیز پر انحصار کرتی ہے۔ فرشتے ہر وقت عبادت کرتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے مگر ان کے درجات بلند نہیں ہوتے۔ جو فرشتہ جس مقام پر پیدا کیا گیا ہے وہ اسی مقام پر ہی تمام عمر گزار دیتا ہے کیونکہ ان کو نفس کی مزاحمت نہیں دی گئی۔ کسی فرشتے کی نہ تو بیوی ہے اور نہ بچے اور نہ اس نے کسی کیلئے روزی کمانی ہے اور نہ اس نے بیوی بچوں کی خاطر کچھ کام کرنا ہے۔ ایسی حالت میں نہ اس کو کسی سے سلوک کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی نوکری یا ملازمت کرنی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں ان کو نہ تو کسی چوری چکاری اور نہ ہی کوئی برائی کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ درجات کی بلندی تو انسان کیلئے رکھی گئی ہے۔ جو انسان رشوت نہ لے گا تو اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے اور وہ فرشتے جو زنا یا بدکاری کرنے پر قادر ہی نہیں تو ان کے درجے بلند ہی نہ کیے جائیں گے۔ معلوم

[1] البقرہ ۲:۲۰۸۔

ہوا کہ درجات اس وقت بلند ہوتے ہیں جب کسی بری بات سے خود کو روکا جائے اور چونکہ یہ سعادت فرشتوں کو حاصل ہی نہیں تو ان کے درجات کس طرح بلند ہو سکتے ہیں۔ محنت کرنا فقر و فاقہ برداشت کرنا تو انسان کیلئے ہے اس لیے اس کے درجات بلند ہو سکتے ہیں۔ فرشتہ بیچارہ جس درجے پر پیدا ہوا اسی درجے پر تمام عمر رہے گا۔ انسان کی اس بلندیٔ درجات پر فرشتے رشک کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں لکھا ہے کہ فقر و فاقہ، ھاؤھو اور مصائب کا برداشت کرنا نہ تو ان کیلئے ہے اور نہ ہی حور و فرشتہ کو اس کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح ہو جائے تو مقامِ حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ مقامِ محبت نورِ یقین کے غلبہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ نفس کی اصلاح ہو جائے تو قلب پر ذکر کے اثر سے مقامِ حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے اور جب محبت، صحبت کے درجے پر پہنچ جائے تو اس وقت قلب پر احوال مرتب ہونے لگتے ہیں۔ محبت ایک ایسا جام ہے کہ اگر حواس اس سے متاثر ہوں تو ان میں سوز برپا ہو جاتا ہے اور اگر نفوس میں جاگزیں ہو جائے تو وہ نیست ہو جاتے ہیں۔ یہ سب یقین کی بدولت ہے۔

روح اور نفس پر شیطان کا اثر

ایک حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی انسان شیطان کی پیروی میں لگا رہے تو شیطان انسان کے دل میں اپنے پنجے گاڑے رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص دنیاوی عیش و عشرت میں غرق رہے یا غیر شرعی گفتگو میں الجھا رہے تو اس کے دل میں شیطان اپنی چونچ رکھ دیتا ہے جس سے انسان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نیک گفتگو یا نیک کاموں میں لگا رہے تو شیطان اس کے دل سے اپنی چونچ نکال لیتا ہے۔[1]

اگر کوئی انسان بُرے کاموں میں الجھا رہے تو اس کے بُرے اثرات اس کے دل پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور روح کمزور اور نحیف ہو جاتی ہے۔ شیطان کی مدافعت ایسی روح کے بس سے باہر کی بات ہے۔ جب گناہوں کی تعداد بڑھتی رہے تو روح ایسے مرض میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کو ہم روحانی بیماری کہتے ہیں۔ کوئی شخص بیمار ہو تو پہلے وہ بیماری اس کی روح کو لگتی ہے اور پھر جسم پر منتقل ہو جاتی ہے۔ انبیاء ﷺ کا مزاج معتدل ہوتا ہے اس لیے ان کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی ماسوا اس کے کہ ان کا امتحان لینا مقصود ہو۔

روحانی دنیا کا ایک اور قانون ہے کہ روح اور بدن ایک دوسرے کی نقیض (الٹ) ہیں۔ جن کاموں کے کرنے سے بدن کمزور ہو جائے تو روح طاقتور ہو جاتی ہے۔ روح کی طاقت نیک کاموں سے ہوتی ہے۔

---

[1] کنز العمال، حدیث ۱۲۶۶، جلد ا، صفحہ ۱۳۷۔

برے کاموں سے روح کمزور اور بدن طاقتور ہو جاتا ہے۔ مثلاً روزہ رکھنے سے بدن کمزور ہوتا ہے تو روح کو طاقت ملتی ہے۔ زیادہ کھانے سے بدن طاقتور ہو جاتا ہے اور روح کمزور ہو جاتی ہے۔

روح انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے اور نفس زمین کی طرف

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوت ملکیہ یعنی فرشتوں کے ساتھ مناسبت رکھنے والی طاقت اور اس کے پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ روحِ حیوانی جو بدن انسان میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ روحِ انسانی سے فیض یاب ہو اور وہ اس کے فیض کو قبول کرلے اور اس سے مغلوب ہو جائے۔ دوسری قوت بہیمیہ یعنی چوپایوں سے مناسبت رکھنے والی قوت اور یہ نفس حیوانی سے پیدا ہوتی ہے جو تمام حیوانات میں مشترک ہے اور یہ قوت روحِ طبیعی کے قویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان دونوں قوتوں میں کھینچا تانی اور مزاحمت ہوتی رہتی ہے۔ قوتِ ملکی عروج چاہتی ہے اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر قوتِ بہیمی غالب آجائے تو قوتِ ملکی دب جاتی ہے اور اگر قوتِ ملکی کا غلبہ ہو جائے تو قوتِ بہیمی ہار کر رہ جاتی ہے۔[1]

روح اور نفس کا تقابل اور مولانا رومیؒ

اس دنیا میں ہر چیز آکل (کھانے والی) یا ماکول (کھائی جانے والی) ہے۔ ایک چیز اگر کام دینے والی ہے تو وہ کام بھی کرتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس دنیا میں ہر ذرّے کو حصولِ غذا کیلئے منہ کھولے ہوئے دیکھا ہے۔ ہر جاندار کا ہر عضو اپنی اپنی مخصوص غذا مانگتا ہے۔ جسم کا ہر حصہ اپنی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے جو چیز کھائے جانے سے بچ جاتی ہے خوش بخت ومقبل (با اقبال) ومقبول ہو کر اس عالم سے ماوراء ہو جاتی ہے۔

ذرّہ ھا دیدم دھاں شاں جُملہ باز   گر بگویم خورد شاں گردد دراز

(میں نے ذرّے دیکھے جن کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ اگر میں ان کی خوراک بیان کروں تو بات بڑھ جائیگی) (۱۷/۳)

جُملہ عالم آکل و ماکول داں   باقیاں را مُقبل و مقبول داں

(تمام عالم کو کھانے والا اور کھایا ہوا سمجھ، باقی رہنے والوں کو مقبول اور با اقبال سمجھ)

لقمہ بخشی آید از ہر کس بکس   حلق بخشی کار یزداں ست و بس

(لقمہ دینا ہر شخص سے ہر شخص کیلئے ہو سکتا ہے حلق بخشنا صرف اللہ کا کام ہے)

حلق بخشد خاک را لُطف خدا   تا خورد خاک آب و روید صد گیا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد ا، صفحہ ۲۰، مطبع المکتبہ السلفیہ لاہور۔

(اللہ تعالیٰ کی مہربانی مٹی کو حلق عنایت کرتی ہے یہاں تک کہ مٹی پانی پیتی ہے اور سینکڑوں گھاس اُگاتی ہے)

باز حیواں را بہ بخشد حلق و لب تا گیاهش را خورد اندر طلب

(پھر (اللہ تعالیٰ) حیوان کو حلق اور ہونٹ بخشتا ہے یہاں تک کہ وہ تلاش کر کے اس (خاک) کی گھاس کھاتا ہے)

چوں گیاهش خورد و حیواں گشت رفت گشت حیواں لقمهٔ انسان و رفت

(جب اس (حیوان) نے اس (خاک) کی گھاس کھائی اور موٹا ہو گیا پھر وہ حیوان انسان کا لقمہ بنا اور ختم ہو گیا)

باز خاک آمد شد آکالِ بشر چوں جدا شد از بشر روح و بصر

(پھر مٹی آئی وہ انسان کو نگل جانے والی بنی جبکہ انسان سے روح اور بینائی جدا ہو گئی)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہر عضو، جان، عقل و دل، بدن اور نفس کا بھی حلق ہے۔ فرعون و موسیٰ کا قصہ ہر نفس میں پایا جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تاریخی قصہ تو ایک الگ بات ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو فرعونیت کے آثار ہر شخص کے اندر پائے جاتے ہیں۔ فرعونیت نفس انسانی کا ایک مظہر ہے۔ فرعون کا قصہ سن کر لوگ فرعون کو برا کہتے ہیں حالانکہ لوگوں کے اندر فرعون کے اژدھے موجود ہیں اور انسان بے سروسامان ہے۔ جو کچھ فرعون کو میسر تھا اگر تجھے دیا جائے تو دیکھ کہ تو کس طرح کا فرعون ہوتا۔ کچھ لوگ وزیر اعظم اور بڑے افسر بنتے ہیں تو لوگ ان کی فرعونیت کو دیکھتے ہیں مگر وہ خود اپنی فرعونیت پر غور نہیں کرتے۔ اگر کوئی ان وزیروں کی تعریف کرے تو یہ لوگ الا ماشاء اللہ گردن اکڑا لیتے ہیں، یہ بھی تو فرعونیت ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ صرف فرعونیت ہی انسان میں موجود نہیں بلکہ موسیٰ علیہ السلام بھی تمہارے اندر ہی ہے۔ خدا نے ان دونوں میلانات کو تمہارے سامنے رکھا ہے اور تمہیں اختیار دیا ہے کہ جس کو چاہو اختیار کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضا یا قلب صافی میں نور تھا۔ وہی نور ہر انسان میں قابل افادہ واستفادہ ہے۔ انسان کو ان دونوں قسموں کو اپنے اندر معلوم کر لینا چاہیے۔

آنچہ در فرعون بُود اندر تو هست لیک اژدرهات محبوسِ چاه است

(جو کچھ فرعون میں تھا وہ تیرے اندر ہے لیکن تیرے اژدھے کنویں میں قید ہیں) (۱۰۱/۳)

اے دریغ ایں جملہ احوالِ تو هست تو براں فرعون بر خواهیش بَست

(ہائے افسوس! یہ سب تیرے احوال ہیں تو ان کو فرعون سے وابستہ کرنا چاہتا ہے) (۱۰۱/۳)

موسیٰؑ و فرعون در هستیِ تُست باید ایں دو خصم را در خویش جُست

(موسیٰ علیہ السلام اور فرعون تیرے وجود میں ہیں ان دو مقابل شخصیتوں کو اپنے اندر تلاش کرنا چاہیے) (۱۲۷/۳)

تا قیامت ہست از موسیٰ نتاج　　نُورِ دیگر نیست دیگر شد سراج

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ قیامت تک کیلئے ہے، روشنی دوسری نہیں ہے، چراغ دوسرا ہے) (۱۲۷/۳)

جہاں نفس سرکش ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کا نور نہیں ہوتا

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس جب تک لذتوں کی طرف مائل ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اخروی نعمتوں کی لذت نہیں چکھی ۔ جب انسان اپنے آپ کو دنیوی کمال کی منزل پر دیکھتا ہے تو خود اس کا دُنیا کی آفات میں گھرا ہوا عمل اس کی حالت کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اس نورِ الٰہی کے دیدار کی علامات یہ ہیں کہ دھوکے کے جہان سے انسان کا بچاؤ ہو۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عورت کی بیوقوفی کی وجہ یہ ہے کہ اس پر حیوانیت کا وصف غالب ہوتا ہے کیونکہ وہ رنگ و بو پر بھروسہ رکھتی ہے۔ حیوان کا شعور حیات تک محدود ہے۔ انسان کی جزوی عقل بھی اگر غالب ہو جائے تو وہ عقل نفس کے مادہ کی شرارت کو سلب کر دے گی اور عقلِ کلی کا تو کیا ہی کہنا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ نفس انسان کی عقلِ جزوی پر غالب ہے۔ نفسِ امارہ کو عقل کلی سلب کر لیتی ہے۔ نفس انتہائی بھوکا ہے اور صبر نہیں کر سکتا۔ مولانا رومیؒ کا کلام بہت طویل ہے لہٰذا تنگیٔ قرطاس کی بناء پر مزید کلام کا پیش کرنا مشکل ہے۔ ضرورت مند اصحاب ہماری تصنیف ''سوز و سازِ رومی'' کا مطالعہ کریں ۔

نفس تو تا مست نقلست و نبیذ　　دانکہ رُوحت خوشنہ غیبی ندید

(تیرا نفس جب تک نقل و شراب سے مست ہے یاد رکھ کہ تیری روح نے قرب حق کا غیبی خوشہ نہیں دیکھا) (م:۵، ۲۵۰)

کہ علامات ست زاں دیدارِ نُور　　اَلتَّجَا فِیْ مِنْکَ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ

(کیونکہ اس نور کے دیدار کرنے کی نشانیاں یہ ہیں کہ تجھ سے دھوکے کے گھر سے کنارہ کشی عمل میں آئے) (م:۵، ۲۵۰)

چوں بہ بیند نُورِ حق ایمن شود　　زاضطراباتِ شک او ساکن شود

(م:۵، ۲۵۰)

(جب وہ حقیقت (اللہ) کا نور دیکھ لیتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ شک کی بے چینیوں سے سکون پا جاتا ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس کا گدھا کودا اور پھاندر رہا ہے اس پر شریعت کا بوجھ ڈال کر اعتدال پر لاؤ۔ یہ ریاضت انسان کیلئے بہتر ہے۔ فرماتے ہیں بدن دوزخ کا ایندھن ہے اس کو کم کرو اور کوئی نئی لذت اس میں پیدا ہو جائے تو اسے بھی اکھاڑ پھینکو۔

بارِ سنگیں بر خرے کاں می جہد　　زود بر نہ پیش ازاں کو بر نہد

(۱۴۵/۵)

(جو گدھا کودا اور پھاندر رہا ہے اس پر جلد بھاری بوجھ رکھ دو (تاکہ وہ اعتدال پر رہے) اس سے پہلے کہ وہ پھینکے)

زھر تن را نافع ست و قند ند   تنِ ھماں بھتر کہ باشد بے مدد

(ریاضت کا زہر بدن کیلئے مفید اور عیش و تنعم کا قند مضر ہے بدن کیلئے یہی بہتر ہے کہ اس کو مدد نہ ملے)(۱۱۶/۵)

ھیزم دوزخ تنست و کم کنش   ور بروید ھیں تو از بُن بر کنش

(بدن دوزخ کا ایندھن ہے اس کو کم کرو اور اگر اس میں لذت جسمانی کی کوئی نئی شاخ اُگ پڑے تو اسے جڑ سے اکھاڑ دو) (۱۱۶/۵)

انبیائے کرام علیہم السلام نفسانی غصہ سے پاک ہوتے ہیں

انبیائے کرام علیہم السلام نفسانی غصہ سے پاک ہوتے ہیں۔ان کا غصہ لِوَجْہِ اللّٰہ ہوتا ہے جو کمالِ ایمان کی دلیل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے ابوذر رضی اللہ عنہ ایمان کا کونسا رشتہ زیادہ مضبوط ہے؟ انہوں نے عرض کیا۔اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔اللہ کیلئے لوگوں کے ساتھ معاونت کا برتاؤ رکھنا اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے محبت کرنا اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے بغض رکھنا ہے۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں میں سے ایک شخص کا کچھ قرض جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ آتا تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا: اس وقت میرے پاس دینے کیلئے کچھ نہیں ہے۔وہ کہنے لگا کہ میں تو آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرا قرض ادا نہیں کریں گے۔فرمایا تو پھر بیٹھ جاؤ۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی جگہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھیں۔اصحاب اس یہودی کو دھمکیاں دیتے رہے مگر وہ ٹلا نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو اصحاب کو اس سلوک سے منع فرمایا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایک یہودی آپ کو باندھے بیٹھا ہے''۔فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے غیر مسلم رعیت پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے۔روایت کے اتنے حصے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ''مغلوب خو'' ہونا معلوم ہو گیا کہ کس طرح تاجدارِ کونین و سردارِ دارین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رعایا میں سے ایک عام آدمی جو کہ مسلمان نہیں بلکہ یہودی ہے کے آگے اپنے آپ کو مجبور و مغلوب بنالیا۔اس مجبوری و مغلوبیت کی تہ میں کس قدر عظیم الشان غلبہ اور زبردست طاقت اپنا کام کر رہی تھی جس سے مغلوب خو کا غالب ہونا ثابت ہو گیا یعنی جب دن چڑھا تو وہ یہودی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور اس نے کہا: میں اپنا نصف مال اللہ کی راہ میں دیتا ہوں۔اللہ کی قسم میں نے جو کچھ کیا اس لیے کیا کہ آپ کے ان حالات کی آزمائش کروں جو میں نے تورات میں پڑھے ہیں کہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبداللہ کے بیٹے مکہ میں پیدا ہوں گے، مدینہ میں ہجرت کر کے جائیں گے، ان کی حکومت شام تک ہوگی، وہ بد

[1] سنن ابی داود، حدیث ۴۵۹۹، جلد ۴، صفحہ ۴۸۹۔

خو اور سنگدل نہ ہوں گے، نہ بازاروں میں غل مچانے والے، نہ برا کرنے اور نہ برا بولنے والے ہوں گے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

هر که باشد طالع او زآں نجوم — نفسِ اُو کفّار سوزد در رُجوم

(جس کا طالع ان ستاروں سے ہو اس کا نفس رجوم کے وقت کفار کو جلا دینے والا ہے) (۱/۱۰۴)

جو شخص ان نجوم سے فیض حاصل کرتا ہے وہ نفس امارہ کو مغلوب کرنے پر قادر ہوتا ہے جس طرح شہاب ثاقب شیطان کو مار بھگاتا ہے

خشمِ مریخی نباشد خشمِ اُو — مُنقلب رُو غالب و مغلوب خوُ

(اس کا غصہ مریخ ستارے (مریخ ستارہ کی تمثیل جنگ جوئی کی علامت ہے جو نفسانی غصہ کو ظاہر کرتا ہے) جیسا نہیں ہوتا (بلکہ بغض فی اللہ ہوتا ہے۔ وہ تواضعاً) سر جھکا کر چلنے والا (اور منصور من اللہ ہونے کی وجہ سے) غالب ہے اور (کمال حلم وعفو کے سبب) مغلوب خو (نظر آتا) ہے) (۱/۱۰۴)

عرض کن برمن شهادت را که من — مر ترا دیدم سَر افرازِ زمن

(پس حضور ﷺ مجھ کو کلمۂ شہادت پیش کیجئے کیونکہ میں آپ کو (اس وقت) تمام زمانہ میں افضل سمجھتا ہوں)

قُرب پنجه کس زخویش و قومِ اُو — عاشقانه سوئے دیں کردند رُو

(الغرض) تقریباً پچاس اشخاص اس کے اقرباو قبیلہ (قوم) میں سے کامل یقین کے ساتھ دین اسلام پر گامزن ہوگئے)۔ (۱/۴۰۳)

مضبوط ایمان والے ہی ضبطِ نفس کرتے ہیں

فرمانِ نبوی ﷺ ہے "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ" (تم میں سے کوئی ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں)[1] صحابہ کرامؓ کی آپ ﷺ کے ساتھ ایسی ہی محبت تھی۔ محبت کے ترازو میں ایک طرف آپ کی ذات پاک ہو اور دوسری طرف انسان کے ماں باپ تو آپ کا درجہ اس قدر بلند تر ہوگا کہ انسان ماں باپ کو آپ پر قربان کردے۔ یہ ان حضرات کا کمالِ ایمان محبت وعشق تھا جو ہر مومن کیلئے مامور بہ ہے۔ مذکورہ یہودی نے کہا ہے۔

تو تبار و اصلِ خویشم بودنه — تو فروغ شمعِ کیشم بُودنه

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۱۵، جلد ۱، صفحہ ۱۴۔

(میں اپنے خاندان کو چھوڑتا ہوں) آپ ہی میرے خاندان اور حقیقی قرابت دار ہیں اور میرے اس طریق دینداری کی شمع کا نور آپ ہی ہیں) (۴۰۳/۱)

اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے تعلق ہو تو نفس سے نجات ہوتی ہے

نفسِ امارہ ہمیشہ برائی کی طرف راغب کرتا ہے لہٰذا تم اس کے خلاف کرو کیونکہ دنیا میں پیغمبروں سے اسی طرح وصیت آئی ہے۔ نفس سے نجات چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق قائم کرلو کیونکہ (اس نفس کے) ہر سانس میں ایک مکر ہوتا ہے اور اس کے ہر مکر میں سینکڑوں فرعون اپنے تابعین کے ساتھ غرق ہو رہے ہیں۔ اگر تم ان مکروں سے بچنا چاہتے ہو تو موسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے خدا کی پناہ میں آجاؤ۔ اس موقع پر مولانا رومؒ کا کلام پیش کیا جا رہا ہے۔

ہر نفس مکرے و در ہر مکر زاں غرق صد فرعون با فرعونیاں

(اس نفس کے) ہر سانس میں ایک مکر ہوتا ہے اور اس کے ہر مکر میں سینکڑوں فرعون (جیسے شقی) مع اپنے تابعین کے غرق ہو رہے ہیں)

در خدائے موسیٰ و موسیٰ گریز آبِ ایماں را زفرعونی مریز

(نفس کے مکر سے بچنا چاہو تو) تو موسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے خدا (کی پناہ) میں دوڑو اپنے ایمان کی آبرو فرعونیت کے باعث نہ گراؤ)

دست را اندر اَحد و احمد بزن اے برادر وارہ از بوجہل تن

(بھائی! خداوند تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کے ساتھ تعلق پیدا کرو۔ (اور) بدن کے ابوجہل (یعنی نفس امارہ) سے نجات حاصل کرو) (۱۰۷/۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ضبطِ نفس کی وجہ سے کافر مسلمان ہو گئے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ دشمن کو زیر کرنے کیلئے حلم کی تلوار زیادہ طاقتور ہوتی ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر اسوقت تیغ آہن سے کام لیتے تو زیادہ سے زیادہ اس گبر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیتے جن سے آپ کا مقابلہ ہوا لیکن آگے ان لوگوں کی اولاد کی اولاد پر تو اس ضربِ شمشیر کا اثر نہ ہوتا اور وہ بدستور کفر کی زندگی بسر کرتے لیکن تیغِ حلم کی یہ غیر محدود فتوحات ہیں کہ نہ صرف وہ خود مسلمان ہو گئے بلکہ ان کی اولاد قیامت تک

حلقہ بگوش اسلام رہے گی۔

تیغ حلم از تیغ آهن تیز تر بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر
(۴۰۳/۱)

(واقعی) تیغ آہنی سے حلم کی تلوار زیادہ تیز ہے، بلکہ سینکڑوں لشکروں سے زیادہ موجب فتح ونصرت ہے)

گفت من تخم جفامی کاشتم من ترا نوعے دگر پنداشتم

(کہنے لگا کہ میں (آپ کے خلاف) تخم جفا بوتا تھا۔ میرا تو آپ کے متعلق کچھ اور ہی خیال تھا)(۴۰۳/۱)

اس کافر نے کہا کہ میں اس غلطی پر تھا کہ آپ لوگ محض حصولِ دولت اور فتح ممالک کی غرض سے جنگ و جہاد کر رہے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے جس کے انکشاف سے میں حیران رہ گیا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ضبطِ نفس

مبارز کے سوال کا جو جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں نیچے دیئے گئے شعر سے اصل جواب شروع ہوتا ہے یہاں علت کے لفظ سے اجمالاً سبب عزم کا تعین کیا ہے۔ چونکہ ابوتراب کے نام میں جو تراب یعنی مٹی کا لفظ داخل ہے یہ اس لحاظ سے پرلطف واقع ہوا ہے کہ مٹی سے بیل بوٹے اگتے ہیں اور پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی چیز کو خدا ہی کے حکم سے توڑ پھوڑ سکتے ہیں یعنی قتلِ انسان صرف قصاص اور جہاد وغیرہ ہی میں روا ہے جہاں یہ فعل حکم الٰہی کے ماتحت وقوع پاتا ہے۔ اس کافر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا تو اس کو چت کر لیا۔ چونکہ اب جہاد کرنا ذاتی مفاد کی خاطر ہو گیا تھا کہ اس نے میرے چہرہ پر تھوکا ہے اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنی ذات کی توہین دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا اور جذبۂ انتقام جوش زن ہو گیا جو اخلاص فی العمل کے منافی تھا۔

فرمایا روحِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اَلْمَوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ ''[۱] (محبت اور بغض خالصتاً اللہ کیلئے ہونا چاہیے)۔ اللہ کیلئے باہم معاونت کرنا اللہ کیلئے محبت کرنا اور اللہ کیلئے کسی سے بغض رکھنا منشأ اسلام ہے۔ ہم غصے کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور طاقت ور شخص بھی وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے نہ کہ وہ شخص جو ہزار من کا پتھر اٹھا لے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ کشتی گیری میں کمال رکھنے والا بہادر نہیں ہے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ [۲]

خشم بر شاهاں شه و مارا غلام خشم را من بسته ام زین و لگام

---

۱ صحیح بخاری، حدیث ۱۵، جلد ۱، صفحہ ۱۴۔ ۲ صحیح بخاری، حدیث ۵۷۶۳، جلد ۵، صفحہ ۲۲۶۷۔

(غصہ بادشاہوں پر حکمران ہے مگر ہمارا وہ غلام ہے ہم نے غصے پر زین ولگام لگا رکھی ہے) (۳۸۶/۱)

گفت امیر المومنینؑ با آں جواں | کہ بہنگامِ نبرد اے پہلواں
چوں تو خیو انداختی بر روئے من | نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

(امیر المومنین ؓ نے اس جوان سے فرمایا کہ اے پہلوان جنگ کے وقت تو نے جب میرے چہرے پر تھوک دیا تو میرا دل حرکتِ (غضبی) میں آ گیا اور میرا اخلق (حسن) بگڑنے لگا) (۴۰۲/۱)

تا اَحَبَّ لِلّٰہِ آید نامِ من | تا کہ اَبغَضَ لِلّٰہِ آید کامِ من

(تا کہ میرا خالصاً لوجہ اللہ محبت کرنیوالا نام قرار پائے تا کہ میرا مقصود خاص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے دشمنی کرنا ہو) (۳۸۶/۱)

تا کہ اَعطیٰ لِلّٰہِ آید جوُدِ من | تا کہ اَمسَکَ لِلّٰہِ آید بوُدِ من

(تا کہ میری سخاوت اللہ کیلئے ہو جائے اور تا کہ میری ہستی اللہ کیلئے روکنا ہو جائے) (۳۸۶/۱)

غرقِ نوُرم گرچہ سقفم شُد خراب | روضہ گشتم گرچہ ہستم بُوتراب

(میں (مرتبہ روح میں) سراپائے غرق ہوں۔ اگرچہ ریاضت سے میرا جسم زار و نزار ہو گیا ہے۔ میں (گلہائے معارف سے باغ ہو گیا ہوں اگرچہ (نام) کی وجہ سے ابوتراب (کہلاتا) ہوں) (۳۸۶/۱)

جُز ببادِ اُو نجنبد میلِ من | نیست جزُ عشقِ اَحد سرَخیلِ من

(یعنی) اس کی ہوا کے بغیر میرا جھکاؤ نہیں ہوتا اور بجز عشق الٰہی کے میرا کوئی پیشرو نہیں) (۳۸۶/۱)

تیغِ حِلمم گردنِ خشمم زدست | خشمِ حق بر مَن ہمہ رحمت شد ست

(میری تیغ حلم نے میرے غصے کی گردن کاٹ ڈالی ہے (اور) خشم خداوندی (بھی) میرے حق میں سراپائے رحمت بن گیا)۔ (۳۸۶/۱)

چوُں در آمد علتے اندر غزا | تیغ را دیدم میاں کردن سزا

(میرے جہاد میں جب ایک (نفسانی) علت شامل ہونے لگی تو اس وقت میں نے تلوار کو میان میں ڈال لینا مناسب سمجھا) (۳۸۶/۱)

گبر ایں بشنید و نورے شُد پدید | در دلِ اُو تا کہ زنّارش برید

(اس) کافر (حریف) نے جو یہ بات سنی تو اس کے قلب میں نور (ایمان) ظاہر ہوا جس سے اس نے اپنا زنارِ کفر توڑ ڈالا) (۴۰۳/۱)

نیم بہرِ حق شد و نیمے ھوا | شرکت اندر کارِ حق نبودِ رَوا

(پس میرا جہاد) کچھ تو اللہ کے واسطے رہ گیا اور کچھ (مقتضائے) خواہشِ نفسانی ہو گیا اور اللہ کے کام میں شرکت جائز نہیں) (۴۰۲/۱)

نقشِ حق را هم بامرِ حق شکن بر زجاجه دوست سنگِ دوست زن

(تو حق کا بنایا ہوا ہے) اور حق کے بنائے ہوئے نقش کو (اگر توڑنا چاہو) تو حق تعالیٰ ہی کے حکم سے توڑ سکتے ہو (نہ کہ اپنے نفس کے حکم سے) دوست کے شیشے پر دوست ہی کا پتھر مارنا چاہیے) (۴۰۲/۱)

بادِ کبرِ و بادِ عُجب و بادِ خلم برد اُورا که نه بُود از اهلِ علم

(تکبر کی ہوا اور خود پسندی کی ہوا اور سبک سری کی ہوا ایسے شخص کو ہلا ڈالتی ہے جو صاحبِ علم نہ ہو)

کوهم و هستی، من بُنیادِ اُوست ور شوم چُوں کاه بادم بادِ اُوست

(میں حلم و وقار میں گویا کوہ (پہاڑ) ہوں اور میرا وجود (حلم و وقار) کی اصل ہے۔ (اس لیے جنبش نہیں کھاتا) اور اگر میں کاہ (تنکا) بن جاتا ہوں تو (بھی نفس کی تحریک مجھ پر مؤثر نہیں ہوتی بلکہ میری (محرک) ہوا اللہ کے حکم کی ہوا سے (محکم) ہے) (۳۸۶/۱)

نفس کا علاج مجاہدات اور ترکِ لذات ہے

جس طرح مرغ بے ہنگام کو اس کی بانگِ بے وقت کے باعث ذبح کر دیا جاتا ہے اسی طرح فرعون کے دعوے بے ہنگام نے اس کو غرقِ دریا کرایا۔ غرقِ فرعون سے یہ درسِ عبرت ملتا ہے کہ دعویٰ خدائی ایک ناقابلِ عفو جرم ہے اور پھر عبرتِ عام کیلئے اس کی لاش کو دریائے نیل سے نکلوا کر ایک اونچے ٹیلے پر ڈال دیا گیا۔ اسی طرح نفس کو ذبح کرنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ نفس کو ریاضات و مجاہدات سے فنا کر سکتے ہیں تاکہ خود ہلاکت ابدی سے بچ جائیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے، تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے'' (الفرقان ۶۳)

نفس کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے ''اَعدٰی عَدُوِّکَ نَفسُکَ الَّتِی بَینَ جَنبَیکَ'' (تیرا بدترین دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے) [1]

---

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۴۔

ھیں سگِ ایں نفس را زندہ مخواہ　　کُو عدو جانِ تُست از دیر گاہ

(خبردار! اپنے کتے نفس کی زندگی نہ بن جا کیونکہ وہ مدت سے تمہاری جان کا دشمن ہے) (۲/۵۷)

سر بُریدن چیست؟ کُشتن نفس را　　در جہاد و ترک گفتن لمس را

(اب سوال پیدا ہوتا ہے) کہ نفس کو ذبح کرنے کی کیا تدبیر ہے (سو یہ) اس کو مغلوب کرنا ہے مجاہدات سے اور تمام لذاتِ نفسانیہ کو ترک کر دینا جن سے وہ طاقت پاتا ہے) (۲/۲۴۱)

روایات میں ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک بار اپنے نفس کو مخاطب کر کے پوچھا کہ اے نفس میں تجھے اس قدر لتاڑتا ہوں مگر تو پھر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا۔ نفس نے کہا کہ ہم کو آپ سے کچھ یاقوتی مل جاتی ہے ہم اس کی وجہ سے طاقتور بن جاتے ہیں۔ پوچھا کونسی یاقوتی؟ کہا کہ بس یہی کہ جب آپ بازار میں جاتے ہیں تو لوگ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آپ کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں تو اس میں ہمارا کام بن جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا اب میں تمہارا علاج کرتا ہوں ایک دن رمضان کے مہینے میں آپ نے برسرِ بازار ایک روٹی کا ٹکڑا منہ میں چبانا شروع کیا تو لوگ باتیں بناتے ہوئے آپ سے متنفر ہو کر چلے گئے، حالانکہ آپ سفر کا قصد کیئے ہوئے تھے اور حالتِ سفر میں روزہ معاف تھا۔ اس طرح اپنے نفس کا علاج کیا۔

ابتداء میں ہی نفس کی خواہشات کو مار دو

نفس ہمیشہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے جب آدمی نفس کی ہر بات ماننے پر آمادہ رہتا ہے تو نفس کو ان باتوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ پھر خود بخود اس کے دل میں اس قسم کی بری خواہشات پیدا ہونے لگتی ہیں، جن میں بدنظری، شوقِ زنا، ظلم، ایذائے خلق، حرصِ طعام، خواہشِ ترفع وافتخار وغیرہ وغیرہ ہزاروں برائیاں ہیں۔ جب کوئی ناصح ان برائیوں سے اس کو منع کرتا ہے تو اس کو برا معلوم ہوتا ہے اور کسی کی اتباع اس کو پسند نہیں آتی۔ یہی تکبر ہے اور اسی سے ناصح و مانع سے بغض پیدا ہوتا ہے۔ جب عادت کی وجہ سے کوئی بری خصلت پختہ ہو جائے تو جو شخص تم کو اس سے منع کرے اس پر تم کو غصہ آتا ہے۔

ابتدائے کبر و کیں از شہوت ست　　راسخیٔ شہوتت از عادت ست

(تکبر اور بغض کی ابتداء خواہش نفسانی سے ہے اور تیری خواہش نفسانی کی پختگی (اتباعِ نفس کی) عادت سے ہے) (۲/۳۲۴)

زانکہ خُوئے بد بگشتت استوار　　مورِ شہوت شُد زعادت ھمچو مار

(کیونکہ بری خصلت تم میں محکم ہو چکی ہے خواہشاتِ نفسانیہ کی یہ چیونٹی عادت کی وجہ سے سانپ بن گئی ہے) (۲/۳۲۵)

مارِ شہوت را بکُش در ابتداء ورنہ اینک گشتہ مارت اژدھا

(اب بھی ہمت کرو اور خواہشات نفسانیہ کے (اس) سانپ کو شروع ہی میں مار ڈالو ورنہ دیکھنا تمہارا یہ سانپ اژدہا بن جائے گا) (۲/۳۲۶)

مادرِ بُتہا بُتِ نفس شُما ست گزانکہ آں بُت مار و ایں بت اژدھا ست

(تمہارا بت نفس (سارے) بتوں کی ماں ہے کیونکہ وہ بت سانپ ہے اور یہ اژدہا ہے) (۱/۱۰۶)

نفس میخواھد کہ تا ویراں کند (نفس دینی بنیاد کو ویران کرنا چاہتا ہے)

نفس ہمارا ایک چھپا دشمن ہے، پس دشمن کے مشورے پر کیوں کر عمل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے خلاف چلنا چاہیے، ہر چند کہ نفس کا مشورہ قابل عمل نہیں مگر وہ بھی فائدے سے خالی نہیں کیونکہ جب اس کے مشورہ کا الٹ کرنا مفید ہے تو اس طریقہ سے فائدہ کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے بخلاف اس کے اگر نفس کا مشورہ نہ ہوتا تو تذبذب رہتا کہ یہ کام کریں یا نہ کریں۔ جب نفس مشورہ دیتا ہے تو اس کی مخالف جہت عمل کیلئے متعین ہو جاتی ہے اور تذبذب رفع ہو جاتا ہے۔

نفس امارہ ہمیشہ برائی کی طرف مائل رہتا ہے۔ طاعات وعبادات میں اگرچہ یہاں مشقت ہے لیکن آخرت میں اجر وثواب متوقع ہوتا ہے لیکن نفس اس کو ہرگز گوارا نہیں کرے گا بلکہ ان کو چھوڑ دینے کا مشورہ ہی دے گا۔ لہٰذا اس کی بات مت سنو۔ (شیخ سعدیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ نفس امارہ جو کہے تم اس کے خلاف کرو۔ کیونکہ دنیا میں پیغمبروں سے اسی طرح وصیت آئی ہے دیکھو وصیت کے مطابق معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہوتا ہے تاکہ بلا مشورہ کام کرنے سے آخر میں پشیمانی نہ ہو۔ نفس جو کچھ کہتا ہے بطور مشورہ کہتا ہے اور مشورہ سننے اور ماننے کا تو بے شک حکم ہے اور مشورہ کرنا واجب ہے مگر نفس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں بلکہ لائق مخالفت ہے)۔

آنچہ گوید نفس تو کاینجا بدست مشنوش چوں کار او ضد آمدست

(جو کچھ تمہارا نفس کہے کہ یہاں (یہ کام) برا ہے۔ تو اس کی مت سنو کیونکہ اس کا کام (مصلحت کے خلاف ہے) (۲/۲۱۹)

نفس میخواھد کہ تا ویراں کند خلق را گمراہ و سرگرداں کند

(کم بخت نفس (باغوائے شیطان) چاہتا ہے کہ (اس دینی بنیاد کو) تباہ کر دے (اور) مخلوق کو گمراہ اور سر گرداں کر دے) (۲/۲۱۹)

مشورت با نفس خویش اندر فعال ہر چہ گوید عکس آں باشد کمال

(مشورہ نفس کے ساتھ (ہرقسم کے) کاموں میں (کرسکتے ہو مگر) جو کچھ وہ کہے اس کے خلاف (کرنا شرطِ) کمال ہے) (۲/۲۱۹)

روح در عین است و نفس اندر دلیل

(روح مشاہدہ میں ہے اور نفس دلیلوں میں ہے)

کافر بادشاہ (نمرود) آگ سے مخاطب ہوا اور بولا کہ اے تندخو تیری وہ جہان کو جلا دینے والی خصلت کہاں گئی۔ تو کیوں نہیں جلاتی؟ تو اپنی پرستش کرنے والے پر بھی رحم نہیں کرتی، پھر وہ شخص تجھ سے کیونکر نجات پا گیا جو تجھ کو پوجتا بھی نہیں۔ کسی چیز کے جلانے پر تو قادر نہیں تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے کہ تیرا اتنا بلند شعلہ جلاتا کیوں نہیں؟ آگ بولی میں وہی آگ ہوں؟ تو ذرا اندر تو آ تا کہ میری تپش کا مزہ چکھ لے۔ میں خدائی تلوار ہوں اس کی اجازت ہی سے کاٹتی ہوں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خیمے پر تیر کمان والے لوگوں کے کتے مہمان کے آگے تو خوشامد کرتے اور دم ہلاتے ہیں اور اگر خیمے کے پاس سے کوئی اجنبی صورت کا آدمی گزرتا ہے تو کتوں کو شیر کی طرح حملہ آور پاتا ہے۔ میں خدا کی غلامی میں کتے سے کم نہیں ہوں۔ مجھ پر زندگی میں ایک ترک سے کم خدا کا حق نہیں جو وہ کتے پر رکھتا ہے۔ انسان کے جذباتِ طبع بھی جو باطنی آگ ہیں اسی کے حکم کے تابع ہیں اور انسان کو کبھی مغموم اور کبھی مسرور اسی کے حکم سے بناتے ہیں۔

چوں سزائے آں بُت نفس او نداد از بُتِ نفسش بتے دیگر بزاد

(چونکہ اس (بادشاہ) نے (اپنے) اس بت یعنی نفس کو سزا دی تھی (اس لیے) اس کے نفس کے بت سے (یہ) ایک اور بت پیدا ہوگیا) (۱/۱۰۶)

طبع من دیگر نگشت و عُنصُرم تیغ حقم ہم بدستوری بُرم

(میری طبیعت اور میری اصل نہیں بدلی میں خدائی تلوار ہوں، (لیکن) اجازت ہی سے کاٹتی ہوں) (۱/۱۱۲)

نفس نمرود ست و عقل و جاں خلیلؑ روح در عین ست و نفس اندر دلیل

(نفس نمرود ہے اور عقل اور روح (بمنزلہ) خلیل اللہ ہیں (ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ) روح مشاہدہ (حق) میں (مستغرق) ہے اور نفس استدلال (کے چکر) میں (سرگرداں) ہے) (۲/۳۱۱)

نار پاکاں را ندارد خود زیاں کے زخاشاکے شود دریا نہاں

(پاک لوگوں کو آگ نقصان نہیں پہنچا سکتی (دیکھو) دریا کوڑے کرکٹ میں کب چھپ سکتا ہے؟) (۱/۳۷۷)

تا ز نارِ نفس چوں نمرودِ تو وارہد ایں جسم ہمچوں عودِ تو

(تا کہ تیرے اس نمرود (سرکش) نفس کی آگ سے تیرا یہ لکڑی کا جسم نجات پائے) (۳۷۶/۱)

چہ کشد ایں نار را نورِ خدا نورِ ابراھیم را ساز اُوستا

(اس آگ کو کیا چیز بجھا سکتی ہے (نور عشق) الٰہی بجھا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (یعنی مرشد کامل) کے نور کو استاد بنالو (پھر وہ نور حاصل ہو جائے گا) (۳۷۶/۱)

نفس مکار است مکرے زایدت

(نفس مکار ہے، (نماز کا حکم دے تو بھی) مکر میں مبالغہ کرتا ہے)

جس چیز کی سرشت بری ہو اس سے اگر کوئی اچھی بات بھی سرزد ہو جائے تو احتمال ہے کہ اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی برائی ہوگی، جس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کو صبح کی نماز میں دیر ہوگئی۔ شیطان آکر ان کے پاؤں دبانے لگا تاکہ جاگ کر نماز پڑھ لیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ کھلی تو حیران ہوئے کہ ہائے شیطان! اور نماز کیلئے جگائے؟ شیطان بولا میرا مقصد آپ کو نماز کیلئے جگانا نہیں بلکہ آپ کو اس تضرع و ابتہال اور رجوع انابت سے باز رکھنا مقصود ہے جو آپ سے نماز کے قضا ہو جانے کی صورت میں وقوع پاتی ہے اور اس سے آپ کے مدارجِ قرب میں اور ترقی ہوتی ہے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مولاناؒ کے بہت سے اشعار ہیں مگر یہاں دو پر اکتفا کیا گیا ہے۔

نفس خود را زن شناس از زن بتر زانکہ زن جزو ست نفست کُلِّ شر

(اپنے نفس کو (بھی) عورت سمجھو (بلکہ) عورت سے بھی بدتر ہے کیونکہ عورت (میں) تو (شر کا) ایک حصہ ہے اور نفس سراپا شر ہے) (۲۱۹/۲)

گر نماز و روزہ می فرمایدت نفس مکارست مکرے زایدت

(اگر تجھ کو نماز و روزہ کی ترغیب دے تو بھی (یاد رکھو) نفس مکار ہے تم سے کوئی نہ کوئی مکر کھیل رہا ہے) (۲۱۹/۲)

نار شہوت را چہ چارہ نور دیں (شہوت کی آگ دین کے نور سے بجھتی ہے)

یہ اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ "جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَاءَ نُوْرُکَ لَھَبِیْ"[1] یعنی اے مومن جلدی آگے گزر جا کیونکہ تیرے نور سے میری آگ بجھ جائے گی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث

---

[1] المعجم الکبیر، حدیث ۶۶۸، جلد ۲۲، صفحہ ۲۵۸۔

کی تحقیق نہیں۔نورِ دین سے نورِ معرفت مراد ہے جو ریاضت مجاہدات اور مراقبات سے باطن میں پیدا ہو جاتا ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

نار شہوت راچہ چارنہ نور دین نُوْرُ کُمْ اِطْفَآءُ نَارِ الْکٰفِرِیْنَ

(اس آتشِ شہوت کا علاج کیا ہے(اس کا علاج) دین کا نور ہے(جیسے کہ) تمہارا نورِ (ایمان) کافروں کی آگ (یعنی آتش دوزخ) کو (تم پر) ٹھنڈا کر دے گا) (۳۷۶/۱)

ھر کہ تریاقِ خُدائے را بخورد گر خورد زھرے مگویش کو بُمرد

(جس نے خدائی تریاق کھالیا اگر وہ زہر بھی کھائے گا تو اس کو یہ نہ کہو کہ مر گیا) (۳۷۷/۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مضر اشیاء کا استعمال اور مباحات میں توسیع کاملین کو مضر نہیں، ناقصین کیلئے موجب ضرر ہے۔

خود بینی کا انجام موت ہے

مولاناؒ ایک شیر بھیڑیے اور لومڑی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیر نے شکار مارا اور بھیڑیے کو کہا کہ تم اس شکار کے حصے کر دو بھیڑیے نے وحشی گائے کو شیر کے حصے میں جانے کو کہا اور بکری خود اپنے لیے منتخب کر لی اور لومڑی کو خرگوش دے دیا۔ جب شیر نے اس کی نیت بد کو بھانپ لیا تو بھیڑیا شیر سے بحث کرنے لگا جس پر شیر کو غصہ آ گیا۔ مطلب یہ کہ نفس بھی انسان سے بحث کرتا ہے اور اس کو غلط بات کی طرف لے آتا ہے۔ اس بحث کی وجہ سے شیر نے بھیڑیے کو پنجہ مار کر ختم کر دیا۔

(گفت) شیرا ے گرگ ایں رابخش کن معدلت را نو کن اے گرگ کہن

(شیر نے کہا اے بھیڑیے اسے تقسیم کر، اے خرانٹ بھیڑیے انصاف (کی رسم) تازہ کر) (۳۱۸/۱)

نائب من باش در قسمت گری تا پدید آید کہ توچہ گوھری

(تقسیم کرنے میں میرا قائم مقام بن جا تا کہ معلوم ہو جائے کہ تو کیسی اصل و نسل سے ہے) (۳۱۸/۱)

گفت اے شہ گاؤ وحشی بخش تست آں بزرگ و تو بزرگ و زفت و چُست

(بھیڑیے نے عرض کیا حضور! گاؤ وحشی تو آپ کا حصہ ہے کیونکہ یہ بڑا مال ہے اور آپ بھی (ماشاءاللہ) بزرگ اور عظیم اور شہ زور ہیں) (۳۱۸/۱)

بُز مَرا کہ بز میانہ است و وسط رُوبہا! خر گوش بستاں بے غلط

(بکری میری ہے کیونکہ بکری درمیانہ اور اوسط درجے کی ہے۔ اری لومڑی خرگوش تو لے لے ان کی تقسیم میں کوئی غلطی (کا احتمال) نہیں) (۳۱۸/۱)

شیر گفت اے گرگ چوں گفتی بگو | چونکہ من باشم تو گوئی ما و تو

(شیر نے (غضبناک ہوکر) کہا ارے بھیڑیے ہماری موجودگی میں تو تو میں میں کیا بک رہا ہے ان کا جواب دے؟) (۳۱۸/۱)

گرگ خود چہ سگ بود کو خویش دید | پیش چوں من شیر بے مثل و ندید

(بھیڑیا کون کتا ہے جو خود کو دیکھے اور مجھ جیسے بے مثل و بے نظیر شیر کے آگے خود بینی کرے) (۳۱۸/۱)

گفت پیش آ اے خرے کو خود خرید | پیشش آمد پنجۂ زد اورا درید

(پھر کہا! ارے بے وقوف گدھے تو جو خود بینی کرتا ہے ذرا آگے ہو (بھیڑیا) اس کے پاس جو ہوا تو شیر نے پنجہ مار کر اس کو چیر ڈالا) (۳۱۸/۱)

معجزہ بیند فروزد آں زماں

(نفس معجزہ دیکھ کر مان جاتا ہے اور پھر اسے وہم قرار دیتا ہے)

نفس کمینہ کہتا ہے کہ معجزہ تو ایک خیالی و وہمی امر ہے، حقیقی اور واقع فی الخارج نہیں ہے۔ اگر اس میں واقعیت ہوتی تو اس کو ضرور بقا ہوتا اور اس کا وجود اب بھی اسی طرح ہماری نظر میں ہوتا مگر احمق اتنا نہیں سمجھتا کہ معجزات تو وقتی ہوتے ہیں۔ جب طلب کئے گئے تو ان کا ظہور ہوا۔ پھر ختم ہو جاتے ہیں جیسے شق القمر کا معجزہ کہ جب کفار نے شق القمر کی استدعا کی تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ جن کو انھوں نے بچشم خود دیکھا بس مدعا پورا ہوا اور دونوں ٹکڑے باہم ہو گئے۔ سوفسطائی کی طرح نفس بھی کہتا ہے کہ اگر فی الواقع دو ٹکڑے ہوئے تھے تو وہ اسی طرح دو ہی قائم رہتے۔ پھر ان کے باہم مل جانے اور اصلی حالت پر آ جانے سے معلوم ہوا کہ وہ جدا ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ ایک محض خیال ہے۔ نہیں یہ خیال نہ تھا بلکہ وہ ایک امر واقعی ہے اور ہر وقت دکھائی دیتا ہے مگر پاک لوگوں کی نگاہ میں بسا ہوا ہے انہی کو دکھائی دیتا ہے۔ حیوان لا یعقل مثل سوفسطائی کی آنکھ میں بسا ہوا نہیں۔

ور حقیقت بود آں دید عجب | چوں مقیم چشم نامد روز و شب

(اور اگر وہ عجیب نظارہ (واقعی اور) حقیقی ہوتا تو پھر رات دن اسی طرح برابر آنکھ میں سمایا رہتا) یعنی آنکھ اس کو دیکھتی رہتی اور وہ غائب نہ ہوتا) (۳۲۸/۲)

معجزہ بیند فروزد آں زماں | بعد ازاں گوید خیالے بود آں

(نفس) معجزہ کو دیکھتا ہے تو اس وقت تو (نورِ اعتراف سے) منور ہو جاتا ہے (مگر) اس کے بعد (جب اپنی جبلت پر آ جاتا ہے تو) کہنے لگتا ہے وہ تو (محض) ایک خیال تھا) (۲/۳۲۸)

نفس سوفسطائیوں کا چیلہ ہے، زدوکوب کے بغیر صحیح نہیں ہوگا

یہ حضرات جو عقل شریف کے مالک ہیں وہ سراپائے عقل ہیں اور نفس سے منزّہ ہیں۔ حواس ظاہری کے مقتضیات سے بے نیاز اور انوار روحانیہ سے نورٌ علیٰ نور ہیں پھر ان پر تہمت کیسی کیونکہ تہمت تو بندۂ نفس اور پابند حواس پر ہی لگائی جا سکتی ہے۔ جس طرح علمائے کرام کے نزدیک سوفسطائیہ کا علاج زدوکوب اور خرق وغرق کے سوا اور کوئی نہیں۔ ڈنڈا پیر اور اگنی دیوی اپنی حقیقتیں بآسانی منوا سکتے ہیں۔ اسی طرح نفس بھی انہی سوفسطائیہ کا چیلہ ہے۔ یہ لاتوں کا بھوت باتوں سے ماننے والا نہیں۔ لہٰذا یہ بھی سزا کا مستوجب ہے جس کی صورت ریاضت ومجاہدات ہے۔ سوفسطائی فرقہ سوفسطائیہ سے منسوب فلاسفہ کا ایک توہم پرست فرقہ ہے، وہ حقائق اشیاء کا منکر ہے۔

مُتَّہم نفس ست نے عقلِ شریف گمُتَّہم حِس ست نے نُورِ لطیف

(تہمت نفس پر ہے نہ کہ عقل شریف پر (اور) تہمت حس (ظاہری) پر ہے نہ کہ (روح کے) نور پاکیزہ پر)

نفسِ سو فسطائی آمد میزنش کش زدن سازد نہ حجت گفتنش

(نفس (بھی) سوفسطائی (فرقہ والوں کی طرح حقائق کا منکر اور اپنے شک کا مقلد) ہے۔ (لہٰذا) اس کو (خوب) پیٹو کیونکہ اس کیلئے مار پیٹ سازگار ہے نہ کہ اس کے آگے دلیل پیش کرنا) (۲/۳۲۸)

اگر نفس کی تصویر دیکھنا چاہو تو دوزخ کا حال پڑھ لو

دوزخ کے سات دروازے اس کے شرور وآفات کی کثرت پر دال ہیں۔ اسی طرح نفس بھی مجمع شرور ومفاسد ہے بلکہ دوزخ کے شرور نفس کے شرور کے نتائج ہیں۔ پتھر اور لوہا اپنی ذات کے اندر آگ رکھتے ہیں۔ ان کی آگ پر پانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نفس کے رذائل مخفی ہیں اور وہ سرسری تدابیر سے زائل نہیں ہو سکتے۔ باہر کی آگ تو نہر کے پانی سے بجھ سکتی ہے مگر وہ پانی پتھر اور لوہے کے اندر کیونکر جائے۔ جس طرح شرارے کی حرارت ظاہری ہے اس لیے وہ پانی سے ساکن ہو سکتی ہے اور سنگ وآہن کا مادہ ناریہ ہے جو اس کی ذات میں ہے اسے پانی سے ساکن نہیں کیا جا سکتا اسی طرح بت کا شر اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں بلکہ بت پرست کے فعل پر موقوف ہے اور نفس کا شر اس کی ذات میں ہے۔

صُورتِ نفس ار بجوئی اے پسر　　　قصّۂ دوزخ بخواں با ھفت دَر

(بیٹا! اگر نفس کی تصویر (دیکھنی) چاہو تو دوزخ کا حال پڑھ لو جس کے سات دروازے ہیں) (۱۰۷/۱)

آھن وسنگ ست نفس و بت شرار　　　آں شرار از آب می گیرد قرار

سنگ و آھن زآب کے ساکن شود　　　آدمی با ایں دو کے ایمن شود

(نفس (تو گویا) لوہا اور پتھر ہے (جن کے باہم ٹکرانے سے آگ جھڑتی ہے) اور بت (ان سے جھڑنے والی) چنگاری ہے۔ وہ چنگاری تو پانی سے بجھ سکتی ہے (مگر) پتھر اور لوہا پانی سے کب سکون پاتے ہیں اور (اگر ان کو پانی سے تر بھی کیا جائے تو) آدمی ان دونوں کے ہوتے ہوئے کب مطمئن ہو سکتا ہے (کہ یہ ٹکرائیں اور آگ نہ نکلے) (۱۰۶/۱)

پیش حق آتش همیشه در قیام
(اللہ کے حضور آگ بھی عاشق کی طرح حاضر رہتی ہے)

لوہے اور پتھر کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراؤ کیونکہ یہ دونوں مرد و زن کی طرح باہم مقرون ہو کر نتائج بد کا بچہ جنتے ہیں۔ سنگ و آہن کے ذکر میں ضمناً مولانا یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ کسی پر ظلم نہ کرو۔ اس سے بہت برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ظلم سے نتائج بد پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک گناہ کی وجہ سے ظالم کے سر پر اور بہت سے گناہوں کا بوجھ آن پڑتا ہے۔ بے شک لوہا اور پتھر آگ کا سبب ہیں کیونکہ اس سبب کو بھی اسی مسبب نے مہیا کیا ہے۔ کوئی مسبب بھلا آپ سے آپ سبب کب بن سکتا ہے؟ تمام موجوداتِ حادثہ کا وجود اسباب و علل کے سلسلہ سے وابستہ ہے کیونکہ ہر حادث کیلئے کسی محدث کا ہونا لازم ہے جو اس کا سبب ہے۔ کبھی اس سبب کا بھی کوئی اور سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح دور تک سلسلہ چلا جاتا ہے اور اس سلسلۂ اسباب کی انتہا کسی مسبب الاسباب قدیم تک ہونی ضروری ہے تاکہ تسلسل لازم نہ آئے جو باطل ہے اور وہ سبب قدیم اسماء و صفات الٰہیہ ہیں جن سے عالم میں حوادث پیدا ہوتے ہیں۔

پیش حق آتش همیشه در قیام　　　همچو عاشق روز و شب پے جاں مُدام

(حق تعالیٰ کے حضور میں آگ ہمیشہ رات دن ایک عاشق ہیجان کی طرح (خدمت و اطاعت کیلئے حاضر) کھڑی رہتی ہے) (۱۲/۱)

سنگ بر آھن زنی آتش جهد　　　هم بامر حق قدم بیروں نهد

(تم لوہے پر پتھر مارتے ہو تو (اس سے) آگ نکلتی ہے (یہ) بھی خدا کے حکم سے نکلتی ہے) (۱۱۲/۱)

کسی صاحبِ دل کے پاس اپنے نفس کی اصلاح کراؤ

انسان کو اپنا آپ محبوب ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے اخلاقی مصائب کو معلوم نہیں کر سکتا۔ آنکھ خود اپنے عیب کو نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا یہ مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے کہ اپنی تفتیشِ عیوب کا کام کسی صاحب دل کے سپرد کر دو وہی ان کی اصلاح بھی کر دے گا۔

لیک ہر کس مُور بیند مار خویش تو ز صاحبدل کُن استفسار خویش

(لیکن (مشکل یہ ہے کہ) ہر شخص اپنے (خصائل کے) سانپ کو چیونٹی جیسا دیکھتا ہے (پس اس مشکل کا حل یہ ہے کہ) تم (کسی) صاحبدل سے اپنے (باطنی حال کے) متعلق سوال کرو) (۲/۳۲۶)

تا نہ شُد زر مس نداند مَن مسِیم تا نہ شُد شہ دل نداند مُفلسِم

(تانبا جب تک سونا نہ بن جائے وہ نہیں جانتا کہ میں تانبا ہوں (اسی طرح) دل جب تک بادشاہ نہ بن جائے وہ نہیں سمجھتا کہ میں مفلس ہوں) (۲/۳۲۶)

نفس چوں با شیخ بیند گام تو گاز بُن دنداں شود اُو رام تو

(نفس جب تیرا قدم شیخ کے ساتھ دیکھے گا تو مجبوراً تیرا فرمانبردار ہو جائیگا) (۳/۲۴۶)

نفس عقلِ ناقص کو مغلوب کر دیتا ہے

خواہشاتِ نفسانی کے غلبہ میں عقل سے کام ہی نہیں لیا جاتا۔ خود عقلِ ناقص میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ نفس کے معاملات میں دخل دے کر اس کے مفاسد کے تار و پود کو بکھیر دے۔ اگر اس کمزور عقل کی کوئی دھیمی آواز مبتلائے نفس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور راہِ ثواب کی طرف مائل کرتی ہے تو مصاحب بد کی صحبت کا بداثر پھر اس کو ہوائے نفسانی کے اتباع پر مائل اور عقل کی آواز کو مغلوب کر دیتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

نفس چوں با نفس دیگر یار شد گعقل جزوی عاطل و بیکار شُد

(ایک نفس (بد) جب دوسرے نفس (بد) کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تو (جس شخص کی) عقل ناقص ہوتی ہے بے کار اور نکمی ہو جاتی ہے (اس کو برے نتائج پر تنبیہ نہیں کر سکتی)۔

اپنی نگاہوں کو شہوات سے بچانے کیلئے بند رکھو

نیچے دیئے گئے شعر کے دوسرے مصرعے میں سورۂ نور کی اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے پیغمبر ﷺ مسلمانوں کو کہو کہ اپنی آنکھوں کو (نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے) بند رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کو بدکاری سے محفوظ رکھیں۔ یہ ان کیلئے بہت پاکیزہ بات ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا

ہے'' (دیکھیں سورۂ النور آیت ۳۰) مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اپنے قوائے مدرکہ کو حفظ وضبط میں رکھو اور ان کو اوراکاتِ فاحشہ کی طرف ملتفت نہ ہونے دو۔ آنکھ جو جسم کے سوراخوں میں سے ایک سوراخ ہے اس کو بند رکھو کہ دل کی خرابی اس راستے سے آتی ہے۔

لولہا بربند و پُر دارش زخُم گفت غُضُّوا عَنْ هَوٰى اَبْصَارَكُمْ

(اس کی) ٹونٹیاں (شہوات سے روک کر) بند کر دو اور ان کو خم (مٹکے کے پانی) سے پُر رکھو (قرآن مجید) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''یَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ '' (اپنی نگاہوں کو شہوات سے بند رکھو) (النور:۳۰)

آگ، مٹی، پانی اور ہوا سب اللہ کے غلام ہیں

(ہمارے لیے وہ مردہ ہیں لیکن اللہ کیلئے زندہ ہیں)

ہوا، مٹی، پانی اور آگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلتے ہیں۔ ان میں بھی ادراک اور حس ہے۔ اگرچہ ہم کو ان کا مدرک ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے محدود و ناقص علم کی بناء پر چند خاص اوصاف کو آثارِ حیات سمجھ رکھا ہے۔ جن اشیاء میں وہ آثار ہم کو نظر آتے ہیں ان کو زندہ سمجھتے ہیں اور جن میں نہیں ان کو بے جان تصور کرتے ہیں حالانکہ اللہ کا علم اور قدرت ہماری معلومات سے کہیں زیادہ وسیع ہے جن چیزوں کو ہم بے جان سمجھتے ہیں اللہ کے علم وقدرت میں وہ زندہ ہیں۔ اللہ فرماتا ہے'' بے شک پتھروں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف کے مارے گر پڑتے ہیں'' (البقرۃ:۷۴)۔ سورۂ الحشر کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہے'' اگر ہم قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو اللہ کے خوف سے ڈرتا اور پاش پاش ہوتا دیکھتے''۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ ''طَلَعَ لَهُ اُحُدٌ فَقَالَ هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ'' (نبی ﷺ کے سامنے کوہ اُحد نمودار ہوا تو فرمایا یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔[1] قرآن وحدیث کے علاوہ اہل کشف کے نزدیک بھی جمادات کا زندہ ہونا مسلمہ ہے۔ صرف اہلِ فلسفہ اس کے منکر ہیں۔

باد و خاک و آب و آتش بنده اند با من و تو مُرده با حق زنده اند

(ہوا، مٹی، پانی اور آگ (خدا کے) غلام ہیں۔ (گو) یہ ہمارے تمہارے آگے بے جان ہیں مگر اللہ کے آگے زندہ ہیں) (۱/۱۱۴)

کسب فانی خواهدت ایں نفسِ خس

(نفس فانی چیزوں کے تاک میں رہتا ہے)

نفس ہمیشہ ذلیل و ناشائستہ مشاغل کی ترغیب دیتا ہے پس ایسے مشاغل کو ترک کرتے رہو۔ نفس اگر کسی

[1] صحیح بخاری، حدیث ۳۱۸۷، جلد ۳، صفحہ ۱۲۳۲۔

اچھے شغل کی ترغیب دے تو اس سے دھوکا نہ کھانا اس میں بھی اس کا کوئی نہ کوئی فریب ہوتا ہے۔ نفس دنیا کمانے پر مرمٹ رہا ہے جو کہ فانی ہے، حقیر ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ" (اگر دنیا کی قدر اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے ایک گھونٹ بھی نہ پینے دیتا)[1] فرمایا کہ جس نے اپنی دنیا کو محبوب رکھا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی آخرت کو محبوب رکھا اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا۔ پس تم باقی کو فانی پر ترجیح دو۔[2]

حضرت امیر معاویہ ؓ شیطان کی ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ شیطان نے آکر ان کو جگایا کہ اٹھ کر نماز پڑھ لیجئے۔ انہوں نے کہا سچ بتا تو نے طاعت کی ترغیب کیوں دی تیرا شیوہ یہ نہیں ہے۔ پہلے پہلے تو اس نے بہت کچھ ٹال مٹول کی مگر چونکہ امیر معاویہ ؓ کامل تھے اس کے پھندے میں نہ آئے۔ آخر اس نے اپنے مکر کا اقرار کیا۔ نفس کا ایک مکر ہوتا ہے نفس اگر روزہ نماز کی ترغیب دے تو اس کا اصل مقصد نماز و روزہ کی تعلیم نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ نفسِ مطمئنہ نہ بن جائے۔ اس عبادت سے سالک کے اندر غفلت اور غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو ریاضات و مجاہدات سے بے نیاز سمجھنے لگتا ہے جب یہ چیزیں پیدا ہو جائیں تو گرفتار معاصی کر دینا نفس کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ یاد رکھو کہ نفس مکار ہوتا ہے جو فیصلہ کرو اس ذلیل کمینے کے خلاف کرو۔ نفس، ارے تو نے ہزاروں سوئے ہوئے فتنے جگائے ہیں نمرود کا بھیجا بھی تیرے ہی سبب نکلا۔ تیری وجہ سے فرعون سا ہوشیار حکیم بھی عقل کا اندھا ہو گیا اور خدا کی شناخت سے بہرہ مند نہ ہوا۔

کسبِ فانی خواہدات ایں نفسِ خس   چند کسبِ خس کنی بگذار و بس

(۲/۲۲۸)

(تیرا یہ کمینہ نفس فنا ہو جانے والی کمائی کرنا چاہتا ہے اس کو چھوڑ دو کب تک یہ ذلیل کمائی کرتے رہو گے)

خلق اطفالند جز مستِ خدا

(مخلوق سب سوائے مستِ الٰہی کے گویا بچے ہیں)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق کے لوگ بچے ہیں یعنی بالغ نہیں ہیں۔ آپ نے تمام مخلوق میں سے مجذوب لوگوں اور محبوبانِ الٰہی (بندگان الٰہی) کو اس بات سے نکال دیا ہے یعنی ان لوگوں کے علاوہ سب لوگ بچے ہیں۔ بالغ لوگ وہی ہیں جو نفسانی خواہشات سے جان چھڑا چکے ہیں۔ جو آدمی بالغ بننا چاہے یا اپنے

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۲۳۲۰، جلد ۴، صفحہ ۵۶۰۔ [2] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۴۔

آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ اس کو چاہیے کہ نفسانی خواہشات پر کنٹرول کرے۔ اگر اس نے خواہشاتِ نفس پر کنٹرول کر لیا تو وہ بھی بالغ لوگوں میں شامل ہو گیا۔

خلق اطفال اند جُز مستِ خُدا نیست بالغ جُز رہیدہ از ھوَا

(۱/۳۵۴)

(مخلوق سب سوائے مستِ الٰہی کے گویا بچے ہیں۔ پس بالغ وہی ہے جو خواہشاتِ نفسانیہ سے چھوٹ گیا)

باب نمبر۱۴

انسان پر غلبۂ شیطانیہ

شیطان کا معنٰی بہ اعتبار لغت

اَلشَّیْطَانُ کا لفظ شَطَنَ سے ماخوذ ہے، جس کے معنٰی خیر سے دُور ہونا کے ہیں۔ چونکہ شیطان انسان کو ہر خیر اور بھلائی کے کام سے دور کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور خود بھی خیر سے اور اللہ تعالیٰ سے دور ہے اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔[۱] ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہر شخص جو گمراہ اور سرکش ہو وہ بھی شیطان ہے جیسے اللہ رب العزت نے فرمایا ''وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○''[۲] (اور جب وہ (منافق) اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں، ہم (مسلمانوں کا تو) محض مذاق اڑاتے ہیں)۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں شیطان راندۂ درگاہ ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانا تھا اور غرور و سرکشی کی تھی اور جب وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ سے نکالا گیا تو اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ''وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ''[۳] (اور مجھے قسم ہے میں ضرور ان کو گمراہ کروں گا اور میں ضرور ان کے دلوں میں (جھوٹی) آرزوئیں ڈالوں گا)۔

شیطان کے گمراہ کرنے اور جھوٹی آرزوئیں ڈالنے کا معنٰی و مفہوم

صاحب تبیانُ القرآن اس آیت کے تحت رقم طراز ہیں'' کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شیطان کے گمراہ کرنے کا معنٰی یہ ہے کہ لوگوں کو ہدایت کے راستہ سے ہٹا دے گا، اور بعض نے کہا کہ شیطان کے گمراہ کرنے کا معنٰی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف دعوت دے گا، اور یہی صحیح ہے۔ شیطان کا دوسرا دعویٰ یہ تھا کہ میں ضرور لوگوں کے دلوں میں جھوٹی آرزوئیں ڈالوں گا، اس کی تفسیر میں چار اقوال ہیں پہلا قول

---

[۱] مفردات القرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۶۱۔ [۲] البقرہ ۲: ۱۴۔ [۳] النساء ۱۱۹۔

یہ ہے کہ حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو ہوگی کہ نہ جنت ہو نہ دوزخ، اور نہ حشر و نشر ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں توبہ اور استغفار میں تاخیر کرنے اور اس کے ٹالنے کو ڈالتا رہے گا، یہ بھی حضرت ابنِ عباس ﷺ کا قول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں یہ آرزو ڈالے گا کہ آخرت میں ہمیں بہت بڑا اجر وثواب ملے گا، یہ زُجاجؒ کا قول ہے، موجودہ زمانہ میں بعض جاہل پیر اپنے مریدوں سے کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے مجھے مقام و وجاہت عطا کیا تو میں فلاں کو بخشوالوں گا، اور ہماری تو آرزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب سے نجات دے دے تو یہ اس کا ہم پر بہت بڑا کرم ہوگا، جنت اور اس کی نعمتوں کے ہم کب لائق ہیں، چوتھا قول یہ ہے کہ وہ ان کی آرزوؤں کو ان کیلئے مزین کر دے گا۔[1]

مفتی احمد یار خان نعیمی ''تفسیر نعیمی'' میں لکھتے ہیں کہ شیطان انسان کو کس طرح گمراہ کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ گمراہ کرنے کا تعلق انسان کے اعمال سے عقائد کے متعلقہ چالوں میں سے پہلی چال ہے۔ حق سے بہکانا، دلوں میں وسوسہ ڈال کر باطل میں پھنسا دینا، جھوٹی چیزوں کو آراستہ کر کے دکھانا، اچھی چیزوں کو ہیبت ناک کرنا تاکہ انسان کا دل جھوٹ کی طرف لگے، اضلال سے یہی مراد ہے۔ بعض لوگ اپنی خوبصورت بیویوں کو منہ نہیں لگاتے بلکہ بدصورت رنڈیوں میں رغبت رکھتے ہیں یہ ہے شیطان کا اضلال اور بہکانا۔ زکوٰۃ دینے سے گھبراتے ہیں، حرام رسموں میں خوب پیسہ اڑاتے ہیں غرضیکہ یہ اضلال عام ہے۔ خیال رہے کہ جیسے بعض بیماریاں آنکھ، زبان اور کان کے احساس کو بگاڑ دیتی ہیں کہ زبان میٹھی چیز کو کڑوی اور کڑوی کو میٹھی محسوس کرنے لگتی ہے۔ ایسے ہی شیطان کا تسلط انسان کے خیال کو بگاڑ دیتا ہے۔ اس خیال کے بگاڑنے کا نام اضلال ہے۔ اضلال کے چند معانی ہیں یہاں اُن میں دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔(۱) گمراہ و بے دین کر دینا۔ یہ صرف کفار کیلئے ہے۔(۲) بہکا کر گناہ کرا دینا یہ عام مسلمانوں کیلئے بھی ہے۔ یہاں لَاُضِلَّنَّهُمْ کی چار صورتیں ہوئیں۔ ہر صورت کا تعلق الگ الگ نوعیت کا ہے۔ اس لیے هُمْ کے مرجع میں چار احتمال ہوں گے۔ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ ''اُمْنِيَة'' سے بنا۔ خواہش اور رغبت اسی سے ہے۔ امانی، جھوٹی خواہشات فضول تمنائیں۔ یعنی ان کے دلوں میں بُرے خیالات پیدا کروں گا کہ نہ حشر ونشر ہے نہ حساب و کتاب، جو ہو سکے تو دنیا میں مزے اُڑا لو یا تم ابھی بہت جیو گے آخری عمر میں توبہ کر لینا ابھی عیش کر لو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض مسلمان قدرت و طاقت کے باوجود حج نہیں کرتے اسی خیال میں رہتے ہیں کہ بڑھاپے میں کریں گے۔ وہ یا تو بڑھاپے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں یا بڑھاپے میں حج کے قابل نہیں رہتے۔ یہ ہے شیطان کا اُمْنِيَة ناجائز امید بندھانی، درازیٔ عمر کی آرزو دلانی۔[2]

شیطان انسان کا دشمن ہے اس سے بچنے کا راستہ

جو لوگ شیطانی کاموں سے منسلک رہتے ہیں اور توبہ کی کوشش نہیں کرتے اور نفس کی رہائی اور

---

[1] تبیان القرآن، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد ۲، صفحہ ۸۰۳، فرید بک سٹال، لاہور۔ [2] تفسیر نعیمی، جلد ۵، صفحہ ۴۷۲۔

خلاصی کی کوشش نہیں کرتے تو وہ شیطان کے زیر اثر رہتے ہیں۔اس کا علاج یہ ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہیں تا کہ شیاطین کے اثر سے بچ سکیں"اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝" (بے شک جن لوگوں نے پرہیز گاری اختیار کی ہے، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال بھی چھو لیتا ہے (تو وہ اللہ کے امر و نہی اور شیطان کے دجل و عداوت کو) یاد کرنے لگتے ہیں سو اسی وقت ان کی (بصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں)۔ [1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے"اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ " [2] (اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔"اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ" [3] (شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی (اس کی مخالفت کی شکل میں) اسے دشمن ہی بنائے رکھو)۔

یہ شیطان چوبیس گھنٹے اپنی شیطنت کے تیر پھینکتا ہے اور لوگ اس کی فتنہ اندازی سے مطلقاً غافل ہیں۔ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں اور دعوت اسلام دینے میں لگے ہوئے ہیں ان کا یہ کام شیطان کے پیشے، اس کی ہمت، اس کی مراد اور مشن کے بالکل خلاف اور متضاد ہے۔اس سے شیطان غضبناک ہو جاتا ہے اور وہ بھی ایسے لوگوں سے جنگ کرنے پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔حدیث کے مطابق ایک مردِ فقیہہ شیطان پر ستر عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ [4] تمہاری اس مخالفت میں وہ اکیلا نہیں بلکہ شیاطین کی منظم جماعت اور تمہارا نفس اور خواہشات بھی ہیں۔حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ فرماتے ہیں"اَلشَّیْطٰنُ فَارِغٌ وَ اَنْتَ مَشْغُوْلٌ اَنْتَ تَنْسَاهُ وَ هُوَ لَا یَنْسَاکَ وَ مِنْ نَفْسِکَ لِشَیْطٰنٌ عَلَیْکَ الْعَوَانُ فَاِذَا لَا بُدَّ مِنْ مُحَارَبَتِهٖ وَقَهْرِهٖ وَاِلَّا فَلَا تَاْمَنُ الْفَسَادَ وَ الْهَلَاکَ" [5] (شیطان فارغ ہے اور تو مشغول ہے تو نے اس کو بھلا دیا ہے مگر اس نے تجھے نہیں بھلایا اور تیرے اندر بھی شیطان کے کئی یار و مددگار ہیں۔پس بہت ضروری ہے کہ ان کو مغلوب کرنا اور ان کے ساتھ جنگ کرنا ورنہ تو اس کی شرارتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا)۔

شیطان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے

قرآن مجید نے بار بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ"اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ" [6] (یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے)۔اس آیت کے تحت پیر محمد کرم شاہؒ نے ضیاء القرآن میں لکھا ہے کہ شیطان تمہاری خیر خواہی کے ہزار دعوے کرے، وہ تم سے دوستی کے عہد و پیمان کرتے ہوئے کتنی سخت قسمیں کھائے۔سن لو! وہ جھوٹا ہے وہ تمہارا ازلی دشمن ہے۔تمہاری وجہ سے جو چوٹ اس کو لگی ہے، اس کی ٹیسیں کم نہیں ہوئیں، تم اس کی میٹھی میٹھی

---

[1] الاعراف:۷:۲۰۱ [2] یٰسین،۳۶:۶۰۔ [3] فاطر،۳۵:۶۔

[4] سنن ابن ماجہ،حدیث ۲۲۲،جلد۱،صفحہ۸۱۔ [5] مرقاۃ المفاتیح،جلد۱،صفحہ۲۳۰۔ [6] فاطر،۳۵:۶۔

باتوں میں آ جاتے ہو۔ وہ تو ہر لحہ ایسے موقع کی تلاش میں ہے کہ فرصت ملے تو تمہیں ایسی لڑھکنی دے کہ تم اپنے بلند مقام سے منہ کے بل خاکِ مذلت پر پٹاخ سے آ گرو، اور وہ زور سے قہقہہ لگائے اور تمہارا مذاق اڑائے، نادان نہ بنو، ایسے خطرناک دشمن سے ہمیشہ چوکنے رہو۔ جب وہ تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو، تب ہی تم اس کے فریب سے بچ سکتے ہو۔[1]

بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورۂ فاطر کی آیت نمبر ۵ میں غرور سے مراد شیطان ہے۔ بیشک شیطان دھوکہ بازی کے فن میں بے نظیر ہے۔ وہ ہر شخص کو ایک قسم کے دام فریب میں پھنسانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ہر شخص کی نفسیات کو جانتا ہے، وہ ہر انسان کے کمزور پہلوؤں سے خوب واقف ہے اور ہر انسان پر اس کا حملہ اس کے کمزور پہلوؤں پر کرتا ہے۔ عقل کے پجاریوں کو وہ ایسا چکر دیتا ہے کہ وہ کبھی نزولِ وحی اور وقوعِ قیامت کو عقل کے منافی ثابت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ علم و عقل سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے انہیں کبھی دولت کا لالچ دے کر، کبھی اقتدار کے سہانے خواب دکھا کر، کبھی شہرتِ دوام کے چکر میں اسیر کر کے ان سے ایسی ایسی خسیس، سفاکانہ اور مروّت سے گری ہوئی حرکتیں کراتا ہے کہ اسے دیکھنے والے بھنا کر رہ جاتے ہیں اور جو خدا پر اور قیامت پر ایمان محکم رکھتے ہیں، ان کی شمع ایمان اگر بجھا نہیں سکتا تو ان کے کانوں میں چپکے سے یہ افسوں پھونک دیتا ہے کہ تیرا رب غفور اور رحیم ہے بے شک نماز نہ پڑھو، بے شک دادِ عیش دیتے رہو۔ اس کی مغفرت کے سامنے تیرے گناہوں کی کیا حقیقت ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اس جملہ کی بہترین تشریح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے "قَالَ الْغَرُوْرُ بِاللّٰهِ اَنْ یَکُوْنَ الاِنْسَانُ یَعْمَلُ بِالْمَعَاصِیْ ثُمَّ یَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی اَلْمَغْفِرَةَ"[2] (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ غرور کا مطلب یہ ہے کہ انسان دھڑا دھڑ گناہ کرتا رہے اور تمنا یہ کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے گا)۔

شیطان کے غلبہ پانے کا طریقہ

صاحب تفسیر ضیاء القرآن نے سورۂ حشر کی آیت نمبر ۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے: کہ شیطان کا یہ کام ہے کہ وہ پہلے دوست اور خیر خواہ کے روپ میں آتا ہے اور انسان جب اس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ بدر کے موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ کئی لوگوں نے ابوجہل کو مشورہ دیا کہ جس قافلہ کی حفاظت کیلئے ہم گھر سے نکلے تھے وہ بخیریت مکہ پہنچ گیا ہے۔ اب اس لشکر کشی کا کوئی مقصد نہیں۔ ہمیں واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن شیطان ایک نجدی سردار کے لباس میں نمودار ہوا اور یہ کہہ کر انہیں اکسایا کہ "لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُم"[3] (کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر آج ان لوگوں میں

---

[1] تفسیر ضیاء القرآن، جلد ۴، صفحہ ۱۴۲۔ [2] تفسیر قرطبی: جلد ۱۴، صفحہ ۲۸۲۔ [3] الانفال، ۸:۴۸۔

سے اور میں نگہبان ہوں تمہارا)۔لیکن جب دونوں لشکر ٹکرائے تو یہ کہتا ہوا دُم دبا کر بھاگا "اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ"[1] (میں بری الذمہ ہوں تم سے میں دیکھ رہا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھ رہے، میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے)۔[2]

شیطان کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔انفرادی طور پر بھی شیطان کا رویہ انسان کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے کہ وہ اسے غلط کام (ڈاکہ زنی، حرام مال، جھگڑا، نماز نہ پڑھنا، ہر عبادت سے روگردانی، زنا کرنا اور دُنیوی مال و دولت سے محبت کرنا) پر اکساتا ہے مختلف قسم کے وسوسے اور خیال ذہن میں ڈالتا ہے کہ اس طرح کرو گے تو اس طرح ہو جائے گا۔بس جب انسان مکمل طور پر راضی ہو جاتا ہے اور وہ کام کر بیٹھتا ہے تو پھر وہ دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور انسان کف افسوس ملتا رہتا ہے مگر "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

شیطان نے چونکہ قسم کھائی تھی کہ بندوں کو آپ (اللہ تعالیٰ) کی راہ سے پھیروں گا اس لیے وہ ہر قسم کا زور لگاتا ہے کہ کوئی بھی آدمی نیکی نہ کما سکے۔شیطان کیلئے سب سے برا کام علم دین ہے اور بُرا شخص وہ لگتا ہے جو عالم دین ہو۔کہتے ہیں شیطان روزانہ اپنے چیلوں سے اپنی اپنی کارروائی پوچھتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں آدمی سے قتل کرایا ہے، کوئی کہتا ہے کہ میں نے بیوی کا شوہر سے جھگڑا کرایا ہے۔کوئی کہتا ہے میں نے فلاں غلط کام کرایا ہے۔شیطان کہتا ہے کہ آپ نے کچھ نہیں کیا۔آخر میں ایک سے پوچھتا ہے آپ نے کیا کام کیا وہ کہتا ہے میں نے مدرسہ جاتے ہوئے طالب علم کو ورغلا کر روکا ہے تو شیطان اسے تھپکی کے ساتھ شاباش دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سب سے بڑا کام اس نے کیا ہے کیونکہ تم نے تو ایک آدمی سے گناہ کرایا ہے مگر اس نے تو نیکیوں کے منبع کو بند کیا ہے کیونکہ اگر وہ طالب علم پڑھ جاتا تو وہ اور آدمیوں کو بھی پڑھا کر نیک راہ پر لگاتا اور اس طرح مبلغوں کی ایک ٹیم کھڑی ہو جاتی جن کو روکنا مشکل ہو جاتا۔

علامہ اقبالؒ نے شیطان کی اپنے مشیروں سے گفتگو کو، ضربِ کلیم میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ہماری تصانیف "نشانِ منزل" اور "حُسنِ نماز" میں شیطان کے بہکانے کے چار حربوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے جس سے وہ انسانوں کو گمراہ کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کرنے سے روکتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر علم حاصل ہو جائے تو اس پر عمل کرنے سے روکتا ہے، تیسرے یہ کہ وہ تکبر میں گرفتار کر دیتا ہے، چوتھے یہ کہ وہ شرک پر آمادہ کرتا ہے۔اس کی تفصیل مذکور کتب میں ملاحظہ کریں۔

شیطان کا طریقۂ واردات

ہر ذی شعور شخص یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اُس کا دشمن کون ہے؟ اس لیے شیطان انسان کی نفسیات، ماحول اور شعبہ کے حساب سے مختلف راستوں سے وار کرتا ہے۔قلب ایک قلعہ ہے، شیطان انسان کا

---

[1] الانفال، ۸:۴۸۔
[2] تفسیر ضیاء القرآن، جلد۵، صفحہ۱۸۳۔

دشمن ہے اور چاہتا ہے کہ قلعہ میں داخل ہو کر قبضہ کرے اس کی حفاظت تبھی ممکن ہے جب اس کے دروازوں کی حفاظت کی جائے اور جو حفاظت کرنا نہیں جانتا وہ حفاظت کر بھی نہیں سکتا اور یہ کام معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک پر فرض ہے کیونکہ جو عمل واجب ہو تو، اس کا علم حاصل کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی شیطان کی گزرگاہوں سے واقف نہ ہو شیطان کو دور نہیں کرسکتا جن دروازوں سے یہ حملہ کرتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ غضب و شہوت

جب عقل کمزور ہو تو شیطانی لشکر حملہ آور ہوتا ہے۔ شیطان انسان کے غصے سے کھیل کھیلتا ہے جیسے بچے گیند سے کھیلتے ہیں۔ شیطان نے ایک ولی اللہ پر یہ راز افشاں کیا کہ میں ابنِ آدم پر اس وقت غالب آجاتا ہوں جب وہ شہوت میں یا غصے میں ہو۔

مرد کون؟

مولانا رومؒ نے فرمایا کہ جب نہر میں پانی ہو تو وہ نہر کہلانے کی حقدار ہے اور اگر پانی نہ ہو تو یہ مٹی کا ایک گڑھا ہے۔ اسی طرح عام لوگ مرد کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ مرد کہاں ہیں یہ لوگ روٹی پر مرنے والے اور شہوت سے مغلوب انسان ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ایک شخص چراغ لے کر گھوم رہا تھا اور کہتا تھا کہ میں انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں اور میں حیران ہوں کہ ایک انسان بھی مجھے ایسا نظر نہیں آرہا۔ لوگوں نے کہا کہ آخر یہ بازار مردوں سے ہی تو بھرے پڑے ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ لوگ انسان نہیں۔ میں تو غصہ، شہوت اور حرص کی راہوں پر نہ چلنے والے مرد چاہتا ہوں۔ ایسا مرد کون ہے جو غصے اور شہوت میں انسان ہو۔ ایسی دو حالتوں پر ثابت قدم رہنے والا کون ہے تاکہ میں اس پر اپنی جان قربان کردوں۔ اس کے بعد مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ خدا کو ہی فاعل سمجھتے ہوئے خود کو بیچ میں سے نکال لیتے ہیں اور یہ لوگ جبریہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کو مجبور سمجھتے ہیں۔

جُو کہ آبش ہست جُو خود آں بود　　　آدمی آنست کو را جاں بود

(جس نہر میں پانی ہے تو وہی نہر ہے آدمی تو وہی ہے جس میں جان ہے)　(۵/۲۹۳)

ایں نہ مردانند اینہا صُورت اند　　　مُردۂ نانند و کشتہ شہوتند

(یہ لوگ جن کے قلب نور سے خالی ہیں مرد نہیں ہیں (بلکہ مٹی کی بے جان) مورتیں ہیں یہ لوگ روٹی پر جان دینے والے اور شہوت کے مارے ہوئے ہیں)　(۵/۲۹۳)

آگے ایک حکایت کے ضمن میں بتاتے ہیں کہ دنیا میں ایسا آدمی نایاب ہے جو بمعنٰی حقیقی آدمی ہے۔

گفت من جُویائے انسان گشتہ ام　　　می نیابم ہیچ و حیراں گشتہ ام

(اس نے کہا کہ میں انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں (اور حیران ہو رہا ہوں) مجھے کوئی انسان نہیں ملتا)　(۵/۲۹۴)

گفت مردے هست ایں بازار پر   مرد مانند آخر اے دانائے حر

(بوالفضل نے کہا) اے دانائے آزاد آخر یہ بازار مردوں ہی سے تو بھرے پڑے ہیں)(۲۹۴/۵)

گفت خواہم مرد بر جادہ دورہ   در رہ خشم و بہنگام شرہ

(درویش نے کہا! نہیں مجھے ایسے ویسے لوگ درکار نہیں بلکہ میں دوراہوں کی سڑک پر ثابت قدمی کیساتھ چلنے والا جوانمرد چاہتا ہوں یعنی غصے کے راستے میں اور حرص کے وقت) (۲۹۴/۵)

وقت خشم و وقت شہوت مرد کو   طالب مردے دوانم کو بکو

(غصے کے وقت اور شہوت کے وقت مرد کون ہے میں ایسے مرد کی تلاش میں گلی گلی دوڑا پھرتا ہوں)(۲۹۴/۵)

کو دریں دو حال مردے در جہاں   تا فدائے او کنم امروز جاں

(دنیا میں ان دوحالتوں کے اندر ثابت قدم رہنے والا مرد کہاں ہے تاکہ آج میں اس پر اپنی جان قربان کردوں) (۲۹۴/۵)

۲۔حسد اور حرص

حرص اور حسد انسان کو اندھا کر دیتے ہیں اور وہ شہوت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور شیطان قابو پا لیتا ہے۔شیطان نے حضرت نوح علیہ السلام کو بتلایا کہ حسد کی وجہ سے میں ملعون ہوا اور حرص نے حضرت حوا علیہا السلام کو جنت میں پھل کھانے پر اکسایا۔ابلیس کہتا ہے کہ اب میرا شکار حرص کی وجہ سے ہوتا ہے۔

۳۔سیر ہو کر کھانا خواہ حلال اور پاک ہو

سیر ہو کر کھانے سے بھی شیطان انسان پر غلبہ پاتا ہے کیونکہ سیر ہو کر کھانے سے شہوت کو قوت حاصل ہوتی ہے اور شہوت شیطان کا ہتھیار ہے۔

۴۔مکان،لباس اور سامانِ خانہ کے ساتھ زینت کرنا

جب یہ چیزیں انسان کے دل میں وقعت پکڑلیں تو انسان ان کو بڑھاتا رہتا ہے اور جب انسان اس کی خواہش میں پھنس گیا تو پھر شیطان کو اس کے پاس آنے کی ضرورت نہیں رہتی۔خود بخود کام چلتا رہتا ہے اور انسان کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ وہ خواہشات کا مطیع ہوتا ہے۔

۵۔لوگوں سے طمع رکھنا

منقول ہے کہ ابلیس نے ابن حنظلہ سے کہا میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔انہوں نے کہا اس کی مجھے ضرورت نہیں۔تو اس نے کہا اچھا دیکھو تو سہی اگر اچھی بات کہوں تو لے لینا نہیں تو رد کر دینا۔پھر کہا: اے ابنِ حنظلہ! اللہ تعالیٰ کے بغیر رغبت کے ساتھ کسی سے نہ مانگو جب تم غضبناک ہو تو اپنے آپ پر دھیان رکھو اس

لیے کہ جب تم غضبناک ہوتے ہو تو اس وقت میں تم پر قابو پالیتا ہوں۔

۶۔جلد بازی کرنا اور ثابت قدمی چھوڑ دینا

جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور جلد بازی میں شیطان برائی کو انسان پر ایسے چلا دیتا ہے کہ وہ سمجھ نہیں سکتا۔

۷۔درہم، دینار اور دیگر اموال مثلاً سامان، چوپائے اور زمین وغیرہ

ان چیزوں سے بھی شیطان انسان کو ورغلاتا ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں اگر ضرورت سے زیادہ ہوں تو شیطان کی جائے رہائش بن جاتی ہیں۔حضرت ثابت بنانیؒ کا قول ہے: کہ جب حضور ﷺ کی بعثت ہوئی تو ابلیس نے اپنے چیلوں سے کہا کہ کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے جاؤ دیکھو کیا ہے۔چیلے گئے اور تھک کر واپس آ گئے اور کہنے لگے ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔چنانچہ ابلیس خود گیا اور حضور ﷺ کی بعثت کی خبر لے آیا۔شیطان کے چیلے حضور ﷺ کے صحابہ کرام ؓ کے پاس جاتے اور بغیر کسی نقصان کے واپس آ جاتے اور کہتے کہ اس قسم کی قوم کی رفاقت نہیں کر سکتے۔پھر نماز میں وساوس کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے آخر ابلیس نے کہا کہ تم انتظار کرو۔شاید اللہ تعالیٰ ان پر دنیا فراخ کر دے پھر ہمارا کام بن سکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پتھر کا تکیہ لگایا تو شیطان حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میری متاع آپ کے پاس موجود ہے۔آپ نے اس اینٹ کو اپنے سر کے نیچے سے نکال کر دور پھینک دیا تو شیطان بھی رخصت ہو گیا۔

۸۔بخل اور فقر و احتیاج کا ڈر

یہ چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے اور صدقہ و خیرات سے مانع رکھتی ہیں اور توکل کے منافی ہیں۔جو بالآخر عذاب کا باعث بنتی ہیں۔کتنے لوگ ہیں جو مال کو صحیح جگہ خرچ کرتے ہیں؟

۹۔تعصب مذہبی، خواہشات، دشمن کے خلاف کینہ اور حقارت

ان باتوں سے عبادت گزار اور نافرمان سب ہی ہلاک ہوتے ہیں۔ابلیس نے کہا کہ محمد ﷺ کی امت کو میں نے گناہوں میں پھنسا دیا مگر استغفار سے انہوں نے میری کمر توڑ دی۔پھر میں نے انہیں ایسے گناہوں میں پھنسایا کہ وہ استغفار نہیں کریں گے۔خواہشات انسان کو استغفار سے غافل کر دیتی ہیں۔حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے پوچھا گیا کہ اگر شیخ نہ ہو تو کیا کرے؟ کہا کثرت سے استغفار کرو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ؓ سے منقول ہے کہ کسی نے اپنے رب سے دعا کی: اے اللہ! مجھے بنی آدم کے دل میں شیطانی وساوس کا طریقہ کار دکھا دے۔اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ہے جو شیشے کی طرح ہے کہ اس کے آر پار سب کچھ نظر آتا ہے اور شیطان کو دیکھا کہ وہ مینڈک کی صورت میں اس کے

کاندھے اور کان کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اپنی طویل اور باریک سونڈھ کو کاندھے سے اس کے دل میں داخل کیا اور وسوسے ڈالنے لگا۔ جب وہ آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا تو پیچھے ہٹ جاتا۔

ابلیس لعین کا صراطِ مستقیم سے بہکانے کی سعی کرنا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ ○ ''[1] (اس (ابلیس) نے کہا: پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افرادِ بنی آدم کو گمراہ کرنے) کیلئے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا (تا آنکہ انہیں راہِ حق سے ہٹا دوں) پھر میں یقیناً ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان کے پاس آؤں گا، اور (نتیجتاً) تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پائے گا)۔ اس آیت کے تحت ''تبیان القرآن'' میں لکھا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ شیطان کو علم تھا کہ صراط مستقیم کیا ہے اور وہ لوگوں کو اس صحیح راستہ اور منہج قویم سے بھٹکانے کیلئے دن رات ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا ہے اور اس سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

حضرت برہ بن ابی فاکہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شیطان ابن آدم کے تمام راستوں میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کو اسلام کے راستہ سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم اسلام قبول کرو گے اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دو گے؟ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔ پھر اس کی ہجرت کرنے کے راستہ سے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم ہجرت کرو گے اور اپنے وطن کی زمین اور آسمان کو چھوڑ دو گے! اور مہاجر کی مثال تو کھونٹے سے بندھے ہوئے اس گھوڑے کی طرح ہے جو ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہو اور اس کھونٹے کی حدود سے نکل نہ سکتا ہو۔ وہ شخص اس کی بات نہیں مانتا اور ہجرت کر لیتا ہے۔ پھر شیطان اس کے جہاد کرنے کے راستے میں بیٹھ جاتا ہے، وہ اس شخص سے کہتا ہے کہ تم جہاد کرو گے اور اپنی جان اور مال کو آزمائش میں ڈالو گے، اگر تم جہاد کے دوران مارے گئے تو تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کرے گی اور تمہارا مال تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور جہاد کرنے چلا جاتا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سنو جس شخص نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے اور جو مسلمان قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جو مسلمان غرق ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جس مسلمان کو اس کی سواری نے ہلاک کر دیا اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے۔[2]

---

[1] الاعراف، ۱۶:۱۷۔ [2] سنن نسائی، حدیث ۳۱۳۴، جلد ۶، صفحہ ۲۱۔

ابلیس لعین کے چار جہات سے حملہ آور ہونے سے کیا مراد ہے؟

ابلیس لعین نے کہا تھا کہ (لوگوں کو بہکانے کیلئے) ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور بائیں سے آؤں گا۔ اس کی حسب ذیل تفسیریں ہیں:

حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا: سامنے سے مراد یہ ہے کہ میں ان کی دنیا کے متعلق وسوسے ڈالوں گا۔ اور پیچھے سے مراد یہ ہے کہ ان کی آخرت کے متعلق وسوسے ڈالوں گا اور دائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کے دین میں شبہات ڈالوں گا اور بائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کو گناہوں کی طرف راغب کروں گا۔

حضرت قتادہ ﷺ نے فرمایا کہ سامنے سے آنے کا معنٰی یہ ہے کہ میں ان کو یہ خبر دوں گا کہ مرنے کے بعد نہ اٹھنا ہے، نہ جنت ہے، نہ دوزخ ہے اور پیچھے کا معنٰی یہ ہے کہ میں ان کیلئے دنیا کو مزین کروں گا اور انہیں اس کی دعوت دوں گا۔ دائیں جانب کا معنٰی یہ ہے کہ میں ان کی نیکیوں کو ضائع کرنے کی کوشش کروں گا اور بائیں جانب کا معنٰی یہ ہے کہ میں ان کیلئے برائیوں کو مزین کروں گا اور انہیں ان کی دعوت دوں گا۔ حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ابنِ آدم کے اوپر سے آنے کی کوئی راہ نہیں دی کیونکہ اوپر سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ [1]

یہ بھی بیان کردوں کہ انسان کی انیس (۱۹) قوتیں ہیں جن کا تعلق لذّات جسمانیہ سے ہے اور ایک قوت عقل ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ابھارتی ہے۔ وہ انیس قوتیں یہ ہیں پانچ حواس ظاہرہ پانچ حواس باطنہ اور شہوت وغضب اور سات دیگر قوتیں ہیں جاذبہ ممسکہ، ہاضمہ، دافعہ، قازفہ، نامیہ اور مولدہ۔ اور ابلیس لعین کے نزدیک یہ آسان تھا کہ وہ انیس قوتوں کے تقاضوں کو بھڑکائے اور ایک قوت کے تقاضوں کو کم کرے۔ اس لیے اس نے یہ دعویٰ کیا کہ تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ اللہ رب العزت اپنے حبیب ﷺ کے طفیل اس کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین

غلبۂ شیطانیہ کے واقعات

شیطان انسان کیلئے کس طرح کے حالات بنا کر غلبہ پاتا ہے اس کے دو واقعات درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: (ابلیس یعنی شیطان کا قصہ تو مشہور ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے میں سرتابی کی اور خوف خدا کو چھوڑا) بلعم باعور نامی شخص زمانہ موسوی میں ایک مستجاب الدعوات عالم اور عابد تھا جو کہ اسم اعظم جانتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کفار شام سے جہاد کیا تو وہ لوگ بلعم کے پاس آکر فریادی ہوئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام لشکر جرار کے ساتھ ہمارا خون بہانا چاہتے ہیں ان کیلئے بددعا کرو۔ اس نے کہا کہ پیغمبر علیہ السلام اور مومنین پر بددعا

---

[1] جامع البیان، جلد ۷، صفحہ ۱۹۱۔

کر کے دونوں جہان پر اپنے آپ کو رسوا کرنا مجھے پسند نہیں۔ آخر لوگوں نے اصرار کیا تو اس نے کہا کہ بہتر ہے مگر میں استخارہ کر لوں۔ آخر جب استخارہ میں بھی ممانعت آئی تو لوگوں نے بہت کچھ مال و دولت دے کر خوشامدیں کیں۔ وہ راضی ہو گیا اور گدھے پر سوار ہو کر بددعا کرنے کیلئے پہاڑ پر چڑھا اور بددعا کی۔ خدا کی شان کہ بددعا میں بنی اسرائیل کی جگہ اپنا ہی نام اس کی زبان پر جاری ہوا اور بددعا کا اسی پر اثر پڑا اور یہ نتیجہ ہوا کہ اس کی زبان منہ سے باہر نکل کر سینہ پر آ پڑی اور دین و دنیا میں برباد و خوار ہو گیا۔ [1]

دوسرا واقعہ: برصیصا ایک زاہد تھا جس نے ستر برس عبادت میں گزارے اور شیاطین سارے اس کو گمراہ کرنے سے عاجز آ گئے تھے۔ آخر ایک شیطان نے جس کا نام ابیض تھا اس نے زاہد کو برباد کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور عابد بن کر اس کے قریب ایک گرجا میں آ بیٹھا۔ برصیصا اس کا مجاہدہ دیکھ کر اس کا مرید ہو گیا۔ آخر ابیض نے چند کلمے اس کو تعلیم کیے کہ جس بیمار پر پڑھے جائیں گے اس کو شفا ہو جائے گی۔ اس کے بعد ابیض شہر میں طبیب بن کر آیا اور ایک مریض کو دیکھ کر کہا کہ اس کا علاج بس برصیصا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مریض برصیصا کے پاس پہنچا اور شفایاب ہوا۔ اسی طرح ابیض نے متعدد بیمار اس کے پاس بھیجے یہاں تک کہ اس کی شہرت ہو گئی کہ برصیصا کے پاس عجیب عمل ہے۔ بادشاہ وقت کی بیٹی اتفاق سے بیمار ہوئی اور وہ بھی برصیصا کے پاس بھیجی گئی۔ برصیصا نے عمل پڑھا تو اس کو بھی آرام آ گیا۔ آخر بادشاہ نے شہزادی کو وہیں چھوڑا کہ چند روز یہاں رہے کہ کامل شفا حاصل ہو۔ شہزادی کا برصیصا کے پاس رہنا آگ کے پاس گھاس پھوس کا کام دے گیا۔ زاہد نے شیطانی وسوسہ سے اس کے ساتھ زنا کیا۔ زنا کے بعد برصیصا کو بدنامی کا اندیشہ ہوا تو اس نے شہزادی کو قتل کر دیا۔ ابیض نے یہ خبر شہر میں جا اڑائی اور برصیصا کو سولی چڑھانے کا حکم صادر ہوا۔ اس وقت ابیض پھر آیا اور کہا کہ مجھے سجدہ کرو تو نجات پا جاؤ۔ چونکہ جان بڑی پیاری چیز ہے، آخر اس نے سجدہ کیا۔ مگر پھر بھی نہ بچ سکا۔ زنا، قتل اور شرک تینوں معصیتیں لے کر سولی پر جان دی اور صرف اتنی بات میں کہ غیر مشروع منتر اور عمل سیکھا اور بلا تحقیق نااہل سے مصاحبت اختیار کی۔ دنیا و آخرت کی رسوائی کا انجام ملا۔ [2]

مکرِ شیطان سے بچنے کی تدبیر:

جاننا چاہیے کہ شیطان اور اس کے مکر کو مرید سے پھیرنے کیلئے ذکر سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ '' [3] (بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر البتہ بہت بڑا ہے)۔ کبر و غرور کے خاتمے اور اوصاف ذمیمہ کے دفع کرنے میں نماز مؤثر ہے خصوصاً کلمہ طیبہ کی اس بارے میں تاثیر بہت زیادہ ہے اور اکثر مشائخ

---

1. التفسیر الکبیر، جلد ۱۵، صفحہ ۴۵۔
2. تفسیر البغوی، جلد ۴، صفحہ ۳۲۲۔
3. العنکبوت ۲۹: ۴۵۔

نے آیت کا یہ معنٰی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم کو یاد کرنا بڑا ہے تمہارے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے، اور یہ معنٰی بھی مناسب ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کا ہم کو یاد فرمانا بنظرِ رحمت وقبولیت اور عطاوفضل ہمارے تمام اوصاف ذمیمہ کو دفع کرتا ہے۔ پس تزکیہ اور تطہیر کیلئے نماز سب سے مؤثر ہے۔

قلب ونفس کو منور کرنے کا طریقہ

جاننا چاہیے کہ قلب ونفس کو منور بنانے کیلئے عبادت واطاعت گزاری میں فرحت اور سرور بڑی شرط ہے اور اسی لیے حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ اخلاقِ الٰہی کے خوگر بنو کیونکہ خوش خلقی منجملہ اخلاقِ الٰہی کے ہے اور تقدیرِ الٰہی پر راضی وفرحاں رہنا خوش خلقی میں داخل ہے اور جاننا چاہیے کہ وصال اور مشاہدۂ الٰہی کیلئے راہِ مستقیم کے اتباع اور دوامِ ذکر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے "وَ اَنَّ هٰـذَا صِـرَاطِـىْ مُسْتَقِيْـمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ" [1] (اور یہ کہ یہ میرا راستہ مستقیم ہے۔ پس اس کے پیروکار بن جاؤ اور دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ راہِ حق سے دور جا پڑو گے)۔ نیز اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا ہے "فَـاسْتَـمْسِكْ بِـالَّـذِیْٓ اُوْحِـىَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَـلٰـى صِـرَاطٍ مُّسْتَقِيْـمٍ ٥" [2] (پس آپ اس (قرآن) کو مضبوطی سے تھامے رکھیئے جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے، بے شک آپ سیدھی راہ پر (قائم) ہیں۔

پس مراقبہ اور خلوت ودوامِ ذکر سے حق کا طالب رہنا محبین وطالبینِ الٰہی پر فرضِ دائمی ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "قُـلِ اللّٰهُ ثُـمَّ ذَرْهُـمْ فِىْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ٥" [3] (آپ ﷺ فرما دیجیے "اللہ" پھر چھوڑ دیجیے انہیں (تا کہ) وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں)۔ یعنی میرا محبوب ومراد اور مطلوب بجز خدا تعالیٰ کے دوسرا نہیں ہے۔

اپنے نفس کو آدابِ سنت سکھانا دل کو منور کرنے کا سبب ہے

حضرت ابوالعباس بن عطاءؒ نے فرمایا "مَنْ اَلْـزَمَ نَـفْسَهٗ آدَابَ السُّنَّةِ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ بِنُوْرِ الْمَعْرِفَةِ وَلَا مَقَامَ اَشْـرَفُ مِـنْ مَـقَـامِ مُتَابَعَةِ الْحَبِيْبِ، فِىْ اَوَامِرِهٖ وَاَفْعَالِهٖ وَاَخْلَاقِهٖ، وَالتَّاَدُّبِ بِآدَابِهٖ قَوْلاً وَفِعْلاً، وَعَزْماً وَعَقْداً وَنِيَّةً" [4]

(جس نے اپنے نفس کیلئے سنتِ نبویہ ﷺ کے آداب لازم کر لیے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نورِ معرفت سے منور فرمائے گا۔ اور محبوب حقیقی کی اتباع سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ اس کے ارشادات میں اتباع، اس کے افعال و

---

[1] الزخرف، ۴۳:۴۳۔ [2] الانعام، ۶:۹۱۔

[3] الحج، ۲۲:۷۸۔ [4] طبقات الصوفیہ، صفحہ ۲۶۵۔

اخلاق میں اتباع اور اپنے قول وفعل، ارادے، عقیدے اور نیت میں اس کے آداب کی پیروی کرنا لازم ہے)۔

مجاہدہ کی ضرورت

"وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ" [1] (اور اللہ (کی محبت وطاعت اور اس کے دین کی اشاعت واقامت) میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے جہاد کا حق ہے)۔ یعنی اپنی طرف کھینچ لیا اور پسند فرمایا اور اسی نص سے معلوم ہو گیا کہ مجاہدہ سے مراد عالم حقیقت میں مجاہدہ کرنا ہے۔ کیونکہ کشش اور انتخاب کے بعد مجاہدہ طلب فرمایا ہے اور وہ عالم حقیقت کا ہی مجاہدہ ہے کہ سالکین اختیار کرتے ہیں اور یہی دلیل ہے اس پر کہ مبتدی ومنتہی کسی کو بھی مجاہدہ کے بغیر چارہ نہیں۔ یہی منشا ہے اس ارشادِ خداوندی کا کہ "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○" [2] (اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو (آپ کی شان کے لائق) مقامِ یقین مل جائے (یعنی انشراحِ کامل نصیب ہو جائے یا لمحہ وصالِ حق)۔

یعنی موت آجائے کیونکہ عارف کی قدر اس کی معرفت کے بقدر ہے اور قدر معرفت بقدر سیر فی اللہ کے ہے اور مرتبہ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں۔ پس سیر کی انتہا نہ ہوگی۔ پس جس کیلئے عالمِ اعلیٰ کا دروازہ مفتوح ہوا اس کیلئے جائز نہیں کہ ٹھہرے بلکہ زندگی بھر اس کو مجاہدہ کرنا چاہیے تا کہ اس کی معرفت اس کی سیر کے مقدار کے موافق بڑھتی رہے اور خود حق تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ○" [3] (اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (اور مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سَیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں)۔ پس منتہی اور واصل اپنے محبوب کے ساتھ مسرور ہے اور مبتدی وطالب وصال کے کنارہ پر ہے (کہ عنقریب حصولِ مقصود کی توقع ہے) اور ان دو کے علاوہ سب بے قدر ہیں جن کی کچھ عزت نہیں اور مواصلت انہی کا حصہ ہے جو اپنے بدن کو مجاہدہ کے اور نفس کو ریاضت کے اور قلب کو مراقبہ کے اور سرّ کو سیر کے اور روح کو طلبِ محبوب کے حوالے کر دیں۔ یہاں تک کہ سرّ روح تک کہ خفی ہے پہنچ جائیں اور عالمِ حقیقت سے کامیاب ہوں کیونکہ خفی عالمِ حقیقت ہے اور جب سرّ حقیقت پر مطلع ہو جاتا ہے تو اس کے واسطہ سے نفس وعقل اور قلب بھی مطلع ہو جاتے ہیں گویا سرّ ایک چراغ ہے کہ نفس وعقل اور قلب وحقیقت کو اسی چراغ کے واسطہ سے دیکھتے ہیں اور یہ حال ابتدا میں ہوتا ہے اور جس وقت مرید کو تمکین حاصل ہوتی ہے اور حقیقت سے اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو نفس بہ نسبت سرّ اور روح اور اخفیٰ کے مقدم وقوی اور لطیف ترین بن جاتا ہے۔ پس اس وقت نفس اور قلب اور عقل مرید کے بدن کے اندر ہوتے ہیں مگر ان کی شعاعیں عالمِ جبروت میں اس

---

[1] الحج، ۲۲:۷۸۔　[2] الحجر، ۱۵:۹۹۔　[3] العنکبوت، ۲۹:۶۹۔

اونچے سے اونچے مقام پر ہوتی ہیں کہ ملائکہ مقربین بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو گیا، یعنی اس کی طلب میں اپنے اعمال کے اندر اخلاص پیدا کر لیا تو حق تعالیٰ اس کا ہو گیا یعنی اس کی تمام مشکلات کا کفیل بن گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" [1] (کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (مقرب نبی مکرم ﷺ) کو کافی نہیں ہے؟)، بلکہ وہ سب سے زیادہ کافی ہے اور وارد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: کہ "یا اللہ! تو میرا کب ہو گا؟ حکم ہوا کہ اس وقت جب تو اپنے نفس کا نہ ہو گا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا اپنے لیے نہ ہونا کس مرتبہ میں حاصل ہو گا؟ حکم ہوا کہ اس وقت جب تو اپنے آپ کو بالکل نَسْیًا مَّنْسِیًّا کر دے گا۔" [2]

یعقوب سوسیؒ کہتے ہیں کہ صحیح محبت اس وقت ہوتی ہے جبکہ محب علم محبت سے (گزر کر) محبوب کے علم میں آتا ہے اور علم محبت کو بھی فنا کر دیتا ہے (کہ بجز محبوب کے اپنی محبت سے بھی آگاہی باقی نہ رہے) کہ جس طرح محبوب غیب میں تھا اور محبت نہ تھی۔ اسی طرح کمال مشاہدہ کے سبب ایسا بن جاتا ہے کہ محبت کا علم بھی فنا ہو جاتا ہے اور جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو محب بلا محبت ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہنا

جان لے کہ طالبِ حق کو چاہیے کہ رنج ہو یا غم اور تنگی ہو، یا فراخی ہر حالت میں حق تعالیٰ کے وصال کا طلبگار اور اس کی ملاقات کا مشتاق رہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: کہ جنت کی جانب اول وہ لوگ بلائے جائیں گے جو رنج و راحت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے تھے۔ [3] حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دوست بناتا ہے تو اس کو کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس اگر صابر رہا تو برگزیدہ کر لیتا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کی عبادت رضامندی کے ساتھ کرو (کہ دل بھی اندر سے بشاش رہے) اور اگر رضا نہ ہو تو نفس کے خلاف باتوں میں صبر کرنا بھی بہت بڑی بھلائی ہے۔ نیز حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک جماعت سے دریافت فرمایا کہ تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم مومن ہیں۔ فخرِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم مصیبت میں صبر کرتے ہیں اور فراخی پر شکر کرتے ہیں اور قضائے الٰہی پر راضی رہتے ہیں۔

اور بعض اکابرین کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دل کی صفائی کے سبب مصیبت کی تلخی کو بھلا دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ حق تعالیٰ اپنے ذاکرین کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلاتا ہے یہاں تک کہ ان بندوں پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ذات پاک اور اپنی صفات میں غیر سے بے نیاز ہے اور تمام اغیار اس کی قدرت کی وجہ

---

[1] الزمر، ۳۹:۳۶۔ [2] تفسیر ابن کثیر، اسماعیل بن عمر بن کثیر، متوفی ۷۷۴ھ، جلد ۱۳، صفحہ ۱۱۹، دار الفکر، بیروت۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۲۹۵۴۹، جلد ۶، صفحہ ۵۸۔

سے قائم اور اسی کے محتاج ہیں اور جب ان پر مشاہدہ کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ماسوئی کو فنا پاتے ہیں تو بجز حق تعالیٰ کے دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ پس مصیبت اور اس کی تلخی کہاں رہتی ہے؟ اور یہ معرفت عارفین و صدیقین کو حاصل ہوتی ہے جو اصحابِ مشاہدہ و مکاشفہ ہوتے ہیں۔ اور اسی جگہ سے بعض صوفیاء کا یہ قول مستنبط ہے کہ ''میں نے خدا تعالیٰ کو ہر شے سے پہلے دیکھا'' اور یہ دیکھنا یقین اور اخلاص کے ساتھ چشم سر کا دیکھنا ہے۔

حضرت حسین ؓ نے فرمایا ہے کہ مصیبت بارگاہ حق تعالیٰ سے ایک عافیت ہے جو اس کی طرف سے بندوں کو پہنچتی ہے اور سہل تستری ؒ نے فرمایا ہے کہ اگر بلاء اور تکلیف حق تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتی تو بندوں کو حق تعالیٰ کی طرف راستہ نہ ہوتا۔''

ابو سعید خراز ؒ نے فرمایا ہے کہ بلا محبین کیلئے حق تعالیٰ کا تحفہ اور ہدیہ ہے اور وصال کی مخفی زنجیر کا ہلانا ہے اور حضرت ذوالنون ؒ نے فرمایا ہے کہ لوگوں میں بڑا صابر وہ شخص ہے جو بلا کو چھپانے میں بڑھا ہوا اور حضرت رویم ؒ نے فرمایا ہے کہ بلاء کی وجہ سے بندوں کو حق تعالیٰ نے حرکت دی اور وہ متحرک ہو گئے اور اگر ٹھہرے رہتے (اور صبر کر کے اس کے آشیانہ پر ہی پڑے رہتے) تو وصل سے کامیاب ہو جاتے۔ ابو یعقوب نہر پوری ؒ نے فرمایا ہے کہ دنیا بلاء سے فریاد مچاتی ہے اور اس کے دفع کی خواہاں ہوتی ہے اور عارف بلاء میں لذت پاتا ہے اور اس کے ہٹنے کو ہرگز نہیں چاہتا اور حضرت جنید ؒ نے فرمایا ہے کہ بلاء عارفین کیلئے چراغ ہے اور مریدین کیلئے تنبیہ اور غافلین کیلئے تباہی ہے اور ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ بندہ کا سچ اور جھوٹ مصیبت اور فراخی کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اگر فراخی میں ساکن رہا (اور شکر گزار ہو کر عبادت میں ترقی نہ کی) تو سچا ہے اور بلاء میں ہائے ہو کرنے لگا تو جھوٹا ہے اور علی بن بندار ؒ نے فرمایا ہے کہ یہ دنیا ایک مکان ہے جس کی بنیاد ہی بلاء اور محنت پر ہے۔ پس مشقت اور محنت کے بدون اس کا رہنا محال ہے۔

ذکر پر مواظبت

طالبِ حق کو رضا و سرور وغیرہ آداب و شرائط پر قائم رہنا اور شیخ کی تلقین کے مطابق پوری مضبوطی کے ساتھ ذکر پر مواظبت رکھنا ضروری ہے تا کہ ذکر کا اثر باطن میں جائے اور پٹھوں میں سرایت کرے اور وجود کی ظلمت و کثافت اور کدورت ذکر کی آگ سے جل جائے۔ اور ذکر کے نور سے دل کو قرار حاصل ہو۔ کیونکہ ذکر میں نور اور نار دونوں ہیں اس کے نور سے تو دل کو ٹھنڈک و سکون پہنچتا ہے اور اس کی نار سے بشری اور وجودی کثافتیں جلتی اور اصلی خشونت و طبعی پیوست دفع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آثارِ بشریت سے نکل کر، خاکی بوجھوں سے ہلکا ہو کر اپنے قلوب سے ملکوتی میدان کو بھی عبور کر کے عبودیتِ اعلیٰ کے آسمان پر جا پہنچتا ہے اور ذکر کی پوری اور بڑی تاثیر اس وقت ہوتی ہے جبکہ خلوت خانہ لوگوں اور تمام مشاغل سے خالی ہو کیونکہ لوگوں

کا دیکھنا اور ان کی باتوں کا سننا بھی مشغول کرنے والا ہے اور جگہ تنگ ہو اور ہمت جمع کر کے ذکر میں بہت مبالغہ کرے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا، کہ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا اتنی کثرت سے ذکر کرو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں اور صدق و اخلاص سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی علامت قلب کی رقت اور خوف ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" [1] (بیشک مؤمن تو وہ ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں)۔

اس وجہ سے کہ ان کا ذکر عبودیت اور عبادت کا ذکر اور بیداری و جمعیت وانس کا ذکر ہوتا ہے۔ نہ کہ عبادت یا غفلت اور تفرقہ و وحشت کا ذکر اور ذاکر کو یہ اوصافِ حسنہ اس وجہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس ذکر کرنے والے کو اپنی عنایت و مہربانی سے ملائکہ مقربین کی جماعت میں فخر کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "جو شخص مجھ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو ایسے مجمع میں یاد کرتا ہوں جو اس کے مجمع سے بہتر ہے۔" [2] پس جس کو حق تعالیٰ نے یاد فرمایا اس کو ذکر، قلب و سرّ اور مذکور میں استغراق اور ذات بحث میں غائب ہو جانے کا مرتبہ نصیب ہو جاتا ہے اور اس کا قلب عمدہ احوال سے اور اس کا بدن اعمالِ صالحہ سے متصف ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کس قدر لطفِ خاص اور رحمِ اتم نازل فرمایا کہ ذکر کا حکم فرمایا اور اس کے واسطے سے تزکیہ و تصفیہ اور نورانیت و پاکی مقرر فرمائی۔ برے بھلے کی پہچان، خوبیوں کا حصول، برائیوں سے بچاؤ، شیطان کی شناخت، قلب کی حیات و صفائی اور اپنی ذات پاک کا قرب اور ذکر کرنے والے کو نفس پر غلبہ اور نفس کو جھڑکنے، ڈانٹنے، دبانے اور حکمِ شرع میں اس کو داخل کرنے کی سبیل اور حکمت و معرفت اور علم و احوالِ صافیہ کا قلب کیلئے حصول سب کچھ ذکر کے واسطے سے عطا فرمایا اور ان تمام عنایات کو بنی آدم کیلئے مخصوص کر دیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا ہے کہ شیطان باوجود اتنی طاعت کے بھی مشاہدہ کے درجہ کو نہ پہنچا (اسی لیے سجدہ کے حکم پر تکبر ظاہر ہوا) اور جناب آدم علیہ السلام سے عین لغزش کے وقت بھی مشاہدہ فوت نہ ہوا اسی لیے خطا پر ندامت اور عفوِ تقصیر کی استدعا ہوئی۔

حق تعالیٰ نے جس طرح آسمانوں کو فرشتوں اور آفتاب و ماہتاب کے نور سے منور فرمایا ہے اسی طرح قلوب و ارواح کو اپنی ذات اور صفات کے انوار سے (جو ذکر کے سبب ان میں حاصل ہو جاتا ہے) منور فرمایا ہے اور اسم ذات یعنی اللہ اور کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا نور سب سے زیادہ روشن اور صاف ہے۔ پس جب ذکر کنندہ اس پر مداومت کرتا ہے تو اس ذکر کا نور قلب کے نور کے ساتھ جمع ہو کر قلب کے اندر ایسی جگہ پکڑ لیتا ہے کہ الگ نہیں ہو سکتا اور قلب کی ذاتی صفت بن جاتا ہے اور یہی مطلب ہے صوفیاء کے اس قول کا کہ کلمۂ طیبہ

[1] الانفال، ۸:۲۔
[2] صحیح بخاری، حدیث ۶۹۷۰، جلد ۶، صفحہ ۲۶۹۴۔

قلب اور سر میں بیٹھ جاتا ہے یعنی اس کا نور متمکن ہو جاتا ہے۔ پس ذکر کی ابتداء سے علم حاصل ہوتا ہے چنانچہ فخرِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو اس عمل کے صلہ میں ایسا علم عطا فرماتا ہے جو اب تک اس کو حاصل نہ ہوا تھا اور ذکر کی انتہا سے حکمت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ فخرِ پیغمبراں ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ چالیس ایام تک حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عمل کرتا ہے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے زبان پر جاری ہونے لگتے ہیں۔'' اور صوفیاء نے ارشاد فرمایا ہے کہ مذکور ایک ہے اور ذکر اگر چہ مختلف ہیں مگر ذکر کی اصل یعنی قبولیت حق منجملہ لوازم کے ہے (کہ ہر ذکر سے حاصل ہوتی ہے)۔

شبلیؒ نے ایک جماعت سے فرمایا کہ تم لوگ ذاکر ہو اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ذاکرین کا ہمنشین ہوں۔ پس تم حق تعالیٰ کی ہم نشینی کا مرتبہ رکھتے ہو۔'' اسی طرح بعض بزرگوں سے بھی سوال کیا گیا کہ جنت میں بھی ذکر ہوگا یا نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ذکر تو غفلت کو دفع کرتا ہے اور جب جنت میں غفلت ہی نہ ہوگی تو وہاں ذکر ہونے کے معنٰی کیا؟

نزغِ شیطان

نزغ شیطان کا معنٰی ہے شیطان کا وسوسہ۔ حضرت سعید بن مسیب ؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان ؓ اور حضرت علی ؓ کی خدمت میں تھا، ان کے درمیان شیطان نے وسوسے ڈال دیئے تھے ان میں سے ہر ایک دوسرے کو بُرا کہتا رہا، پھر وہ اس وقت تک مجلس سے نہیں اٹھے جب تک کہ ہر ایک نے دوسرے سے معافی نہیں مانگ لی۔ متقدمین میں سے ایک استاد نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اگر شیطان تمہیں گناہوں پر اکسائے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کے خلاف کوشش کروں گا، استاد نے کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا، میں پھر کوشش کروں گا، کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا میں پھر کوشش کروں گا۔ استاد نے کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا۔ استاد نے کہا یہ بتاؤ اگر تم بکریوں کے ریوڑ کے درمیان سے گزرو اور بکریوں کا محافظ کتا تم پر بھونکنے لگے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کو دور بھگانے کی کوشش کروں گا استاد نے کہا اگر وہ پھر بھونکے تو، کہا میں اس کو دور بھگانے کی کوشش کروں گا، استاد نے یہی سوال پھر پوچھا تو کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا لیکن اگر تم بکریوں کے چرواہے سے مدد طلب کرو تو وہ کتے کو تم سے دور کر دے گا، اسی طرح جب شیطان تم کو کسی گناہ پر اکسائے تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو، وہ شیطان کو تم سے دور کر دے گا۔[1]

وسوسۂ شیطان کی وجہ سے عصمت انبیاء علیہم السلام پر اعتراض اور اس کے جوابات

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے منکرین نے کہا اگر انبیاء علیہم السلام کا گناہ اور معصیت پر اقدام ناممکن ہوتا تو اللہ

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷، صفحہ ۳۱۱۔

تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ ''اگر شیطان تم کو کوئی وسوسہ ڈالے تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ ثانیاً اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس آیت میں نبی ﷺ کو خطاب ہو تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر بالفرض شیطان آپ ﷺ کو کوئی وسوسہ ڈالے تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں اور اس سے شیطان کا آپ ﷺ کو وسوسہ ڈالنا لازم نہیں آتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ'' [1] (اگر تُو نے شرک کیا تو یقیناً تیرا عمل برباد ہو جائے گا)۔ اور اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ العیاذ باللہ شرک کریں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے ''قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝'' [2] فرما دیجیے کہ اگر (بفرضِ محال) رحمٰن کے (ہاں) کوئی لڑکا ہوتا (یا اولاد ہوتی) تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا)۔ صرف وسوسہ ڈالنا عصمت کے منافی نہیں ہے، عصمت کے منافی یہ ہے کہ آپ ﷺ شیطان کا وسوسہ قبول کریں۔ اور یہ اس آیت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے ''اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝'' [3] (بے شک میرے (اخلاص یافتہ) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوائے ان بھٹکے ہوؤں کے جنہوں نے تیری راہ اختیار کی)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان کا قرین لگا دیا گیا ہے اور ایک قرین فرشتوں میں سے لگا دیا گیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی اور وہ مسلمان ہو گیا وہ مجھے نیک باتوں کے سوا کوئی مشورہ نہیں دیتا۔ [4]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک بہت بڑا جن گزشتہ رات مجھ پر حملہ آور ہوا تاکہ میری نماز کو خراب کرے، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دی تو میں نے اس کو دھکا دے کر بھگا دیا، اور میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں حتیٰ کہ صبح کو تم سب اسے دیکھتے۔ پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا یاد آئی ''رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ'' [5] (اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیبا نہ ہو)۔ [6] اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ شیطان کو نبی ﷺ پر کوئی غلبہ نہیں بلکہ نبی ﷺ ہی غالب تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ نبی ﷺ شیطان کا وسوسہ قبول کریں۔

رابعاً اس آیت میں بظاہر آپ ﷺ کو خطاب ہے لیکن مراد آپ ﷺ کی امت ہے کہ جب

---

[1] الزمر، ۳۹: ۶۵۔ [2] الزخرف، ۴۳: ۸۱۔ [3] الحجر، ۱۵: ۴۲۔ [4] صحیح مسلم، حدیث ۲۸۱۴، جلد ۴، صفحہ ۲۱۶۷۔
[5] ص، ۳۸: ۳۵۔ [6] صحیح بخاری، حدیث ۱۱۵۲، جلد ۱، صفحہ ۴۰۵۔

شیطان مسلمانوں کو کسی چیز کا وسوسہ ڈالے تو وہ اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝" [1] (بے شک جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال بھی چھو لیتا ہے (تو وہ اللہ کے امر و نہی اور شیطان کے دجل و عداوت کو) یاد کرنے لگتے ہیں سو اسی وقت ان کی (بصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں)۔

طَائِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ کا معنیٰ

علامہ راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں "انسان کو ورغلانے کیلئے انسان کے گرد گردش کرنے والے شیطان کو طائف کہتے ہیں، کسی چیز کا خیال یا اس کی صورت جو نیند اور بیداری میں دکھائی دے اس کو طیف کہتے ہیں"۔ [2]

علامہ المبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر جزریؒ لکھتے ہیں: "طیف کا اصل معنیٰ جنون ہے پھر اس کو غضب، شیطان کے مس کرنے اور اس کے وسوسہ کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا اور اس کو طائف بھی کہتے ہیں۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکیؒ لکھتے ہیں "طیف کا معنیٰ تَخَیُّلٌ ہے اور طائف کا معنیٰ شیطان ہے، اور اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں جب انہیں کوئی وسوسہ لاحق ہو تو وہ اللہ عزوجل کی قدرت میں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعام کیے ہیں ان میں غور کرتے ہیں اور پھر معصیت کو ترک کر دیتے ہیں"۔ [3]

انسان کس طرح غور و فکر کر کے انتقام لینے کو ترک کرے

امام فخر الدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: "جب انسان کسی دوسرے شخص پر غضبناک ہو اور اس کے دل میں شیطان یہ خیال ڈالے کہ وہ اس سے انتقام لے تو پھر انتقام نہ لینے کی وجوہات پر غور و فکر کرے اور انتقام لینے کے ارادہ کو ترک کر دے۔ وہ وجوہات حسب ذیل ہیں۔

1) انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خود کتنے گناہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سزا دینے پر قادر ہے، اس کے باوجود اس سے درگزر کرتا ہے اور اس سے انتقام نہیں لیتا سو اس کو بھی چاہیے کہ وہ انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دے۔

2) جس طرح اس کا مجرم بے بس اور مجبور ہے اسی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مجرم ہے اور اس کے سامنے مجبور اور بے بس ہے۔

---

[1] الاعراف، ۷:۲۰۱　[2] المفردات فی القرآن، جلد۲، صفحہ۴۰۶۔　[3] النہایہ، جلد۳، صفحہ۱۳۹۔

۳) غضبناک شخص کو ان احکام پر غور کرنا چاہیے جن میں اسے انتقام کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

۴) اس کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے غضب اور انتقام کے تقاضوں کو پورا کر دیا تو اس کا یہ عمل موذی درندوں کی طرح ہوگا اور اگر اس نے صبر کیا اور انتقام نہیں لیا تو اس کا یہ عمل انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرامؒ کی مثل ہوگا۔

۵) اس کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس کمزور شخص سے آج وہ انتقام لینا چاہتا ہے، ہوسکتا ہے کل وہ قوی اور قادر ہو جائے اور یہ کمزور اور ناتواں ہو جائے اور اگر وہ اس کو معاف کر دے تو پھر یہ شخص اس کا احسان مند رہے گا''۔[1]

امام رازیؒ نے ترک انتقام کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان کو معصیت کی دیگر انواع میں بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ جب بھی شیطان انسان کو کسی معصیت اور گناہ پر اکسائے وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اتنی مہربانی کرتا ہے تو کیا یہ انصاف ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ نیز اس پر غور کرے کہ اگر اس نے یہ گناہ کیا تو اس سے شیطان راضی ہوگا اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا تو کیا یہ جائز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض اور شیطان کو راضی کرے۔ نیز یہ سوچنا چاہیے اگر آج اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھلا دیا تو ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو بھلا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنسٰكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا''[2] (اور (اُن سے) کہا جائے گا آج ہم تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم نے اپنے اِس دن کی پیشی کو بھلا دیا تھا)۔ سوچنا یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں رزق دینے اور پرورش کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ اس کو پورا کر رہا ہے تو اس نے کلمہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جو وعدہ کیا ہے، وہ اس کو کیوں پورا نہیں کر رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ''[3] (اور تم میرے (ساتھ کیا ہوا) وعدہ پورا کرو میں تمہارے (ساتھ کیا ہوا) وعدہ پورا کروں گا)۔ اور یہ سوچنا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جو دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول کر لیتا ہے تو پھر کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ کہے وہ بھی اس پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِي ''[4] (میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے، پس انہیں چاہیے کہ میری فرمانبرداری اختیار کریں)۔

نیز یہ غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے وہ گناہ کر لیا تو وہ فُساق وفُجار کی مثل ہوگا اور اگر اس نے اس گناہ سے دامن بچا لیا تو وہ انبیاء علیہم السلام کا متبع اور اولیاء کی مانند ہوگا۔ اور جو شخص فُساق وفُجار کے کام کرے گا وہ کیسے یہ توقع کر سکتا ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت کی زندگی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی طرح ہوگی! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اَمْ

[1] الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷، صفحہ ۳۱۳۔　[2] تفسیر کبیر، جلد ۵، صفحہ ۴۳۷۔
[3] الجاثیہ، ۴۵:۳۴۔　[4] البقرۃ، ۲:۱۸۶۔

حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ" [1] کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کمار کھی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے (کہ) اُن کی زندگی اور ان کی موت برابر ہو جائے۔ جو دعویٰ (یہ کفار) کر رہے ہیں نہایت برا ہے)۔ اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں، اپنے شاگردوں، مریدوں اور اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے بے حیائی کے اور برے کام نہیں کرتا اور جب تنہا ہو اور صرف اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہو تو وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں سے باز نہیں آتا کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ اس کے دل میں اللہ کا اتنا خوف بھی نہیں ہے، جتنا اپنے ماتحت لوگوں اور چھوٹوں کا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ" [2] (لوگوں سے مت ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرا کرو)۔

اور یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے لوگوں کے ڈر سے برے کام چھوڑ بھی دیئے تو وہ اس کو کوئی انعام نہیں دیں گے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے اس نے گناہ، بُرے کام چھوڑ دیئے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بہت بڑے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ٥ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ٥" [3] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات وشہوات سے باز رکھا، تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا ٥) نیز فرمایا "وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ٥" [4] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور (پیشی کیلئے) کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اُس کیلئے دو جنتیں ہیں)

خوفِ خدا سے مرنے والے نوجوان کو دو جنتیں عطا فرمانا

امام ابو القاسم بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں: یحییٰ بن ایوب الخزاعی" بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا جس نے مسجد کو لازم کر لیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے بہت خوش تھے، اس کا باپ بوڑھا تھا، وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کی طرف لوٹ آتا تھا، اس کے راستہ میں ایک عورت کا دروازہ تھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی، وہ اس کے راستہ میں کھڑی ہو جاتی تھی، ایک رات وہ اس کے پاس سے گزرا تو وہ اس کو مسلسل بہکاتی رہی حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا، جب وہ اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو وہ بھی داخل ہو گئی، اس نوجوان نے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا شروع کیا اور اس کی زبان پر یہ آیت جاری ہو گئی "اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ" (بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں انہیں اگر شیطان کی طرف سے

---

[1] الجاثیہ، ۴۵:۲۱۔ [2] المائدہ، ۵:۴۴۔ [3] النّٰزعٰت، ۷۹: ۴۰، ۴۱۔ [4] الرحمٰن، ۵۵:۴۶۔

کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں)۔[1]

پھر وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر گیا، اس عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اس نوجوان کو اٹھایا اور اسے اس کے گھر کے دروازہ پر چھوڑ آئیں۔ اس کے گھر والے اسے اٹھا کر گھر میں لے گئے، کافی رات گزرنے کے بعد وہ نوجوان ہوش میں آیا۔ اس کے باپ نے پوچھا بیٹے تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا خیر ہے، باپ نے پھر پوچھا تو اس نے پورا واقعہ سنایا۔ باپ نے پوچھا۔ اے بیٹے تم نے کون سی آیت پڑھی تھی؟ تو اس نے اس آیت کو دہرایا جو اس نے پڑھی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا گھر والوں نے اس کو ہلایا جُلایا لیکن وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے اس کو غسل دیا اور لے جا کر دفن کر دیا، صبح ہوئی تو اس واقعہ کی خبر حضرت عمر ﷛ تک پہنچی۔ صبح کو حضرت عمر ﷛ اس کے والد کے پاس تعزیت کیلئے آئے اور فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ اس کے باپ نے کہا رات کا وقت تھا۔ حضرت عمر ﷛ نے فرمایا ہمیں اس کی قبر کی طرف لے چلو، پھر حضرت عمر ﷛ اور ان کے اصحاب ﷛ اس کی قبر پر گئے، حضرت عمر ﷛ نے کہا اے نوجوان! جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کیلئے دو جنتیں ہیں؟ تو اس نوجوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر ﷛! مجھے میرے رب عزوجل نے جنت میں دوبار دو جنتیں عطا فرمائی ہیں۔[2]

حسن بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب ﷛ کے زمانہ میں ایک نوجوان نے عبادت اور مسجد کو لازم کر لیا تھا، ایک عورت اس پر عاشق ہو گئی، وہ اس کے پاس خلوت میں آئی اور اس سے باتیں کیں اس کے دل میں بھی اس کے متعلق خیال آیا، پھر اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چچا آیا اور اس کو اٹھا کر لے گیا جب اس کو ہوش آیا تو اس نے کہا اے چچا! حضرت عمر ﷛ کے پاس جائیں ان سے میرا سلام کہیں اور پوچھیں کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کی کیا جزا ہے؟ اس کا چچا حضرت عمر ﷛ کے پاس گیا، اس نوجوان نے پھر چیخ ماری اور جاں بحق ہو گیا۔ حضرت عمر ﷛ اس کے پاس کھڑے ہوئے اور کہا تمہارے لیے دو جنتیں ہیں، تمہارے لیے دو جنتیں ہیں۔[3]

حافظ ابن عساکرؒ نے جو حدیث تفصیلاً روایت کی ہے اس پر حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اعتماد کیا ہے اور اس کو اپنی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس حدیث سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ گناہ کی ترغیب کے موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس کے خوف سے گناہ کو ترک کر دینا دو جنتوں کے حصول کا سبب ہے۔

۲۔ نیک مسلمان اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

---

[1] اعراف، ۷: ۲۰۱۔ [2] تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰۔ [3] شعب الایمان، حدیث ۷۳۶، جلد ۱، صفحہ ۴۶۹۔

۳۔ نیک مسلمانوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کیلئے جانا حضرت عمرؓ کی سنت ہے۔

۴۔ کسی فوت شدہ مسلمان کی تعزیت کیلئے اس کے والدین اور اعزہ کے پاس جانا حضرت عمرؓ کا طریقہ ہے۔

۵۔ صاحبِ قبر سے کلام کرنا اور صاحبِ قبر کا جواب دینا، اس حدیث سے یہ دونوں امر ثابت ہیں۔

۶۔ جن احادیث میں ہے کہ قبر والے ایسا جواب نہیں دیتے جن کو تم سن سکو، ان کا معنی یہ ہے کہ تم ان کا جواب عادۃً نہیں سن سکتے۔

تلبیسِ ابلیس

جان لے کہ شیطان اکثر جاہلوں کو اباحت میں ڈال دیتا ہے اس طرح کہ اس جاہل سے ملمع دار باتیں بناتا اور باطل حجتیں پیش کر کے کہتا ہے کہ میاں! شریعت اور طریقت کا مقصود تو یہی مشاہدہ تک پہنچ جانا ہے جس پر تو خود پہنچ گیا ہے اور جس طرح مر جانے کے بعد شریعت کی تکلیف اٹھ جاتی ہے۔ اسی طرح مقصود کے حاصل ہو جانے کے بعد تکلیف بھی اٹھ جاتی ہے۔ پس جو تیرا جی چاہے کر۔ اور کبھی کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو تیری عبادت واطاعت کی پرواہ نہیں اور تجھ کو جو شریعت کے احکام کا مکلف بنایا تھا وہ تو صرف اس لیے کہ نفس کی صفائی اور طہارت حاصل ہو اور جب تجھ کو یہ تزکیہ بدرجۂ کمال حاصل ہو گیا اور تُو روحانیت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اب اطاعت کی حاجت نہیں رہی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے اور عین حالت نافرمانی میں اس کو جھوٹے انوار اور من گھڑت پیاری شکلیں دکھلاتا ہے اور پھر اس کے دل میں کھلم کھلا یہ مضمون ڈالتا ہے کہ دیکھ اب تو تکلیف تجھ سے اٹھ گئی کہ گناہ بھی تجھ کو نقصان نہیں دیتا بلکہ تیرا عصیان بھی بمنزلہ اطاعت کے بن گیا (کہ تجلیات کا ورود ہوا)۔

شیطان کی گمراہیوں سے بچنے کا طریقہ

یہ سارے تخیلات کے حیلے اور چالبازیاں ہیں اور ان گمراہیوں سے نجات پانے کیلئے علمائے عظامؒ نے بہت سے اسباب تجویز فرمائے ہیں۔ مثلاً یہ یقینی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مشاہدہ کا مرتبہ ان سے زیادہ قریب اور قوی تھا اور وہ حضرات حقائق اور باطنی امور کو سب سے زیادہ جانتے تھے باوجود اس رفعت وشان کے انہوں نے کبھی کسی اطاعت کو بھی مہمل نہیں چھوڑا اور چھوٹے سے چھوٹے گناہ پر بھی جرأت نہ کر سکے بلکہ گناہ میں احتیاط اور عبادت میں مجاہدہ سب سے زیادہ کیا۔ پس گناہ کے مباح ہو جانے کا مذہب جس کو اباحت کہتے ہیں کس طرح صحیح ہو جائے گا۔ نیز سمجھے کہ قرآن وحدیث میں ایسا کوئی حرف کسی شخص کیلئے بھی کسی حالت

میں کیوں نہ ہو ہرگز ہرگز نہیں پایا جاتا۔ بلکہ قرآن اور احادیث اور امت کا اجماع ظاہر و باطن اس شخص پر جو شریعت کے امور تکلیفیہ میں سے ذرا سی چیز کی بھی اہانت کرے پوری سختی کرتے ہیں نیز جھڑکتے، ڈانٹتے اور حدود و تعزیر قائم کرتے ہیں اور احکامات شریعہ کی تعظیم اور نواہی سے بچنے کا اتنی تاکید کے ساتھ حکم دیتے ہیں کہ حد وانتہا سے زیادہ ہے۔ پھر اباحت کسی کو کس طرح جائز ہوسکتی ہے؟ اور اس قسم کے دلائل مشائخ و علماء کے پاس مذاہب اباحت کے باطل ہونے پر بکثرت ہیں۔

شیطان کی مزید چالبازیاں

اکثر جاہلوں کو شیطان لعین فرقہ مجسمہ میں داخل کر دیتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ اوّل دل میں یہ ڈالتا ہے کہ یہ صورتیں اور شکلیں جو مشاہدہ میں دکھائی دیتی ہیں بعینہٖ حق تعالیٰ کی ذات ہیں اس کے بعد باطل کا مشاہدہ کراتا ہے اور یہ عقیدہ کہ (نعوذ باللہ خدا کی صورت و شکل ہے) مضبوط بنا دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان تخت پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور یہ مضمون حدیث شریف میں بھی آیا ہے۔ پس وہ جاہل آتش اور تخت سے دھوکہ کھا کر اس کو اپنا رب سمجھ کر سجدہ کرتا ہے اور مجسمہ کے مذہب سے اپنے عقیدہ کی گرہ باندھ لیتا ہے اور یہ قصہ مصر کے راستہ میں ایک شخص کو پیش آیا کہ اس نے جنگل میں شیطان کو معلق تخت پر دیکھا۔ (اور چونکہ خدا کیلئے جسم نہ ہونے کا عقیدہ جاتا رہا تھا اس لیے) یوں سمجھ کر کہ یہی نعوذ باللہ حق تعالیٰ ہے اس کو سجدہ کیا اور اس کے بعد بغداد پہنچ کر مشائخ کی جماعت کے سامنے قصہ نقل کیا۔ ان مشائخ نے فرمایا کہ وہ تو شیطان تھا۔ اس دلیل سے کہ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”شیطان کیلئے تخت ہے کہ اس کو زمین و آسمان کے درمیان معلق کر کے اس پر بیٹھتا ہے“ پس اسی وقت وہ شخص اٹھا ایمان کی تجدید کی اور ساری نمازیں لوٹائیں۔ اس کے بعد جہاں اس ملعون کو دیکھا تھا وہاں آیا اور اس پر لعنت کر کے کہا کہ بلاشبہ شیطان تو ملعون ہے میں تجھ پر لعنت کرتا ہوں اور خدائے یگانہ و فردِ حقیقی جل شانہ پر ایمان لاتا ہوں۔

تجسم کی بلاء سے نجات کیلئے علمائے راسخین کے پاس بہت دلیلیں ہیں منجملہ اس کے یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ساری گزشتہ امتیں اور موجودہ مومنین اور تمام مشائخ و علماء چھوٹے اور بڑے سب اس بات پر اتفاق اور اجماع رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات اور صفات جسمیت سے منزّہ اور پاک ہے اور وہ اجسام و اعراض میں کسی چیز کے ساتھ بھی مشابہت نہیں رکھتی اور جملہ اشیاء مخلوق نو پیدا ہیں اور حق تعالیٰ تمام اشیاء کا پیدا کرنے والا، قدیم، ازلی و ابدی اور ظاہر ہے کہ اپنے قبول و برگزیدہ بندوں کا اجماع و اتفاق باطل امر پر کس طرح ہوسکتا ہے؟ پس ثابت ہوا کہ ایسے جاہل کا عقیدہ باطل ہے۔

عقیدۂ حلول کی تردید

شیطان جاہلوں کو حلول کے عقیدہ میں ڈال دیتا ہے۔ کہ ان کے دلوں میں باطل مقدمات ڈال دے اور وہ ان پر اپنے عقائد باطلہ کو متفرع کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ان کو جتلاتا ہے کہ روحانیات کی قسم میں سے جو کچھ تم مشاہدہ کر رہے ہو یہ تمہاری ہی باطنی چیزیں ہیں اس لیے خارج میں ان کی رؤیت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جب ان کو مشاہدہ ہوتا ہے اور اپنے وطن کی کوئی چیز دیکھتے اور جانتے ہیں کہ جو کچھ مشاہدہ میں نظر آتا ہے وہ بھی ہمارا نفس ہی ہے۔ پس حق تعالیٰ بھی (جس کا مشاہدہ ہوا) ہمارا نفس ہوا کہ ہم میں حلول کر آیا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهَا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی جاہل پر حال نازل ہو کر غلبہ پکڑتا ہے تو اس حال کی قوت کے سبب ان سے خارقِ عادات امور اور کرامتیں صادر ہونے لگتی ہیں۔ پس اس وقت شیطان ان کے خیال میں یوں ڈالتا ہے کہ یہ حال جس نے تیرے اندر نزول کیا ہے حق تعالیٰ ہی ہے کہ اس طرح پر اپنی قدرت دکھاتا اور خلاف عادت کرتا ہے۔ اس وقت وہ جاہل اس پر فریفتہ ہو کر حلول کا عقیدہ اختیار کر لیتا ہے اور اس سے نجات کی یہ صورت ہے کہ غور کرے اور جانے کہ یہ تو حال کی تاثیر ہے اور حال عنایتِ خداوندی ہے اور دیکھنے والے کی نگاہ ہے وہ خود دیکھنے والا نہیں ہو سکتا اور کھلی ہوئی بات ہے (جس کو دلیل کی ضرورت نہیں کہ ناظر اور چیز ہے اور نظر دوسری چیز ہے) اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سالک ابھی عالم نفس و ہویٰ میں ہوتا ہے اور خواب یا حال میں یوں دیکھتا ہے کہ وہ خدا ہے۔ پس سمجھنے لگتا ہے کہ فی الواقع میں خدا ہی ہوں کہ خدا تعالیٰ میرے اندر حلول کر آیا ہے حالانکہ یہ خواب تعبیر کا محتاج ہے اور تعبیر اس کی یہ ہے کہ یہ شخص ابھی تک اپنے نفس کا بندہ بنا ہوا ہے اور نفس کو محبوب اور خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اسی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا خیال سمجھتے ہیں۔ اس کا علاج نفس و ہویٰ کی اطاعت کو ترک کرنا ہے کہ جو کچھ نفس کی خواہش ہو اس کو مجاہدہ اور ریاضت سے قطع کرنا چاہیے اور اس قسم کے واقعہ کو محال نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ تخیلات اس قسم کی باتیں کس طرح دیکھ لیتے ہیں، اس لیے کہ یہ شخص بھی دوسروں کی طرح عامی ہے۔ پس دوسرے بھی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ گویا وہ نوح علیہ السلام یا آدم علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام یا جبرائیل علیہ السلام یا میکائیل علیہ السلام اور کوئی فرشتہ یا کسی قسم کے جانور درندہ وغیرہ ہیں اور کبھی دیکھتے ہیں کہ اڑ رہے ہیں اور کبھی دوسرے عجائبات دیکھتے ہیں اور ان سب خوابوں کو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے اگرچہ واقعہ میں وہ شخص درندہ و پرندہ وغیرہ نہیں ہو جاتا اور کبھی حلول کی غلطی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ صوفی جب عالم نفس و ہویٰ سے آگے بڑھ کر عالم حقیقت اور فنا کو پہنچتا ہے تو بجز حق تعالیٰ کے کسی چیز کی خبر نہیں رکھتا تو اعتقاد کرتا ہے کہ بجز حق تعالیٰ کے نہ کسی کو دیکھتا ہے نہ جانتا ہے اور ساری چیزوں کو بلکہ اپنے نفس کو بھی فراموش کر دیتا ہے اور صوفیائے کرامؒ کے نزدیک اسی کا نام فنا ہے۔ پس جہاں بھی خدا کو دیکھتا ہے اور کسی چیز کی خبر نہیں

رکھتا تو اعتقاد کرتا ہے کہ بجز حق تعالیٰ کے کوئی وجود نہیں اور میں حق ہوں پس ''اَنَـــا الْـحَـقُّ '' اور اسی قسم کے دوسرے کلمات کہنے لگتا ہے۔ سننے والا شخص یہ کلمات سن کر حلول کا اعتقاد کر بیٹھتا ہے اور اس عقیدۂ فاسدہ سے نجات کی یہ صورت ہے کہ صوفی کو جاننا چاہیے کہ یہ سمجھنا اس سبب سے ہوا کہ دنیا و آخرت کی ساری چیزیں فراموش ہو گئیں اور اپنے نفس و صفات کو بھی بھول کر مشاہدہ اور علم باللہ میں اپنے باطن کے ساتھ محو و مستغرق ہو گیا ورنہ واقع میں تو ساری چیزیں سابق کی طرح اپنی حالت پر موجود ہیں اور اس مقام پر تو پہنچنا بہت ہی اچھا ہے کہ عالی مقام ہے۔ مگر بوجہ مذکورہ اس غلطی کا اندیشہ ہے کہ بعض دفعہ خود وہ صوفی بھی اس حالت سے افاقہ پانے کے بعد اپنے جہل کے سبب حلول کا اعتقاد کر بیٹھتا ہے۔ پس اس جگہ پر شیخ کامل کا ہونا شرط ہے تاکہ اس تباہی کی جگہ سے امان دے اور کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے کہ صوفی ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ جس چیز پر بھی نظر ڈالتا ہے خدا تعالیٰ ہی کو پاتا ہے اور یہ مشاہدۂ معرفت ہوتا ہے اور اسی سے یہ قول مستنبط ہے کہ ''جس چیز کو بھی میں نے دیکھا خدا تعالیٰ کو پایا۔'' بعض نے یوں کہا ہے کہ ''جس چیز کو بھی میں نے دیکھا اس چیز سے پہلے خدا کو پایا۔'' پس جب ایسا معاملہ پیش آتا ہے تو اعتقاد کر لیتا ہے کہ حق تعالیٰ ساری چیزوں میں حلول کر آیا ہے حالانکہ اللہ پاک اس سے بہت بلند ہے اور اس خرابی سے نجات کی یہ صورت ہے کہ یقین کے ساتھ جانے کہ یہ عظمت و کبریائی کا حجاب ہے کہ ہر جگہ دکھائی دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ تمام اشیاء کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر شے کے ساتھ قرب و معیت رکھتا ہے اور ذرہ برابر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور باوجود اس کے حق تعالیٰ سب سے جدا ہے اور مخلوق اس سے مباین ہے۔ پس مخلوق کا اس میں حلول کرنا یا اس کا مخلوق میں حلول کرنا دونوں ہی محال ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء و علماء حلول کے خلاف پر متفق ہیں۔ پس حلولی کا مذہب اعتماد کے قابل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس عقیدہ کو خوب محفوظ رکھے کہ اس مرتبہ میں حلول کی غلطی بہت پڑتی ہے۔

شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے ہتھیار

حدیث قدسی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اے میرے بندے شیطان مجھ سے دور ہے اور تو مجھ سے قریب ہے۔ لہٰذا حسنِ ادب ملحوظ خاطر رکھ۔ یہاں تک کہ تجھ پر شیطان کا داؤ نہ چلے۔ وہ کسی طرح بھی تجھ پر قابو نہ پا سکے۔ حسن ادب احکام کو بجا لانا اور ممنوعات سے بچنے کو کہتے ہیں اور اگر ایسا ہو تو اس سے شیطان کے وسوسوں، نفس کے خطروں، فتنوں اور نفس کی سرکشی سے نجات ملتی ہے۔

استخارہ

استخارہ یا تعوذ اللہ کی پناہ طلب کرنا ہے اور نور معرفت کی شعاع کو طلب کرنا ہے، جو شیطان کی کسی کام میں شرکت کو روک دیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سائے سے بھی بھاگتا

ہے۔[1] فرمایا کہ جس وادی سے حضرت عمرؓ گزرتے ہیں شیطان اس وادی کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ شیطان حضرت عمرؓ کو دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ اگر شیطان کسی بندے کو سچائی پر دیکھتا ہے تو اس کا رخ چھوڑ دیتا ہے مگر چھپ چھپا کر اس کے پاس آتا رہتا ہے۔ شیطان کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بڑھاپے میں دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ تعالیٰ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں زنا کروں یا کسی کو قتل کروں۔ کسی نے پوچھا کہ آپؓ کو بڑھاپے میں بھی یہ خوف ہے، فرمایا کیوں نہ خوف کروں کیونکہ شیطان تو بوڑھا نہیں ہوا۔

شیطان کن باتوں سے گھبراتا ہے

جن کلمات سے شیطان بھاگتا ہے ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میرا قلعہ ہے اور جس کسی نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیا وہ میرے اس قلعے میں داخل ہو گیا، میرے عذاب سے بچا اور محفوظ ہو گیا۔ ذکرِ الٰہی کا درجہ فرائض، واجبات کے ادا کرنے اور ممنوعات کے ترک کے بعد ہے۔ ذکر سے انسان پر نورانی لباس چڑھ جاتا ہے جس کو شیطان دیکھ کر دور بھاگ جاتا ہے۔ یورپ کے سائنسدانوں نے بھی لکھا ہے کہ عملِ خیر سے جسم پر ایک خاص رنگ نمودار ہو جاتا ہے اور جن میں روحانی طاقت ہے اس رنگ کو دیکھ لیتے ہیں۔ (دیکھیں ہماری تصنیف حُسنِ نماز ''عبادت سائنسدانوں کی نظر میں'')۔
قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَھُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ ''[2] (اور جو شخص (خدائے) رحمان کی یاد سے صرفِ نظر کرلے تو ہم اُس کیلئے ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے)۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ '' بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط '' کے بکثرت پڑھنے سے بھی شیطان چھوٹا بن جاتا ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ شیطان ہلاک ہو جائے تو شیطان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ مجھے اپنی عزت کی قسم میں نے تجھ پر قبضہ پالیا۔

شیطان سے مقابلہ کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے علاوہ دنیا والوں سے کسی قسم کا طمع نہ رکھو، نہ ان کے مال کی تعریف اور نہ ان کی طاقت کی مدح کرو۔

شیطان سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مباح اور حلال چیزوں کے استعمال میں بھی کمی کردو۔ خواہش اور حرص کیلئے کھانا نہ کھاؤ۔ اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ کھانے کیلئے مت بیٹھا کرو بلکہ کھلانے کیلئے بیٹھو

[1] کشف المشکل، حدیث ۶۳۳، جلد ۲، صفحہ ۱۶۴۔
[2] الزخرف، ۳۶:۴۵۔

یعنی جسم کا حق ادا کرنے کیلئے نہ کہ لذت طعام کیلئے۔

امام غزالیؒ کا شیطان پر حاوی ہونے کا نسخہ

امام غزالیؒ اپنی کتاب ''نسخہ کیمیا'' میں فرماتے ہیں: کہ انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس نور عقل کی مدد سے (اس کی روشنی میں) جو فرشتوں کے انوار و آثار میں سے ہے، شیطان کے مکروفن کو دیکھے (اور عریاں دیکھے) اور سمجھے تاکہ وہ (شیطان) ذلیل وخوار ہو جائے اور کسی قسم کا فتنہ نہ پھیلا سکے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''ہر آدمی کا ایک شیطان ہے اور میرا بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب کر دیا (وہ شیطان میرا مفتوح ہے) اور وہ میرے سامنے مغلوب و بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور مجھے شر پر آمادہ نہیں کر سکتا۔''[1]

انسان کو یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرص و شہوت کے اس خنزیر اور غیظ و غضب کے اس کتے کو عقل کے تابع رکھ، تاکہ اس کے حکم کے بغیر نہ اٹھ سکیں اور نہ بیٹھ سکیں۔ اگر (انسان) ایسا کرے گا تو اس کو اس سے نیک و پسندیدہ اخلاق و عادات حاصل ہوں گے اور اس کیلئے تخمِ سعادت ثابت ہوں گے، لیکن اگر اس کے خلاف کرے گا اور ان کی غلامی پر کمر بستہ ہو جائے گا تو اس میں ایسے اخلاق ظہور پذیر ہوں گے جو اس کی بدبختی کا بیج ثابت ہوں گے، اسی صورت میں اگر وہ اپنی حالت کو خواب میں دیکھے یا بیداری میں اسے دکھائی جائے تو اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہوگی جو کسی کتے یا خنزیر یا شیطان کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو کسی کافر کے حوالے کر دے تو اس کا حال کیا ہوگا؟ پس ظاہر ہے کہ (اس سے بھی آگے بڑھ کر) اگر کوئی شخص فرشتے کا ہاتھ کافر کے ہاتھ میں دے دے تو اس کا حال اور بھی زیادہ ابتر و بدتر ہوگا۔

زیادہ تر لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ انصاف کریں اور اپنا محاسبہ کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ رات دن اپنی نفسانی خواہشات کے حصول میں کمر بستہ رہتے ہیں، اور سچ پوچھو تو فی الوقت وہ ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے اگرچہ آدمی دکھائی دیتے ہیں لیکن کل قیامت میں تو اصل حقیقت آشکار ہو جائے گی، جہاں ظاہری نہیں بلکہ باطنی صورت میں اٹھایا جائے گا، یعنی وہ شخص جو یہاں شہوت و حرص سے مغلوب رہا، وہ خنزیر کی شکل میں دکھائی دے گا اور وہ شخص جس پر یہاں غصہ غالب رہا وہاں کتے یا بھیڑیے کی صورت میں پیش ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں بھیڑیے کو دیکھے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ مردِ ظالم کو دیکھے گا اور اگر خواب میں سور دکھائی دے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ کسی مردِ پلید سے دوچار ہوگا یعنی دراصل اپنے ہی آپ کو بالآخر اس صورت میں دیکھے گا۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۸۱۴، جلد ۴، صفحہ ۲۱۶۷۔

باب نمبر ۱۴

خواہشات وشہوات نفسانیہ

دنیا میں شہوت کی کشمکش

دنیا کا نظام چلانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی کشش کو تخلیق کیا جس سے تمام دنیا کی چیزیں ایک دوسرے سے پیوست ہوگئی ہیں اور وہ قوت جو حیوانوں اور انسانوں کو اپنے اپنے دائرے میں باندھے ہوئے ہے اس کو خواہشات نفسانیہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ خواہش نفسانیہ ایسی طاقت رکھتی ہے کہ انسان اور حیوان اپنی نفسانی تشنگی کو بجھائے بغیر اگر اپنی زندگی گزارنا چاہیں تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی نظام کے تحت انسانوں اور جانوروں کے جوڑے بنائے گئے ہیں اور اس میں جو ایک مخفی راز رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ نر اور مادہ کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا گیا ہے۔ ہر گھر کے افراد اس بات پر اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں کہ ان کی لڑکی کی جلد شادی ہوجائے اور لڑکے والوں کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا گھر آباد ہوجائے۔ اگر مناسب وقت پر شادی نہ کی جائے تو دونوں اصناف کے گناہ میں گرفتار ہونے کے بے شمار مواقع پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر انسان کی نفسانی خواہشات کا چکر نہ رکھا گیا ہوتا تو کوئی کسی کو اپنی لڑکی نہ دیتا اور نہ ہی اس ازدواجی بندھن میں پھنستا حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ان ازدواجی بندھنوں کا اختتام بالعموم کثیر تعداد میں جوڑوں کی تباہی پر ہوتا ہے۔ ہماری تصنیف ''متعلقات زوجین'' میں اس بندھن کو اسلامی تعلقات کی روشنی میں استوار کرنے کے لیئے خاطر خواہ تفصیل لکھ دی گئی ہے یہ کتاب انشاءاللہ کچھ عرصہ میں زیور طباعت سے آراستہ کی جائے گی۔ لڑکے اور لڑکی کی انتہائی خواہشات اس ازدواجی بندھن میں جلد از جلد آنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگر یہ شہوت کا بندھن نہ ہوتا تو فرشتوں کی طرح انسان بھی مجرد اور پاکبازی کی زندگی گزارتا۔ ازدواجی بندھن کے بعد بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان روٹی، کپڑا، مکان اور بچوں کی پرورش اور بہت سے جھمیلوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ سورۃ لقمان کی آیت نمبر ۱۴ کا

مفہوم یہ ہے کہ "بچے کی والدہ اسے ایک مدت تک اپنے پیٹ میں رکھتی اور اس کی مصیبتیں جھیلتی ہے" اور انسان یہ سب کچھ اپنی خوشی سے اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے برداشت کرتا ہے۔ لڑکی اپنے والدین کا گھر بار چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے غیروں کے سپرد ہو جاتی ہے اور اپنی پوری عمر اسی گھر میں گزار دیتی ہے۔ اگر اس پوری کہانی سے نفسانی شہوات کو نکال دیا جائے تو انسانی حیات ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ خود اس شہوانی بندھن کو پیدا کیا اور فرمادیا کہ اس لیے پیدا کیا کہ دنیا کا نظام چل سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی خواہشات کا یہ ماجرا انسان کے ضمیر میں بھی گوندھ دیا نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ "شہوت کا جائز حد تک استعمال کیا جائے" اور ان جائز خواہشات کو انسانوں کے حقوق میں شامل کر دیا۔ انسان کیلئے اس بندھن کو ایک شرعی حیثیت عطا فرمائی تا کہ اس نظام میں حیوانوں کا نظام داخل نہ ہو سکے۔ چنانچہ قرآن کی آیات اور احادیث کے بہت بڑا مجموعہ نے اس جواز کو ثابت کرنے اور اس انسانی حد کو عبور نہ کرنے کے قوانین وضع فرمائے تا کہ افراط وتفریط کے زغے سے نکل سکے۔

اس جگہ اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ مخلوقات میں شہوت کے نظام کو کس نہج پر استوار کیا گیا ہے۔

۱) فرشتے: اس مخلوق کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے عقل ودیعت کی ہے مگر شہوت سے پاک ومنزہ رکھا ہے۔

۲) جنات: جنات کو اللہ تعالیٰ نے عقل بھی عطا کی اور شہوت کا مادہ بھی رکھا چنانچہ ان کے ہاں بھی اولاد پیدا ہوتی ہے۔

۳) حیوانات: اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق کی سرشت میں شہوت رکھی ہے مگر عقل سے محروم کر دیا ہے۔

۴) انسان: اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف وممتاز اور افضل ترین مخلوق بنایا ہے۔ اس مخلوق کی فطرت میں باری تعالیٰ نے عقل اور شہوت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا ایک وجودِ انسانی میں جمع کرنا دراصل اسے بلند ترین منازل ومراتب پر فائز کرنے کیلئے تجویز فرمایا اور اس کو ایک کڑی آزمائش کی حیثیت دی چنانچہ اب اگر عقل شہوت پر غالب آ جائے تو انسان امتحان میں کامیاب ہو کر باری تعالیٰ کے حضور قربِ خاص حاصل کر لیتا ہے اور رشکِ ملائک بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر شہوت اس کی عقل پر اپنا غلبہ حاصل کر لے تو یہی مسجودِ ملائک انسان اسفل السافلین کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر بَلْ هُمْ اَضَلُّ (بلکہ جانوروں سے بھی بدترین) کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ گویا انسان اپنی عظمت وسر بلندی کے راز کو یعنی اپنی شہوت کو عقل وحکمت کے خنجر سے ذبح کر دیتا ہے اور اس کی تباہی وہلاکت کی وجہ شہواتِ نفسانی کی اتباع ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کیلئے (لذتِ شہوت کا دلدادہ) نفس کی عنان کو تھام کر رکھنا ضروری ہے ورنہ اکثر لوگ جو اپنے نفس کو مختارِ کل اور مطلق العنان کر لیتے ہیں جس وجہ سے تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شہوت کو انسانی خمیر میں رکھا

اللہ تعالیٰ نے شہوت کو انسانی خمیر میں رکھا اور اس کے غلبے سے بچنے کا حکم دیا۔ حضور تاجدارِ کائنات ﷺ

کا فرمان ہے: "اَلْهَوٰی وَالشَّهْوَةُ مَعْجُوْنَتَانِ بِطِيْنَةِ ابْنِ اٰدَمَ" [1] (نفسانی خواہش اور شہوت ابن آدم کے خمیر میں گوندھی گئی ہیں) جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہوت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طینت اور سرشت میں داخل فرمادیا۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ شہوت کی غلامی کسی انسان کی غلامی سے بدتر اور سخت ہوتی ہے۔ کسی آقا سے مملوک کی آزادی آسان ہے لیکن بندہ شہواتِ غلامی سے نفس کو آسانی سے خلاصی نہیں دلاسکتا، اس لئے کہ وہ خود عارضی لذت میں منہمک ہوکر خلاصی نہیں چاہتا۔ اس معاملے میں وہ غلام ہی رہنا پسند کرتا ہے اور رفتہ رفتہ گناہوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کسی دوسرے نے اس پر ظلم نہیں کیا اور نہ کسی غیر کا اس پر جبر ہے، اس نے خود ہی اپنے آپ کو مجبور و مظلوم بنایا ہے۔ جب وہ اپنی مرضی سے گرا ہے اور اس کنویں میں رہنا بھی چاہتا ہے تو اس کو کون نکالے ؎

بندۂ شہوت بدتر نزدیکِ حق　　　از غلام و بندگانِ مسترق

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہوت کا غلام زیادہ برا ہے رقیق بنائے ہوئے غلاموں سے) (م ۱-۳۸۷)

بندۂ شہوت نہ دارد خود خلاص　　　جز بفضلِ ایزد و انعامِ خاص

(شہوات کے غلام کی خلاصی نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے فضل اور خاص انعام کے) (م ۱-۳۸۷)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝" [2] (سوانہوں نے (نافرمانی اور ناشکری کر کے) ہمارا کچھ نہیں بگاڑا مگر اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے) انسان کی اسی فطری شہوت کے بارے میں امام غزالیؒ نے فرمایا کہ شہوت بادشاہوں کو غلام بنادیتی ہے اور صبر غلاموں کو بادشاہ بنادیتا ہے۔ ترکِ ھوٰی بندے کو پُر اُمید کرتی ہے اور اتباع ہوائے نفس اسے اسیر اور غلام بناتی ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ زلیخا امیر تھی مگر اتباعِ ھویٰ سے اسیر ہوگئی اور حضرت یوسف علیہ السلام اسیر تھے مگر ترکِ ھویٰ کیا تو امیرِ مصر بن گئے اور زلیخا اسیرِ شہوت ہونے کی وجہ سے حقیر و فقیر بن گئی۔ وہ محبت پر صبر نہ کرسکی۔

ایک دانا کا قول ہے کہ جس انسان پر اس کا نفس غالب آجاتا ہے وہ شہوت کا قیدی اور بیہودگی کے تابع ہوجاتا ہے۔ اس کا دل تمام فوائد سے محروم ہوجاتا ہے۔ جس کسی نے بھی بدن کے اعضاء کو شہوت سے سیراب کیا اس نے اپنے دل میں ندامت کاشت کی۔

حکایت: حضرت ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے کوہ مکارم میں انار دیکھے۔ کھانے کو جی چاہا تو ایک انار پھاڑا اور جب چکھا تو کھٹا ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ آگے گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی راستے پر پڑا ہے جس پر بھڑیں اکٹھی ہورہی تھیں۔ میں نے کہا: السلام علیکم! اس نے جواب دیا وعلیکم السلام اے ابراہیم۔ میں نے پوچھا آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔ اس نے کہا جو اللہ تعالیٰ کو پہچان لے اس پر کچھ مخفی نہیں رہتا۔ میں

---

[1] العلل المتناھیہ، علامہ ابن جوزی، متوفی ۵۹۷ھ، حدیث ۱۲۹۳، جلد ۲، صفحہ ۷۷۵، دارالکتب العلمیہ، بیروت [2] البقرۃ ۲:۵۷۔

نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا خاص حال دیکھا ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کی کہ تجھے اللہ تعالیٰ بھڑوں سے نجات دے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تیرا خاص حال دیکھا ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کی کہ وہ تجھے انار کی شہوت سے نجات دے۔ اس لیے کہ انار کا دکھ انسان آخرت میں پاتا ہے اور بھڑوں کا دکھ تو صرف دنیا میں پاتا ہے۔ بھڑیں تو صرف نفس کو کاٹتی ہیں اور شہوت دلوں کو کاٹتی ہے۔ اس کے بعد میں اس کو اسی حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

نفس کی آرزوؤں سے نجات کا نام راحت ہے

یوسف بلخیؒ نے کوئی چیز حاتم اصمؒ کے پاس بھیجی انھوں نے اسے قبول کر لیا کسی نے پوچھا آپؒ نے اسے کیوں قبول کر لیا۔ فرمایا کہ لینے میں ان کی عزت پائی جاتی تھی اور میری ذلت اور اس کے رد کرنے میں میری عزت تھی اور ان کی ذلت۔ حضرت خواصؒ فرماتے تھے کہ کسی شخص نے اگر کوئی خواہش ترک کی اور اس سے اُس کی روح کو تقویت نہ ملی تو سمجھ لو کہ اس کے ترک میں وہ جھوٹا ہے کیونکہ نفس کی آرزوؤں سے نجات کا نام راحت ہے

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے بارے میں بھی اسی طرح کی روایت آئی ہے کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنے فقراء کو کھانے پکانے کا طریقہ تعلیم فرمایا تھا اور ہر شخص کو کھانا پکانے کے مختلف فرائض سونپ دیئے تھے۔ ایک روز آپؒ کھانا تناول فرمانے لگے اور پہلا لقمہ اٹھایا تو اسے تناول نہ فرمایا اور واپس چھوڑ دیا اور پوچھا ''نظام الدین کیا بات ہے لقمہ گراں ہے؟'' حضرت نظام الدینؒ دست بستہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور عرض کرنے لگے کہ جناب کھانے سے متعلقہ تمام کام آپ کی ہدایت کے مطابق پورا کیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا نمک کہاں سے آیا؟ عرض کیا کہ جناب آج لنگر خانے میں کوئی پیسہ موجود نہ تھا اس لیے فلاں ہندو سے نمک ادھار خریدا گیا ہے۔ آپؒ نے کھانا تناول نہ فرمایا اور حضرت نظام الدینؒ کو مخاطب ہو کر فرمایا ''نظام الدین اولیاء اللّٰہ اگرچہ بہ فاقہ میرند، از برائے لذت نفس قرض نہ گیرند'' یعنی اولیاء اللہ اگرچہ فاقے سے ہی مر جائیں تو بھی لذت نفس کیلئے قرض نہیں لیتے۔

نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا نفس کے متعلق قول موجود ہے ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ'' [1] (بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرما دے)۔ ایک اور جگہ حکم باری تعالیٰ ہے ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ o فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى o'' [2] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس

[1] یوسف ۱۲: ۵۳۔
[2] النّٰزعٰت ۷۹: ۴۰، ۴۱۔

نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات وشہوات سے باز رکھا، تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔ راہِ سلوک میں نفس کو اپنا حکم چلانے سے روکنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور تصوف کی اصل بھی یہی ہے کہ سالک اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے۔

نفسِ امارہ کے اندر قوی ترمیلان شہوتِ جنسی کی تسکین ہے۔ نفس کا خمیر اعلیٰ اور ادنیٰ، غریب اور امیر سب میں کم وبیش پایا جاتا ہے۔ انسان ارتقائے حیات میں آگے کی طرف بڑھنا چاہتا ہے مگر نفسانی خواہشات پیچھے کی طرف کھینچتی ہیں لیکن شہوت کا رخ جسمانیت سے عقل اور روحانیت کی طرف پھیرا جا سکتا ہے اور یہی شہوت عقل میں تبدیل ہو سکتی ہے (دنیا کی خواہشات اور ان کی تسکین سراسر باطل ہیں اگر ایسی تخلیقی قوت کا رخ بدن کی طرف ہو تو وہ جائز حدود سے متجاوز ہو کر انسان کو ذلیل کرتی ہے اور روح کی طرف ہو تو انسان کو شریف تر بنا دیتی ہے۔ جب لوگوں کا باطن بہیمیت سے پاک وصاف ہے تو ان پر آتشِ شہوت اپنی بری تاثیر نہیں ڈال سکتی۔ شہوت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ا۔ شہوتِ حرام ۲۔ شہوتِ مباح

شہوتِ حرام سے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو محفوظ رکھتا ہے اور مباح کی کثرت سے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ اہل اللہ کی بہیمیت مضمحل ہو چکی ہوتی ہے اور ذکرِ حق ان کا ملکہ بن چکا ہوتا ہے اس لیے یہ کثرت (شہوتِ مباح کی) نہ ان کیلیے مقتضی الی الحرام (حرام کی طرف رغبت دلانے والی) ہوتی ہے اور نہ باعثِ غفلت۔ جبکہ راہِ سلوک کے مبتدی میں یہ احتمالات قوی ہیں۔

شہواتِ لذات

نفس جب رذائل وذمائم سے پاک نہیں ہوا تو لذاتِ مباحہ کی کثرت انسان کو اور بھی زیادہ مائل بشہوات اور دلدادۂ لذات کر دے گی جس سے وہ مکروہات ومحرمات کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے گا۔ ان پر دو آتش (آتشِ عنصری اور آتشِ مرض) میں سے پہلی عنصری آگ سے تمہارا گھر بار خاک سیاہ ہو جائے گا اور دوسری آگ وہ ہے کہ زندہ جسم کو بے جان کر دیتی ہے۔ اسی طرح آتشِ رذائل روح کو برباد کر کے چھوڑتی ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں۔

شہوت نارے براندن کم نشد　　　　اُو بماندن کم شود بے ہیچ بُود

(یہ شہوت مثل آتش ہے وہ پورا کرنے سے کم نہیں ہوتی (ہاں) وہ ساکن (اور ضبط) کرنے سے کم ہو سکتی ہے) (م ۱-۳۷۶)

اگر تمہارے اندر شہوت کی شدید حرارت اور آتش بیماری موجود ہے تو ایسی حالت میں تکثیر مباحات کی بد پرہیزی سخت مضر ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مرض کو رفع کس طرح کیا جائے چونکہ بعض لوگ نظرِ شہوتِ مذمومہ کا علاج یہ سمجھتے ہیں کہ شہوت کو پورا کر لیا جائے تا کہ طبیعت خالی ہو جائے پھر توبہ کر لی جائے چنانچہ شیطان یہی دھوکا دے کر بعض مبتدیانِ راہِ طریقت سے معصیت صادر کروا دیتا ہے۔ یہاں مولانا رومؒ

اسی غلطی پر متنبہ فرماتے ہیں کہ مرض شہوت کا یہ علاج نہیں کہ اس کے مقتضا کو عمل میں لایا جائے بلکہ اس کے استحصال کی صورت یہی ہے کہ اس کو ضبط کیا جائے اور اس کے مقتضا کی مطلق پرواہ نہ کی جائے حتیٰ کہ معطل اور بے کار رہ کر نابود ہو جائے۔ اس لیے وہ ذرائع جو شہوات پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں ان سے بھی اللہ تعالیٰ نے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے فرمایا ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ'' (اور آپ مومن عورتوں سے فرما دیں کہ وہ (بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں)۔[1]

شیطان کا وجود انسان سے الگ نہیں

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ شیطان انسان سے الگ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ نفسِ امّارہ اور شیطان ایک ہی معنٰی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔

نفس و شیطان هر دو یک تن بوده اند — در دو صورت خویش را بنموده اند

(نفس اور شیطان دونوں ایک تن تھے، انہوں نے دو صورتوں میں اپنے آپ کو دکھایا ہے) (م-۳-۳۸۶)

گر نه نفس از اندروں راهت زدے — رهزنان را بر تو دستے کے بدے

(اگر نفس اندر سے تیری راہزنی نہ کرتا۔ راہزنوں کو تجھ پر کب قابو ہوتا) (م-۳-۳۸۷)

حدیث شریف میں ہے ''اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ''[2] (تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان (یعنی تیرے باطن میں) ہے)۔

انسان کا نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں

امیر المؤمنین حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''لَا عَدُوَّ اَعْدٰی عَلَی الْمَرْءِ مِنْ نَفْسِهٖ اَللّٰهُ فِی الْجِهَادِ بِالنَّفْسِ فَهِیَ اَعْدَی الْعَدُوِّ لَکُمْ'' (انسان کا نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں۔ اللہ نفس کے ساتھ جہاد کرنے سے ملتا ہے کیونکہ نفس تمہارے لیے سب دشمنوں سے بڑا دشمن ہے)، آپؓ کا ایک ارشاد گرامی یہ بھی ہے کہ ''اِعْرِفُوا اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلَ بِالرِّسَالَةِ وَاُولِی الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَسُئِلَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیٌّ بِمَ عَرَفْتَ رَبَّکَ فَقَالَ بِمَا عَرَفْتُ نَفْسِیْ''[3]

امیر المؤمنین علیؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانو، اس کی ذات و صفات سے اور رسول اللہ ﷺ کو رسالت سے پہچانو اور حاکموں کو نیکیوں اور عدل و احسان سے پہچانو اور حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپؓ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: اس چیز سے جس سے میں نے اپنے نفس کو پہچانا۔

---

[1] النور، ۲۴: ۳۰۔ [2] التفسیر الکبیر، جلد ۱، صفحہ ۸۲۔ [3] اصول کافی، صفحہ ۴۱، مطبوعہ ایران۔

ابراہیم ذوق کا شعر ہے:

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر　　فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

نفسِ امّارہ کے اندر سے شیطان کی آواز پختہ گناہ گاروں کو نہایت بارعب اور پُر شکوہ معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کے اہلِ ہوس مکس کی طرح ہیں کہ باز سے تو نہیں ڈرتے لیکن شیطان کے جال میں جو نہایت بودا (کمزور) ہوتا ہے آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بھی گنہگار کی یہی نفسیات پیش کی ہیں ''وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ'' [1] (اور آراستہ کر دیئے ہیں ان کیلئے شیطان نے ان کے اعمال)۔

بقولِ عارف رومیؒ شیطان نفسِ امّارہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ نفس اعمالِ قبیحہ کو مزیّن اور دلکش بنا کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس وقت حرص کا جادو اس عملِ بد کو خیر بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ حرص حُبّ جاہ و مال اور حُبِّ شہوات خارزار ہی ہیں لیکن شیطان نفس کی نظروں کو حسین و جمیل بنا دیتا ہے اور شہوات آخر میں راکھ ہو کر رہ جاتی ہیں اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ ذلیل آرزوئیں نفس کا دھوکہ تھیں۔ انہوں نے ملمع کو زرِ خالص بنا کر مجھے فریب دیا۔ یہ اس مشہور حدیثِ پاک کی طرف اشارہ ہے کہ ''جُزْ يَا مُوْمِنُ فَقَدْ اَطْفَأَ نُوْرُكَ لَهَبِىْ'' [2] (اے مومن آگے گزر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا)۔

صاحبِ ''کلیدِ مثنوی'' کہتے ہیں کہ اس حدیث کی تحقیق نہیں ہے۔ (نورِ دین سے نورِ معرفت مراد ہے جو ریاضات و مجاہدات اور مراقبات سے باطن میں پیدا ہو جاتا ہے)۔

چہ کشد ایں نار را نورِ خدا　　نورِ ابراھیم را ساز اوستا

(اس آگ کو کیا چیز بجھا سکتی ہے نورِ عشقِ الٰہی بجھا سکتا ہے حضرت ابراہیم ؑ (یعنی مرشد کامل) کے نور کو استاد بنالو (پھر وہ نور حاصل ہو جائے گا) (م-۱:۶-۳۷۶)

تاز نارِ نفس چوں نمرودِ تو　　وارھد ایں جسم ھمچوں عودِ تو

(تاکہ تیرے اس نمرود جیسے (سرکش و متمرد) نفس کی آگ سے تیرا یہ لکڑی کا سا جسم نجات پائے) (م-۱:۶-۳۷۶)

شہوتِ شیطانیہ سے حفاظت

جس طرح حضرت ابراہیم ؑ کو عشقِ الٰہی کا نور حاصل تھا جس کی بدولت آتشِ نمرود سرد پڑ گئی اسی طرح جو مرشد صفت ابراہیمی سے موصوف ہو اور عشقِ الٰہی کے نور سے اس نے اپنا تہذیبِ نفس اور تزکیہ باطن کر لیا ہو تم اس کی مطابقت اختیار کرو تاکہ تم اس کی تعلیم و تربیت کی بدولت شہوتِ نفسانی کی آگ سے محفوظ ہو جاؤ۔

---

[1] النمل، ۲۷:۲۴۔
[2] المعجم الکبیر، حدیث ۶۶۸، جلد ۲۲، صفحہ ۲۵۸۔

نارِ بیرونی بآبے بفسرد | نارِ شہوت تا بدوزخ می برد

(ظاہری آگ تو پانی کے ساتھ بجھ جاتی ہے مگر شہوت کی آگ دوزخ تک لے جاتی ہے)(م-۱-۳۷۶)

نارِ شہوت می نیارامد بآب | زانکه دارد طبع دوزخ در عذاب

(شہوت کی آگ پانی کے ساتھ تسکین نہیں پاتی کیونکہ وہ عذاب میں دوزخ کی طبیعت رکھتی ہے)(م-۱-۳۷۶)

نارِ شہوت را چہ چارہ؟ نورِ دیں | نُورُکُم اَطْفَاءُ نَارَ الْکَافِرِیْن

(نارِ شہوت کا علاج کیا ہے؟ (پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ) نورِ دین اس کا علاج ہے، جس طرح تمہارا نورِ ایمان کافروں کی آگ کو بجھا دیتا ہے)۔

جو خواہشات کی پیروی کرے وہ نفس کا غلام ہے

جو شخص خواہشات کی پیروی میں لگا رہتا ہے تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل میں رکھ دیتا ہے اور طرح طرح کی خواہشات کا حکم دیتا ہے۔ احادیث کی رو سے خواہشاتِ دنیا ناپاک ہیں اور دنیا و آخرت میں انسان کو ہلاک کرنے والی ہیں اور بالآخر انسان کو بدبختی اور خواری کی جگہ یعنی جہنم میں جھونک دیتی ہیں اور اسے دائمی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کوڑیوں کے بھاؤ میں آخرت کو بیچ دیتے ہیں اور موتیوں کی بجائے کوڑیوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ○" ۱ (سو آخرت (کے مقابلہ) میں دنیوی زندگی کا ساز و سامان کچھ بھی نہیں مگر بہت ہی کم (حیثیت رکھتا ہے)"بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی" ۲ (البتہ تم لوگ دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت کہیں بہتر ہے اس سے اور باقی رہنے والی ہے)۔ "فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ○ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ○ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ○" ۳ (پھر جس شخص نے سرکشی کی ہوگی اور دنیاوی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دی ہوگی ○ تو بے شک دوزخ ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔

"یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ○ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ○" ۴ (اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا، جس نے تجھے پیدا کیا، پھر اس نے تجھے درست اور سیدھا کیا، پھر وہ تیری ساخت میں متناسب تبدیلی لایا) "اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ" ۵ (کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر ہرگز کوئی بھی قابو نہ پا سکے گا؟)۔ کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہرگز اس پر کوئی قدرت نہیں پائے گا یعنی کیا اللہ تعالیٰ نہیں پوچھے گا کہ اس نے مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں

---

۱ التوبہ،۳۸:۹۔ ۲ الاعلیٰ، ۱۶:۸۷، ۱۷۔ ۳ النّزعٰت، ۳۷:۷۹، ۳۹۔

۴ الانفطار،۶:۸۲، ۷۔ ۵ البلد ۵:۹۰

خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سب کچھ دیا تو پھر کیوں اس کی اطاعت میں سستی کر رہا ہے کیا تو دنیا پر راضی ہو گیا ہے اور آخرت کو بھول گیا ہے حالانکہ دنیا کی زندگی ناپائیدار اور ختم ہونے والی ہے۔ تمہارا یہ گمان نفس اور شیطان کا دھوکا ہے جبکہ آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے۔

حضرت شداد بن اوس ؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا: ''اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِيَّ'' [1] (دانا وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور آنے والی زندگی کیلئے عمل کرتا ہے۔ عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا رہتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہے)۔

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ وَ ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ اَلْمُهْلِكَاتُ شُحٌّ مُطَاعٌ هَوىً مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَالْمُنْجِيَاتُ خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَالْقَصْدُ فِي الْغِنَاءِ وَالْفَقْرِ وَ الْعَدْلُ فِي الرِّضَاءِ وَ الْغَضَبِ" [2] (حضور ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں اور تین چیزیں نجات دینے والی ہیں۔ (ہلاک کرنے والی یہ ہیں) بخل جو مسلط ہو جائے، خواہش نفس جس کی پیروی کی جائے اور خود بینی اور نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا خوف، خوشحالی اور افلاس میں میانہ روی اور رضامندی اور ناراضگی میں عدل اور انصاف)۔

خود کو نفس کی پیروی سے بچاؤ

ابن عساکرؒ نے موسیٰ بن عقبہ ؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ایک مرتبہ یہ خطبہ دیا:

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے واسطے ہیں، میں اسی کی حمد کرتا ہوں اور اسی سے مدد مانگتا ہوں اور موت کے بعد اسی سے کرم کا خواستگار ہوں، اے لوگو! میری اور تمہاری موت قریب آ چکی ہے۔ (ہمیں اور تمہیں سب کو مرنا ہے)۔

لوگو! میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ نے تم کو (ہدایت کا) جو راستہ دکھایا ہے اس پر قائم رہو۔ کلمۂ اخلاص کے بعد اسلامی ہدایات (احکام) کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے امیر کے احکام سنو اور ان کی تعمیل کرو، کیونکہ جس نے اللہ تعالیٰ اور اپنے امیر کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اطاعت کی اس نے فلاح پائی (کامیاب ہوا) اور اس پر جو حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا، خود کو نفس کی پیروی سے بچاؤ، جو نفس کی پیروی، طمع اور غصہ سے محفوظ رہا وہ کامیاب ہو گیا (فلاح کو پہنچ گیا) کبھی غرور نہ کرو، غور کرو کیا وہ شخص بھی فخر و

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۲۴۵۹، جلد ۴، صفحہ ۶۳۸۔

[2] مسند الشہاب، محمد بن سلامۃ، متوفی ۴۵۴ھ، حدیث ۳۲۶، جلد ۱، صفحہ ۲۱۴، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

غرور کرسکتا ہے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہو اور مٹی ہی میں ملنے والا ہو، جس کو کیڑے (کرماں) کھائیں گے، آج وہ زندہ ہے کل مردہ ہوگا۔ پس ہر روز بلکہ ہر گھڑی نیک عمل کرو، مظلوم کی بددعا سے بچو! اپنے نفوس کو مردہ شمار کرو! صبر کرو، کہ صبر ہی ایسی چیز ہے جو نیک اعمال کراتا ہے۔ پرہیز کرو کہ پرہیز ہی ایسی چیز ہے جو بہت نفع بخش ہے۔ عمل کرو کیونکہ عمل ہی قبول کیا جاسکتا ہے۔ جو چیز تمھیں اللہ کے عذاب کی طرف لیجائے اس سے بچو، اور اس کام کے کرنے میں عجلت کرو جس کے کرنے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا وعدہ کیا ہے۔ خود سمجھو، دوسروں کو سمجھاؤ، ڈرو اور ڈراؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا دیا ہے کہ تم سے پہلے کے لوگ کن کن کاموں کے کرنے سے ہلاک ہوئے۔ اور کون سے کام کرنے کے باعث نجات پائی۔[1]

اس نے اپنی پاک کتاب (قرآن پاک) میں حلال وحرام، مکروہ و پسندیدہ چیزیں بیان کردی ہیں۔ میں تم کو اور اپنے نفس کو نصیحت کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ خداوند تعالیٰ مددگار ہے اور اس کے سوا کسی میں قوت نہیں ہے۔ تم جان لو کہ خداوند تعالیٰ بغیر اعمال کے نہیں چھوڑے گا۔ (عمل کا بدلہ ضرور ملے گا)۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اپنے حصہ کی حفاظت کرو، تم دین کی آرزو کرو، دین کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ جہاں تک ہو سکے نوافل پڑھو کہ تمہارے فرائض (کی ادائیگی) میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے، تم جب خالی ہاتھ ہو گے تو تم کو جزا ملے گی۔

اللہ تعالیٰ کے حلال وحرام میں فرق

حلت وحرمت میں انسانی خواہش کا کوئی دخل نہیں حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حلال فرمائے اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حرام فرمائے۔ مشرکین نے اپنی مرضی سے حلال وحرام بنائے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا تعین فرمادیا۔ ارشادِ سبحانی ہے" قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○"[2] (فرمادیجیے کہ میرے رب نے (تو) صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں (سب کو) اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کا شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور (مزید) یہ کہ تم اللہ (کی ذات) پر ایسی باتیں کہو جو تم خود بھی نہیں جانتے)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ چیزیں:

۱) فاحشہ انتہائی قبیح فعل یعنی زنا ہے جیسے فرمایا" اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً " بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے چوری

---

[1] تاریخ الخلفاء مترجم، امام جلال الدین سیوطی، صفحہ ۱۷۱،۱۷۲، مدینہ پبلشنگ، کراچی۔　[2] الاعراف، ۷: ۳۳۔

چھپے ہو یا ظاہر۔

۲)دوسرا اثم ہے جوکہ شراب کے ناموں میں سے ایک نام ہے حضرت حسن بصریؒ نے یہی معنٰی لیے ہیں۔

۳)بغی ظلم میں حد سے تجاوز کرنا۔

۴)شرک اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی دوسرے کو ہمسر بنانا۔

۵)اللہ تعالیٰ پر جھوٹی باتوں کو منسوب کرنا یعنی جس کا حکم نہ ہو اس کا حکم دینا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فواحش سے یوں منع فرمایا ہے''وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ "[1] (اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں)۔غرضیکہ ھوٰی کا ترک کرنا غلام کو آقا اور ارتکابِ ھوٰی آقا کو غلام بنانا ہے جیسا کہ زلیخا نے ھوٰی کی پیروی کی تو حاکمِ وقت کی بیوی ہوتی ہوئی کنیز بن گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ھوٰی کی مخالفت کی تو غلام ہوتے ہوئے امیر ہوگئے۔حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے پوچھا''مَا الْوَصْلُ؟ قَالَ تَرْکُ اِرتِکَابِ الْهَوَاءِ''(وصل کیا ہے؟ فرمایا خواہش کو چھوڑ دینا)۔[2]

حضرت بایزید بسطامیؒ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا''مَا الطَّرِیْقُ اِلَیْکَ قَالَ دَعْ نَفْسَکَ فَتَعَالِ'' کہ تیری طرف کون سا راستہ ہے فرمایا کہ نفس کو چھوڑ اور چلے آؤ۔معلوم ہوا کسی شخص کو اس وقت تک قربت و وصالِ الٰہی کی دولت میسر نہیں آسکتی جب تک وہ ھوٰی کی مخالفت نہ کرے اور اس وقت تک شیطان کو وسواس ڈالنے کی قدرت نہیں ہوتی جب تک کہ بندے کے نفس میں معصیت اور شہوت کی خواہش پیدا نہ ہو۔ شیطان باہر سے نہیں آتا بلکہ یہ ھوٰی شیطان ہے جو آدمی کے نفس میں پیدا ہوتی ہے اسی طرح بعض مشائخ سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "ذِبْحُ النَّفْسِ بِسَیْفِ الْمُخَالَفَةِ "(نفس کو مخالفت کی تلوار سے مار ڈالنا)۔

شہوات کا ترک کرنا

حضرت حاتم اصم خراسانیؒ (جو ابو علی شقیق بن ابراہیمؒ کے مرید تھے اور احمد خضرویہؒ کے استاد) جن کے متعلق حضرت جنیدؒ نے فرمایا تھا صِدِّیقِ زمانہ یعنی ہمارے زمانے کے صِدِّیق حاتم اصمؒ ہیں۔آپ کا قول ہے''اَلشَّهْوَاتُ ثَلٰثَةٌ شَهْوَةٌ فِی الْاَکْلِ وَ شَهْوَةٌ فِی الْکَلَامِ وَشَهْوَةٌ فِی النَّظْرِ فَاحْفِظِ الْاَکْلَ بِالثِّقَةِ وَالِلّسَانَ بِالصِّدْقِ وَالنَّظْرَ بِالْعِبْرَةِ''[3](شہوت تین قسم کی ہے ایک کھانے کے اندر، ایک کلام کرنے میں اور ایک دیکھنے میں۔لہذا کھانے میں ہوشیار رہ اور اپنی روزی کا خدا پر بھروسہ رکھ۔زبان کو سچ بولنے پر قائم رکھ اور آنکھوں کو عبرت سے دیکھنے پر پختہ کر)۔

---

[1] الانعام،۶:۱۵۱۔ [2] کشف المحجوب،صفحہ ۳۱۲۔ [3] کشف المحجوب،صفحہ ۲۲۷۔

اگر تو خواہش اور حرص سے کھائے خواہ کسب حلال ہی میں سے کھائے تو یقیناً شہوتِ اکل ہے اگر اپنی نفسانی خواہشات کے ساتھ کلام کرے خواہ دروغ نہ ہو تو یہ شہوتِ لسانی ہے۔ اگر اپنی خواہشاتِ نفسانی سے دیکھے خواہ دیکھنے میں شہادت کا کام لے مگر یہ شہوت ہے اور یہ شہوتِ نظر کہلائے گی۔

کیمیائے سعادت میں ہے کہ ترکِ شہوات خود بہت سی آفتوں کو جنم دیتی ہے ترک لذت پر انسان عام طور پر قادر نہیں لہذا خلوت میں شہوات کو پورا کر لیتا ہے لوگوں کے سامنے کوئی چیز نہ کھانا ان کی شخصیت کو ابھارتی ہے اور اگر کوئی خلوت میں کھا پی لے تو یہ عین منافقت ہے اور اس کو شیطان مغرور بنا دیتا ہے ایسے آدمی بہت کم ملتے ہیں کہ اپنی پسند کی چیز دوسروں کے سامنے خریدیں اور گھر جا کر درویشوں میں بانٹ دیں، یا لوگوں سے نذرانہ مجلس میں قبول کریں اور خلوت میں تقسیم کر دیں ایسا عمل صدیقوں سے ہی ممکن ہو سکتا ہے جو کہ بے حد دشوار ہے اور اگر انسان اس امر کو مشکل محسوس کر رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی نفاق اور ریا اس کے دل میں باقی ہے۔ ایک بزرگ لوگوں کے سامنے حقہ یا سگریٹ نہیں پیتا اور تنہائی میں پی لیتا ہے تو وہ شہوت ریا میں مبتلا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص بارش کے پانی سے بچنے کیلئے پرنالے کے نیچے جا کر کھڑا ہو جائے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ کھانے کی ایسی چیزیں لوگوں کے سامنے کھالیں (اگر وہ حرام و مکروہ نہیں) لیکن ساری کی ساری نہ کھائیں بلکہ کچھ چھوڑ بھی دیا کریں تا کہ خواہش بھی ایک حد تک شکستہ ہو جائے اور کچھ ریا کا زور بھی ٹوٹ جائے۔

صاحب ''کشف المحجوب'' کا قول ہے کہ صوفی وہ ہے کہ جب کلام کرے اس کا کلام اس کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو۔

شہوتِ فرج کی آفات

شہوت کی خواہش انسان پر اس لئے مسلط کی گئی ہے کہ تخم ریزی کا تقاضا کرتی رہے پھر لذت بہشت کی بھی ایک جھلک دکھانا اس میں مقصود ہے ابلیس ملعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ عورت کے ساتھ خلوت میں کبھی نہ بیٹھے گا کیونکہ ایسے معاملات میں میری خدمات اس کو ضرور ملیں گی اور میں ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ زنا کی ابتداء آنکھ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں مرد اور عورت دونوں کو کہا گیا کہ اپنی نظروں کی حفاظت کرو۔ جو شخص اپنی نظر کی حفاظت سے قاصر ہے اس کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ریاضت اور مجاہدہ کی مشقت میں ڈالے اور اس کا بہترین طریقہ روزہ رکھنا ہے۔

ایک بزرگ نے اپنے مریدوں کو بتلایا کہ ایک بار مجھ پر شہوت ایسی غالب ہوئی کہ اس سے پیچھا

چھڑانا مشکل ہو گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے آگے گریہ وزاری کی۔ رات کو خواب میں دیکھا ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے میں نے اپنا حال بتایا۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا تو ایک سال تک مجھے شہوت کا غلبہ محسوس نہ ہوا۔ پھر مجھے یہی شکایت ہوئی تو میں نے پھر گریہ وزاری کی اس دفعہ اس شخص نے میری گردن پر تلوار دے ماری، ایک مرتبہ پھر وہ طوفان تھم گیا مگر سال کے بعد پھر وہی شکایت ہوگئی تیسری بار رات کو پھر وہی شخص ملا اور وہی سوال جواب ہوئے اس بار اس نے کہا کہ آخر کب تک تو ایسی چیز کی مدافعت میں لگا رہے گا جس کا دفعیہ خود اللہ تعالیٰ کو بھی پسند نہیں اس خواب کے بعد میں نے نکاح کر لیا اور یوں اس آفت سے رہائی ملی۔

شہوت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب اس کی مزاحمت کرنے والے کو ملے گا تمام شہوات میں سے سب سے زیادہ شہوت فرج کی ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ اس شہوت سے اس لیے بچتے ہیں کہ ان کو شرم آتی ہے یا اس بات سے ڈر جاتے ہیں کہ اگر یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگئی تو کیا ہوگا، ایسے شخص کی شہوت کو دبانے کا اجر نہیں اور جو شخص برائی پر قادر ہو اور محض اللہ تعالیٰ کیلیے اجتناب کرے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوگا۔ جب کسی کا سایہ نہیں ہوگا اور اس بات میں اس کا درجہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوگا کیونکہ وہ اس گھاٹی سے پار اترنے والوں کے پیشوا ہیں۔

ضبطِ نفس کے چند واقعات

حضرت سلیمان بن بشارؒ بہت حسین وجمیل تھے ایک بار ایک عورت نے آپ کو بلایا تو آپ بھاگ گئے اسی روز انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کیا آپ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں؟ تو فرمانے لگے ہاں میں وہی یوسف ہوں جس نے قصد کیا تھا اور تو وہ سلیمان ہے جس نے قصد بھی نہ کیا۔ حضرت سلیمان بن بشارؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دوست کے ساتھ حج کیلئے نکلا ابواء کے مقام پر میرا دوست کھانا لینے کیلئے گیا اور میں اکیلا تھا اتنے میں ایک نہایت حسین عورت آئی اور کہا کہ مجھے کچھ دو میں اسے کچھ روٹی دینے لگا اور کہا کہ دامن پھیلاؤ۔ اس عورت نے کہا کہ میں یہ نہیں مانگتی بلکہ وہ مانگتی ہوں جو عورتیں مردوں سے چاہتی ہیں میں نے سر جھکا لیا اور اتنا رویا کہ آخر وہ عورت وہاں سے چلی گئی میرے ساتھی نے جب رونے کے اثرات میرے چہرے پر دیکھے تو وجہ دریافت کی تو میں نے ٹال دیا۔ آخر اس کے اصرار پر میں نے جب سب ماجرا سنایا تو وہ بھی رونے لگا۔ اور کہا کہ تمہاری اعلیٰ ہمتی کے مقابلے میں اپنی کم ہمتی پر روتا ہوں کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو نہ بچ سکتا تھا۔ جب طواف کعبہ کے بعد میں حجرے میں سو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کہ آپ کا عزیزِ مصر کی عورت سے واقعہ کتنا عجیب وغریب ہے آپ نے فرمایا ہاں لیکن اعرابی کی عورت کے ساتھ تمہارا قصہ عجیب تر تھا۔

شہوتِ نفس میں احتیاط کی راہ

حضرت علاؤ بن زیادؒ کہتے ہیں کہ کسی عورت کو دیکھنا تو درکنار کسی عورت کی چادر پر بھی نظر نہیں ڈالنا چاہیے کہ اس سے بھی دل میں شہوت بیدار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کی خوشبو، لباس اور آواز کی طرف بھی توجہ نہیں دینا چاہیے عورتوں کی طرف (اور عورتوں کا مردوں کی طرف) دوسری نگاہ، دعوتوں میں اکٹھا کھانا کھانا خوبصورت نقاب یا چادر سب حرام ہیں اور عورت کا ولی اگر ان چیزوں کی اجازت دے تو وہ خود بھی گنہگار ہے جیسا کہ ارشاد سبحانی ہے "یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا"[1]

(اے ازواجِ پیغمبر! تم عورتوں میں سے کسی ایک کی بھی مثل نہیں ہو، اگر تم پرہیزگار رہنا چاہتی ہو تو (مردوں سے حسب ضرورت) بات کرنے میں نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (نفاق کی) بیماری ہے (کہیں) وہ لالچ کرنے لگے اور (ہمیشہ) شک اور لچک سے محفوظ بات کرنا)۔

فطرت انسانی کی ساخت کچھ ایسی ہے وہ صرف کسی نہ کسی طرح پیٹ پالنا ہی نہیں چاہتا بلکہ قسم قسم کے لذیذ کھانوں اور لذیذ مشروبات کی خواہش بھی رکھتا ہے وہ صرف تن ڈھانپنے پر ہی کفایت نہیں کرتا بلکہ آرائش کیلئے دیدہ زیب لباس بھی چاہتا ہے۔ انسان اپنی رہائش کیلئے اپنے سر پر ایک چھت ہی نہیں چاہتا بلکہ آراستہ و پیراستہ کوٹھیوں اور بنگلوں کی خواہش بھی رکھتا ہے یہی خواہشیں ہیں جو انسان کو ہزاروں لاکھوں کام کرنے پر آمادہ کرتی ہیں بلکہ اس دنیا کی چہل پہل انسان کی انہی خواہشوں کی پیدا کردہ ہے تعلیم و تہذیب اور تمدن و ترقی کے نام آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب انہی خواہشوں کے جلوے اور کرشمے ہیں۔ آرٹ اور صنعت و حرفت کے جتنے مظاہر نظر آ رہے ہیں ان سب کی تہہ میں یہی خواہشیں پل رہی ہیں۔ یہی خواہشیں ہیں جو ایک خاص قسم کے نظام اخلاق کو وجود میں لاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ عزت و شہرت کی خواہش، بقائے دوام کی آرزو، جاہ و منصب اور مال و زر کے حصول کی خواہش، غلبہ و اقتدار اور حکمرانی کی خواہش، اپنی مدح و تعریف کا اشتیاق اور خود نمائی وغیرہ ہیں۔

مذکورہ خواہشات کا براہ راست نفسِ انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن نفس امارہ کی تخلیق کردہ خواہشات کی تکمیل ہزارہا باطنی و روحانی امراض کا باعث بنتی ہے۔ انسان کا نفسِ امارہ اسے ہمہ وقت بدی، شر اور فساد کی طرف راغب کرتا رہتا ہے۔ مرتبہ کمال تک پہنچنے کیلئے نفسِ امارہ کو مغلوب کرنا از بس ضروری ہے۔

---

[1] الاحزاب، ۳۳: ۳۲۔

نفسِ امّارہ کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ خود پرور اور خود پرست، سرکش اور خود سر ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝" [1] (بے شک جن لوگوں نے پرہیز گاری اختیار کی ہے، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال بھی چھو لیتا ہے (تو وہ اللہ کے امر و نہی اور شیطان کے دجل و عداوت کو) یاد کرنے لگتے ہیں سو اسی وقت ان کی (بصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں)

نفس با نفس دگر چوں یار شد　　　عقل جزوی عاطل و بیکار شد

(ایک نفس بد جب دوسرے نفس (بد) کا یار بن جاتا ہے تو (جس شخص کی) عقل ناقص ہوتی ہے اور اس میں کامل دور اندیشی کا مادہ نہیں ہوتا وہ بیکار اور نکمی ہو جاتی ہے (اور وہ اس کو برے نتائج پر تنبیہ نہیں کر سکتی) (۲-۱۷)

چونکہ خواہشاتِ نفسانی کے غلبہ میں عقل سے کام ہی نہیں لیا جاتا اور خود عقلِ ناقص میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ نفس کے معاملات میں دخل دے کر اس کے مفاسد کے پود و تار کو بکھیر کر رکھ دے۔ اگر اس کمزور عقل کی کوئی دھیمی سی آواز مبتلائے نفس کو اپنی طرف متوجہ اور راہِ ثواب کی طرف مائل بھی کرتی ہے تو مصاحبِ بد کی صحبتِ بد کا اثر پھر اس کو ہوائے نفسانی کی اتباع پر مائل اور عقل کی آواز کو مغلوب کر دے گا۔ اکبر الہ آبادی مرحوم کہتے ہیں ؎

مل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ　　　آدمی کا آدمی شیطان ہے

نفس بانفسِ دگر دوتا شود　　　ظلمت افزوں گشت و رہ پنہاں شود

(ایک نفس بد دوسرے نفس بد کے ساتھ مل جاتا ہے اندھیرا بڑھ جاتا ہے اور راستہ چھپ جاتا ہے) (۲-۱۷)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک شریر النفس جب دوسرے شریر النفس سے الفت و رفاقت پیدا کر لیتا ہے تو اسبابِ شر کے قوی اور مضاعف ہو جانے سے ان کے ہدایت پا جانے کے امکانات موہوم ہو جاتے ہیں اور ان کی گمراہی "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" [2] (ترجمہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر) کے مصداق ہوتی ہے۔

ابتدائے کبر و کیں از شہوت است　　　راسخی شہوتت از عادت است

(تکبر اور بغض کی ابتدا خواہش نفسانی سے ہے، اور تیری خواہش نفسانی کی پختگی (اتباع نفس کی) عادت سے ہے) (۲-۳۴۴)

گردن خر گیر و سوئے راہ کش　　　سوئے راہبانان و رہ دانانِ خوش

(اپنے خر (نفس) کی گردن پکڑ کر اس کو سیدھے راستہ پر لے جاؤ یعنی ان لوگوں کی طرف جو راہ پر چلتے ہیں اور راہ سے خوب واقف ہیں) (۱-۳۰۸)

---

[1] الاعراف، ۷: ۲۰۱۔　[2] النور، ۲۴: ۴۰۔

ہیں مہل خر را و دست از وی مدار　　زانکہ عشقِ اوست سوئے سبزہ زار

(خبردار (اس) خر (نفس) کو کھلا نہ چھوڑ دو۔ اور اس کو آزاد نہ کرو کیونکہ اس کا میلان لذّاتِ نفسانیہ کے سبزہ زار کی طرف ہے)　(۱-۳۰۸)

اگر تم اس کو غفلت کے ساتھ ایک دم کیلئے کھلا چھوڑ دو تو گھاس کی طرف کوسوں دور نکل جائے گا۔ جو گدھا گھاس کے شوق کا مست ہو وہ راستے کا دشمن ہوتا ہے (اس لئے وہ اس راستے پر ٹھیک طور سے نہیں چلتا) چنانچہ بہت سے مطیعانِ خر کو اس نے ہلاک کیا ہے۔

اس عبارت میں نفسِ امّارہ کے مقتضیات کے کلیۃً منکر و مردود ہونے کا اشارہ ہے۔ گزشتہ اشعار میں کہا گیا ہے کہ شرورِ نفس سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مرشدِ کامل کا توسل اختیار کرے۔ اس شعر میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر اتفاقاً کوئی راہنما نہ ملے اور خود راستہ معلوم کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو صراطِ مستقیم معلوم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نفسِ امّارہ یقیناً کجرو اور غلط کار ہوتا ہے لہٰذا وہ جس بات کا مقتضی ہو، جس کام پر آمادہ کرے اور جس راہ کی طرف لے جائے تو اس کے برخلاف چلو کہ یقیناً یہی صراطِ مستقیم ہوگا۔ اس نفس کی ٹونٹیاں (شہوات سے روک کر) بند کر دو۔ اور ان کو خم (کے پانی) سے پر کھو۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی نگاہوں کو شہوات سے بند رکھو۔

خلق اطفال اند جز مستِ خدا　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوٰی

(مخلوق سب سوائے مستِ الٰہی کے گویا بچے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانیہ سے چھوٹ جانے والے کے سوا کوئی بالغ نہیں ہے)　(۱-۳۵۳)

خواہشاتِ نفسانیہ کی ابتدا بالکل کمزور ہوتی ہے اس وقت ان کا انسداد ایسا ہی آسان ہوتا ہے جیسے ایک چیونٹی کو مسل ڈالنا ہوتا ہے۔ لیکن یہی خصائل جب رسوخ و استحکام پا کر چیونٹی سے سانپ بن جاتے ہیں تو پھر ان کا ازالہ ذرا مشکل ہوتا ہے مگر خیر لاٹھی لکڑی چلانے کی ہمت ہو تو یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے اور خصائل کے اس سانپ کا سر کچلا جا سکتا ہے لیکن اگر اب بھی تغافل اور بے پرواہی سے کام لیا گیا تو پھر یہ سانپ اژدھا بن جائے گا اور اژدھا ایک شخص کے قابو میں آنے والا نہیں ہوتا یعنی جب خصائلِ بد انتہائی قوت حاصل کر لیں تو پھر تا مرگ ان کے پنجے سے رہائی محال ہوتی ہے۔

لیکن ان خصائل کی اصلاح و درستی کی راہ میں ایک سخت مشکل حائل ہے وہ یہ ہے کہ ان کے خطرات

کو ہر کوئی شخص محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی نشو ونما اور ان کا مور سے مار (سانپ) اور مار سے اژدھا بننا عادت کے زیرِ سایہ وقوع پاتا ہے۔ اور اپنی اپنی عادت سب کو محبوب و مانوس ہوتی ہے۔ اس لیے ان خصائل کو خوفناک ترقی کا کچھ خیال نہیں گزرتا۔ اور کسی بلا کے انسداد کا جوش جبھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کے خطرہ کا خیال دل پر غالب ہو۔

اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں شب و روز مصروف ہے، عارضی لذتوں اور فانی جاہ و جلال کے حصول کے علاوہ اس کے پیشِ نظر کوئی منزل نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "اَلنَّاسُ غَادِيَانِ فَمُبْتَاعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا وَ بَائِعٌ نَفْسَهُ وَ مُوْبِقُهَا" [1] (لوگ جب صبح کرتے ہیں (تو ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں) کچھ لوگ اپنے نفس کو خرید کر اس کو آزاد کر دیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نفس کو فروخت کر کے اس کو ہلاک کر دیتے ہیں)۔

نفس انسان کو ہمیشہ برائی پر آمادہ کرتا ہے جب آدمی نفس کی ہر بات ماننے پر آمادہ رہتا ہے تو اسے ان تمام باتوں کی عادت ہو جاتی ہے پھر خود بخود اس کے دل میں اسی طرح بری خواہشات پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہی نفسانی خواہشات ہیں جن میں بدنظری، شوقِ زنا، ظلم ایذائے خلق، حرصِ طعام، خواہشِ ترفع و افتخار وغیرہ ہزاروں برائیاں داخل ہیں۔ جب کوئی ناصح ان برائیوں سے ان کو منع کرتا ہے تو اسے برا معلوم ہوتا ہے اور کسی کی اتباع کرنا اس کو پسند نہیں ہوتا اور اسی سے ناصح و مانع سے بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی مطلب ہے کہ خواہشِ نفسانی سے تکبر و بغض پیدا ہوتا ہے۔

مارِ شہوت را بکش در ابتداء ورنہ اینک گشتہ مارت اژدھا

(اب بھی ہمت کرو اور) خواہشاتِ نفسانیہ کے اس سانپ کو شروع ہی میں مار ڈالو ورنہ دیکھنا تمہارا یہ سانپ اژدھا بن جائے گا۔) (۲-۳۲۶)

نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کی بنیاد اور تمام مجاہدوں کا کمال ہے اور مخالفت کا طریق یہی ہے کہ اس کے ہر مطالبہ کو پسِ پشت ڈال دیا جائے (مثلاً نفس کا مطالبہ اعلیٰ مکان ہو، عمدہ خوراک اور نفیس لباس ہو تو انسان جھونپڑی میں سادہ خوراک اور گودڑی پر گزارہ کرے)۔ نفس کی مخالفت کرنے والوں کی ذاتِ باری تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: "وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى" [2] (اور اپنے نفس کو روک رکھا ہوگا (ہر بری) خواہش سے یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا)۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے لعاب کا تار نکال نکال کر اپنے اوپر لپیٹتا جاتا

---

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۳۵۱۴، جلد ۱۰، صفحہ ۳۷۲۔
[2] النّٰزعٰت، ۷۹: ۴۰، ۴۱۔

ہے آخر کار یہ کیڑا اسی غلاف میں دم گھٹنے سے مر جاتا ہے۔یہی حالت انسان کی ہے کہ اس کی تعیشات اور شہوات اور خواہشاتِ نفس کے ریشمی غلاف اس کی روح کے گرد لپٹتے چلے جاتے ہیں یہ غلاف اس کی روحانی موت کا باعث بنتے ہیں اور انسان اپنی روح کو آخر کار مردہ بنادیتا ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان کے جسم کے اندر کوئی باریک کانٹا چبھ کر زیرِ جلد چھپ جاتا ہے اور اس کا نکالنا دشوار ہوتا ہے اس کانٹے کی وجہ سے انسان کو کسی پل چین نہیں آتا۔اسی طرح انسان کی نفسی زندگی میں بعض ناقابلِ اظہار آرزوؤں اور خواہشات کے باریک کانٹے دل کے اندر چبھ کر چھپ جاتے ہیں جو اس سے سکون وطمانیت کی دولت چھین لیتے ہیں اور اسے ہمہ وقت مضطرب و بے چین رکھتے ہیں۔ جب انسان کی ایسی کیفیت ہو اور خواہشاتِ نفس کے کانٹے دل کے اندر چبھ گئے ہوں اور اس کو شعوری طور پر علم نہ ہو تو اس کا علاج کوئی طبیبِ نفس یعنی مرشدِ کامل ہی کر سکتا ہے۔

نفسِ انسانی گناہوں سے باز نہیں آتا سوائے توفیقِ الٰہی اور وسیلۂ مرشد کے

حضرت سلطان العارفینؒ نے عین الفقر میں فرمایا کہ پارسائی اور زیادہ علم حاصل کرنا فرض نہیں، البتہ گناہوں سے بچنا فرض ہے۔اگر انسان گناہوں سے نہ بچے تو تمام عبادات اور علوم بے فائدہ ہیں۔آپ نے فرمایا کہ ریاضت، صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، ذکر وفکر، مشاہدہ ومجاہدہ، مراقبہ ومحاسبہ، وصال وحضور، درود و وظائف، تسبیح وتلاوت، علم فقہ، خرقہ پوشی، دلق پوشی وگدڑی، خلق سے الگ رہنا، خاموشی اختیار کرنا، نیک عادات پیدا کرنا، چلہ کشی، گوشہ نشینی، اپنے حال کو پریشان رکھنا اور تمام اشیاء کی لذت سے باز رہنا یہ سب چیزیں نفس کے خلاف ہیں۔کیا ان سے نفس مر جاتا ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں ''نہیں''۔فرماتے ہیں بھوک، درس وتدریس، خداشناسی سے نفس نہیں مرتا، بھوک کی حالت میں نفس کتے کی طرح ہوتا ہے اور شکم سیری میں گدھے کی طرح۔فرماتے ہیں کہ گناہ کرنے کے وقت اگر انسان کے سامنے قرآن وحدیث، حشر ونشر، حساب اور عذابِ قبر، میزان وپل صراط اور مسائل ترہیب وترغیب پیش کیے جائیں تو بھی موذی نفس باز نہیں آئے گا اور گناہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا، سوائے توفیقِ الٰہی کے اور وسیلہ مرشد کامل کے۔اسی لیے آپ فرماتے ہیں۔

سے روزے سے نفل نمازاں، سے سجدے کر تھکے ھُو
مکے حج گیئے سے واری، دل دوڑ نہ مُکّے ھُو
چلے چلیئے جنگل بھونا، اس گل تھیں نہ پکے ھُو
سب مطلب ہو جاندے حاصل پیر نظر اِک تکے ھُو

حضرت سلطان باھوؒ اپنی تصنیف ''تیغ برہنہ'' میں فرماتے ہیں کہ مرشد جب طالب کو بیعت کرتا ہے تو ایک توجہ اور نظر سے اس کو فقر کی معرفت عطا کر دیتا ہے اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مرشد کامل اسم ذات (لفظ اللہ) کی تلوار سے مرید کے نفس کو قتل کر دیتا ہے، جو شخص اسم ذات کے تصرف سے نفس کو مار ڈالتا ہے اور تکبیر تحریمہ سے ذبح کرتا ہے وہ دونوں جہانوں کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔

حصّہ سوم

تزکیہ وتہذیب نفس

باب نمبر ۱۵

تزکیہ اور تصفیۂ باطن

(تہذیبِ نفس کا طریقہ)

تزکیۂ نفس

تمام انبیائے کرام ؑ کی بعثت کا اصلی مقصد اور شرائع اسلامیہ کی غرض و غایت کفر و شرک اور ظلم و معصیت کو مٹانا ہے اور گناہوں کی زندگی بسر کرنے والی انسانیت کے نفوس کو مزکی و منزہ کر کے انہیں معرفتِ خداوندی سے ہمکنار کرنا ہے۔ تمام ادیان و شرائع کی غرض و غایت اور جملہ انبیائے کرام ؑ کی بعثت کا مقصودِ اصلی یہی تزکیہ و تصفیہ ہے۔ دینِ حنیف میں جو اہمیت تزکیۂ نفس کو حاصل ہے کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔ دیگر ساری چیزیں وسائل اور ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں تزکیۂ نفس غایت و مقصود کی حیثیت کا حامل ہے۔ انبیاء ؑ کی سرگرمیاں خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف فرد اور انسانی معاشرے کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

انبیائے کرام ؑ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز تزکیہِ باطن سے کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے امور سرانجام دینے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کیلئے وہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں انہیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت کا درس دیتے ہیں مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف اور صرف لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی ان کی تمام جدوجہد کی غایت بنتا ہے چنانچہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے آنحضور ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کیلئے جو دعا فرمائی اس میں آپ ﷺ کی بعثت کی اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ o" [1] (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول ﷺ مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے (کر دانائے راز بنادے) اور ان (کے نفوس و قلوب) کو خوب پاک صاف کر دے، بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو شرفِ قبولیت نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا "كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ o" [2] (اسی طرح ہم نے تمہارے اندر تمہیں میں سے (اپنا) رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں (نفساً وقلباً) پاک صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ (اسرارِ معرفت و حقیقت) سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے)۔

اسی طرح سورۂ جمعہ میں آپ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ اور اس کی اغراض و مقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل علیہ السلام پر ان الفاظ میں احسان جتلایا ہے: "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ق وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ o" [3] (وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک (باعظمت) رسول ﷺ کو بھیجا وہ اُن پر اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں۔ اور اُن (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں بے شک وہ لوگ اِن (کے تشریف لانے) سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے) اور چونکہ کائنات میں انسان کے حق میں مکمل فلاح اور کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ دنیا میں پاکیزہ زندگی گزارے تاکہ اسے آخرت کی ابدی اور دائمی راحت والی زندگی حاصل ہو اور پاکیزہ زندگی گزارنے کے اصول اللہ کا نبی علیہ السلام سکھاتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بعثتِ رسول ﷺ کو عظیم احسان فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا "لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ج وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ o" [4] (بے شک اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے (عظمت والا) رسول ﷺ بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔ یہاں ضروری ہے کہ آیات مذکورہ بالا میں استعمال کیے گئے لفظ "تزکیہ" کا مفہوم واضح کیا جائے۔ ذیل میں تزکیہ کا لغوی و

---

[1] البقرہ،۲:۱۲۹۔ [2] البقرہ،۲:۱۵۱۔ [3] الجمعہ،۶۲:۲۔ [4] آل عمران،۳:۱۶۴۔

اصطلاحی مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔

تزکیہ کا لغوی معنٰی

تزکیہ کا لفظ زکاۃ سے ماخوذ ہے اور زکاۃ کا لفظ اصل میں "زَكَوَةٌ" تھا کاف کے فتحہ کی وجہ سے واؤ الف سے تبدیل ہوگئی تو "زَكَوَةٌ" سے "زَكَاةٌ" ہوگیا۔ امام ابنِ اثیر جزریؒ فرماتے ہیں "لغت میں زکاۃ کا معنٰی ہے طہارت، بڑھنا، برکت اور مدح"۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں "زکاۃ کا اصل معنٰی ہے وہ اضافہ اور پھلنا پھولنا جو قدرتی برکت سے حاصل ہو اور اس معنٰی کا تعلق دنیوی اور اخروی تمام امور سے ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "زَكَا الزَّرْعُ يَزْكُوْ" (کھیتی بڑھ گئی) اور یہ اسوقت کہا جاتا ہے جب کھیتی سے برکت اور اضافہ حاصل ہو اور اسی سے وہ زکاۃ ہے جو انسان فقراء کیلئے اللہ تعالٰی کا حق نکالتا ہے اس کو زکاۃ کہنے کی توجیہ یہ ہے کہ اس میں برکت کی امید کی جاتی ہے یا اس لیے اس کو زکاۃ کہتے ہیں کہ اس سے نفس کی طہارت ہوتی ہے یعنی نفس کی نیکی اور صالحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور مال میں برکت ہوتی ہے۔ نفس کی زکاۃ اور طہارت سے انسان دنیا میں اوصافِ محمودہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب کا حق دار ٹھہرتا ہے لہٰذا انسان غور کرے کہ اس کی تطہیر کن امور میں ہے۔[1]

علامہ زبیدیؒ فرماتے ہیں "زَكَا يَزْكُوالرَّجُلُ زَكْوًا"[2] انسان نے خوب زکاۃ کی یعنی اپنی اصلاح کی۔ صاحبِ قاموس فرماتے ہیں "وَالزَّكَاةُ صَفْوَةُ الشَّيْءِ"[3] زکاۃ کا معنٰی ہے کسی چیز کا ستھرا ہونا اور تم جو اپنے مال سے مقررہ حق نکالتے ہو اسے اس لیے زکاۃ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے بقیہ مال کو قدرت کی نگاہ میں ستھرا بنا دیتا ہے"۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ زکاۃ کا معنٰی ہے طہارت، برکت، پھلنا پھولنا، ستھرا ہونا اور مدح کے لائق ہونا تزکیہ چونکہ بابِ تفعیل کا مصدر ہے اور اس میں "کرنے" کا معنٰی پایا جاتا ہے لہٰذا تزکیہ کا معنٰی ہوگا پاک کرنا، برکت دینا، پھیلانا، ستھرا کرنا اور تعریف کرنا اور لفظِ تزکیہ جب نفس کی طرف مضاف ہو تو پھر معنٰی ہوگا نفس کا پاک کرنا، بابرکت کرنا (یعنی مطمئنہ وغیرہ بنانا) نفس کا ستھرا کرنا اور لائق تعریف بنانا۔

تزکیہ کا اصطلاحی معنٰی

اصطلاحِ شریعت میں انسان کا اپنے آپ کو تمام قسم کے فسق و فجور، کفر و ضلالت، معصیت و غوایت، ظلم و عداوت، کذب و خیانت، حسد و معاندت، بغض و کدورت، مخاصمت و منافرت، رِجس و خباثت، کینہ

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۱۳۔ [2] تاج العروس، جلد ۳۸، صفحہ ۲۲۱۔

[3] القاموس المحیط، الفیروزآبادی، متوفی ۸۱۷، جلد ۱، صفحہ ۱۶۶۷، موسسۃ الرسالہ، بیروت۔

وغیبت، الزام وتہمت، بے پروائی وغفلت اور غصہ وتکبر وغیرہ رذائل سے پاک کرنا تزکیہ ہے۔

قرآن کی روشنی میں تزکیہ کے معانی

قرآن مجید میں لفظِ تزکیہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے، اس کے رسول ﷺ کی طرف بھی ہے اور بندے کی طرف بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ان آیات میں ہے ''بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ'' [1] (کہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک فرماتا ہے)۔ ''وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ط'' (اور اللہ جسے چاہتا ہے پاک فرمادیتا ہے) [2]

اور رسول اللہ ﷺ کی طرف لفظِ تزکیہ کی نسبت ان تمام آیات میں ہے جنہیں ہم اس باب کے شروع میں درج کر چکے ہیں، نیز ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا'' [3] (آپ ﷺ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجیے کہ آپ اس (صدقہ) کے باعث انہیں (گناہوں سے) پاک فرمادیں)۔ اور بندے کی طرف تزکیہ کی نسبت ان آیات میں ہے۔ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۝'' [4] (بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا)۔ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ۝'' [5] (بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کرلیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی)۔

تزکیۂ نفس کی عملی صورتیں

تزکیۂ نفس یعنی نفس کی طہارت کا مضمون وسیع ہے لہٰذا ہم نفس کی دیگر تمام برائیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس مضمون میں نفس کی بنیادی بیماری عُجب کا ذکر کر رہے ہیں۔ پچھلے ابواب میں نفس کے جتنے رذائل اور معائب بیان کیے گئے ہیں ان سب کی بنیاد عُجب اور خود پسندی ہے یعنی جو انسان اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھتا ہے اور خود کو صاحبِ جاہ ومرتبہ سمجھتا ہے اور پھر اسے کوئی اور ایسا شخص نظر آتا ہے جس کی اس سے زیادہ عزت ہو رہی ہو تو وہ حسد کرنے لگتا ہے۔ پھر پہلے تو وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس شخص سے بلند ثابت کرے سو اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو فبھا، ورنہ اس کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کے مرتبہ کو ختم کرے اور اس کیلئے وہ ہر جائز وناجائز حربہ استعمال کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتا۔ بہر کیف وہ اپنے مدِ مقابل کو مٹا سکے یا نہ مٹا سکے وہ خود ہر حال میں نقصان میں رہتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنے حریف کو مٹانے میں کامیاب ہوتا تو کسی ناجائز ہتھکنڈے سے ہوتا اور جب ناکام رہا تو ہر وقت اسکی وجہ سے حسد میں مبتلا ہے۔

---

[1] النسآء، ۴:۴۹۔　[2] النور، ۲۴:۲۱۔　[3] التوبہ، ۹:۱۰۳۔

[4] الاعلیٰ، ۸۷:۱۴۔　[5] الشمس، ۹۱:۹۔

اور حسد کی نحوست کی وجہ سے شب و روز اس کی غیبت میں رطب اللّسان ہے اور سچ پوچھیے تو یہ ایسا موذی مرض ہے جس میں تمام طبقاتِ انسانی مبتلا ہیں (ماسوا انبیائے کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے مخلصین بندوں کے)
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثریتی طور پر ایک تاجر دوسرے تاجر سے، ایک زمیندار دوسرے زمیندار سے، ایک سیاستدان دوسرے سیاستدان سے، ایک سائنسدان دوسرے سائنسدان سے، ایک قاری دوسرے قاری سے، ایک عالم دوسرے عالم سے، ایک نام نہاد پیر دوسرے نام نہاد پیر سے اور ایک خودساختہ صوفی دوسرے خودساختہ صوفی سے حسد میں مبتلا ہے۔

سب سے پہلا خود پسند

یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ سب سے پہلا خود پسند ابلیس لعین ہے۔ اسی نے سب سے پہلے "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" (میں اس سے بہتر ہوں) کہا تھا اور اس کا خود کو بہتر سمجھنا یہ اس کا قیاس تھا علماءِ کرامؒ فرماتے ہیں "اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِيْسُ" سب سے پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس ہے[1] اسلاف کرام فرماتے ہیں "پہلی نافرمانی حسد کے باعث ہوئی، ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کیا تو آپ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا"۔ اور حسد پر شیطان کو جس چیز نے اُبھارا وہ عُجب (یعنی انا اور خود پسندی) ہے جیسا کہ اس نے خود کہا "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" (میں اس سے بہتر ہوں) لہٰذا ہم آئندہ سطور میں عُجب اور اس کی مذمت بیان کر رہے ہیں۔[2]

عُجب کی مذمت

قرآن و سنت دونوں میں عُجب کی برائی بیان کی گئی ہے چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا"[3] اور (خصوصاً) حنین کے دن جب تمہاری (افرادی قوت کی) کثرت نے تمہیں نازاں بنا دیا تھا پھر وہ (کثرت) تمہیں کچھ بھی نفع نہ دے سکی)۔
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے "ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ شُحٌّ مُّطَاعٌ وَهَوًى مُّتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ"[4] (تین چیزیں تباہ کر دیتی ہیں وہ بخل اور حرص کہ انسان اس کا پابند ہو جائے اور ایسی خواہش جس کی پیروی کی جائے اور انسان کا خود پسند ہونا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "جب تم ایسا بخل اور حرص دیکھو کہ انسان جس کا قیدی بن چکا ہو اور ایسی خواہشات دیکھو جن کی پیروی کی جا رہی ہو اور ایسے رائے زن دیکھو جو اپنی رائے پر اترا رہے ہوں تو اپنے آپ پر خلوت لازم کر لو"۔[5]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۵۸۰۶، جلد ۷، صفحہ ۲۵۳۔ [2] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۱۶۹۔ [3] التوبہ، ۹: ۲۵۔
[4] المعجم الاوسط، حدیث ۵۴۵۲، جلد ۵، صفحہ ۲۳۸۔ [5] سنن ابن ماجہ، حدیث ۴۰۱۴، جلد ۲، صفحہ ۱۳۳۰۔

اپنے آپ کو پارسا کہنے کی ممانعت

انسان کی سرشت ہے کہ اگر وہ کچھ عبادت کرلے تو خود کو نیک گمان کرنے لگتا ہے اور پھر بزبانِ حال اور قال اپنے پارسا ہونے کا چرچا کرنے لگتا ہے تا کہ لوگ اسے شیخ وقت سمجھیں اور اس کے پاس آنا جانا شروع کریں تا کہ وہ مرجع خلائق بن جائے۔ اس کے ہاتھ چومے جائیں اور اسے نذرانے پیش کیے جائیں۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں ''حضرت ابن جریج نے ''فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' کا مطلب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم جب کوئی نیک عمل کرو تو یہ نہ کہو کہ ہم نے نیک عمل کیا'' اور حضرت زید بن اسلمؒ نے کہا تم اسے نیکی مت سمجھو کیونکہ اسے نیکی سمجھنا ہی عُجب ہے۔ غزوۂ اُحد میں حضرت طلحہؓ نے نبی کریم ﷺ کی حفاظت فرمائی حتیٰ کہ انہوں نے اپنے جسم کو حضور ﷺ کیلئے ڈھال بنالیا اور ان کی ہتھیلی سخت زخمی ہوگئی، اس پر انہیں عُجب ہونے لگا کہ انہوں نے حضور ﷺ کیلئے خود کو وقف کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی فراست سے ان کے عُجب کو جان لیا اور فرمایا جب سے طلحہؓ نے حضور ﷺ کی حفاظت کی ڈیوٹی ادا کی اس وقت سے مسلسل ان کے اندر ''ناؤ'' (عُجب یا خود پسندی) پائی جاتی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں ''ناؤ'' کا معنیٰ ہے عُجب (خود پسندی) البتہ یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت طلحہؓ نے اپنے کن الفاظ میں اس عُجب کا اظہار کیا ہو اور کسی مسلمان کو حقیر جانا ہو، ہاں ایک مرتبہ مجلسِ شوریٰ میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت فاروق اعظمؓ سے کہا کہ آپ نے مشورے کی اس مجلس میں حضرت طلحہؓ کو نہیں بلایا؟ آپ نے فرمایا وہ ایک ایسا شخص ہے جس میں عُجب ہے۔

حضرت مطرفؒ کہتے ہیں ''اگر میں ساری رات عبادت سے غافل ہو کر نیند میں گزار دوں اور صبح ندامت کا سامنا کروں تو یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ ساری رات قیام کروں اور صبح خود پسندی میں مبتلا ہوں''۔ عُجب کے اس قدر مضر ہونے کے باعث نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ''لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَخَشِيْتُ عَلَيْكُمْ مَا هُوَ اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ اَلْعُجْبُ اَلْعُجْبُ'' (اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو مجھے تم پر اس سے بھی بڑی چیز کا خدشہ ہے، وہ عُجب ہے وہ عُجب ہے)۔[1]

اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت ہی ترک کر دی جائے تا کہ نہ عبادت ہو نہ عُجب آئے، بلکہ عبادت کیے جاؤ اور خود پسندی نہ آنے دو۔ مردانِ خدا تو وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی ریاضت و مجاہدہ کا دیکھنے والوں پر بہت زبردست تاثر پیدا ہوتا ہے لیکن وہ خود کو دنیا کا نکما ترین انسان تصور کرتے ہیں۔ آیئے اس سلسلے میں اسلاف کرامؒ کے چند واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تا کہ ہمیں عبرت حاصل ہو۔

---

[1] مسند شہاب، حدیث ۱۴۴۷، جلد۲، صفحہ ۳۲۱۔

عُجب کا علاج

جس طرح جسمانی اطباء ہر مرض کی بنیاد خرابیٔ معدہ کو قرار دیتے ہیں اور اسی کا علاج کرتے ہیں۔اسی طرح روحانی امراض میں بنیادی مرض عجب ہے اور اس مرض کے بھی اکثر لوگ شکار ہیں خواہ اطاعت گزار ہوں یا سیاہ کار، بلکہ خرابیٔ معدہ کا شکار جس طرح غرباء سے زیادہ امراء ہوتے ہیں اسی طرح عجب کا شکار گنہگاروں سے زیادہ نیکوکار ہوتے ہیں بہر کیف یہاں ہم عجب کے علاج کے سلسلے میں سلف صالحین کے فرمودات اور ان کی سیرت کے چند نمونے پیش کر رہے ہیں۔

حضرت امام غزالیؒ نے عجب کا علاج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ﷺ اپنے اعمال کی خالصیت اور قلوب کی صفائی کے باوجود یہ تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ راہ میں پڑی ہوئی مٹی ہوتے، گھاس کا تنکا ہوتے یا ایک پرندہ ہوتے، پھر اُن کے بعد کسی عقل مند سے یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال پر عجب کرے یا وہ اپنے اعمالِ حسنہ کی دلالت کرے (یعنی بزبانِ حال یا بزبانِ قال انہیں لوگوں پر ظاہر کرے) یقیناً یہ صورتِ حال نفس کے حق میں بہت مضر ہے۔امام غزالیؒ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ عجب کا علاج تواضع ہے۔[1]

تواضع اور عملِ اسلاف

حضور اقدس ﷺ کا فرمان ہے "جس شخص نے تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ نے اسے رفعت عطا فرمائی"۔[2]

۱) ایک مرتبہ حضرت یونسؒ، ایوبؒ اور حسنؒ باہر نکلے یہ حضرات تواضع پر گفتگو کر رہے تھے۔حضرت حسن نے کہا جانتے ہو تواضع کسے کہتے ہیں؟ تواضع یہ ہے کہ تم گھر سے نکلو تو جو مسلمان بھی تمہیں راہ میں نظر آئے اسے اپنے آپ سے افضل سمجھو۔

۲) حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں "جب اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح ؑ کو غرق کیا تو اس وقت تمام پہاڑ اپنی بلندی پر اترانے لگے مگر جودی پہاڑ تواضع میں رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت بڑھائی اور سفینۂ نوح ؑ کو اسی پر ٹھہرایا گیا"۔

۳) حضرت ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام قلوب میں نگاہ فرمائی تو سب سے زیادہ تواضع والا قلب حضرت موسیٰ ؑ کے قلب کو پایا، اسی لیے انہیں اپنے ساتھ ہم کلامی کا شرف بخشا (اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو یہ بات بتلائی تو وہ روزانہ سر کوز میں پر رکھ کے عاجزی کا اظہار فرماتے)۔

۴) حضرت یونس بن عبیدؒ حج کے دنوں میں عرفات سے واپس آتے ہوئے کہہ رہے تھے، مجھے اللہ

---

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۳۰۱۔ [2] مسند شہاب، حدیث ۸۳۴، جلد ۱، صفحہ ۲۱۹۔

کی رحمت میں کوئی شک نہیں ہے بشرطیکہ مجھ جیسا شخص اس میدان میں نہ ہوتا بے شک میں خوف کرتا ہوں کہ میری وجہ سے یہ تمام لوگ محروم ہونگے۔

۵) حضرت مالک بن دینار ﷫ نے فرمایا اگر مسجد کے دروازے پر منادی کی جائے کہ اس مسجد میں جو سب سے زیادہ بُرا آدمی ہے وہ باہر آجائے تو خدا کی قسم سب سے پہلے دروازہ پر پہنچنے والا میں ہوں گا سوائے اس نوجوان کے جو طاقت اور دوڑنے میں مجھ سے زیادہ ہو۔ جب آپ کا یہ قول حضرت عبداللہ بن المبارک ﷫ کو پہنچا تو انہوں نے فرمایا اسی تواضع کے باعث مالک، مالک بنا (یعنی مالک بن دینار بادشاہِ ولایت بنا)۔

۶) حضرت موسیٰ بن قاسم ؒ کہتے ہیں ہمارے ہاں ایک مرتبہ سرخ آندھی اور طوفان آیا تو ہم حضرت محمد بن مقاتل ؒ کے پاس گئے اور اُن سے عرض کیا، اے ابوعبداللہ! آپ ہمارے امام ہیں، اللہ عزّ وجلّ سے ہمارے لیے دعا کریں، وہ رونے لگ گئے اور کہنے لگے کاش میری وجہ سے تمہیں یہ ہلاکت نہ پہنچی ہوتی۔ ابنِ قاسم ؒ کہتے ہیں، اس کے بعد مجھے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی تو آپ نے فرمایا محمد بن مقاتل کی دعا کے سبب تم سے ہلاکت دور کر دی گئی۔

۷) حضرت ابوالفتح بن شحرف ﷫ کہتے ہیں، میں نے حضرت علی بن ابی طالب ﷜ کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا اے ابوالحسن ﷜! مجھے نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا اغنیاء کا فقراء کی بارگاہ میں تواضع کرنا کس قدر حسین عمل ہے اور فقراء کا اغنیاء سے بے پرواہ ہونا اور رب تعالیٰ پر توکل کرنا کس قدر عمدہ بات ہے۔

(۸) حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: جب تک بندے کا یہ گمان باقی رہے کہ مخلوق میں کوئی شخص اس سے زیادہ بُرا موجود ہے تو وہ متکبر ہے۔

۹) حضرت ابوعلی جوزجانیؒ فرماتے ہیں "نفس تکبر، حرص اور حسد سے مرکب ہے سو جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی ہلاکت کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے تواضع، نصیحت اور قناعت کو دور کر دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اور اس پر چادرِ رحمت پھیلانا چاہتا ہے تو اسے ان تین باتوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے، پس جب نفس میں تکبر کی آگ بھڑکنے لگتی ہے تو بندہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس کا تدارک تواضع سے کرتا ہے، جب نفس میں حسد کی آگ شعلہ زن ہونے لگے تو اس کا تدارک وہ بندہ رب تعالیٰ کی توفیق سے نصیحت سے کرتا ہے اور جب نفس میں حرص کی آگ اٹھنے لگے تو بندہ اس کا تدارک بتوفیقِ الٰہی قناعت سے کرتا ہے۔

۱۰) حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ایک مرتبہ خطبۂ جمعہ دے رہے تھے تو دورانِ گفتگو فرمانے لگے، اگر نبی کریم ﷺ سے یہ فرمان مروی نہ ہوتا کہ "آخری زمانہ میں قوم کا سردار رذیل

ترین انسان ہوگا'' تو میں تمہیں خطاب نہ کرتا۔

۱۱) سیدنا حضرت ابوبکر صدیق اکبر ﷺ نے فرمایا ''ہم نے کرم خداوندی کو تقویٰ میں پایا ہے، تمنا کو یقین میں پایا ہے اور عزت کو تواضع میں پایا ہے''۔ [۱]

دستک دینے پر کہا جائے لوٹ جاؤ تو لوٹ جانے میں تزکیہ ہے، کیوں؟

قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کر لو یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو، پس اگر ان گھروں میں تم کسی کو نہ پاؤ تو (بھی) اجازت ملے بغیر ان میں داخل نہ ہو اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ ''هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ'' [۲] یہ (طرزِ معاشرت) بہت پاکیزہ ہے تمہارے لیے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے)۔

بغیر کسی کارنامے کے مدح کی اُمید کرنا

نفس کے حق میں تو یہ بات بھی انتہائی مضر تھی کہ وہ کسی عبادت یا اچھے کام کے بعد عجب میں آئے، لیکن بعض نفوس اس سے بھی زیادہ خطرناک اور خسیس ہوتے ہیں جو ناکردہ کارناموں پر بھی تعریف کے خواہاں ہوتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں اس عادتِ بد میں مبتلا لوگوں کیلئے ارشاد ہے ''لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝'' [۳] (آپ ایسے لوگوں کو ہرگز (نجات پانے والا) خیال نہ کریں جو اپنی کارستانیوں پر خوش ہو رہے ہیں اور ناکردہ اعمال پر بھی اپنی تعریف کے خواہشمند ہیں (دوبارہ تاکید کیلئے فرمایا) پس آپ انہیں ہرگز عذاب سے نجات پانے والا نہ سمجھیں، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے)۔

شریعت میں تو یہ بات بھی ممنوع ہے کہ کوئی شخص بلاضرورت اپنی وہ خوبی ظاہر کرے جو اس میں فی الواقع موجود ہو اور کجا یہ کہ جو خوبی اس میں سرے سے ہی نہیں وہ اس کا چرچا کرتا پھرے۔ معاشرہ میں ایسے کذاب اور مکار لوگ بکثرت موجود ہیں جو عالم نہیں مگر خود کو عالم کہلاتے ہیں، مفتی نہیں ہیں مگر مفتی کہلاتے ہیں اور شیخ و مرشد نہیں مگر خود کو شیخ اور مرشد کہلاتے ہیں۔

امام احمد رضاؒ لکھتے ہیں ''یوں ہی اپنے آپ کو بے ضرورت شرعی مولوی (علامہ) صاحب لکھنا بھی گناہ و مخالفِ حکمِ قرآن ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ تمہیں خوب جانتا ہے جو پرہیزگار ہے جب اس نے تمہیں زمین سے اُٹھان دی اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں چھپے تھے ''فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ''

---

[۱] احیاء علوم الدین، جلد۳، صفحہ۳۰۲۔ [۲] النور۲۴: ۲۷، ۲۸۔ [۳] آلِ عمران۳: ۱۸۸۔

تو اپنی جانوں کو آپ اچھا نہ کہو خدا خوب جانتا ہے جو پرہیز گار ہے'' اور فرماتا ہے'' کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جو آپ اپنی جانوں کو ستھرا بتاتے ہیں بلکہ خدا ستھرا کرتا ہے جسے چاہے''۔ حدیث شریف میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں ''مَنْ قَالَ اَنَاعَالِمٌ فَهُوَ جَاهِلٌ'' [1] (جو اپنے آپ کو عالم کہے وہ جاہل ہے۔ جاہل شخص کا اپنے آپ کو مولوی (عالم) کہنا دوگنا گناہ ہے کہ اس کے ساتھ جھوٹ اور جھوٹی تعریف کا پسند کرنا بھی شامل ہوا۔ جس کی مذمت کا بیان آیت مذکورہ قبل میں ہو چکا ہے۔ تفسیر ''معالم التنزیل شریف'' میں عکرمہ تابعی رضی اللہ عنہ شاگرد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر یوں منقول ہے ''يَفْرَحُوْنَ بِاِضْلَالِهِمُ النَّاسَ وَبِنِسْبَةِ النَّاسِ اِيَّاهُمْ اِلَى الْعِلْمِ وَلَيْسُوْا بِاَهْلِ الْعِلْمِ'' (خوش ہوتے ہیں لوگوں کو بہکانے پر اور اس پر کہ لوگ انہیں مولوی (علامہ) کہیں حالانکہ مولوی نہیں)۔ [2]

حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبِ زُوْرٍ'' [3] (اُس چیز کا اظہار کرنے والا جو اسے عطا نہیں کی گئی ایسا ہے جیسے جھوٹ کا جامہ پہننے والا)۔

مشہور صوفی محدث عارف باللہ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''یہ اس شخص کی مذمت میں ارشاد ہے جو زاہدین، صالحین اور اہل حق علماء کے لباس میں ملبوس ہو کر اپنے آپ کو زاہد، صالح اور عالم ظاہر کرے لیکن اس کا باطن ان تمام باتوں سے خالی ہو''۔ [4]

امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک جعلی پیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے مفصل جواب دیتے ہوئے آخر میں یہ حدیث درج فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا'' [5] (دھوکہ دینے والا ہمارے گروہ سے نہیں)۔ [6]

نماز اور تزکیۂ نفس

نماز قائم رکھنے والے اہل اسلام نفس کی تمام صفاتِ ذمیمہ اور عجب و خود پسندی سے مبرا اور منزہ ہو جاتے ہیں بشرطیکہ وہ نماز کو قائم کرنے والے ہوں اور نماز کا قائم رکھنا یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نقص، کمزوری اور کجی وغیرہ نہ ہو۔ اقامتِ نماز یعنی نماز قائم کرنے کا معنٰی سمجھنے کیلئے درج ذیل آیت میں غور فرمایئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ'' [7] (اور اگر وہ لوگ تورات اور انجیل اور جو کچھ (مزید) ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا تھا (نافذ اور) قائم کر دیتے تو (انہیں مالی وسائل کی اس قدر وسعت عطا

---

[1] المعجم الصغیر، حدیث ۱۷۶، جلد ۱، صفحہ ۱۲۰۔ [2] فتاوی رضویہ، امام احمد رضا خاں بریلوی، جلد ۱۰، نصف الاول، صفحہ ۹۵، ۹۶۔

[3] صحیح بخاری، حدیث: ۴۹۲۱، جلد ۵، صفحہ ۲۰۰۱۔ [4] فیض القدیر، جلد ۱۲، صفحہ ۶۱۰۱۔

[5] سنن الترمذی، حدیث ۱۳۱۵، جلد ۳، صفحہ ۶۰۶۔ [6] فتاوی رضویہ، جلد ۹، ص ۱۰۴۔ [7] المائدہ، ۵:۶۶۔

ہو جاتی کہ) وہ اپنے اوپر سے (بھی) اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (بھی) کھاتے)۔ ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ o" [1] (اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو کم نہ کرو)۔

ان آیات کی روشنی میں کسی چیز کی اقامت (قائم رکھنے) کا معنیٰ بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے اقامتِ صلوٰۃ کا معنیٰ یہ ہے کہ نماز کی تمام شرائط پوری کی جائیں، اس کے تمام فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کے ساتھ اس کی تمام ظاہری حدود پوری کی جائیں اور نماز میں اِدھر اُدھر کی سوچ و بچار نہ ہو اور نماز کے دوران دنیوی منصوبوں اور دنیاوی خیالات میں منہمک اور مستغرق نہ ہو، وہ صرف یہ سوچے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑا ہے اور اس سے مناجات کر رہا ہے۔ فقط اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور دورانِ نماز اس کا ڈر اور خوف دامن گیر رہے۔ یہ نماز کی باطنی حدود ہیں اور ظاہری اور باطنی تمام حدود کی رعایت کے ساتھ نماز پڑھنا اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ (ہماری تصنیف "حسنِ نماز" کے اوائل میں اقامتِ صلوٰۃ کے مضمون کا مطالعہ فرمائیں) ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ط وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ط" [2] (اے حبیب ﷺ) آپ ان ہی لوگوں کو ڈر سناتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کوئی پاکیزگی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کیلئے پاک ہوتا ہے)۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى o وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى o" [3] (بے شک وہی بامراد ہوا جو (نفس کی آفتوں اور گناہ کی آلودگیوں سے) پاک ہو گیا اور وہ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور (کثرت و پابندی سے) نماز پڑھتا رہا)۔

مال خرچ کرنے میں تزکیۂ نفس

سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۳ میں مال خرچ کرنے سے جو نفس کا تزکیہ ہوتا ہے وہ آپ پڑھ چکے ہیں اب آپ ان آیات کا مطالعہ فرمائیں جن میں اس ہستی کا ذکر ہے جو انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد "اَتْقٰى" (سب سے بڑا متقی) ہے، یعنی حضرت سیدنا ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، اُن کی شان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى o الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى o" [4] (اور اس (آگ) سے اس بڑے پرہیز گار شخص کو بچا لیا جائے گا، جو اپنا مال (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اپنے جان و مال کی) پاکیزگی حاصل کرے)۔ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آخر سورۃ تک یہ تمام آیات خصوصاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئیں اور عموماً ہر وہ شخص ان آیات کے مصداق بننے کا حق دار ہے جو اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کر کے تزکیہ حاصل کرے۔

فائدہ: اِن آیات میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "اَتْقٰى" کہا گیا اور سورۃ الحجرات میں "اَتْقٰى" کو سب

---

[1] الرحمٰن، ۵۵: ۹۔ [2] فاطر، ۳۵: ۱۸۔ [3] الاعلیٰ، ۸۷: ۱۴، ۱۵۔ [4] اللیل، ۹۲: ۱۷، ۱۸۔

سے مکرم کہا گیا "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰکُمْ"[1] (تم میں سے زیادہ معزز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے) اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد معزز گروہ صدیقین کا ہے اور صدیقین میں بڑا صِدّیق رضی اللہ عنہ وہ ہوگا جو "اتقٰی" بڑا متقی ہو اور بڑے متقی (اُمتِ مسلمہ میں) قرآن کے نزدیک حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا جہاں آپ بڑے متقی ہیں وہاں بڑے صِدّیق بھی آپ ہیں۔ اسی لیے آپ کو صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے بہر کیف مال راہِ خدا میں خرچ کرنے کا تزکیۂ نفس سے بہت گہرا تعلق ہے اسی لیے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔

مگر یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ مال سے مراد مال حلال ہے، ایسا نہ ہو کہ مال، حرام ذرائع سے کمایا گیا ہو اور پھر بڑی بڑی نمائشی افطاریاں کروا کر اور گھر کے باہر سڑک پر کھڑے ہو کر سو، سو روپے کے نوٹ بانٹ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ میرے گناہ دھل گئے اور میرے نفس کا تزکیہ ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں، تزکیہ نفس کیلئے مال حرام سے بچنا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ حرام مال کیا ہوتا ہے؟

مال حرام سے مراد

طبرانی اور بیہقی میں ہے کہ فرائض کے بعد حلال طلب کرنا فرض ہے اور فرمایا حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور طلبِ حلال اس وقت ممکن نہیں جب تک معلوم نہ ہو کہ حلال کہتے کس کو ہیں۔[2] تفصیل کے لیئے ہماری کتاب "اکتسابِ رزق" دیکھیں جو کچھ عرصہ میں انشاءاللہ شائع ہونے والی ہے۔

حضرت مولانا رومیؒ مال حرام کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں "فَیَدْخُلُ فِیْهِ الْقُمَارُ وَالْخِدَاعُ وَالْغُصُوْبُ وَجُحْدُ الْحُقُوْقِ مَالَا یُطِیْبُ بِهٖ نَفْسُ مَالِکٍ" (اس میں جوا، دھوکہ دہی، غصب (زبردستی چھین لینا) کسی کے حقوق کا انکار اور وہ مال جسے اس کے مالک نے خوشی سے نہیں دیا سب اکل باطل (حرام خوری) میں شامل ہیں)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ"[3] (اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ)۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں "مَنْ اَخَذَ مَالَ غَیْرِهٖ عَلٰی مَا وَجَدَ اِذْنَ الشَّرْعِ فَقَدْ اَکَلَ بِالْبَاطِلِ"[4] (وہ شخص جس نے اس طریقے سے مال حاصل کیا جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی تو اس نے باطل ذرائع سے کھایا)۔ اس آیت سے سود، جوا، لوٹ مار، چوری، خیانت، جھوٹی گواہی، رشوت، چور بازاری، ناجائز منافع خوری، کھیل کود، مذاق میں اور چھین کر لیا ہوا مال وغیرہ کو حرام خوری میں داخل کر دیا گیا

---

[1] الحجرات، ۴۹: ۱۳۔
[2] سنن البیہقی، حدیث ۱۰۱۸۰، جلد ۵، صفحہ ۲۶۴۔
[3] النسآء ۴: ۲۹۔
[4] تفسیر قرطبی، جلد ۲، صفحہ ۳۳۸۔

ہے۔ صحابہ کرام ﷺ ہر معاملے میں تقویٰ اختیار کرتے اور کسی کے گھر سے بھی نہ کھاتے تھے کہیں اس میں حرام کا شائبہ نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ نور کی یہ آیت نازل ہوئی "وَلَا عَلٰٓی اَنۡفُسِکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا مِنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اٰبَآئِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اُمَّهٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اِخۡوَانِکُمۡ "[1] (اور نہ تم پر اس بات میں (کوئی حرج) کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے)۔

طبرانی میں ہے کہ اپنا کھانا عمدہ (حلال) رکھو۔ تمہاری دعائیں قبول ہوں گی۔ اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے ایک آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا ایک نوالہ ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ مسند بزاز میں ہے کہ جس نے حرام مال سے قمیض بنا کر پہنی جب تک وہ قمیص نہ اتارے اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔[2]

مسندِ احمد بن حنبل میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہارے اندر روزی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق تقسیم کیے ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا اسے بھی دیتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اسے بھی دیتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہے مگر دین کی دولت اور علم و فہم صرف اسے ہی دیتا ہے جسے پسند کرتا ہے۔[3]

پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل اور زبان مسلمان نہ ہوں اور تب تک ایماندار نہیں ہوتا جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاء رسانی سے محفوظ نہ ہوں۔ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا یا رسول ﷺ اس کی ایذاء رسانیاں کیا ہیں۔ فرمایا کہ اس کو دھوکہ دینا، ظلم کرنا اور جو بندہ بھی حرام کماتا ہو پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے ختم نہیں کرتا بلکہ بُرائی کو نیکی سے ختم کرتا ہے۔[4]

ترمذی شریف میں ہے کہ زیادہ تر لوگ منہ اور شرم گاہ کے باعث دوزخ میں جائیں گے اور زیادہ تر لوگ جنت میں اللہ تعالیٰ کے ڈر اور حسنِ اخلاق سے جائیں گے۔[5] اور ترمذی میں ہی ہے کہ قیامت کے دن بندے کے قدم اس وقت تک نہیں ہلیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے متعلق پوچھ نہ لیا جائے گا۔

۱) عمر کس کام میں ختم کر دی؟ ۲) جوانی کس کام میں لگا دی؟

۳) مال کہاں سے کمایا؟ ۴) کہاں خرچ کیا؟

۵) علم پر کس قدر عمل کیا؟[6]

شیخ ابوالسعود ابی العشائرؒ فرماتے ہیں کہ جب تک تمہاری زبان حرام چکھتی رہے گی اس وقت تک یہ

---

[1] النور،۲۴:۶۱۔ [2] مسند البزار، احمد بن عمرو البزار، متوفی ۲۹۲، حدیث ۸۱۹، جلد ۳، صفحہ ۶۱، موسۃ علوم القرآن، بیروت۔

[3] مسند احمد بن حنبل، حدیث ۳۶۷۲، جلد ۱، صفحہ ۳۸۷۔ [4] المعجم الکبیر، حدیث ۱۰۴۴۲، جلد ۱۰، صفحہ ۱۹۶۔

[5] سنن الترمذی، حدیث ۲۰۰۴، جلد ۴، صفحہ ۳۶۳۔ [6] سنن الترمذی، حدیث ۲۴۱۷، جلد ۴، صفحہ ۶۱۲۔

امید نہ رکھو کہ تم حکمتوں اور معرفتوں کا کچھ مزہ چکھ سکو گے۔ حضرت داتا گنج بخش لکھتے ہیں کہ حضرت سعید بن المسیب مکہ معظمہ میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے وہ حلال بتائیے کہ جس میں حرام نہ ہو اور وہ حرام بتائیں جس میں حلال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا "ذِکْرُ اللّٰہِ حَلَالٌ لَیْسَ فِیْہِ حَرَامٌ وَ ذِکْرُ غَیْرِہٖ حَرَامٌ لَیْسَ فِیْہِ حَلَالٌ" (اللہ کا ذکر ایسی حلال چیز ہے جس میں حرام نہیں پایا جاتا اور غیر اللہ کا ذکر ایسی حرام چیز ہے جس میں حلال نہیں پایا جاتا)۔

حضرت سعد نے ایک دن عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے حق میں دعا فرمائیں کہ میں مستجاب الدعوات بن جاؤں یعنی میری ہر دعا قبول ہو۔ فرمایا حلال روزی کھاتے رہو اور ہمیشہ سچ بولو تمہاری ہر دعا قبول ہوگی۔[1] ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کتنے ہی لوگ ہیں کہ کھاتے بھی حرام ہیں، پہنتے بھی حرام ہیں اور اس کے باوجود ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں آخر کس طرح قبول ہو سکتی ہیں۔

کسبِ حلال کی فضیلت

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص چالیس روز تک حلال کی روزی کھاتا رہے جس میں حرام کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہو۔ حق تعالیٰ اس کے دل کو نور سے بھر دیتا ہے اور حکمت کے سوچشمے اس کے دل سے پھوٹتے ہیں اور دوسری حدیثِ پاک میں ہے کہ اس کا دل دنیا کی دوستی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ چالیس دن حرام کھانے والوں کا دل سیاہ اور زنگ آلود ہو جاتا ہے۔[2] "احیاء العلوم" میں حضرت امام غزالی لکھتے ہیں:

حضرت سہیل فرماتے ہیں "مَنْ اَکَلَ الْحَرَامَ عَصَتْ جَوَارِحُہٗ شَاءَ اَمْ اَبٰی عَلِمَ اَوْلَمْ یَعْلَمْ وَ مَنْ کَانَتْ طُعْمَتُہٗ حَلَالًا اَطَاعَتْ جَوَارِحُہٗ وُفِّقَتْ لِلْخَیْرَاتِ"[3] (جو شخص حرام کھاتا ہے اس کے اعضاء آمادۂ گناہ ہو جاتے ہیں، خواہ وہ خود چاہے یا نہ چاہے خواہ اس کو معلوم ہو یا نہ ہو، اور جس شخص کی غذا حلال ہے اس کے اعضاء اطاعت کرتے ہیں اور اس کے اعضاء کو نیکی کی توفیق دی جاتی ہے)۔

فرمایا حرام کھا کر جو گوشت جسم پر چڑھ گیا ہو اس کا دوزخ کی آگ میں جلنا ہی بہتر ہے۔ فرمایا جس کو یہ پرواہ نہیں کہ مال کہاں سے چلا آ رہا ہے تو اس کے بارے میں حق تعالیٰ کو بھی کوئی پرواہ نہیں ہوگی کہ اس کو دوزخ کے کون سے حصے میں جھونک دیا گیا ہے۔ فرمایا عبادت کے دس حصوں میں نو حصے طلبِ حلال کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

---

[1] المعجم الاوسط، حدیث ۶۴۹۵، جلد ۶، صفحہ ۳۱۰۔

[2] الترغیب والترھیب، عبد العظیم المنذری، متوفی ۶۵۶ھ، حدیث ۲۶۶۵، جلد ۲، صفحہ ۳۴۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

[3] احیاء علوم الدین، جلد ۲، صفحہ ۹۱۔

حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ ہم نے حلال کے دس حصوں میں سے نو پر اس لیے قناعت کر لی کہ کہیں (پورا لے کر) حرام میں مبتلا نہ ہو جائیں چنانچہ اس زمانے میں اگر کسی نے سو درہم لینے ہوتے تو نوے سے زیادہ اس لیے وصول نہ کرتے کہ کہیں زیادہ نہ ہو جائیں۔ فرمایا کہ کسب حلال میں کوشاں رہنے والا جب تھک کر رات کو سوتا ہے تو بخشا ہوا ہوتا ہے اور صبح کو اٹھتا ہے تو حق تعالیٰ کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حرام سے پرہیز کرنے والوں سے تو مجھے حساب لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کیا حساب لیں گے) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بار مشتبہ دودھ پی لیا مگر علم ہونے پر قے کر دی جس سے ان کی جان کو بھی خطرہ ہو گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ نماز پڑھتے پڑھتے کمر جھک جائے اور روزے رکھتے رکھتے جسم سوکھ کر بال کی طرح باریک ہو جائے تو بھی ان کا کوئی فائدہ نہیں جب تک حرام روزی سے اعراض نہ کیا جائے۔

حضرت سفیان ثوریؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص مالِ حرام سے صدقہ خیرات دیتا ہے وہ گویا ناپاک کپڑوں کو پیشاب سے دھونے کی کوشش کرتا ہے جو بذاتِ خود زیادہ ناپاک ہے۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک لاکھ درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے کہ شبہ والا ایک درہم مالک کو لوٹا دیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ستر بار ایسا ہوا کہ میں نے حلال چیز سے بھی ہاتھ اٹھا لیا کیونکہ یہ خوف ہوتا تھا کہ اگر ہر حلال چیز کی خواہش کو پورا کرنے لگوں تو خواہشات کا ہجوم ہو جائے گا اور بالآخر حرام کی خواہش بھی دل میں پیدا ہو جائے گی اور جب نفس حلال چیزوں کا عادی ہو جائے تو پھر دل ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کون کون سی چیز حلال ہے کیونکہ۔

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم کن نعمتوں کا حکم دیا ہے جواز کا

''مقالاتِ حکمت'' جلد دوم صفحہ نمبر ۲۵۲ میں ہے کہ بلند پروازی کا انحصار طیب روزی پر ہے۔ مرغ کی روزی حقیر ہے اور باز کی روزی طیب ہوتی ہے۔ مرغ گرے پڑے ریزوں سے پیٹ بھرنے کا عادی ہے مگر باز کی روزی اس کے تجسس اور زور بازو کا نتیجہ ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ حلال اور حرام کا انسان کی روح پر براہِ راست اثر ہوتا ہے۔ حلال کی روزی جو ایمان داری اور محنت سے حاصل کی گئی ہو اس سے انسان کے ذہن میں علم و حکمت کا اضافہ ہوتا ہے، عشقِ حقیقی اور رقت پیدا ہوتی ہے۔ حرام کی روزی سے حسد و بغض اور جہالت میں اضافہ ہوتا ہے۔ غذا کے اثرات روح پر حلال و حرام روزی سے مرتب ہوتے ہیں۔ روزی ایک تخم ہے اور خیالات اس کا ثمر ہیں۔ حرام کی روزی سے خراب خیالات ہی پیدا ہوتے ہیں۔ روح کی مثال ایک چراغ کی سی ہے۔ حلال کی روزی تو اس میں روغن کا کام دیتی ہے اور اس کے برعکس حرام کی روزی سے اس چراغ میں پانی پڑ جاتا ہے اور چراغ بجھ جاتا ہے۔ جب کسی شخص کے دل میں خراب

خیالات اور خراب میلانات دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ حرام کا لقمہ کھاتا ہے۔

لقمہ کاں نور افزود و کمال — آں بود آوردہ از کسب حلال

(جس لقمے نے نور اور کمال بڑھایا ہے وہ حلال کمائی سے حاصل کیا ہوا ہوتا ہے)

روغنے کاید چراغ ما کشد — آب خوانش، چوں چراغے را کشد

(وہ تیل جو آتے ہی ہمارا چراغ بجھا دے اس کو پانی کہو کیونکہ وہ چراغ کو گل کرتا ہے)

علم و حکمت زاید از لقمۂ حلال — عشق و رقت زاید از لقمہ حلال

(حلال لقمہ سے علم و دانائی پیدا ہوتی ہے، عشق اور دل کی نرمی حلال لقمہ سے پیدا ہوتی ہے)

چوں ز لقمہ تو حسد بینی دوام — جہل و غفلت زاید، آں را داں حرام

(جب تو دیکھے کہ لقمہ سے ہمیشہ حسد، جہل اور غفلت پیدا ہوتی ہے تو اس کو حرام سمجھ)

لقمہ تخم است و برش اندیشہا — لقمہ بحر و گوہرش اندیشہا

(لقمہ تخم ہے اور اس کا پھل خیالات ہیں، لقمہ سمندر ہے اور اس کے موتی خیالات ہیں)

زاید از لقمہ حلال اندر دہاں — میل خدمت، عزمِ رفتن آں جہاں

(منہ میں لقمہ حلال سے خدمت کا میلان اور اُس جہان (آخرت) جانے کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے)

زاید از لقمہ حلال اے مہ حضور — در دل پاک تو و در دیدہ نور

(اے بزرگ حلال لقمہ سے حضوری پیدا ہوتی ہے، ترے پاک دل اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے) (م:۱/۱۸۷)

جو ہمہ وقت انسان کے اندر گناہ و لغزش اور بدکاری کے داعیہ کو بیدار کرتی رہتی ہے وہ شہوت کی یہ آگ ہے جو انسان کے نفسِ امارہ میں بھڑکتی ہے۔ ظاہری اور بیرونی آگ کو پانی سے بجھایا جا سکتا ہے مگر شہوت کی آگ پانی سے بجھنے والی نہیں جس طرح کہ دوزخ کی آگ پانی سے نہیں بجھے گی۔ باطن اور نفس کی آگ کو سوائے تزکیہ نفس کے نہیں بجھایا جا سکتا اور اگر اس آگ کو ذکرِ الٰہی اور اشکِ ندامت سے بجھانے کا شروع سے اہتمام نہ کیا جائے تو یہ آگ جہنم کی آگ کی شکل اختیار کر جاتی ہے جس سے نکلنا محال ہے۔ شیطان ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کا وِرد کرنے سے بھاگ جاتا ہے مگر آستین کے سانپ کو کیسے بھگایا جائے۔ اس کی خبر اس وقت چلتی ہے جب وہ ڈس کر اپنا زہر پورے بدن انسانی میں پھیلا چکا ہوتا ہے۔ آتشِ شہوت کے نارِ دوزخ کے ساتھ مشابہ ہونے کی تائید اس حدیث مبارکہ سے ملتی ہے جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے ''حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ'' (جہنم کو خواہشات سے ڈھانپ دیا گیا ہے)۔[1]

بعد ازاں ایں نار نار شہوت است — کاندر او اصل گناہ و ذلت است

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۷۱۹، جلد ۲، صفحہ ۴۹۴۔

(اس آتشی مخلوق (شیطانی) کے علاوہ یہ ایک اور آگ نارِ شہوت ہے جو انسان کے اندر گناہ اور لغزش کی بنیاد ہے)

تہذیب نفس کا مناسب وقت

انسان کے نفس کی یہ خصلت ہے کہ وہ ہر وقت بُرائی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس سے بچنے کی تدابیر اس کتاب میں جابجا دی گئی ہیں مگر قرآن نے اس کا علاج یہ دیا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو بے لگام نہ چھوڑے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝" [1] (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات و شہوات سے باز رکھا، تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے ساری کائنات بنائی اور ان چیزوں سے استفادہ کرنے کیلئے انسان کے اندر نفس پیدا کیا جو مختلف خواہشات پیدا کرتا ہے۔ کسی انسان سے گناہ سرزد ہو جانا اور بات ہے لیکن اگر نفس کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ شیطان کا روپ دھار لیتا ہے اور انسانیت کے درجے سے گر جاتا ہے۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کا درج ذیل فرمان روایت کیا گیا ہے جسے حضرت قیس بن اَبی حازم ﷛ نے روایت کیا ہے۔

حضرت قیس بن اَبی حازم ﷛ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَتَضَعُوْنَهَا عَلٰى غَيْرِ مَا وَضَعَهَا اللّٰهُ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَهُمْ فَلَمْ يُنْكِرُوْهُ يُوْشِكُ اَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ" [2]

(اے لوگو تم یہ آیت پڑھتے ہو اور اسے ایسی جگہ رکھ دیتے ہو جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے نہیں رکھا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اے ایمان والو! تم اپنے نفسوں کی فکر کرو، تمہیں کوئی گمراہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت یافتہ ہو چکے ہو" میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک لوگ جب برائی کو اپنے درمیاں دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن سب کو عذاب میں مبتلا کر دے)۔

نفس کی اصلاح سے بالکل بے پرواہ بن جانا نہایت قابلِ افسوس ہے اور نفس ایک معبود کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے بالکل کچل دیا جائے اور اس کی جائز ضروریات بھی پوری نہ کی جائیں تو یہ صریحاً ظلم اور رہبانیت ہے جسے اللہ تعالیٰ گمراہی قرار دیتا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ" [3] (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے) اسلام دو انتہاؤں کے درمیان میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے اور اپنے

---

[1] النّٰزعٰت، ۷۹: ۴۰، ۴۱۔
[2] صحیح ابن حبان، حدیث ۳۰۵، جلد ۱، صفحہ ۵۴۰۔
[3] کشف الخفاء، حدیث ۳۱۵۴، جلد ۲، صفحہ ۵۱۰۔

نفس کی اصلاح پر زور دیتا ہے اور ہمہ وقت اس کا احتساب اور اسے قابو میں رکھنے کی تاکید کرتا ہے جس طرح انسان جسمانی امراض میں مبتلا ہوتا ہے اسی طرح اپنی بشریت کے تقاضے سے روحانی امراض میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے مگر کوئی عقلمند اور ذی ہوش انسان جسمانی مرض میں گرفتار رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ فوراً اس کے علاج کی طرف توجہ دیتا ہے۔

بالکل اسی طرح کوئی عاقل شخص روحانی امراض میں ہمیشہ مبتلا رہنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات ایک معمولی جسمانی مرض بھی نہایت سنگین اور پیچیدہ مرض بن جاتا ہے اور اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو وہ عموماً جان لیوا ثابت ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی امراض (خواہ وہ بظاہر کتنے ہی معمولی نظر آتے ہوں) کی طرف بروقت توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتدائی علاج آسان اور سہل ہوتا ہے۔ بعد میں علاج نہ صرف مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض امراض تو لاعلاج بھی بن جاتے ہیں۔

باب نمبر ۱۶

محاسبہ، معاتبہ اور مراقبہ

عرف عام میں اپنے کیے گئے اعمال کی درستی یا خرابی کے حساب کرنے کو محاسبہ کہا جاتا ہے۔ اپنے اعمال میں کسی خطا یا لغزش ہونے کے بعد خود پر عتاب کرنے کو معاتبہ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں اصطلاحات کی طریقت کے اعتبار سے تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

محاسبۂ نفس کی اہمیت

یوم حساب میں انسان سے حساب لیا جائے گا۔ اس حساب کی دنیا میں جانچ پڑتال کرنے سے مراد محاسبۂ نفس ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے کائنات کی ہر چیز اس کی خادم ہے اور یہ مخدوم کائنات ہے اور یہ فطرت کا اُصول ہے کہ مخدوم ہونے کا شرف اُسی کو حاصل ہوتا ہے جس کی صلاحیتیں اُس کی رعایا سے زیادہ ہوں مثلاً ایک جانور کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے آخر کیوں؟ اس لیے کہ اُس کی صلاحیتیں دیگر جانوروں سے زیادہ ہیں، علی ھذا القیاس، بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا انسان کے بارے میں جب یہ کہا گیا کہ اِس کے سَر پر عظمت و کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور کائنات پست و بالا کو اس کیلئے مسخر کر دیا گیا تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اندر دیگر مخلوقات سے زیادہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی گئی ہوں گی، یقیناً انسان عقل و فہم، ذہن و ذکاء اور علم و حلم میں باقی تمام مخلوق سے ممتاز بھی ہے اور افضل بھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بہیمی و حیوانی صفات اور خواہشات ولذّات کا داعیہ بھی رکھا گیا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام ضروریات کا زمین میں بندوبست کر کے اِسے بتادیا کہ وہ کس طرح

زندگی گزارے اور اشیاء کائنات کو کس طرح کام میں لائے اسے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ وہ دیگر مخلوقات کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے اور انسان خود انسانی معاشرہ میں باہمی زندگی کس طرح گزارے۔ قرآن وحدیث کی صورت میں یہ تمام لائحہ عمل اس پر واضح کر دیا گیا ہے اور ایک خاص وقت میں اس سے باز پرس ہوگی کہ بتاؤ تم نے زندگی کیسے گزاری؟ اس سے یہ باز پرس کی جائے گی کہ مال کہاں سے کمایا اور کس طرح اور کہاں خرچ کیا اور لوگوں کے ساتھ اس نے ان کے حقوق کو کس حد تک ادا کیا۔ اگر کوئی شخص پڑھا لکھا نہ بھی ہو تب بھی اُسے فطری طور پر کھوٹے اور کھرے، نفع اور نقصان کی تمیز دے دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا" [1] (پھر اُس کے دل میں ڈال دیا اُس کی نافرمانی اور اُس کی پارسائی کو)۔ نیز ارشاد فرمایا "اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۝ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" [2] (کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کیلئے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے دکھا دیں اُسے دو نمایاں راہیں)۔

عوام الناس میں سے کون نہیں جانتا کہ زنا اچھا ہے یا نکاح، حرام خوری اچھی ہے یا حلال خوری؟ غرضیکہ انسان ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا' اُسے اچھی زندگی گزارنے کا مکمل شعور حاصل ہے لہٰذا اس سے ضرور باز پرس ہوگی اور مکمل حساب لیا جائے گا۔ ارشاد فرمایا "وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ" [3] (اور ہم رکھ دیں گے صحیح تولنے والے ترازو قیامت کے دن پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے)۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے "يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ" [4] (وہ دن جب تم پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہ رہے گا)۔

یوم الحساب سے پہلے اپنا محاسبہ کرنے کا حکم

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ متعدد آیات میں روزِ قیامت حساب لینے اور انسان کو اس کے سابقہ اعمال سے آگاہ کرنے کا ذکر ہے اور ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ انسان کو اُس کے اگلے پچھلے تمام اعمال کے بارے میں بتایا جائے گا لیکن انسان خود بھی باخبر ہے جان بوجھ کر بے خبر بننے کی کوشش کرتا ہے "يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝" [5] (اُس دن اِنسان اُن (اَعمال) سے خبردار کیا جائے گا جو اُس نے آگے بھیجے تھے اور جو

---

[1] الشمس، ۹۱:۸۔　[2] البلد، ۹۰:۸،۱۰۔　[3] الانبیآء، ۲۱:۴۷۔　[4] الحآقۃ، ۶۹:۱۸۔

[5] القیامۃ، ۷۵:۱۳،۱۵۔

(اَثرات اپنی موت کے بعد) پیچھے چھوڑے تھے، بلکہ اِنسان اپنے (اَحوال) نفس پر (خود ہی) آگاہ ہوگا، اگرچہ وہ اپنے تمام عذر پیش کرے گا)۔

انسان کی اسی دانائی اور بینائی کی وجہ سے اسے آپ اپنا محاسبہ کرنے کی پیش کش کی گئی۔ ارشادِ الٰہی ہے "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ"[1] (اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کیلئے آگے کیا بھیجا ہے)۔

محاسبہ کرنے والا عقل مند ہے

نبی کریم ﷺ نے اُس شخص کو عقل مند فرمایا ہے جو اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ"[2] (وہ شخص عقل مند ہے جس نے اپنے نفس (یعنی اپنے آپ) کا محاسبہ کیا اور موت کے بعد کیلئے تیاری کی اور وہ شخص عاجز ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور (اس کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے آرزو رکھی)۔

محاسبۂ نفس میں اسلاف کرام کے اقوال اور اُن کی سیرت

سلف صالحین کے محاسبۂ نفس کے بارے میں بہت اقوال ہیں۔

۱) **حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ** کا اس بارے میں بہت اہم ارشاد ہے، آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا وَ تَزَیَّنُوْا لِلْعَرْضِ الْاَکْبَرِ وَ اِنَّمَا یَخِفُّ الْحِسَابُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰی مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِی الدُّنْیَا"[3] (تم اپنے نفسوں کا محاسبہ کرلو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور سب سے بڑی بارگاہ میں حاضری کیلئے تیاری کرلو، قیامت کے دن صرف اسی کا حساب آسان ہوگا جس نے دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا)۔

۲) **امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ** حضرت وھب بن منبہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حکمت میں مرقوم ہے کہ عقل مند شخص پر لازم ہے کہ چار مقامات پر غفلت کا شکار نہ ہو (۱) جب اپنے رب جلّ جلالُہ سے مناجات (دُعا) کرے (۲) جب اپنے نفس کا محاسبہ کرے (۳) جب وہ اپنے احباب کے ساتھ خلوت میں ہو اور وہ اس کے عیب اس کو بتلائیں (۴) جب وہ بالکل تنہا ہو اور اس کے اور شہوات ولذات کی تکمیل کے

---

[1] الحشر، ۵۹: ۱۸۔ [2] المستدرک، حدیث ۱۹۱، جلد ۱، صفحہ ۱۲۵۔

[3] معارج القبول، حافظ ابن احمد، متوفی ۱۳۷۷ھ، جلد ۲، صفحہ ۸۲۲، دار ابن قیم، القاہرہ۔

درمیان کوئی رکاوٹ نہ ہو، بیشک اس ساعت میں شیطان لذت کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۳) **حضرت احنف بن قیس** رضی اللہ عنہ جلتے ہوئے چراغ کی طرف آتے اور اس پر انگلی رکھ دیتے، پھر فرماتے اے احنف! محسوس کر جو تو نے فلاں اور فلاں دن یونہی گزار دیا اور جو تو نے فلاں عمل کیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ رونا شروع کر دیتے۔

۴) **حضرت حسن** رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مومن اپنے نفس کا حاکم ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔ بیشک اس قوم کا حساب بہت آسان ہوگا جس نے دنیا میں اپنا محاسبہ کرلیا اور وہ قوم بڑی مشکل میں ہوگی جو اپنا محاسبہ کیے بغیر دنیا سے رخصت ہوگئی۔

۵) **حضرت مالک بن دینار** رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جو اپنے آپ سے کہے کیا تو نے فلاں دن ایسا نہیں کیا تھا اور فلاں دن یہ عمل نہیں کیا تھا پھر نفس کی گردن پکڑے پھر اسے نکیل ڈالے، پھر کتاب اللہ کو پکڑے اور اس پر عمل کرے کیونکہ قرآن شریف انسان کا بہترین قائد ہے۔

۶) **حضرت شیخ ابن العربی** رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہمارے مشائخ اپنا محاسبہ کرتے تھے، وہ اپنے کلام اور افعال پر غور کرتے تھے اور دن بھر کی مکمل روداد کو ایک دفتر میں لکھ لیتے تھے۔ پھر جب عشاء کے بعد اپنا محاسبہ کرتے تو اس رجسٹر یا ڈائری کو اپنے سامنے رکھ لیتے اور اس میں ہر قول و عمل کو بغور دیکھتے اور موازنہ کرتے اگر کوئی عمل استغفار کے لائق ہوتا تو استغفار کرتے اور اگر توبہ کے لائق ہوتا تو توبہ کرتے اور اگر کوئی حسنِ عمل ہوتا تو حمدِ الٰہی اور شکر بجالاتے، پھر آرام گاہ میں جا کر محوِ خواب ہوتے۔[۱]

۷۔ **اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد** علیہ السلام پر وحی فرمائی ''یَادَاوُدُ عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّ وُدِّیْ بِعَدَاوَتِہَا'' (اے داؤد اپنے نفس سے دشمنی کر اس لیے کہ میری دوستی اس کی عداوت میں ہے)۔[۲]

۸۔ **حضرت ذوالنون مصریؒ** فرماتے ہیں ''اَشَدُّ الْحِجَابِ رُؤْیَۃُ النَّفْسِ وَتَدْبِیْرُھَا'' بندے کا سخت ترین حجاب نفس کو دیکھنے میں ہے اور اس کی تدبیر کی اتباع ہے (اس لیے کہ مطابقتِ نفس اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہے اور یہ تمام حجابوں کا سرچشمہ ہے)۔[۳]

۹۔ **حضرت ابو حفصؒ** فرماتے ہیں کہ نفس سراسر ظلمت ہے، اس کا چراغ اس کا اخلاص ہے اور اس کے

---

[۱] فیض القدیر، جلد ۵، صفحہ ۶۷۔ [۲] کشف المحجوب، صفحہ ۳۳۹۔ [۳] کشف المحجوب، صفحہ ۳۴۲۔

چراغ ''اخلاص'' کا نورِ توفیق الٰہی ہے۔ جس کے باطن میں توفیق الٰہی نہ ہو تو وہ سراسر تاریک رہے گا۔

۱۰۔ حضرت ابو عثمانؒ کا قول ہے کہ جس کو اپنے نفس کی کوئی بات بھی اچھی لگتی ہے تو وہ شخص اپنے نفس کے عیب نہیں دیکھ سکتا۔ نفس کے عیب تو اسی کو نظر آئیں گے جو ہر حالت میں اپنے نفس کو مشتبہ سمجھتا ہے۔

۱۱۔ حضرت ذوالنون مصریؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دی کہ وہ اپنے نفس کا ذلیل ہونا پہچان لے اور اس سے زیادہ انسان کو کوئی ذلت نہیں دی ہے کہ وہ اپنے نفس کے ذلیل ہونے پر پردہ ڈالے۔

۱۲۔ حضرت میمون بن مہران ﷺ فرماتے ہیں: بندہ اس وقت تک مرتبۂ تقویٰ پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے نفس کا اس طرح محاسبہ نہ کرے جس طرح وہ اپنے شراکت دار شخص کا محاسبہ کرتا ہے کہ اس کا کھانا کہاں سے آتا ہے اور لباس کہاں سے۔

۱۳۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے محاسبہ کا ذکر بہترین انداز میں فرمایا ہے۔ انہوں نے ''خطاب بہ نفس'' (نفس کے ساتھ خطاب) کے عنوان سے یوں فرمایا۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت مزاج تو از حالِ طفلی نگشت

(تیری پیاری زندگی کے چالیس برس گزر گئے لیکن تیرا مزاج بچپن کے حال سے نہیں بدلا)

ہمہ با ہوا و ہوس ساختی دمے با مصالح نہ پرداختی

(تو نے تمام عمر خواہش اور حرص میں گزار دی اور لمحہ بھر کیلئے نیکیوں میں مشغول نہیں ہوا)

مکن تکیہ بر عمرِ ناپائدار مباش ایمن از بازی روزگار

(بے وفا زندگی پر بھروسہ نہ کر اور زمانے کی چالبازی سے بے پرواہ نہ ہو)

محاسبۂ نفس کے ذرائع

افضل اور عمدہ بات یہ ہے کہ انسان اپنے عیوب اور نقائص پر خود نگاہ رکھے ورنہ اُن طریقوں پر عمل کرے جو صوفیائے عظام بتلاتے ہیں۔ تاہم انسان کے خود شناس ہونے میں جو لطف ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ چنانچہ سیدہ ام سلمہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا اجْعَلَ لَهُ وَاعِظًامِنْ قَلْبِهِ'' (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے قلب سے ایک واعظ (نصیحت کرنے والا) پیدا فرما دیتا ہے)۔ [1]

[1] کنز العمال، حدیث ۳۰۷۶۲، جلد ۱۱، صفحہ ۱۹۱۔

امام ابنِ سیرینؒ فرماتے ہیں: "یَاْمُرُہٗ وَ یَنْھَاہُ" یعنی اس کے قلب کا واعظ اُسے نیکی کا حکم کرتا ہے اور بدی سے منع کرتا ہے۔ حضرت محمد بن کعب القرظیؒ فرماتے ہیں جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس میں تین خوبیاں پیدا فرما دیتا ہے (۱) دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے (۲) دنیا میں زہد اور قناعت سے رہنا اس کیلئے آسان کر دیتا ہے (۳) اس کو اُس کے عیب دیکھنے والی آنکھ عطا فرما دیتا ہے۔[۱]

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس بات پر زور دیتے تھے کہ انسان اپنا محاسبہ آپ کرے۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب "الفتح الربانی" میں ارشاد فرماتے ہیں: تجھ پر افسوس ہے تو لوگوں کی باتوں میں کیوں آتا ہے؟ تو خود ہی جانتا ہے کہ تجھ میں کیا عیب ہیں اور تیرے ذمہ کیا حقوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ"[۲] (بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے احوال پر نظر رکھتا ہے)۔[۳]

علامہ اقبالؒ کے محاسبہ کا طریقہ

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنے اوپر تین قسم کے شاھد مقرر کرے جو اس کے اعمال پر گواہی دیتے رہیں۔

امتحانِ خویش کن موجود باش

اوپر سرخی میں دی گئی عبارت علامہ اقبالؒ کے شعر کا ایک مصرع ہے۔ علامہؒ کے اس مصرع سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کا امتحان کرتے رہو اور اپنے اصلی مقام یعنی درجۂ نیابت پر قائم ہونے کا ثبوت فراہم کرو۔ علامہ اقبالؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے افکار کو مولانا رومؒ کی زبان میں ایک عابد کیلئے اپنے حال کی کیفیت کو معلوم کرنے کی غرض سے چند طریقے درج ذیل اشعار میں بیان کیے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایک عابد ریاضتوں کے ساتھ مشاہدہ حاصل کرتا اور ایک مشاہدے کے بعد دوسرے میں قدم رکھتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک تماشائی کی سی نہیں بلکہ ایک ناقد اور مُبصر کی ہے۔ وہ اپنے دائرۂ تحقیق کے پیشِ نظر جن طریقوں سے کام لیتا ہے ان اصول وقواعد کے مطابق محسوسات و مدرکات کی چھان بین کرتا ہے اور ہر عنصر کو خواہ عضویاتی ہو یا نفسیاتی مگر جس کی نوعیت داخلی ہو، ان میں شامل نہیں ہونے دیتا کیونکہ وہ اس کی حقیقت پہچانتا ہے جس کی حالت ابھی معروضی ہے۔ اس تجربے اور ارادے کی طاقت سے زندگی کا ایک نیا عمل اس پر منکشف ہوتا ہے جو اصلی اور ابدی ہوتا ہے۔ پھر خودی کا ایک ازلی راز ہے کہ جب سالک پر ہر اس حقیقت کا انکشاف ہو تو وہ اسے ماننے میں مطلق تامل نہیں کرتا، کیونکہ وہی اس کی ہستی کی حقیقی اساس ہے یہاں اگر کوئی خطرہ ہے تو یہ کہ سالک اس انہماک اور استغراق میں اپنی تلاش اور جستجو کا عمل ترک نہ کر دے خودی کا نصب العین

---

[۱] حلیۃ الاولیاء، جلد۱۰، صفحہ۲۷۔　[۲] القیامہ، ۷۵: ۱۴۔　[۳] الفتح الربانی، صفحہ۲۴۴۔

یہ نہیں کہ کچھ دیکھے بلکہ یہ کچھ بن جائے اور اس کوشش میں اپنا گہرا ادراک پیدا کرے اور " اَنَاالْمَوْجُوْدُ " کہہ سکے یعنی وہ اپنے وجود کی اساس کو پالے اس کے بعد پھر کہیں جا کر اس پر اپنی حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اس عملِ ترقی میں عابد کو چاہیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے روزِ اَلَسْتُ تمام ارواح کو جمع کر کے اپنی الوہیت کیلئے شہادت طلب کی اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو اسی طرح عابد بھی اپنے اوپر تین شہادتیں طلب کرے۔ پہلی شہادت تو اپنی ذات سے لے اور خود سے پوچھے کہ "مَنْ اَنَا" میں کون ہوں پھر دوسروں کی نگاہوں سے دیکھے کہ میں ان کی نظروں میں کیا ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کیا ہوں؟ اس سے اس کو اپنا عرفان ملے گا اور معلوم ہوگا کہ میں کن صفات کے ساتھ موجود ہوں اور پھر اگر کوئی نقص نظر آئے تو اس کی اصلاح کرے اس سے مراد یہ ہے کہ سالک کی عبادت کا درجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی خودی کے مقام کی پہچان کرتا رہے۔

زندگی خود را بہ خویش آراستن — بر وجود خود شہادت خواستن

(زندگی اپنے آپ کو اپنی نظر میں آراستہ کرنا ہے اور اپنے وجود پر شہادت طلب کرنا ہے)

انجمن روز الست آراستند — بر وجود خود شہادت خواستند

(حق تعالیٰ نے بھی روزِ الست ایک محفل سجائی اور اپنے وجود پر شہادت چاہی)

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب — از سہ شاھد کن شہادت را طلب

(تو زندہ یا مردہ ہے یا جاں بہ لب، تین شاہدوں سے شہادت طلب کر)

شاھد اول شعور خویشتن — خویش را دیدن بنور خویشتن

(شاہد اول تیرا اپنا شعور ہے اس میں اپنے آپ کو اپنے نور سے دیکھنا ہے)

شاھد ثانی شعور دیگرے — خویش را دیدن بنور دیگرے

(دوسرا شاہد دوسروں کا شعور ہے یعنی خود کو دوسروں کے نور سے دیکھنا ہے)

شاھد ثالث شعور ذات حق — خویش را دیدن بہ نور ذات حق

(تیسرا شاہد حق تعالیٰ کا شعور ہے یعنی اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے نور سے دیکھنا ہے)

پیشِ ایں نُور ار بمانی استوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

(اگر تو اللہ کے نُور کے سامنے قومیت (ثابت قدمی) اختیار کرے تو خود کو اللہ تعالیٰ کی طرح حیّ و قیّوم سمجھ)

بر مقام خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

(اپنے مقام پر پہنچنا زندگی ہے ذاتِ باری تعالیٰ (یا خود) کو بے پردہ دیکھنا ہی زندگی ہے)

تاب خود را بر فزودن خوشتر است — پیش خورشید آزمودن خوشتر است

(ذرے کیلئے اپنی چمک میں اضافہ کرنا بہت ہے اور روشن سورج کے سامنے خود کو آزمانا بہتر ہے)

پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش　امتحانِ خویش کن موجود باش

(اپنے فرسودہ پیکر کی نئے سرے سے تعمیر کرو، اپنا امتحان کرتے رہو اور خود کو موجود ثابت کرو) (ج،ن:۱۹)

محاسبۂ نفس کے بارے میں امام غزالیؒ کا کلام

آپؒ فرماتے ہیں: جان لو کہ اللہ عزّ وجلّ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کیلئے اپنے عیبوں کو دیکھنے والی آنکھ کھول دیتا ہے۔ سو جس شخص کی بصیرت کے دریچے کھلے ہوں اس پر اس کے نفس کے عیب مخفی نہیں رہتے اور جب عیوب پر آگاہی ہو جائے تو علاج ممکن ہو جاتا ہے لیکن اکثر مخلوق اپنے عیب دیکھنے سے قاصر ہے۔ وہ دوسرے شخص کی آنکھ کا باریک ترین ذرہ تاڑ لیتے ہیں اور اپنی آنکھ کے شہتیر کا ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ بہر کیف جو شخص اپنے عیوب پر آگاہی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کیلئے چار طریقے ہیں۔

محاسبۂ نفس کا پہلا طریقہ، کامل شیخ کی صحبت

اوّل طریقہ یہ ہے کہ شیخ بصیرت (صاحبِ فراست) کی صحبت میں بیٹھے تاکہ وہ اس کو نفس کی مخفی آفات سے خبردار کرے اور اس کے علاج کے بارے میں احکام صادر فرمائے اور مجاہدات کی تلقین کرے۔ یہ حالت مرید اپنے شیخ کی بارگاہ میں اور شاگرد اپنے استاد کی بارگاہ میں اختیار کرے تاکہ شیخ اور استاد کو مرید اور شاگرد کے نفس کے عیوب کی معرفت آسان ہو اور وہ اس کا علاج کر سکے لیکن اس زمانے میں ایسے مُربّی (تربیت کرنے والے) شیخ اور استاد کا دستیاب ہونا بہت نادر ہے۔

محاسبۂ نفس کا دوسرا طریقہ، اچھا دوست

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دیندار اور سچا دوست تلاش کرے، پھر اسے اپنے آپ پر رقیب (نگران) مقرر کرے تاکہ وہ اس کے احوال و افعال کو ملاحظہ کرتا رہے اور اس کے ناپسندیدہ افعال و اخلاق پر تنبیہ کرتا رہے اور اس کے ظاہری اور باطنی معاملات کو سنوارنے میں کوشاں رہے۔ عقل مند اسلاف اور اکابر ائمہ دین اسی طرح کرتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی سکول کا نالائق لڑکا کسی لائق لڑکے کے ساتھ بیٹھے یا دوستی لگائے گا تو نالائق لڑکا بھی لائق ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے تھے "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت فرمائے جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کرے۔ آپؓ حضرت سلمانؓ سے اپنے عیبوں کے بارے میں دریافت فرماتے رہتے وہ معذرت کا اظہار کرتے تو آپؓ اُن کے سامنے اصرار کرتے اور فرماتے تمہیں ہمارے متعلق کوئی ناپسندیدہ بات پہنچی ہو تو ضرور بتلائیں۔ ایک دن انہوں نے مجبوراً کہا کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپؓ کے دسترخوان پر بیک وقت دو

سالن ہوتے ہیں اور یہ کہ آپ ﷺ کے دو حُلّے ہیں، ایک رات کیلئے اور ایک دن کیلئے، آپ ﷺ نے پھر پوچھا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی پہنچی ہے! انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: البتہ یہ دو حُلّے میری کفایت کیلئے ہیں۔''

یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ حضرت عمر ﷺ حضرت حذیفہ ﷺ سے پوچھتے تھے کہ کیا میرا نام منافقین کی فہرست میں شامل تو نہیں ہے اس پر حضرت حذیفہ ﷺ فرماتے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ منافقین کے ناموں کو کسی سے بیان کروں اور حضرت حذیفہ رسول اللہ ﷺ کے راز داں تھے حتیٰ کہ ان کے پاس تمام منافقین کے بارے میں معلومات موجود تھیں۔ آپ ﷺ اُن سے پوچھتے کیا تمہیں مجھ پر منافقت کی علامات نظر آتی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس قدر عظمت و جلالتِ شان کے باوجود آپ ﷺ اپنے نفس پر اعتماد کرنے کے روادار نہیں تھے۔

پس ہر وہ شخص جس کی عقل وافر ہو اور مرتبہ بلند ہو وہ خود پسندی میں کم مبتلا ہوتا ہے اور نفس پر بہت زیادہ بے اعتماد ہوتا ہے۔ مگر یہ چیز بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو چکی ہے۔ سو ایسے دوست بہت قلیل ہیں جو رکھ رکھاؤ سے صرفِ نظر (بے پروائی) کرتے ہوئے دوست کو اس کے عیوب سے خبردار کریں۔ اسی لیے حضرت داؤد طائیؒ نے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اُنہیں کہا گیا آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ فرمایا: میں ان لوگوں میں کیسے رہوں جو مجھ سے میرے عیب مخفی رکھیں۔

غرضیکہ اسلاف کرام کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے عیوب پر دوسروں کی اطلاع سے آگاہ ہوں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جو ہمیں نصیحت کرے اور ہمیں ہمارے عیوب کی معرفت دے۔ پس قریب ہے کہ اگر ہماری یہی حالت رہی تو ہم ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

یاد رکھو! بُرے اخلاق سانپ اور بچھو کی مانند ہیں۔ ذرا سوچیئے! اگر کوئی شخص ہمیں اطلاع دے کہ ہمارے کپڑوں کے نیچے بچھو ہے تو ہم فوراً اس کی بات تسلیم کر لیں گے۔ اس پر خوش ہوں گے اور اس کے زیرِ بارِ احسان ہوں گے اور بچھو کو ہٹانے اور مارنے میں مشغول ہو جائیں گے حالانکہ بچھو کے ڈنگ کی تکلیف اور درد ایک آدھ دن رہتا ہے اور برائیوں اور اخلاقِ سیئہ کی تاثیر اور الم کے بارے میں تو خدشہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمیشہ رہے یا ہزاروں برس تک رہے۔ پھر ہم اس شخص پر کیوں نہیں خوش ہوتے جو ہمیں ایسی ضرر رساں باتوں پر متنبہ کرتا ہے جن کا ضرر دائمی ہے اور ایسی برائیوں کے ازالے کے درپے کیوں نہیں ہوتے؟ بلکہ اُلٹا ناصح شخص کو کوسنے پر اُتر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو بھی تو فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہے اور یوں ہم اس کی نصیحت سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے اس کی عداوت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں رشد و ہدایت عطا فرمائے اور ہمیں اپنے عیوب پر آگاہ فرمائے اور ہمیں اس شخص کا شکریہ ادا کرنے کی سعادت نصیب فرمائے جو ہمیں ہمارے عیوب کی اطلاع دے۔ آمین

محاسبۂ نفس کا تیسرا طریقہ، اپنے مخالفین کی آراء پر غور کرنا ہے

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کی معرفت کیلئے اپنے مخالفین کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں غور کرے کیونکہ مخالف کی آنکھ چھپے ہوئے عیوب بھی تاڑ لیتی ہے اور بسا اوقات انسان کٹر دشمن سے وہ فوائد حاصل کر لیتا ہے جو رکھ رکھاؤ والے دوست سے حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ دوست مدح وتعریف میں رطب اللسان رہتا ہے اور اس کی آنکھ سے عیب مخفی رہتے ہیں اور ہر چند کہ فطرتاً انسان اپنے مخالف کی بات کی تردید کرتا ہے لیکن عقل مند شخص اقوالِ مخالف میں بھی غور وفکر کر کے اپنے حق میں منفعت کے پہلو تلاش کر لیتا ہے اور اس سے پہلے کہ اس کے عیب زبانِ زدِ عام ہوں وہ اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔

محاسبۂ نفس کا چوتھا طریقہ، مطالعۂ خلقت ہے

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے اور جو بُری بات ان میں پائے اُسے اپنے نفس میں تلاش کرے اور اسے اپنی طرف منسوب کرے کیونکہ مومن، مومن کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا وہ غیر کے عیوب میں اپنے عیوب دیکھے اور یقین رکھے کہ طبیعتیں خواہشات کی پیروی میں قریب قریب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سو جو عیب ایک شخص میں ہے، بہت ممکن ہے وہی یا اُس سے زیادہ یا اُس کا کچھ حصہ اس میں بھی موجود ہو۔ پھر اپنے نفس کو اس برائی سے پاک کرے اور اسی طرح ہر وہ بات جس کی مذمت کی جاتی ہو اُس سے خود کو پاک کرے اور اپنے آپ کا محاسبہ کرنے کیلئے یہ طریقہ بہت مفید ہے اور اگر لوگ ہر اُس عمل سے دور ہو جائیں جو انہیں اُن کے غیر میں بُرا لگتا ہے تو پھر کسی کو کسی مؤدب (تربیت کرنے والے) کی ضرورت نہیں رہے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا گیا آپ کو ادب کس نے سکھایا ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے کسی شخص نے ادب نہیں سکھایا، میں نے جب کسی جاہل شخص کو کسی جہالت میں پایا تو خود اس سے مجتنب (کنارہ) ہو گیا۔ غرضیکہ یہ تمام حیلے اس شخص کیلئے ہیں جس کو ذکی، عارف، صاحبِ بصیرت اور مشفق شیخ دستیاب نہ ہو یعنی ایسا شخص جو اپنے نفس کی فریب کاریوں سے فارغ ہو چکا ہو اور خلقِ خدا کی تہذیب وتربیت میں مشغول ہو چکا ہو۔ یقیناً جس شخص کو ایسا شیخ مل گیا اُس نے ایک حاذق روحانی طبیب کو پا لیا اُسے چاہیے کہ وہ اس شیخ کامل کو غنیمت جانے اور اُسے اپنے حق میں لازم کر لے۔ بیشک وہ اسے روحانی امراض سے نجات دلائے گا اور دنیا و آخرت کی ہلاکتوں سے بچائے گا۔[1]

یہاں ایک طویل حدیث کا آخری حصہ اور اُس کی شرح میں علامہ ابن قیم کی عبارت کا درج کرنا از

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۵۸، ۵۹۔

بس مفید ہوگا۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اَللّٰھُمَّ زَیِّنَّا بِزِیْنَۃِ الْاِیْمَانِ وَاجْعَلْنَا ھُدَاۃً مُّھْتَدِیْنَ'' [1] (اے اللہ! ہمیں ایمان کی زینت سے مزین فرما اور ہمیں ہدایت یافتہ ہادی بنا)۔

قرآن کریم میں بھی ایمان دار اور عملِ صالح کرنے والے لوگوں کی دُعا مذکور ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں ''وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا'' [2] (اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا دے)۔ بلاشبہ باکمال اور کامیاب انسان وہی ہے جو خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کیلئے ہادی اور راہنما ہو یعنی وہ اپنے تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا نفع دوسروں کو بھی پہنچے اور زبانِ خلق اس کی شان میں یوں گویا ہو۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راهنما

اسی حقیقت کو علامہ ابن قیمؒ نے یوں بیان کیا ہے ''وَلَمَّا کَانَ کَمَالُ الْعَبْدِ فِیْ اَنْ یَّکُوْنَ عَالِمًا بِالْحَقِّ مُتَّبِعًا لَہٗ مُعَلِّمًا لِغَیْرِہٖ مُرْشِدًا لَّہٗ قَالَ وَاجْعَلْنَا ھُدَاۃً مُّھْتَدِیْنَ'' [3] (کیونکہ بندے کا کمال اس میں ہے کہ وہ حق کو جاننے والا ہو، اس کی اتباع کرنے والا ہو اور دوسروں کے حق میں معلّم اور مرشد ہو اسی لیے حضور ﷺ نے دُعا فرمائی اے اللہ! ہمیں ہدایت یافتہ ہادی بنا)۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اپنی ہمت اور خیال کو اس طرح بلند رکھتے کہ دوسروں کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے لیکن یہ ہماری بدقسمتی اور ستم ظریفی ہے کہ ہم اپنے نفس کے ہاتھوں اس قدر ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئے کہ اپنی اصلاح بھی نہ کر سکے حتیٰ کہ مقامِ انسانیت سے بھی گر گئے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالتِ زار پر نظرِ کرم فرمائے۔ آمین۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں ابلیس کی خدا کے سامنے شکایت کا ذکر کیا ہے کہ وہ انسان کی صحبت میں رہ کر خراب ہو گیا ہے کیونکہ (ابلیس) جب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو انسان اس کے ساتھ مقابلہ کی ذرا بھی سکت نہیں رکھتا لہٰذا وہ انسان کی صحبت میں رہ کر خراب ہو گیا ہے۔ تاہم اب بھی وقت ہے کہ انسان کے پاس زندگی کی جو چند ساعتیں باقی ہیں انہیں غنیمت سمجھے اور اپنا محاسبۂ نفس کر کے کم از کم اپنی اصلاح تو کر لے۔

المحاسبی کی زبان سے محاسبہ کی وضاحت

حضرت ابوعبداللہ حارث بن اسد البصری المحاسبی متوفی ۲۴۳ھ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے ہم عصر ہیں اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے استاد ہیں۔ آپؒ کی تصنیف و تالیف کا طریقہ عجیب تھا چنانچہ امام ابونعیم اصفہانی حضرت جنید بغدادیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے استادِ گرامی حضرت حارث

---

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۱۹۷۱، جلد ۵، صفحہ ۳۰۴۔ [2] الفرقان، ۲۵: ۷۴۔
[3] فیض القدیر، جلد ۲، صفحہ ۱۴۷۔

محاسبی رحمۃ اللہ علیہ ہماری قیام گاہ کی طرف تشریف لاتے اور فرماتے اُٹھو ہمارے ساتھ صحراء میں چلو۔ میں عرض کرتا حضور! آپ ہمیں خلوت سے نکال کر عام راہوں، آفات اور شہوات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور ہمیں اپنے نفس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ آپ فرماتے تم اُٹھو اور کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ میں آپ کے ساتھ چل دیا۔ ہمارے لیے وہ راستہ یوں ہو گیا جیسے یہ کسی کی گزرگاہ ہی نہیں۔ ہمیں کسی ایسی چیز کا سامنا نہ کرنا پڑا جو ہمارے حق میں بُری ہوتی۔ پھر جب ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچے اور بیٹھ گئے تو آپؒ نے ارشاد فرمایا: "سَلْنِیْ" تم مجھ سے سوال کرو! میں نے کہا میرے پاس کوئی سوال نہیں جو میں جناب سے پوچھوں۔ فرمایا: جو تمہارے جی میں آئے وہی پوچھو۔ پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ میرے ذہن میں سوالات کا سیلاب آ گیا" میں آپ سے پوچھتا جاتا اور آپ فی البدیہہ جواب مرحمت فرماتے جاتے۔ پھر گھر واپس آ کر انہی سوالات و جوابات کو کتابی شکل دے دیتے۔[1]

لقب محاسبی کی وجہ

امام حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ حارث بصری کے بجائے حارث محاسبی کیوں مشہور ہوئے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے "وَ عُرِفَ بِالْمُحَاسِبِیْ لِكَثْرَةِ مُحَاسَبَتِهٖ لِنَفْسِهٖ "[2] (اور آپ لقب محاسبی سے پہچانے جاتے ہیں اس لیے کہ آپ کثرت کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتے تھے)۔

سوال و جواب کی صورت میں محاسبہ کی وضاحت

امام حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے ایک شاگرد (غالباً حضرت جنید بغدادیؒ) نے سوالات کیے چنانچہ وہ شاگرد فرماتے ہیں: میں نے پوچھا اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمت ہو، محاسبہ کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: عقل کا مسلسل نفس کی نگرانی کرنا تا کہ وہ نفس کی خیانت کو پکڑے اور اس کی افراط و تفریط کا جائزہ لے۔ میں نے کہا برائے کرم اس کی مزید وضاحت فرمائیں!

فرمایا تم جو کام کرنا چاہو اس سے پہلے یہ سوچ لو کہ "کس لیے کرتے ہو" اور "کس کیلئے کرتے ہو" پس اگر وہ کام اللہ تعالیٰ کیلئے ہو تو کر گزرو اور اگر غیر اللہ کیلئے ہو تو رُک جاؤ۔ اور اپنے نفس کو ملامت کرو کہ اس نے غیر اللہ کی خاطر عمل کرنے کا اشارہ کیوں کیا اور خواہش کا داعیہ کیوں پیدا کیا اور اس کا تعاقب کرو اور اس پر اس کی جہالت واضح کرو اور عقل کے نزدیک اس کام میں جو ذلت مرتب ہوتی ہے اس میں غور کرو اور یقین رکھو کہ نفس تمہارا دشمن ہے وہ تم سے گناہ کرا کے تمہارے خالق کا تم سے بائیکاٹ کرانا چاہتا ہے۔

میں نے کہا محاسبہ کا مخرج کیا ہے؟ یعنی اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: (اصل پونجی میں) کمی کے

---

[1] حلیۃ الاولیاء، جلد ۱۰، صفحہ ۷۴۔ [2] طبقات الشافعیہ، احمد بن محمد الشعبہ، متوفی ۸۵۱، جلد ۱، صفحہ ۵۹، عالم الکتب، بیروت۔

خدشات، قیمت میں کمی کا خدشہ اور منافع میں زیادتی کی رغبت، کیونکہ شراکت دار اپنے شریک کا قیمت میں کمی اور خسارہ کے خدشہ کے پیشِ نظر محاسبہ کرتا ہے۔ نیز بکثرت نفع اور اصل پونجی میں اضافہ کی اُمید کے ساتھ بھی محاسبہ کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے بعض عابدہ خواتین سے کہا، اضافہ کیسے حاصل کرتی ہو؟ انہوں نے کہا خوب تلاش اور محاسبہ کے ذریعہ (یعنی رضائے الٰہی کے حصول کے مواقع کی تلاش اور نفس کے محاسبہ کے ذریعے)۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول "وَزِنُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُوْزَنُوْا؟" [1] (اپنے آپ کا وزن کرلو اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے) کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا ایسا وزن کرو کہ وہ ذرّہ بھر بھی باطل کی طرف مائل نہ ہوں۔

میں نے کہا محاسبہ کا ثمرہ کیا ہے؟ (یعنی ایک تاجر اپنے شراکت دار کا محاسبہ کرتا ہے تو حساب والے دن میں نفع حاصل کرتا ہے اور اصل پونجی بھی باقی ہوتی ہے، نفس کا محاسبہ کرنے والے کیلئے کیا ثمرہ اور فائدہ ہوتا ہے؟) فرمایا: بصیرت (قلب کی بینائی) میں اضافہ ہوتا ہے، عقل کے اِدراک میں اضافہ ہوتا ہے، مثبت دلائل کے بیان میں سرعت پیدا ہوجاتی ہے، معرفت میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ سب کچھ قلب کی تفتیش کے بقدر ہوتا ہے (یعنی جتنا محاسبہ اتنا منافع)۔ میں نے کہا کس چیز کے ذریعہ بندہ محاسبۂ نفس میں قوی ہوتا ہے؟

فرمایا تین باتوں سے (۱) ان تعلقات سے کنارہ کرلے جو سے محاسبہ کے ارادہ سے باز رکھتے ہیں اس لیے کہ جو شخص اپنی تجارت میں اپنے شریک کے محاسبہ کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنے قلب کو دیگر مشاغل سے فارغ کرلیتا ہے (۲) نفس کو اس کے غیر سے علیحدہ کرلے تاکہ محاسبہ میں جس نفع کی اُمید باندھی ہے وہ ختم نہ ہو (۳) اللہ تعالیٰ کا خوف دِل میں رکھے کہ وہ سوال فرمائے گا کہ جو اُس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے تم تک پہنچایا تھا تم نے اُس میں کمی تو نہیں کی؟ [2]۔

عمل سے پہلے محاسبۂ نفس

سطورِ بالا میں اثنائے کلام میں سرسری طور پر کسی عمل سے پہلے محاسبۂ نفس کی بات ہوچکی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں واضح طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بعض لوگ کوئی کاروبار شروع کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچتے ہیں کہ وہ یہ کاروبار کریں یا نہ کریں، دوست احباب سے مشورے کرتے ہیں، عاملوں اور نجومیوں کے پاس جاتے ہیں (حالانکہ ان کے پاس جانا حرام ہے) استخارے کرتے کرواتے ہیں غرضیکہ ہزار ہا حیلے اپنا کر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس کاروبار میں اپنا سرمایہ لگائیں یا

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، حدیث ۳۴۴۵۹، جلد ۷، صفحہ ۹۶، مکتبۃ الرشد، ریاض۔

[2] الوصایا للحارث المحاسبی، صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰۔

نہ لگائیں حالانکہ دولت جس قدر بھی زیادہ ہو تب بھی فانی ہے یہ سب احتیاط دولت کے حصول کیلئے ہے اور مال کی حقیقت یہ ہے کہ نگاہِ قدرت میں اس کی پرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں ہے جب کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اس قدر قیمتی ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی لیکن حیرت کی تو بات یہ ہے کہ وہ متاعِ انمول جس کے بدلے جنت خریدی جاتی ہے اس کو ہم (اس زندگی کے قیمتی لمحات کو) بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں اور کوئی عمل کرنے سے قبل ذرہ برابر بھی غور وفکر نہیں کرتے کہ آیا جو عمل ہم کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے لیے مفید ہوگا یا مضر؟ اور ہمارا رب اس عمل سے راضی ہوگا یا ناراض۔ اے انسان! تو جس قدر غفلت شعاری اپناتا ہے اور خرگوش کی طرح آنکھیں موندنے کی کوشش کرتا ہے، لامحالہ تجھے اپنے کیے کی جزاء وسزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لیے تیرا فائدہ اسی میں ہے کہ تو ہر عمل سے پہلے مکمل غور وخوض کر لیا کر کہ وہ عمل تیرے حق میں ہوگا یا تیرے خلاف ہوگا۔

۱) امام عبداللہ ابن المبارک ؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبادہ بن الصامت ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ بابرکت میں عرض کیا کہ حضورؐ سے وصیت اور نصیحت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اِذَا اَرَدْتَ اَمْرًا فَتَدَبَّرْ عَاقِبَتَهُ فَاِنْ کَانَ رُشْدًا فَامْضِهِ وَ اِنْ کَانَ غَیًّا فَانْتَهِ عَنْهُ '' [1] (جب تم کسی امر کا ارادہ کرو تو اسکے انجام کے بارے میں خوب غور وفکر کرو پس اگر وہ ہدایت پر مبنی ہو تو کر گزرو اور اگر وہ گمراہی پر مبنی ہو تو رک جاؤ)۔

۲) حضرت لقمان حکیم ؒ فرماتے ہیں: بیشک مؤمن جب عاقبت (انجام) کو پہلے دیکھ لیتا ہے تو ندامت سے دوچار نہیں ہوتا۔

۳) حضرت حسن بصری ؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحمت فرمائے جو کوئی عمل کرنے سے پہلے توقف کرے اور سوچے۔ پھر اگر وہ کام اللہ تعالیٰ کیلئے ہو تو کر گزرے اور اگر وہ کام اللہ تعالیٰ کیلئے نہ ہو تو رک جائے۔

۴) حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں ہر پختہ ارادہ کرنے والا جو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو پر لازم ہے کہ وہ محاسبۂ نفس سے غافل نہ رہے اور نفس کی تمام حرکات، سکنات، خطرات اور اقدامات پر کڑی نگرانی کرے۔ بے شک انسانی عمر کی تمام سانسوں میں ہر ہر سانس قیمتی جوہر ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے اس جوہرِ بے بہا سے ایسے خزانے خریدے جاسکتے ہیں اور ایسی نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں جو کبھی فنا نہیں ہوں گی اور جو ابدالآباد تک رہیں گی۔ سو ایسے قیمتی سانس ضائع کرنا یا انہیں ہلاکت خیز امور میں خرچ کرنا خسرانِ عظیم (بڑے گھاٹے کا سودا) ہے اور عقل مند سے یہ بہت بعید ہے۔ [2]

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں لکھا ہے کہ جو آخرت کے بدلے دنیا کو اختیار کرتے ہیں

[1] کنز العمال، حدیث ۵۶۷۶، جلد ۳، صفحہ ۴۴۔ [2] احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۳۹۶۔

ایسے ہیں گویا موتی اور جواہرات کے بدلے کوڑیوں کو خرید تے ہیں۔

۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا: آسانی کے ایام میں اپنے نفس کے ہر عمل سے پہلے محاسبہ کرلیا کروتا کہ شدتِ حساب کے وقت آسانی رہے اور آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا کتاب اللہ (تورات شریف) میں محاسبہ کے بارے میں کیا پاتے ہو؟ انہوں نے کہا "وَيْلٌ لِدَيَّانِ الْاَرْضِ مِنْ دَيَّانِ السَّمَاءِ" (زمین کے حاکموں کیلئے خرابی ہے آسمان کے حاکموں کی طرف سے) اتنا جملہ حضرت کعب احبار نے ادا کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا دُرّہ بلند فرمایا اور کہا "اِلَّا مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ" (مگر وہ شخص مستثنیٰ ہوگا جو اپنا محاسبہ کرلے)۔ حضرت کعب نے کہا: یا امیر المؤمنین بیشک تورات میں مذکورہ الفاظ کے بعد یہی الفاظ ہیں جو جناب نے ادا فرمائے، درمیان میں اور کوئی حرف نہیں ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ یہ مستقبل میں محاسبۂ نفس کی طرف اشارہ ہے۔

عمل کے بعد محاسبۂ نفس

اعمالِ گزشتہ پر نفس کا کس طرح محاسبہ کیا جائے اس کے متعلق امام غزالیؒ فرماتے ہیں: بندے کو چاہیے کہ دن کے اوّل وقت میں نفس کو حق پر کاربند رہنے کی تلقین کرے پھر دن کی آخری ساعت میں اس سے مطالبہ کرے اور اس کی تمام حرکات وسکنات کا محاسبہ کرے جس طرح کہ تاجر لوگ سال کے آخر میں یا مہینہ اور دن کے آخر میں اپنے شراکت داروں کا محاسبہ کرتے ہیں تا کہ اُن کا اصل سرمایہ ضائع نہ ہو اور جس نفع کی اُمید لگا رکھی ہے وہ کما حقہ حاصل ہو اور اگر خدانخواستہ نقصان سامنے آئے تو آئندہ اس کا تدارک کیا جائے۔ [1]

اسی طرح بندے کا اُس کے دین میں اصل سرمایہ فرائض ہیں اور منافع نوافل اور فضائل ہیں جبکہ خسارہ معاصی یعنی گناہ ہیں اور اس تجارت کا موسم تمام ایام ہیں اور شراکت دار "نفس امارۃ بالسّوء" ہے۔ پس محاسبہ کا عمل فرائض سے شروع کرے اگر وہ پورے ہوں تو شکر الٰہی بجالائے اور آئندہ اسی رغبت کے ساتھ فرائض کا اہتمام برقرار رکھے اور اگر اصل فرائض میں کمی ہے تو ان کی قضا کرے اور اگر فرائض ادا تو کیے تھے لیکن ان میں نقص رہ گیا تھا تو نوافل کے ذریعہ وہ کمی پوری کرے (یعنی نوافل بکثرت ادا کرے) اور اگر خسارہ (یعنی معصیت) سامنے آئے تو نفس جو اس کا کھاتہ دار ہے اس پر سختی کرے تا کہ جو نقصان ہوا وہ اسے پورا کرے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ احتیاط برتے۔

نیز اس خسارہ کے پیش آنے پر نفس سے اس کی ہر حرکت، سکون، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا اور سکوت وگفتار وغیرہ کے متعلق محاسبہ کرے تا کہ آئندہ خسارہ کی نوبت نہ آئے۔

پھر یہ بھی چاہیے کہ انسان اپنی مکمل زندگی کا حساب کرے ایک ایک دن اور ایک ایک ساعت شمار

---

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷۔

کرے اور غور کرے کہ اس نے ظاہر اور باطن میں کیا کیا عمل کیے جیسا کہ ابن القمہؒ نے ایک دن اپنا محاسبہ کیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی عمر ساٹھ برس ہو چکی ہے جس کے ساڑھے اکیس ہزار دن بنتے ہیں، پھر اس نے ایک چیخ ماری اور کہنے لگا ہائے افسوس! میں اپنے مالک کے ساتھ اکیس ہزار گناہ لے کر ملاقات کروں گا، پھر ہر دن میں دس ہزار گناہ اور بھی شامل ہوں گے یہ کہا اور گر کر بیہوش ہو گئے۔ پھر دیکھا گیا تو واصل بحق ہو چکے تھے اسی اثنا میں ایک آواز آئی اے فلاں جنت کی طرف دوڑ آ۔

پس اسی طرح بندہ کو ایک ایک ساعت کا حساب کرنا چاہیے اور قلب و اعضاً سے صادر ہونے والے گناہوں کا حساب کرنا چاہیے۔ اگر بندہ ہر صادر ہونے والے گناہ پر اپنے گھر میں ایک پتھر پھینکتا رہے تو نہایت قلیل مدت میں اس کا گھر پتھروں سے بھر جائے گا لیکن بندے کی غفلت پر حیرت ہے کہ وہ بڑی آسانی سے گناہ پر گناہ کرتا چلا جا رہا ہے اور اپنے محاسبہ کی طرف دھیان تک نہیں دیتا جب کہ فرشتے بڑی استقامت کے ساتھ ہر ہر گناہ کو لکھ رہے ہیں اور "اَحْصَاهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ" [1] (اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں گن رکھا ہے اور وہ بھول گئے)۔ [2]

معاتبہ کا مفہوم اور اس کی اہمیت

اپنے اعمال میں کسی خطا یا لغزش ہونے کے بعد خود پر عتاب کرنے کو معاتبہ کہا جاتا ہے نفس کی تخلیق کچھ اس طرح ہے کہ خیر اور نیکی سے گریز کرتا ہے اور بدی اور شر میں خواہ مخواہ الجھا رہتا ہے۔ اگر کسی کام میں نفس کو اپنا فائدہ یا بھلائی نظر آئے تو اس کو کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے خواہ اس میں رنج و تکلیف ہی کیوں نہ ہو اس کو پورا کرنے کیلئے سختی بھی اُٹھائے گا۔ یہ نفس کا حجاب ہے جو اس کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے اور اگر اس کو شہوت پرستی سے رُوک کر اصلاح کی طرف لاؤ تو اسے بھی قبول کر لیتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝" [3] (اور آپ نصیحت کرتے رہیں کہ بے شک نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے)۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان نفس کو متواتر زیر عتاب رکھے اور سمجھائے کہ اے نفس اگر تجھے کوئی احمق کہے تو تجھے بہت بُرا لگتا ہے حالانکہ تو بڑا احمق اور بے وقوف ہے کیونکہ اگر کسی شخص کے گھر کے باہر اس کو پکڑنے کیلئے ایک لشکر کھڑا ہو جو اسے قتل کرنے کیلئے تیار ہو تو وہ شخص لازمی طور پر تھر تھر کانپتا ہو گا اور اگر وہ ڈرنے کی بجائے مزے سے کھیل کود میں مصروف رہے تو کیا وہ احمق نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" [4] (لوگوں کیلئے ان کے حساب کا وقت قریب آ پہنچا مگر وہ غفلت میں (پڑے طاعت سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں)۔

---

[1] المجادلۃ، ۵۸:۶۔
[2] احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۳۹۸۔
[3] الذاریات، ۵۱:۵۵۔
[4] الانبیآء ۲۱:۱۔

سورہ انبیاء کی مذکورہ آیت کے علاوہ سورۃ الواقعہ اور الطور میں بھی عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے تاکہ لوگ فکر کریں اور نفس کی اتباع سے بچیں "اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝ "[1] (بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہو کر رہے گا، اسے کوئی دفع کرنے والا نہیں، جس دن آسمان سخت تھرتھراہٹ کے ساتھ لرزے گا اور پہاڑ (اپنی جگہ چھوڑ کر بادلوں کی طرح) تیزی سے اڑنے اور (ذرّات کی طرح) بکھرنے لگیں گے)۔

باری تعالیٰ نے فرمایا "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ"[2] (ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے) اور تو اس کیلئے تیار نہیں نہ جانے کب موت آ جائے اور تو تمام دن گناہوں میں گزار دیتا ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا نہیں اگر یہ سمجھ لیا ہے تو یہ علامت کفر کی ہے۔ تو گناہوں کی زندگی پر کیوں مطمئن ہے کیا یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب برداشت کر لے گا یا تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے عذاب نہیں دے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو برا کام کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔

معاتبہ اور عمل اسلاف

پچھلے وقتوں میں اولیائے کرامؒ کا یہ حال تھا کہ جب وہ اپنے تئیں ایسا کام کر بیٹھتے جو نفس کی اطاعت میں شمار ہوتو وہ نفس کو عتاب کرتے مثلاً حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک طویل عرصہ تک اپنے نفس کو پلاؤ نہ کھلایا مگر ایک دن آپؒ نے اپنے نفس سے کہا کہ اچھا میں تمہیں پلاؤ کھلاتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ پھر کسی چیز کی تمنا نہ کرنا۔ آپؒ نے پلاؤ پکایا اور نفس سے کہا کہ خوب کھاؤ لیکن کچھ دیر بعد نفس نے کہا پانی! آپؒ نے فرمایا کہ دیکھو تمہارے ساتھ یہ معاہدہ ہوا تھا کہ پلاؤ کے بعد کچھ اور نہیں مانگو گے۔ چنانچہ عتاب (سزا) کے طور پر اپنے نفس کو ایک سال پانی نہیں دیا۔[3] حضرت یوسف علیہ السلام نے عورتوں کے شر سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی چنانچہ آپ علیہ السلام نو سال جیل میں رہے۔ اولیائے سلفؒ اگر کوئی ایسا کام کرتے جس میں نفس کی مرضی شامل ہوتی تو وہ نفس کو سزا دیتے۔ حضرت عبداللہ المغربیؒ کے ایک مرید نے نفس کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے ایک پیالہ مسور کی دال کا کھالیا اور جب بازار گئے تو ایک دکان پر موجود شراب کے مٹکے توڑ دیئے جس پر انہیں پیٹا گیا اور چالیس کوڑے بھی لگے۔ چھ ماہ قید میں رہنے کے بعد ان کے پیر جیل میں آئے اور اپنے مرید سے پوچھا کہ وہ جیل میں کیسے آئے مرید نے کہا ایک پیالہ دال کا پیا اور اتنے درّے کھائے اور چھ ماہ جیل میں رہا۔ شیخ نے فرمایا سستے ہی چھوٹ گئے یعنی تمہیں یہ سزا کم ملی ہے۔ حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سال سے میری یہ خواہش تھی کہ گاجر کا مربہ شہد میں ڈبو کر کھاؤں مگر میں نے اپنے نفس کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ یمن کی ایک

---

[1] الطور،۵۲:۷۔۱۰۔ [2] آل عمران،۳:۱۸۵۔ [3] تذکرۃ الاولیاء، صفحہ۱۱۰۔

عورت کے بارے میں روایت ہے حضرت عبداللہ مزنیؒ فرماتے ہیں کہ اھل یمن میں سے ایک عورت جب صبح کو اٹھا کرتی تو اپنے نفس کو کہتی تھی ''اے نفس تیرے پاس آج کا دن ہے اس کے علاوہ تیرے پاس اور کوئی دن نہیں، پس تو عمل کر آج جتنا چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ تو عمل کرے، جب شام ہوتی تو کہتی اے نفس تیرے پاس آج کی رات ہے جو چاہتا ہے تو کر اگر اللہ تعالیٰ چاہے یہاں تک کہ صبح ہو جائے، وہ اسی عادت پر رہی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا۔[1]

نفس کے حیلوں پر عتاب

اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کریم اور رحیم ہے تو پھر ہزاروں کو بھوک پیاس اور بیماری میں کون مبتلا کر دیتا ہے۔ جو بوتا نہیں وہ کاٹتا بھی نہیں۔ جب تو دنیا میں روٹی کمانے کیلئے کام اور محنت کرتا ہے تو آخرت کی نجات کیلئے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا بے معنی ہے۔ اس وقت یہ کیوں نہیں تصور کرتا کہ اللہ تعالیٰ رحیم اور کریم ہے۔ اے نفس! جب تو بیمار ہوتا ہے تو یہودی ڈاکٹر کے کہنے پر پرہیز کرتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا اور اگر تو یہ کہتا ہے کہ توبہ کر لیں گے، تو تجھے کیا خبر توبہ کا موقع ملتا ہے یا نہیں۔ کیا تو سوچتا ہے کہ توبہ کل آسان ہو جائے گی حالانکہ کل تو بدی کا درخت زیادہ طاقتور ہو جائے گا اور کل کو تیری طاقت اور کم ہو جائے گی۔ لہٰذا آج اور ابھی توبہ کرنا ضروری ہے۔

ایک آدمی سردی آنے سے پہلے گرم کپڑے نہ بنائے تو اسے اللہ تعالیٰ کے توکل پر اُمید سردی سے نہیں بچائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سردی کو پیدا کیا وہاں فرمایا سردی کیلئے لباس بھی تیار کر سکتے ہو۔

اے نفس تو یہ سمجھ لے کہ تیری غفلت کا سبب صرف یہ ہے کہ تو دنیا کی لذتوں میں کھو کر رہ گیا ہے اور شہوت تیرے دِل کا قرار بن چکی ہے۔ تو دنیا کا عاشق بن بیٹھا ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ انسان گدھے سے بھی بدتر ہے کیونکہ گدھا جب دلدل میں پھنس جائے تو باہر نکلنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر انسان جب اخلاقی دلدل میں پھنس جائے تو بجائے باہر نکلنے کے وہیں ڈیرے لگا دیتا ہے انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ بڑے بڑے بادشاہ آئے اور خاک کے سائے تلے چلے گئے ان کی سلطنت ان کی کوئی مدد نہ کر سکی، تم تو معمولی انسان ہو تم اس معمولی دنیا پر آخرت کی جاودانی نعمتوں کو فروخت کرتے ہو کیا تم خالص قیمتی ہیرا چھوڑ کر ایک مٹی کے پیالے پر راضی ہو گئے ہو؟ کیا یہ حماقت نہیں؟ یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد اپنے نفس کو من مانی حرکتوں سے باز رکھنا ضروری ہے۔

---

[1] الزھد لابی حاتم، جلد۱، صفحہ ۵۶۔

باب نمبر ۱۷

مراقبہ ومجاہدہ

مراقبہ کی تعریف

کسی عمل یا کام کی حقیقی حیثیت کے معلوم کرنے کو مراقبہ کہتے ہیں۔ صاحب سرِّ دلبراں فرماتے ہیں دل کی ماسوٰی (اللہ تعالیٰ کے سوای) سے نگہبانی، دل میں مقصود کے تصور کی مخالفت کرنا، بندہ کا اپنے علم کو بفرض فیضان علم قدسی حق تعالیٰ کی جانب رجوع کرنا مراقبہ کہلاتا ہے[1]۔

مراقبہ کی حقیقت اور اس کے درجات

جس طرح تمام انسان شکل وصورت، عقل وذہانت اور ہمت وقوت میں یکساں نہیں ہیں اسی طرح روحانی دنیا میں بھی تمام انسان یکساں نہیں ہوتے۔ اس امر کی واضح مثال وہ واقعہ ہے کہ تمام مریدین اپنا اپنا پرندہ ذبح کر کے لے آئے مگر ایک نوجوان شخص پرندے کو زندہ واپس لے آیا (واقعہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔ اسی لیے صوفیاء عظامؒ نے مراقبہ کے درجات بیان کیے ہیں چنانچہ امام غزالیؒ نے ان درجات کا ذکر کیا ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

جان لو کہ مراقبہ کی حقیقت رقیب کے احوال کی نگہداشت کرنا ہے۔ لفظ مراقبہ بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے اور اس کا معنیٰ ہے کہ ایک دوسرے کا رقیب ہونا۔ یہاں مراد دراصل یہ ہے کہ بندے پر اللہ سبحانہ رقیب (نگہبان) ہے اور بندہ رضائے الٰہی کی خاطر اپنے آپ پر حقوقِ الٰہی اور حقوق العباد کا رقیب ہے، گویا مراقبہ نفس کا معنیٰ ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت کرنا اور اپنی تمام تر توجہ رقیب کی طرف مرکوز کرنا ہے) پس

---

[1] سرِ دلبراں، صفحہ ۳۰۴۔

جس شخص نے کسی اور سبب سے کسی گناہ سے احتراز کیا تو اسے یہی کہا جائے گا کہ اس نے فلاں کو اپنا رقیب گردانا اور اسی کی رعایت کی۔ (ایسے شخص کو مراقبہ کا کوئی ثمرہ حاصل نہیں ہوگا) کیونکہ مراقبہ قلب کی ایک حالت کا نام ہے جس سے معرفت پیدا ہوتی ہے اور اس معرفت کا ثمرہ یہ ہے کہ اعضائے بدن اطاعت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جس معرفت کا ثمرہ یہ اعمال ہیں، اس معرفت کی صورت یہ ہے کہ بندے کو یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ضمائر (قلوب) پر مطلع ہے، اسرار کا عالم ہے، بندوں کے اعمال پر رقیب ہے اور ہر نفس جو کماتا ہے (یعنی جو عمل کرتا ہے) اس کو دیکھتا ہے اور بے شک دِل کا راز اس پر یوں مکشوف (کھلا ہوا) ہے جس طرح ظاہری جلد مخلوق پر مکشوف ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ پس جب یہ معرفت یقین کا روپ اختیار کرتی ہے یعنی اس میں شک کی آمیزش باقی نہیں رہتی تو اس معرفت کا قلب پر غلبہ ہو جاتا ہے حالانکہ بہت سے ایسے علوم ہیں جن میں کوئی شک نہیں ہوتا لیکن وہ قلب پر غالب نہیں ہوتے مثلاً موت کا علم ہر شخص کو یقیناً ہے لیکن یہ علم قلب پر غالب نہیں رہتا، مگر مراقبہ کے ذریعہ قلب کو جو معرفت حاصل ہوتی ہے وہ قلب پر حاکم ہوتی ہے اور قلب کو رقیب (یعنی اللہ تعالیٰ) کے احکام کی جانب لگا دیتی ہے اور قلب کی پوری ہمت (توجۂ تام) اسی بارگاہ میں مرکوز کر دیتی ہے۔

ایسی معرفت والے حضرات مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) الصدّیقین (۲) اصحاب الیمین ان کے مراقبے کے دو درجے ہیں۔

صدّیقین کا مراقبہ

پہلا درجہ مقربین صدّیقین کا ہے۔ ان کا مراقبہ تعظیم و اجلال پر مبنی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے قلوب عظمتِ جلال کے ملاحظہ میں مستغرق رہتے ہیں اور اس کی ہیبت کے تحت منکسر رہتے ہیں ان کے قلوب میں غیر کی طرف مائل ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہ ایسا مراقبہ ہے جس کے بیان میں ہم طوالت نہیں کرتے کیونکہ یہ قلب تک محدود ہے۔ رہ گیا اعضاء کا معاملہ تو وہ قلب کی اس یکسوئی کی وجہ سے ممنوعات سے تو کیا مباحات سے بھی معطل ہو جاتے ہیں اور جب طاعات کیلئے متحرک ہوتے ہیں تو تمام طاعات ان کیلئے مستعمل چیز کی طرح آسان ہوتی ہیں کسی قسم کی کوشش اور تدبیر وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ تمام اعضاء یوں ہر وقت طاعت کیلئے تیار ہوتے ہیں جس طرح ریوڑ راعی (چرواہے) کے حکم پر تیار ہو جاتا ہے اور یہاں راعی سے مراد قلب ہے۔ پس قلب جب سراسر رضائے معبود میں مستغرق ہوتا ہے تو تمام اعضا اس کی استقامت اور ہدایت پر قیام کی بدولت بغیر کسی تکلیف کے مشغول بالطاعات ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی ہمت (توجہ) صرف ربّ تعالیٰ کی طرف مرکوز کر دے اللہ تعالیٰ اس کی تمام ھموم

(پریشانیاں) زائل فرما دیتا ہے اور جو شخص اس درجہ پر پہنچتا ہے تو وہ مخلوق سے یکسر غافل ہو جاتا ہے حتی کہ وہ اپنے روبرو بیٹھے ہوئے شخص کو بھی نہیں دیکھتا حالانکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ کوئی بات سُنتا ہے حالانکہ وہ گونگا بہرہ نہیں ہوتا۔ اس کو بعید نہیں سمجھنا چاہیے بیشک اس کی نظیر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے قلوب میں دنیا کے بادشاہوں کی عظمت ہوتی ہے حتی کہ بادشاہوں کے بعض خدام شدتِ استغراق کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے کہ مجلسِ سلطان میں کیا بیتی بلکہ بعض قلوب دنیا کے حقیر خیالات میں محو ہو جاتے ہیں تو انہیں کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اسی استغراق کے عالم میں چل رہے ہوتے ہیں اور اس مقام سے آگے نکل جاتے ہیں جہاں کا انہوں نے قصد کیا ہوتا ہے اور اُنہیں وہ کام بھی بھول جاتا ہے جس کیلئے وہ اُٹھ کر چل دیئے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے زمانہ میں کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو اپنے حال میں مشغول ہونے کی وجہ سے مخلوق سے بے خبر ہو؟ فرمایا: نہیں مگر ایک شخص ایسا ہے جو ابھی اس مجلس میں پہنچنے والا ہے بس تھوڑی دیر گزری تھی کہ عتبہ غلام آ گیا حضرت عبدالواحد بن زیدؒ نے ان سے پوچھا عتبہ کہاں سے آ رہے ہو؟ انہوں نے کہا فلاں مقام سے اور اس کا راستہ بازار سے گزرتا تھا۔ حضرت نے پوچھا راستہ میں کس کس سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک مقام سے گزر رہے تھے کہ سامنے ایک خاتون آئی آپ نے اُسے ہٹانے کیلئے ہاتھ مارا تو وہ گر گئی لوگوں نے کہا آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: ہم نے گمان کیا کہ دیوار ہے۔

بعض مشائخ سے منقول ہے کہ وہ ایک جماعت سے گزرے جو تیراندازی کر رہی تھی اور راستہ کی ایک جانب ایک شخص تنہا بیٹھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص کے ساتھ جا کر کچھ گفتگو کر لی جائے۔ جونہی میں اس کے قریب ہوا تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ کا ذکر میری خواہش ہے۔ میں نے کہا آپ یہاں تنہا ہیں؟ کہنے لگا کہ میرے ساتھ میرا رب اور دو فرشتے ہیں۔ میں نے کہا ان تیراندازوں میں کون سبقت کرے گا؟ فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ بخش دے۔ میں نے کہا راستہ کس طرف ہے؟ تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کھڑا ہوا پھر چل دیا اور کہتا جا رہا تھا تیری اکثر مخلوق تجھ سے غافل ہے۔ یہ وہ کلام ہے جو مشاہدۂ الٰہی میں مستغرق ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایسے لوگ گویا ہوتے ہیں تو اسی کی خاطر اور سنتے ہیں تو اس کی باتیں۔ انہیں زبان اور اعضاء کے مراقبہ کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کی ہر حرکت اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔

ابوعبداللہ بن خفیفؒ کہتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے مصر سے رملہ جانے کا ارادہ کیا تا کہ ابوعلی روذباریؒ سے ملاقات کروں تو مجھے عیسیٰ بن یونس مصری زاہدؒ نے کہا وہاں صور (ایک جگہ کا نام ہے) میں ایک جوان اور

بزرگ اکٹھے مراقبہ میں مشغول ہیں تم اگر ایک نظر اُن کی زیارت کیلئے جاؤ تو شاید تمہیں فائدہ پہنچے۔ ابن خفیفؒ کہتے ہیں میں وہاں پہنچا تو اُس وقت میں سخت بھوکا تھا اور میرے آدھے جسم پر کپڑے تھے اور میرے کندھے پر کوئی کپڑا نہیں تھا، اسی حال میں، میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دو شخص قبلہ رُخ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا دوبارہ سلام کیا مگر جواب نہ آیا اور تیسری بار بھی جواب نہ آیا۔ میں نے کہا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی خاطر سلام کرتا ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ اس پر نوجوان نے سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا اے ابن خفیفؒ! دنیا قلیل ہے اور جو وقت باقی رہ گیا ہے وہ اس قلیل کا بھی قلیل ہے۔ پس تم اس قلیل سے اپنے لیے کثیر حصہ حاصل کرو، اے ابن خفیف! تمہارا رب تعالیٰ سے کتنا کم رابطہ ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ ملاقات کیلئے وقت مل گیا۔ یہ کہہ کر اس نے میرے دِل کو قابو کر لیا۔ میں ان کے قریب بیٹھا رہا حتیٰ کہ ہم نے ظہر اور عصر کی نماز ادا کی پھر میری بھوک، پیاس اور تھکن رخصت ہوگئی۔ جب نمازِ عصر سے فارغ ہوئے تو میں نے کہا مجھے نصیحت فرمایئے! پھر اسی نوجوان نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا اے ابن خفیف! ہم اصحابِ مشقت ہیں ہمارے پاس زبانِ نصیحت نہیں ہے، پھر میں نے اُن کی صحبت میں مزید تین دِن گزارے اور اس کے دوران میں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ نیند کی اور نہ ان دونوں کو کھاتے پیتے دیکھا۔ تیسرے دن میں نے خیال کیا کہ ان کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھے کوئی نصیحت کریں تا کہ میں ان کی نصیحت سے مستفید ہوں۔ نوجوان نے پھر سر اُٹھا کر کہا اے ابن خفیفؒ! تجھے اس شخص کی صحبت حاصل کرنی چاہیے جس کے دیدار سے تجھے خدا یاد آ جائے اور اس کی ہیبت تیرے دِل میں بیٹھ جائے اور جو تجھے زبان قال سے نہیں بلکہ زبانِ حال سے نصیحت کرے۔ والسلام، اب یہاں سے اُٹھو اور چلے جاؤ۔

پس یہ درجہ ان مراقبین (مراقبہ کرنے والوں) کا ہے جن کے قلوب پر اجلال اور تعظیم کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کے قلوب میں غیر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اصحاب الیمین کا مراقبہ

یہ وہ قوم ہے جن کے ظاہر اور باطن پر علمِ الٰہی کا یقینی غلبہ ہوتا ہے یعنی یہ اپنے احساس و شعور پر رب تعالیٰ کی نگہبانی کا غلبہ پاتے ہیں تاہم یہ لوگ ملاحظۂ جلال میں مستغرق نہیں ہوتے بلکہ ان کے قلوب حدِ اعتدال پر برقرار ہوتے ہیں اور ان میں احوال اور اعمال دونوں کی طرف توجہ کرنے کی وسعت ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ معاملات میں منہمک (مسلسل مشغول) ہونے کے باوجود مراقبہ سے خالی نہیں ہوتے۔ بیشک ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حیاء غالب ہوتی ہے اسی لیے یہ لوگ کوئی عمل کرنے سے پہلے یا کسی عمل اور بات کا انکار کرنے سے پہلے مراقبہ (غور وخوض) ضرور کرتے ہیں اور ہر اس بات سے اجتناب کرتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں قیامت کے روز شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گویا یہ لوگ دنیا میں ہر وقت رب تعالیٰ کو اپنے آپ پر مطلع

سمجھتے ہیں لہٰذا ان کو قیامت کیلئے منتظر رہنے کی حاجت نہیں ہوتی یعنی اس دن رب تعالیٰ کے روبرو ہونے سے قبل یہ لوگ خود کو ہر وقت اُس بارگاہ کے رُوبرو سمجھتے ہیں۔

ان دونوں درجوں کے درمیان جو فرق ہے اسے تجربہ و مشاہدہ سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً تم کسی کام میں بے تکلف مشغول ہو اتنے میں کوئی بچہ یا عورت آ جائے تو بطریق حیا اپنے بیٹھنے کی ہیئت اور صورتِ حال کو بدل لیتے ہو لیکن یہ تبدیلی اجلال و تعظیم کے طور پر نہیں ہوتی بلکہ رسمی شرم ہوتی ہے۔ پس اگرچہ اس حیاء میں ہیبت اور استغراق نہیں تاہم معمولی ادراک (یعنی بچے اور عورت کے آنے کے شعور) کے باعث بے تکلف ہیئت اور حالت میں حیاء کی آمیزش ہوئی اور یہ "مراقبہ" (غور وخوض) کرنے کا نتیجہ ہے۔

اور کبھی ایسی حالت میں کوئی بادشاہ یا اکابرین میں سے کوئی آ جائے تو تم بوجہ تعظیم اور ہیبت میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہو کہ جس کام میں مشغول ہوتے ہو وہ یکسر ترک ہو جاتا ہے اور یہ رسمی شرم و حیاء کی وجہ سے نہیں بلکہ ہیبت و جلال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس اسی طرح بندے رب تعالیٰ کیلئے مراقبہ میں مختلف احوال کے حامل ہوتے ہیں۔ جو لوگ سلوک کے اس درجے میں ہوتے ہیں وہ اپنی جمیع حرکات، سکنات، خطرات، لحظات (ساعتیں) بلکہ جمیع اختیارات میں مراقبے (غور وخوض) کے محتاج ہوتے ہیں اور انہیں عمل کرنے سے پہلے غور وخوض کرنا ہوتا ہے۔ آیا جو عمل وہ کرنا چاہتے ہیں وہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کیلئے ہے یا اس میں نفس کی خواہش اور شیطان کی پیروی کا اثر ہے۔ پس وہ توقف کرتے ہیں حتی کہ نورِ حق کی بدولت ان پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ کام کیسا ہے پھر اگر وہ کام خوشنودیٔ مولیٰ کا باعث ہوتا ہے تو کر گزرتے ہیں اور اگر غیر اللہ کیلئے ہوتا ہے تو اپنے پروردگار سے شرم و حیاء کرتے ہوئے اس سے رُک جاتے ہیں۔ پھر نفس کو ملامت کرتے ہیں کہ آخر اس عمل کی تیرے اندر رغبت ہی کیوں پیدا ہوئی؟ [1]

مراقبہ کیلئے تین دیوان

امام غزالی فرماتے ہیں: ایک حدیث شریف میں ہے کہ بندے کی ہر حرکت کیلئے تین دیوان (دفتر) ہوتے ہیں اگرچہ وہ حرکت کتنی ہی صغیر ہو۔

دیوانِ اول "لِمَ" ہے۔ دیوانِ ثانی "کَیْفَ" ہے اور دیوانِ ثالث "لِمَنْ" ہے اور "لِمَ" کا معنی ہے کہ یہ عمل تو نے کیوں کیا، آیا یہ تجھ پر تیرے مولا کی طرف سے فرض تھا یا اس کی طرف تیری شہوت اور خواہش مائل ہوئی۔ اگر معاملہ شہوت اور خواہش سے مبرّا ہو تو دیوانِ ثانی میں غور کیجیے اور پوچھیے کہ یہ عمل تو نے کیسے کیا؟ سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کیلئے کیے ہوئے ہر عمل میں ایک شرط ہے اور ایک حکم، جس کی قدر، وقت اور صفت کو علم کے بغیر

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۴۰۰۔

نہیں جانا جا سکتا لہٰذا یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ عمل کیسے کیا؟ آیا محقق (یقینی) علم کے ساتھ یا جہالت اور گمان کے ساتھ؟ پس اگر یہ دیوان بھی نقص اور کجی سے محفوظ ہو تو دیوانِ ثالث کھولیے اور دیکھیے کہ اخلاص کامل موجود ہے یا نہیں، اگر وہ عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کیلئے ہو اور اس عہد ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کی وفاداری میں ہو تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے اور اگر مخلوق کو دکھانے کیلئے کیا تو اجر اُنہی سے وصول کیجیے اور اگر دنیا کے فوری نفع کیلئے کیا تو تمہیں دنیا میں نصیبہ (حصہ) مل گیا اور اگر وہ عمل سرے سے غیر اللہ ہی کیلئے کیا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب اور عقاب لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تُو جب بندہ میرا ہے، رزق میرا کھاتا ہے، میرے ملک میں رہتا ہے، پھر تیرا عمل غیر کیلئے کیوں؟ کیا تو نے نہیں سنا میرا فرمان ہے ''اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ'' [1] (بے شک جن (بتوں) کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہاری ہی طرح (اللہ کے) مملوک ہیں۔) ''اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ'' [2] (بے شک تم اللہ کے سوا جن کی پوجا کرتے ہو وہ تمہارے لیے رزق کے مالک نہیں ہیں پس تم اللہ کی بارگاہ سے رزق طلب کیا کرو اور اسی کی عبادت کیا کرو)۔ تیرے لیے خرابی ہو کیا تو نے نہیں سُنا، میں نے فرمایا ہے ''اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ'' [3] (لوگوں سے کہہ دیں:) سُن لو! طاعت و بندگی خالصۃً اللہ ہی کیلئے ہے)۔ پس بندہ جانتا ہے کہ اُسے مذکور الصدر مطالبات اور تنبیہات کا سامنا ہر حال میں کرنا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان مطالبات سے پہلے اپنے آپ سے مطالبات کرے اور ان سوالات سے پہلے جوابات تیار کر لے اور یہ جوابات باصواب ہوں یعنی خطا سے مبرّا ہوں، لہٰذا ہر عمل کی ابتداء اور انتہا میں نفس کا مطالعہ کرنا اور ربّ تعالیٰ کو رقیب (نگہبان) جاننا ضروری ہے اور ہر حرکت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی تأمل (فکر و تدبر) لازمی ہے۔ [4]

صوفیاء عظام نے مراقبہ کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے لیکن میں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں مشائخ نقشبندیہ کے حوالے سے مراقبہ کا ذکر کرتا ہوں۔

امام السید محمد بن محمد الحسینی الزبیدیؒ فرماتے ہیں: مشائخ نقشبند قدس اللہ ارواحھم اس معاملہ میں تمام لوگوں سے زیادہ حصہ لے گئے۔ وہ فرماتے ہیں: جان لو کہ مراقبہ نسبت زکیہ اور ایک مخفی عبادت ہے۔ جس شخص کو مراقبہ میں ثبات حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نورِ معرفت سے منور فرما دیتا ہے اور اس کے سینے کو حقائق کے کشف کیلئے شرح صدر کر دیا جاتا ہے پھر اس شخص کی فراست خطا نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے مکاشفہ میں تاخیر آتی ہے اور ملک و ملکوت میں اس کے تصرف کو صحت حاصل ہو جاتی ہے اور بارگاہِ جبروت میں

---

[1] الاعراف، ۷:۱۹۴۔ [2] العنکبوت، ۲۹:۱۷۔ [3] الزمر، ۳۹:۳۔

[4] احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۴۰۰۔

قربت عطا ہو جاتی ہے اور تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ خوب ہو جاتا ہے اور اوقاتِ عبادت تام ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف مراقبہ کی برکت سے ہوتا ہے کیونکہ مراقبہ اعظم العبادات ہے یعنی تمام عبادتوں سے بڑی عبادت ہے۔

مراقبہ کی وضاحت

جیسا کہ لفظ مراقب سے ظاہر ہوتا ہے۔ مراقب ایسا شخص ہے جو سواری کرتا ہے یا نگرانی کرتا ہے۔ عرب ممالک میں مراقب اس ملازم یا افسر کو کہتے ہیں جو تمام دفتر کا نگران ہو۔ علامہ اقبالؒ نے قلندر کو حالات پر سواری کرنے والا (راقب) کہا ہے وہ حالات کا مَرْ کَبْ نہیں یعنی حالات اس پر سوار نہیں ہو سکتے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اگر قلندر (مردِ مسلمان) کے حالات سازگار نہ ہوں تو وہ ساری دنیا سے جنگ آزما ہو جاتا ہے اور کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ حقیقتاً مراقبہ کا اصل معنی یہی ہے کہ مسلمان کسی دوسرے کی برتری کو تسلیم نہ کرے اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اس صورت میں کہ جب مومن ذکر کے بعد مراقبہ کرتا ہے تو دراصل وہ خدا کی طرف متوجہ ہو کر اس سے اس قدر فیض اور روحانی طاقت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ کسی سے مسخر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ خدا کی طرف سے بذریعہ مراقبہ اس قدر طاقت حاصل کر لے تو وہ مخلوق کے سامنے ناقابلِ شکست ہو جاتا ہے۔ مومن جب طاقت حاصل کرنے کے بعد ''قائم بامر اللّٰہ بود'' کا مصداق ہو جاتا ہے تو وہ تمام دنیا پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اللہ تعالیٰ پر کمند ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک مقالہ ''مقامِ آدم'' کے نام سے ہماری تصنیف ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبال'' میں ہے اس کا مطالعہ فرمائیں۔ علامہ اقبالؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ بندۂ مومن اگر چاہے تو جبرائیل علیہ السلام کو سدھائی ہوئی چڑیا کی طرح ایک جلے ہوئے بال سے باندھ کر اسے انگوٹھے پر بٹھا سکتا ہے۔ اس طاقت کی ابتداء ذکر اور مراقبہ سے ہوتی ہے۔ راقم الحروف اپنے مطالعۂ اسلام کو گہرائیوں سے دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ طریقت کی روحانیت کا منبع ذکرِ الٰہی ہے، جس کے متعلق مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ فکر اگر منجمد ہو جائے تو ذکر اس کو کھول دیتا ہے اور اگر فکر کھل جائے تو وہ طریقت کے راستے کے قابل ہو جاتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ راہ وہ ہوتی ہے جس سے مومن خدا کے سامنے آ جائے گویا مومن خدا کا وصل حاصل کر لیتا ہے۔ اولیائے کرامؒ مراقبہ میں اکثر اوقات تصرف کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے پناہ طاقت مل جاتی ہے۔ جس سے وہ مخلوق پر تصرف کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کو یہ طاقت حضور ﷺ کی صحبت میں رہنے اور بنابریں اعمالِ صالحہ پر استقامت کرنے سے حاصل ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ روحانیت

کے سلسلہ کو محض عصر حاضر میں رواج نہیں دیا جا رہا ہے جو کہ اصل حضور ﷺ کے زمانے میں موجود نہ تھی۔ نا سمجھ لوگ اس طریقت کو بدعت اور لایعنی کام سمجھتے ہیں یہ وہ روحانیت تھی کہ جس نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمر ؓ، اور دیگر صحابہ کرام ؓ کی وہ مثالیں قائم کیں ہیں جس کو زمانہ پھر کبھی بھی دہرا نہ سکے گا۔ ہم مراقبہ اور اس کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں: حضرت جبرائیل ؑ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا احسان کیا ہے؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کی یوں عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے [1] جیسا کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے خود وضاحت فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ'' [2] (کیا وہ (اللہ) جو ہر جان پر اس کے اعمال کی نگہبانی فرما رہا ہے)۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ''اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝'' [3] (کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ (اس کے سارے کردار کو) دیکھ رہا ہے؟)۔ اور ارشاد فرمایا ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا'' [4] (بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے)۔ اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ'' [5] (اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی نگہداشت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں)۔

حضرت ابن المبارکؒ نے ایک شخص سے فرمایا: "رَاقِبِ اللّٰهَ تَعَالٰى (اللہ تعالیٰ کے ساتھ مراقبہ کر) اس شخص نے اس بات کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا: تم ایسے ہو جاؤ گویا تم ہر وقت اللہ عزوجل کو دیکھ رہے ہو۔ حضرت عبدالواحد بن یزیدؒ فرماتے ہیں: جب میرا سید (مشکل کشا حاجت روا یعنی اللہ تعالیٰ) میرا رقیب (نگہبان) ہو تو مجھے غیر کی کیا پروا ہے اور حضرت ابو عثمان المغربیؒ فرماتے ہیں: راہِ طریقت میں انسان کیلئے افضل چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر مراقبہ، محاسبہ اور علم کے ساتھ سیاستِ عملی لازم کر لے۔ (لفظِ سیاست کا معنی ہے جانوروں کو سدھانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا۔ اسی لیے گھوڑے کو سدھانے والے شخص کو "سَائِسْ" کہتے ہیں اور قومی اُمور کی تدبیر و تنظیم کو بھی سیاست کہتے ہیں اور یہاں نفس کو سدھانے سے مراد سیاستِ عملی ہے) [6]۔

حضرت ابن عطاؒ فرماتے ہیں: افضل ترین عبادت دائمی طور پر حق کا مراقبہ کرنا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' میں دائمی کا مضمون اوائل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اور حضرت جریریؒ فرماتے ہیں: ہمارا یہ معاملہ دو اصولوں پر مبنی ہے (۱) یہ کہ اللہ عزوجل کی رضا کی خاطر اپنے نفس کی نگہبانی کر (۲) تمہارے ظاہر پر علم نمایاں ہو (یعنی علم پر عمل کرنے کی برکات نمایاں ہوں)۔

---

۱ المعجم الکبیر، حدیث ۵۱۹۱، جلد ۵، صفحہ ۲۳۷۔　۲ الرعد ۱۳: ۳۳۔　۳ العلق ۹۶: ۱۴۔

۴ النسآء ۴: ۱۔　۵ المعارج ۷۰: ۳۲، ۳۳۔　۶ احیاء علوم الدین، جلد ۴، صفحہ ۳۹۷۔

حضرت ابو عثمانؒ فرماتے ہیں مجھے ابو حفصؒ نے فرمایا جب تم لوگوں کو وعظ کرنے کیلئے بیٹھو تو یوں سمجھو کہ تم اپنے نفس اور قلب کو وعظ کر رہے ہو اور لوگوں کے ہجوم پر مت اتراؤ کہ لوگ تو تمہارے ظاہر کا مراقبہ (مشاہدہ) کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے باطن پر رقیب (نگہبان) ہے۔ منقول ہے کہ کسی بزرگ کا ایک نوجوان شاگرد تھا، شیخ اس کی بہت تعظیم کرتے تھے اور اُسے دیگر مریدین پر مقدم رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بعض خلفانے شیخ کے سامنے اظہارِ خیال کیا کہ آپ کیوں اس نوجوان کی تکریم کرتے ہیں؟ حالانکہ ہم اس کے مقابلہ میں شیوخ کی مانند ہیں؟ شیخ نے چند پرندوں کو حاضر کرنے کا حکم کیا پھر ایک ایک پرندہ اور ایک ایک چھری ہر مرید کو دی اور کہا کہ تم میں سے ہر شخص اپنا اپنا پرندہ وہاں ذبح کر کے آئے جہاں اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکے اور ایک پرندہ اور چھری اس نوجوان کو بھی دے کر اسی طرح کہا۔ غرض ان میں سے ہر شخص اپنا پرندہ ذبح کر کے لے آیا لیکن جب وہ نوجوان آیا تو اس کے ہاتھ میں زندہ پرندہ تھا۔ شیخ نے نوجوان سے پوچھا، تمہیں کیا ہوا کہ تم نے اپنے ساتھیوں کی طرح پرندہ کو ذبح نہیں کیا؟ اس نے کہا حضور! مجھے کوئی ایسا مقام نہیں ملا جہاں کوئی بھی نہ دیکھتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر جگہ مجھ پر نگاہ ہے۔ مریدین نے اس نوجوان کے مراقبے کے اس مقام کی تحسین کی اور اعتراف کیا کہ شیخ اس کی تعظیم اور تقدیم میں حق بجانب ہیں۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جنتِ عدن جنت الفردوس کا ایک حصہ ہے۔ اس میں حوریں رہتی ہیں جو وہاں داخل ہونے والوں کو ملیں گی۔ پوچھا گیا اس جنت عدن میں کون داخل ہوگا؟ فرمایا وہ لوگ اس میں داخل ہوں گے جنہوں نے معصیت کا ارادہ کیا پھر اُنہیں رب کی عظمت یاد آ گئی اور رب تعالیٰ کا دیکھنا اُنہیں یاد آیا تو وہ معصیت سے باز آ گئے۔

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ سے مراقبہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا مراقبہ کی ابتداء یہ ہے کہ تو دل سے جان لے کہ رب تعالیٰ تیرے قریب ہے۔ حضرت مرتعشؒ فرماتے ہیں غیب کو ملاحظہ کرتے ہوئے اُسرار کو ہر حال میں مخفی رکھنا مراقبہ ہے اور مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے ارشاد فرمایا تم ظاہر کے نگران مقرر کیے گئے ہو اور میں باطن کا رقیب (نگہبان) ہوں۔

حضرت محمد بن علی الحکیم الترمذیؒ فرماتے ہیں: اس ذات کیلئے مراقبہ کرو جس کی نظر ایک لحہ کیلئے بھی تم سے نہیں ہٹتی اور اس کیلئے شکر کرو جس کی نعمتیں لحہ بھر کیلئے تم سے منقطع نہیں ہوتیں اور اس کی اطاعت بجالاؤ جس سے تم لحہ بھر کیلئے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور اس کی بارگاہ میں عاجزی اختیار کرو جس کے ملک اور اختیار سے تم باہر نہیں نکل سکتے۔

حضرت سہل تستریؒ فرماتے ہیں: قلب کی افضل اور اعلیٰ زینت اتنی کسی چیز سے نہیں ہوتی جتنی اس بات سے ہوتی ہے کہ بندہ یقین رکھے کہ اللہ سبحانہ اس پر شاہد (نگہبان) ہے خواہ بندہ کہیں ہو۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا بندہ کس طرح جنت حاصل کرسکتا ہے؟ فرمایا: پانچ خصلتوں سے (۱) ایسی استقامت جس میں حیلہ اور کج روی نہ ہو (۲) ایسا مجاہدہ جس میں تساہل اور غفلت نہ ہو (۳) علانیہ اور پوشیدہ ہر حالت میں مراقبۂ الٰہی یعنی رب تعالیٰ کو خود پر شاہد و نگہبان یقین کرنا (۴) اعمالِ حسنہ کے ساتھ موت کے انتظار میں رہنا (۵) حساب سے پہلے اپنا محاسبہ کرلینا۔ حضرت حمید طویلؒ نے سلیمان بن علیؒ سے عرض کیا مجھے نصیحت فرمایئے انہوں نے فرمایا: اگر تم اللہ تعالیٰ کی معصیت کرو اور سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے تو تم نے بڑی جرأت کی اور اگر تم گمان کرو کہ وہ تمہیں نہیں دیکھ رہا تو تم نے کفر کیا۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: تم پر اس ذات کا مراقبہ لازم ہے جس سے کوئی چھپنے والا چھپ نہیں سکتا۔ تم پر اس ذات سے اُمید رکھنا لازم ہے جو وفا کا مالک ہے اور تم پر اس سے ڈرنا لازم ہے جو سزا دینے پر قادر ہے۔

حضرت فرقد سنجیؒ فرماتے ہیں منافق غور کرتا ہے اور جب سمجھتا ہے کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو برائی کیلئے داخل ہو جاتا ہے۔ وہ محض لوگوں کو اپنے آپ پر رقیب سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو رقیب (نگہبان) نہیں سمجھتا حالانکہ "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِيْبًا" [۱] اور (اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے)۔

حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکۃ المکرمۃ کیلئے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ ایک مقام پر رات کے آخری حصہ میں ہم نے پڑاؤ کیا۔ کچھ دیر بعد ایک چرواہا بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ پہاڑ سے نیچے اُترا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا: اے راعی (چرواہے!) ان بکریوں میں سے ایک بکری ہمارے ہاتھوں پر فروخت کر! اس نے کہا میں ایک نوکر ہوں بکریوں کا مالک نہیں ہوں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم اپنے مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری کو بھیڑیا کھا گیا۔ اس نے کہا "فَاَيْنَ اللّٰه؟" پھر اللہ کہاں ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کی بات سُن کر رو پڑے اور علی الصبح اس نوکر کے مالک کے پاس تشریف لے گئے اس سے اس غلام کو خرید کر آزاد فرمایا اور ارشاد فرمایا: دنیا میں تو یہ نوجوان اس کلمہ (فَاَيْنَ اللّٰه) کی بدولت آزاد ہو گیا اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی وہ اسی کلمہ کی بدولت نجات پا جائے گا۔ [۲]

حضرت نصر آبادیؒ فرماتے ہیں: رب تعالیٰ سے رجا (اُمید) تجھے اطاعت پر اُبھارے گی اس کا خوف تجھے گناہوں سے باز رکھے گا اور مراقبہ تجھے حقائق (یعنی مشاہدہ) کی طرف راہنمائی کرے گا۔

حضرت ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت جریریؒ کو فرماتے ہوئے سُنا جو شخص اپنے اور اللہ سبحانہ کے درمیان تقویٰ اور مراقبہ کو حاکم نہیں بناتا وہ کشف اور مشاہدہ کی دولت سے نہیں نوازا جاتا۔ بعض مشائخ نے فرمایا: جو شخص اپنے دِل کے خیالات پر رب تعالیٰ کو نگہبان سمجھے اللہ تعالیٰ اس کے اعضائے بدن کو

---

[۱] الاحزاب ۳۳: ۵۲۔

[۲] احیاء العلوم، جلد ۴، صفحہ ۳۹۸۔

گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔[1]

مراقبہ کا طریقہ

مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن پاک ہو، جگہ پاک ہو، قلب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو، ذہن وسوسوں اور خیالات سے بلند ہو اور ہر تشویش و فکر سے محفوظ ہو، قبلہ رُخ دو زانو ہو کر بیٹھ جائے، آنکھیں بند کر لے، آس پاس کے ماحول کے اثرات سے مبرّا ہو کر بیٹھے تمام علوم و معرفت سے آزاد ہو جائے، حواسِ ظاہری اور قوائے باطنی سے معطل ہو جائے پھر قلب آزاد کے ساتھ اور جذبۂ ہیبت کے ساتھ ذاتِ حق کی جناب میں متوجہ ہو جائے، اس جذبہ کے ساتھ کہ اس میں خود کو فنا کرنا ہے حتیٰ کہ تمام خطرات کلیتاً زائل ہو جائیں اور روحانیت جسمانیت پر غالب آ جائے اور جب یہ حالت غالب ہو جائے اور صفتِ لازمہ کا روپ اختیار کر جائے تو ایسے شخص کیلئے تمام عبادات پر استقامت اور تمام اعمال کے ذریعہ تقرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

مقصد مراقبہ، نفس کی نگہداشت

مراقبہ کے معنی نفس کی نگہداشت کے ہیں۔ یعنی اگر انسان نفس پر نگاہ نہ رکھے تو نفس پھر شہوت پرستی اور کاہلی کے زیرِ اثر اپنی اصلیت پر لوٹ آئے گا۔ کہتے ہیں کہ اگر تم نفس کو کسی کام میں مصروف نہ رکھو گے تو وہ تمہیں کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھے گا اور سرکشی کا مظاہرہ کرے گا تمام خیالات سے دل و دماغ کو فارغ کر کے کامل یکسوئی حاصل کرتے ہوئے خدا کی طرف دھیان لگانا مراقبہ کہلاتا ہے۔

مراقبے کا فائدہ تب ہوگا جب انسان یہ سمجھے کہ لوگ تو میرے ظاہری اعمال کو دیکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ میرے باطن سے بھی واقف ہے اور ہر فعل اور ہر حال سے واقف ہے۔ ''وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ''[2] (وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں خواہ انہیں ظاہر کر دیا انہیں چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا)۔ یہ بات سمجھنے سے ظاہر آراستہ اور باطن پیراستہ ہو جاتا ہے۔ جب تک تم یہ نہ سمجھو گے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے تمہارا کوئی کام درست نہیں ہو سکتا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مراقبہ کا طریقہ

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ تجھ پر لازم ہے کہ اپنے قبلۂ توجہ کو ہر طرف سے ہٹا کر کلیۃً اس طریقۂ عالیہ کے بلند مرتبہ اکابرین کی طرف کرے اور اُن سے ہمت اور توجہ طلب کرے۔ ابتدا میں ذکر

---

[1] الرسالۃ القشیریہ، صفحہ ۲۶۴، ۲۶۵۔

[2] البقرہ، ۲: ۲۸۴۔

کرنے کے بغیر چارہ نہیں (یعنی پہلے کچھ دیر نفی اثبات یا اللہ ھُو کا ذکر کرے) چاہیے کہ قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ دل کے گوشت کا ٹکڑا قلبِ حقیقی کیلئے حجرے اور گھر کی مانند ہے اور اسمِ مبارک ''اللہ'' کو اس قلب پر گذارے اور اُس وقت قصداً کسی عضو کو بھی حرکت نہ دے، کلیۂ قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائے اور خیال میں بھی قلب صنوبری کو ہرگز جگہ نہ دے۔ اس کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ نہ ہو کیونکہ مقصود قلب کی توجہ ہے نہ کہ اس کی صورت کا تصور اور لفظِ مبارک ''اللہ'' کے معنی کو بے مثال اور بے کیف ملاحظہ کرے (یعنی اللہ کو کسی مثال یا مثل کی شکل میں دل میں نہ لائے) اور کسی صفت کو بھی اس کے ساتھ نہ ملائے اور اُس کے حاضر و ناظر ہونے کو بھی لحاظ وخیال میں نہ لائے، تاکہ حضرت ذاتِ تعالیٰ تقدس (پاکی) کی بلندی سے صفات کی پستی کی طرف نہ آئے اور اس سے شہود و کثرت میں نہ پڑے اور بے کیف ذات کی گرفتاری سے چوں اور کیف والی شے کے ساتھ آرام نہ پکڑے کیونکہ جو چوں اور کیف (شکل وصورت) رکھنے والی شے میں نمایاں ہوگا وہ بے کیف یعنی اللہ تعالیٰ نہیں ہوسکتا اور جو کچھ کثرت میں نمودار ہوتا ہے وہ واحدِ حقیقی نہیں ہوسکتا۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کو وحدت کے اعتبار سے مانتے ہیں مگر کائنات کو اسی وحدت کی کثرت والی صورت میں دیکھتے ہیں۔ خدا کیلئے وحدت یا کثرت کا ایسا کوئی خیال مراقبے کے دوران نہیں لانا چاہیے) بے چوں ذات کو چوں کے دائرہ سے باہر تلاش کرنا چاہیے۔ بسیطِ حقیقی کو احاطۂ کثرت سے باہر طلب کرنا چاہیے۔ اگر بوقت ذکرِ الٰہی بے تکلف پیر کی صورت ظاہر ہو تو اُسے بھی دل میں لے جائے اور دل میں بٹھا کر ذکر کرے۔ تم جانتے ہو پیر کیسی ہستی ہے؟ پیر وہ ذات ہے کہ جنابِ قدس خداوندی جلّ شانہٗ تک پہنچنے کے راستے میں تم اُس سے استفادہ کرتے ہو اور اُس سے اس راہ میں طرح طرح کی مدد و اعانت حاصل کرتے ہو۔ خالی کلاہ اور چادر اور شجرہ جو مروج ہو چکا ہے پیری مریدی کی حقیقت سے خارج ہے اور عادات و رسوم میں داخل ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ شیخ کامل کا کرتہ بطورِ تبرک اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اعتقاد و اخلاص سے زندگی گذارے۔ شیخ کے کرتے کو پاس رکھنے میں ثمرات ونتائج کا قوی احتمال ہے۔ شیخ علاؤالدین فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں قطرہ خوں از دل چکد تا نشان قطرہ از آں یافتم

(دل سے لاکھوں قطرہ ہائے خون نکلنے کے بعد ایک قطرہ بھر آگاہی کا نشان نصیب ہوتا ہے)

''مرآۃُ الاسرار'' میں ہے کہ ایک سانس میں نو سے اٹھارہ مرتبہ تک لفظِ ''اللہ'' کہے یہ مراقبہ خلوت میں ہو اگر اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو مشائخ کی ارواح سے استفادہ کرے، فائدہ اُس قدر ہوگا جس قدر شیخ سے نسبت قوی ہوگی۔ اس کام میں توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے۔ اس بزرگ کی روح کو وسیلہ سمجھنا چاہیے۔ بزرگوں کے ساتھ عقیدت کا ہونا دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقیدت ہے جس طرح تواضع تو لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے مگر حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان معنوں میں پیروں کو بظاہر آثارِ قدرت اور غنیمت سمجھنا

چاہیے۔ مراقبے کا طریقہ نفی اثبات کے طریقے سے زیادہ مؤثر ہے اور جذب پیدا کرنے میں اکسیر ہے مراقبہ کی بدولت عالم میں تصرف ہو سکتا ہے قلب کو منور کرنے اور انوار و برکات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ دوامِ مراقبہ ہے۔ اِس سے جمیعتِ خاطر اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اس مقام کو جمع وقبول کہتے ہیں۔ اور انسان جب اپنے نفس کو وصیت کرے اور شرائط طے کر چکے جو ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں تو پھر اس کے بعد مراقبہ ہوتا ہے یعنی تمام اعمال میں بہت غور و فکر کرے اور سخت نگرانی کرے اگر اُس نے اِس معاملہ میں ذرہ برابر تساہل برتا تو نفس کی سرکشی، خیانت اور فساد میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ مشائخ کا قول ہے کہ انسان کی روح نفس کے چنگل سے آزاد ہو تو روح میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ نفس کو یہ جرأت نہیں رہتی کہ دل کی طرف نگاہ بھی کر سکے اور اگر روح کمزور ہو جائے تو نفس کی حکمرانی دل پر ثبت ہو جاتی ہے اور جو کچھ نفس چاہتا ہے انسان سے کروا لیتا ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ کسی نالے کے ابتدائی باریک سوراخ کو چھوٹی سی تیلی سے بھی بند کیا جا سکتا ہے مگر جب وہ سوراخ بڑھ جائے تو ہاتھی بٹھا کر بھی مشکل سے بند ہوتا ہے۔

مشارطۂ نفس

مشارطہ کا معنٰی ہے دو شخصوں کا کسی معاملہ میں باہمی شرائط مقرر کرنا اور انہی طے شدہ شرائط پر معاملہ آگے چلانا، جیسا کہ ایک تاجر شخص اپنے شراکت دار کو مال سپرد کرتے وقت شرائط مقرر کرتا ہے اسی طرح عقل دارِ آخرت کی تاجر ہے اور اس کا مقصود اور نفع تزکیۂ نفس ہے اس لیے کہ عقل کی فلاح اسی میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا o "[1] (بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی) اور بے شک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)۔

بے شک نفس کی فلاح اعمالِ صالحہ میں ہے اور عقل نفس سے مدد حاصل کرتی ہے تاکہ وہ اس تجارت میں شریکِ کار رہے اور اعمالِ صالحہ کمانے میں ہر موڑ پر معاون ثابت ہو جیسا کہ ایک تاجر اپنے نوکر یا حصہ دار سے مدد حاصل کرتا ہے تاکہ اُس کے اصل مال میں اضافہ ہو اور جس طرح تاجر اپنے حصہ دار یا خائن نوکر کو اپنے مال کیلئے مضر گردانتے ہوئے ان کے ساتھ کڑی شرائط طے کرتا ہے اور پھر مسلسل ان شرائط کی نگرانی کرتا ہے تاکہ نفع یقینی ہو اسی طرح عقل بھی اوّلاً نفس کے ساتھ شرائط طے کرتی ہے پھر اس کو رأس المال (اصل سرمایہ) کے طور پر وظائف مہیا کرتی ہے اور اسے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی راہیں بتاتی ہے اور پھر اس سے پختہ عہد لیتی ہے کہ تو نے سلوک کی ان راہوں پر چلتے رہنا ہے اور پھر ایک لحہ کیلئے بھی اس سے غفلت نہیں برتنی اگر وہ لحہ بھر

---

[1] الشمس، ۹۱: ۹، ۱۰۔

کیلئے غافل ہو جائے تو خیانت اور رأس المال کی بربادی کے سوا اسے اور کچھ نظر نہیں آئے گا جس طرح کہ اگر خائن نوکر سے تھوڑی سی غفلت برتی جائے تو نقصان کا یقینی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پھر جب فارغ ہو تو اس سے حساب لے اور مطالبہ کرے کہ طے شدہ شرائط کے مطابق اس نے دارِ آخرت کی تجارت میں کیا کمایا؟ بے شک اس تجارت کا نفع فردوسِ اعلیٰ ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام اور شہدائے کرامؓ کے ساتھ نشست گاہ سدرۃ المنتھیٰ ہے لہٰذا اس تجارت کا حساب دنیوی مالِ تجارت کے حساب سے بہت زیادہ دقیق اور شدید ہونا چاہیے کیونکہ اس تجارت میں جتنا منافع زیادہ رکھا گیا ہے اتنا ہی تھوڑی سی غفلت اور بے پروائی سے عظیم خسارہ کا اندیشہ بھی ہے۔

غرض نفس کے ساتھ دارِ آخرت کی تجارت سے پہلے مشارطہ، پھر مراقبہ، پھر محاسبہ اور پھر معاقبہ یا معاتبہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تمام قواعد وضوابط کے ساتھ یہ تجارت کرے تو اس کا نفع عظیم بھی ہے اور دائمی بھی۔ ارشادِ الٰہی ہے ”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝“ (اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتادوں جو تم کو دردناک عذاب سے بچالے؟ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر (کامل) ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اور نہایت عمدہ رہائش گاہوں میں (ٹھہرائے گا) جو جناتِ عدن (یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتوں) میں ہیں، یہی زبردست کامیابی ہے)۔[1]

معاقبہ اور عملِ اسلاف

معاقبہ کا معنیٰ ہے کہ نفس کا پیچھا کرنا۔ حساب لینے کے بعد بھی اس کو اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو دلیر اور بے باک ہو جائے گا۔ اگر کوئی مشتبہ چیز کھائے تو سزا یہ ہے کہ اسے بھوکا رکھو، کفارہ کی غایت یہی معاقبہ ہے۔

۱) بنی اسرائیل کا ایک عابد عرصہ دراز صومعہ میں عبادت کرتا رہا کہ ایک روز ایک عورت کو دیکھ کر ایک قدم اس لیے باہر نکالا کہ اس عورت سے ملاقات کرے جب احساسِ گناہ ہوا تو فوراً رک گیا، اس قدم کو وہیں

---

[1] الصف، ۶۱: ۱۰-۱۲۔

سردی میں رات دن پڑا رہنے دیا یہاں تک کہ وہ شدتِ موسم سے گل سڑ گیا اور آخر بدن سے جدا ہو گیا۔

۲) جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ابن الکربیؒ کو ایک رات غسل کی حاجت ہوئی۔ چاہتے تھے کہ غسل کر لیں مگر سخت سردی کے باعث نفس نے سستی اور کاہلی پر مجبور کیا اور کہا کہ صبح حمام میں جا کر نہا لیں گے مگر ابن الکربیؒ نے قسم کھائی کہ اس نفس کو سیدھا کرنے کیلئے کپڑوں سمیت نہاؤں گا اور ان کپڑوں کو بدن پر ہی سکھاؤں گا پھر ویسے ہی کیا اور کہا کہ ایسے نفس کو اسی طرح ٹھیک کرنا چاہیے تا کہ حق تعالیٰ کے کام میں پھر کبھی تساہل کی جرأت نہ کرے۔

۳) ایک زاہد نے عورت کو گھورا پھر قسم کھائی کہ ٹھنڈا پانی کبھی نہ پیوں گا اور کبھی ٹھنڈا پانی نہ پیا۔

۴) حسان بن ابی حنانؒ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک خوبصورت منظر دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور پوچھا کہ اسے کس نے تیار کروایا ہے پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اپنے نفس سے کہا کہ تجھے اس سے کیا غرض تھی۔ اس کی سزا یہ دی کہ ایک سال تک روزے رکھے۔

۵) حضرت ابوطلحہ ﷛ کا ایک کھجور کا باغ تھا۔ جس میں حضور ﷺ کبھی کبھی تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایک روز ابوطلحہ ﷛ اس میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خوبصورت پرندہ اس میں سے گزرا تو آپ نماز میں بھول گئے کہ کتنی رکعت پڑھی ہیں نفس کی اس غفلت کے عوض تمام باغ صدقہ کر دیا۔

۶) مالک بن ضیغمؒ کہتے ہیں کہ رباح القیسیؒ نماز عصر کے بعد ہمارے ہاں آئے اور کہا کہ اپنے باپ کو ذرا باہر بلاؤ۔ میں نے کہا کہ اس وقت وہ سو رہے ہیں وہ کہہ کر چلے گئے کہ "سونے کا بھلا یہ کون سا وقت ہے"۔ میں نے سُنا کہ وہ اپنے نفس کی تادیب کر رہے تھے اے نفس تجھے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی اب تجھے سال بھر تکیہ پر سر رکھ کر سونے نہ دوں گا۔

۷) تمیم داریؒ ایک رات ایسے سوئے کہ نماز تہجد قضا ہو گئی اس پر انہوں نے عہد کر لیا کہ ایک سال تک رات نہیں سوؤں گا جو کچھ آرام کرنا ہو گا دن کو کروں گا۔

۸) احنف بن قیسؒ کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو جلتے ہوئے چراغ پر ایک ایک ساعت کے بعد انگلی رکھتے اور کہتے تھے اب بتا فلاں وقت فلاں کام کیوں کیا تھا، فلاں چیز کیوں کھائی تھی۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر نفس سے اس قسم کا برتاؤ روا نہ رکھا جائے تو غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ‏ ‏ ‏ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو ‏ ‏ ‏ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

(ب ج:۵۶)

مجاہدہ کا معنٰی اور مفہوم

لغوی معنٰی کے اعتبار سے مجاہدہ لفظ جہد سے مشتق (Derived) ہے جس کے معنی کوشش کرنا، مشقت اُٹھانا اور سعی کرنا ہے۔ اصطلاحی طور پر مجاہدۂ نفس کے معنی تمام رذائل اور عاداتِ خبیثہ کو شکست دینے کیلئے کوشش ہے جو انسان نفس کی خواہش، مرضی اور مطالبہ کے خلاف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کیلئے اپنے نفس کو روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص ہماری راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم ضرور بالضرور اسے اپنی راہ دکھائیں گے۔ ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط ''[1] (اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (اور مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں)۔

لہٰذا اس کو شکست دیئے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ممکن نہیں اور نفس کو شکست دینے کیلئے مجاہدہ ضروری ہے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ وسلم نے فرمایا ''رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ قَالَ مُجَاهَدَةُ النَّفْسِ ''[2] (ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہیں صحابہ نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ جہادِ اکبر کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مجاہدۂ نفس ہے)۔

اس حدیث میں حضور ﷺ نے نفس کے ساتھ جہاد کو تمام غزوات سے بڑھ کر قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد کرنے میں زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی خواہشات پر قہر کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عوام وخواص صوفیاء مجاہدے کو لازم جانتے ہیں۔

تہذیبِ نفس اور مجاہدہ

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ مجاہدے کو تصوف کی اصل قرار دیتے ہیں اور مشاہدے کیلئے مجاہدے کو علت قرار دیتے ہیں۔ بعض صوفیا کا خیال ہے کہ تہذیبِ نفس کیلئے مجاہدہ ضروری ہے حقیقتِ قرب کیلئے نہیں۔

حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں: مشاہدے کیلئے مجاہدہ واقعی علت ہے کیونکہ ایسا نہ ہو تو آسمانوں سے کتب کے ذریعے شریعت کا نازل ہونا اور ان پر عمل کو واجب قرار دینا یہ تمام چیزیں باطل ہو جائیں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دین اور آخرت کے تمام احوال کسی نہ کسی علت کے ماتحت ہیں اگر علت کی نفی کر دی جائے تو تمام احکام اُٹھ جائیں گے، پھر یہ دنیا عالمِ اسباب ہے ہر بات کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، مثلاً بھوک مٹانے کیلئے کھانا کھاتے ہیں، پیاس مٹانے کیلئے پانی پیتے ہیں تو مشاہدے کیلئے مجاہدے کو علت قرار دینا اس

---

[1] العنکبوت، ۲۹:۶۹۔ [2] کشف الخفاء، حدیث ۱۳۶۲، جلد ۲، صفحہ ۳۴۵۔

میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور اسباب کو ساقط قرار دینا تعطیل ہے۔ سرکش گھوڑے کی تربیت کی جاتی ہے تو وہ آدمی کی طرح حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ وحشی پرندے کو تربیت دینے کے بعد چھوڑ دو پھر جب بلاؤ گے واپس آجائے گا۔ شکاری کتا تربیت کے بعد اپنا مارا ہوا شکار مالک کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ شرع اور رسم کا مدار بھی مجاہدے اور ریاضت پر ہے۔

دوسری جماعت جو مجاہدے کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کے قرب کا ذریعہ نہیں مانتی وہ آیت کریمہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا" کی تفسیر اس طرح کرتی ہے کہ "وَ الَّذِيْنَ هَدَيْنَا لَهُمْ جَاهَدُوْا فِيْنَا" کہ جن کو ہم ہدایت دیتے ہیں وہی ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَنْ يُّنْجُوَ اَحَدُكُمْ بِعَمَلِهٖ" (تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کے ذریعے نجات نہیں حاصل کر سکتا) عرض کیا گیا "وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ" اور آپ بھی نہیں یارسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ"[1] اور میں بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پاسکتا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ معلوم ہوا کہ مجاہدہ عمل ہے اور یہ محال ہے کہ بندے کا عمل اس کی نجات کا سبب بن سکے۔

معلوم ہوا کہ مقامِ سبقت عنایتِ الٰہی پر مبنی ہے نہ کہ مجاہدہ و ریاضت پر لیکن یہ بھی نہیں کہ جو زیادہ مجاہدہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے مامون ہو جائے بلکہ جس پر فضلِ الٰہی زیادہ ہوتا ہے وہی مقربِ بارگاہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی خانقاہ نشین مصروفِ عبادت درویش اللہ تعالیٰ سے دور ہو اور کوئی مصروفِ معصیت خراباتی (شراب خور) اس کا مقرب ہو لہٰذا سب سے بہتر بات یہی ہے کہ جس کا ایمان قوی ہے وہی مقرب ہے۔ "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o"[2] (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس (کے حضور) تک (تقرب اور رسائی کا) وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ)۔ "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ o"[3] (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اہلِ صدق (کی معیت) میں شامل رہو)۔

اہلِ مجاہدہ کی چند مثالیں

بزرگانِ دین جب نفس کو تساہل پر مائل دیکھتے تو اس کو راہِ راست پر رکھنے کیلئے بہت سی اضافی عبادات کو لازم کر لیتے۔

۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نماز باجماعت فوت ہو جانے پر اتنا مال صدقہ کیا جس کی قیمت دو لاکھ درہم بنتی تھی۔ ایک بار نمازِ فجر قضا ہوئی تو جسم کو زمین پر پٹختے رہے۔ کسی موقعہ پر نمازِ مغرب میں کچھ تاخیر ہوگئی تو

---

[1] صحیح بخاری حدیث ۵۳۴۹، جلد ۵، صفحہ ۲۱۴۷۔ [2] المآئدہ، ۵:۳۵۔ [3] توبہ، ۹:۱۱۹۔

بطورِ کفارہ دو غلام آزاد کیے۔

۲) نفس کے تساہل کا علاج ایک یہ بھی ہے کہ اہلِ مجاہدہ کے ساتھ رہے تاکہ عبادت سے رغبت ہو۔ ایک بزرگ کا بیان ہے کہ جب کبھی ریاضت میں اپنے آپ کو کچھ کم پاتا ہوں تو حضرت محمد واسع ؒ کے ہاں تھوڑی دیر کیلئے چلا جاتا ہوں۔ ان کی ایک گھڑی کی زیارت مجھے ایک ہفتہ کیلئے ریاضت کی طرف راغب اور مشتاق کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایسی صحبت میسر نہ ہو تو ایسے لوگوں کے حالات کا مطالعہ کر لے۔

۳) حضرت داؤد طائی ؒ کھانا نہ پکاتے بلکہ آٹا پانی میں گھول کر پی لیتے جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا روٹی نہ پکانے سے جو وقت بچتا ہے اتنی دیر پچاس آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر لیتا ہوں تو پھر یہ وقت روٹی پکانے میں کیوں ضائع کروں۔ ایک اور مقام پر ہے کہ آپ ؒ سے لوگوں نے کہا کہ آپ داڑھی کے بالوں میں کنگھی کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے فرمایا: کنگھی کروں تو گویا یہ ثابت کروں کہ میں مردِ فارغ ہوں۔

۴) حضرت ابو درداء ؓ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ زندگی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ایک تو یہ کہ لمبی راتوں میں سجدے کیا کروں۔ دوسرے یہ کہ لمبے دن ہوں تو پیاسا رہا کروں۔ تیسرے یہ کہ ایسے بزرگوں کی صحبت میں رہا کروں جن کی ہر بات حکمت و دانش کا نچوڑ اور پاکیزگی کی آئینہ دار ہو۔

۵) حضرت جنید بغدادی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ عجیب و غریب بات سوائے سری سقطی ؒ کے اور کسی میں دکھائی نہ دی کہ آپ اٹھانوے برس تک زندہ رہے لیکن مرنے سے پہلے کسی نے آپ کا پہلو زمین پر لگتے نہیں دیکھا یعنی جس نے بھی دیکھا ہمیشہ بیٹھے ہی دیکھا۔

۶) علقمہ بن قیس ؒ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے نفس کو کیوں مبتلائے آزار رکھا کرتے ہیں؟ فرمایا: اس لیے کہ اس سے میری دوستی ہے اور میں اسے دوزخ سے بچانا چاہتا ہوں۔ پوچھا گیا کہ نفس کو اتنی مشقت میں ڈالنا فرض تو نہیں ہے۔ فرمایا: میں کوتاہی نہیں کرتا اس لیے کہ قیامت کے دن حسرت نہ رہے کہ فلاں کام نہیں کیا۔

۷) حضرت ربیع ؓ کہتے ہیں کہ میرا جی چاہا کہ اویس قرنی ؓ کی زیارت کروں۔ میں حاضر ہوا تو نماز صبح میں مشغول تھے، جب فارغ ہوئے تو تسبیح میں لگ گئے میں نے تاوقتیکہ تسبیح ختم نہ ہو واپس ہونا پسند نہ کیا، لیکن ان کی تسبیح ظہر، عصر، مغرب حتیٰ کہ دوسرے دن صبح تک جاری رہی۔ رات کو ذرا نیند کا جھونکا سا آ گیا تو کہنے لگے اے پروردگار! میں بہت سونے والی آنکھ اور بہت کھانے والے پیٹ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: کیا تیرے لیے اتنی ہی زیارت کافی نہیں اور میں واپس چلا آیا؟

غرض کہ جہاد تو فرضِ کفایہ ہے اور نفس کے ساتھ مجاہدہ فرضِ عین ہے اسی لیے اسے جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے "قَدِمْتُمْ خَيْرَ مَقْدَمٍ وَ قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ

مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ "[1] (تمہارا واپس پلٹ کر آنا بہت بہتر ہے، تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو بندے کا اپنی خواہش کے خلاف جہاد کرنا مجاہدہ ہے)۔

عارف مناوی ؒ فرماتے ہیں: جہادِ اصغر اس دشمن کے ساتھ ہوتا ہے جو کھلم کھلا دشمن ہو اور جہادِ اکبر کا تعلق اس دشمن کے ساتھ ہے جو ہمارے اندر گھسا ہوا ہے اور نظر نہیں آتا۔ سو یہ اعظم اور اکبر جہاد ہے کیونکہ کفار کو قتل کرنا فرضِ کفایہ ہے اور نفس کے ساتھ جہاد کرنا فرضِ عین ہے اور ہر مکلف شخص اس کا ہمہ وقت پابند ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ط "[2] (یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اُسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو)۔

بے شک انسان کا بدن ایک شہر کی مانند ہے اور عقل (یعنی ادراک کرنے والی قوت) بادشاہ کی مثل ہے جو ملک کی تدبیر کرتا ہے اور حواسِ ظاہری اور باطنی کے تمام قوائے مُدرِکہ (یعنی آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ اور لطائفِ خمسہ باطنی) اس کا لاؤ لشکر ہیں اور دیگر اعضاء اس شہر کی رعایا ہیں اور نفسِ امارہ جو کہ شہوت و غضب کا منبع ہے اس دشمن کی مانند ہے جو بادشاہ کی مملکت میں فساد بپا کرنے اور رعیت کو ہلاک کرنے میں کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ پس بدنِ انسانی سرحد ہے اور نفس جو کہ کھلا دشمن ہے، اس سرحد کے اندر موجود ہے، سو جو شخص اِس دشمن کے ساتھ جہاد کرے اور اس کو یوں ہلاک کرے جیسا کہ ربّ تعالیٰ کو پسند ہے تو ایسے شخص کی بارگاہِ ایزدی میں فضیلت ہے۔ "فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ط "[3] (اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر مرتبہ میں فضیلت بخشی ہے)۔ اور اگر اس نے لشکر اور رعیت کو ضائع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے انتقام لیا جائے گا اور کہا جائے گا اے بُرے بادشاہ! تو گوشت کھاتا رہا اور دودھ پیتا رہا اور عیاشی کرتا رہا اور رعایا کا خیال نہ کیا بلکہ لشکر کو بھی تباہ کر دیا آج تجھ سے بدلہ لینے کا دن ہے۔ مذکور الصدر حدیث پاک میں اسی جہادِ اکبر کی طرف اشارہ ہے۔

۸) حضرت ابن ادھم ؒ فرماتے ہیں: سخت ترین جہاد خواہشِ نفس کے خلاف جہاد ہے، سو جس شخص نے خواہشات کے خلاف جہاد کیا تو وہ دنیا (وآخرت) کے مصائب سے نجات پا گیا۔

۹) حضرت حرالی ؒ فرماتے ہیں: جو شخص مجاہدہ کی آگ میں نہیں جلا اسے خوف کی آگ جلا کر رکھ دے گی اور جو خوف کی آگ میں نہیں جلا وہ مغلوبیت کی آگ میں جل جائے گا (یعنی نفس اس پر غلبہ پا کر ہلاک کر دے گا)۔ پس عقل مند پر لازمی ہے کہ وہ ہمہ وقت نفس کے ساتھ جہاد میں مشغول رہے اور اسے اچھی نصیحت

[1] کنز العمال، حدیث ۱۱۷۷۹، جلد ۴، صفحہ ۲۶۰۔ [2] فاطر، ۶:۳۵۔ [3] النسآء، ۹۵:۴۔

کرتا ہے، مثلاً یوں کہے "اے نفسِ مطمئن! تو سفر میں ہے اور یہ دنیا غرور کا گھر ہے اور جو مسافر زادِ راہ نہ رکھتا ہو وہ گھمبیر خطرہ میں ہوتا ہے اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔" [1]

قرآن حکیم میں ہے: "وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ○" [2] (اور آخرت (کا حُسن وزیبائش) آپ ﷺ کے رب کے پاس ہے (جو) صرف پرہیزگاروں کیلئے ہے)۔ اور تقویٰ کا معنیٰ ہے کہ خدا تجھے وہاں سے غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونا اسے پسند ہے اور وہاں تجھے موجود نہ پائے جہاں سے اس نے منع کیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس پر پورا اُترنا کتنا مشکل ہے۔ بلاشبہ جو شخص تقویٰ کے اس معیار پر پورا اُترے وہ جہادِ اکبر کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے اور بمصداق آیت قرآنی "اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے) اسے مغیثِ الٰہی کی عظیم الشان نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور مرتبۂ مشاہدہ سے نواز دیا جاتا ہے کیونکہ مشاہدہ، مجاہدہ کا ثمرہ ہے۔ اللہ کریم اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے طفیل مجاہدہ کی منازل طے کرنے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین۔

---

[1] فیض القدیر، جلد ۴، صفحہ ۵۱۱۔

[2] الزخرف، ۴۳:۳۵۔

باب نمبر ۱۸

علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کا نفس سے تعلق

تربیتِ خودی کے مراحل

تہذیب وتزکیۂ نفس کا عمل خودی کی تربیت کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ خودی براہِ راست انسان کے ظاہر و باطن کے امور کو ایک خاص نہج پر چلا کر نفس کی اصلاح کا کام کرتی ہے۔ اور اصلاحِ نفس کے ذریعے انسان کی باطنی کائنات ایک خوشگوار انقلاب سے ہمکنار ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے خودی کی نشوونما اور اس کی تربیت کے درج ذیل مراحل اپنے کلام میں بیان کیے ہیں یہ وہ مرحلے ہیں جن کو صوفیائے کرام اپنی تعلیمات اور ملفوظات میں اکثر بیان کرتے ہیں۔

۱) اطاعت　۲) ضبطِ نفس　۳) نیابتِ الٰہی

خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کیلئے اطاعتِ قانونِ الٰہی اور اتباعِ رسالت مآب ﷺ یعنی شریعتِ محمدی ﷺ کی مکمل پابندی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک قوانین خداوندی اور شریعتِ محمدی ﷺ کی اطاعت و اتباع ہی درحقیقت وہ زادِ راہ ہے جس کی بدولت مسلمان جادۂ حق پر گامزن ہو کر اپنے دامنِ مراد کو گوہرِ مقصود سے بھر لیتا ہے۔ مسلسل جدوجہد، عملِ پیہم، محنت و مجاہدہ، صبر و ثبات اور مستقل مزاجی کے ساتھ اطاعتِ الٰہی میں رواں دواں مسافر کے قدموں کے نقوش صفحۂ ہستی پر اس قدر ثبت ہوتے ہیں کہ انہیں رہتی دنیا تک کوئی مٹا نہیں سکتا۔

علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں جا بجا خوابِ غفلت میں مدہوش، اطاعتِ خداوندی سے بے نیاز اور

کسلان و بے پرواہی کے جال میں پھنسے ہوئے مردِ مسلماں کو بیدار کرنے اور اسے اپنا مقام و مرتبہ باور کرانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور اسے یہ احساس دلاتے ہیں کہ اپنے فرائض و واجبات سے سرتابی سراسر تباہی و ہلاکت اور طغیان و سرکشی ہے۔ انسانیت کے مقامِ ارفع و اعلیٰ سے اپنے آپ کو پستی اور زوال کی گہرائیوں میں گرانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ آگ بھی طغیانی و سرکشی کے باعث ایک دم اوپر اٹھتی ہے اور بالآخر راکھ بن کر بے وشت ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اطاعت و فرمانبرداری منزل سے بازیابی، کارگہِ حیات میں کامرانی و کامیابی بخشتی ہے کیونکہ ایک بے وقعت، بے حیثیت، بے بس و بیکس اور مجبور و مقہور انسان جب اطاعتِ الٰہیہ اور شریعتِ محمدی ﷺ کی راہ پر چلتا ہے تو اسے اسلام کی نگاہ میں قدر و منزلت، عزت و عظمت اور سربلندی نصیب ہوتی ہے وہی بے بس انسان شرفِ انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر رشکِ ملائک بن جاتا ہے۔ اسی مجبور انسان کے ہاتھ میں ملک و ملت کے نظام کی باگ ڈور تھما دی جاتی ہے اسے اختیارات کی دولت عطا کر دی جاتی ہے۔ اسرارِ خودی میں علامہؒ فرماتے ہیں۔

تو هم از بار فرائض سر متاب　　برخوری از عنده حسن المآب

(تو بھی اپنے فرائض سے سرتابی نہ کرتا کہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے مقام سے بہرہ ور ہو سکے)

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار

(اے غفلت شعار تو بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوشاں ہو کیونکہ ضبط ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے)

هر که تسخیر مه و پرویں کند　　خویش را زنجیری آئیں کند

(جس کسی نے چاند ستاروں کو مسخر کیا اس نے پہلے اپنے آپ کو کسی آئین کا پابند بنایا)

باد را زندان گل خوشبو کند　　قید بو را نافهٔ آهو کند

(ہوا پھول کے قید خانے میں رہ کر خوشبو بن جاتی ہے اور خوشبو قید ہو کر آہو کا نافہ بن جاتی ہے)

می زند اختر سوئے منزل قدم　　پیش آئینے سر تسلیم خم

(ستارہ قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتا ہے)

سبزه بر دین نمو روئیده است　　پائمال از ترک آں گردیده است

(سبزہ اگنے کے قانون کی پابندی کرتے ہوئے اگتا ہے اور جب اس قانون کو چھوڑ دیتا ہے تو پامال ہو جاتا ہے)

لاله پیهم سوختن قانونِ او　　بر جهد اندر رگ او خونِ او

(گلِ لالہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلتا رہتا ہے، اس کی رگوں کے اندر اس کا خون بھڑکتا ہے)

قطره ها دریاست از آئینِ وصل　　ذره ها صحراست از آئینِ وصل

(وصل کے قانون کی پابندی کرتے ہوئے قطرے دریا اور ذرے صحرا بن جاتے ہیں)

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　　　تو چرا غافل زایں ساماں روی

(ہر چیز کی حقیقی پختگی آئین سے ہے، تو کیوں اس حقیقت سے بے خبر ہے)

باز اے آزاد دستورِ قدیم　　　زینتِ پا کن ہماں زنجیر سیم

(اے پرانے آئین (شریعت مطہرہ) سے آزاد شخص، اپنے آپ کو اسی نقرئی زنجیر کا پابند بنا)

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو　　　از حدود مصطفیٰ بیروں مرو

(قانون کی سختی کی شکایت نہ کر، مصطفیٰ ﷺ کے قانون سے سرتابی نہ کر) (ا۔ر:۴۱)

ضبطِ نفس علامہ اقبالؒ کی نظر میں

خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے۔ نفس کی پوشیدہ اور گہری خصوصیات سے مطلع ہو کر اس کی کمزوریوں پر قابو پانا ضبطِ نفس کہلاتا ہے۔ انسان کا نفس امارہ اسے ہمہ وقت بدی، شر اور فساد کی طرف راغب کرتا رہتا ہے۔

مرتبۂ کمال تک پہنچنے کیلئے نفسِ امارہ کو مغلوب کرنا ازبس ضروری ہے۔ نفسِ امارہ کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ خود پرور اور خود پرست، سرکش اور خودسر ہوتا ہے۔ مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ نفس کی لگام کو اپنے قابو میں رکھے کیونکہ نفس کو مکمل طور پر مغلوب کر لینے سے ہی انسان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے نفس کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتا اس پر حکومت نہیں کر سکتا، اس کو اپنے زیرِ فرمان نہیں لا سکتا تو گویا وہ دوسروں کا غلام ہو جاتا ہے وہ اس طرح کہ نفسانی خواہشات اس پر غالب آ جاتی ہیں اور ان کی تکمیل کیلئے انسان طرح طرح کی ہرزہ سرائی اور حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ اس طرح دوسروں کا دستِ نگر اور غلام بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اسرار و رموز میں اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسان کو خبردار کیا۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است　　　خود پرست و خود سوار و خود سر است

(تیرا نفس اونٹ کی طرح اپنی پرورش میں لگا رہتا ہے ساتھ ہی وہ خود پرست، خود سوار اور سرکش ہے)

ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں　　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

(جو اپنے (نفس کے) اوپر حکم نہیں چلاتا اسے دوسروں کی حکم برداری کرنا پڑتی ہے)

مرد شو آور زمام او بکف　　　تا شوی گوہر اگر باشی خذف

(تو مرد بن اور اس (اپنے نفس) کی باگ سنبھال تا کہ اگر تو کنکر بھی ہے تو گوہر بن جائے) (ا۔ر:۴۲)

علامہ اقبالؒ کے بیان کردہ تصور ''ضبطِ نفس'' کے مطابق مشیتِ ایزدی نے حضرت انسان کی فطرت میں خوف و محبت کے جذبات کی آمیزش کر دی ہے، جو انسانی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے

بے شمار پہلو ہیں خوف کے جذبے میں خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جان اور خوفِ مصائب اور طرح طرح کے دوسرے غم والم شامل ہیں جبکہ محبت میں مال ودولت کی محبت، بیوی بچوں کی محبت، رشتہ وقرابت کی محبت، عزت وآبرو اور جاہ ومنصب کی محبت اور وطن وملک کی محبت شامل ہیں۔ انسان کے نفس میں موجود خوف ومحبت کی اس آمیزش کی اگر مناسب تہذیب وتربیت نہ کی جائے تو انسان کی روحانی واخلاقی اور سماجی ومعاشرتی ترقی کے عمل میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے۔ مال ودولت کی محبت انسان کو حریص اور سنگدل، اہلِ خانہ کی محبت بزدل اور کم ہمت بنا دیتی ہے اور دنیا کا خوف قلب ونظر کا ایسا روگ ہے جس کی موجودگی میں روحانی یا اخلاقی صحت وترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر چونکہ انسان کا بدن جو پانی اور مٹی کے امتزاج سے بنا ہے اس کا خمیر خیر وشر سے مرکب ہے اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کے دونوں عنصر موجود ہیں مگر نفسِ امارہ بدن میں نیکی کی صلاحیتوں کو مغلوب کر کے فواحش ومنکرات کا تسلط پیدا کر دیتا ہے۔

طرح تعمیر تو از گِل ریختند　　با محبت خوف را آمیختند

(تیری تعمیر مٹی سے کی گئی ہے، اور تیرے اندر محبت اور خوف کی آمیزش رکھی گئی ہے)

خوف دنیا خوف عقبیٰ خوف جاں　　خوف آلام زمین و آسماں

(دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف، زمین وآسمان کے مصائب کا خوف)

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن　　حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

(دوسری طرف مال ودولت کی محبت، وطن کی محبت، خویش اقرباء کی محبت، عورت کی محبت)

امتزاج ماء و طیں تن پرور است　　کشتۂ فحشاء هلاك منكر است

(پانی اور مٹی کے امتزاج سے بدن کی پرورش ہے، اور پھر یہ بدن بے حیائی اور ناپسندیدہ کاموں کا شکار ہوجاتا ہے) (۱ر:۴۲)

نفسِ امارہ کی فریب کاریوں کے باعث بے حیائی اور ناپسندیدہ امور، فواحش اور خوف ومحبت کے جذبات کا نقصان دہ پہلو اور زہرناکی کیا ہے؟ ہم کس طرح ان جذبات کی بے اعتدالیوں کو اعتدال میں اور سرکشیوں کو ضبط وقابو میں رکھ سکتے ہیں؟ اس کا علاج علامہ اقبالؒ نے توحید کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک توحید کے اثرات انسان کے قلب وباطن میں راسخ ہو جائیں تو اس کے نفس سے خوف ومحبت کی تمام ادنیٰ اور مضر صورتیں محو ہو جاتی ہیں کیونکہ توحید وہ قوت ہے جو انسان کو حیوانی جبلّت پر غلبہ وتسلط بخشتی ہے۔ اسی آفاقی قوت سے خوف کا فطری جذبہ مغلوب ومرعوب ہو جاتا ہے اور توحید کا پرستار باطل کی بڑی بڑی قوتوں کے سامنے بھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ دوسری طرف محبت کا ادنیٰ تقاضا جو جان ومال اور زن واولاد کی قربانی سے باز رکھتا ہے۔ ابراہیمی توحید پرست کی نظر میں یہ تقاضے کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ ہر قسم کی محبت ورغبت کو بالائے طاق

رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھنے سے نہیں گھبراتا۔یہی وجہ ہے کہ اگر تمہارے پاس لَآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ کا عصا ہے تو تم ہر خوف پر غالب آسکتے ہو۔جس شخص کے دل میں توحید اس قدر رچ بس جائے جیسے جسم کے اندر روح ہوتی ہے اس کی گردن باطن کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتی خوف توحید پرست کے سینے میں راہ نہیں پاسکتا جو کوئی لَآاِلٰہَ اِلَّاالـلّٰہُ کی تعلیم میں آباد ہو جاتا ہے۔وہ زن واولاد کی بے جا بندشوں اور رغبتوں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔وہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔وہ یک وتنہا ہو کر بھی اپنے دشمنوں اور شیطانی قوتوں کے خلاف ایک لشکر سپاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔جان اس کی نظر میں ہوا سے زیادہ ارزاں اور کم قیمت ہوتی ہے۔علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں اسی تصور کو یوں بیان کیا ہے ۔

تا عصائے لا اله داری بدست ہر طلسم خوف را خواہی شکست

(جب تک اپنے ہاتھ میں لا الہ کا عصا رکھے گا تو ہر قسم کے خوف کے جادو کو توڑ دے گا)

ہر که حق باشد چو جاں اندر تنش خم نہ نگردد پیش باطل گردنش

(جس کے اندر حق تعالیٰ جاں کی طرح بسا ہوا ہو اس کی گردن باطن کے آگے نہیں جھکتی)

خوف را در سینۂ او راه نیست خاطرش مرعوب غیر الله نیست

(ایسے شخص کے سینے میں خوف کی گنجائش نہیں اس کا دل کبھی غیر اللہ سے مرعوب نہیں ہوتا)

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد فارغ از بند زن و اولاد شد

(جو کوئی توحید کی ولایت میں آباد ہوتا ہے وہ زن واولاد کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے)

می کند از ما سوی قطع نظر می نہد ساطور بر حلق پسر

(ایسا شخص غیر اللہ سے لاتعلق ہو جاتا ہے پھر وہ بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ دیتا ہے)

بایکی مثل ہجوم لشکر است جاں بچشم او زباد ارزاں ترست

(ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا یوں ہے جیسے کثیر لشکر کے ساتھ ہو اس کی نظر میں جاں ہوا سے بھی ارزاں ہوتی ہے) (ا۔ر۴۲)

اگر انسان حقیقی معنوں اور تقاضوں کے ساتھ توحید سے وابستہ ہو جائے ،اس کے تن من میں لآ اِلٰـہَ کے اثرات راسخ ہو جائیں تو پھر ہر وہ کام جو توحید کے منافی ہو،خداوند قدوس کی رضا وخوشنودی کے خلاف ہو اس سے باز رہنا ایک لابدّ (لازمی) امر ہوتا ہے۔پھر یہ لَآاِلٰـہَ صدف کی صورت اختیار کرتا ہے جس کے اندر نماز کا گوہر پرورش پاتا ہے۔لَآاِلٰہَ سے معمور باطن میں نماز کی چمک اور نور پیدا ہو جاتا ہے۔

نماز اگر حضورِ قلب کے ساتھ ادا کی جائے تو انسان کے نفس کو برائیوں سے نہ صرف روکتی ہے بلکہ اس کیلئے حج اصغر کا درجہ رکھتی ہے۔نماز مسلمان کے ہاتھ ایسا اسلحہ ہے جو بے حیائی،منکرات،فواحش ونواہی کو نفسِ انسانی کے قریب نہیں بھٹکنے دیتا۔روزہ نفس کو تن پروری اور سہل پسندی پر غالب کر دیتا ہے۔ادائیگی حج

مومن کی فطرت کو جلا بخشتی ہے اور قلبِ مومن کو تجلیاتِ الٰہیہ سے روشن کرتی ہے جبکہ زکوٰۃ مال و دولت کی محبت کے بت کو پاش پاش کر کے انسان کو اخوت و مساوات، ایثار و قربانی اور یکجہتی کا تصور عطا کرتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" [1] (تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے)۔

علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اپنی محبوب اور عزیز چیزوں کو راہِ خدا میں خرچ کیے بغیر تم نیکی کی حقیقت تک جو خیر و احسان کا درجۂ کمال ہے رسائی حاصل نہیں کر سکتے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا کے مستحق نہیں بن سکتے۔ محبوب اشیاء میں مال و متاع، جسم و جان اور جاہ و منصب سب داخل ہیں۔ مال و دولت کی زکوٰۃ بھی اسی زمرے میں آتی ہے جسے اسلام کا ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔ [2]

الغرض تمام عبادات سے مقصود و مدعا سرکش و باغی نفس کا تزکیہ کرنا ہے اور شریعت کی تمام پابندیاں نفسِ امارہ کو قابو کرنے کیلئے کافی ہیں بشرطیکہ انسان ان پر اچھی طرح کاربند رہے۔ اور ارکانِ اسلام کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کی خودی محکم ہو تاکہ وہ مقصدِ حیات میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی تصور کو رموزِ خودی میں خوب صورت انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔

لا الہ باشد صدف گوہر نماز　　قلب مسلم را حج اصغر نماز

(کلمہ طیبہ صدف ہے اور نماز اس کا گوہر، مومن کے قلب کیلئے نماز حج اصغر کی مانند ہے)

در کف مسلم مثال خنجر است　　قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

(نماز مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی مانند ہے، یہ بے حیائی، سرکشی اور ناپسندیدہ کاموں کو ختم کر دیتی ہے)

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند　　خیبر تن پروری را بشکند

(روزہ بھوک پیاس پر شبخوں مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑ دیتا ہے)

مومناں را فطرت افروز است حج　　ہجرت آموز و وطن سوز است حج

(حج اہلِ ایمان کے قلب کو (تجلیاتِ ذات سے) منور کر دیتا ہے، ہجرت کا سبق دیتا ہے اور وطن کی محبت جلا دیتا ہے)

طاعتے سرمایۂ جمعیتے　　ربط اوراق کتاب ملتے

(فرمانبرداری جمعیت کا سرمایہ ہے اس سے ملت کی کتاب کے اوراق مضبوط ہوتے ہیں)

---

[1] آل عمران، ۳: ۹۲۔

[2] تفسیر البیضاوی، جلد ۲، صفحہ ۶۴۔

حب دولت را فنا سازد زکوۃ ہم مساوات آشنا سازد زکوۃ
(زکوٰۃ دولت کی محبت ختم کرتی ہے نیز مساوات سے آشنا کرتی ہے)

دل ز حتّٰی تُنْفِقُوْا محکم کند زر فزاید الفت زر کم کند
(قرآن پاک کے ارشاد حتّٰی تُنْفِقُوْا پر عمل کرنے سے (زکوٰۃ دینے سے) مال بڑھتا ہے مال کی محبت کم ہوتی ہے اور زکوٰۃ دل کی تقویت کا باعث بنتی ہے)۔

ایں ہمہ اسباب استحکام تست پختہ محکم اگر اسلام تست
(یہ (مذکورہ بالا) سب تیرے استحکام کے اسباب ہیں اگر تیرا دین اسلام محکم و پختہ ہے) (ار:۴۳)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں، لا الٰہ کے ذکر سے مقصود باطل اور جھوٹے خداؤں کی نفی ہے خواہ وہ خدا آفاقی ہوں یا انفسی۔ آفاقی سے مراد (عالم خارج میں) بیرونی معبود یعنی کافروں اور فاجروں کے جھوٹے معبود، لات، ہبل، عزّیٰ وغیرہ، انفسی اور باطنی معبود سے مراد حرص و ہوس اور نفسانی خواہشات کے بت ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے شخص پر بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے جو اپنے باطن اور نفس کے معبود کی عبادت اور پیروی کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اَرَئَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ هَوٰهُ''[1] (کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے۔)

خواہشات نفسانی کے بت لاشعوری طور پر انسان کے باطن میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نفس کے معبودوں کی پوجا کرنے والا بھی طریقت میں کافر و مشرک ہی گردانا جاتا ہے۔

نفس دانی چیست کافر در وجود دوست دارد نفس را کافر یہود
(تجھے معلوم ہے نفس کیا چیز ہے؟ تیرے وجود کے اندر ایک کافر گھسا ہوا ہے۔ اس کافر نفس کو کافر اور یہودی ہی دوست رکھتے ہیں)

انسان کا نفس امارہ جو ہمہ وقت اسے بدی کی طرف راغب رکھتا ہے وہ آستین کے موذی سانپ سے زیادہ بدتر ہے۔ لہٰذا انسان کو نفس کی فریب کاریوں سے خبردار رہنا چاہیے کہیں اس کی مصیبت میں گرفتار ہو کر ایمان سے نہ ہاتھ دھو بیٹھے۔

ترا با نفس کافر کیش کاریست کہ بہر قتل تو بے شبہ ماریست
(تجھے نفس کفر شعار سے کام پڑا ہے کیونکہ وہ تیرے مار ڈالنے کیلئے بلاشبہ سانپ ہے)

اگر مارے نشستہ در آستین است بہ از نفسے کہ با تو ہم نشیں است

---

[1] الفرقان، ۲۵:۴۳۔

(اگر تیری آستین میں سانپ بیٹھ جائے تو نفسِ بدتر سے بہتر ہے کہ تیرا ہم نشیں ہے)

نفس کی فریب کاریاں

مولاناؒ نفسِ انسانی کی اس فریب کاری کی یوں مثال دیتے ہیں: حیوانی جنسی جذبہ خواب میں انسان کو کسی مہوش حور سے ہمکنار کر دیتا ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ شیطان نے حور کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کچھ لمحات وہ اصل کی طرح لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنے رختِ خواب کو آلودہ کر دیتا ہے۔ جب بیدار ہوتا ہے تو وہ نقشِ موہوم (مہوش حور) ناپید ہو جاتا ہے اور اسے سوائے دردِ سر اور آلودگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

نفسِ انسانی اس کتے کی مانند ہے جو اپنے منہ میں ہڈی دبائے پانی میں اپنے ہی عکس کو دیکھ کر اس ہڈی کو چھیننے کی کوشش میں اپنی اصل ہڈی بھی کھو بیٹھتا ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں نفس اور عقل کو زن و شوہر سمجھ لو۔ زن کا تقاضا زیادہ تر نان و نفقہ اور زینت کی طلب ہے اور نفسِ انسانی کے مطالبے بھی اسی قبیل کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرد عاقل کے تقاضے معنوی ہیں۔ نفس اور عقل کو ایک ہی وجود کے اندر رہنا پڑتا ہے اس لیے کچھ نہ کچھ کشاکش رہتی ہے کیونکہ نفس کے تقاضے اور عقل کے مطالبے باہم موافق نہیں ہوتے۔

نفس ھمچوں زن پئے چارہ گری گاہ خاکی گاہ جوید سروری

(نفس عورت کی طرح تدبیر کے درپے ہے کبھی خاک کی طرح عاجز اور کبھی بادشاہت چاہتا ہے)(م۔۱:۲۷۹)

عقل خود زیں فکرھا آگاہ نیست در دماغش جز غم اللہ نیست

(عقل ان افکار سے آگاہ نہیں ہے اس کے دماغ میں سوائے اللہ تعالیٰ کے غم کے کچھ بھی نہیں)(م۔۱:۲۷۹)

نفس کی فریب کاری کا حال یہ ہے کہ یہ قدم قدم پر انسان کو دھوکہ دیتا ہے۔ انسان اپنے اعمال صالحہ اور عبادات ایک تھیلے میں جمع کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد باطن کی آنکھ سے دیکھنے پر اسے تھیلا خالی دکھائی دیتا ہے اور سارے اعمال کو غارت پاتا ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک چوہے (اس کے نفس) نے اس تھیلے میں سوراخ کر رکھا ہے اور اندر ہی اندر سے سارا گیہوں کھا جاتا ہے۔ نفس کا محاسبہ نہ کیا جائے تو نفس کا مکر و فریب اس کے اچھے اعمال کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ بعینہ اس چوہے کی طرح ہے جو گیہوں کی پوری بوری ہضم کر جاتا ہے۔

انسان کے اندر شیطانیت اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ نفس کی خواہشوں کو پورا کرنے کیلئے تو صاحبِ اختیار بن جاتا ہے لیکن عقل کے تقاضوں کے سامنے اپنے آپ کو مجبور قرار دیتا ہے اور بے عقلی میں اضطرار کا بہانہ کرتا ہے۔

ھر چہ نفست خواست داری اختیار　　　ھر چہ عقلت خواست آری اضطرار
(نفس کی خواہشات میں اختیار ہے اور عقل کے تقاضوں میں حیلہ اور اضطرار ہے)(م-۴-۱۴۰)

مجھے میرے نفس کے حوالے کر دیا جاتا تو میں کیونکر جذبات کو بے قابو کر دینے والے ان حالات میں ثابت قدم رہتا۔ نفسِ امارہ کی تو عادت ہے کہ وہ گناہ کے خارزاروں میں انسان کو اس بے رحمی سے گھسیٹتا ہے کہ قبائے شرافت تار تار ہو جاتی ہے۔ نفس سرکش کی شرانگیزیوں سے وہ ہی بچ سکتا ہے جس پر میرا رب مہربانی فرمائے۔ اگر میں ان صبر آزما اور جانگسل آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزر آیا ہوں تو سب سن لو کہ یہ میرا کمال نہیں ہے میرے رب کا کرم ہے۔ ''وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا'' [1] (اور نہ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کیا کرو جو (بعثتِ محمدی ﷺ سے) پہلے ہی گمراہ ہو چکے تھے اور بہت سے (اور) لوگوں کو (بھی) گمراہ کر گئے)۔ ''وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'' [2] (اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو بے علم ہیں)۔ عقل انسان کو راہِ راست پر لانا چاہتی ہے تاکہ انسان اپنی منزل مقصود پر پہنچے لیکن ذرا سی غفلت سے طے کیا ہوا راستہ دوبارہ طے کرنا پڑتا ہے اور انسان بھوکے بیل کی طرح وہیں چکر کھاتا رہتا ہے۔ نفسِ امارہ سے خدا تک دو قدم کا راستہ ہے لیکن انسان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح سے بیابان میں سرگرداں گھومتا رہتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو اس قدر عزت عطا نہیں فرمائی جتنی اس شخص کو عطا فرمائی کہ جسے اپنے نفس کے ذلیل ہو جانے کا علم ہو گیا اور جو اپنے نفس کے ذلیل ہونے سے بے خبر ہوا اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ذلیل نہیں کیا۔ حضرت ابو محمد مرتعشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے حج کیے جن میں میں نے تھکان اور بھوک برداشت کی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ میرے ان حجوں میں نفس کی آمیزش تھی کیونکہ ایک بار جب میری والدہ نے پانی کا مٹکا لانے کیلئے کہا تو مجھے اس کا بہت بار محسوس ہوا اس لیے میں سمجھ گیا کہ ان حجوں میں نفس کی آمیزش تھی۔ حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا کہ مجھے جس کسی چیز کا ڈر ہوا میں نے اسے ضرور کیا۔ محمد بن فضلؒ فرماتے تھے نفس کی آرزوؤں سے نجات کا نام راحت ہے۔ حضرت ابو علی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں سے مخلوق پر آفت آتی ہے:

۱) **طبیعت کی بیماری سے:** جب ان سے پوچھا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: حرام کا مال کھانا۔

۲) **عادت پر قائم رہنے سے:** جب پوچھا گیا کہ عادت پر قائم رہنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا حرام کی

---

[1] المائدہ، ۵:۷۷۔　[2] الجاثیہ، ۴۵:۱۸۔

طرف دیکھنا، حرام سننا اور غیبت کرنا۔

۳) فسادِ صحبت: یعنی صحبت کی خرابی، جب پوچھا گیا کہ فسادِ صحبت کیا ہے؟ فرمایا جب کبھی نفس میں کوئی خواہش جوش مارے تو اس کے پیچھے ہو لینا۔

حضرت نصیر آبادیؒ فرماتے تھے کہ تمہارا نفس ہی تمہارا قید خانہ ہے جب تو اس سے نکل آیا تو تو نے ابدی راحت حاصل کر لی۔ حضرت ابوحفصؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے عیبوں کو نہیں پہچانتا وہ بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے اس لیے کہ گناہ کفر کی راہ دکھاتے ہیں۔ حضرت ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کسی چیز کو اچھا نہیں سمجھا چہ جائیکہ اس کا ثواب سمجھوں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ کسی جانور کو بھی اتنی سخت لگام کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ نفس کو ہوتی ہے۔

کسی نے ایک راہب سے پوچھا کہ کیا آپ راہب ہیں؟ کہا نہیں۔ میں تو کتے کا پاسبان ہوں۔ میرا نفس کتا ہے جو لوگوں کو کاٹتا ہے۔ لہٰذا میں نے اسے لوگوں سے نکال لیا ہے کہ وہ اس سے بچے رہیں۔ حضرت بایزیدؒ سے مروی ہے کہ میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ یا اللہ میں تجھے کیسے پاؤں؟ فرمایا اپنے نفس سے جدا ہو کر چلے آؤ۔

مولانا رومیؒ بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جو فرعون کے اصلی دشمن تھے، اور اس کا قلع قمع کرنے پر مقرر تھے وہ فرعون کے گھر میں پرورش پا رہے تھے اور فرعون خوف زدہ ہو کر بنی اسرائیل کے تمام بچوں کو قتل کر رہا تھا۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ نفسِ امارہ اس کا حقیقی دشمن، اس کے اندر پرورش پا رہا ہے لیکن انسان دوسرے انسانوں کو دشمن سمجھ کر ان سے بدسلوکی کرتا ہے حالانکہ یہ سوئے ظن اس کے اپنے نفس کا آئینہ ہوتا ہے۔ مردِ عارف اپنے اندرونی دشمن سے خبردار اور برسرِ پیکار رہتا ہے اور خواہ مخواہ دوسروں کی عیب بینی کو اپنا شیوہ نہیں بناتا۔

تو ہم از بیروں بدی با دیگراں و اندروں خوش گشتہ با نفس گراں

(تو دوسروں کی بدبینی نہ کر اور اپنے نفس کی برائیوں سے تو خوش ہوتا ہے)

اکثر انسان شیطانی وساوس اور نفس کی فریب آفرینیوں کا شکار ہو کر پوری زندگی بے مقصدیت کی نذر کر دیتے ہیں۔ جب جاہ و حبِ مال اور جب شہوات ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے اس سطحی مقصد کے حصول کیلئے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کر بیٹھتا ہے جس سے نہ تو انہیں اطمینانِ قلب کی دولت میسر آتی ہے اور نہ ہی وہ کوئی پائیدار نتیجہ اخذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ضبطِ نفس سے اصلاحِ نفس

ضبطِ نفس وہ دولت ہے اگر انسان کو حاصل ہو جائے تو اس سے سیرت کی تعمیر، تکمیل اور تشکیل آسان ہو جاتی ہے اور افراد کی تعمیرِ سیرت سے معاشرہ تہذیبِ نفس کا خوب صورت نمونہ بن سکتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ''ضبطِ نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے اور قوموں میں ہو تو سلطنتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں'' نفسانی خواہشات کا تعلق دُنیوی لذّات اور تسکین سے ہے جبکہ دنیا کی تمام چیزوں کو اللہ رب العزت نے انسان کے تصرف اور خدمت کیلئے پیدا فرمایا پھر باری تعالیٰ نے اس کے نفس کیلئے ان چیزوں کے اندر اس قدر لذت رنگینی اور تسکین و آسودگی کا سامان مہیا کیا ہے کہ انسان آخری دم تک سیر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی تشنگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر نفس کا مطالبہ ماننا شروع کر دیا جائے تو نفس کے مطالبات میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

وَالنَّفْسُ اِنْ اَعْطَيْتَهَا مَنَاهَا فَاغَرَتْ نَحْوَهَوَاهَا فَاهَا

(اگر تو نفس کی خواہشات کی تکمیل کرتا ہے تو یہ اپنی مزید خواہشات کی طرف منہ کھولے ہوئے بڑھتا چلا جائے گا)

اور اگر شروع سے نفس کی تہذیب کا عمل تیز کیا جائے اور اس کی خواہشات کو ضبط و تربیت کے مراحل سے گزارنے کی مشق کی جائے تو کوئی وجہ نہیں نفس انسان کے کنٹرول میں نہ آسکے۔

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰى حُبِّ الرَّضَاعِ وَ اِنْ تُغْطِمْهُ يَنْفَطِمِ[1]

(نفس بچے کی مانند ہے اگر تم اس کا دودھ نہ چھڑاؤ تو وہ اسی عادت پر جوان ہو جائے گا اور اگر تم اس کا دودھ چھڑا دو (تو کچھ دن رونے کے بعد) وہ دودھ پینا چھوڑ دے گا۔)

چنانچہ جس طرح روح کی حفاظت بے حد و بے حساب ذکر و فکر سے ہوتی ہے اور اسمِ ذات کے ذکر سے روح کو بالیدگی اور تقویت نصیب ہوتی ہے اسی طرح بدن کی حفاظت بھی جوانی میں ضبطِ نفس سے ہوتی ہے۔ اگر جوانی میں نفس پر قابو نہ پایا جائے تو بقول غالب: ع

آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

علامہ اقبالؒ ضبطِ نفس کو جوانی میں لازمی قرار دیتے ہوئے ''جاوید نامہ'' میں فرماتے ہیں:

حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

(ج،ن:۷۹۱)

(روح کی حفاظت بے حساب ذکر و فکر سے ہوتی ہے۔ اور بدن کی حفاظت جوانی میں ضبطِ نفس سے ہوتی ہے)

---

[1] روح المعانی، جلد ۱، صفحہ ۲۸۴۔

''پس چہ باید کرد'' میں علامہ اقبالؒ نفس کی آلائشوں میں گھرے ہوئے انسان کو اپنے اندر اعتماد و یقین کی قوت پیدا کرنے کی رغبت دیتے ہیں۔

زیستن تا کے بہ بحر اندر چُو خس　　سخت شو چوں کوہ از ضبط نفس

(تو کب تک دریا میں پڑے ہوئے تنکے کی مانند زندگی بسر کرے گا۔ضبطِ نفس سے اپنے اندر پہاڑ کی مضبوطی پیدا کر)　　(پ،چ:۳۷)

علامہ اقبالؒ اطاعت کے مفہوم کو شتر کی زندگی سے واضح کرتے ہیں کہ جس طرح اونٹ خدمت شعار ہے، اپنے کام میں ہمہ وقت مستعد رہتا ہے، صبر و استقلال اس کی عادت ہے، بارِ محمل کو اٹھائے منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ کم کھاتا ہے، کم سوتا ہے مگر مالک کا حکم ماننے میں سرتابی نہیں کرتا۔اسی طرح سے ہر مسلمان کو احکام خداوندی کی بجا آوری میں ایسی ہی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں۔ شریعت کی پابندی میں سختی کا گلہ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی حدودِ شریعت مصطفیٰ ﷺ سے باہر قدم رکھنا چاہیے۔

خدمت و محنت شعار اشتر است　　صبر و استقلال کار اشتر است

(اونٹ کا کام خدمت اور محنت ہے صبر و مستقل مزاجی اس کی خوبیاں ہیں)

گام او در راہ کم غوغا ستے　　کارواں را زورق صحرا ستے

(سفر کے دوران اس کے پاؤں آواز پیدا نہیں کرتے، یوں وہ قافلوں کیلئے ریگستان کی کشتی ہے)

نقش پایش قسمت ہر بیشۂ　　کم خورد کم خواب و محنت پیشۂ

(اس کے پاؤں کے نقوش ہر صحرا میں ملتے ہیں، تھوڑا کھانا، تھوڑا سونا اور محنت میں لگا رہنا اس کا کام ہے)

مست زیر بار محمل می رود　　پاے کوباں سوے منزل می رود

(وہ محمل کے بوجھ کے نیچے مستانہ وار رقص کرتا ہے اور وہ ٹکڑی کے پیروں کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے)　　(ا،ر:۴۰)

شکوہ سنج سختی آئیں مشو　　از حدود مصطفیٰؐ بیروں مرو

(قانون کی سختی کی شکایت نہ کر، جناب رسولِ پاک ﷺ کی حدود سے باہر نہ جا)　　(ا،ر:۴۱)

ایک روایت ہے کہ بنی تمیم کا ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں آیا تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عرض کی کہ ان سے بات کرنے کیلئے قعقاع بن معبد ؓ کو امیر بنائیے اور حضرت عمر ؓ نے عرض کی کہ نہیں اقرع بن حابس ؓ کو بنائیے۔اس گفتگو میں دونوں کی آواز بلند ہوگئی۔فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَا اَرَدْتَ اِلَّا خِلَافِيْ؟ وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَا اَرَدْتُ خِلَافَكَ[1] ''حضرت ابوبکر ؓ نے

---

[1] صحیح بخاری حدیث ۴۸۷۲، جلد ۶، صفحہ ۲۶۶۲۔

فرمایا کہ آپ تو ہمیشہ میری مخالفت کرتے رہتے ہیں اب حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصد تمہاری مخالفت نہیں"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ o"[1] (اے ایمان والو! (کسی بھی معاملے میں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو (کہ کہیں رسول ﷺ کی بے ادبی نہ ہو جائے)، بے شک اللہ (سب کچھ) سننے والا خوب جاننے والا ہے)۔ اس کے شانِ نزول میں اور بھی اقوال ہیں۔ حضرت کلبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حکم سے مراد ہے کہ قول و عمل کسی چیز میں بھی رسول ﷺ پر سبقت نہ کرو تا آنکہ حضور ﷺ ہی تم کو کسی کا حکم دیں۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ یہی طرز عمل مرید کا ہونا چاہیے یہاں تک کہ اس کا اپنا ارادہ اور اختیار باقی نہ رہے۔ ایک روز حضور ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابو درداءؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آگے آگے چل رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تَمْشِیْ اَمَامَ مَنْ ھُوَ خَیْرٌ مِّنْکَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ "[2] (تم اس کے آگے چل رہے ہو جو تم سے دنیا اور آخرت میں بہتر ہے)۔

آپؒ مزید فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ شیخ کی مجلس میں بالکل خاموش بیٹھے اور جب تک شیخ سے اجازت نہ ہو کوئی بات نہ کرے۔[3] حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ حُسنِ ادب عقل کا ترجمان ہے۔ ابو عبداللہ بن حنیفؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے شیخؒ نے فرمایا "اے فرزند! اپنے عمل کو نمک اور ادب کو آٹا بناؤ (جیسے آٹے میں نمک معمولی ہوتا ہے)۔ بعض اربابِ صدق نے فرمایا ہے کہ تصوف تمام تر ادب ہے اور ہر مقام کیلئے مخصوص ادب ہے۔[4] جو ادب کو اختیار کرتا ہے وہ مردِ کامل کی منزل کو پہنچ جاتا ہے اور جو ادب سے محروم رہتا ہے وہ مقامِ قرب سے دور اور قبولیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

از خدا جوئیم توفیق ادب — بے ادب محروم ماند از فضل رب

(ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں (کیونکہ) بے ادب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے محروم رہتا ہے) (م،۱:۳۹)

ھر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — ھر کہ خود را دید او محروم شد

(جس نے خدمت کی وہ مخدوم ہو گیا، جس نے اپنے آپ کو دیکھا وہ محروم رہتا ہے)

شہاب الدین سہروردیؒ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۳ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھائی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں بس اتنی آواز سے گفتگو کریں گے جیسے کوئی سرگوشی کرنے والا دوسرے سے کرتا ہے۔

حضرت شہاب الدینؒ فرماتے ہیں کہ پس اسی طرح شیخ کے سامنے مرید کا طرزِ عمل ہونا چاہیے کہ وہ

---

[1] الحجرات، ۴۹:۱۔ [2] علل الحدیث، عبدالرحمٰن الرازی، متوفی ۳۲۷ھ، حدیث ۲۶۶۳، جلد ۲، صفحہ ۳۸۴، دار المعرفۃ، بیروت۔

[3] عوارف المعارف، صفحہ ۵۶۰۔ [4] کشف المحجوب، صفحہ ۱۲۷۔

نہ تو بلند آواز میں گفتگو کرے نہ ہنسے اور بہت زیادہ گفتگو کرنے سے بھی گریز کرے تاوقتیکہ شیخ اجازت نہ دے۔ جب شیخ کا وقار سنجیدگی سے قلب میں جاگزیں ہوتا ہے تو زبان کو خطاب کا صحیح طریقہ آ جاتا ہے۔

''عوارف المعارف'' میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی آواز بلند تھی جب سورۂ الحجرات کی آیت نمبر ۳ نازل ہوئی تو حضرت عاصم بن عدن رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر عرض کی کہ یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ثابت رضی اللہ عنہ راستے میں بیٹھے اس لیے رو رہے ہیں کہ شاید یہ آیت میرے لیے نازل ہوئی ہے اور عین ممکن ہے کہ میرے تمام اعمال ضائع ہو جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے اصطبل میں بند پایا جہاں سے انہوں نے اس وقت تک نہ نکلنے کا تہیہ کیا تھا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو معاف نہ کر دیں۔ جب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حاضر کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس بات سے خوش نہیں کہ تم سعید بن کر زندگی گزارو اور شہید ہو کر مر جاؤ اور جنت میں داخل ہو جاؤ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ [1] (بیشک جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں (ادب و نیاز کے باعث) اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں''۔ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کیلئے چن لیا ہے)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ ہمارے سامنے سے گزرتے تو ہم دیکھتے کہ ایک اجنبی شخص ہمارے سامنے سے گزر رہا ہے اور جب مسیلمہ کذاب پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ شہاب الدین سہروردیؒ اس واقعہ کے بعد ''عوارف المعارف'' میں لکھتے ہیں کہ مرید صادق کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا شیخ اللہ اور اس کے رسول کا ایک تذکرہ ہے۔ پس اس کو اپنے شیخ پر ایسا بھروسہ اور اعتماد ہونا چاہیے جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں۔

ایہہ تن میرا جے چشمہ ہووے میں مرشد ویکھ نہ رجاں ھو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ چشماں ہک کھولاں ہک کجاں ھو
اتناں ڈٹھیاں مینوں صبر نہ آوے میں ہور کدے ول بھجاں ھو
ہک دیدار سوہنے مرشد دا باھوؒ مینوں لکھ کروڑاں حجاں ھو

نفس کی خواہشات سے بچنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ہی ممکن ہے

محبت زندہ دلوں میں ہوا کرتی ہے اور زندہ دل وہ لوگ ہیں جن کے نفوس اپنی خواہشات سے مر چکے ہیں۔ محبت اہلِ ایمان کے دلوں کی زندگی ہے اور روح کی غذا ہے۔ احوال محبت میں مقام رضا افضل

---

[1] الحجرات، ۴۹: ۳۔

ترین مقام ہے۔ جس میں محبت نہیں گویا وہ بے روح ہے۔ جب دل ماسوی اللہ تعالیٰ سے خالی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ مال و دولت اور ہر شئے سے خالی ہو جائے تو ایسے دل پر لطفِ حق کا نزول ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی کے دل کو دنیا کی محبت سے خالی پاتا ہے تو اس کو اپنی محبت سے بھر دیتا ہے۔ جس دل کو اللہ تعالیٰ دنیا اور اس کی محبت سے بھرپور پاتا ہے تو اس سے نظر پھیر لیتا ہے۔ مواہب لُدنیہ میں ہے کہ اہلِ معرفت کے نزدیک محبت ایک کیفیت ہے اور یہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک بطریق وجدان انسان پر وارد نہ ہو۔ اس کے معنی جھکنے اور ایسی چیز کی طرف مائل نہ ہونے کے ہیں جو اسے مرغوب ہو۔ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ محبوب کی خوبیوں میں گم ہونے اور اس کی ذات اور صفات میں کھو جانے کا نام محبت ہے۔ محبت کی اس تعریف کے مطالعے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ نفس کی خواہشات سے بچنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے باعث ہی ہو سکتا ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اہلِ محبت کے نفوس اپنی خواہشات سے مر چکے ہوتے ہیں اور نفس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں۔

باب نمبر ۱۹

توبہ اور تہذیبِ نفس

توبہ کا معنی ومفہوم

توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں توبہ کا یہ مفہوم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ترک کر کے اطاعت کی طرف لوٹے اور اطاعت یہ ہے کہ انسان اپنی عملی زندگی میں احکاماتِ الٰہیہ جو ہمارے سامنے شریعتِ اسلامیہ کی صورت میں موجود ہیں، کی تعمیل کرے اور نافرمانی کو ترک کرے۔

(حضرت علی ؓ کا ارشاد) توبہ ایک امان ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہمارے لیے دو امانیں ہیں۔ ایک نے پردہ کرلیا یعنی حضور نبی کریم ﷺ اور دوسری قیامت تک ہمارے ساتھ ہے یعنی توبہ۔ اگر یہ بھی نہ رہے تو ہم ہلاک ہو جائیں۔ حضرت علی ؓ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توبہ دراصل انسان کیلئے ذریعہ نجات ہے۔ توبہ سے اللہ تعالیٰ اتنا خوش ہوتا ہے جتنا کہ ایک اعرابی کا اونٹ زادِ راہ سمیت گم ہو گیا ہو اور وہ مایوسی و پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہو کہ اچانک وہ اونٹ اپنے سامان سمیت خود بخود آ جائے، جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ سے جب وہ توبہ کرتا ہے اتنا خوش ہوتے ہیں جس طرح کہ تم میں سے کسی کے پاس سواری ہو اور وہ چٹیل میدان میں سفر کر رہا ہو اور وہ سواری اس سے گم ہو جائے، اس سواری پر کھانے اور پینے کا سامان لدا ہوا ہو۔ پس وہ آدمی مایوس ہو کر

درخت کے سائے کے نیچے آئے اور سو جائے۔ (کیونکہ اسے اب زندگی کی کوئی امید نہ ہو) اچانک وہ اٹھے تو سواری اس کے قریب کھڑی ہو وہ اس کی مہار پکڑے اور خوشی کی شدت کی وجہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل جائیں "اے اللہ تعالیٰ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں" یہ الفاظ شدت خوشی سے ہوں نہ کہ اللہ کی ذات کا انکار کرتے ہوئے۔[1] خوشی کا جو یہ عالم اس اعرابی کا ہوگا اس سے زیادہ بندے کی توبہ سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔ توبہ کا اجرا تنا زیادہ ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ"[2] (مگر جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جن کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا)۔

توبہ کس طرح کی ہونی چاہیے۔ اس کو قرآن مجید نے بھی ارشاد فرمایا "یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا"[3] (اے ایمان والو! تم اللہ کے حضور رجوع کامل سے خالص توبہ کرلو)۔

اس آیت کی جو تفسیر "ضیاء القرآن" میں دی گئی ہے پیش کی جارہی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں اہلِ ایمان کو ہدایت کی جارہی ہے کہ اگر اس سے پہلے جہالت، کم فہمی یا بشری کمزوری کی وجہ سے تم سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں تو وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور صدقِ دل سے توبہ کرو تاکہ تمہارا رحیم و کریم خدا تمہارے گناہوں کے بدنما داغوں کو اپنے دامنِ کرم میں یوں چھپالے کہ کسی کو ان کا اتا پتا بھی معلوم نہ ہوسکے۔ روزِ محشر فرشتے بھی تمہارے نامۂ اعمال سے کوئی ایسی چیز پیش نہ کرسکیں جو تمہاری رسوائی کا باعث ہو۔ توبہ کرنے کے ساتھ توبہ کی قسم بھی بتادی گئی ہے اور فرمایا توبہ کرو تو توبۂ نصوحا کرو۔

توبۂ نصوحا سے مراد

توبۂ نصوحا کی تشریح میں علماء کے کم و بیش بائیس تیئیس اقوال منقول ہیں جن میں سے چند پیش خدمت ہیں اور آپ کیلئے انہی میں کفایت ہے۔

١) وہ شہد جس کو موم اور دیگر آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو اسے عسل "ناصح" (شہد خالص) کہتے ہیں۔ اگر نصوحا اس سے ماخوذ ہو تو مقصد یہ ہوگا کہ تمہاری توبہ نفاق، ریا اور کاہلی کی آلائشوں سے پاک ہونی چاہیے۔

٢) پھٹے ہوئے کپڑے کو مرمت کرنا، چاکوں کو رفو کرنا، "نصاحۃ الثوب" کہلاتا ہے۔ اگر نصوحا کا یہ ماخذ ہو تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح گناہوں سے تم نے اپنے ایمان کا لباس تار تار کر دیا ہے اور اپنے تقویٰ کے پیرہن میں چاک ڈال دیے ہیں، تو اب ایسی توبہ کرو کہ وہ چاک رفو ہو جائیں اور ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۶۹۴۷، جلد ۴، صفحہ ۲۱۰۴۔ [2] الفرقان ۲۵: ۷۰۔ [3] التحریم ۶۶: ۸۔

۴) نصوحا کی اصل نصیحت ہے۔اس وقت اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایسی توبہ کرو کہ اس کے آثار تم میں نمایاں ہو جائیں۔تم میں نمودار ہونے والی خوش آئند تبدیلی کو دیکھ کر دوسرے گنہگار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور وہ بھی اپنی غفلت وعصیاں سے آلودہ زندگی کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ تشریح لغوی معانی کے اعتبار سے ہے،اب زبان نبوت سے اس کا مفہوم سنیئے۔

سچی توبہ کیا ہے؟

حضرت معاذ بن جبل ﷛ نے عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا التَّوْبَةُ النَّصُوْحُ اے جانِ عالم ﷺ! توبۂ نصوح کس کو کہتے ہیں۔ارشاد فرمایا: ''اَنْ یَنْدَمَ الْعَبْدُ عَلَی الذَّنْبِ الَّذِیْ اَصَابَ فَیَعْتَذِرُ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی ثُمَّ لَا یَعُوْدُ اِلَیْہِ کَمَا لَا یَعُوْدُ اللَّبَنُ اِلَی الضَّرْعِ''[1] (جو گناہ بندے سے سرزد ہو اس پر نادم اور شرمسار ہو، بارگاہِ الٰہی میں معذرت طلب کرے۔جس طرح دودھ کھیری میں دوبارہ داخل نہیں ہوسکتا پھر اس سے یہ گناہ صادر نہ ہو)۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جائیں۔''اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً''[2] نیز اسلام نے جو احکامات بتائے ہیں ان کو بجالائیں کیونکہ اس قسم کے اشخاص کا دین کی اتباع کر لینے کے بغیر چارہ نہیں۔اگر خدانخواستہ زندگی میں انسان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا پہلا قدم توبہ کی طرف ہونا چاہیے، کیونکہ ایک اور جگہ پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَتُوْبُوْآ اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ''[3] (اور تم سب کے سب اللہ کے حضور توبہ کرو اے مومنو! تاکہ تم (ان احکام پر عمل پیرا ہوکر) فلاح پا جاؤ)۔اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کے وہ کام، نیکیاں اور توبہ جو نوجوانی میں کرتا ہے نہایت ہی مقبول ہوتے ہیں۔اسی کو نبی کریم ﷺ نے اس انداز سے فرمایا: ''مَا مِنْ شَیْءٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ شَابٍّ تَائِبٍ اِلَی اللّٰہِ''[4] (اللہ تعالیٰ کو نوجوانی میں توبہ کرنے والے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں)۔شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری　　وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

(جوانی میں توبہ کرنا پیغمبروں کا شیوہ ہے بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار ہوجاتا ہے)

اس کے علاوہ اللہ رب العزت نے اپنی لاریب کتاب میں توبہ کرنے والوں کو دوست ومحبوب کہا ہے۔''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ''[5] (بے شک اللہ بہت توبہ کرنیوالوں سے محبت فرماتا ہے)۔

---

[1] الدر المنثور، جلال الدین السیوطیؒ، متوفی ۹۱۱، جلد ۸، صفحہ ۲۲۷، دارالفکر، بیروت۔　[2] البقرۃ ۲:۲۰۸۔

[3] النور ۲۴:۳۱۔　[4] کنز العمال، حدیث ۱۰۲۳۳، جلد ۴، صفحہ ۹۱۔　[5] البقرۃ ۲:۲۲۲۔

شرائطِ توبہ

اہلِ سنت کے نزدیک توبہ کی تین شرائط ہیں:

۱) جن امور میں شریعت کی مخالفت کی ہے ان پر ندامت کا اظہار کرنا۔

۲) اپنی لغزش یا غلطی کو فوراً ترک کر دینا۔

۳) ارادہ کرنا کہ جو گناہ کر چکا ہے دوبارہ قطعاً نہ کرے گا۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اَلتَّوْبَۃُ النَّدَامَۃُ'' توبہ ندامت کا نام ہے۔[۱] گویا توبہ سراسر ندامت ہے اور ندامت تین اسباب سے ہوتی ہے۔

۱) ایک توبہ خوفِ عذاب سے ہوتی ہے کہ دل میں اعمالِ سیۂ کا غم ہو تو خوفِ عذاب کی وجہ سے توبہ کرے۔

۲) دوسرا جب حصولِ نعمت کا ارادہ دل پر غالب ہوتا ہے تو آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ کی نافرمانی سے حاصل نہ ہوسکے گی لہٰذا نافرمانی سے توبہ کرے۔

۳) تیسرا یہ کہ اپنے گناہوں پر اللہ سے شرم آ جائے اور گناہوں سے پشیمان ہو کر تائب ہو جائے۔

المستدرک للحاکم میں حدیث شریف ہے کہ جو بندہ اپنے گناہوں سے نادم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے استغفار سے پہلے ہی بخش دیتا ہے۔ ان تینوں کی مثالیں طوالت کی وجہ سے نہیں لکھی جا رہی ہیں۔

مقاماتِ توبہ

حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے فرمایا کہ توبہ کے تین مقام ہیں۔

۱) توبہ:

یہ عام مومنین کا مقام ہے اور یہ عذاب کے خوف کیلئے ہے اور یہ فواحش اور کبیرہ گناہوں کیلئے ہوتی ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اس کی طرف رجوع کر لیتا ہے یعنی توبہ اللہ تعالیٰ کی جھڑکیوں، تنبیہ اور وعید سے بچنے اور خوابِ غفلت سے دل کی بیداری اور اپنے حال کے عیب کو دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ جب بندہ کو اپنے برے احوال و افعال پر غور کرنے کی توفیق حاصل ہو تو ان سے خلاصی کی دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے توبہ کرنا آسان فرما دیتا ہے۔ حتیٰ کہ معصیت سے رہائی دیتا ہے اور عبادت کی حلاوت تک پہنچا دیتا ہے۔

---

[۱] کشف المحجوب، صفحہ ۴۴۸۔

۲) انابت:

یہ اولیاء اللہؒ اور مقربانِ حق کا مقام ہے۔ یہ صغیرہ گناہ اور فاسد اندیشہ سے اللہ تعالیٰ کی خالص محبت رکھنے کے باعث اس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ یہ طلب ثواب کیلئے ہے۔

۳) اوبت:

یہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا مقام ہے جیسے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ توبہ مجھ پر آسان کردی جاتی ہے یہاں تک کہ میں ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں،[1] یہ آپ ﷺ نے اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ جب کسی بلند مقام پر پہنچتے تو اس سے نیچے کے مقام کو دیکھ کر توبہ فرماتے۔ یہ فرمانِ حق کی رعایت کیلئے ہے۔

پس توبہ گناہِ کبیرہ سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں دست بردار ہونا ہے، انابت گناہِ صغیرہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اور اوبت اپنے آپ سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔

احکامِ خدا کے پیش نظر خواہش سے روگرداں ہونے والے کا گناہوں اور غلط خیالات سے بچ کر حق تعالیٰ کی محبت میں توبہ کرنے والے اور خودی کو ترک کر کے ذاتِ حق کی طرف رجوع کرنے والے میں بڑا فرق ہے۔ اصل توبہ اللہ تعالیٰ کی تنبیہات میں خوابِ غفلت سے دل کی بیداری ہے اور اپنے عیوب پر نظر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے احوال و افعال پر نظر کرتا ہے اور ان سے نجات کا متمنی ہوتا ہے تو باری تعالیٰ اسبابِ توبہ آسان فرما دیتا ہے۔ گناہوں کی سیاہ بختی سے بچا کر اسے اطاعت کی حلاوتوں سے آشنا کر دیتا ہے۔

توبہ گناہ سے نیکی کی طرف آنا ہے

جن لوگوں نے کوئی بُرا فعل کیا یا اپنی جانوں پر ظلم کیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی۔ توبہ نیکی سے زیادہ نیکی کی طرف آنا ہے۔ یہ اہلِ ہمت خصوصاً اولیاء اللہؒ کیلئے خاص ہے کیونکہ وہ معصیت کرتے ہی نہیں بلکہ وہ معمولی نیکی پر قرار پکڑنے اور راستہ میں ٹھہر جانے کو ایک حجاب خیال کرتے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ نیکی کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے ملتی ہے کہ سارا عالم تو اللہ تعالیٰ کے دیدار کی حسرت میں ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدارِ الٰہی سے توبہ کی (کیونکہ یہ دیدارِ الٰہی کی آرزو خود اپنے اختیار سے طلب کی تھی) اور پھر اپنی خودی کو ترک کر کے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا جو درجۂ محبت میں ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۹۴۸، جلد ۵، صفحہ ۲۳۲۴۔

بلند تر مقام پر ٹھہرنے سے توبہ

جیسا کہ علماء بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی رحمت ﷺ کے مقامات ہمیشہ ترقی پر تھے۔ اس لیے آپ ﷺ جب کسی مقام پر پہنچتے تھے تو اس سے نیچے کے مقام کے دیکھنے سے بھی توبہ فرماتے تھے۔

اہل السنۃ والجماعۃ اور جملہ مشائخ معرفت کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرلے اور دیگر گناہوں میں مبتلا رہے تو حق تعالیٰ اسے اس ایک گناہ سے بچنے کا ثواب عطا کرتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اسی کی برکت سے وہ باقی گناہوں سے بھی نجات حاصل کرلے۔ مثلاً ایک شخص شراب نوشی کرتا ہے اور زانی بھی ہے وہ زنا سے تائب ہوجاتا ہے مگر شراب نوشی کو ترک نہیں کرتا۔ اس کی دوا توبہ ہے باوجودیکہ دوسرے گناہ کا ارتکاب ابھی اس سے سرزد ہورہا ہے۔ جب ایک گناہ سے تائب ہوجائے تو اس پر کوئی مواخذہ اس گناہ سے متعلق نہیں ہوسکتا اور یہی چیز اس توبہ کی متحرک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کچھ فرائض ادا کرتا ہے اور کچھ نہیں کرتا یقیناً اسے ادا کردہ فرائض کا ثواب ہوگا جس طرح غیر ادا کردہ فرائض کے بدلے وہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ اگر کسی گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو یا اس کے اسباب ہی موجود نہ ہوں مگر بندہ توبہ کرے تو وہ تائب کہلائے گا کیونکہ توبہ کا ایک رکن پشیمانی ہے۔ اس توبہ سے اسے گزشتہ گناہ پر ندامت ہوگی۔ فی الحال وہ اس گناہ سے اعراض کرتا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اسباب میسر بھی ہوں تو بھی وہ ہرگز گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

وصفِ توبہ اور صحتِ توبہ کے متعلق مشائخ میں اختلاف ہے۔ سہل بن عبداللہؒ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال ہے کہ توبہ یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہوچکا ہو وہ ہمیشہ یاد رہے یعنی انسان ہمیشہ اس کے متعلق پریشان رہے۔ اگر بہت سے نیک عمل موجود ہیں تو طبیعت میں عجب پیدا نہ ہو، برے کام پر ندامت اور پشیمانی نیک اعمال سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ جو شخص معاصی کو فراموش نہیں کرتا، وہ نیک اعمال پر کبھی مغرور نہیں ہو سکتا۔

حضرت جنید بغدادیؒ اور ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے کیونکہ تائب محبوبِ حق ہوتا ہے۔ محبوبِ حق ہونے کی وجہ سے صاحبِ مشاہدہ ہوتا ہے اور مشاہدہ میں گناہ کی یاد ظلم ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے مطابق گناہوں کو بھول جانے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کی لذت بھی خیال میں نہ آئے۔

ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ درد مند است من گرچہ توبہ گفتم نشکستہ ام سبو را
(اس نکتے کو وہ دل پہچانتا ہے جو دردمند ہو میں اگرچہ توبہ کرچکا ہوں لیکن شراب کے پیالے کو ابھی نہیں توڑا ہے)

یہ کہا جاتا ہے کہ کچھ عمر گناہ میں گزر گئی کچھ یادِ گناہ میں اور مشاہدہ میں یادِ گناہ حجاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ کچھ لوگ گزشتہ گناہوں کی لذت سے مسرور ہوتے ہیں تو یہ توبہ نہ ہوئی۔ اس اختلاف کا تعلق مجاہدہ اور مشاہدہ کے اختلاف سے ہے (اس کا مفصل ذکر کشف المحجوب کے مکتبہ سہلیہ کے بیان میں ملاحظہ ہو)۔ اس باب میں لکھا ہے کہ جب تائب کو قائم بخود سمجھا جائے تو نسیانِ گناہ غفلت پر محمول کرنا پڑے گا۔ اگر تائب قائم بحق ہو تو یادِ گناہ بمنزلۂ شرک ہے۔ الغرض تائب باقی الصفت ہے تو اس کے اسرار کا عقدہ ابھی حل نہیں ہوا۔ اگر فانی الصفت ہے تو اپنی صفت کا بیان روا نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ ؑ نے باقی الصفت ہونے کے عالم میں کہا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور رسول پاک ﷺ نے فانی الصفت ہو کر کہا میں تیری ثنا بیان نہیں کر سکتا۔ مقصود یہ ہے کہ قربِ حسن میں وحشت کا ذکر تمام تر وحشت ہے۔ تائب کو خودی سے بھی دستبردار ہو جانا چاہیے۔ یادِ گناہ کا ذکر بھی فی الحقیقت خود گناہ ہے کیونکہ جب گناہ باعثِ اعراض ہے تو اس کی یاد بھی باعثِ اعراض ہونی چاہیے۔ اسی طرح غیر اللہ کا ذکر بھی حق تعالیٰ سے اعراض کرنا ہے۔ جس طرح جرم کا ذکر ہے اسی طرح جرم کو فراموش کر دینا بھی جرم ہے۔

اقسامِ توبہ

حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے فرمایا ہے کہ توبہ چھ قسم کی ہے۔ (۱) دل کی توبہ، (۲) زبان کی توبہ، (۳) کان کی توبہ، (۴) ہاتھ کی توبہ، (۵) پیر کی توبہ اور (۶) نفس کی توبہ۔

۱) دل کی توبہ

وہ فرماتے ہیں کہ توبہ کو دل سے تسلیم نہیں کرو گے اور زبان سے جب تک توبہ کا اقرار نہیں کرو گے تو توبہ درست نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ جب تک کوئی دل کو دنیا اور اس کی لذتوں اور اس کی دوستی حسد و فحش، ریا اور لہو و لعب کی گندگیوں سے صاف نہ کرے اور سچائی کے ساتھ ان معاملات سے تائب نہیں ہوگا اس کی توبہ، توبہ نہ ہوگی۔ جیسے کوئی گناہ کرتا جائے اور توبہ بھی کرتا جائے تو وہ توبہ، توبہ نہ ہوگی۔ اپنی خواہشِ نفسانی کے مطابق گناہ کرے اور پھر توبہ کرے تو اس طرح کی توبہ درست نہ ہوگی۔ جب تک کوئی کھوٹ کو دل سے باہر نہیں نکال لے گا اور تمام خراب معاملات کو پورے طور پر دل سے درست نہیں کرے گا اس کی توبہ درست نہیں ہوگی۔ جیسا کہ کلامِ پاک میں آیا ہے۔ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؀ ''[1] (اے ایمان والو! تم اللہ کے حضور رجوعِ کامل سے خالص توبہ کرلو)۔

---

[1] التحریم، ۶۶:۸۔

اور توبہ نصوح سے مراد یہی دل کی توبہ ہے جب دل کو تم نے ان دنیاوی برائیوں سے صاف کر دیا تو یہ توبہ ہوگی اور پھر تم متقی کے برابر ہو جاؤ گے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آدمی توبہ کرتا ہے تو وہ ایسے گناہ سے پاک ہو جاتا ہے کہ گویا اس سے کبھی گناہ سرزد ہوا ہی نہیں تھا۔ اس وجہ سے متقی اور تائب ایک ہی صف میں آ جاتے ہیں۔ بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ اصل توبہ دل کی توبہ ہے۔ اگر زبان سے سو ہزار مرتبہ توبہ کرو، لیکن جب تک دل سے اس کی تصدیق نہیں ہوگی تو وہ توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ توبہ کیلئے زبان سے اقرار کرنے کے ساتھ دل سے تصدیق کی جائے بعض لوگ ایسے ہیں جو زبان سے توبہ کرتے ہیں لیکن دل سے نہیں کرتے۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بیماری میں مبتلا ہو اور صبح و شام ہائے ہائے اور توبہ و استغفار کرتا رہے لیکن جونہی وہ تندرست ہو جائے تو پھر دنیا کی غفلت اور بدمستی پر اتر آئے اور توبہ کا خیال نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب ہے جو دل کی گندگیوں اور آلائشوں کی وجہ سے ہے، انسان توبہ کے ذریعے سے اس حجاب کو دُور کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب نہیں رہتا۔ چنانچہ دل کو تمام گندگیوں اور آلائشوں سے پاک کرنا چاہیے تاکہ وہ پردہ درمیان سے اٹھ جائے، لذت اور شہوت کی بجائے مشاہدہ اور مکاشفہ کے مقام پر پہنچ جائے۔

۲) زبان کی توبہ

زبان کی توبہ یہ ہے کہ ہر نامناسب کلمہ سے زبان کو دور رکھو اور بے ہودہ گفتگو نہ کرو اور واہیات گفتگو سے توبہ کرو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھو اور قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاؤ اور التجا کرو کہ خداوند میری اس زبان کو بری بات کہنے سے باز رکھ اور اس کی توبہ قبول کر اور آئندہ سوائے اپنے ذکر کے کوئی دوسری چیز زبان سے نہ نکلنے دے اور ایسی واہیات باتیں جن میں تیری رضامندی نہ ہو میری زبان سے نہ نکلیں۔ زبان کی حفاظت سے انسان ہلاکت سے بچ جاتا ہے۔

حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ سے میں نے سنا ہے کہ اللہ والوں میں سے ایک درویش سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ دس سال تک وہ ان کی خدمت میں رہے۔ اور دس سال کے عرصہ میں سوائے ایک بات کے اور کوئی نامناسب بات ان کے منہ سے نہ سنی اور وہ بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک عزیز کو سمجھایا تھا کہ اے درویش! اگر چاہتے ہو کہ سلامتی کے ساتھ عقبیٰ میں جاؤ تو نازیبا بات بولنے سے اپنی زبان کو روکو۔ بس جیسے ہی انہوں نے یہ جملہ کہا تو فوراً زبان کو ایسا کاٹا کہ خون جاری ہو گیا اور فرمایا کہ تجھ کو یہ بولنے سے کیا سروکار تھا اور اس ایک بات کے کفارہ میں بیس برس تک بات نہیں کی۔

بابا فریدؒ نے فرمایا کہ جس دن حق تعالیٰ نے چاہا کہ بنی آدم کے منہ میں زبان ڈالے تو اس نے

زبان سے فرمایا کہ اے زبان! خبردار! تیری تخلیق سے یہ غرض ہے کہ سوائے میرے نام کے تو اور کچھ نہ بولے، تجھ سے سوائے میرے کلام کے اور کچھ نہ نکلے اور اگر اس کے علاوہ تو کچھ بولی تو خود اپنے ساتھ سارے اعضاء کو بھی مصیبت میں ڈالے گی اور زبان کی تخلیق خاص کر کلامِ پاک کی تلاوت کیلئے ہوئی ہے۔

حضرت موصوف نے فرمایا کہ آدمی کے اعضاء میں سے ہر ایک عضو میں شہوت اور خواہش ملی ہوئی ہے جو کہ حجاب اور آفت کا باعث ہے۔ جب تک ان شہوتوں اور خواہشوں سے کوئی توبہ نہ کرے گا اور اپنے تمام اعضاء کو طاہر اور پاک نہ رکھے گا وہ ہرگز اپنی منزل پر نہیں پہنچے گا۔ پھر فرمایا کہ ان اعضا میں سے جن کا ذکر کیا گیا ہے اول نفس ہے کہ اس میں شہوت یعنی خواہشِ نفسانی رکھی گئی ہے۔ دوسری آنکھ ہے کہ اس میں دیکھنے کی خواہش پیدا کی گئی ہے۔ تیسرے کان ہیں کہ ان میں سننے کا احساس دیا گیا ہے۔ چوتھی ناک ہے کہ اس میں سونگھنے کی رغبت ہے۔ پانچواں تالو ہے کہ اس میں چکھنے کی اشتہاء ہے، چھٹے ہاتھ ہیں کہ اس میں پکڑنے کی صلاحیت ہے۔ ساتویں زبان ہے کہ اس میں خوشامد اور سراہنے کی عادت ہے۔ آٹھواں دل ہے کہ اس میں کوشش کرنے اور سوچنے کی طاقت ہے۔ پس حق تعالیٰ کے طلب گار کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے برے استعمال سے توبہ کرے تا کہ خدا تعالیٰ سے اس کی خوشنودی کا پیغام سنے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ تمام سعادت اور نیکیوں کا سرچشمہ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کا مالک ہوتا کہ اس کی طبیعت پر شہوت کی حکمرانی نہ ہو اور حق تعالیٰ سے مدد مانگے کہ وہ ان صفات سے متصف ہو۔ درویش کامل ہے کہ جب اس میں حال پیدا ہو جائے تو یہ درویش کا جوہر کہلاتا ہے۔ جب عالمِ نورانی سے اسرار و انوارِ تجلی الٰہی کا نزول ہوتا ہے، جب دل زبان سے اور زبان دل سے مخالفت رکھتی ہے، تو پھر انوارِ محبت اسی جگہ سے واپس لوٹ جاتے ہیں اور ایسے دل پر نازل ہوتے ہیں جس کی زبان کے ساتھ موافقت ہو۔

۴) آنکھ کی توبہ

آنکھ کی توبہ کے بارے میں آپؒ نے فرمایا آنکھ کی توبہ یہ ہے کہ انسان نہا دھو کر صاف ستھرا ہو جائے، پھر دو رکعت نفل نماز ادا کرے اور قبلہ رو ہو کر بیٹھ جائے اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھا کر التجا کرے کہ خداوند کریم! تمام نادیدنی چیزوں کو دیکھنے سے میں نے توبہ کی۔ جس چیز کو دیکھنے کا تیرا حکم ہوگا اس کے علاوہ کوئی نامناسب چیز نہیں دیکھوں گا۔

پھر فرمایا کہ بار بار آنکھ کو تمام ممنوعات اور خواہشات سے پاک رکھو تا کہ آنکھ کی توبہ قبول ہو اس واسطے کہ یہی آنکھ انسان کو خدا کے حضور تک پہنچاتی ہے اور یہی آنکھ انسان کو مصیبت میں پھنسا دیتی ہے۔

آنکھ نے آنکھ دیکھی اس لیے زاری میں ہے دِل نے کیا دیکھا، جو بن دیکھے گرفتاری میں ہے

پس اے درویش! عشق کی پہلی منزل آنکھ سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ایسے مقام کیلئے جہاں دیدارِ الٰہی کی نعمت حاصل ہوتی ہے کوشش کرے اور ہمیشہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھے تا کہ تباہ نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ حضرت زید ؓ کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے آپ ﷺ کی نظر مبارک حضرت زید ؓ پر پڑی اور آنکھ لب سے گزری۔ اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا اے اللہ کے رسول ﷺ زید کی زبان اور لوگوں سے برتر ہوگی۔ آنکھ کی توبہ کئی قسم کی ہے ایک تو حرام دیکھنے سے توبہ، دوسرے اگر کسی مسلمان بھائی کے بارے میں کسی کی غیبت کرتے دیکھ لے تو اس سے توبہ کرے کہ کیوں دیکھا اور پھر جو دیکھا ہے اس کو بھی کسی سے کہنا نہیں چاہیے۔ تیسرے جب کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھ لے تو اپنی آنکھ کو ملامت کرے کہ کیوں اس ظلم کو دیکھا اور اس کے بعد توبہ کرے۔

۴) کان کی توبہ

کان کی توبہ یہ ہے کہ تمام نامناسب باتوں کے سننے سے توبہ کرے اور بیہودہ بات نہ سنے۔ اس وقت اس کی توبہ حقیقی توبہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اے درویش! انسان کو سننے کی طاقت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ذکر سنے اور جس جگہ اللہ پاک کا کلام سنے اس کو کان میں محفوظ رکھے اور سمجھے کہ کیا حکمِ باری ہوتا ہے۔ سننے کی طاقت اسے اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہر جگہ گالی گلوچ، ہنسی ٹھٹھا، گانا بجانا اور نوحہ و ماتم کی آواز سنتا پھرے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص مذکورہ بالا چیزوں کو سنے گا اور کان میں رکھے گا، کل قیامت کے دن اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ خفیف ؒ کسی راستے سے گزر رہے تھے تو نوحہ کی آواز ان کے کان میں پڑی۔ فوراً کان میں انگلی ڈال لی۔ جب گھر میں آئے تو ایک آدمی سے کہا کہ تھوڑا سا سیسہ پگھلا کر لاؤ، ان کے حکم کے مطابق لوگ لے آئے، آپؒ نے فرمایا اس کو میرے کان میں ڈال دو، آج نہ سننے کے لائق آواز میرے کان میں پڑی ہے، آج اس گناہ کا کفارہ ادا کر لیتا ہوں تا کہ کل قیامت کا عذاب مجھ پر نہ ہو۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ فقراء نے اسی وجہ سے اپنے آپ کو دنیا اور اس کی محبت سے دور رکھا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تا کہ کوئی واہیات بات نہ سنیں اور یہی کان کی توبہ ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند گر نہ بینی سرّ حق بر من بخند

(آنکھ، کان اور زبان ایسی سی لے یعنی دنیا سے قطع تعلق ہو جا ایسے میں اگر تو حق کا راز نہ جانے تو مجھ پر ہنسی اڑا)

۵) ہاتھ کی توبہ

ہاتھ کی توبہ یہ ہے کہ کسی نہ پکڑنے کے لائق چیز کو ہاتھ میں نہ پکڑے اور تمام نامناسب چیزوں کو پکڑنے سے توبہ کر لے۔ حضرت بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ کی بدخشاں میں

ایک درویش سے ملاقات ہوگئی۔ان کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔اور وہ عرصہ تیس سال سے ایک حجرہ میں اعتکاف کیے ہوئے تھے۔خواجہ قطب الدینؒ نے ان سے پوچھا کہ اے حضرت! آپ کے ہاتھ کٹنے کا کیا ماجرا (راز) ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ میں کسی مجلس میں حاضر تھا۔صاحبِ مجلس کا ایک دانہ گیہوں ان کی اجازت کے بغیر میں نے اٹھالیا اور اس دانہ کو دو ٹکڑے کر دیا، جیسے ہی دانہ کو میں نے گرایا تو ہاتفِ غیبی کی آواز میرے کانوں میں گونجی کہ اے درویش! تم نے یہ کیا کیا دوسرے آدمی کے گیہوں کا ایک دانہ اس کی اجازت کے بغیر دو ٹکڑے کر دیا۔جیسے ہی میں نے یہ بات سنی، فوراً اس ہاتھ کو کاٹ کر باہر پھینک دیا تا کہ دوسری مرتبہ کوئی نامناسب چیز نہ اٹھائے۔اس وقت شیخ الاسلامؒ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ اللہ والوں نے ایسا کیا تب کہیں جا کر وہ مقام پر پہنچے ہیں۔

۶) پاؤں کی توبہ

پاؤں کی توبہ یہ ہے کہ نامناسب جگہ پر جانے سے توبہ کی جائے اور اس کی خواہش پر پیر باہر نہ نکالے تا کہ اس کی صحیح توبہ ہو۔

خواجہ ذوالنون مصریؒ ایک مرتبہ سفر کر رہے تھے۔سفر کرتے ہوئے وہ ایک جنگل میں پہنچ گئے جہاں ایک غار تھا۔اس غار میں ایک بزرگ اور صاحبِ نعمت درویش سے ان کی ملاقات ہوگئی۔اس درویش کا ایک پیر باہر تھا اور ایک غار کے اندر اور دونوں آنکھیں ہوا میں۔غار کے باہر جو پیر تھا وہ کٹا ہوا پڑا تھا۔خواجہ ذوالنونؒ ان کے اور نزدیک ہو گئے اور سلام کے بعد انہوں نے پوچھا کیا بات ہے۔جو اس پیر کو آپ نے کاٹ دیا۔اس بزرگ نے جواب دیا کہ اے ذوالنون! میرا قصہ بڑا طویل ہے لیکن پَیر کٹنے کا حال البتہ سن لو۔ایک روز میں غار سے باہر نکلا ہوا تھا، ایک عورت کسی ضرورت سے غار کے سامنے سے گزری، خواہشِ نفسانی نے تقاضا کیا، اسی وقت اس عورت کو پکڑنے کیلئے میں نے اس پَیر کو باہر نکالا۔وہ عورت میرے سامنے سے لاپتہ ہوگئی، فوراً میں نے اس پیر کو کاٹ کر باہر پھینک دیا۔پس اے درویش! آج چالیس برس ہو گئے ہیں کہ میں ایک پیر پر کھڑا ہوں۔آج ندامت سے حیران ہوں کہ کل قیامت کے دن کیا جواب دوں گا۔

۷) نفس کی توبہ

نفس کی توبہ یہ ہے کہ جس میں نفس کو تمام لذیذ غذاؤں، شہوات اور خواہشات سے دور رکھنا چاہیے اور تمام چیزوں سے توبہ کرنی چاہیے اور نفسانی خواہشات کے مطابق کام نہیں کرنا چاہیے۔کلام اللہ اور حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص خواہشِ نفس سے اپنے آپ کو روکے گا وہ بہشتی ہے اور اس کی جگہ بہشت ہے۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے (اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس

کو (بری) خواہشات وشہوات سے باز رکھا تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا)۔[1]

شیخ سعدیؒ نے فرمایا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد کسے را با کسے کارے نہ باشد

(بہشت وہ جگہ ہے کہ وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، وہاں کسی کو کسی سے کوئی کام نہیں ہوتا)

قبولِ توبہ

توبہ کرنے کے بعد تائب کے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا اس کی توبہ بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کا صحیح جواب اللہ تعالیٰ خواب یا مراقبہ کی حالت میں تائب کو دے دیتا ہے اور بعد میں انسانی دل میں اس قسم کی نیکی کی طرف مائل کرنے والے جذبات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوگئی ہے یا پھر توبہ کے بعد روحانی فضل کے آغاز سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں توبہ قبول ہوگئی ہے۔ بہر کیف اگر توبہ سابقہ بیان کردہ شرائط کے مطابق ہوگی اور سچے دل سے ہوگی تو ضرور قبول ہوگی۔ توبہ کا اصل تعلق انسان کے دل سے ہے۔ جس کو یہ معرفت حاصل ہوجائے کہ دل کی کیا حقیقت ہے جسم سے اس کا تعلق کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی کیا نسبت ہے۔ تو ایسا دل توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے اور دل ہی توبہ کے ذریعے عبد اور معبود کے درمیان حجاب کو دور کرتا ہے۔ دل ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر وہ گناہوں اور خطاؤں کے زنگار سے پاک صاف ہو تو اللہ تعالیٰ کے نور کی آماجگاہ ہے لیکن اگر آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو یہ گناہ آئینۂ دل کو گندہ کردیتا ہے۔ مگر انسان کی عبادت اور نیکیاں نور بن کر دل کی ظلمت اور تاریکی کو ختم کردیتی ہیں اور جب بھی ظلمت کا غلبہ ہونے لگے تو توبہ ایک ایسی عبادت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جس سے دل کی ظلمت ختم ہوجاتی ہے اور دل از سرِ نو پاک وصاف ہوجاتا ہے۔

دل کی پاکی سے دل میں ایک ایسا نور پیدا ہوجاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ انسان کی باطنی نگاہ کھول دیتا ہے اور پھر اس کی توبہ قبول ہونے کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ سے پتہ چل جاتا ہے۔

باقی اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ اگر کوئی انسان سچے دل سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ کو اللہ تعالیٰ ضرور شرفِ قبولیت بخشتے ہیں۔ مگر قبولیتِ توبہ کے بارے میں یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ توبہ کرکے برائیوں کو عملی طور پر ترک کردینا چاہیے۔ رزقِ حلال کمانا اور رزقِ حلال کھانا بھی جزوِ لازم ہے۔ اگر توبہ کرکے ساتھ ساتھ برائی بھی جاری رکھی جائے تو توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ خواہ زبان سے انسان لفظِ توبہ جتنی مرتبہ چاہے کہتا جائے کہ "اللہ

---

[1] النزعٰت، ۷۹: ۴۰، ۴۱۔

میں نے توبہ کی' ناقص توبہ قبول نہ ہوگی۔

بزرگانِ دین کے اقوالِ توبہ

بزرگانِ دین کے اقوال میں بڑی نصیحت اور دانائی کے رموز ہوتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر معرفتِ حق حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ توبہ کے متعلق اکابرینِ دین کے کچھ اقوال مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت علی ﷺ: شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ، کا توبہ کے بارے میں فرمان ہے کہ گناہ پر نادم ہونا انہیں مٹا دیتا ہے، اور نیکیوں پر مغرور ہونا انہیں برباد کر دیتا ہے۔

۲۔ اُمّ المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ ﷺ نے توبہ کے بارے میں فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، کیونکہ خدا سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں سے بچائے گا، اور جب لوگوں سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہاری کچھ پیش نہ جائے گی۔

۳۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: نے فرمایا کہ جو فاسقوں کے ساتھ نشست و برخاست (یعنی اٹھنا بیٹھنا) کرتا ہے، وہ گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے اور اسے توبہ کرنے کی توفیق نہیں رہتی۔

۴۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ: آپؒ نے فرمایا ہے کہ توبہ کے چار ستون ہیں۔ (۱) زبان سے معافی کا طالب ہونا (۲) دل سے پشیمان ہونا۔ (۳) اپنے اعضاء کو گناہ سے روکنا (۴) یہ نیت رکھنا کہ آئندہ ایسا گناہ نہیں کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ توبہ کرے اور جس گناہ سے توبہ کی ہے اس کی طرف پھر نہ لوٹے۔

۵۔ حضرت رابعہ بصریؒ: آپؒ نے فرمایا کہ صرف زبان سے توبہ کرنا جھوٹوں کا شیوہ ہے اگر خود بخود توبہ کریں تو دوسری توبہ کی حاجت نہیں رہتی۔ ایک اور جگہ آپؒ فرماتی ہیں کہ میرے استغفر اللہ کہنے میں جو عدم خلوص پایا جاتا ہے اس سے میں استغفار کرتی ہوں۔

۶۔ حضرت ذوالنون مصریؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ عام لوگ گناہ سے اور خواص غفلت سے توبہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ عوام سے ظاہر کے متعلق سوال ہوگا اور خواص سے اعمال کی حقیقت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ کیونکہ غفلت عوام کیلئے رکاوٹ اور خواص کیلئے حجاب ہوتی ہے۔ ایک اور جگہ آپؒ فرماتے ہیں کہ گناہوں کو چھوڑے بغیر توبہ کرنا جھوٹوں کی توبہ ہے۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا کہ "حَقِيْقَةُ التَّوْبَةِ أَنْ تَضِيْقَ عَلَيْكَ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ حَتّٰى لَا يَكُوْنَ لَكَ قَرَارٌ، ثُمَّ تَضِيْقُ عَلَيْكَ نَفْسُكَ" [1]

"توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے تمہارے لیے اس قدر تنگ معلوم ہو کہ تمہیں قرار حاصل نہ

[1] رسالہ قشیریہ، صفحہ ۹۶۔

ہو بلکہ تمہارا نفس بھی تمہارے لیے تنگ ہو جائے"۔

۷۔حضرت حسیب ابن ابی عطاؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن آدمی پر اس کے گناہ پیش کیے جائیں گے جو خطا اس کے سامنے آئے گی اس پر یہی کہے گا کہ میں اسی سے ڈرا کرتا تھا چنانچہ اس کا قصور اس سے معاف کر دیا جائے گا۔

۸۔حضرت ابوالحسن بوشنجیؒ: ان کا قول ہے کہ اگر گناہ کی یاد میں لذت نہ رہے تو یہ توبہ ہے گناہ کی یاد تو ندامت کی وجہ سے ہوتی ہے یا دلی خواہش کی وجہ سے۔ جب ندامت کی وجہ سے ہو تو انسان تائب ہوتا ہے۔ جب ارادت سے یاد آئے تو گناہ ہے۔ گناہ کا مرتکب ہونے میں وہ آفت نہیں جو اس کی ارادت میں ہے کیونکہ ارتکاب تو ایک بار ہو چکا ہوتا ہے مگر ارادت مستقل طور پر دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ گھڑی بھر جسم سے گناہ کرنا اتنا سنگین نہیں جتنا کہ رات دن ارادت کے گناہ میں منہمک رہنا سنگین ہے۔

۹۔شیخ سوسیؒ: آپؒ سے توبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا توبہ ہر اس چیز سے کی جاتی ہے جس کی علم نے مذمت کی ہو۔ اور جس چیز کی علم نے تعریف کی ہو اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ تعریف ظاہر و باطن دونوں میں شامل ہے اور اس کا تعلق ہر اس شخص سے ہے جسے کامل علم عطا کیا گیا ہو۔ چنانچہ علم کے سامنے جہالت اس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے طلوع آفتاب سے رات غائب ہو جاتی ہے۔

۱۰۔حضرت ابراہیم دقاقؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ توبہ یہ ہے کہ جس طرح تو پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف پشت کیے ہوئے تھا اور ادھر توبہ نہیں کرتا تھا، اب تو ہمہ تن توجہ بن جائے اور پھر اس کی طرف پشت نہ کرے۔

۱۱۔حضرت لقمانؒ: آپؒ نے فرمایا کہ جو رحم کرتا ہے اس پر رحم ہوتا ہے جو چپ رہتا ہے وہ سلامت رہتا ہے، جو بُری بات کہتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے اور جو اپنی زبان نہیں روکتا وہ ندامت اٹھاتا ہے۔

۱۲۔حضرت ابراہیم بن ادھمؒ: آپؒ نے فرمایا کہ اچھے آدمی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ بھول چوک آدمی کا کام ہے اور سب انسان، انسان نہیں ہوتے۔ انسان گزر گئے اور بھوت رہ گئے ہیں ان کو انسان کیسے جانیں جو آدمیوں کی ہتک کرتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے　　　مار و کژدم رہ گئے، کیڑے مکوڑے رہ گئے

اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں تین چیزوں میں مخفی رکھی ہیں۔ اول اپنی رضامندی کو اطاعت میں۔ پس کسی اطاعت کو حقیر مت جانو، شاید خدا کی رضامندی اسی میں ہو، دوم اپنے غضب کو معافی میں اس لیے کسی گناہ کو چھوٹا مت سمجھو، شاید اس کا غضب اسی میں ہو، سوم اپنی ولایت و دوستی کو بندوں میں مخفی کر رکھا ہے۔ لہٰذا بندوں میں سے کسی کو حقیر مت سمجھو، شاید اللہ کا ولی ہو۔

۱۳۔شیخ ابوالحسن رضویؒ: آپؒ کا قول ہے کہ توبہ یہ ہے کہ تم خدا کی یاد کے سوا ہر چیز کی یاد سے توبہ کر لو اور اس

کے سوا تمہارے دل میں کوئی چیز نہ رہے۔

۱۴۔حضرت فضیل بن عیاضؒ: آپؒ نے فرمایا کہ تم اپنی ذات کے خود وصی بنو اور دوسرے لوگوں کو اپنے لیے وصی نہ بناؤ۔ جبکہ خود تم نے اپنی زندگی میں اپنے نفس کی وصیت ضائع کر دی تو پھر تم ان دوسروں کو اس بات پر کس طرح برا کہہ سکتے ہو کہ انہوں نے تمہاری وصیت رائیگاں اور ضائع کر دی ہے۔

۱۵۔حضرت بوعلی دقاقؒ: آپؒ نے فرمایا کہ توبہ کے تین درجے ہیں۔ اول توبہ، دوم انابت، سوم اوبت۔ توبہ ابتدائی درجہ ہے، درمیانی درجہ انابت اور آخری یا انتہائی درجہ اوبت ہے۔ جس نے عذاب الٰہی کے خوف سے توبہ کی وہ صاحبِ توبہ ہے۔ جس نے ثواب کی خاطر یا عذاب سے بچنے کیلئے توبہ کی وہ صاحبِ انابت ہے اور جس نے محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں توبہ کی، ثواب کی اُمید اور عذاب سے بچنے کے اندیشہ سے نہیں، وہ صاحبِ اوبت ہے۔ اوبت انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی صفت ہے۔ انابت اولیائے مقربینؒ کی صفت ہے۔ توبہ عامۃ المسلمین کی صفت ہے۔

۱۶۔حضرت جنید بغدادیؒ: سید الطائفہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ توبہ تین معانی پر حاوی ہے۔(۱) گناہ پر پشیمانی (۲) جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اس کو دوبارہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ (۳) حقوقِ انسانی کو ادا کرنے کی کوشش۔ ایک اور مقام پر آپؒ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سری سقطیؒ کے پاس پہنچا تو میں نے ان کا رنگ پریدہ (اُڑا ہوا) پایا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو آپؒ نے فرمایا کہ ابھی ایک جوان نے مجھ سے توبہ کے بارے میں دریافت کیا، میں نے اس کو بتایا کہ توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو نہ بھولے۔ وہ نوجوان مجھ سے جھگڑنے لگا اور کہا کہ توبہ تو یہ ہے کہ اپنے گناہوں کو بھلا دے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک تو توبہ کے یہی معنیٰ ہیں جو اس جوان نے بتائے ہیں۔ حضرت سری سقطیؒ نے پوچھا کیوں، یہ معنیٰ کیوں کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں کہتا ہوں کہ جب میں رنج والم کے عالم میں ہوتا ہوں تو وہ مجھے آرام و راحت کی حالت میں لے جاتا ہے اور آرام و راحت کی حالت میں رنج والم کو یاد کرنا ظلم ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

۱۷۔حضرت ابوالحسن شاذلیؒ: آپؒ نے فرمایا کہ خواہ تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو پھر بھی توبہ و استغفار کیا کرو۔ مومنوں کی جماعت کو نہ چھوڑو، اگرچہ وہ گنہگار اور بدکار ہی کیوں نہ ہوں۔

۱۸۔حضرت ابوسعیدؒ: حضرت ابوسعیدؒ نے وصیت کی کہ خدا کا خوف اپنے اوپر لازم کرلو، ہر چیز کی خیر یہی ہے اور جہاد کرنا اپنے اوپر لازم کرلو، کہ اسلام میں رہبانیت اس کو کہتے ہیں اور قرآنِ مجید کو ہمیشہ پڑھا کرو، کہ وہ تیرے لیے زمین والوں میں نور ہو گا اور آسمان والوں میں تیری یاد رہے گی۔ اور بہتر بات کے سوا سکوت اختیار کرو کہ اس کے باعث تو شیطان پر غالب آ جائے گا۔

۱۹۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ: آپؒ نے فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ جس چیز سے توبہ کرے اسے ہمیشہ اپنا دشمن جانے جب تک بندے کے ساتھ خواہشوں میں سے کوئی خواہش رہے گی وہ ہرگز اللہ تعالیٰ تک نہ پہنچے گا۔

۲۰۔ حضرت نوریؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ توبہ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے توبہ کرلے۔

جز وصل تو دل ہر جا بستم توبہ　　　بے یادِ تو ہر جا کہ نشستم توبہ

(تیرے وصل کے سوا کسی چیز سے دل لگانے سے میں نے توبہ کی ہے تیری یاد کے بغیر کسی جگہ بیٹھنے سے میں نے توبہ کرلی ہے)

در حضرتِ تو توبہ شکستم صد بار　　　زاں توبہ کہ صد بار شکستم توبہ

(تیرے سامنے میں سو بار توبہ توڑ چکا ہوں اور اس توبہ سے بھی سو بار توبہ توڑ چکا ہوں)

خطبۂ تبوک میں ہے کہ: ''کَثْرَۃُ النَّدَامَۃِ نَدَامَۃُ الْاٰخِرَۃِ'' [1] (زیادہ شرمندگی آخرت کی شرمندگی ہے) یہ بچوں کی توبہ ہے، یہ کاملین کی توبہ ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں بھی ایسی ہی توبہ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

توبہ چوں باشد پشیماں آمدن　　　بر در حق نو مسلماں آمدن

(توبہ چونکہ پشیمان ہو کر رجوع کرنے کا نام ہے اس لیے توبہ اللہ کے دروازے پر ایک نیا مسلمان بن کر آنا ہے)

خدمتے از سر گرفتن با نیاز　　　با حقیقت روئے کردن از مجاز

(اپنے سر کو نیازمندی سے خدمت میں جھکانے کا مطلب مجاز سے حقیقت کی طرف آنا ہے)

یہ یاد رہے کہ گناہوں پر کبھی ندامت، کبھی افسوس اس لیے ہوتا ہے کہ ان سے صحت تباہ ہوگئی، مال برباد ہوگیا، عزت خاک میں مل گئی۔ اگر کوئی شخص ان وجوہات سے اپنے گناہوں پر نادم ہوتا ہے تو اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ توبہ اس وقت ہوگی جب اسے اس بات پر ندامت ہو کہ اس نے اپنے رب کریم کی حکم عدولی کی ہے، اپنے نفس امارہ کو خوش کرنے کیلئے اپنے پروردگار کو ناراض کر دیا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسا کر کے اس نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہے۔ یہ احساس اصل میں توبہ ہے۔

حقیقتِ توبہ

توبہ بھی توفیقِ الٰہی ہے اور ان لوگوں کی قسمت میں آتی ہے جن کو اعمالِ بد سے ندامت ہو اور نیکی کی طرف راغب ہونے کا دل سے متمنی ہوں۔ توبہ کی ابتدا ایک نور سے ہوتی ہے جس دل میں پیدا ہو جاتا ہے، گناہوں کا احساس ہونے لگتا ہے اور آخر دل میں بے قراری کی آگ لگ جاتی ہے۔ صحبتِ بد ترک کر کے

---

[1] حلیۃ الاولیاء، جلد ا، صفحہ ۱۳۸۔

صحبتِ صالح اختیار کرتا ہے۔

توبہ ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے۔ جیسے ہی اس سے کوئی گناہ یا غلطی سرزد ہو۔ غافل مسلمان کو غفلت سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ جو مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا وہ تقلیداً مسلمان کہلواتا ہے اس کے دل پر غفلت اور نادانی نے قبضہ کر رکھا ہوتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ غفلت اور جہالت سے توبہ کرے۔ تائب عموماً ایک دم تائب نہیں ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ کوشش کرے کہ حسد، غصہ، کینہ اور طمع وغیرہ کو ترک کرے اور ان سے ہی توبہ درکار اور واجب ہے۔ انہی سے تمام گناہ پھوٹتے ہیں۔ ان صفاتِ مذمومہ کو مجاہدات و ریاضت کے ذریعے سے ہی ترک کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان مجاہدات سے عقل کو غلبہ ملتا ہے اور خواہشات کم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وسوسے اور کچھ نفس کے ناجائز مطالبات رہ جاتے ہیں۔ جس سے توبہ واجب ہے۔ اس کے بعد غفلت اور فراموشی سے توبہ کرے اور ذکر پر مداومت اختیار کرے اور استغفار کو اپنا معمول بنائے کیونکہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

عام لوگوں کی توبہ عذاب دوزخ سے بچائے گی اور خواص کی توبہ بلندیٔ درجات کا موجب ہوگی۔ قیامت کے دِن لوگ اپنے اوپر والوں کے درجات دیکھ کر حسرت کریں گے اور اپنے اوپر والوں کو یوں دیکھیں گے جیسے ہم آسمان کے تاروں کو دیکھتے ہیں۔ جس نے اطاعت نہ کی ہوگی اسے حسرت ہوگی کہ اطاعت کیوں نہ کی اور جس نے اطاعت کی ہوگی وہ کہے گا زیادہ کیوں نہ کی۔ حضور ﷺ خود کو ارادۃً بھوکا رکھتے یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اسے ہڈیوں کے ساتھ لگا ہوا دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور آنسو میری آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ میں نے کہا میری جان آپ ﷺ پر فدا ہو اگر اس دنیا میں پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا کریں تو کیا ہے۔ فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا مجھ سے پہلے میرے بڑے بڑے اولوالعزم بھائی وہاں پہنچ چکے ہیں اور بڑے بڑے درجے، بلندیاں، عظمتیں اور سرفرازیاں انہیں حاصل ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں دنیا سے حصہ بٹانے بیٹھ جاؤں تو اس حصے سے محروم نہ رہ جاؤں جس کی وجہ سے بلند درجات حاصل ہو سکتے ہیں اور ایسا نہ ہو کہ ان کے مرتبے سے میرا مرتبہ کم ہو جائے۔ پس اپنے بھائیوں سے کم تر درجوں پر رہنے کی بجائے مجھے یہ بات کہیں زیادہ پسند ہے کہ یہاں چند روز صبر و قناعت سے کام لوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سر کے نیچے پتھر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ شیطان نے کہا کہ آپ نے تو ترکِ دنیا کا ارادہ کر رکھا تھا۔ شاید اب اس سے پشیمان ہو گئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیوں؟ کہا یہ پتھر جو سرہانے رکھا ہوا ہے، تن آسانی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا لے اسے بھی میں نے تیرے لیے اس دنیا میں چھوڑ دیا اور پتھر کو پھینک دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے نعلین مبارک میں نیا تسمہ لگوایا اور آپ ﷺ کو بھلا معلوم ہوا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا وہی پرانا تسمہ پھر سے اس میں ڈال دو۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے دودھ کا پیالہ نوش کیا تو مشتبہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے منہ میں انگلی ڈال کر قے کر دی۔ اس سے ان کو یوں تکلیف ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دودھ ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کی جان بھی باہر نکل آئے گی۔ یہ عمل فتویٰ عام کے مطابق واجب نہ تھا لیکن کسی مقام پر بھی جا کر بندہ توبہ سے بے نیاز نہیں ہو جاتا۔

انہی وجوہات کی بنا پر حضرت سلمان درازؒ فرماتے ہیں کہ بندے کی نظر اگر کسی طرف نہ بھی پڑے اور صرف اپنے اس گزرے ہوئے وقت پر آنسو بہانے لگے جو اس نے ضائع کیا ہے تو بھی حسرت اس کو مرنے تک یاد دلانے کیلئے کافی ہے، اور جس کا ماضی تو درکنار موجودہ اور آنے والا وقت بھی ضائع ہو جائے تو اس کیلئے تو اور بھی زیادہ رونے کا مقام ہے۔

حضرت ابودرداء ﷺ فرماتے ہیں ''لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا تَرَوْنَ بَعْدَ الْمَوْتِ مَا أَكَلْتُمْ طَعَامًا بِشَهْوَةٍ وَلَا شَرِبْتُمْ شَرَابًا عَلٰى شَهْوَةٍ وَلَا دَخَلْتُمْ بَيْتًا تَسْتَظِلُّوْنَ فِيْهِ وَلَحَرِصْتُمْ عَلَى الصَّعِيْدِ تَضْرِبُوْنَ صُدُوْرَكُمْ وَتَبْكُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ وَلَوَدِدْتُ اَنِّيْ شَجَرَةٌ تُعْضَدُ ثُمَّ تُؤْكَلُ''

''اگر تم دیکھ لو جو کچھ تم موت کے بعد دیکھو گے تو تم کبھی بھی شہوتِ نفس کے ساتھ نہ کھاؤ اور نہ ہی شہوت کے ساتھ پیو اور نہ ہی کسی ایسے گھر میں داخل ہو جس میں تم دھوپ سے بچ سکو۔ اور تم یقیناً مٹی کیلئے حریص ہو جاتے، اپنے سینوں کو مارتے اور اپنے آپ پر روتے۔ کاش میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا اور پھر کھا لیا جاتا۔''[1]

شیخ سعدیؒ نے اپنی غفلت کا یوں تذکرہ کیا ہے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

(چالیس سال تیری پیاری عمر گزر گئی، لیکن تیری طبیعت بچپن کی حالت سے نہ پھری)

قبولیتِ توبہ کا وقت

توبہ کس وقت کرنی چاہیے اور توبہ کی قبولیت کب ہوتی ہے اور کب نہیں اس کو قرآن و احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْاٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا''[2] (اور ایسے لوگوں کیلئے توبہ (کی قبولیت) نہیں ہے جو گناہ کرتے چلے جائیں یہاں تک

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ۱، صفحہ ۲۱۶۔

[2] النسآء ۴:۱۸۔

کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آ پہنچے تو (اس وقت) کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ ہی ایسے لوگوں کیلئے ہے جو کفر کی حالت پر مریں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

توبہ کا وقت بیان کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہؒ نے درج بالا آیت سے پہلی آیت میں موجود "ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ" کے تحت لکھتے ہیں کہ وقتِ قریب سے مراد یہ ہے کہ وہ جذبات جن سے مغلوب ہو کر اس نے یہ فعلِ بد کیا۔ جب ان کی تیزی ختم ہو جائے تو فوراً بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر توبہ کرے۔ لیکن شریعت نے موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کرنے کو صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ ضحاک سے مروی ہے کہ "كُلُّ مَا كَانَ قَبْلَ الْمَوْتِ فَهُوَ قَرِيْبٌ" یعنی ہر وہ وقت جو موت سے پہلے ہو قریب ہے، لیکن انسان اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ ابھی توبہ کی کیا جلدی ہے۔ موت سے پہلے توبہ کر لوں گا۔ کیا پتہ کہ موت اچانک ہی آ جائے۔ کیا خبر کہ پیہم نافرمانیوں کی نحوست احساسِ گناہ کا گلا ہی گھونٹ دے اور توبہ کی توفیق سے ہی محروم کر دے۔ ایک چیز یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات برتر اور اعلیٰ ہے اس چیز سے کہ اس پر کوئی چیز واجب ہو۔ ہاں جسے وہ خود محض اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر واجب کرے۔ اس طرح ایسی توبہ کے قبول کرنے کا اس نے محض اپنی مہربانی اور رحمت سے وعدہ فرمایا ہے۔ درج شدہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے آپؒ فرماتے ہیں کہ یہی لوگ انجام سے بے خبر اور خوفِ الٰہی سے بے فکر ہو کر روز و شب گناہوں میں مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت کا فرشتہ ان کا گلا دبوچ لیتا ہے اور زندگی سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور توبہ توبہ کہنے لگتے ہیں اس کو "توبۃ الیاس" کہتے ہیں یعنی مایوسی کی توبہ اور ایسی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ نیز وہ بدبخت جو کفر پر مرتا ہے ان دونوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے المناک عذاب تیار کر رکھا ہے ان کی بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے[1]

اسی آیت کے ضمن میں شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدیؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں اور توبہ کرنے میں تاخیر کرتے ہیں کہ ان کی نزعِ روح کا وقت آ جاتا ہے اور وہ امورِ غیبیہ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس وقت ان کو اضطراری طور پر اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایمان لے آئیں یا توبہ کریں تو وہ ایمان اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کو حق ماننے اور توبہ کرنے کا نام ایمان ہے۔[2]

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ" (جب تک غرغرہ موت (نزعِ روح) کا وقت نہ آئے اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ قبول کرتا رہتا ہے) [3]

---

[1] ضیاء القرآن، جلد ا، صفحہ ۳۲۹۔ [2] تبیان القرآن، جلد ۲، صفحہ ۶۱۲۔

[3] سنن ترمذی، حدیث ۳۵۳۷، جلد ۵، صفحہ ۵۴۷۔

امام ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے فرشتوں کو دیکھنے سے پہلے توبہ کرلی وہ اس کی عنقریب توبہ ہے۔ امام ابن جریرؒ اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں ضحاک سے روایت کیا ہے کہ موت سے پہلے ہر چیز عنقریب ہے۔ موت کے فرشتہ کو دیکھنے سے پہلے توبہ مقبول ہے اور موت کے فرشتہ کو دیکھنے کے بعد توبہ مقبول نہیں ہوتی [1]۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں بھی اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝" [2] (اور ہم بنی اسرائیل کو دریا کے پار لے گئے پس فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم و تعدی سے ان کا تعاقب کیا، یہاں تک کہ جب اسے (یعنی فرعون کو) ڈوبنے نے آلیا وہ کہنے لگا: میں اس پر ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس (معبود) کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں (اب) مسلمانوں میں سے ہوں (جواب دیا گیا کہ) اب (ایمان لاتا ہے؟) حالاں کہ تو پہلے (مسلسل) نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد بپا کرنے والوں میں سے تھا)۔

توبہ اگر شرائط کے مطابق ہو تو قبول ہوتی ہے۔ شبہ شرائط میں ہوسکتا ہے قبولیت میں شبہ نہیں۔ توبہ پر پختہ یقین اس کی قبولیت کا ضامن ہے۔ آدمی کا دل اور فرشتوں کا جوہر ایک ہی جنس سے ہے۔ یعنی دونوں کی اصلیت نورانی ہے۔ صفات کے لحاظ سے آئینہ ہے اور اگر زنگ سے صاف ہو تو اللہ تعالیٰ کا نور بھی اس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گناہ ظلمت بن کر دل کے آئینے پر چھا جاتے ہیں اور ہر عبادت ایک نور بن کر اس ظلمت کو مٹا دیتی ہے۔ توبہ سے دل از سر نو مصفا اور پاکیزہ ہو جاتا ہے لیکن اگر زنگ دل کے جوہر تک سرایت کر چکا ہو اور کسی کو قبول نہ کرے تو ایسا دل توبہ کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی توبہ زبان سے بے شک لاکھ بار ہوتی ہے مگر دل سے نہیں ہوتی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر گناہ کے بعد نیکی ضرور کرلیا کرو جو اس بدی کے اثر کو ضائع کردے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں تو بھی توبہ کرو گے تو قبول ہو جائے گی۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ کچھ آدمی ایسے ہوں گے کہ ان کی بخشش گناہ کی وجہ سے ہوگی یعنی وہ اپنے کیے ہوئے گناہوں پر اتنے پشیمان ہوں گے کہ اُن کی پشیمانی اُنہیں جنت کے دروازے تک لے جائے گی۔ ایسے آدمیوں کے متعلق شیطان کہے گا کہ اے کاش میں انہیں اس گناہ میں مبتلا ہی نہ کرتا۔ پھر فرمایا نیکیاں گناہوں کو اس طرح مٹا دیتی ہیں جس طرح پانی میلے کپڑے سے میل کچیل نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ [3]

اس کے بعد فرمایا کہ جب حق تعالیٰ نے ابلیس کو لعنت میں گرفتار کیا تو اس نے کہا کہ اے اللہ تعالیٰ میں تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک آدمی کی جان اس کے جسم سے نہ نکل جائے گی میں بھی اس

---

[1] الدر المنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۳۰۔　[2] یونس، ۱۰: ۹۰، ۹۱۔　[3] کشف المحجوب، صفحہ ۴۵۵۔

کے اندر موجود رہوں گا۔ حق تعالیٰ سے جواب ملا کہ مجھے اپنی عزت کی قسم ہے کہ جب تک اس کے جسم میں جان رہے گی میری طرف سے توبہ کا دروازہ اس پر مسلسل کھلا رہے گا۔

سجدہ بر کف، توبہ برلب، دل پُر از ذوق گناہ　　معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(ہتھیلی پر سجدہ اور ہونٹوں پر توبہ کرنے کے بعد بھی دل میں گناہ کی لذت کا ہونا ایسے ہے جیسے ہمارے استغفار پر ہمارا گناہ خندہ زن ہو)

اے فسق و فجور کارِ هر روزهٔ ما　　ولے پُر زحرام کاسہ و کوزهٔ ما

(ہمارے ہر روزے کا انجام فسق و فجور ہونا اور حرام سے ہمارے کاسے لبریز ہیں)

می خندد روزگار و می گرید خلق　　بر طاعت و برنماز و بر روزهٔ ما

(زمانہ ہنستا ہے اور مخلوق ہماری اطاعت و نماز اور روزے پر روتی ہے)

اللہ رب العزت کی رحمت وسیع ہے اس کا اندازہ کسی کی عقل نہیں لگا سکتی حدیث میں ہے "عَفْوُ اللّٰہِ اَکْبَرُ مِنْ ذُنُوْبِکُمْ" (اللہ تعالیٰ کی بخشش تمہارے گناہوں سے بہت بڑی ہے)۔[1]

عصیان ما و رحمت پروردگار ما　　ایں را نہایت است نہ آں را نہایت است

(ہمارے گناہ ہیں اور ہمارے پروردگار کی رحمتیں ہیں، نہ اس کی کوئی حد ہے اور نہ اُس کی کوئی حد ہے)

بنی اسرائیل کا ایک بندہ حد سے زیادہ گنہگار تھا۔ اس نے ایک عابد سے پوچھا کہ میں نے بہت گناہ کیے اور ننانوے افراد بھی قتل کیے۔ کیا میری بخشش ہو سکتی ہے؟ جواب ملا نہیں۔ اس نے عابد کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک عالم کے پاس گیا، اس نے کہا کہ تیری توبہ اس طرح قبول ہو سکتی ہے اگر تو ایسی بستی میں بود و باش اختیار کرے جہاں صالح لوگ رہتے ہیں۔ وہ شخص توبہ کرنے روانہ ہوا اور ابھی راستے میں ہی تھا کہ پیغامِ اجل آ گیا۔ عذاب اور رحمت کے فرشتوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کہ اس کی روح کو کون لے کر جائے گا۔ ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ میں اس کی روح کو لے جاؤں گا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں طرف سے زمین کی پیمائش کر لو۔ جب زمین ماپی گئی تو وہ صالحین کے علاقے میں بقدر ایک بالشت قریب ہو چکا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتے اس کی روح کو جنت میں لے گئے۔[2] اس سے معلوم ہوا حقیقت میں ندامت ہی توبہ ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام گھر سے دستبردار ہو جاؤں اور اپنے خاندان کے ان گھروں کو چھوڑ دوں جہاں بیٹھے رہ کر مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس مال کا تہائی حصہ تم دے دو، یہ کافی ہے۔ اس وقت سے صوفیاء کی یہ سنت

---

[1] کشف الخفاء، حدیث ۱۷۳۹، جلد ۲، صفحہ ۷۹۔　[2] صحیح مسلم، حدیث ۲۷۶۶، جلد ۴، صفحہ ۲۱۱۸۔

ہو گئی کہ استغفار و توبہ کے بعد توبہ کرنے والے سے تاوان (صدقہ) کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی ہے کہ استغفار کے بعد اپنے بھائی کیلئے کچھ پیش کرے۔

توبہ میں ثابت قدمی: خواجہ معین الدین چشتیؒ کا قول ہے کہ توبہ میں ثابت قدم مرید وہ ہے کہ بائیں جانب کا فرشتہ بیس سال تک اس کا کوئی گناہ لکھنے نہ پائے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں صوفیاء کا قول ہے کہ ایک مرید کیلئے توبہ واستغفار ایک لازمی اور ضروری چیز ہے یعنی گناہ کرے تو کم از کم توبہ واستغفار ضرور کرے اور توبہ واستغفار کے ہوتے ہوئے گناہ نہیں لکھے جاتے۔ صوفیاء نے وصیت کی ہے کہ سوتے وقت اپنے اوپر استغفار کو ضروری اور لازم کرلو۔ عادتِ الٰہی اسی رحمت کی بنا پر جاری ہے اور دن کے گناہ وقتِ خواب تک لکھے نہیں جاتے کہ شاید رات کو توبہ کرلے)۔

لذتِ نماز توبہ کے بعد: روایت ہے کہ ایک شخص نے ابو یزیدؒ سے کہا میں طاعت وعبادتِ الٰہی میں کچھ لذت نہیں پاتا۔ فرمایا تو طاعت کی عبادت کرتا ہے نہ کہ اللہ کی۔ یعنی سب باتوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر پھر لذت پائے گا۔ جیسے کہ روایت ہے کہ ایک آدمی نے نماز میں کہا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" اور دل میں خیال کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہے۔ آواز آئی کہ جھوٹ ہے، تو خلقت کی عبادت کر رہا ہے۔ اس نے توبہ کی اور لوگوں سے کنارہ کش ہو گیا۔ پھر نماز شروع کی اور جب اِیَّاکَ نَعْبُدُ پر پہنچا تو آواز آئی تو جھوٹا ہے۔ تُو تو ابھی مال کی عبادت کرتا ہے اس نے اپنے مال کو صدقہ وخیرات میں خرچ کر دیا۔ پھر آواز آئی کہ تُو تو ابھی کپڑوں کی عبادت کرتا ہے اس نے کپڑے بھی صدقہ کر دیے پھر جب نماز میں کھڑا ہوا تو آواز آئی کہ اب تو سچ کہتا ہے اب تو رب کی عبادت کرتا ہے۔ خواجہ حسن بصریؒ کو ایک شخص نے کہا کہ میں عبادت میں لذت نہیں پاتا فرمایا تو ایسے کی عبادت کرتا ہے جو رب سے نہیں ڈرتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو لذت ملے گی۔

سچی توبہ کا طریقہ اور نشانیاں

توبہ کی بنیاد پشیمانی پر ہوتی ہے اور تائب ہمیشہ پُر درد نظر آتا ہے۔

ھر کہ پر درد تر رخ زرد تر   ھر کہ او آگاہ تر پر درد تر

(جو زیادہ آگاہ ہے وہ درد سے لبریز ہوتا ہے اور جو درد سے آگاہ ہوا اس کا چہرہ زیادہ زرد ہوتا ہے)

حدیث شریف میں ہے کہ اہلِ توبہ کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ان کا دل رقت سے بھرپور ہوتا ہے اور دل بھی صاف ہوتا ہے۔ توبہ اس وقت ممکن ہے جب:

۱) اپنے اعمال پر پشیمان ہو۔

۲) لوگوں سے عزلت اور خاموشی اختیار کرے۔

۳) حلال پر اکتفا کرے کیونکہ مشتبہ اور مشکوک اشیاء سے کنارہ کش نہ ہوتو یہ توبہ ممکن نہیں رہتی۔

۴) اللہ تعالیٰ سے نیک اعمال کی توفیق مانگتا رہے۔

۵) نیکوں کی صحبت کو اختیار کرے۔

۶) رشوت اور غلط خواہشات کے تکلف سے سات مرتبہ ہاتھ روکے تو اس کا ترک اس کیلئے آسان ہو جائے گا۔

ماضی میں جو گناہ کیے ان میں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی تلافی کرے۔ حقوق اللہ میں جو نمازیں ادا نہ ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزے وغیرہ جو اس کے ذمہ ہیں قضا ادا کرے۔

وہ گناہ جو آنکھ، کان، ہاتھ، زبان وغیرہ سے ہوئے اور جن پر حد شرعی واجب ہے مثلاً زنا، لواطت، چوری، شراب تو ایسے گناہوں کی خفیہ توبہ کرے اور حکم سے حد لگوانے کی ضرورت نہیں اور اس کی تلافی کثرت عبادات سے کرے جو اس کا کفارہ بن جائیں گے۔ کیونکہ قرآنِ مجید کا اٹل فیصلہ ہے کہ ''اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ '' [1] (بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے ذکر کرنے والوں کیلئے)۔

توبہ کرنے والے کو چاہیے کہ گناہ سے جو خوشی اس نے حاصل کی اس کے بدلے میں تکلیف اور رنج و آزار برداشت کرے یا اتباعِ سنت میں اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے چاہے وہ کانٹے کا چبھنا ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ بعض گناہوں کا کفارہ ہوتا ہی صرف یہ ہے کہ رنج و غم و تکلیف برداشت کی جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اگر گناہ زیادہ ہوں اور عبادت اتنی نہ ہو جو اس کا کفارہ بن سکے تو حق تعالیٰ اس کے دل میں رنج پیدا کر دیتا ہے جو گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(باز آ جاؤ، باز آ جاؤ جو کچھ بھی تو ہے باز آ، اگر کافر، آتش پرست یا بت پرست ہے تو بھی باز آ)

ایں در گیہ ما در گیہ نو میدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(ہمارے پروردگار کی درگاہ ناامیدی کی درگاہ نہیں، اگر سو بار بھی توبہ توڑ چکا ہے تب بھی باز آ)

حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے والد کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں تو جواب دیا کہ اس درجہ غمگین اور ملول جیسے کسی ماں کے سو فرزند مارے گئے ہوں۔ جب حضرت

---

[1] ھود، ۱۱: ۱۱۴۔

یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ اس بے پناہ رنج وغم کا بدلہ ان کو کیا ملے گا تو جواب دیا کہ سو شہیدوں اور ماؤں کا ثواب۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ درج ذیل ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک دوست شام میں تھا جو بہت متقی تھا۔ آپ اس کی پاکیزگی کے باعث اس کو اپنا بھائی کہتے تھے۔ ایک روز شام سے ایک آدمی آیا تو آپ نے اپنے دوست کی خیریت پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تباہ ہو گیا ہے اور عیاشی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ سن کر آپ کو بہت رنج ہوا۔ فرمایا جب واپس جانے لگو تو مجھے ملتے جانا۔ روانگی کے وقت وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے کاتب کو بلایا اور فرمایا لکھو "مِنْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اِلٰی فُلَانٍ سَلَامٌ" عَلَیْکُمْ فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْکَ اللّٰهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ غَافِرُ الذَّنْبِ وَ قَابِلُ التَّوْبِ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ" [1] (یہ خط عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فلاں شخص کی طرف ہے۔ تم پر سلام ہو۔ میں تیری طرف حمد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی وہ وحدہ لاشریک ہے، گناہ معاف کرنے والا۔ سخت عذاب والا۔ بڑی قدرت والا۔ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس کی طرف سب نے لوٹنا ہے)۔

پھر خود بھی اس کی ہدایت کیلئے دعا مانگی اور حاضرینِ مجلس سے بھی دعا کروائی۔ جب یہ خط ان کے دوست کو دیا گیا تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔ روتا تھا اور خط کو بار بار پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اطاعت واتقیاد کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کی توبہ کی اطلاع ملی تو بڑے خوش ہوئے فرمانے لگے تم بھی جب اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ راہِ راست سے اس کا قدم پھسل گیا ہے تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو۔ اسے سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرو۔ ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو اور اس کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بن جاؤ۔ یعنی اگر اس پر زبانِ طعن کھولو گے اور برا بھلا کہنے لگو گے تو اپنی ضد پر پکا ہو جائے گا۔

توبہ کی لغزش کا علاج

توبہ میں اگر کوئی لغزش رہ جائے تو اس کا علاج نیچے دیا جا رہا ہے۔

۱) اگر توبہ ناقص ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو فوراً دوبارہ توبہ کرے۔

۲) آئندہ نہ توڑنے کا عہد کرے۔

۳) اس گناہ کے عذاب سے خوفزدہ رہے۔

۴) اللہ تعالیٰ کے عفو کا امیدوار رہے۔

---

[1] تخریج الاحادیث والآثار، عبداللہ بن یوسف، متوفی ۷۶۲ ھ، جلد ۳، صفحہ ۲۱۵، دار ابن خزیمہ، الریاض۔

بدنی توبہ ٹوٹنے کا کفارہ

اگر بدنی توبہ ٹوٹ جائے تو اس کا علاج نیچے دیا جارہا ہے۔

۱) ایک توبہ کے دو نفل پڑھے یا اس سے بھی زیادہ پڑھے۔

۲) ستر مرتبہ استغفار کرے اور سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَ بِحَمْدِهٖ پڑھے۔

۳) صدقہ بقدرِ توفیق دے۔

۴) ایک دن کا روزہ رکھے۔

اندازہ کرو اگر ایسا کوئی جرمانہ توبہ کے ٹوٹنے پر کرے تو کیا آئندہ توبہ توڑنے پر انسان گھبرائے گا نہیں۔ پوشیدہ گناہوں کی پوشیدہ توبہ کرے اور اعلانیہ کی اعلانیہ۔ استغفار صرف زبانی نہ ہو دل سے خوف و خجالت، عاجزی اور خشوع وخضوع سے کرے۔ مکتوبات میں ہے کہ حضرت مجددؒ نے ایک بار بیت الخلاء میں داخل ہونے کیلئے دایاں پاؤں پہلے رکھا۔ آپ واپس آئے تو نوافل پڑھے، توبہ کی اور متعدد مرتبہ استغفار پڑھا تاکہ آئندہ غلطی نہ ہو۔ ایک مرتبہ آپ کو پیشاب کی شدت کی وجہ سے غسل خانہ میں جاتے ہوئے بایاں پاؤں پہلے اندر رکھنے کا خیال نہ رہا لیکن آپ فوراً واپس آئے اور بایاں پاؤں پہلے غسل خانہ میں داخل کیا۔

توبہ پر مائل نہ ہونے کے اسباب اور ان کا علاج

اُن بدبختوں کا علاج جو توبہ کرتے ہی نہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ ان کی توبہ نہ کرنے پر کون سی چیز مانع ہے۔ ان بدقسمت توبہ نہ کرنے والوں کے اسباب چھ ہوسکتے ہیں جن کا علاج بھی پیش کیا گیا ہے۔

۱) پہلا سبب یہ کہ خدا پر ایمان ہی نہ ہو اور اگر ہو تو اتنا کمزور ہو کہ نہ ہونے کے برابر ہو۔ اس کا علاج اور بیان طویل ہے اور اسی کتاب میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے۔ ہماری تصنیف ''سوز وسازِ رومیؒ ''میں بھی اس کا مطالعہ کریں۔

۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان تو ہو مگر آخرت پر ایمان ہی نہ ہو اور انہیں اپنے وجود کی اہمیت کا اندازہ ہی نہ ہو کہ ہم کیسے عدم سے وجود میں آئے اور کس ذات نے یہ کرم فرمایا اور یہ کہ ہم چند روزہ مسافر ہیں کیونکہ یہ جہان فانی ہے۔

۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ شہوت نے انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہو اور خواہشوں سے اتنا مغلوب ہو چکے ہوں کہ اس کے ترک کی ہمت نہ رہے اور دنیاوی لذتیں نفس پر اتنی مسلط ہو چکی ہوں کہ کارِ آخرت کا خطرہ و خوف دل سے اٹھ چکا ہو۔

علاج: جب ایک شخص دنیا میں ترکِ لذت کو برداشت نہیں کرسکتا وہ آخرت میں عذابِ جہنم اور عذابِ قبر اور حشر کو کیسے برداشت کرے گا۔ ایسے آدمی نے جنت کی نعمتوں کو ترک کرنا (جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے) کس طرح برداشت کرلیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جہنم کو بنایا تو جبرائیل علیہ السلام کو کہا کہ جبرائیل ذرا اس کو دیکھو تو سہی! جب اس نے جھانکا تو کہا اے اللہ تیری عزت کی قسم کون ہوگا جو اس کا حال سن کر اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے گرد خواہشات اور شہوات کو پیدا کیا اور جبرائیل علیہ السلام سے کہا کہ اب دیکھو! انہوں نے کہا کہ شاید ہی کوئی شخص ایسا نکلے جو دوزخ میں جانے سے بچ نکلے۔

اسی طرح جب جنت کو بنایا تو جبرائیل علیہ السلام نے دیکھ کر کہا کہ کون ہے جو اس کی صفت سن کر اس کی طرف دوڑنے نہ لگے۔ [1] تب اللہ تعالیٰ نے مکروہات، تلخیوں، دشواریوں اور مشکل گھاٹیوں کو جو بہشت کی راہ میں حائل ہیں۔ بہشت کے گرداگرد پیدا کیں اور جبرائیل علیہ السلام سے کہا کہ اب دیکھو تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ تیری عزت کی قسم کوئی شخص اس میں نہ رہ سکے گا کیونکہ اس کی راہ میں جو تکالیف ہیں انتہائی دشوار اور خوفناک ہیں۔

لہٰذا ان جنت کی نعمتوں کے ترک کی بجائے خواہشات کا ترک زیادہ قریب عقل ہے۔ ایک بیمار کو کبھی ٹھنڈا پانی نقصان دہ ہوتا ہے اور اگر ایک یہودی طبیب مریض سے کہہ دے کہ ٹھنڈا پانی مت پیو ورنہ نقصان ہوجائے تو باوجود شدتِ خواہش کے مریض ٹھنڈا پانی پینا ترک کرتا ہے۔ اندازہ کریں کہ کیا دوزخ سے بچنے کیلئے خواہشات کا ترک ضروری اور اہم نہیں اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر چل کر ابدی کامیابی کو حاصل نہیں کرنا چاہیے؟ ایک لحہ اگر کوئی جنت یا دوزخ کو دیکھ لے تو تمام عمر کیلئے انسان تارک الدنیا ہوجائے۔

۴) چوتھا سبب یہ ہے کہ بندہ یہ سمجھتا ہے کہ آخرت کا سودا تو ادھار ہے اور دنیا نقد ہے۔ جس چیز کی ہمیں اب ضرورت ہے وہ حاصل ہوجائے تو کل قیامت کو جو ہوگا دیکھا جائے گا اور جو چیز آنکھوں سے دور ہو لامحالہ دل سے دور ہوجاتی ہے

مذکورہ بیماری کا علاج یہ ہے کہ ایسا سمجھنے والے کو یہ جان لینا چاہیے کہ آخرت اور دوسرا جہان دور نہیں۔ ابھی اگر ایک منٹ میں آدمی مرجائے تو اس جہاں میں پہنچ گیا۔ وہ وقت دور نہیں اس کو دور نہ سمجھو۔ اس کا اور اس دنیا کے درمیان فاصلہ ایک سیکنڈ کا بھی نہیں۔ ابھی مرجائے تو ابھی پہنچ جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نماز ایسے پڑھو جیسے یہ تمہاری زندگی کی آخری نماز ہے بلکہ یہاں تک فرمایا کہ نماز میں ایک طرف سلام پھیر لو تو یہ سمجھ لو کہ معلوم نہیں دوسری طرف منہ پھیرنے کی مہلت ہی نہ ملے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، حدیث ۴۷۴۴، جلد ۴، صفحہ ۲۳۶۔

ایک درویش کو ہزاروں درہم نذرانہ کے دیئے گئے لیکن شام تک اس نے سب کچھ بانٹ دیا اور شام کو کسی نے اس کو اپنے لیے ٹاٹ یا بوری ڈھونڈتے دیکھا تو کہا کہ صبح تو تمہارے پاس اتنا مال تھا اور تم نے سب کچھ بانٹ دیا۔ اپنے لیے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا تو اس طرح بوریا نہ ڈھونڈتے پھرتے۔ درویش نے کہا کہ مجھے تو اس بات کا یقین نہ تھا کہ شام تک زندہ رہوں گا کہ نہیں۔

۵) پانچواں سبب یہ ہے کہ ہر مسلمان تائب ہونے کا ارادہ تو ہمیشہ رکھتا ہے لیکن تاخیر اور تساہل سے کام لیتا ہے۔ توبہ ٹالتے ٹالتے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ بس ایک خواہش پوری ہو جائے تو پھر توبہ کرلوں گا اور اسی میں اکثر لوگوں کی موت آ جاتی ہے تو پھر کوئی چیز سوائے نیک اعمال کے اس کے کام نہیں آئے گی۔ امام غزالیؒ جنہوں نے یہ سب علاج تجویز کیے ہیں فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو سوچنا چاہیے کہ وہ لیت ولعل کیوں کر رہا ہے۔ موت تو ایک منٹ میں بھی آ سکتی ہے ایسا نہ ہو کہ مہلت ہی نہ مل سکے۔

حدیث شریف ہے کہ اہل دوزخ میں دہائی دینے والے زیادہ وہی لوگ ہوں گے جو توبہ کا ارادہ رکھتے تھے اور ان کو مہلت نہ ملی۔ اور یہ بھی حدیث شریف میں ہے کہ جب ملک الموت آ جائے گا تو وہ بندہ اس سے بھی مہلت مانگے گا یہاں تک کہ ایک گھڑی کی مہلت بھی اس کو نہ دی جائے گی کیونکہ ملک الموت کہے گا کہ تجھے اتنے سینکڑوں ہزاروں دنوں کی مہلت دی جا چکی ہے اب کچھ مہلت نہ دی جائے گی۔

توبہ کو کل پر ڈالنے کا معنی یہ ہے کہ آج توبہ مشکل ہے کل آسان ہو جائے گی۔ یاد رکھو جس کیلئے آج مشکل ہے کل بھی مشکل ہوگی۔ تو پھر کیوں نہ آج ہی توبہ کرلی جائے۔ کل کا کیا یقین ہے کہ زندہ بھی رہو گے یا نہیں۔ توبہ کو التوا پر ڈالنے والو اگر کل سے پہلے مر گئے تو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ آج جس حالت میں تم ہو یقیناً جہنم میں جاؤ گے۔

ترکِ شہوات اور توبہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص کل یا خاص دن نہیں مقرر کیا تو پھر کس کا انتظار ہوگا بلکہ کل تو توبہ اور بھی دشوار ہو جائے گی۔ آج اور اسی وقت توبہ کرنی چاہیے۔ جیسا کہ ایک شخص کو کہا گیا کہ اس درخت کو اکھاڑ دو۔ وہ کہنے لگا یہ درخت تو بہت مضبوط ہے اور میں کمزور ہوں اس کو اگلے سال اکھاڑ دوں گا۔ اس کو معلوم نہیں کہ اگلے سال اس کی جڑیں تو اور بھی مضبوط اور طاقتور ہو جائیں گی اور تو خود زیادہ کمزور ہو جائے گا۔ ابھی اکھاڑ پھینکا جائے تو بہتر ہے یہی خواہشات کا حال ہے۔

۶) چھٹا سبب یہ ہے کہ کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ ہمارے گناہ بخش دے گا ان سے کوئی پوچھے کہ کیا بغیر عمل کے خدا کی رحمت کی امیدیں باندھے رکھتے ہیں کتنی عجیب بات ہے؟

خدا کن کیلئے غفور و رحیم ہے

ایسے شخص کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ضرور ہے لیکن کن کیلئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے ''اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ'' [۱] (مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں اور (حق کو) ظاہر کردیں تو میں (بھی) انہیں معاف فرمادوں گا، اور میں بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہوں)۔ یا ان لوگوں پر اللہ غفور رحیم ہے جن کی سفارش مصطفیٰ ﷺ فرمادیں لیکن اس کی بھی کچھ ضروریات ہیں یعنی اپنے گناہوں کو حضور ﷺ کے سامنے پیش کرے ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا'' [۲] (اور (اے حبیب!) اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کیلئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے)۔

احادیث سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نمازی سے اس طرح ملے گا کہ نہایت غصہ میں ہوگا اور یہ بھی ہے کہ بے نمازی کا حساب کتاب بہت سختی سے ہوگا چہ جائیکہ اللہ اسے کہے کہ میں بہت غفور اور رحیم ہوں جا تجھے بغیر عمل کے معاف کردیا۔ تو پھر قرآن بھیجنے اور رسول اور ہادی بھیجنے کا مقصد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بخش سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں مگر اس نے قانون مقرر کردیے ہیں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کس طرح پیش آئے گا۔ خدا کے ڈر سے تو پیغمبر اور بڑے بڑے ولی تھر تھر کانپتے ہیں کہ خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے پاس جاؤ تو خالی ہاتھ نہ جاؤ۔ اعمال لے کر جاؤ پھر امید رکھو کہ جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ معاف کردے گا وہ بھی اگر اس کی رضامندی ہوئی تو۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سارے قرآن کریم میں تین باتیں ہیں:

۱) اوامر، یعنی یہ کام کرو۔

۲) نواہی، یعنی یہ کام مت کرو۔

۳) تم سے پہلوں نے کیا کچھ کیا اور ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا یعنی عذاب اور انعامات کی مثالیں بیان کی ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ معاذ اللہ ہم اگر ان لوگوں کی راہ پر چلیں گے جن پر عذاب ہوا تو ہمیں بھی خدانخواستہ وہ ہی کچھ نہ ملے اور اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب کی تو ان شاء اللہ اس کی رضا ضرور ملے گی۔

---

[۱] البقرۃ، ۲:۱۶۰۔ [۲] النسآء، ۴:۶۴۔

دُنیا کی حقیقت پر غور

مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں فرمایا ہے دنیا آرائش اور ابتلاء (آزمائش) کا مقام ہے، اس کے ظاہر کو مختلف ملمع سازیوں اور زینت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کی صورت کو موہوم خال وخط اور زلف ورخسار سے خوب صورت کیا گیا ہے۔ دیکھنے میں شیریں، طراوت اور تازگی کا خیال آتا ہے لیکن حقیقت میں عطر لگا ہوا مردار اور مکھیوں اور کیڑوں سے بھرا ہوا نجس خانہ اور زہر سے لبریز شکر ہے۔ اس کا باطن سراسر خراب اور ابتر ہے۔ اس کے معاملے کی گندگی، جتنا تم خیال کر سکتے ہو اس سے بھی بدتر ہے۔ اس دنیا پر فریفتہ، دیوانہ اور مسحور ہے اس کا گرفتار مجنون اور فریب خوردہ ہے۔ جو اس کے ظاہر پر فریفتہ ہو گیا وہ نقصان ابدی کے ساتھ داغدار ہو گیا اور جس نے اس کی حلاوت کے اوپر نظر کی دائمی ندامت اور شرمندگی اس کے حصے میں آئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اَلدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃُ ضَرَّتَانِ اِنْ رَضِیَتْ اِحْدٰھُمَا سَخِطَتِ الْاُخْرٰی'' [1] (دُنیا اور آخرت دو سوکنوں کی طرح ہیں، اگر ایک راضی ہو جائے تو دوسری ناراض ہو جاتی ہے)۔ دنیا وہ چیز ہے جو تجھے خدا سے دور کر دیتی ہے۔ لہٰذا بیوی بچے، مال و جاہ و سرداری اور لہو ولعب میں مشغول ہونا سب دنیا میں داخل ہے اگر خدا سے غفلت نہ ہو تو بیوی بچے اور کسبِ معاش عین عبادت ہیں۔ دنیاوی علوم جس کا مقصد ملک اور قوم کی خدمت نہ ہو، لایعنی چیزیں ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے سے اعراض کرنے کی علامت یہ ہے کہ بندہ لایعنی کاموں میں مشغول ہو جائے۔ [2] دنیا کی چیزوں کو مثلاً غذا اور لباس کو صرف ضرورت کی حد تک اہمیت دینی چاہیے اور خیال یہ ہونا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔ خدا تعالیٰ کی رضا جنت میں جنت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دوزخ میں دوزخ کے عذاب سے بھی بدتر ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کا پابند ہے۔ اسے شترِ بے مہار کی طرح کھلا نہیں چھوڑا گیا کہ جو دل میں آئے کرے۔ غور وفکر سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ کل قیامت کو سوائے خسارے کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔

کام کرنے کا وقت جوانی ہے اور جوانمرد وہی ہے جو اپنی جوانی کا وقت ضائع نہ کرے۔ زندگی کے ختم ہونے کا وقت کبھی بھی آ سکتا ہے۔ آج کا کام کل پر نہ ڈالیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے ''ھَلَکَ الْمُسَوِّفُوْنَ'' (ہلاک ہو گئے وہ لوگ جو کہتے ہیں عنقریب ہم توبہ کر لیں گے)۔ [3]

---

1. کشف الخفاء، حدیث ۱۳۱۰، جلد ۱، صفحہ ۴۹۱۔
2. شرح الزرقانی، امام الزرقانی، متوفی ۱۱۲۲ھ، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔
3. احیاء العلوم، جلد ۴، صفحہ ۵۸۔

استغفار کے فوائد

قرآن مجید اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے استغفار کے بہت سے فوائد معلوم ہوتے ہیں۔ چند فوائد رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:

۱) استغفار کی کثرت سے دل کی سیاہی زائل ہو جاتی ہے

گناہ انسان کے دل پر سیاہ داغ پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ جب گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں تو سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس سیاہی کو زائل کرنے کا طریقہ حضور ﷺ نے استغفار تجویز فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے "عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَآءُ فِیْ قَلْبِهٖ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَ اِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَهٗ فَذٰلِكُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَكَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی، كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ" [1] (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب مومن بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے۔ پس اگر توبہ و استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر گناہ زیادہ کرے تو یہ سیاہ داغ بھی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی وجہ سے دل سیاہی میں گھر جاتا ہے اور اس سیاہی کو دور کرنے کیلئے حضور اقدس ﷺ نے استغفار کو تجویز فرمایا۔ دل کی صفائی اور پاکیزگی کیلئے استغفار نسخہ کیمیا ہے۔ لہٰذا اگر کبھی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ جو لوگ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، گناہوں کی وجہ سے ان کے دل میں نیکی اور بدی کا احساس تک نہیں رہتا۔

۲) دل کی صفائی ہونا

استغفار سے دل کی صفائی ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق یوں فرمایا ہے: "اِنَّهٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِی الْیَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ" [2] (میرے دل پر کبھی (انوار کے غلبہ سے) ابر چھا جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں)۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ معصوم ہوتے ہوئے بھی سو مرتبہ استغفار کرتے تھے تاکہ آپ ﷺ کی امت آپ ﷺ کی اتباع میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں پر استغفار کرتی رہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث شریف میں آپ ﷺ

---

[1] مسند احمد بن حنبل، حدیث، ۷۹۳۹، جلد۲، صفحہ ۲۹۷۔ [2] سنن ابن ماجہ، حدیث، ۳۸۱۸، جلد۲، صفحہ ۲۳۲۴۔

نے یوں ارشاد فرمایا " وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً "(اللہ کی قسم! میں دن میں ستر بار سے زیادہ استغفار اور توبہ کرتا ہوں)[1]

۳)نامۂ اعمال میں اضافہ ہونا

''طُوْبٰی لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا کَثِیْرًا'' [2] (اس کیلئے خوشخبری ہے جو (قیامت کے دن) اپنے نامہ اعمال میں کثیر استغفار پائے۔ اس حدیث شریف میں کثرت سے استغفار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ قیامت کے روز جو شخص اپنے اعمال نامہ میں کثرتِ استغفار لکھا ہوا پائے تو اس کیلئے بہتری کی خوشخبری ہے کیونکہ اس کے باعث اسے نجات حاصل ہوگی اور وہ راحت پانے کا حقدار ہوگا۔

۴)اصلاحِ زبان کا ہونا

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کی طبیعت میں شدت ہو تو اپنی طبیعت کو اعتدال پر رکھنے کیلئے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کثرت سے استغفار کرے۔ اس سے زبان کی اصلاح ہوگی اور طبیعت نیکیوں کی طرف مائل ہوگی۔ ''عَنْ حُذَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ کُنْتُ ذَابَ اللِّسَانِ عَلٰی اَهْلِیْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَشِیْتُ اَنْ یُّدْخِلَ لِسَانِیَ النَّارَ قَالَ اَیْنَ اَنْتَ مِنَ الْاِسْتِغْفَارِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِی الْیَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ'' [3] (حضرت حذیفہ ؓ نے فرمایا کہ میں اپنے گھر والوں سے فحش کلامی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میری زبان مجھے دوزخ میں نہ داخل کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم استغفار سے کیوں دور ہو میں روزانہ سو مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں)۔

۵) اجرِ عظیم حاصل ہونا

کثرت سے استغفار کا بہت اجر ہے اور اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا فرمان یہ ہے: ''مَا مِنْ حَافِظَیْنِ یَرْفَعَانِ اِلَی اللّٰهِ فِیْ یَوْمٍ فَیَرٰی تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی فِیْ اَوَّلِ الصَّحِیْفَةِ اِسْتِغْفَارًا وَ فِیْ اٰخِرِهَا اِسْتِغْفَارًا اِلَّا قَالَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ مَا بَیْنَ طَرَفَیِ الصَّحِیْفَةِ'' [4] (محافظ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور جب کسی کا ایسا اعمال نامہ پیش کریں جس کے اول و آخر میں استغفار لکھا ہوا ہو تو اس پر ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کا وہ سب کچھ بخش دیا جو اس اعمال نامہ کے اول و آخر کے

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۹۴۸، جلد ۵، صفحہ ۲۳۲۴۔ [2] صحیح مسلم، حدیث ۲۷۰۲، جلد ۴، صفحہ ۲۰۷۵۔

[3] سنن نسائی، حدیث ۱۰۲۸۵، جلد ۶، صفحہ ۱۱۷۔

[4] مجمع الزوائد، علی بن ابی بکر الہیثمی، متوفی ۸۰۷، جلد ۱۰، صفحہ ۲۰۸، دار الریان للتراث، القاہرہ۔

درمیان ہے)۔

۶) تمام مشکلات کا حل ہونا اور ہر دُشواری سے چھٹکارا

استغفار تنگی اور دُکھوں کا علاج بھی ہے اور اس سے روزی کے ملنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔
آپ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا: ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ'' [۱] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص استغفار کو اپنے اوپر لازم کرلے اللہ تعالیٰ اس کیلئے ہر دشواری سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور ہر غم و رنج سے اسکو نجات دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

۷) اصرار گناہوں سے بچنے کیلئے استغفار

''عَنْ اَبِیْ بَکْرِنِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَ اِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّةً'' [۲] (بروایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص استغفار کرتا ہے وہ ان لوگوں میں شمار نہیں جو گناہوں پر اصرار کرنے والے ہیں۔ اگرچہ ایک دن میں اس نے ستر بار گناہ کئے ہوں)۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے بار بار ایک ہی طرح کا گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اسے اس سے بچنے کیلئے استغفار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۸) استغفار عذاب الٰہی سے بچاؤ کا ذریعہ

استغفار عذابِ الٰہی سے بھی بچاؤ کا ذریعہ ہے: اس کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے فرمایا وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیَّ اَمَانَیْنِ لِاُمَّتِیْ'' [۳] (اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر میری اُمت کیلئے دو امانیں نازل فرمائی ہیں)۔ جن دو امانوں کا ذکر آپ ﷺ نے فرمایا اس کا بیان سورۂ انفال کی آیت نمبر ۳۳ میں یوں آیا ہے: 'وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ'' [۴] (اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ ﷺ تشریف فرما ہیں ان میں۔ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں)۔

مزید آپ ﷺ نے فرمایا ''وَ اِذَا مَضَيْتُ تَرَكْتُ فِيْهِمُ الْاِسْتِغْفَارَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''

---

[۱] سنن ابی داؤد، حدیث ۱۵۱۸، جلد ۲، صفحہ ۸۵۔　[۲] سنن ابی داؤد، حدیث ۱۵۱۴، جلد ۲، صفحہ ۸۴۔

[۳] تفسیر الثعالبی، عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبی، جلد ۲، صفحہ ۹۶، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت۔　[۴] انفال، ۸: ۳۳۔

(پس جب میں دنیا سے پردہ کر جاؤں گا (تو ایک امان اٹھ جائے گی اور دوسری امان) استغفار قیامت تک (اپنی امت کے اندر) چھوڑ جاؤں گا)۔ اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! اگر تیرا قرآن واقعی تیری طرف سے ہے تو ہم پر اس کے نہ ماننے کی وجہ سے آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی۔ آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کے تشریف فرما ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عذاب نہ بھیجا اور استغفار کرنے والوں کے ہوتے ہوئے بھی عذاب نہ دے گا۔

۹) استغفار کر لینے کے بعد اعمال نامے میں گناہ نہیں لکھے جاتے

''مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَعْمَلُ ذَنْباً اِلَّا وَقَفَ الْمَلَکُ ثَلٰثَ سَاعَاتٍ فَاِنِ اسْتَغْفَرَ مِنْ ذَنْبِہٖ لَمْ یَکْتُبْہُ عَلَیْہِ وَ لَمْ یُعَذِّبْہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ'' [۲] (فرمایا کہ جو بھی کوئی مسلمان گناہ کرتا ہے تو اعمال لکھنے والا فرشتہ تین گھڑی انتظار کرتا ہے پس اگر استغفار کر لیا تو وہ گناہ اس کے اعمال نامہ میں نہیں لکھتا اور اس پر اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن عذاب نہ دے گا)۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی مہربانی ہے ایک نیکی کی کم از کم دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر گناہ ہو جائے تو اول فرشتہ لکھنے میں دیر لگاتا ہے اور بندے کے استغفار کا انتظار کرتا ہے اور اگر استغفار کر لیا تو اس کا لکھا جانا ہی ختم ہوا اور اگر استغفار نہ کیا تو ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے۔

۱۰) استغفار کرنے والے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں

''عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا'' [۳] حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ فرماتے تھے اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے کر کہ جب نیکی کریں تو خوش ہوں اور جب برائی کریں تو استغفار کریں۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ استغفار کرنا خوش بختی کی دلیل ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ جو استغفار کرتے رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور بہت پسندیدہ لوگوں میں سے ہو جاتے ہیں۔

علاماتِ قبولیتِ توبہ

قبولیتِ توبہ کی کچھ علامات ہیں۔ توبہ کرنے والا:

---

[۱] سنن الترمذی، حدیث ۳۰۸۲، جلد ۵، صفحہ ۲۷۰۔
[۲] المستدرک، حدیث ۷۶۷۵، جلد ۴، صفحہ ۲۹۱۔
[۳] سنن ابن ماجہ، حدیث ۳۸۲۰، جلد ۲، صفحہ ۱۲۵۵۔

۱) گناہوں سے بچا ہوا پایا جاتا ہے۔

۲) اپنے دل کو خوش پاتا ہے۔

۳) اپنے رب کو حاضر دیکھتا ہے۔

۴) نیک صحبت میں بیٹھتا ہے اور بد کو ترک کرتا ہے۔

۵) دنیا کے تھوڑے مال کو زیادہ خیال کرتا ہے اور زیادہ اعمالِ صالحہ کو کم خیال کرتا ہے۔

۶) اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف راغب اور مشغول پاتا ہے۔

۷) زبان کو قابو میں رکھتا اور تفکر زیادہ کرتا ہے۔

۸) اپنی خطاؤں اور گناہوں پر نادم اور پشیمان رہتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے ''فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ''[1] (پھر لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں (ہی) عطا کر دے اور ایسے شخص کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور انہی میں سے ایسے بھی ہیں جو عرض کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی سے نواز اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ، یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے ان کی (نیک) کمائی میں سے حصہ ہے، اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے)۔

خلاصۂ کلام

معلوم ہوا کہ جب کسی بات کا علم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو توبہ بمطابق حکمِ الٰہی ''تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ o''[2] (اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے پھر اللہ نے اُن کی جانوں کو ہی اُن سے بھلا دیا (کہ وہ اپنی جانوں کیلئے ہی کچھ بھلائی آگے بھیج دیتے)، وہی لوگ نافرمان ہیں)۔ اللہ تعالیٰ کے عتاب کو پس پشت نہ ڈالو۔ نفسوں کو لگام دو اسے ہوا و حرص سے باز رکھو انسان کو شتر بے مہار کی طرح کھلا نہیں چھوڑا گیا ہے جان لو کہ انسان کو خواہ مخواہ یا بے کار پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کسی مقصد کیلئے پیدا کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی عزت اور قدر کرو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو کمینی اور فضول دنیا کے عوض ٹھکرانے والو! ہوش میں آؤ۔ دیکھو کہ تم اس عیاش زندگی کے دلدادہ ہو رہے ہو اور یہ آفت تمہیں کہاں

[1] البقرة ۲: ۲۰۰، ۲۰۲۔　[2] الحشر ۵۹: ۱۹۔

لے جائے گی۔ آج ہی اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرو۔

حدیث شریف میں ہے جو اللہ تعالیٰ کا دیدار چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا دیدار چاہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا دیدار پسند نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہی لوگ فاسق اور فاجر ہیں جو تھوڑی سی دنیاوی لذت کے عوض جہنم کی آگ میں جھلس جانے کی پرواہ نہیں کرتے۔

فاسق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ فاسق فاجر (جو گناہوں کا مرتکب ہو) اور فاسق کافر جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لائے۔ فاسق کافر اگر توبہ کے بغیر مرے تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور فاسق فاجر توبہ کے بغیر مرے تو جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا اور اگر توبہ کر کے مرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا جیسا کہ فرمایا "وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ" [1] (اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک روز مدینے کے گلی کوچوں سے گزر رہے تھے اور ایک جوان شراب کی بوتل چھپائے لیے جا رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر بہت گھبرایا اور دل میں کہا کہ الٰہی اگر آج تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مجھے بچا لے تو میں شراب پینا ترک کر دوں گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب پوچھا کہ اے جوان تیری بغل میں کیا ہے؟ کہا کہ سرکہ ہے۔ جب کھلوا کر دیکھا تو واقعی سرکہ تھا۔ اگر انسان نادم ہو کر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط" [2] (مگر جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جن کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا)۔ اسی طرح بڑے بڑے لوگوں نے توبہ کی اور بہت مشہور ہوئے، ان میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابو علی فضیل ابن عیاضؒ: آپؒ نے درج ذیل آیت مبارکہ سنی تو سچے دل سے توبہ کی: "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ" [3] (کیا ایمان والوں کیلئے (ابھی) وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی یاد کیلئے رقت کے ساتھ جھک جائیں)۔

۲۔ بشر حافیؒ نے زمین پر گرے کاغذ پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا دیکھا تو اٹھا لیا۔ کستوری لگا کر دیوار میں رکھ دیا۔ خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اے بشر تو نے میرے نام کو خوشبو لگائی میں تیرے نام کو دنیا اور آخرت میں خوشبودار بنا دوں گا۔

۳۔ ابو سلیمان درانیؒ: آپؒ ایک قصہ خواں کے ہاں گئے تو پہلی بار ایک رباعی پر اٹھتے ہی اثر ختم ہو گیا۔

---

[1] الشوریٰ، ۴۲: ۲۵۔ [2] الفرقان، ۲۵: ۷۰۔ [3] الحدید، ۵۷: ۱۶۔

دوسری بار اس کا اثر راہ تک رہا، تیسری بار یہ اثر گھر تک رہا۔ پھر انہوں نے مخالفت کے سارے آلات توڑ دیئے اور طریقت کی راہ پر آ گئے۔

اسی طرح توبہ کے بہت سے قصے اولیائے کرامؒ کی سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ گناہوں سے توبہ آہستہ آہستہ کرنا بھی درست ہے۔ اگر ایک دم توبہ کرے تو بہت بہتر ہے اس کیلئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھے۔

۱) گناہوں پر ندامت، بے بندگی سے شرمندہ ہو۔

۲) بُرے لوگوں کی صحبت ترک کرے اور نیک صحبت میں جائے، اور کتب کا مطالعہ کرے۔

۳) ذکر اور مجاہدوں کو اپنائے، مجلسِ ذکر میں شامل رہے۔

۴) بیعت سچے دل سے کرے اور راہِ تصوف کا دلدادہ بن جائے۔

باب نمبر ۲۰

تہذیبِ نفس اور حضراتِ جنیدؒ و بایزیدؒ

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرامؒ کو اپنے بندوں کی تربیت کے لئے نمونہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ تصرفات سے یہ حضرات لوگوں کی زندگیوں کو سنوارتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا اہم جزو خلقِ خدا میں ایسی رہنمائی کا شعور بیدار کرنا ہے جس کے باعث لوگ نفسانی فریب اور شیطانی اثرات سے محفوظ ہو کر نجات کا راستہ اختیار کریں۔ انسان کے درجات کی بلندی نفس کی مخالفت میں رکھی گئی ہے اور اس میں جتنے کمالات ظاہر ہوتے ہیں وہ نفس کی مخالفت کے باعث ہی ہوتے ہیں چنانچہ جس قدر مخالفت زیادہ ہوگی اسی قدر بلندیٔ درجات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور بالآخر وہ اپنے خدا کو پالینے کے قابل ہو جائے گا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ الٰہی! میں تجھے کیسے پاسکتا ہوں تو فرمایا کہ اپنے نفس کو چھوڑ کر چلے آؤ کیونکہ میں نفس کی مخالفت میں ہی رکھا گیا ہوں۔

ان مشائخ کبار کی مختصری صحبت سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد خواہشات اور نفس کی آلودگیوں سے پاک ہو سکتی ہے اور وہ صحبت انہیں جہنم کی راہ سے ہٹا کر جنت الفردوس کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ ان کے حالات کو پڑھنا اور ان کی تصانیف کا مطالعہ بھی دراصل ان کی صحبت کا ایک ذریعہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ ان نیک لوگوں کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا موجب ہے[1] اس کتاب میں ہم اولیاء کرامؒ کی تہذیب نفس کا تذکرہ کر چکے ہیں مگر یہاں قارئین کی دلجمعی اور دلچسپی کیلئے حضرات جنیدؒ و بایزیدؒ کے نفس کی تہذیب کے دلچسپ اور روح افروز احوال، افکار اور کیفیات و واردات یکجا کر رہے ہیں۔

راہِ طریقت سراسر نفس کی آلائشوں سے محفوظ رہنے اور اس کی بغاوتوں کو کچلنے کا نام ہے۔ راقم الحروف

---

[1] الفوائد المجموعہ، حدیث ۱۰۹، جلد ۱، صفحہ ۲۵۴۔

نے ایک بہت ضخیم کتاب ''جنیدؒ و بایزیدؒ ''، جس میں ان حضرات کی زندگیوں سے سبق حاصل کرنے کے علاوہ ان کی زندگیوں کے بہت سے محیر العقول واقعات درج کر دیئے ہیں جو قارئین کے لیئے نہایت سودمند ثابت ہو سکتے ہیں یہاں ہم صرف حضرت جنیدؒ اور بایزیدؒ کے حوالے سے نفس کے متعلق ان کے چند فرمودات کو نقل کیے دیتے ہیں۔

ان حضرات کا مقام دنیائے طریقت میں کسی سے مخفی نہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ جو کہ سیدُ الطائفہ (ولیوں کے گروہ کا سردار) کے نام سے مشہور ہیں۔ اور حضرت بایزیدؒ کے مقام کا اندازہ حضرت جنیدؒ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے۔ ''اَبُوْیَزِیْدَ مِنَّا بِمَنْزِلَةِ جِبْرِیْلَ مِنَ الْمَلٰئِکَةِ ''(بایزید بسطامیؒ ہم (اولیاء) میں ایسے معظم ہیں جیسے ملائکہ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام معظم ہیں)۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کرامؒ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن جب میں حضرت بایزید بسطامیؒ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہوں تو دل کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ حقائق میرے دل کی گہرائیوں میں امڈ کر غلبہ حال کی صورت میں نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بایزیدؒ کی باتوں سے اونچی باتیں کسی بزرگ میں نظر نہیں آتیں۔ آپ نے حضرت بایزیدؒ کی کچھ باتوں کا ذکر اپنے اہلِ حلقہ سے کیا اور فرمایا کہ خدارا بایزیدؒ کی باتوں پر کان دھرو اور دیکھو کہ ان میں کیا کیا لعل، رموز اور نکات پنہاں ہیں۔

معرفتِ نفس

نفس بذات خود ایک ایسی چیز ہے جس میں تمام اجزائے خبث کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں اور اس کے خبث ذاتی یعنی اس کی اصل کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ جتنا اس کو دباؤ گے اتنا ہی ابھرے گا۔ جتنا اس کو مارو گے اتنا ہی قوی اور طاقتور ہوتا جائے گا۔ اس کی فطرت روح کی نقیض (الٹ) ہے۔ روح جن باتوں سے طاقتور ہوتی ہے نفس ان سے کمزور ہو جاتا ہے اور جن چیزوں سے روح کمزور ہوتی ہے نفس طاقتور ہو جاتا ہے۔ اس کی اصلاح مقصود ہو تو اسے متدین، مہذب اور مترتب (تربیت دیا ہوا) کیا جا سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پورا اسلام اسی نفس کو تہذیب دینے کے گرد گھومتا ہے۔

ایک شخص نے جنیدؒ سے کہا، خراسان کے بزرگوں کو میں نے اس قول پر پایا کہ حجاب تین ہیں۔ ایک حجاب مخلوق ہے۔ دوسرا دنیا اور تیسرا نفس ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا، یہ عوام کے دل کے حجاب ہیں۔ خاص الخاص لوگ دوسری چیزوں سے محجوب ہیں جو یہ ہیں۔

''رُؤْیَةُ الْاَعْمَالِ وَمُطَالَبَةُ الثَّوَابِ عَلَیْهَا وَ رُؤْیَةُ النِّعَمِ'' (اعمال کو دیکھنا اور ان پر ثواب کا مطالبہ کرنا اور نعمتوں کو دیکھنا (حجاب ہے)۔

معرفتِ نفس بہت مشکل کام ہے کیونکہ انسان علم و معرفت رکھتے ہوئے بھی اس کے داؤ پیچ سے غافل رہتا ہے۔ حضرت بایزیدؒ کا فرمان ہے کہ انسان اس وقت متواضع ہوتا ہے جب وہ اپنے نفس کا (شرعی حق کے سوا) کوئی حق نہ سمجھے اور سالک کبھی یہ خیال نہ کرے کہ مخلوق میں کوئی اس سے بدتر ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے یہ معرفت کیسے حاصل کی۔ فرمایا کہ بھوکے پیٹ اور ننگے بدن سے۔

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ "اَلْمَعْرِفَةُ اَنْ تَعْرِفَ اَنَّ حَرَكَاتِ الْخَلْقِ وَسَكْنَاتِهِمْ بِاللّٰهِ" یعنی معرفت یہی ہے کہ بندہ جان لے کہ مخلوقات کی تمام حرکتیں اور جملہ سکنات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور کسی کو اس کے اذن کے بغیر اس کی ملک میں حق تصرف نہیں۔ عین اس سے عین ہے اور اثر اس سے اثر ہے اور صفت اس سے صفت ہے، متحرک اس سے متحرک اور ساکن اس سے ساکن ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کے وجود میں توفیق پیدا نہ فرمائے اور دل میں قوت ارادہ نہ ڈالے تو بندہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بندے کا فعل مجازی ہے اور حقیقتاً فعل اللہ کا ہے یا یہ کہ انسان آلۂ کار ہے۔

آپؒ نے فرمایا عبادت کا مقصد صرف یقین پیدا کرنا ہے اور تیس سالہ ریاضتوں کے بعد مجھے "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) [1] یہ یقین ہوا اور اگر میں شروع میں ہی اس بات پر یقین کر لیتا تو تیس سال اس قدر سخت مجاہدات نہ کرنے پڑتے۔ مشائخ نے کہا ہے کہ جس کا "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" پر یقین ہو تو اس کا کام فوراً ہو جاتا ہے۔ (یقین کا بیان ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ اے داؤد! لوگوں کو اپنی خواہشات کی چیزیں کھانے سے بچاؤ۔ اس لیے کہ جو دل دنیا کی خواہشات میں لگے رہتے ہیں ان کی عقلیں مجھ سے حجاب میں رہتی ہیں۔

کثرتِ نعمت گداز از دل برد　　ناز مے آرد نیاز از دل برد

(نعمتوں کی کثرت دل سے گداز کو لے جاتی ہے، ناز پیدا کرتی ہے اور نیاز رخصت ہو جاتا ہے)

خواہشِ نفس کی مخالفت سے مرضِ نفس کا علاج بن جاتا ہے

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں تہجد کیلئے اٹھا جب نماز کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا تو مجھ پر ناقابل بیان اضطراب طاری ہو گیا۔ بجائے تہجد پڑھنے کے میں ذکر الٰہی میں مشغول ہو گیا تو تب بھی طبیعت میں بے قراری محسوس کرتا رہا۔ آخر کار میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا مگر بیقراری کی کیفیت ختم نہ ہوئی۔ پھر میں جا کر بستر پر لیٹ گیا لیکن کیفیت جوں کی توں رہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بے چینی کا سبب کیا ہے؟ آخر

[1] ق، ۵۰:۱۶۔

میں جوتے پہن کر گھر سے باہر نکل آیا اور کھلی فضا میں ٹہلنے لگا۔ گھر سے کچھ ہی دور گیا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص چوغے میں ملبوس اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ اس وقت یہ کون شخص ہے کہ جو پچھلے پہر یہاں لیٹا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے مخاطب ہو کر کہا ''آ گئے ہو ابوالقاسم! تم نے آتے آتے بہت دیر کر دی'' حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کی بات سن کر مجھ پر ایک عجیب سا رعب طاری ہو گیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ ''میں نے آپکے پاس آنے کا کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ جس کی پابندی مجھ پر فرض ہوتی''۔

مذکورہ شخص نے حضرت جنیدؒ سے کہا ''اے ابوالقاسم! آپ سچ کہتے ہیں مگر میں نے خداوند ذوالجلال کو جو دلوں کو حرکت دیتا ہے اور مقلب القلوب ہے یہ کہا تھا کہ آپ کے دل کو حرکت دے اور میری جانب بھیج دے''۔ حضرت جنیدؒ نے کہا ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو آپ کی طرف مائل کر دیا ہے اور میں یہاں آ بھی گیا ہوں، اب آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں''۔ وہ شخص بولا ''اے ابوالقاسم! میں ایک سوال کا جواب آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس سوال نے مجھے کئی دنوں سے پریشان کر رکھا ہے''۔ حضرت جنیدؒ نے پوچھا اب بتائیے سوال کیا ہے؟ اس نے کہا سوال یہ ہے کہ مرض نفس کب نفس کی دوا بن جاتا ہے؟ آپ نے جواب دیا ''جب انسان اپنی خواہشات کی مخالفت کرتا ہے تو اس حالت میں مرض نفس اس کے نفس کا علاج بن جاتا ہے''۔ حضرت جنیدؒ کا یہ جواب سن کر وہ شخص اپنے دل کو مخاطب کر کے کہنے لگا ''میں نے تجھے سات مرتبہ یہی جواب دیا تھا مگر تو نے میری بات نہیں مانی اور یہی کہتا رہا کہ جب تک جنیدؒ کی زبانی نہ سنوں گا اس وقت تک نہیں مانوں گا۔ اب تو تو نے سن لیا کہ جنیدؒ کیا کہتے ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ شخص تیز رفتاری کے ساتھ چلا گیا۔ آپؒ کھڑے سوچتے ہی رہے کہ وہ شخص کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے میں اسے نہیں جانتا تھا۔

درِ حق مصائب کے ذریعے کھلتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ستر زنار کھولنے کے باوجود بھی ایک زنار میری کمر میں باقی رہ گیا اور جب کسی طرح نہ کھل سکا تو میں نے خدا سے عرض کیا کہ اس کو کس طرح سے کھولا جائے؟ ندا آئی کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے جب تک ہم نہ چاہیں۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا میری ان تھک کوششوں کے باوجود بھی درِ حق نہ کھل سکا اور جب کھلا تو مصائب کے ذریعے کھلا اور ہر طرح سے میں نے اس کی راہ پر چلنے کی سعی کی لیکن سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور جب قلبی لگاؤ کے ذریعے چلا تو منزل تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ میں نے مکمل تین سال اللہ تعالیٰ سے اپنی ضروریات کے مطابق طلب کیا لیکن اس کی راہ میں

گامزن ہوتے ہی سب کچھ بھول گیا اور یہ تمنا کرنے لگا کہ یا اللہ! تو میرا ہو جا اور جو تیری مرضی ہو دیسا کر۔ فرمایا کہ جب میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ تجھ تک رسائی کی کیا صورت ہے؟ فرمایا کہ اپنے نفس کو تین طلاقیں دیدے۔

متعلقاتِ نفس سے گزرنے کے بعد روحانیت کے درجات ملتے ہیں

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اگر انسان بہت عبادت اور ریاضت بھی کرنے کا اہتمام کرے تب بھی نیچ اور سفلی شہوتوں، فاسد اور ردی ارادوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے تاوقتیکہ عارف کا دل اس کی روح کی ابتدائی حالت میں نہ پہنچ جائے جہاں خالق کون و مکاں کے سوا کسی بھی مظہر کا وجود نہ تھا۔ اس مقام تک پہنچنا ریاضت شاقہ اور دنیا سے قطعِ تعلق اور خواہشاتِ نفس سے مکمل اجتناب کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی درویشی اور بزرگی کا اعلان کرتے ہوئے بھی کھانے پینے، ہنسنے کھیلنے اور دنیاداری کی بھاگ دوڑ میں عام لوگوں کی طرح لگے رہتے ہیں تو پھر ان کے ان بلند بانگ دعووں میں کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کیلئے دنیا کے دروازے بند نہیں کرتا۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ جب تک بندہ دنیا اور اس کے تمام متعلقات سے گزر نہ جائے، نفس کے سمندر کو عبور نہ کر لے، خواہشات نفس کے جھمیلوں کے سمندروں کو پار نہ کر لے اس وقت تک وہ روحانیت کے بلند و بالا درجے تک پہنچ نہیں سکتا۔ فریب نفس نے بہت سے بزرگوں کو اپنے مقام و مرتبہ سے محروم کر دیا ہے۔ وظائف، اوراد اور عبادات کے زعم میں نہایت ہی پر پیچ مسائل پنہاں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱)'' يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ''

(اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹنا ہے)۔[۱]

(۲)''وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ''

(جان لو کہ اللہ دل کی باتوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا تم اس سے ڈرتے رہو)۔[۲]

ایسے حالات میں کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے تو انسان کبھی چین کی سانس نہیں لے سکتا۔ اس کے دل میں تو ہمیشہ کھٹکا ہونا چاہیے کہ کہیں اس کا حشر ابلیس، قارون، بلعم باعور، فرعون، شداد اور ہامان جیسا نہ ہو جائے۔ انسان پر کتنے ہی پردے پڑ جاتے ہیں اور اسے محسوس بھی نہیں ہوتا۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ کتنے ہی انسان ہونگے جو قیامت کے دن پروردگار کے دیدار سے محجوب ہونگے جیسے فرمایا:

''كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ''

---

[۱] آل عمران،۳: ۲۸۔ [۲] البقرہ،۲: ۲۳۵۔

(کچھ شک نہیں کہ وہ لوگ قیامت کے دن اپنے رب کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے)۔[1]

اگر کوئی شخص دنیا کو چھوڑ بھی دے اور پھر اس چھوڑنے پر تفاخر کرے تو اس کا یہ فخر کرنا اس کے دنیا نہ چھوڑنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی طرح اگر تم خواہشات نفس اور گناہوں سے تو باز آئے مگر ان چیزوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے تو یہ پسندیدگی تمہارے اصل گناہوں کے چھوڑنے سے بھی بدتر ہے۔ اگر تم خوف میں مبتلا ہو گئے اور اس خوف پر مطمئن ہو گئے تو اس طرح کا اطمینان خوف نہ ہونے سے بھی کہیں زیادہ برا ہے۔ اگر اللہ پر توکل کرنے کے بعد اس پر ڈینگ ماری اور اللہ سے قطع نظر کر لیا تو یہ توکل کی بات صحیح نہ ہوگی۔ اگر تم نے محبت پیدا کر لی تو اپنے محبوب سے صرف نظر کرنے سے سب کچھ سمجھ لیا تو ایسی محبت کے ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان چار دریا ہیں

حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اللہ اور بندے کے درمیان چار دریا ہیں۔ پہلا دریا دنیا ہے جو پرہیزگاری کی کشتی کے بغیر طے نہیں ہوتا۔ دوسرا دریا آدمیوں کا ہے اس کو طے کرنے کیلئے لوگوں سے دور رہنا چاہیے۔ تیسرا دریا شیطان ہے اور شیطان کی مخالفت کرنا ہی اس دریا کی کشتی ہے۔ چوتھا دریا نفس ہے اور یہ دریا نفس کی مخالفت سے پار کیا جاتا ہے۔ نفس کی مخالفت کرنا ہی ابلیس کی مخالفت ہے۔ شیطانی وسوسے اور نفس انسانی میں فرق یہ ہے کہ وسوسہ تو لاحول پڑھنے سے دور ہو جاتا ہے لیکن نفس جس چیز کی خواہش کرتا ہے اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ جب تک اسے حاصل نہ کر لے اس وقت تک راضی نہیں ہوتا۔ اگر اسے روکا جائے تو جب بھی موقع ملے گا اسے حاصل کرنے کے بغیر قرار نہ پائے گا۔

ایک سیدزادے سید ناصریؒ ایران سے آپؒ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ حج سے پہلے حضرت جنیدؒ سے ملاقات کریں۔ حضرت نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو عرض کیا گیلان کا رہنے والا ہوں اور سید خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا سید صاحب آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے دادا حضرت علیؓ بیک وقت دو تلواریں چلایا کرتے تھے۔ تو سید صاحب یہ بات سمجھ نہ سکے حضرت نے فرمایا کہ حضرت علیؓ ایک تلوار کافروں کی گردنوں پر چلاتے تھے اور دوسری تلوار اپنے نفس پر۔ سید صاحب آپ کون سی تلوار چلاتے ہیں؟ سید صاحب یہ سن کر بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ مجھے پہلے اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لائق بنا دیں۔ آپ نے فرمایا ''تمہارا سینہ حق تعالیٰ کا خاص حرم ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس

---

[1] المطففین، ۸۳:۱۵۔

میں کسی نامحرم کو جگہ نہ دو۔ حضرت سید ناصریؒ نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور دنیا سے رخصت ہو گئے"۔

عجز وانکساری اللہ تعالیٰ کے وصل کا ذریعہ

حضرت بایزیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے بذریعہ الہام اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت وخدمت تو بہت ہے لیکن اگر تو ہماری ملاقات کا متمنی ہے تو ہماری بارگاہ میں وہ شے شفاعت کیلئے بھیج جو ہمارے خزانے میں نہ ہو۔ آپ نے سوال کیا وہ کون سی شے ہے؟ فرمایا گیا کہ عجز وانکساری اور ذلت وغم حاصل کر کیونکہ ہمارا خزانہ ان چیزوں سے خالی ہے اور ان کو حاصل کرنے والے ہمارا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جنگل میں میرے اوپر محبت کی ایسی بارش ہوئی کہ پوری زمین برف کی طرح یخ ہو گئی اور میں اس میں گردن تک غرق ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ میں نے نماز کے ذریعے استقامت اور روزے کے ذریعے سوائے بھوکا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں کیا اور جو کچھ بھی ملا وہ سب فضل خداوندی سے حاصل ہوا اور اپنی سعی سے کچھ نہیں مل سکا۔ پھر فرمایا کہ دو عالم کی دولت سے یہ بات بہتر ہے کہ انسان خدا کے فضل سے ہٹ کر اپنی ذاتی سعی سے کچھ بھی حاصل نہ کرے۔ پھر بھی انسان کو سعی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے سعی بہت ضروری ہے لیکن سعی کے بعد جو کچھ حاصل ہو اس کو محض خدا کا فضل تصور کرنا چاہیے۔

حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے سوال کیا کہ انسان کو مرتبۂ کمال کس وقت حاصل ہوتا ہے؟ فرمایا جب مخلوق سے کنارہ کش ہو کر اپنے عیوب پر نظر پڑنے لگے تو اس وقت قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ آپ ہمیں تو زہد وعبادت کی تلقین فرماتے ہیں لیکن خود اس جانب راغب نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے زہد وعبادت کو مجھ سے سلب کر لیا ہے۔ پھر کسی نے پوچھا کہ خداوند تعالیٰ تک رسائی کس طرح ممکن ہے؟ فرمایا نہ تو دنیا کی جانب نظر اٹھاؤ اور نہ اس کی باتیں سنو اور اہلِ دنیا سے بھی بات کرنا چھوڑ دو۔ پھر لوگوں نے عرض کیا ہم نے آپ کے کلام سے بہتر کسی بزرگ کا کلام نہیں دیکھا۔ آپؒ نے فرمایا کہ دوسروں کے کلام میں التباس ہوتا ہے اور میں بغیر تلبیس کے گفتگو کرتا ہوں کیونکہ دوسرے لوگ تو "ہم" کہتے ہیں اور میں "تو" ہی کہتا ہوں۔

حضرت بایزیدؒ نے عُجب کا عجیب علاج تجویز کیا

ایک شخص تیس سال تک آپؒ کی صحبت میں عبادت کرتا رہا اور ایک دن آپؒ سے عرض کیا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی آپؒ کی تعلیم مجھ پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ آپؒ نے فرمایا کہ ایک ہی صورت میں تیرے اوپر اثر ہو سکتا ہے لیکن وہ تجھے قابلِ قبول نہ ہو گی۔ اس نے عرض کیا کہ میں آپؒ کے ہر حکم کی تعمیل

کروں گا۔ آپؒ نے فرمایا کہ داڑھی، مونچھ اور سر کے تمام بال منڈوا کر اور ایک کمبل اوڑھ کر ایک تھیلے میں اخروٹ بھر لے اور ایسی جگہ پر جا بیٹھ جہاں بہت سے لوگ تجھ سے واقف ہوں اور بچوں سے کہہ دے کہ جو بچہ مجھے ایک تھپڑ مارے گا میں اسکو ایک اخروٹ دوں گا۔ بس یہی تیرا واحد علاج ہے، اسلئے کہ ابھی تک تو اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکا۔ اس نے جواب میں کہا کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" آپ نے فرمایا یہ کلمات اگر کسی کافر کی زبان سے ادا ہوتے تو وہ مسلمان ہو جاتا لیکن تو اس لیے مشرک ہو گیا ہے کہ تو نے عظمتِ خداوندی کی بجائے عجب کی بنا پر اپنی عظمت کا اظہار کیا۔ یہ سن کر اس نے عرض کیا کہ آپ کی بتائی ہوئی ترکیب میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ آپ نے کہا کہ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تو میری بات پر عمل نہیں کرے گا۔

علماء حق کا طریق نفس کشی اور علماء سوء کا نفس پرستی

حضرت جنیدؒ نے علماء حق کی یہ نشانیاں بیان فرمائی ہیں کہ ان کا وجود عالم انسانیت کیلئے موجب خیر و برکت ہوتا ہے۔ وہ جب بولتے ہیں تو علم و حکمت کے موتی بکھیرتے ہیں۔ ان کی ذات بارانِ رحمت کی طرح ہوتی ہے کہ جن سے اعمال کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں اور مردہ دل حیاتِ تازہ حاصل کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں نیت کی درستی اور پختگی، نصب العین کے ساتھ وابستگی اور شوق طلب کے ساتھ نفس کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ قیام حق کیلئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور اپنے علم پر حسن و خوبی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ذکر و فکر ان کا دائمی مشغلہ ہوتا ہے اور زہد و تقویٰ اور محاسبۂ نفس ہمیشہ ان کا شعار ہوتا ہے ایذا رسانی اور دوسروں کی تحقیر ان کے نزدیک ناقابل معافی گناہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ غیبت اور برائی سے بچتے اور دوسروں کی سلامتی کیلئے دعا گو رہتے ہیں۔ دوسرے لوگ ظلم و زیادتی بھی کریں تو صبر اور درگزر سے کام لیتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں غرور اور نخوت نام کو بھی ان میں نہیں ہوتی وہ منکرات کو پہچانتے، انہیں برا جانتے اور ان سے ہمیشہ بچتے رہتے ہیں۔ اسی طرح معروف کو جانتے پہچانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لوگوں کی مدح و قدح سے بے نیاز رہ کر ہمیشہ سعی و عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر ان کے اردگرد معتقدین کی کثرت ہو جائے تو اس مقبولیت پر اتراتے نہیں بلکہ ان کی خواہش بس یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو صحیح معنوں میں فیض پہنچایا جائے۔ یہ لوگ کبھی تاویل اور بدعت کی طرف مائل نہیں ہوتے بلکہ اپنا میلان طبع ہمیشہ اور ہر حال میں اتباع سنت کی طرف رکھتے ہیں۔

علماء سوء اپنے علم پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے سامنے حصول علم کا مقصد محض شہرت دنیا اور حصول زر ہوتا ہے۔ ان کا تمام تر زورِ علم تاویلات پر صرف ہوتا ہے انہی تاویلوں کے ذریعے وہ مقاصدِ بلند سے پہلو تہی کرتے، روپیہ کماتے اور اپنی تشہیر میں لگے رہتے ہیں۔ مدح و ستائش کے آرزومند رہتے ہیں

اور مفادِ عاجلہ کی خاطر متاع قلیل پر اپنا علم اور دین فروخت کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہمارا علم ہی دراصل قیامِ حق کا واحد ذریعہ ہے اور تمام مخلوق ہماری ضرورت مند ہے لہٰذا اپنی اصلاح کی بجائے سرکار (حکومتِ وقت) کے دربار میں رسائی ان کا منتہائے مقصود بن جاتی ہے جہاں جا کر خود بھی ذلیل ہوتے ہیں اور اپنے علم کی رسوائی کا بھی سامان پیدا کرتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ یہی پسند ہوتا ہے کہ ان کے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا ہو۔ ہر شخص ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو، ان کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جائے اور ان کی ہر رائے وقیع قرار دی جائے۔ اگر کوئی ان کی شخصی رائے سے اختلاف کر گزرے تو اسے طعن وتشنیع اور اپنے غیظ وغضب کا نشانہ بنا لیتے ہیں اور مرتے دم تک اسے معاف کر دینے کے روادار نہیں ہوتے

تادیبِ نفس کیلئے حضرت بایزیدؒ کا نسخہ

ایک مرتبہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ میں بہت بڑا بزرگ اور شیخ الوقت ہو گیا ہوں لیکن اس کے بعد یہ خیال بھی آیا کہ میرا یہ خیال فخر اور تکبر کا آئینہ دار ہے چنانچہ فوراً خراسان کی طرف روانہ ہوئے اور ایک منزل پر پہنچ گئے تو دعا کی کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی ایسے کامل بندے کو نہیں بھیجے گا جو مجھے میری حقیقت سے روشناس کرا سکے تو اس وقت تک میں یہیں پڑا رہوں گا۔ تین شب و روز کے بعد ایک شخص اونٹ پر آیا۔ آپؒ نے اس کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن اس اشارے کے ساتھ ہی اونٹ کے پاؤں زمین میں دھنستے چلے گئے اور جو شخص اس پر سوار تھا اس نے خشمگیں لہجہ میں کہا اے بایزیدؒ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی کھلی ہوئی آنکھ بند کرلوں اور بند آنکھ کو کھول لوں اور بایزید سمیت پورے بسطام شہر کو غرق کر دوں۔ اس کی یہ بات سن کر آپؒ کے ہوش اڑ گئے اور آپؒ نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جس وقت تم نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا اس وقت میں یہاں سے تین ہزار میل دور تھا اور اس وقت میں سیدھا وہیں سے آرہا ہوں اور تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اپنے قلب کی نگرانی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ" (یعنی ہر علم والے کے اوپر ایک اور علم والا ہے)۔[1] آپ اپنے نفس کی اصلاح کیلئے کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈ لیتے تھے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے "کشف المحجوب" میں ذکر کیا ہے کہ بایزیدؒ جب سفر حجاز سے واپس تشریف لائے تو ان کے آنے کی منادی کی گئی۔ لوگوں میں مشہور ہوا کہ بایزیدؒ تشریف لائے ہیں۔ شہر کے لوگ جمع ہوئے اور آپ کے استقبال کیلئے شہر سے باہر آئے تا کہ اعزاز واکرام کے ساتھ شہر میں لائیں حضرت بایزیدؒ لوگوں کی آمد و رفت کو دیکھ کر جب ان کی طرف مشغول ہو گئے تو محسوس فرمایا کہ اب ان کا دل

---

[1] یوسف، ۱۲:۷۶۔

بھی تقرب الٰہی سے دور ہو رہا ہے تو پریشان ہو گئے۔ لوگوں کو اپنے سے دور کرنے کیلئے آپؒ نے یہ حیلہ کیا کہ جب وسط شہر میں تشریف لائے تو روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر سر عام چبانا شروع کر دیا۔ ماہ رمضان میں آپؒ کے اس عمل پر عوام میں منافرت پیدا ہو گئی اور لوگ حضرت بایزیدؒ کو تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ کیونکہ یہ واقعہ رمضان شریف میں ہوا تھا اسلئے لوگوں نے آپؒ کے سر عام کھانے کے عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت بایزیدؒ کے ہمراہ ایک مرید تھا۔ آپؒ نے اس مرید سے فرمایا ''دیکھا تو نے شریعت مطہرہ کے ایک مسئلہ پر میں نے عمل کیا تو لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ آپؒ کا اشارہ مسئلہ شرعی کی طرف تھا کہ مسافر اگر بحالت مسافرت روزہ نہ رکھے تو اس پر گناہ نہیں۔ وہ اس روزے کی قضا دوسرے ایام میں کر سکتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں حصول ملامت کیلئے ایک بُرا فعل بہتر تھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی دو رکعت نفل لمبے کر کے پڑھے یا اپنے دین کو مضبوطی سے تھام لے تو آج کل کی عوام اس کے متعلق ریاکاری یا منافقت کا فتویٰ دے دیتی ہے۔ داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خلاف شریعت عمل کرے اور خود کو ملامتی ظاہر کرے تو یہ سراسر گمراہی، آفت اور ہوس کاذب ہے۔ اس وضاحت کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ نے ریاکار ملامتی فرقہ کے متعلق کافی طویل بیان لکھا ہے۔ حضرت بایزیدؒ اسی طرح اپنے نفس کا علاج کیا کرتے تھے اور اس کیلئے کبھی نفس پر عتاب فرماتے اور کبھی تکبر کے احساس کا تدارک کرتے۔

مولانا عطارؒ ''تذکرۃ الاولیاء'' میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب آپؒ کو شہر بسطام سے نکال دیا گیا تو آپ نے وجہ دریافت کی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم اچھے آدمی نہیں اس لیے تم کو شہر سے نکالا گیا۔ آپؒ نے فرمایا کہ کتنا اچھا ہے وہ شہر جس کا برا آدمی میں ہوں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کے محیر العقول مجاہدات نفس

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ "اَلنَّفْسُ صِفَةٌ لَا تَسْكُنُ اِلَّا بِالْبَاطِلِ" (نفس ایک ایسی صفت ہے جسے بغیر باطل پرستی کے سکون حاصل نہیں)۔ اور فرمایا اس کی اطاعت بیماری ہے اور اس کی مخالفت دوا "طَاعَةُ نَفْسٍ دَاءٌ وَعِصْيَانُهَا دَوَاءٌ"۔ یہ امر مُسَلَّم ہے کہ شریعت کی اتباع اور طریقت کی ریاضتوں کو اپنانے کا منشا صرف یہ ہے کہ مسلمان تہذیب کے دائرے میں داخل ہو جائے اور اس کے دل میں یقین پیدا ہو جائے۔ نیچے حضرت بایزید بسطامیؒ کے نفس کی بابت چند واقعات بیان کئے جا رہے ہیں۔

۱) حضرت بایزید بسطامیؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ مجاہدات شاقہ میں گزرا۔ آپؒ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے مجاہدات کے بارے میں ہمیں کچھ بتلائیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ بڑے مجاہدات تو در کنار تم میرے معمولی مجاہدات کو سننے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ عرض کیا گیا کہ کسی معمولی مجاہدے کا ذکر فرمائیں تو آپؒ نے فرمایا کہ

میرا نفس ایک عرصہ سے پلاؤ کھانے کی خواہش کر رہا تھا ایک مدت کے بعد میں نے اس سے کہا کہ میں پلاؤ تمہیں اس شرط پر کھلاتا ہوں کہ اس کے بعد مزید کسی چیز کی فرمائش نہ کرنا۔ میرے نفس نے اس شرط کو تسلیم کرلیا اور میں نے پلاؤ پکا کر اسے کہا کہ اسے خوب کھاؤ۔ پلاؤ کھانے کے بعد میرے نفس نے کہا پانی! میں نے کہا خبردار! تم نے معاہدہ توڑا ہے اور اب تمہیں پانی نہیں دوں گا۔ اس کے بعد ایک سال تک میں نے اپنے نفس کو پانی نہیں دیا۔

۴) حضرت بایزیدؒ نے اپنی زندگی کے تیس سال ذکر وفکر، زہد وعبادات اور سخت مجاہدات میں گزارے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد ۱۱۳ مشائخ سے فیض حاصل کیا۔ فرمایا کہ میں حج کے لئے گیا تو بارہ سال میں سجدہ ریزی کرتے ہوئے خانہ کعبہ پہنچا کیونکہ میرے نزدیک خانہ کعبہ دنیاوی بادشاہوں کے دربار کی طرح نہیں تھا کہ جہاں انسان ایک دم پہنچ جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں پہلی بار حج کے لئے روانہ ہوا تو راستے میں ایک بزرگ کے ہاں قیام کیا اس بزرگ نے میرے سفر کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا تم ابھی حج کرنے کے قابل نہیں ہو، چنانچہ حج کا سفر خرچ مجھے دے دو اور میرے گرد سات چکر کاٹ لو تو تمہارا حج ہو جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ واقعی میں اس وقت حج کے قابل نہ تھا اور اس شیخ سے مجھے بہت فیض حاصل ہوا (اس قصے کو مولانا رومؒ نے مثنوی میں بیان کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے ہماری کتاب ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' فرمایا کہ میری ان تھک کوششوں کے باوجود راہِ الٰہی مجھ پر نہ کھلا اور اگر کھلا تو مصائب برداشت کرنے کے ذریعے کھلا۔ روح انسان نسیان (بھولنے والی چیز) ہے۔ اگر انسان کا مادہ انس سے ہو تو محبت کرنے والا کہلائے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز بھول جاتی ہے لیکن اگر انس سے منفی کی طرف ہو تو خدا کو بھول جاتا ہے۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ طریقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہوتا ہے اور تکبر طریقت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کروں کہ وہ مجھ کو کھانے، پینے کی تکلیف سے اور عورتوں کی تکلیف سے بچالے۔ پھر خیال کیا جب رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال نہ کیا تو میرے لئے یہ سوال کس طرح جائز ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی تکلیف سے مجھے ایسا بچایا کہ اب مجھے پرواہ نہیں کہ میرے سامنے کوئی عورت ہے یا دیوار ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن بزرگوں کو قبولیت عطا کرنا چاہتا ہے تو ان پر کوئی ایسا فرعون مقرر کر دیتا ہے جو ہمہ وقت انہیں اذیت پہنچاتا ہے۔ اپنی خواہشات کو چھوڑ دینے سے بندہ واصل باللہ ہو جاتا ہے اور جو واصل باللہ ہو جائے تو مخلوق اس کی فرمانبردار ہو جاتی ہے۔ جس کو خدا شناسی حاصل نہ ہو تو جہنم اس کے لئے عذاب بن جاتی ہے لیکن جو خدا شناس ہو تو وہ شخص جہنم کے لئے عذاب ہوتا ہے۔

۳)　حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں بارہ سال تک جنگلوں میں اپنے نفس کے حق میں لوہار بنا رہا اور نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ میں گرم کر کے ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ آخر کار میں نے اسے آئینہ بنالیا۔ پانچ سال آئینہ بنانے میں صرف ہوگئے۔ طرح طرح کی ریاضتوں سے اس آئینے کو صیقل کیا۔ پھر ایک سال اس کو اغیار کی نظر سے دیکھا تو پھر بھی اس کو غرور، اطاعت کے بھروسے اور عمل کی خود پسندی میں مبتلا دیکھا۔ پانچ سال مزید کوشش کرنے کے بعد پھر جب دیکھا تو یہ مردہ تھا، چنانچہ چار تکبیر جنازہ پڑھ کر اس سے فارغ ہوا۔

۴)　''سبع سنابل'' میں روایت نقل ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ میں نے چالیس سال ریاضت کے بعد اسی ہزار پردے اٹھائے اور گڑگڑایا کہ اب مجھے راہ بتائی جائے۔ خطاب ہوا کہ اس ٹوٹے ہوئے پیالے اور پوستین کے ٹکڑے کے ہوتے ہوئے تمہیں راہ نہیں مل سکتی (جو کچھ رکھتے ہو، اسے پھینک دو) میں نے فوراً انہیں پھینک دیا۔ ندا آئی اے بایزیدؒ! اب ان مدعیانِ فقر سے کہہ دو کہ بایزید نے چالیس سال کی ریاضت کے باوجود جب تک ٹوٹا ہوا پیالہ اور پوستین کا ٹکڑا نہ پھینک دیا، اسے کوئی ثمر نہ ملا۔ مدعیانِ فقر تم تعلقاتِ دنیا سے بندھے ہونے کے باوجود فقر کے مدعی ہو اور تم نے طریقت کو اپنی خواہشاتِ نفسانیہ کا بہانہ اور جال بنا رکھا ہے۔ تم ہرگز کوئی پھل نہ پاسکو گے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ کی زبان پر دنیا کا ذکر آجاتا تو آپؒ وضو کرتے اور اگر جنت کا ذکر آجاتا تو غسل فرماتے۔ لوگوں نے جب سبب پوچھا تو فرمایا کہ دنیا محدث (قدیم کا الٹ) ہے، لہٰذا اس کا ذکر حدث ہوا اور حدث لاحق ہوجائے تو وضو کرنا چاہیے اور جنت خواہشات کے پورا کرنے کی جگہ ہے تو اس کا ذکر موجب جنابت ہوا اور جنابت سے غسل ہی کرنا چاہیے۔

۵)　حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ لکھتے ہیں کہ میں نے ''تحفۃ العارفین'' میں مولانا علاؤ الدینؒ کا یہ مکتوب دیکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کو ایک عرصہ دراز سے سیب کھانے کی خواہش تھی مگر آپ نے نہ کھایا۔ ایک دن ایک شخص آپؒ کی خدمت میں کچھ سیب لایا تو آپ نے ایک سیب کو ہاتھ میں لے کر تبسم فرمایا اور پھر تمام سیب حاضرین میں تقسیم کر دیے اور بعد ازاں یہ فرمایا کہ اگر میں نفس کی آرزو پوری کر دوں تو یہ مجھ پر غالب آجائے گا۔ فرمایا جو شخص نفس کی آرزو پوری کرے گا اس کے عمل میں سستی واقع ہوجائے گی۔

۶)　ایک موقع پر حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ جب میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ کلام وہ ہے جو دل سے ہو تو میں نے تیس سال کی نمازیں دوبارہ پڑھیں۔ اس کے بعد تیس سال تک پھر التزام کیا کہ جس وقت نماز میں دنیا کا خیال آجاتا تو میں اس نماز کو دوبارہ پڑھتا اور آخرت کا تصور آجاتا تو سجدۂ سہو کرتا تھا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے مجاہدات اور نفس پر اقوال

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ "اَسَاسُ الْکُفْرِ قِیَامُکَ عَلٰی مُرَادِ نَفْسِکَ" (کفر کی بنیاد یہ ہے کہ تم نفس کی مراد پوری کرو)۔ اس لئے کہ مطابقت نفس مخالفت حق عز وجل ہے اور مخالفتِ نفس تمام حجابات کے مرتفع ہونے کا سرچشمہ ہے۔ کشف المحجوب میں ہے کہ کچھ مشائخ کرام نے نفس کے بارے میں حضرت ذوالنون مصریؒ قدس سرہ کا قول نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اَشَدُّ الْحِجَابِ رُؤْیَةُ النَّفْسِ وَتَدْبِیْرُھَا" (بندے کا حجاب نفس کو دیکھنا ہے اور اس کی تدبیر کا اتباع کرنا ہے)۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سری سقطیؒ کو کسی نے نوے سال کی عمر تک کمر کو زمین پر لگائے ہوئے نہیں دیکھا۔ فرماتے ہیں کہ حضرت سری سقطیؒ کو ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ چالیس سال سے میرا نفس یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ایک گاجر شہد میں ڈبو کر کھاؤں مگر میں نے نفس کی اطاعت نہیں کی۔ نیچے حضرت جنید بغدادیؒ کے نفس کی بابت چند واقعات اور اقوال بیان کئے جا رہے ہیں۔

۱) حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے، "میں نے دس برس دل کے دروازے پر بیٹھ کر دل کی حفاظت کی۔ پھر دس برس تک میرا دل میری نگرانی کرتا رہا۔ اب بیس برس ہو گئے ہیں کہ نہ میں دل کی خبر رکھتا ہوں اور نہ دل میری خبر رکھتا ہے۔ اس حالت کو تیس سال ہو گئے ہیں کہ ہر طرف حق تعالیٰ کو ہی دیکھتا ہوں، اس کے سوا باقی کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔"

۲) فرماتے ہیں کہ سلوک میں مراقبۂ باطن کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے خود اپنے گھر کی سیڑھی کے نیچے بیٹھ کر چالیس سال تک مراقبہ کیا۔ فرمایا کہ جس کی کڑی نگرانی مراقبے کی غایت پر ہو تو اس کی ولایت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ عوارف المعارف میں آپ کا قول ہے کہ تم گھڑی بھر کے لئے ہر چیز کے ملاحظے سے معطل ہو کر بیٹھ جاؤ تا کہ دن میں تمہارا کچھ وقت خدا کے لیے مخصوص ہو جائے۔ ایک مرتبہ آپ کی طبیعت ناساز تھی تو کسی نے عرض کیا کہ یہ وظیفہ آپ کل پر چھوڑ دیں تو آپ نے فرمایا کہ تصوف میں اوقات گنے چنے ہوتے ہیں لہٰذا اوراد میں سے ایک ورد کا بھی دوسرے وقت پر ٹالنا ممکن نہیں ہوتا۔

۳) آپ کا فرمان ہے کہ تصوف تو ایک جنگ ہے جس میں کوئی صلح نہیں۔ تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور تیرے درمیان کوئی واسطہ باقی نہ رہے۔ اپنے نفس کی مدافعت کے ساتھ تمام عمر یہ جنگ باقی رہتی ہے۔ فرمایا کہ تصوف بدایت کی طرف لوٹنے کا نام ہے کیونکہ بدایت کی طرف رجوع کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرنا ہے اور ہر شے کا مبتدا اور منتہا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

باب نمبر۲۱

اعمال صالحہ اور تہذیبِ نفس

نفس اور روح کی کشمکش

قدرت نے انسان کو بیک وقت دو قوتیں دے رکھی ہیں (۱) قوتِ نورانی (۲) قوتِ حیوانی۔ قوتِ نورانی روح کی قوت ہے اور قوتِ حیوانی نفس کی قوت ہے، پس اگر کوئی شخص نفس کی خواہشات میں مگن ہوجائے تو اُس کی نورانی قوت کمزور ہوجائے گی اور اگر وہ صرف روح کو قوی کرنے میں لگ جائے تو نفس کمزور ہوگا مگر اس میں احتیاط یہ لازم ہے کہ سر بسر نفس کو پامال ہی نہ کر دیا جائے جیسا کہ راہب لوگ کرتے ہیں اور رہبانیت کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے "اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا" [۱] (تجھ پر تیرے نفس کا بھی حق ہے)۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں اعتدال اور توازن ہے اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ان دونوں قوتوں کو اعتدال پر رکھنے کیلئے اپنے آپ پر اتباعِ سنت لازم کرلے۔ اتباعِ سنت کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ نفس جس کو "اَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" (برائی کا بہت حکم کرنے والا) کہتے ہیں اس کی سرکشی میں بتدریج (آہستہ آہستہ) کمی آتی جائے گی اور روح کی قوتِ نورانیہ میں اضافہ ہوتا جائے گا حتیٰ کہ وہ نفس "اَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" کی حالت سے ترقی پاکر نفس مطمئنہ ہوجائے گا اور روح کے ساتھ مزاحم ہونے کی بجائے اس کے موافق ہوجائے گا۔

---

[۱] المستدرک، حدیث ۶۹۰۰، جلد۵، صفحہ ۱۸۰۔

اصلاحِ نفس کا منہاج

اسلام میں نفس کی تربیت ایک عظیم خصوصیت ہے۔ اسلام میں نفس کی اصلاح کا نہایت فطری طریقہ بتایا گیا ہے۔ اسلام میں رہبانیت سے سختی سے منع کیا گیا ہے اس لئے اصلاحِ نفس کیلئے اسلام معاشرتی زندگی کے دائرہ کار سے باہر کوئی گوشہ اختیار کر لینا ضروری قرار نہیں دیتا۔ انسان اگر اصلاحِ نفس کا خواہش مند ہے تو وہ اپنے روزمرہ کے کاروبار میں مشغول رہتے ہوئے بھی اس مقصد کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام میں کامیابی کا دارومدار اصلاحِ نفس پر ہے۔ بعثتِ نبوی ﷺ کا ایک اہم مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ اصلاحِ نفس کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

ا۔ ایمان کی پختگی

اللہ تعالیٰ کے موجود و بصیر ہونے کا پختہ یقین، رسول اکرم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ اور ان کی محبت و اطاعت اور آخرت میں جواب دہی پر یقین اصلاحِ نفس کیلئے سنگ بنیاد ہے۔ یہ یقین جس قدر پختہ ہوگا اسی قدر آخرت کی ابدی زندگی پر غیر متزلزل اعتقاد ہوگا۔ یہ انسان کے اندر جوابدہی کا وہ احساس پیدا کرتا ہے جو اصلاحِ نفس کیلئے مددگار ہوتا ہے۔ ان اعتقادات کی کمی یا کمزوری انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اصلاحِ نفس سے غافل یا قاصر رہتا ہے۔ اس کے برعکس ایمان کی پختگی اصلاحِ نفس کیلئے نہایت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ ارکانِ اسلام پر نظر رکھنا

ایمان کی پختگی عبادات پر منحصر ہے۔ عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) کی شعوری ادائیگی اور سوچ سمجھ کر بجا لانے سے ایمان میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ بھی پیدا ہوتا ہے۔ الغرض وہ نظری وفکری علاج تھا اور عبادات عملی علاج ہے اگر ایک مسلمان پورے شعور اور یقین کے ساتھ ارکانِ اسلام پر عمل کرے تو اس کی زندگی میں وہ استحکام آئے گا کہ شیطان اور اس کی ذریت کا اس کے نفس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

۳۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا

اصلاحِ نفس میں یہ فریضہ ایک انقلابی قدم ہے اس سے اول تو ضمیر بیدار ہوتا ہے اور دوسرا ماحول سازگار ہوتا ہے اور یہ ضروری ہے کہ مسلمان کو اپنی اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ دوسرے انسانوں کی ہدایت کا بھی پورا پورا خیال ہو اور مناسب طریقے سے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہے۔ مسلم معاشرے میں سب افراد ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اس سلسلے میں آغازِ تبلیغ اپنے اہل خانہ، قریبی رشتہ داروں اور دوستوں

سے کرے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کی حس زندہ رہے۔

۴۔صحبتِ صالح کا اہتمام کرنا

انسان پر صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر صحبت اچھی ہو تو وہ صالح بن جاتا ہے اور صحبت بُری ہو تو وہ بھی بُرا بن جاتا ہے اس لیے اصلاحِ نفس کے خواہش مند لوگوں کو نیک صحبت کا اہتمام کرنا ضروری ہے انسان کی اصلاح میں تمام حواس کا اثر ہے اور ان حواس پر جس قدر زیادہ نیک اثرات ہوں گے اتنا ہی وہ نیکی کی طرف زیادہ مائل ہوتا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسِ انسانی نیک اور بُرے خیالات وخواہشات سے مرکب ہے۔ صرف پروردگار کی رحمت کے طفیل ہدایت واستقامت حاصل ہوسکتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ اسی بنا پر ہمیشہ طلبِ ہدایت کی دعا فرمایا کرتے تھے کہ امت کو تعلیم دیں۔اس بات پر آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہدایت فضلِ ایزدی پر منحصر ہے۔ہمیں مقدور بھر کوشش کے بعد صرف رحمتِ الٰہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اگر ہم اپنے ایمان کو یقینِ محکم میں بدل لیں اور ارکانِ اسلام کو آداب وشعور سے ادا کریں اور نفس پر کڑی نظر رکھیں تو انشاء اللہ تعالیٰ نفس امارہ نفسِ لوّامہ میں بدل جائے گا اور نفسِ لوّامہ، نفسِ مطمئنہ میں تبدیل ہوجائے گا جس سے یہ زندگی پُرسکون ہوگی اور جنت میں بلند مقام ملے گا۔ اصلاحِ نفس مشکل ضرور ہے مگر ہر مشکل کی طرح اس کا حصول بھی طلبِ صادق اور عزمِ صمیم پر منحصر ہے۔ چنانچہ ایک قابلِ عمل منصوبہ،مضبوط ارادہ اور مسلسل محنت ہی اصلاحِ نفس کو آسان کردیتی ہے اور آخرت کی یاد اس کیلیے روشنی کا مینار ثابت ہوتی ہے اس لیے کہ وہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہوگا۔

۵۔روزہ اور اصلاحِ نفس

رمضان المبارک کا پورا مہینہ نیکی اور خیر کا مہینہ ہے اور ہر مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق خیرات وحسنات کی طرف بڑھتا ہے جس کی بدولت نیکی پر چلنا آسان تر ہوجاتا ہے۔روزہ سے تقویٰ اور صبر کی صفات پیدا ہوتی ہیں جو نفس کی تمام بیماریوں کا تریاق اور زندگی میں کامیابی کا زینہ ہیں۔ پورے شعور اور آداب سے روزے رکھ کر ہم صحت یاب اور کامیاب ہوسکتے ہیں۔روزہ شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔روزہ دار کا دل پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبالب بھرا ہوتا ہے۔اس میں غیر اللہ کی محبت کیسے آئے۔نماز نے مومن کے اندر اللہ تعالیٰ کا رنگ پیدا کیا۔زکوٰۃ نے اسے اور گہرا کیا اور روزہ نے اسے بالکل نکھار دیا۔

۶۔گناہوں سے بچنے کی مشق

اگر روزہ دار صحیح جذبے اور پورے شعور سے روزہ رکھے تو اسے اللہ تعالیٰ کی تمام حرام کردہ اشیاء سے

بچنا ہوگا۔ روزہ میں بندۂ مومن سے حلال وطیب چیز چھڑا کر اسے یہ تربیت دی جاتی ہے کہ مومن اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء سے ہمیشہ ہمیشہ بچتا رہے گا۔ حضور ﷺ کے ارشادات اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ''پس جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ نہ بدکلامی کرے اور نہ غل مچائے اور اگر کوئی اس سے گالی گلوچ یا لڑنے جھگڑنے پر اتر آئے تو کہے کہ ''میں روزہ سے ہوں۔'' ''جس کسی نے (روزے کی حالت میں) جھوٹ بولنا، جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا وہ جان لے کہ اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کے پلے اپنے روزوں سے پیاس کے سوا اور کچھ نہیں۔''[1]

۷۔ تربیتِ بندگی

جب رات کو مومن اللہ تعالیٰ کے حضور قیام کرتا ہے اس کے احکام سنتا ہے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کبھی رکوع کرتا ہے اور کبھی سربسجود ہو جاتا ہے تو اس مشق سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ روزہ سے مومن کو تربیت دی جاتی ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر رہے۔ روزہ کے شروع ہوتے ہی حلال وطیب رزق ممنوع ہو جاتا ہے اور غروب کے بعد وہی رزق پھر استعمال کرنا حلال ہو جاتا ہے۔ روزہ دار اگر چاہے تو چھپ کر کھا پی سکتا ہے لیکن وہ روزہ کے دوران پانی کو چھوتا تک نہیں کیونکہ اس کا اس بات پر یقین ہے کہ اس کا رب اس کو دیکھتا ہے اور یہ جذبہ اصلاحِ نفس کیلیے آبِ حیات ہے اور بندگی کی روح کیلئے نفس کو پاک کرنے میں مؤثر ترین علاج ہے۔

۸۔ خواہشِ نفس پر اللہ تعالیٰ سے رجوع

''عوارف المعارف'' میں ہے کہ جب کسی صالح یا درویش کے دل میں کوئی خواہش رونما ہو تو اس کی دو حالتوں میں سے ایک حالت ضرور ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ وہ رزق یا چیز جس کی خواہش ہو یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے اور اس کی آمد کا درویش کو علم ہو جاتا ہے اور وہ خواہش کرتا ہے۔ دوسری حالت یہ کہ خواہش کسی گناہ کی سزا کے طور پر ہوتی ہے چنانچہ جب فقیر کا دل کسی چیز کا بار بار مطالبہ کرے تو اس وقت فقیر کو چاہیے کہ اُٹھے اور اچھی طرح وضو کرے، دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ الٰہی! اگر یہ مطالبۂ نفس کسی گناہ کی سزا ہے تو میں تجھ سے بخشش اور مغفرت کا طالب ہوں، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور اگر میرا یہ مطالبہ اس رزق کیلئے ہے جو تو نے میرے لیے مقدر کر دیا ہے تو پھر اس کو جلدی میرے پاس پہنچا دے۔ پس اللہ تعالیٰ یا تو اس کو وہ چیز دے دے گا یا اس خواہش کو اس کے دل سے رخصت کر دے گا۔

---

[1] بخاری شریف، حدیث ۱۸۰۴، جلد ۲، صفحہ ۶۷۔

۹۔مجاہداتِ نفس

مجاہدات سے نفس پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔اس موضوع پر اس کتاب میں الگ مضمون دے دیا گیا ہے۔یہاں صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ مجاہدات کرتے رہنے سے صوفیاء پر مشاہدات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔''کشف المحجوب'' میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس بات پر لوگوں کے دو قسم کے خیالات ہیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر مجاہدات کیے جائیں تو مشاہدات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر مشاہدات ہو جائیں تو انسان مجاہدات کرنے لگتا ہے۔کسی بزرگ کا ارشاد ہے اَلْمُشَاهِدَاتُ مَوَارِیْثُ الْمُجَاهِدَاتِ مشاہدے مجاہدات کی میراث ہیں)۔[۱] اور یہ بھی کہا گیا ہے''مَنْ جَدَّ وَجَدَ''(جس نے کوشش کی اس نے پا لیا)۔حضور شافعِ یوم النشور ﷺ نے باوجود حصولِ قرب اور وصلِ مطلوب کے،عاقبت کی طرف سے بے فکر کئے جانے،معصومیت اور پاکدامنی کے ثابت ہونے کے دن بھر عبادتیں اور راتوں کو شب بیداریاں اس قدر کیں کہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ راتوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قیام کر کے آپ ﷺ کے پاؤں مبارک متورم ہو جاتے۔[۲] آپ ﷺ کے اس مجاہدے اور ریاضت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کو یہ پیغام بھیجا''طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ○''[۳](اے محبوبِ مکرم!)ہم نے آپ پر قرآن (اس لیے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں)نیز یہ بھی فرمایا ''یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ○''[۴](اے کملی کی جھرمٹ والے(حبیب!)آپ رات کو(نماز میں)قیام فرمایا کریں مگر تھوڑی دیر(کیلئے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مسجد کی تعمیر میں حصہ لینے کیلئے پتھر اٹھا رہے تھے اور آپ کو تکلیف ہو رہی تھی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا،''یارسول اللہ ﷺ یہ خدمت میرے سپرد کردیں مگر آپ ﷺ نے فرمایا''خُذْ غَیْرَهَا فَاِنَّهٗ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَةِ''[۵](تم اور پتھر اٹھاؤ کیونکہ دنیا کا آرام تو کچھ نہیں،آرام تو آخرت کا ہے)۔(یہ مقام مشقت اور ریاضت کا ہے)۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مجاہدہ یا ریاضت اللہ تعالیٰ کے قرب کا سبب بنتا ہے اور کہتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہ مجاہدہ کرتے ہیں''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط''[۶](اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد(اور مجاہدہ)کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سیر اور وصول کی)راہیں دکھا دیتے ہیں)۔اور کچھ یہ بھی کہتے

---

[۱] کشف المحجوب،صفحہ ۳۹۶۔
[۲] صحیح بخاری،حدیث ۴۵۵۶،جلد ۴،صفحہ ۱۸۳۰۔
[۳] طٰہٰ،۲۰:۱،۲۔
[۴] المزمل،۷۳:۱،۲۔
[۵] مسند احمد بن حنبل،حدیث ۸۹۳۸،جلد ۲،صفحہ ۳۸۱۔
[۶] العنکبوت،۲۹:۶۹۔

ہیں کہ عمل سے نجات نہیں حالانکہ ایک حدیث میں یوں آیا ہے: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَارِبُوْا وَسَدِّدُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّهٗ لَنْ یَّنْجُوَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ بِعَمَلِهٖ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ" [1] (حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صحیح اور پختہ عزم کرو اور پھر اس پر ثابت قدم رہو اور جان لو کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کے بل بوتے پر نجات نہیں پائے گا صحابہ کرام ؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ بھی نہیں فرمایا میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لے)۔

کہتے ہیں کہ ان آیات سے مجاہدات کی نفی ہوتی ہے اور اگر مجاہدہ ہی قرب کا سبب ہوتا تو ابلیس مردود نہ ہوتا ایک گروہ کہتا ہے: "مَنْ طَلَبَ وَجَدَ" (جس نے طلب کیا اس نے پالیا)۔ اور دوسرا کہتا ہے۔ "مَنْ وَجَدَ طَلَبَ" (جس نے پایا اس نے طلب کیا)۔ حضور داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ کیلئے ضروری نہیں کہ مجاہدہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کیلئے ہم اگر فرشتے بھی نازل کریں اور مردے بھی باتیں کریں تو جب تک ہم نہ چاہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر فرمایا "وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝" [2] (اور وہ لوگ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا (سب) پر ایمان لاتے ہیں، اور وہ آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں)۔

مجاہدہ تو اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ توفیقِ اطاعت دے اور مشاہدہ محض عطاءِ الٰہی سے ہوتا ہے تو جب اطاعت توفیقِ الٰہی سے ہے تو یہ توفیق بھی اس وقت تک نہ ملے گی جب تک اطاعت نہ کرے، گویا اطاعت کا ارادہ اور جذبہ پیدا کر دو توفیقِ اطاعت ملے گی۔ توفیقِ اطاعت ملی تو اطاعت کرو گے اور اطاعت ہوگی تو مشاہدہ بھی ملے گا۔ [3]

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ منزل رسیدہ کو بے شک آسودگی یعنی آرام ہوتا ہے مگر طالب کیلئے آرام کرنا درست نہیں۔ اس کیلئے مجاہدہ کرنا ضروری ہے۔ انسان کا آج گزشتہ کل سے بہتر ہونا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ" [4] (جس کے دو دن مساوی ہو گئے وہ نقصان میں ہے)۔ سالک کو چاہیے کہ وہ عبادت و ریاضت اور محنت و مجاہدہ میں روز بروز ترقی کرے۔ جوں جوں وہ ریاضت زیادہ کرتا چلا جائے گا توں توں اس کے روحانی مدارج بلند ہوتے جائیں گے اس پر آنے والا کل ریاضت و مجاہدہ کے اعتبار سے بہتر ہونا ضروری ہے بلکہ ہر اگلا لمحہ گزشتہ گھڑی سے بہتر ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث ۲۸۱۷، جلد ۴، صفحہ ۲۱۷۱۔
[2] البقرہ، ۲: ۴۔
[3] کشف المحجوب، صفحہ ۲۰۴۔
[4] التفسیر الکبیر، جلد ۲۵، صفحہ ۱۶۵۔

حضور ﷺ نے اسی تصور کو یوں ارشاد فرمایا "اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا" [1] استقامت اختیار کرو مگر ایک حالت پر نہ رہو۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اسی لیے فرمایا کہ۔

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

(ب ج:۳۵۴)

حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں کہ گھوڑے کے اندر جو صفتِ اطاعت پوشیدہ ہے اس کو ظاہر کرنے کیلئے ریاضت سبب بنتی ہے اسی لئے گھوڑے کی تربیت کیلئے اس کو مشقت میں ڈالتے ہیں مگر گدھے میں یہ صفت نہیں۔ اس لئے گدھے کی عین بدل کر گھوڑا نہیں بنایا جا سکتا۔ مطلب یہ کہ ہم بھی مجاہدے کریں گے تو صفاتِ محمودہ کھل جائیں گے اور اگر گھوڑے کو مشقت و ریاضت میں ڈال کر اسے سدھانے میں غفلت کریں تو وہ بھی اطاعت و فرمانبرداری سے منہ موڑ لے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ نفس ایک کتا ہے اور کتے کی کھال بغیر دباغت اور رنگائی کے پاک نہیں ہوتی۔ [2]

حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں کہ نفس کو قبضہ اور قابو میں لانے کیلئے ریاضت اشد ضروری ہے لیکن چونکہ یہ نفس عین ہے اور اس کی عین کو بدلا نہیں جا سکتا۔ چونکہ یہ مخلوقِ خداوندی ہے اس کو مارا بھی نہیں جا سکتا البتہ اگر اس کی شناخت ہو جائے تو طالب اس سے چوکنا رہتا ہے اور طالب کو اس کے باقی رہنے کا خوف نہیں رہتا "لِاَنَّ النَّفْسَ كَلْبٌ نَبَّاحٌ وَ اِمْسَاكُ الْكَلْبِ بَعْدَ الرِّيَاضَةِ مُبَاحٌ" [3] (نفس ایک بھونکنے والا کتا ہے اور ریاضت اور اصلاح کے بعد کتے کو باندھ رکھنا مباح ہے)۔

مخالفتِ نفس

تمام انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرامؒ نے نفس کی مخالفت اور سرزنش پر زور دیا ہے۔ یہاں کچھ اولیائے کرامؒ کے فرامین پیش کیے جا رہے ہیں۔ حضرت ابوالقاسمؒ کہتے ہیں کہ اتباعِ ھوی (خواہشات کی پیروی) حق سے روکتی ہے، لمبی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں اور مباحات کا ترک کرنا باعثِ کرامات ہے۔

نفس کی مخالفت اصل عبادت ہے اور صوفیاء نے فرمایا ہے کہ مخالفت کی تلوار سے نفس کو ذبح کرنے کا نام اسلام ہے۔ حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں جو شخص اپنی دنیاوی خواہشات پر غالب آ گیا، شیطان اس کے سائے سے الگ کر دیا گیا۔

---

[1] شعب الایمان، حدیث ۲۸۰۲، جلد ۳، صفحہ ۳۷۔
[2] کشف المحجوب، صفحہ ۲۰۵۔
[3] کشف المحجوب، صفحہ ۲۰۸۔

جس کے نفس کی خواہشات ظاہر ہوتی ہیں اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی محبت کے ستارے غروب ہو جاتے ہیں۔ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں غور و فکر عبادت کی کنجی ہے اور درست کام کرنے کی نشانی یہ ہے کہ نفس اور خواہشات کی مخالفت کی جائے اور خواہشات کو ترک کر دیا جائے۔ حضرت ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ جس نے نفس کی باگ ڈور چھوڑ دی وہ نفس کی برائیوں میں نفس کا شریک ہے۔

حضرت ابوحفصؒ فرماتے ہیں کہ جس نے نفس کی مخالفت نہیں کی اور اپنی زندگی میں اسے ایسے کاموں میں نہیں لگایا جنہیں نفس ناپسند کرتا ہے تو وہ شخص دھوکا کھا گیا اور جس نے نفس کی کسی ایک چیز کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ عقلمند آدمی نفس سے راضی نہیں ہوتا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام (جو کہ نبیوں کی نسل سے ہیں) انھوں نے بھی بالآخر فرما دیا کہ "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ" [1] (میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا)۔

حضرت ابوبکر طمستانیؒ فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کے قابو سے نکلنا سب سے بڑی نعمت ہے کیونکہ تمہارا نفس ہی اللہ تعالیٰ اور تمہارے درمیان بہت بڑا حجاب ہے۔ حضرت سہلؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی نفس اور اس کی خواہشات کی مخالفت سے بہتر کسی طرح نہیں کی گئی۔

کسی نے حضرت ابن عطاءؒ سے پوچھا کہ وہ کون سی چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ بہت جلد ناراض ہو جاتا ہے۔ فرمایا نفس اور اس کے احوال کو دیکھنا اور اس سے بھی سخت بات یہ ہے کہ انسان نفس کے افعال پر معاوضہ کی امید رکھے۔

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ سے روایت ہے کہ آپؒ فرماتے تھے کہ میں نے چالیس برس تک کبھی چھت کے نیچے رات نہیں گزاری اور نہ ہی ایسی جگہ رات گزاری جہاں پر تالا لگا ہو۔ بعض اوقات میں چاہتا تھا کہ مجھے پیٹ بھر کر مسور کی دال مل جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ ایک بار جب میں شام میں تھا تو کوئی میرے پاس ایک بڑا پیالہ جس میں مسور کی دال تھی لایا میں نے پیٹ بھر کر کھالی اور باہر نکل گیا۔ جب میں بازار میں آیا تو ایک دکان پر بوتلیں لٹکی ہوئی دیکھیں۔ میں نے ان کو سرکہ کی بوتلیں سمجھا۔ کسی نے مجھے کہا کہ تو کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ شراب کے نمونے ہیں اور ان مٹکوں میں بھی شراب ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اب تو مجھ پر ایک فرض عائد ہو گیا ہے۔ میں دوکان میں گھسا اور تمام مٹکوں کو انڈیلتا گیا۔ دوکان دار یہ سمجھا کہ میں سلطان کے حکم سے انڈیل رہا ہوں مگر جب اسے حقیقت کا علم ہوا تو وہ مجھے ابن طولون کے پاس لے گیا جس نے مجھے دو سو درے لگائے

---

[1] یوسف، ۱۲: ۵۳۔

اور قید بھی کر دیا۔ ایک مدت تک میں قید رہا یہاں تک کہ میرے استاد ابو عبداللہ المغربیؒ اس شہر میں آئے اور میری سفارش کی۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمانے لگے کیا کیا تھا؟ میں نے عرض کیا پیٹ بھر کر دال کھائی اور دو سو دُرّے کھائے۔ ابو عبداللہ المغربیؒ نے جواب دیا سستے چھوٹے۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سری سقطیؒ جن کو نوے سال کی عمر میں زمین پر کمر لگاتے نہیں دیکھا، میں نے ان کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تیس چالیس سال سے میرا نفس مجھ سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ میں ایک گاجر شہد میں ڈبو کر کھاؤں مگر میں نے نفس کی اطاعت نہیں کی۔

عبدالرحمٰن سلمیؒ فرماتے ہیں کہ میرے دادا فرماتے تھے کہ انسان کیلئے آفت اس بات میں ہے کہ اس کا نفس جو کام کر رہا ہے وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرے۔

یوسف بلخیؒ نے کوئی چیز حضرت حاتم اصمؒ کے پاس بھیجی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ کسی نے پوچھا آپ نے اسے کیوں قبول کیا؟ فرمایا کیونکہ لینے میں ان کی عزت پائی جاتی تھی اور میری ذلت اور اس کے رد کرنے میں میری عزت تھی اور ان کی ذلت۔

ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے تھے کہ اگر کوئی نیک عمل دن میں کرے تو اللہ تعالیٰ اسی رات اس کا اجر عطا کر دیتا ہے اور رات کے عمل کا اجر صبح دے دیتا ہے اور جو اپنی خواہشات کو صدقِ دل سے ترک کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو خواہشات کی تکلیف سے محفوظ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی کی کہ "اے داؤد! لوگوں کو اپنی خواہش کی چیزیں کھانے سے بچاؤ اس لئے کہ جو لوگ دنیا کی خواہشات میں لگے رہتے ہیں ان کی عقلیں مجھ سے حجاب میں رہتی ہیں"

سورہ الفرقان میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہی بدبخت اور خواہش پرست لوگوں کی بابت ارشاد فرمایا ہے کہ "وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ۝" (تو نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو (دنیوی مال و اسباب سے) اتنا بہرہ مند فرمایا، یہاں تک کہ وہ تیری یاد (بھی) بھول گئے، اور یہ (بدبخت) ہلاک ہونے والے لوگ (ہی) تھے)[1] حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں بھی اسطرح کی روایت موجود ہے آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کرتے ہیں "یَا رَبِّ اِنَّکَ اَعْطَیْتَنِیْ الْمَالَ وَالْوَلَدَ فَلَمْ یَقُمْ اَحَدٌ عَلٰی بَابِیْ یَشْکُوْنِیْ بِظُلْمٍ ظَلَمْتُهٗ وَاَنْتَ تَعْلَمُ ذٰلِکَ وَاَنَّهٗ کَانَ یُوْطَأُ لِیَ الْفِرَاشُ فَاَتْرُکُهَا وَاَقُوْلُ لِنَفْسِیْ یَا نَفْسُ اِنَّکِ لَمْ تُخْلَقِیْ لِوَطْءِ الْفِرَاشِ وَ مَا تَرَکْتُ ذٰلِکَ اِلَّا ابْتِغَاءَ

[1] الفرقان، ۲۵:۱۸۔

فَضْلِکَ"

(اے میرے رب بے شک تو نے مجھے مال اور اولاد عطا کی ہے پس کوئی بھی میرے دروازے پر نہیں کھڑا ہوا جو اس ظلم کی شکایت کرتا ہو جو میں نے اس پر کیا ہو، اور میرے رب تو یہ بہتر جانتا ہے، بستر جو میرے لیئے بنا گیا میں نے اسے چھوڑ دیا ہے اور میں اپنے نفس سے کہتا ہوں، اے نفس تو بستر کو روندنے کے لیئے نہیں بنایا گیا اور میں نے یہ (بستر) نہیں چھوڑا مگر صرف تیری رضا کی خاطر) [1]

کثرت نعمت گداز از دل برد ناز می آرد نیاز از دل برد

(نعمتوں کی کثرت دل سے سوز و گداز لے جاتی ہے اس سے دل میں تفاخر پیدا ہو جاتا ہے اور نیاز مندی چلی جاتی ہے)

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام نم بچشم منعمان کم دیدہ ام

(کئی سال میں جہان میں پھرا ہوں۔ میں نے اہل نعمت کی آنکھوں میں آنسو کم ہی دیکھے ہیں)

حضرت ابوتراب نجشیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نفس نے صرف ایک بار خواہش کی کہ اس نے روٹی انڈا کھانا چاہا۔ اس وقت میں سفر میں تھا۔ میں ایک بستی کی طرف ہو لیا۔ ایک شخص اٹھا اور مجھ سے چمٹ گیا اور کہا تحقیق یہ چوروں کے ساتھ تھا۔ لوگوں نے مجھے ستر دُرّے مارے۔ ان میں سے ایک شخص نے مجھے پہچان لیا کہ یہ ابوتراب نجشیؒ ہیں۔ لوگوں نے مجھ سے معافی مانگی۔ ایک شخص تعظیم اور مہربانی کے طور پر مجھے گھر لے گیا روٹی اور انڈہ پیش کیا۔ میں نے اپنے نفس سے کہا کہ ۷۰ دُرّے کھانے کے بعد اسے کھاؤ۔ [2]

بزرگوں کا قول ہے کہ اگر کسی مومن کو ایک ہزار خواہشات درپیش ہوں تو وہ انہیں خوفِ الٰہی کی وجہ سے دل سے نکال دیتا ہے اور اگر کافر کو ایک بھی خواہش پیش آئے تو یہی اس کے دل سے خوف کو نکال دیتی ہے۔ یعنی مومن کی خواہش خوف کی وجہ سے نکل جاتی ہے اور کافر کی خواہش دل کے خوف کو نکال دیتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر تو اپنی باگ خواہش کے ہاتھ میں دے دے گا تو وہ تجھے تاریکی کی طرف لے جائے گی۔ تاریکی نفس کی ذات کی صفت ہے۔ حضرت یوسف بن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ بے قرار کر دینے والا خوف اور شوق ہی دل سے خواہشات کو نکال دیتا ہے۔ حضرت خواصؒ فرماتے ہیں کہ جس نے خواہش ترک کی اور اس سے اس کے دل کو تقویت نہ ملی تو سمجھ لو کہ اس کے ترک کرنے میں وہ جھوٹا ہے۔

خواہشاتِ نفسانیہ کی مخالفت سے دل کو تقویت ملتی ہے اور دل کی قوت سے روح کی نورانیت میں

---

[1] حلیۃ الاولیاء، جلد ۲، صفحہ ۳۷۳۔

[2] رسالہ قشیریہ، صفحہ ۴۸۔

اضافہ ہوتا ہے لیکن نفس ہمیشہ قلب اور رب تعالیٰ کے درمیان انقطاع (بائیکاٹ) کرانے میں کوشاں رہتا ہے چنانچہ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں ''سالکین راہِ طریقت اپنے اپنے طریقہ واردات میں مختلف ہونے کے باوجود اس امر پر متفق ہیں کہ نفس، قلب اور وصولِ رب تعالیٰ کے درمیان قاطع (رکاوٹ ڈالنے والا) ہے اور یہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری اور رسائی نہیں چاہتا مگر اس وقت جب اس کا زور توڑ دیا جائے، اس کی خواہشات کی پیروی نہ کی جائے اور یوں اس پر مکمل قابو پالیا جائے''۔

اتباعِ سنت میں دل کی قوت

اتباعِ سنت پر ہماری تصنیف ''سنتِ مبارکہ'' کا مطالعہ کیا جائے جس میں سنت کی افادیت کا مفصل ذکر موجود ہے۔ مگر یہاں پر اختصاراً یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سنت نبوی ﷺ کی پیروی سے دل پاکیزہ اور قوی ہو جاتا ہے کیونکہ برائیوں اور مصیبتوں کی نجاست قلب کیلئے بعینہٖ اسی طرح مضر ہے جس طرح بدن میں پیدا ہو جانے والا غلیظ مواد اور فاسد خون، یا جس طرح کھیتی میں اُگ جانے والی بیکار گھاس یا جس طرح سونے اور چاندی میں کھوٹ کی آمیزش جس سے سونے کی قدر نہیں رہتی جب تک کہ وہ کھوٹ سے پاک نہ ہو جائے۔ اسی طرح قلب کو بھی اگر گناہوں سے پاک کر لیا جائے یا اُسے شروع ہی سے پاک رکھا جائے تو اس کی قوت اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ توانا اور قوی ہو کر اپنی مملکت کے تخت پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے اور اپنی رعایا پر صحیح حکومت کرتا ہے یعنی بدن کے تمام اعضا سے خیر اور بھلائی کے کام لیتا ہے اور تمام اعضا اس کے حکم کی اطاعت بجالاتے ہیں لیکن یہ بحالی حکومت اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی جب تک کہ سنت نبوی ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے دل کو اخلاق رذیلہ سے محفوظ نہ رکھا جائے، اسی لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ'' [1] (آپ ﷺ مومن مردوں سے فرما دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں، یہ ان کیلئے بڑی پاکیزہ بات ہے)۔

''ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ'' میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ نظروں کا جھکانا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنا مومنین کے حق میں ایسا ہے جیسے انہوں نے زکوٰۃ ادا کی ہو اور زکوٰۃ کا لغوی معنی ہے پھلنا پھولنا اور بڑھنا۔

غضِ بَصَرْ کے فوائد

غضِ بَصَرْ (نظر نیچی کرنے) سے تین فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

---

[1] النور ۲۴: ۳۰۔

۱) ایمان کی مٹھاس اور لذت

غَـضِّ بَصَرْ کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ایمان کی مٹھاس اور لذت نصیب ہوتی ہے۔ یہ مٹھاس ولذت اس لذت سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہوتی ہے جس لذت سے اس نے نظریں جھکالیں اور اُسے اللہ تعالیٰ کیلئے ترک کردیا کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کسی چیز کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر معاوضہ عطا فرماتا ہے۔

نفس حسن و جمال کو دیکھنے کا شیفتہ ہے یہ قلب کو برانگیختہ کرتا ہے اور آنکھ قلب کی جاسوس ہے اس لیے قلب آنکھ کو حسن و جمال کے تعاقب میں بھیجتا ہے پھر جب آنکھ منظور (دیکھی ہوئی چیز) کے بارے میں اطلاع فراہم کرتی ہے تو قلب اس کے شوق میں متحرک ہو جاتا ہے اور اس کے شوق میں اپنے (زائد) جاسوس سے بھی زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر نے بہت خوب کہا ہے۔

وَكُنْتَ مَتٰى اَرْسَلْتَ طَرْفَكَ رَائِدًا لِقَلْبِكَ يَوْمًا اَتْبَعَتْكَ الْمَنَاظِرُ

(جب تم نے اپنی آنکھ کو ایک روز جاسوس بنا کر بھیجا تا کہ قلب کیلئے مناظرِ حسن دیکھ آئے)

رَاَيْتَ الَّذِىْ لَا كُلُّهٗ اَنْتَ قَادِرٌ عَلَيْهِ وَلَا عَنْ بَعْضِهٖ اَنْتَ صَابِرٌ

(سو جو تو نے دیکھا تم اُسے مکمل حاصل کرنے پر قدرت نہیں رکھتے اور بعض کے حاصل ہونے پر صبر نہیں کر سکتے)

پس اگر آنکھوں کو تعاقب اور کشف وجستجو سے روک دیا جاتا تو دل طلب اور اُمنگ کی آفت سے محفوظ رہ جاتا۔ جو شخص آنکھوں کو آزاد کر دے وہ ہمیشہ حسرتوں میں قید رہتا ہے۔ بے شک نظر سے محبت جنم لیتی ہے تو قلب میں منظور (دیکھی ہوئی چیز) کے بارے میں ربط وتعلق کی ابتدا ہوتی ہے پھر یہ ربط اور زیادہ ہوتا ہے تو وارفتگی کی حالت ہو جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ عشق تک نوبت جا پہنچتی ہے اور عشق حد سے بڑھی ہوئی حالتِ محبت کو کہتے ہیں۔ پھر قلب اپنے منظور ومحبوب کا بندہ اور مطیع بن جاتا ہے اور بادشاہ ہو کر قیدی بن جاتا ہے اور یہ سب نظر بازی کا نتیجہ ہے۔ یاد رہے کہ قلب کو کسی نہ کسی محبوب کی ضرورت ہوتی ہے اور جس شخص کا محبوب ومطلوب اللہ تعالیٰ نہیں ہوگا تو اس کا قلب کسی اور کی آماجگاہ بن جائے گا۔ قرآن کریم میں ہے: ''كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ؀'' [۱] (اس طرح (اس لیے کیا گیا) کہ ہم ان سے تکلیف اور بے حیائی (دونوں) کو دور رکھیں، بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے (برگزیدہ) بندوں میں سے تھے)۔ غور فرمایئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قلب کو رب تعالیٰ کی محبت کیلئے خالص کر رکھا تھا اس لیے باوجود جوان ہونے کے محفوظ رہے۔

---

[۱] یوسف: ۲۴۔

۲) نور وفراست میں اضافہ

غضِ بصر (نظرنیچی کرنے) کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے اور فراست صادق ہوجاتی ہے۔ ابوالنوارس ابن شجاع کرمانی کہتے ہیں ''جس شخص نے اپنے ظاہر کو اتباعِ سنت سے معمور کیا اور باطن کو دوامِ مراقبہ سے آباد کیا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا اور اپنی نگاہوں کو محرمات سے باز رکھا اور حلال کھانا اپنی عادت بنائی تو اس کی فراست کبھی خطا نہ کرے گی''۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کا قصہ بیان کیا اور ان کی ہلاکت کا ذکر کیا پھر فرمایا ''اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ'' [۱] (بے شک اس (واقعہ) میں اہلِ فراست کیلئے نشانیاں ہیں)۔ یہاں ''مُتَوَسِّمِیْنَ'' سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنی نگاہوں کو محارم اور بے حیائی سے محفوظ رکھا تھا۔ پھر غور فرمایئے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو غضِ بصر کے بعد فرمایا ''اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' [۲] (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جزا جنسِ عمل کے مطابق ہوتی ہے، سو جس شخص نے اللہ عزوجل کی حرام کردہ چیزوں سے اپنی نگاہ کو باز رکھا اللہ تعالیٰ اُسے اس سے بہتر جزا عطا فرمائے گا یعنی اُس نے آنکھ کے نور کو ممنوعات سے روکا تو اللہ تعالیٰ اُس کے نورِ بصیرت (قلب کا نور) کو آزاد فرمادے گا پھر یہ شخص ایسے مشاہدات سے نوازا جائے گا جن سے وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو اپنی ظاہری آنکھوں کو کنٹرول میں نہیں رکھتے۔ بلاشبہ دل آئینہ کی مانند ہے اور خواہشاتِ نفسانی اُس پر گردوغبار اور زنگ کی مثل ہیں۔ سو جب آئینہ گردوغبار اور زنگ سے پاک صاف ہو تو تمام صورتیں اُس میں اپنی اصل حالت میں نظر آتی ہیں ورنہ دھندلی اور بے ڈھنگی نظر آتی ہیں، یہی حال آئینۂ قلب کا ہے کہ یہ جب کدورتوں اور گناہوں سے پاک ہو تو ایسے شخص کا علم اور کلام ظن وقیاس سے مبرا ہوتا ہے۔

۳) استقامتِ قلب

غضِ بصر کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت قلب کو استقامت، شجاعت اور قوت عطا ہوتی ہے بلکہ دو قوتیں عطا ہوتی ہیں ایک سلطان النصرۃ (مدد کی قوت) اور دوسری سلطان الحجۃ (دلائل کی قوت) انہی دو قوتوں کی بدولت شیطان ایسے شخص سے بھاگتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے ''اِنَّ الَّذِیْ یُخَالِفُ ھَوَاہُ یُفْرِقُ الشَّیْطَانُ مِنْ ظِلِّہٖ'' [۳] (جو شخص اپنے نفس کی خواہشات کی مخالفت کرے شیطان اس کے سایہ سے بھاگتا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ نفسانی خواہشات کا پیروکار شخص اُس ذلت وخواری کا شکار رہتا ہے جو اس کیلئے

---

[۱] الحجر، ۱۵:۷۵۔　[۲] النور، ۲۴:۳۵۔　[۳] مجموع الفتاوی، جلد ۱۵، صفحہ ۴۲۶۔

قدرت کی طرف سے مکافاتِ عمل کے طور پر طے ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ نے عزت اس کیلئے پیدا کی جو اس کی اطاعت کرے اور ذلت اس کیلئے ہے جو اس کی نافرمانی کرے۔ "وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ" (حالانکہ عزت تو صرف اللہ کیلئے اور اس کے رسول ﷺ کیلئے اور مومنوں کیلئے ہے)[1] وَلَاتَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" [2] (اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو)۔

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا" [3] (جو شخص عزت چاہتا ہے تو اللہ ہی کیلئے ساری عزت ہے)۔ کہ ہر قسم کی عزت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے)۔" عَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ رَفَعَهٗ قَالَ يَا عَلِيُّ لَا تَتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةُ "[4] (حضرت علی ؓ کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری مرتبہ مت دیکھو، بے شک پہلی نظر تمہارے لیے مباح ہے اور دوسری تمہارے لیے وبال ہے)۔

ایک حدیث شریف میں ہے "اِنَّ النَّظْرَ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِيْ اَبْدَلْتُهٗ اِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهٗ فِيْ قَلْبِهٖ "[5] (نظر ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جس شخص نے میرے خوف اور ڈر کی وجہ سے اپنی نظر کو روکے رکھا تو میں اسے ایسا ایمان عطا فرماؤں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا)۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نور بخشتا ہے۔

یہی وہ نور ہے جس کی بدولت بندے پر تمام اشیاء کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں "وَكَذٰلِكَ اِذَا قَوِيَ نُوْرُهٗ وَاِشْرَاقُهٗ اِنْكَشَفَتْ لَهٗ صُوَرُ الْمَعْلُوْمَاتِ وَحَقَائِقُهَا عَلٰى مَاهُوَ عَلَيْهِ"[6] (اور اسی طرح جب دل کا نور قوی اور اس کی روشنی کامل ہو جائے تو انسان پر تمام معلومات کی صورتیں اور ان کی حقیقتیں یوں منکشف ہو جاتی ہیں جیسا کہ وہ ہیں)۔

قلب کی جن آنکھوں کا ذکر علامہ ابن قیمؒ نے کیا اور جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں آیا قرآن حکیم میں اُسے یوں بیان کیا گیا "فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ "[7] (تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

(ب ج:۳۳۵)

---

[1] المنافقون، ۶۳:۸۔　[2] آل عمران، ۳:۱۳۹۔　[3] فاطر، ۳۵:۱۰۔

[4] سنن ترمذی، حدیث ۲۷۷۷، جلد ۵، صفحہ ۱۰۱۔　[5] المعجم الکبیر، حدیث ۱۰۳۶۲، جلد ۱۰، صفحہ ۱۷۳۔

[6] اغاثۃ اللھفان، جلد ۱، صفحہ ۲۱۔　[7] الحج، ۲۲:۴۶۔

خلاصہ یہ ہے کہ سُنّتِ نبوی ﷺ پر گامزن ہونے میں دل کی بینائی ہے اور اتباعِ سنت سے روگردانی کرنے میں وہ ذلت ورسوائی اور عذابِ آخرت ہے جس کا تذکرہ سطورِ بالا میں تفصیلاً ہو چکا ہے۔

اتباعِ سنت کا ظاہر وباطن پر اثر

اتباعِ سنت سے نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور اس پاکیزگی کا اثر انسان کے باطن سے اس کے ظاہر پر نمایاں ہوتا ہے اور اسی طرح مخالفتِ سنت سے نفس کی نجاست اور خباثت بڑھتی ہے اور اس کا اثر انسان کے باطن سے اس کے ظاہر پر نمودار ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ گناہوں کی نجاست کبھی ظاہر محسوس ہوتی ہے اور کبھی مخفی محسوس ہوتی ہے اور جب روح وقلب پر خبث اور نجاست کا غلبہ ہو جاتا ہے تو زندہ دل شخص کو اس روح اور قلب سے بدبو آتی ہے جس سے اس کو اذیت ہوتی ہے جیسا کہ کسی شخص و بدبودار چیز سے تکلیف ہوتی ہے اور یہ حقیقت بسا اوقات انسان کے پسینے سے ظاہر ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بدکار شخص کے پسینہ سے عفونت اور بدبو پائی جاتی ہے کیونکہ پسینہ انسان کے باطن سے آتا ہے ''وَلِهٰذَا كَانَ الرَّجُلُ الصَّالِحُ طِيْبَ الْعَرْقِ'' (یہی وجہ ہے کہ صالح شخص کا پسینہ خوشبودار ہوتا ہے)۔[1]

صالحین کے نفس کی خوشبو

علامہ ابن قیمؒ نے صالحین کے باطن سے جس خوشبو کے پھیلنے کا ذکر کیا ہے اس کی تائید اس حدیث پاک سے ہوتی ہے جس کو حضرت براء ابن عازب ؓ نے روایت کیا ہے کہ ''بندۂ مومن کے سرہانے ملک الموت آ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے ''يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ'' [2] (اے نفس مطمئنہ! نکل آ، اللہ کی مغفرت اور رضا کی طرف)۔ پھر وہ نفس نکل آتا ہے اور اس سے یوں قطرے ٹپک رہے ہوتے ہیں جس طرح پانی کی مشک سے ٹپکتے ہیں اور اس سے یوں خوشبو نکلتی ہے جس طرح زمین پر پھیلی ہوئی کستوری کی خوشبو۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ''تُخْرَجُ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ وَ هِيَ اَطْيَبُ رِيْحًا مِنَ الْمِسْكِ'' [3] (مومن کے نفس (روح) کو جب نکالا جائے گا تو اس کی خوشبو کستوری سے زیادہ پاکیزہ ہو گی، وہ فرشتے جنھوں نے اسے موت دی تھی اوپر لے جائیں گے تو آسمان کے فرشتے ان سے ملاقات کریں گے اور پوچھیں گے تمھارے پاس کیا ہے وہ جواب دیں گے یہ فلاں ہے اور بڑے اچھے طریقے سے اس کا

---

[1] اغاثۃ اللہفان، جلد ۱، صفحہ ۶۰۔

[2] الاجابہ، امام بدرالدین الزرکشی، متوفی ۷۹۴ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۴، المکتب الاسلامی، بیروت۔

[3] حلیۃ الاولیاء، جلد ۱، صفحہ ۱۴۰۔

تذکرہ کریں گے، وہ فرشتے کہیں گے تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو اور اس پر بھی جو تمھارے ساتھ ہے، پھر اس کے لیئے جنت کے دروازوں کو کھول دیا جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں اس کا چہرہ چمک رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے حاضر کیا جائے گا اور سورج کی طرح اس کے چہرے پر برھان ہوگی)۔

اتباعِ سنت کی تاثیر میں ابن عباس ؓ کا فرمان: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں ''اتباعِ سنت سے چہرہ میں ضیاء (روشنی) قلب میں نور، بدن میں قوت، رزق میں وسعت اور مخلوق کے دلوں میں محبت پیدا ہو جاتی ہے اور مخالفتِ سنت سے چہرہ میں سیاہی، قلب میں تاریکی، بدن میں کمزوری، رزق میں کمی اور مخلوق کے دلوں میں بغض پیدا ہوتا ہے''۔

حضرت عثمان غنی ؓ کا فرمان: حضرت عثمان غنی ؓ فرماتے ہیں ''جو شخص کوئی عمل کرے اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اس عمل کی چادر ڈال دیتا ہے (یعنی اُس عمل کی تاثیر اس پر نمایاں کر دیتا ہے) عملِ خیر ہو تو خیر نمایاں ہوتی ہے اور عملِ شر ہو تو برائی نمایاں ہوتی ہے''۔[1]

حضرت عثمان غنی ؓ کی نظرِ فراست کا یہ عالم تھا ہر ایک شخص کے اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیئہ کی چادر کو دیکھ لیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک عورت کو شوق کی نگاہ سے دیکھا پھر وہ آپ کے روبرو حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا بعض لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی آنکھوں میں زنا کے آثار پائے جاتے ہیں وہ شخص اس انکشاف پر حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا، کیا اب بھی وحی اتر رہی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ وحی نہیں بلکہ فراست ہے۔[2]

نماز کا نفس پر اثر

نماز کے نفس پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس سلسلے میں لمبی چوڑی بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم کا واضح فرمان ہے: ''اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ''[3] (بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)۔ نماز کی یہ تاثیر کا ہے بگاہے نماز پڑھنے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تاثیر دائمی نمازی پر ہوتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ''[4] (بے شک انسان بے صبرا اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اسے مصیبت (یا مالی نقصان) پہنچے تو گھبرا جاتا ہے اور جب اسے بھلائی (یا مالی فراخی) حاصل ہو تو بخل کرتا ہے، مگر وہ نماز ادا کرنے والے، جو اپنی نماز پر ہمیشگی قائم رکھنے والے

---

[1] الوابل الصیب، علامہ ابن قیم، متوفی ۷۵۱ھ، صفحہ ۸۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

[2] مدارج السالکین، جلد ۲، صفحہ ۴۸۶۔　[3] العنکبوت، ۲۹:۴۵۔　[4] المعارج، ۷۰:۱۹،۲۳۔

ہیں)۔غور کیجئے مطلقاً انسان کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے اندر تخلیقی اور فطری عیوب کی نشاندھی فرمائی لیکن ان فطری عیوب سے دائمی نمازیوں کو مستثنیٰ قرار دیا اور یہ جتنے عیب بیان کیے گئے سب نفس کے خصائلِ ذمیمہ ہیں تو پھر اندازہ فرمایئے اس سے بڑھ کر نماز کی کیا تاثیر ہوگی۔

روزہ کا نفس پر اثر

روزہ کا نفس پر جو اثر ہوتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔اس کی مکمل تفصیل ''بھوک اور تہذیب نفس'' کے عنوان میں ملاحظہ کیجئے۔

زکوٰۃ کا نفس پر اثر

بخل،حرص اور مال و دولت کی محبت خباثتِ نفس کی اصل ہیں اور زکوٰۃ کا ادا کرنا اِن خصائلِ ذمیمہ کے خلاف ایک جہاد ہے۔ارشادِالٰہی ہے''وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ○''[1] (اور اس (آگ) سے اس بڑے پرہیز گار شخص کو بچا لیا جائے گا، جو اپنا مال (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اپنے جان و مال کی) پاکیزگی حاصل کرے)۔''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا''[2] (آپ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجیے کہ آپ اس (صدقہ) کے باعث انہیں (گناہوں سے) پاک فرما دیں)۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے''اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا''[3] (شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکنے کیلئے) تنگدستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے)۔

صاف ظاہر ہے کہ شیطان کی مخالفت میں نفس کی مخالفت ہے۔علمائے کرامؒ فرماتے ہیں جس قدر راہِ خدا میں مال و دولت خرچ کرنے سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اتنا کسی عبادت سے بھی نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کو اس وقت تک سکون نہیں آتا تھا جب تک کہ گھر میں موجود درھم و دینار راہِ خدا میں خرچ نہ فرمادیتے۔[4]

حضرت امام باقرؓ کا ایمان افروز واقعہ

<u>اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا جس قدر نفس و شیطان پر بھاری ہے اسی قدر اس میں تزکیۂ نفس ہے لیکن یہ انفاق آسان نہیں ہے نفس اِس میں بہت رکاوٹیں ڈالتا ہے اس سلسلے میں حضرت امام باقرؓ کا یہ واقعہ نہایت ایمان افروز ہے۔</u>''آپ ایک مرتبہ بیت الخلا میں تشریف لے گئے ابھی ضرورت پوری کرنے

---

[1] الیل ۹۲:۱۷،۱۸۔ [2] التوبہ ۹:۱۰۳۔ [3] البقرۃ ۲:۲۶۸۔

[4] صحیح بخاری، حدیث ۱۱۶۳، جلد ۱، صفحہ ۴۰۸۔

کیلئے بیٹھنا چاہتے تھے کہ دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپ کے جسم اطہر پر جو قیمتی قبا (واسکٹ) ہے اُسے فلاں آدمی کے پاس ھدیۃً بھیجیں بس وہیں کھڑے کھڑے خادم کو آواز لگائی وہ دیوار کے قریب حاضر ہوا۔ آپ نے قبا اُتاری اور فرمایا یہ فلاں آدمی کو دے آؤ، خادم نے حکم کی تعمیل کی اور واپس آ کر عرض کی حضور! یہ حکم بیت الخلا سے باہر تشریف لانے کے بعد بھی ہو سکتا تھا، آپ کھڑے کھڑے اور ضرورت پوری کرنے سے پہلے حکم فرمانے میں کیا حکمت تھی؟ ارشاد فرمایا اتنی دیر میں اگر ہم پر نفس کا غلبہ ہو جاتا تو ہم اس نیکی سے محروم رہ جاتے"۔

نفس پر اتنا بھروسہ بھی نہیں کیا حالانکہ یہ وہ حضرات ہیں جن کے حق میں ارشادِ الٰہی ہے۔ "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ" [1] (بے شک میرے (اخلاص یافتہ) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا) جب ان اولوالعزم ہستیوں کی نفس کے بارے میں اس قدر احتیاط ہے تو پھر عامۃ الناس کس شمار میں ہیں۔ "اِنْفَاقِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) جتنا نفس پر بھاری ہے اتنا ہی اس میں تزکیۂ نفس زیادہ ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں انفاقِ مال کے ذریعہ جتنا نفس کو طہارت حاصل ہوتی ہے اتنا کسی اور عبادت سے حاصل نہیں ہوتی، یہاں تک کہ حدیثِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا "اَلصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ" (خیرات کرنا برھان ہے)۔ [2]

برہان اُس مؤکد اور پختہ ترین دلیل کو کہتے ہیں جو ہمیشہ صدق پر دلالت کرے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور الوہیت کی دلیل سورۃ النساء آیت نمبر ۱۷۴ میں حضور ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حج کے نفس پر اثرات

حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے اور ہر چند کہ یہ زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے تاہم اگر صدق و اخلاص کے ساتھ یہ مشکل ترین عبادت اپنے تمام مناسک کے ساتھ ادا کی جائے تو اِس سے خوب تزکیۂ نفس ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان تمام اگلے پچھلے صغیرہ کبیرہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ تاثیر کسی اور عبادت میں نہیں ہے مگر یہ کہ اُس کے ساتھ توبہ بھی کی جائے اور حج میں از خود توبہ موجود ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دورِ حاضر میں حج کر کے واپس آنے والے لوگوں کی (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ) حالت ابتر ہوتی ہے یہاں حضور ﷺ کے اِس ارشاد پر غور کیا جائے تو از بس مفید ہوگا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ طبقۂ امراء سیر و سیاحت کی غرض سے حج کرنے جائیں گے، متوسط طبقہ تجارت کی نیت سے جائے گا، علماء و قراء ریاکاری کی خاطر جائیں گے اور فقراء بھیک مانگنے جائیں گے"۔ [3]

---

[1] الحجر، ۱۵:۴۲۔
[2] صحیح مسلم، حدیث ۲۲۳، جلد ۱، صفحہ ۲۰۳۔
[3] المعجم الکبیر، حدیث ۸۹۱۱، جلد ۹، صفحہ ۱۸۵۔

اس سے پہلے حضور ﷺ کا فرمان بیان کیا جا چکا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ میری امت کی رہبانیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہے[1] ایک جگہ پر آپ ﷺ نے جہاد کی بجائے حج بھی فرمایا ہے کیونکہ حج میں بھی اول تا آخر سخت مشقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

سفر کے نفس پر اثرات

سفر کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد یہ ہے کہ نفس کے تمام راز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ نفس کی رعونت اور خود پسندی انسان پر کھل جاتی ہے اور یہ حقائق بغیر سفر کے انسان پر آشکار نہیں ہوتے۔ جب انسان کی برائیاں اس پر ظاہر ہو جاتی ہیں تو پھر یہ اس کے علاج کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ سفر کو سفر اس لیے کہتے ہیں کہ مبتدی کے نفس پر سفر کا اس طرح اثر ہوتا ہے جس طرح نماز، روزہ اور تہجد کے نوافل اثر کرتے ہیں جو قرب الٰہی کا باعث بنتے ہیں۔ جب مسافر صرف خدا کیلئے سفر کی منازل طے کرتا ہے تو وہ لذتِ دنیا کو ترک کر کے سیر الی اللہ تعالیٰ کا قصد کرتا ہے۔

شیخ امام نوویؒ کا بیان ہے کہ تصوف نام ہے حظوظِ نفسانی کے ترک کر دینے کا۔ سفر میں ترکِ لذائذ ہے اور نوافل میں بھی ترکِ لذائذ ہے۔ ان سے نفس ایسا نرم پڑتا ہے جیسے دباغت سے چمڑہ ملائم ہو جاتا ہے اور اس کا فطری کھردراپن، خشکی اور بدبو ختم ہو جاتی ہے اسی طرح مسافر کے نفس کی سرکشی بھی دور ہو جاتی ہے۔

سفر میں انسان قدرت کے بہت سے آثار و آیات دیکھتا ہے اور دیگر بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مزید برآں سفر میں مسافر گمنامی کو قبول کرتا ہے اور اپنے نقائص اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ کرتا ہے کیونکہ اپنے گھر میں جو قبول خلائق کا دروازہ اس پر کھلا ہوتا ہے، بند ہو جاتا ہے۔

''عوارف المعارف'' صفحہ ۲۹۴ پر ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا ہے اور اس نے کسی سے نہیں مانگا اور اس گرسنگی (بھوک) میں مر گیا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ مگر صاحب مال مانگنے سے محفوظ رہے گا۔ اگر سوال کرے گا تو علم کے ذریعے سوال کرے گا جیسا کہ حضرت سفیان ثوریؒ حجاز سے یمن کا سفر کرتے اور راستے میں لوگوں کی مہمان نوازی پر گزر کرتے، لوگوں کے سامنے حدیث خیانت بیان کرتے تو لوگ ان کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیتے اور وہ اس میں سے بقدرِ ضرورت لے لیتے۔ جو لوگ مانگنا پسند نہیں کرتے ان کا ایک واقعہ ''عوارف المعارف'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے حج کی نیت سے ایک قافلے کے ساتھ شمولیت کی اور روزانہ کوئی نہ کوئی ان کو کھانے کیلئے کچھ نہ کچھ دے دیتا تھا۔ کچھ دنوں بعد یکا یک یہ کیفیت ختم ہوگئی اور چند دن کھانا نہ ملنے کے باعث کمزوری ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ قافلہ نکل گیا اور یہ ایک درخت کے نیچے موت کا انتظار کرنے لگے دل میں خیال ہوا کہ کسی سے مانگیں مگر چونکہ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ میں کسی سے نہ مانگوں گا

[1] صحیح ابن حبان، حدیث ۴۶۱۸، جلد ۲، صفحہ ۷۶۔

لہٰذا خاموشی سے موت کا انتظار کرنے لگے۔ آخر ان کا سر ڈھلک گیا گویا موت قریب تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان گلے میں تلوار لٹکائے آیا۔ اس نے انہیں ہلایا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس نے بقدر ضرورت کھلایا، پلایا اور وہ اُٹھ بیٹھے۔ پھر پوچھا کہ تم قافلے کے ساتھ ملنا چاہتے ہو۔ اُٹھو اور میرا ہاتھ پکڑو اور کہتے ہیں کہ وہ نوجوان کچھ دیر میرا ہاتھ پکڑ کر چلے اور پھر مجھ سے کہا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔ تمہارا قافلہ یہاں پہنچا ہی چاہتا ہے۔ میں کچھ دیر بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں قافلہ میری تلاش کرتا ہوا میری جانب بڑھ رہا ہے۔ یہ شان ان لوگوں کی ہے کہ جو اپنے مولا کے ساتھ صدقِ دل سے اپنا معاملہ کر لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○"[1] (اے رب! میں ہر اس بھلائی کا جو تو میری طرف اتارے محتاج ہوں)۔

تلاوتِ قرآن پاک کے نفس پر اثرات

نفس کے حق میں تلاوتِ قرآن مجید نہایت مفید اور باعثِ طہارت ہے۔ خصوصاً قلب و روح اور نفس کی پاکیزگی کیلئے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○"[2] (اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور ان (بیماریوں) کی شفاء آ گئی ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہیں اور ہدایت اور اہلِ ایمان کیلئے رحمت (بھی)۔

قرآن مجید کی تلاوت دلوں کا زنگ اتارتی ہے

قرآن کریم نور بھی ہے اور منیر بھی "وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا"[3] (اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف نورِ درخشاں اور "کِتٰبٌ مُّنِیْرٌ" (روشن کتاب) بھی قرآن مجید میں کہا گیا ہے اور حدیث پاک میں بھی "اَلنُّوْرُ الْمُبِیْنُ" فرمایا گیا ہے اور "اَلشِّفَآءُ النَّافِعُ" (مفید شفاء) بھی کہا گیا ہے۔[4]

اور ہر چند کہ قرآنِ مجید جسمانی شفاء بھی ہے لیکن اس کا روحانی شفاء ہونا بہت واضح ہے اور قرآن کا نور جب من میں اتر جائے تو قلب زندہ ہو جاتا ہے اور اس کی بصیرت (آنکھ) وا ہو جاتی ہے اور جب قلب کی آنکھ وا ہو جائے تو انسان دور و نزدیک یکساں دیکھتا ہے حتیٰ کہ اشیاء کی حقیقت بھی اُس پر واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَا جِلَاءُ ھَا قَالَ تِلَاوَۃُ الْقُرْاٰنِ"[5] (بے شک یہ دل بھی زنگ آلود ہوتے ہیں جیسے کہ لوہے کو زنگ لگتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر اس زنگ کو اتارنے کا

---

[1] القصص، ۲۸:۲۴۔　[2] یونس، ۱۰:۵۷۔　[3] النسآء، ۴:۱۷۴۔

[4] سنن الدارمی، حدیث ۳۳۱۵، جلد۲، صفحہ ۵۲۴۔　[5] مسند الشہاب، حدیث ۱۱۷۹، جلد۲، صفحہ ۱۹۹۔

علاج کیا ہے؟ فرمایا قرآن مجید کی تلاوت)۔

ایک حدیث شریف میں ذکرِ الٰہی کو بھی 'صِقَالَۃُ الْقَلْبِ '' یعنی دل کو چمکانے والا نور فرمایا ہے۔ یہ حقیقت ہر ذی شعور پر واضح ہے کہ زنگ آلود لوہے کو مقناطیس کا قرب حاصل نہیں ہوتا بالکل اسی طرح زنگ آلود قلب قربِ الٰہی کے لائق نہیں ہوتا مگر یہ کہ جب لوہے کی طرح صیقل ہو جائے اور لوہے کا زنگ ریگ مال سے اترتا ہے تو دل کا زنگ تلاوتِ قرآن سے اُترتا ہے اور تلاوتِ قرآن جب غور و فکر اور تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس کی شان ہی نرالی ہوتی ہے تاہم قرآن کریم بلا سمجھے پڑھا جائے تب بھی مفید ہے اور یہ اعزاز قرآن کے سوا اور کسی کلام کو حاصل نہیں ہے۔ کوئی بھی کلام ہو جب تک اُسے سمجھا نہ جائے وہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا لیکن قرآن کریم کی فقط تلاوت میں ہر حرف پر کم از کم دس نیکیاں عطا ہوتی ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل ؒ نے خواب میں دیدارِ الٰہی کا شرف حاصل کیا تو رب تعالیٰ سے سوال کیا یا رالٰہ! سب سے زیادہ کس عمل سے تیرا قرب حاصل ہوتا ہے؟ ارشاد ہوا تلاوتِ قرآن سے، پھر عرض کیا، پروردگار! سمجھ کر یا بغیر سمجھے؟ ارشاد ہوا دونوں طرح۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں بھی یہ مضمون وارد ہے چنانچہ حضرت ابوامامہ ؓ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بندے اللہ تعالیٰ کا قرب اتنا کسی چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جتنا اس چیز سے حاصل کرتے ہیں جو اس کی ذاتِ اقدس سے صدور پذیر ہوئی، یعنی قرآن۔

بغیر سمجھے محض تلاوتِ قرآن کے مفید ہونے پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ قرآن کریم کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور حضور ﷺ نے فرمایا ہم نہیں کہتے کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے بلکہ الف الگ ایک حرف ہے لام الگ ایک حرف ہے اور میم الگ ایک حرف ہے۔[1] الٓمّٓ ؀ یعنی حروف مقطعات کی مثال بیان فرما کر رسول اللہ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم بغیر سمجھے بھی قاری (پڑھنے والے) کے حق میں مفید ہے کیونکہ حروفِ مقطعات کا مطلب و معنٰی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ۔

تلاوتِ قرآن کیلئے امام شعرانی ؒ کی اہم نصیحت

امام شعرانی ؒ مریدین کے آداب کے بیان میں لکھتے ہیں ''تم پر تلاوت قرآن کریم لازم ہے اگر چہ زیادہ نہ سہی دن میں تین پارے ہی پڑھ لیا کرو اور تلاوتِ قرآن ترک مت کرو جس طرح کہ علم کے بعض طلبہ یا نام نہاد صوفیاء نے ترک کر رکھی ہے اور اُن کا گمان یہ ہے کہ وہ تلاوتِ قرآن سے زیادہ اہم اوراد و وظائف میں مشغول ہیں حالانکہ یہ جھوٹ اور فریب ہے کیونکہ قرآن کریم دنیا میں ہر خیر اور علم کا منبع ہے لہٰذا تلاوتِ قرآن سے بیگانگی نہ کرو بلکہ رات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کرتے رہا کرو اور اس

[1] سنن الترمذی، حدیث ۲۹۱۰، جلد ۵، صفحہ ۱۷۵۔

سے یوں علوم مستنبط کرو جس طرح ائمۂ دین نے مستنبط فرمائے، اور اے بھائی اپنی تلاوت میں ہر اُس صفت پر غور کر جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی مدح فرمائی ہے پھر اُس صفت کو تم بھی اپنانے کا پختہ ارادہ کرو اور اسی طرح ہر وہ خصلت جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی مذمت فرمائی ہے اس میں بھی غور کرو اور اُسے ترک کر دو یا ترک کرنے کا پختہ ارادہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے جس بات کا ذکر کیا اور اُسے کتاب میں اُتارا تو اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، پس جب تم عمل کے معاملہ میں تعلیماتِ قرآن کی حفاظت کرو گے جیسا کہ تم تلاوت کی حفاظت کرو گے تو پھر تم کامل مرد ہو گے"۔[1]

ذکرِ الٰہی کے نفس پر اثرات

تمام عبادات اور اوامر و نواہی کا مقصودِ اصلی ذکرِ الٰہی ہے مثلاً عبادات میں افضل ترین عبادت نماز ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ"۔[2] (اور میری یاد کی خاطر نماز قائم کیا کرو۰) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا "وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"[3] (اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تا کہ تم فلاح پاجاؤ)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "لِکُلِّ شَیْءٍ صِقَالَۃٌ وَصِقَالَۃُ الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ"[4] (ہر شئے کیلئے ایک صِقَالَۃ (زنگ اتارنے کا آلہ) ہوتا ہے اور دلوں کا صِقَالَۃ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے)۔ دل اگر زنگ آلود ہو تو مردہ ہے اور دل جب مردہ ہو تو اس کی تمام صلاحیتیں بھی مردہ ہوتی ہیں۔ مشائخ عظام فرماتے ہیں "بے شک دل پر اس طرح زنگ چڑھتا ہے جس طرح لوہے، تانبے اور چاندی پر، اور اُس کی جلاء (چمکانے کا ذریعہ) ذکرِ الٰہی ہے۔ پس جب ذکر دل کو جلاء بخشتا ہے تو اسے مرآۃ البیضاء (چمکدار آئینے) کی طرح کر دیتا ہے اور ہر شئے اس میں یوں نظر آتی ہے جیسا کہ وہ شفاف آئینہ ہو اور اگر اس پر زنگ ہو تو اشیاء کی حقیقت آئینۂ دل میں نظر نہیں آتی۔

اسی لیے علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا تھا۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

(ب۔د:۷)

اس حقیقت کو حدیثِ پاک میں یوں بیان کیا گیا ہے "مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّہٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ رَبَّہٗ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ" (اس شخص کی مثال جو رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور اس کی جو یاد نہیں

---

[1] کنز العمال، حدیث ۴۱۷۷۷، جلد ۱، صفحہ ۲۱۴۔
[2] الکبریت الاحمر، جلد ۲، صفحہ ۱۸۵۔
[3] طٰہٰ ۲۰: ۱۴۔
[4] الانفال ۸: ۴۵۔

کرتا ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ)۔ [1]

ذکر کے بے شمار فوائد بیان کیے گئے ہیں اور اُن میں سب سے بڑا فائدہ بلکہ تمام فوائد کی اصل کی حیثیت رکھنے والا جو فائدہ ہے وہ نور ہے جو ذاکر کو حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اس موضوع پر جس قدر تفصیل سے لکھا ہے اتنا کسی نے نہیں لکھا۔ وہ لکھتے ہیں "ذکر کی بدولت ذاکر کو دنیا میں نور عطا ہوتا ہے، اسے اس کی قبر میں نور ملتا ہے اور اسے میدانِ محشر میں نور عطا ہوگا جس کی روشنی میں وہ پل صراط عبور کرے گا۔ بہرکیف قلوب اور قبور کو جس طرح ذکرِ الٰہی سے نور ملتا ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں ملتا۔ غرضیکہ تمام کی تمام شان اور تمام کی تمام فلاح نور میں ہے اور تمام کی تمام بدبختی نور کے نہ ہونے میں ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ بڑے مبالغہ کے ساتھ اپنے رب کریم سے نور کی دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے گوشت، میری ہڈیاں، میرے پٹھے، میرے بال، میری جلد، میرے کان، میری آنکھیں میرے اوپر میرے نیچے میرے دائیں میرے بائیں میرے آگے اور میرے پیچھے نور کردے حتیٰ کہ آخر میں فرماتے "وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا" مجھے سراپا نور کردے۔ [2] غور کیجئے حضور ﷺ نے اپنی ذات کے ظاہر و باطن کیلئے اور اس کی جمیع جہات کیلئے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے نور کا سوال کیا حتیٰ کہ حضور سراپا نور ہو گئے، پس اللہ عزوجل کا دین نور ہے، اس کی کتاب نور ہے، اس کا رسول نور ہے اور اس نے اپنے دوستوں کیلئے جو گھر تیار کیا ہے وہ بھی نور ہے۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر اُن پر اپنے نور کا فیض ڈالا جس جس پر وہ نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا اور جس پر وہ نور نہ پہنچا وہ گمراہ رہا۔ [3]

علمائے کرامؒ فرماتے ہیں یہ نورِ فطرت ہے اور جس نور کو اللہ کا نبی لے کر آتا ہے وہ نورِ وحی ہے سو جب نورِ فطرت سے نورِ وحی مل جائے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ہو جاتا ہے اور "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" [4] میں اسی نور کا ذکر ہے۔ اور شریعت تمام کی تمام ذکرِ الٰہی ہے یعنی جب کوئی شخص حکمِ الٰہی پر عمل کرے اور نہیِ الٰہی سے باز رہے تو دونوں حالتوں میں اُسے خدا یاد رہے گا اور اُسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اتباعِ سنت میں نور ہی نور ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف نور اُتارا جس سے اُنہیں حقیقی زندگی حاصل ہوئی اور اُسی نور کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتے ہیں اور اسی نور کی جڑ اُن کے قلوب میں ہے، پھر اتباعِ سنت سے وہ نور بڑھتا رہتا ہے۔ اِس سے آگے اصل عربی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں "فَتَتَزَايَدُ حَتّٰى تَظْهَرَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ وَجَوَارِحِهِمْ وَاَبْدَانِهِمْ بَلْ عَلٰى ثِيَابِهِمْ وَدُوْرِهِمْ يُبْصِرُهُ مَنْ هُوَ مِنْ جِنْسِهِمْ وَسَائِرُ الْخَلْقِ لَهٗ مُنْكِرٌ" (پھر وہ نور زیادہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ان کے چہروں پر،

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۶۰۴۴، جلد ۵، صفحہ ۲۳۵۳۔
[2] صحیح مسلم، حدیث ۱۸۷، جلد ۱، صفحہ ۵۲۵۔
[3] الوابل الصیب، جلد ۱، صفحہ ۱۱۴۔
[4] النور، ۲۴: ۳۶۔

اعضاپر، بدنوں پر بلکہ ان کے کپڑوں اور ان کے گھر کی دیواروں پر ظاہر ہو جاتا ہے اس نور کو ہر وہ شخص دیکھتا ہے جو اہل اللہ کا ہم جنس ہو اور باقی ساری مخلوق اس نور کی منکر رہتی ہے)۔[1]

صلوٰۃ وسلام کا نفس پر اثر

نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کے فضائل و برکات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ اس موضوع پر علمائے امت نے بہت مبسوط تصانیف پیش فرمائی ہیں۔ یہاں ہم اس مبارک عبادت کے فضائل و برکات پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، البتہ صرف یہ پہلو زیرِ بحث لاتے ہیں کہ نفس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے چند احادیث پھر ان کی تشریح پیشِ خدمت ہے۔

۱) حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مجھ پر صلوٰۃ بھیجو، بے شک مجھ پر درود بھیجنا تمہارے لیے کفارہ ہے''۔[2]

۲) حضرت ابو کاہل ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص نے مجھ پر دن میں تین مرتبہ اور ہر رات میں تین مرتبہ محبت اور شوق سے درود بھیجا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اُس کے اُس دن اور رات کے تمام گناہ بخش دے''۔

۳) حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مجھ پر درود بھیجو بے شک مجھ پر درود بھیجنا تمہارے لیے زکوٰۃ ہے''۔[3]

علامہ ابنِ قیمؒ نے بھی یہ احادیث بیان کی ہیں وہ اِن کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس آخری حدیث میں درود کو زکوٰۃ فرمایا گیا اور زکوٰۃ کا لفظ نمو (بڑھنے پھلنے پھولنے) برکت اور طہارت کو شامل ہے اور اس سے پہلی حدیث میں درود شریف کو کفارہ فرمایا گیا اور کفارہ سے مراد گناہوں کا مٹنا ہے، پس ان دونوں حدیثوں سے یہ امر ثابت ہوا کہ نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ بھیجنا طہارتِ نفس کا سبب ہے۔ بے شک درود شریف سے نفس کے رذائل زائل ہوتے ہیں اور نفس کے کمالات و فضائل میں استقامت بھی آتی ہے اور برکت و اضافہ بھی ہوتا ہے اور یہ امر مسلّم ہے کہ نفس کا کمال فقط ان دو ہی باتوں میں مضمر (پوشیدہ) ہے (یعنی نفس اطاعت پر مستقیم ہو اور آئندہ اس کے کمالات میں ترقی بھی ہو) لہٰذا معلوم ہوا کہ نفس کو کمال نہیں حاصل ہو سکتا مگر نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنے سے، اس لیے کہ یہ حضور ﷺ کی محبت آپ ﷺ کی اتباع اور دیگر مخلوقات پر آپ ﷺ کو مقدم ماننے کے لوازم سے ہے''۔

---

[1] الوابل الصیب، جلد ۱، صفحہ ۵۷۔
[2] مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۱۷۸۴، جلد ۶، صفحہ ۳۲۵۔
[3] القول البدیع صفحہ ۳۲۵۔

نفس کے حق میں سب سے عظیم فائدہ یہ ہے کہ اُسے ہدایتِ راسخہ حاصل ہو اور ہدایتِ راسخہ کی ضمانت صرف اور صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ قلبی رابطہ میں مضمر ہے اور حضور ﷺ کے ساتھ قلبی رابطے کا بڑا ذریعہ درود و سلام ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے درود و سلام کے بہت فوائد ذکر کیے ہیں۔ وہ ایک فائدہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

درود شریف بندہ کی ہدایت اور اس کے قلب کی حیات کا سبب ہے، پس بندہ جب حضور ﷺ پر صلوٰۃ کی کثرت کرتا ہے تو آپ ﷺ کی محبت اس کے قلب پر غالب آ جاتی ہے، حتیٰ کہ اس کے قلب میں حضور ﷺ کے فرمودات کے منافی کوئی چیز نہیں رہتی اور نہ ہی اس کے دل میں حضور ﷺ کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات کے بارے میں کوئی شک رہتا ہے بلکہ جو کچھ حضور ﷺ لے کر تشریف لائے وہ اس کے قلب میں مسطور (منقش) ہو جاتا ہے اور ایسا شخص اپنی لوحِ دل کو ہمیشہ پڑھتا رہتا ہے اور اُسی سے وہ ہدایت، فلاح اور علوم کی تمام قسمیں حاصل کرتا رہتا ہے اور جوں جوں اس کے دل کی بصیرت اور قوت بڑھتی رہتی ہے توں توں اُس کے درود بھیجنے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی لیے اہلِ علم اور آپ ﷺ کی سنت کے عارفین اور آپ ﷺ کی ہدایت کے متبعین کا درود عوام کے درود کے برعکس ہوتا ہے۔

عوام الناس کا درود صرف اعضا کا ٹیرھا کرنا اور آواز کا بلند کرنا ہے لیکن عرفاء اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا حضرات کے درود کی الگ شان ہوتی ہے، ایسے لوگوں کی معرفت جب کامل ہوتی ہے اور حضور ﷺ کے ساتھ انہیں کمالِ محبت نصیب ہوتی ہے تو اُن پر درود کی وہ حقیقت عیاں ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر آتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قال سے نہیں حال سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس شخص کے درمیان (جو صفاتِ محبوب کے ذکر میں رطب اللسان رہتا ہے اور محبوب کی محبت اس کے قلب کی مالک بن چکی ہے یعنی محبت کا غلبہ ہو چکا ہے اور وہ انہی صفات و محبت کے پیش نظر اپنے محبوب کی صفت و ثنا کرتا ہے) اور اس کے درمیان جو صرف الفاظ کے ہیر پھیر میں رہتا ہے اور معانیٔ حقیقت سے بے خبر ہے اور اس کا دل اور زبان ہم آہنگ نہیں ہیں، کتنا فرق ہے؟ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے پیشہ ور نوحہ کرنے والی عورت کے رونے میں اور اس عورت کے رونے میں فرق ہوتا ہے جس کا بچہ وفات پا چکا ہو۔

پس حبیب ﷺ کا ذکر اور جو کچھ آپ ﷺ لے کر تشریف لائے اُس کا ذکر اور آپ ﷺ کے تشریف لانے میں جو اللہ تعالیٰ کا ہم پر انعام اور احسان ہے اس سب پر ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ بے شک حضور ﷺ وجود کی حیات اور اُس کی روح ہیں۔

رُوْحُ الْمَجَالِسِ ذِکْرُهُ وَحَدِیْثُهُ وَهُدًی لِکُلِّ مُلَدَّدٍ حَیْرَانٖ

(محفلوں کی روح آپ ﷺ کا ذکراور آپ ﷺ کی حدیث ہے اور ہر پریشان کرنے والے اور حیران کیلئے ہدایت ہے)

وَاِذَا اَخَلَّ بِذِکْرِهٖ فِیْ مَجْلِسٍ فَاُولٰئِکَ الْاَمْوَاتُ فِی الْاَحْیَاءِ

(اور جب کوئی مجلس آپ ﷺ کے ذکر سے خالی ہو تو وہ لوگ زندوں میں مردہ ہیں)

علامہ ابنِ قیمؒ کی اس عبارت میں تین اہم فوائد ذکر ہوئے (۱) قلب کو ہدایتِ راسخہ کا حاصل ہونا (۲) قلب کا زندہ ہونا (۳) اور قلب کی تختی پر تمام علوم کا منقش ہو جانا اور صاحب دل کا اُن علوم کو مسلسل پڑھنا اور اگر غور کیا جائے تو بندے کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔

آپ ﷺ پر صلوۃ وسلام کا نذرانہ پیش کرنے والے خوش نصیب تو آپ کی دائمی معیت ورفاقت سے سرفراز ہیں چنانچہ ابنِ قیم درود شریف کے فائدے میں لکھتے ہیں۔ ''اِنَّهَا سَبَبٌ لِدَوَامِ مَحَبَّتِهٖ لِرَسُوْلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَزِیَادَتِهَا وَتَضَاعُفِهَا'' [1] (درود شریف حضور ﷺ کی محبت کے دوام کا سبب ہے بلکہ اس محبت میں اضافہ اور کئی گنا زیادہ ہونے کا سبب ہے)۔

اور محبت کے تقاضوں میں سے ہے کہ (۱) مُصَاحَبَةُ الْمَحْبُوْبِ عَلَی الدَّوَامِ (محبوب کی دائمی صحبت حاصل رہے)۔ (۲) اَنْ یَّکُوْنَ الْمَحْبُوْبُ اَقْرَبَ اِلَی الْمُحِبِّ مِنْ رُوْحِهٖ'' (محبوب محب کی روح سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہو)۔ محبت کے یہ تقاضے علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب ''روضۃ المحبین'' میں ذکر کیے ہیں پھر فرمایا ہے۔

مِثَالُکَ فِیْ عَیْنِیْ وَ ذِکْرُکَ فِیْ فَمِیْ وَ مَثْوَاکَ فِیْ قَلْبِیْ فَاَیْنَ تَغِیْبُ؟

(تیری صورت میری آنکھوں میں ہے اور تیرا ذکر میرے منہ میں ہے اور تیرا ٹھکانہ میرے قلب میں ہے تو پھر تو غیب کہاں ہے؟) [2]

اور انہوں نے اپنی کتاب ''بدائع الفوائد'' میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں حالتِ نماز میں خطاب کے ساتھ سلام کرنے کی حکمت یہ لکھی ہے کہ حضور ﷺ کی صورتِ مبارکہ نمازی کے ذہن میں ہوتی ہے اور آپ ﷺ اس کی روح کے اُس سے بھی زیادہ مالک ہوتے ہیں اور اس کی روح سے اس سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں اس لیے نمازی کہتا ہے ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ'' پھر علامہ نے وہاں بھی مذکور الصدر شعر لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت کی تمام فوز وفلاح صرف اور صرف اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جسے

---

[1] جلاء الافہام، محمد بن ابی بکر الزرعی، متوفی ۷۵۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۴۴۷، دار العروبہ، الکویت۔

[2] روضۃ المحبین، محمد بن ابی بکر ایوب الزرعی، جلد ۱، صفحہ ۲۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

نبی اکرم ﷺ کا قرب حاصل ہو خود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلَاةً (قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے نزدیک وہ شخص ہوگا جس نے سب سے بڑھ کر مجھ پر درود بھیجا ہوگا۔) [1] اہلِ محبت کا درود حضور ﷺ خود سنتے ہیں ارشاد فرمایا ''اَسْمَعُ صَلَاةَ اَھْلِ مَحَبَّتِیْ'' [2] (میں اہلِ محبت کا درود خود سنتا ہوں)۔

اس سلسلے میں یہ حدیثِ پاک قابلِ ذکر ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔ حضرت ابوالدرداء ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو کیونکہ یہ حاضری کا دن ہے فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں کوئی بندہ ایسا نہیں جو مجھ پر درود بھیجے مگر اس کی آواز مجھے پہنچتی ہے وہ جہاں بھی ہو۔ ہم نے کہا آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا میری وفات کے بعد بھی بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے جسموں کو کھائے۔ [3]

خلاصہ یہ ہے کہ درود وسلام میں تزکیۂ طہارتِ نفس کا بڑا سامان ہے اس لیے کہ قرآن میں ''یُزَکِّیْھِمْ'' اور ''یُزَکِّیْکُمْ'' (انہیں پاک فرماتا ہے اور تمہیں پاک فرماتا ہے) میں فاعل حضور ﷺ ہیں یعنی ''مُزَکِّی'' (تزکیہ کرنے والے) حضور ﷺ ہیں لہٰذا صلوٰۃ وسلام کی بدولت جس کو جتنا زیادہ قربِ حضور ﷺ حاصل ہوگا اس کو اتنا ہی طہارتِ نفس حاصل ہوگی۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ'' [4] (یہ نبی مکرم ﷺ مومنوں کے ساتھ اُن کی جانوں سے زیادہ قریب اور حقدار ہیں)۔

مومنین وہی ہیں جو اپنے ماں باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر حضور ﷺ سے محبت کرتے ہیں بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں، سو وہ ذات جو مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے وہی مومنین کا تزکیہ نفس کرتی ہے اسی لیے صلوٰۃ وسلام کا حکم ہوا تا کہ رابطہ قائم اور قوی ہو اور نفس کی طہارت ہوتی رہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

---

[1] سنن الترمذی، حدیث ۴۸۴، جلد ۲، صفحہ ۳۵۴۔

[2] دلائل الخیرات۔

[3] جلاء الافھام صفحہ ۶۴۔

[4] الاحزاب ۶:۳۳۔

باب نمبر ۲۲

بھوک اور تہذیبِ نفس

تہذیب نفس کیلئے بھوک کی ضرورت واہمیت

بھوک ایک ایسا ہتھیار ہے جو شیطان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے مختلف درجات کا شیطان سے گہرا تعلق ہے۔ پیٹ اگر زیادہ بھرا ہو تو یہ شیطان کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اگر ضرورت کے مطابق ہو تو سالک کے حق میں عبادت کرنے کیلئے سازگار ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت سے کم بھرا جائے تو نورِ الٰہی کے دیکھنے میں مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ سے ایک غیر مسلم طبیب نے سوال کیا کہ کیا بات ہے کہ مدینے شریف کے لوگ بیمار نہیں ہوتے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''نَحْنُ قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ حَتّٰى نَجُوْعَ وَ اِذَا اَكَلْنَا لَا نَشْبَعُ'' [1] (ہم ایک ایسی قوم ہیں کہ جو کھانا نہیں کھاتے جب تک بھوک نہ لگے اور جب ہم کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے)۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ صحت کا راز پیٹ کو اعتدال سے غذا دینے پر منحصر ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا رکھو، جگروں کو پیاسا رکھو اور جسموں کو ننگا رکھو اور اپنی اُمیدوں کو کوتاہ رکھو تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نور کو دیکھ سکو۔ [2]

پیٹ کو بھوکا رکھنا ریاضت کرنے والے اللہ والوں کا کام ہے۔ کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی کا بت بنایا گیا تو ابلیس انسان کے اس بت کو دیکھنے کیلئے آیا اور اس کے ایک سوراخ سے داخل ہوا اور پورے جسم میں گھوم گیا تا کہ معلوم کرے کہ انسان میں کیا خوبی رکھی گئی ہے۔ خوبیوں کو سمجھنا تو اس کے بس کی بات

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ، علی بن برھان الدین الحلبی، جلد ۳ صفحہ ۲۹۹، دار المعرفۃ، بیروت۔ [2] جلاء الافھام، صفحہ ۲۴۰۔

نہ تھی ورنہ اگر وہ سمجھ لیتا تو سجدے سے ہرگز انکار نہ کرتا۔ جب اس نے انسان کے دِل کو دیکھا کہ ایک اُلٹا لٹکایا ہوا بند برتن ہے تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا کہ باقی تمام باتیں تو میں سمجھ گیا ہوں یعنی کھانے کیلئے پیٹ، سانس کیلئے پھیپھڑے اور جسم کے تمام حصّوں کے کام کرنے کے نظام کو اس نے معلوم کر لیا لیکن وہ یہ راز نہیں سمجھ سکا کہ یہ اُلٹا لٹکایا ہوا برتن (دِل) کیا چیز ہے۔ پیٹ کے اوپر اس نے ہاتھ مارا اور کہنے لگا کہ انسان کو میں اس (پیٹ) کے ذریعے بہکایا کروں گا، چنانچہ شیطان کے زیادہ تر دھندے انسانی پیٹ کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔

''الانسان فی القرآن''، جس کا بیان الگ کر دیا گیا ہے اس میں انسان کی ان صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن پر کنٹرول کرنے سے انسان بہت سی خوبیوں کا مالک بن جاتا ہے لیکن اگر ان میں راہِ اعتدال قائم نہ کی جائے تو شیطان ان امور میں داخل ہو جاتا ہے اور انسان کو ان اوصاف معتدلہ سے بہکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ان تمام اوصاف میں انسانی نفس کے حظ کا شیطان کے ذریعے زیادہ تر پیٹ کی بداعتدالیوں سے واسطہ رہتا ہے لہٰذا پیٹ پر اگر مناسب توجہ دی جائے تو انسان شیطانی شرارتوں سے بچ جاتا ہے۔

احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ شریعت کی اتباع کے ذریعے بندوں پر شیطانی اثرات بہت کم ہو جاتے ہیں اور جس قدر نفس کا علاج شریعت کی اتباع سے ہوتا ہے اتنا اثر کسی اور عمل میں نہیں۔ غیر اسلامی مذاہب میں بھوک ایک بہت بڑا ہتھیار سمجھا جاتا ہے اور یہ لوگ کئی کئی سال بھوکے رہنے سے محیّر العقول کام کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ طویل مدت تک بھوکے رہنے سے نفس پر ایک باریک سی جھلی چڑھ جاتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھوکے رہنے سے نفس کے اثرات ختم ہو گئے ہیں لیکن یہ جھلی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور انسان اپنی پرانی حالت پر عود کر آتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت کی اتباع سے نفس مہذب ہو جاتا ہے اور اپنی سرکشی سے باز آ جاتا ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ نفس کو اس کی بغاوت سے روکنے کیلئے اتباعِ شریعت سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں جسم اور انسانی کردار پر بھوک کے اثرات کس طرح اور کس انداز میں نمودار ہوتے ہیں، پوری تفصیل کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ اسلامی عبادات میں نفس کو اس کی سرکشی سے باز رکھنے کیلئے بھوک سے کس طرح مدد لی گئی ہے جو یقیناً دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔ رمضان المبارک کے روزے اس قسم کی عبادتوں میں شامل ہیں جن کے باعث ایک مسلمان اپنے نفس کو مہذب بنا لیتا ہے اور اس کے انعام کی صورت میں اسے تقویٰ کی دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں رہبانیت کو رواج دیا گیا ہے۔ مگر اسلام نے اس کے بدل میں جہاد کو رکھا ہے۔ بھوکے رہنے کی بجائے روزے رکھنے کو کہا گیا ہے۔ حج میں بھی نفس کی بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

مجاہدات اسلام کو غیر اسلامی نفس کشیوں کا بدل مقرر کیا گیا ہے۔غرضیکہ غیر اسلامی تمام سختیوں کا بدل شریعتِ اسلامی میں مہیا کیا گیا ہے جس پر چلنا زیادہ آسان ہے اور انسان کو اعلیٰ ترین مقامات پر فائز کر دیتا ہے۔

طریقت میں شکم سیری سے منع کیا جاتا ہے تاکہ نفس کی سرزنش ہو سکے۔ جو سالک بھوک برداشت نہیں کر سکتا اس کو طریقت قبول نہیں کرتی۔ بہت سی ایسی حکایات پائی جاتی ہیں جن میں نفس کا علاج بھوک سے ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے تیس سال تک سخت مجاہدات کیے جس کو عام لوگ سُننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اتباع شریعت اور مجاہدات اسلام کا مقصد یہ ہے کہ سالک کو یقین کی دولت مہیا کر سکیں اور ان مشقتوں میں بھوک کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں نفس کی تادیب ہے۔

پیٹ کو بھوکا رکھنے کے متعلق احادیث و آثار

نفس انسان کو طرح طرح کی خواہشات میں مبتلا کرتا ہے اور غلط سمت میں چلنے کی رہنمائی کرتا ہے اور خدا کی نافرمانی پر آمادہ کرتا ہے، اس لیے وہ انسان کا بھی دشمن ہے اور خدا کی اتباع کی راہ میں دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس نے اس کی پیدا کردہ خواہشات کی پیروی کی وہ گمراہ ہوا، لہٰذا حضور ﷺ نے شیطان کی اتباع اور اپنی خواہشات کو بھوک کے ذریعے روکنے کا حکم فرمایا ہے۔ حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ فِیْ اِبْنِ اٰدَمَ مَجْرَی الدَّمِ فَضَیِّقُوْا مَجَارِیَهٗ بِالْجُوْعِ“[1] (بیشک شیطان بنی آدم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ پس اس کی گردش کو بھوک کے ذریعے بند کرو)۔

مذکورہ حدیث سے ظاہر ہوا کہ بھوک اس دشمن یعنی نفس کیلئے قہر ہے۔ اس لیے بھوکا رہ کر اپنی شہوات کا قلع قمع کرو۔ شیطان کا وسیلۂ ظفر یہی خواہشات اور کھانا پینا وغیرہ ہیں۔ اس پیٹ کی بدولت حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام جنت سے دنیائے ذلت اور فقر و فاقہ میں زمین پر اُتارے گئے۔ جب کہ رب کریم نے انہیں شجرِ (ممنوعہ) کے کھانے سے منع کیا تھا لیکن انہوں نے شیطان کے بہکانے سے ہمیشہ جنت میں رہنے کی خواہش پر اُسے کھالیا۔ پیٹ بھر کر کھانا بھی حقیقت میں شہوات کا منبع اور مرکز ہے۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام نے شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے آپ علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شیطان نے جواب دیا کہ یہ شہوات ہیں جن سے ابنِ آدم کو قید کرتا ہوں۔ پوچھا میرے لیے بھی کوئی پھندا ہے؟ شیطان بولا نہیں۔ مگر ایک رات آپ نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا جس سے آپ کو نماز میں سستی پیدا ہوگئی، تب حضرت یحییٰ علیہ السلام بولے! آئندہ میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاؤں گا۔ شیطان بولا اگر یہ بات ہے تو آئندہ میں تمہیں کبھی نصیحت کی بات نہیں کہوں گا۔

---

1. کشف الخفاء، حدیث ۶۷۱، جلد ۱، صفحہ ۲۵۶۔

یہ اس مقدس ہستی کا حال ہے جس نے ساری عمر میں صرف ایک رات پیٹ بھر کر کھانا کھایا تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو عمر بھر پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور کبھی بھوکا نہیں رہتا اور اُس پر بھی وہ چاہتا ہے کہ میں عبادت گزار بن جاؤں۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے دِلوں کو بھوک سے منور کرو اور اس کے توسط سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو۔ بھوکا رہنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوک سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ حدیث کی عبارت حسب ذیل ہے ''نَوِّرُوْا قُلُوْبَکُمْ بِالْجُوْعِ وَجَاهِدُوْا اَنْفُسَکُمْ بِالْجُوْعِ وَ الْعَطْشِ وَاَدِیْمُوْا قَرْعَ بَابِ الْجَنَّةِ بِالْجُوْعِ فَاِنَّ الْاَجْرَ فِیْ ذٰلِکَ کَاَجْرِ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ عَمَلٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ جُوْعٍ وَّ عَطْشٍ وَّ لَنْ یَّلِجَ مَلَکُوْتُ السَّمٰوٰتِ مَنْ مَلَأَ بَطْنَهٗ فَقَدَ حَلَاوَةَ الْعِبَادَةِ'' [1] (اپنے قلب کو بھوک سے منور کرو، اپنے نفس کا بھوک پیاس سے مقابلہ کرو اور ہمیشہ بھوک کے توسط سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو۔ بھوکا رہنے والے کو مجاہد فی سبیل اللہ کے ثواب کے برابر ثواب ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکا پیاسا رہنے سے بہتر کوئی عمل نہیں اور آسمان کے فرشتے اس انسان کے پاس بالکل نہیں آتے جس نے اپنا پیٹ بھر کر عبادت کا مزہ کھودیا ہو)۔

''منہاج العابدین'' میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول مذکور ہے کہ میں جب سے ایمان لایا ہوں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کا مزہ حاصل کرسکوں اور اپنے رب تعالیٰ کے شوقِ دیدار کی وجہ سے کبھی سیر ہوکر پانی نہیں پیا اس لیے کہ زیادہ کھانے پینے سے عبادت میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ جب انسان خوب سیر ہوکر کھالیتا ہے تو اس کا جسم گراں اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔ اُس کے بدن کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور پھر وہ باوجود کوشش کے سوائے نیند کے کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتا اور اس طرح وہ اس مردہ کی مانند بن جاتا ہے جو راہ گزر میں پڑا ہوا ہو۔

''غنیۃ الطالبین'' میں ہے کہ کھانا اور سونا کم کرو کیونکہ جو شخص زیادہ کھاتا اور زیادہ سوتا ہے وہ قیامت کے دن اعمالِ صالحہ سے خالی ہاتھ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا فرمانِ عبرت نشان ہے کہ اپنے دِلوں کو زیادہ کھانے پینے سے ہلاک نہ کرو۔ جس طرح زیادہ پانی سے کھیتی تباہ ہو جاتی ہے اس طرح زیادہ کھانے پینے سے دِل ہلاک ہو جاتا ہے۔

نیک لوگوں نے معدہ کو ایسی ہانڈی سے تشبیہ دی ہے جو کہ اُبلتی رہتی ہے اور اُس کے بخارات برابر دِل تک پہنچتے رہتے ہیں۔ پھر انہی بخارات کی کثرت دِل کو غلیظ اور کثیف بنا دیتی ہے۔ زیادہ کھانے سے علم و فکر میں کمی واقع ہوتی ہے اور شکم پُری فطانت، ذہانت اور ذکاوت کو برباد کر دیتی ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۸۸۔

''کثرتِ نعمت گداز از دِل برد'' (نعمت کی بہتات دل سے گداز کو نکال دیتی ہے)۔

حضرت ابو یزیدؒ سے پوچھا گیا کہ آپؒ بھوک کی زیادہ تعریف کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ ثعلبہ جب تک بھوکا رہا تو لوگ اس کی تعریف کرتے تھے جب سیر ہوا تو اس نے نفاق ظاہر کیا۔ پھر فرمایا اگر فرعون بھوکا رہتا تو ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' نہ کہتا اور اگر قارون بھوکا رہتا تو نافرمانی نہ کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝'' [1] (آپ (غمگین نہ ہوں) انہیں چھوڑ دیجیے وہ کھاتے (پیتے) رہیں اور عیش کرتے رہیں اور (ان کی) جھوٹی امیدیں انہیں (آخرت سے) غافل رکھیں پھر وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے)۔ ''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝'' [2] (اور جن لوگوں نے کفر کیا اور (دنیوی) فائدے اٹھا رہے ہیں اور (اس طرح) کھا رہے ہیں جیسے چوپائے (جانور) کھاتے ہیں سو دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے)۔

ابن وضاحؒ نے ایک حدیث بتاتے ہوئے کہا کہ جب انسان چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے اور توبہ نہ کرے تو شیطان اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو نجات نہیں پاتا۔ جس طرح خون اور گوشت میں شہوت ہے اس طرح شیطان کے اثرات بھی اس میں جاری ہیں۔ پیچھے بیان کی گئی حدیث شریف میں ہے کہ شیطان بنی آدم میں خون کی طرح چلتا ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ترین وہ ہوگا جس نے بھوک پیاس زیادہ برداشت کی ہوگی۔ ابنِ آدم کیلئے شدید تر ہلاکت یہی ہے کہ وہ پیٹ کی خواہش میں لگا رہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم لوگوں کو بھوک، خوف، پھلوں، مالوں اور جانوں میں نقصان سے آزمائیں گے۔ ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ'' [3] (اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے)۔ اور حدیث شریف ہے ''بَطْنٌ جَائِعٌ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ سَبْعِيْنَ عَابِدٍ عَاقِلٍ'' [4] بھوکا پیٹ رہنے والا اللہ تعالیٰ کو ستر عبادت گذار عقلمندوں سے زیادہ پیارا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے بھوک میں کچھ ایسی حکمتیں رکھی ہیں کہ روزے کو (جس میں شہوات، خواہشات اور کھانے پینے کا ترک ہے) فرض فرمایا۔ اس سے بھوک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بھوک کو بہت شرف حاصل ہے اور تمام اُمتوں میں پسندیدہ ہے اور اگر دیکھا جائے تو بھوکے کا دِل زکی ہوتا ہے اور طبیعت مہذب، تندرستی زیادہ، خاص طور پر جو پینا بھی کم

---

[1] الحجر ۱۵:۳۔
[2] محمد ۴۷:۱۲۔
[3] البقرۃ ۲:۱۵۵۔
[4] البدایہ والنھایہ، جلد ۱۱، صفحہ ۱۸۱۔

رکھے اور ریاضت زیادہ کرے۔ ''لِاَنَّ الْجُوْعَ لِلنَّفْسِ خُضُوْعٌ وَّ لِلْقَلْبِ خُشُوْعٌ'' (کیونکہ بھوک نفس میں خضوع پیدا کرتی ہے اور دِل میں عجز و نیاز بڑھاتی ہے)۔ قوتِ نفسانی بھوک سے گھٹتی ہے۔ بھوک سے تن کو کمزوری ہوتی ہے لیکن دِل میں روشنی ہوتی ہے اور جان میں صفائی اور سر میں حق کا سودا حاصل ہوتا ہے۔

ایک آدمی باطن کی اصلاح کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تاکہ خالص اللہ تعالیٰ کا ہو جائے اور دوسرا بدن کی نفسانی خواہش میں مصروف رہتا ہے دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ ''اِنَّ الْمُتَقَدِّمِیْنَ یَاْکُلُوْنَ لِیَعِیْشُوْا وَ اَنْتُمْ تَعِیْشُوْنَ لِتَاْکُلُوْا'' (متقدمین اس لیے کھاتے تھے تاکہ زندہ رہیں اور تم اس لیے زندہ ہو تاکہ کھاؤ۔) ''اَلْجُوْعُ طَعَامُ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ مُسَبَّبُ الْمُرِیْدِیْنَ وَ قَیْدُ الشَّیَاطِیْنَ'' (بھوک صدیقوں کا طعام ہے اور مریدوں کا راستہ اور شیطانوں کے قید کرنے کا ذریعہ ہے)۔

حضرت ابوبکر کتانیؒ فرماتے ہیں ''مِنْ حُکْمِ الْمُرِیْدِ اَنْ یَکُوْنَ فِیْهِ ثَلٰثَةُ اَشْیَاءٍ نَوْمُهٗ غَلَبَةٌ وَ کَلَامُهٗ ضَرُوْرَةٌ وَّ اَکْلُهٗ فَاقَةٌ'' [1] (مرید کیلئے تین حکم ضروری ہیں وہ یہ کہ غلبہ نیند ہو تو سوئے ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے اور کھانا فاقہ کے بغیر نہ کھائے۔)

حضرت شیخ سعدیؒ نے کم کھانے، کم بولنے اور کم ملنے جلنے کی نصیحت درج ذیل شعر میں فرمائی ہے۔

بہ کم خوردن، بہ کم گفتن بکن خو　　تو کم باخلق بودن، خواب کم جو

(کم کھانا، کم بولنا اپنی عادت بنالو، لوگوں کے ساتھ میل جول کم رکھو اور سونے کو کم تلاش کرو)

جس درویش میں یہ چار صفات نہ ہوں وہ قربِ الٰہی کا مرتبہ نہیں پا سکتا۔ حضرت سلیمان بن داؤد علیہم السلام نے فرمایا: نفس پر قابو پانے والا پورا شہر فتح کرنے والے سے زیادہ بہادر ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میں اپنے نفس کے ساتھ ایسا ہوں جیسے بکریوں کا چرواہا ہو، ایک طرف کی بکریاں جمع کرے تو دوسری طرف والی بھاگ جائیں۔ جس نے اپنے نفس کو مار لیا وہ رحمت کے کفن میں بند ہوگا اور عزت کی زمین میں دفن ہوگا۔

ریاضت و عبادت سے نفس کے خلاف جہاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ نیند کم کرے تاکہ اس سے ارادے درست ہوں۔ کھانے کی کمی کرے تاکہ آفات سے بچا رہے۔ لوگوں کی اذیت برداشت کرے تاکہ مقصود کی طرف بڑھنے میں آسانی ہو۔ کم کھانا شہوات کی موت ہے اور زیادہ کھانے سے دِل سخت ہو جاتا ہے اور اس کا نور چلا جاتا ہے۔ حکمت کا نور بھوک ہے اور سیرابی انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ ''وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ'' [2] (اور جب ہم انسان پر (کوئی) انعام فرماتے ہیں تو وہ (شکر سے) گریز کرتا اور پہلوتہی کر جاتا ہے)۔

---

[1] شعب الایمان، حدیث: ۵۷۲۹، جلد ۵ صفحہ ۴۷۔　[2] بنی اسرائیل، ۱۷: ۸۳۔

حدیث شریف میں ہے"جِیۡعُوۡا بُطُوۡنَکُمۡ، دَعُوۡا الۡحِرۡصَ وَاعۡرُوۡا اَجۡسَامَکُمۡ قَصِّرُوۡا الۡاَمَلَ، وَ اظۡمَؤُوۡا اَکۡبَادَکُمۡ دَعُوۡا الدُّنۡیَا لَعَلَّکُمۡ تَرَوۡنَ اللّٰہَ بِقُلُوۡبِکُمۡ"[1] (اپنے پیٹوں کو بھوکا رکھو۔حرص چھوڑ دو۔بدن ننگے کرو۔امیدیں کم کرو۔اپنے جگر پیاسے رکھو۔دنیا کو چھوڑ دو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے دِل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھانے سے فہم وعلم ختم ہو جاتا ہے اور ذہانت جاتی رہتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنی بھوک اور پیاس کے ساتھ جہاد کرو کہ اس کا بھی وہی ثواب ہے جو کفار سے جہاد کرنے میں ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کا پیٹ بھرا ہوا اس کو ملکوت آسمانی کی طرف جانے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔[2]

بھوک پر اولیائے کرامؒ کے اقوال

اولیائے کرامؒ نے بھوک پر بہت سے اقوال لکھے ہیں اور انسان کے بھوکا رہنے کو بہت پسند فرمایا ہے۔نیچے چند اولیائے کرامؒ کے اقوال درج کیے جا رہے ہیں۔

۱) ابوسلیمان دارانیؒ: آپ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک رات کے کھانے سے ایک لقمہ کم کرنا رات بھر کی عبادت سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

۲) حضرت عبدالواحد بن زیدؒ: کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دوست نہیں بنایا سوائے اس کے جو بھوکا رہا ہو اور کوئی شخص پانی پر نہ چل سکا سوائے اس کے جو بھوکا رہا۔کوئی زمین کو طے نہ کر سکا سوائے اس کے جو بھوکا رہا۔

حدیث شریف ہے کہ"وہ چالیس ایام جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام رہے بھوکے رہے"۔

۳) حضرت سہل تستریؒ: فرماتے ہیں کہ جتنے ابدالوں کو مرتبہٴ ابدال تک رسائی ہوئی محض خلوت، بھوک، خاموشی اور شب بیداری کی بدولت حاصل ہوئی۔عام مشغولیات کو راہ سے ہٹا کر راہِ حق پر چلنا شروع کرنا چاہیے"۔بعض صالحین نے فرمایا ہے کہ "اَلۡجُوۡعُ رَاسُ مَالِنَا"(بھوک ہمارا سرمایہ ہے)اسی لیے علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے کہ۔

حکیمی نا مسلمانی خودی کی کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں غریبی میں نگہبانی خودی کی!

(ب ج:۳۸۱)

۴) حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ اپنے خدام سے فرمایا کرتے تھے"مَا دَامَتِ النَّفۡسُ تَطۡلُبُ مِنۡکُمۡ

---

[1] حلیۃ الاولیاء، صفحہ ۳۳۷۔

[2] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۸۰۔

اَلْمَعْصِيَةَ فَأَدِّبُوْهَا بِالْجُوْعِ وَالْعَطَشِ، فَإِذَا لَمْ تُرِدْ مِنْكُمُ الْمَعْصِيَةَ فَأَطْعِمُوْهَا مَا شَاءَتْ، وَاتْرُكُوْهَا تَنَامُ مِنَ اللَّيْلِ مَا أَحَبَّتْ"

(جب تک تمہارا نفس گناہ طلب کرتا ہے اسے بھوک اور پیاس کے ساتھ سزا دو جب تم سے گناہ کی طلب نہ کرے تو جو چاہے اسے کھلاؤ اور اسے رات کو جب تک چاہے سویا رہنے دو) [1]

۵) حضرت معروف کرخیؒ: نے فرمایا ہے کہ جب تو روزہ رکھے تو اس بات کا خیال رکھ کہ کس چیز سے افطار کرتا ہے اور کس کے پاس افطار کرتا ہے اور کس کے کھانے سے افطار کرتا ہے کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خراب لقمے سے دِل کی کیفیت خراب ہو جاتی ہے اور پھر ساری عمر وہ اپنی اصل حالت پر نہیں آ سکتا اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ صرف ایک خراب لقمہ پیٹ میں جانے سے ایک سال تک نمازِ تہجد ادا کرنے سے انسان محروم ہو جاتا ہے اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بُری نظر سے دیکھنے سے بندہ ایک عرصہ تک تلاوتِ قرآن پاک سے محروم ہو جاتا ہے۔ [2]

بھوک کے فوائد اور شکم سیری کی آفات

علماً و مشائخ کرامؒ نے بھوک کے دس فوائد بیان کیے ہیں۔ بھوک کی فضیلت اس لیے نہیں کہ یہ تلخ ہے اور اس میں مصیبتیں ہیں بلکہ اس کی فضیلت فوائد کی وجہ سے ہے۔

۱) اس سے دِل کی صفائی ہوتی ہے اور دِل روشن ہو جاتا ہے جب کہ پیٹ بھرنے سے دِل اندھا ہو جاتا ہے اور بخارات دماغ میں چڑھتے ہیں جن سے آدمی کند ذہن ہو جاتا ہے۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جس روز اللہ تعالیٰ کیلئے بھوک برداشت کی میرا دِل حکمت و عبرت سے پُر ہوا۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ پیٹ بھر کر نہ کھاؤ مبادا کہ تمہارے دِل میں نورِ معرفت ختم ہو جائے۔

۲) بھوک سے دِل میں رقت سی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے عبادت میں لذت ملتی ہے جب کہ شکم سیری سے دِل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان کھانے کا معاملہ جاری رکھ کر ذکر و مناجات سے لذت اندوز ہونے کی کوشش یا توقع کرتا ہے تو یہ اس کی محض خام خیالی ہے۔

دِل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت　　فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دِل یا شکم؟

(ب۔ج:۳۲۵)

۳) شکم سیری غفلت، غرور اور لاف زنی کو جنم دینے والی چیز ہے، خواہ انسان چاہے یا نہ چاہے جب کہ

---

[1] الطبقات الکبریٰ، صفحہ ۱۱۹۔　[2] منہاج العابدین، صفحہ ۱۶۴۔

خستگی و عاجزی کا ظہور بھوک سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی عظمت کی پہچان اسی بھوک سے میسر ہوتی ہے اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کے خزانوں کی کنجی حضور ﷺ کے سامنے رکھ دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس کی ضرورت نہیں اور مجھے یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ میں ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن کھایا کروں اور جس روز بھوکا رہوں صبر کروں اور جس دن کھاؤں تو شکر ادا کروں۔[1]

(۴) جس کا پیٹ بھرا ہو وہ اپنے بھوک کے عالم کو بھول جاتا ہے بلکہ دوسروں کی بھوک کو بھی بھول جاتا ہے۔ جو بھوکا ہو اسے اپنی اور دوسروں کی بھوک کا احساس ہوتا ہے (رمضان میں ہم اسی لیے روزے کھلواتے ہیں)۔ بھوکے کو خدا کا عذاب، قیامت کی بھوک پیاس، اہلِ دوزخ کی بھوک پیاس کا احساس ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ دنیا بھر کے خزانوں پر قابض ہونے کے باوجود آپ کا بھوکا رہنا کس سبب سے ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ ڈر غالب رہتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرا رکھوں تو درویشوں کی بھوک سے غافل نہ ہو جاؤں۔

(۵) سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو غلام بنا لے اور بدترین حالت یہ کہ خود نفس کا غلام بن جائے۔ سرکش جانور اس وقت تک سیدھا نہیں ہوتا جب تک اُسے بھوکا نہ رکھیں۔ نفس بھی اس بھوک کے بغیر سیدھا نہیں ہوتا کیونکہ شہوت شکم سیری سے جنم لیتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ سب سے پہلی بدعت جو حضور ﷺ کے بعد ظہور میں آئی وہ یہ تھی کہ قوم نے سیر ہو کر کھانا شروع کر دیا اور ان کا نفس بغاوت پر آمادہ ہونے لگا۔ شہوتِ فرج یقیناً کم خوری سے سرد ہو جاتی ہے اسی لیے کہا گیا کہ جو شادی نہ کر سکے تو روزے رکھے ایسے شخص کو اس سے باتیں بھی زیادہ کرنے کی خواہش نہیں رہتی جو زیادہ کھاتا ہے، باتیں بھی زیادہ بناتا ہے اور حرکتیں بھی عجیب کرتا ہے۔ سوکھی اور کم روٹی ایک سال کھانے سے عورت کا خیال بالکل دِل سے دور ہو جاتا ہے۔

(۶) نیند کا کم آنا بھوک سے لازم ہے لہٰذا عبادت میں اضافہ کیا جانا ممکن ہوگا۔ شکم سیر ہو کر نیند زیادہ ہو گی اور عبادت کم اور لذتِ عبادت سے بھی محرومی ہو گی۔ احتلام کا امکان زیادہ ہوگا۔ حضرت ابو سلیمانؒ کہتے ہیں کہ احتلام بھی ایک عذاب ہے جو شکم سیری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بھوکے رہنے سے وقت کی بچت ہو گی۔ سامانِ خورد و نوش کی خریداری، پکانا کھانا، رفعِ حاجات زیادہ ہونا یہ سب وقت کا ضائع کرنا ہے ان سے بچ جاتا ہے۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ علی جرجانیؒ نے چالیس سال سے روٹی بند کر رکھی تھی اور ستو کھاتے تھے کیونکہ اس سے اتنا وقت بچ جاتا کہ ستر بار تسبیح پڑھ سکتے تھے۔

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ، جلد ۳، صفحہ ۴۵۰۔

۸) کم کھانے سے وضو کی حاجت نہیں رہتی کیونکہ اس حالت میں وضو زیادہ دیر تک رہتا ہے اور کم خور غسل خانے کے کم چکر لگاتا ہے۔

۹) کم خور کی صحت ہمیشہ بہتر رہتی ہے۔ دواؤں کے خرچ اور ہسپتالوں کے چکروں سے اور کڑوی دواؤں کے پینے سے بچا رہتا ہے۔

۱۰) کم خور کا خرچہ بھی کم ہوتا ہے۔ اس طرح مال کی حاجت کم رہتی ہے۔ مال کی حاجت بڑھنا ہی آفتوں کی ذمہ دار ہے۔ حرام پر نظر نہ جائے گی۔ ایسے حلال رزق والا یقیناً مرفّہ ہوتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی الہجویریؒ کا قول ہے کہ میں اپنی زیادہ تر حاجتیں یوں پوری کر لیتا ہوں کہ انہیں ترک کر دیتا ہوں۔ جب مجھے قرضے کی ضرورت ہو تو میں لوگوں سے نہیں کہتا بلکہ اپنے پیٹ سے حاصل کرتا ہوں یعنی یہ کہ وہ اس خواہش کو ہی ترک کر دے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جب بازار میں مہنگائی کا رُخ پاتے تو کہتے لوگو! اس کا علاج یہ ہے کہ مہنگی چیزوں کی خرید ترک کر دو۔

جو اپنے پیٹ پر قادر ہو جائے اس کیلئے صدقہ، قربانی، ایثار اور سخاوت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک شخص کا پیٹ بہت موٹا دیکھا تو فرمایا کہ جو کچھ تو نے اس میں ڈال رکھا ہے وہی اگر دوسری جگہ ڈالتا تو بہت اچھا ہوتا (یعنی حق تعالیٰ کی راہ میں)۔

کم خوری کے متعلق مریدوں کے آداب و درجات

مشائخ عظام کا قول ہے کہ کھانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ کھانا حلال ہو اور کم کھائے۔ ایک دَم کم کرنا مشکل ہے۔ ایک ایک لقمہ کم کھانے کی عادت ڈالے تو یہ ممکن ہے۔ کم ہونے کے بعد چار درجے ہوتے ہیں۔

۱) صِدّیقوں کا درجہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ کا تصور بھی نہ کرے۔

حضرت سہل تستریؒ فرماتے تھے کہ زندگی کا انحصار عقل اور قوت پر ہے۔ جب تک ہر دن میں کمی واقع نہ ہو تو مت کھاؤ کیونکہ بھوکا آدمی کمزوری کے باعث اگر بیٹھ کر نماز پڑھے تو شکم سیر کی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ کے کھانے کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا؟ فرمایا: سالانہ خرچ برائے آٹا، چاول اور شہد کیلئے تین درہم تھا۔ جس سے میں ۳۶۰ پنیاں سی بنا لیتا تھا اور ہر رات ایک پنی سے روزہ افطار کر لیتا تھا۔

۲) دوسرا طریقہ ان لوگوں کا جو ۱/۳ حصہ روٹی کو بھی زیادہ سمجھتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ چند لقمے بھی آدمی کیلئے کافی ہوتے ہیں (آدھ مد کھانا)۔

۳) تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے کہ جو ۱/۳ انہیں بلکہ ۱/۲ حصہ پیٹ کا بھر لیتے ہیں (ایک مد کھانا)۔

۴) چوتھا درجہ ان کا ہے جو ایک مد سے بھی زیادہ کھا جائیں ممکن ہے کہ یہ اسراف میں ہو اور ارشاد باری

تعالیٰ ہے "وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝"[1] (مگر حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا)۔

بھوک رکھ کر اٹھنے کا نشان یہ ہے کہ اتنی بھوک رہے کہ ابھی روکھی روٹی کھانے کیلئے بھی جی ترپ رہا ہو۔ اگر سالن کی طلب کرتے رہو تو جان لو عیاشی ہے بھوک سچی نہیں۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آٹھ دن میں ایک صاع (۴ مد) سے زیادہ نہ کھاتا تھا اور قسم ہے خدا کی اس معمول کو اس وقت تک ترک نہ کروں گا جب تک ان کو دوبارہ نہ جا ملوں (یعنی وصال تک)۔ پھر فرمایا: لوگو! تم نے اس معمول کو چھوڑ دیا حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرا دوست اور مقرب وہی ہے جو اس انداز کو آخیر تک اپنائے جس پر وہ آج عمل پیرا ہے۔

جوع خود سلطانِ داروہاست ہیں ۔ جوع در جاں نہ چنیں خوارش مبیں

(بھوک تمام دواؤں کی سردار ہے، بھوک کو جان کے ساتھ عزیز رکھو اس کو ایسی ویسی چیز نہ سمجھو)

حدیث شریف ہے کہ "مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْمِزْمَارِ لَا يُحْسِنُ صَوْتَهٗ إِلَّا بِخَلَاءِ بَطْنِهٖ" (مؤمن کی مثال مزمار (ساز) کی طرح ہے جو اس وقت تک اچھی آواز نہیں دیتا جب تک کہ اس کا پیٹ خالی نہ ہو)۔

اسی طرح جب پیٹ خالی ہو تو آواز میں زیادہ شیرینی ہوتی ہے۔ دربارِ کبریاء میں زیادہ دیر کھڑا رہ سکتا ہے، خضوع زیادہ ہوتا ہے، نیند کم آتی ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لیے حضور ﷺ کے پاس آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ عرض کیا میں نے ایک روٹی پکائی تھی اور جی نہ چاہا کہ آپ ﷺ کے بغیر کھاؤں تو آپ ﷺ نے فرمایا تین دن کے بعد یہ پہلا لقمہ ہوگا جو تمہارے باپ کے منہ میں جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے گھر میں گندم کی روٹی متواتر تین دن تک کبھی کسی نے نہ کھائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام نیک افعال کی سردار بھوک ہے اور پرانا کپڑا پہننا اور آدھا پیٹ خالی رکھنا جزوِ پیغمبری ہے۔[2]

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تفکر نصف عبادت ہے جب کہ بھوک مکمل عبادت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چند لقمے آدمی کیلئے بہت ہیں جو اُس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں اور اس پر قادر نہ ہو تو پیٹ کا ایک تہائی حصہ کھانے کیلئے ہے۔ ایک تہائی پانی کیلئے اور ایک تہائی ہوا کیلئے ہے یعنی سانس لینے کیلئے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے آپ کو بھوکا اور ننگا رکھو تاکہ تمہارے دل کو دیدارِ الٰہی حاصل ہو سکے

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرامؒ کی جماعت پر رحمتِ الٰہی کا نزول تین وقتوں پر

---

[1] البقرۃ ۲: ۱۹۰۔ [2] احیاء العلوم، جلد ا، صفحہ ۳۰۷۔

ہوتا ہے۔ایک کھانے کے وقت اس لیے کہ وہ نہیں کھاتے مگر فاقے کے وقت۔دوسرے ہم نشینی اور مکالمت کے وقت اس لیے کہ یہ حضرات انبیاء ومرسلین علیہم السلام اور صدیقینؒ کے مقامات میں اُن کے قائم مقام ہو کر کلام فرماتے ہیں۔تیسرے سماع کے وقت اس لیے کہ یہ حضرات اس وقت حق تعالیٰ کے وجد اور شہود میں ہوتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت

ایک روایت جس کو امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں نقل کیا ہے قارئین کے نذر کی جارہی ہے۔

''حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا ابا جان! جب مختلف مقامات سے مالِ غنیمت آئے تو آپ اس میں سے نرم اور ملائم لباس چن کر زیب تن فرمایا کریں اور عمدہ ولذیذ کھانے خود بھی اور اپنے اہلِ خانہ کو بھی کھلایا کریں'' آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''اے حفصہ رضی اللہ عنہا بیوی سے زیادہ شوہر کے مال ومتاع کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اور تم تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے مکمل آگاہی رکھتی ہو تمہیں قسم ہے خدا کی ذرا بتاؤ تو سہی کہ اتنے سال تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت میں گزارے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل صبح کو سیر ہو کر کھاتے تو شام کو فاقے سے رہتے اور اگر شام کو روٹی مل جاتی تو صبح کو بھوکا رہنا پڑتا تھا۔تم بتاؤ کہ کیا فتح خیبر تک آپ کو سیر ہو کر خرمے کھائے ہوئے کئی سال نہ گزر چکے تھے؟ کیا تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب سوتے تو کملی کی دوتہیں کر کے اسی پر لیٹ جاتے تھے اور ایک دن کملی کی چارتہیں کرنے سے وہ زیادہ نرم سی ہوگئی تو دوسرے دن فرمایا کہ اس کی نرمی نے مجھے نمازِ شب سے محروم رکھا اور پھر ہمیشہ دوتہیں ہی کیا کرتے تھے۔تمہیں قسم ہے خدا کی بتاؤ کہ کیا تم نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کپڑے دھوتے اور ادھر بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کپڑے خشک ہونے تک باپردہ نہ نکل سکتے تھے کیونکہ آپکے پاس وہی ایک جوڑا ہوتا تھا؟ اور کیا تمہیں یاد نہیں کہ بنی ظفر کی ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایک چادر اور تہبند بُن رہی تھی اور دونوں کو مکمل کرنے سے پہلے ایک ہی کو ختم کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہننے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ مجھے ان میں سے ایک ایک بات یاد ہے۔اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ زاروقطار رونے لگے اور ساتھ ہی حفصہ رضی اللہ عنہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو روتے روتے بے ہوش ہوگئے اور جب ہوش آیا تو فرمایا کہ میرے دو محبوب دوست مجھ سے پہلے جاچکے ہیں (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اگر میں انہی کی راہ پر چلوں گا تو ان تک پہنچ سکوں گا ورنہ مجھے کسی اور راہ پر ڈال دیں گے! (چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما

دونوں کو حضور ﷺ کے پہلو میں جگہ ملی) ذرا اندازہ کریں کہ اس اعتبار سے ہماری جگہ حضور ﷺ کے مقام سے کتنی دور ہوگی۔

مدّتِ فاقہ

اکابرین و کاملین کیلئے مدتِ فاقہ بعض کے نزدیک ۴۸ گھنٹے، بعض کے نزدیک ۷۲ گھنٹے، بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک ۴۰ دن ہوتی ہے۔ جب غذاؤں سے پرہیز ہو تو خواہشات ضعیف ہو جاتی ہیں اور عقلی قوت بڑھ جاتی ہے۔ نفس کا زور (تصرف) ٹوٹ جاتا ہے۔ خواہشات فنا ہونے لگتی ہیں اور مرید کو تمام مرادیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابن عمر بن نجیب ﷫ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو نفس عزیز ہوتا ہے اس کی نظر میں دین خوار ہوتا ہے۔ ابوعلی رود باریؒ فرماتے ہیں کہ اگر صوفی پانچ دن کے بعد ہی یہ کہنے لگے کہ میں بھوکا ہوں تو اس کو بازار کا راستہ دکھاؤ کیونکہ وہ مجاہدے کے قابل نہیں۔

حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جنت کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹاتے رہو یہاں تک کہ وہ تمہارے لیے کھول دیا جائے۔ لوگوں نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ کس چیز سے کھٹکھٹایا کریں؟ فرمایا: بھوک اور پیاس سے۔ [1]

حضرت عائشہ ؓ کا ہی قول ہے کہ حضور ﷺ اتنا کم کھاتے کہ کبھی کبھی تو مجھے ترس آنے لگتا۔ ان کا پیٹ بالکل کمر کے ساتھ لگا ہوا ہوتا جب میں کہتی کہ آپ ﷺ اگر اتنا کھا لیا کریں جس سے بھوک مٹ جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ آپ ﷺ فرماتے کہ عائشہ! مجھ سے پہلے جو عالی حوصلہ پیغمبر گزرے ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور بڑے بڑے مرتبے ملے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں تن کی پرورش میں مشغول ہو گیا تو میرا درجہ ان سے کہیں کم نہ رہ جائے۔ مجھے یہ چیز زیادہ عزیز ہے کہ میرا حصہ آخرت میں کم نہ ہو جائے۔ سالک یا مرید کیلئے بھوک کا وقفہ کتنا لمبا رکھنا چاہیے اس کے تین درجے ہیں۔

۱) بڑا درجہ یہ ہے کہ تین دن بعد کھانا کھائیں۔ حضرت صدیق اکبر ﷛ چھ دن فاقے سے رہتے اور ابراہیم بن ادھمؒ اور سفیان ثوریؒ کا معمول تین دن بعد کھانے کا تھا۔ کہا گیا ہے کہ جو شخص چالیس دن کچھ نہ کھائے تو اس پر ملکوتِ آسمان سے کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر ہوتا ہے۔

حکایت: ایک صوفی نے راہب سے کہا کہ تم ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگا کہ حضرت عیسیٰ ؑ نے چالیس روز تک کچھ نہ کھایا تھا، یہ ان کے سچے نبی ہونے کی دلیل ہے، جب کہ تمہارے پیغمبر نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اس صوفی نے کہا کہ میں اپنے نبی کا ادنیٰ اُمتی ہوں اگر چالیس روز نہ کھاؤں تو ایمان لے آؤ گے۔ کہنے

[1] احیاء علوم الدین، جلد ۳، صفحہ ۸۸۔

لگاہاں ضرور۔ چنانچہ اس صوفی نے ساٹھ روز تک کچھ نہ کھایا اور وہ آدمی مسلمان ہوگیا۔

۲) دوسرا درجہ وہ ہے کہ تین دن کچھ نہ کھائیں۔

۳) تیسرا درجہ ان کا ہوتا ہے جو روزانہ کھاتے ہیں مگر دن میں ایک بار ہی کھاتے ہیں۔ حضور ﷺ حضرت عائشہ ؓ سے فرماتے ہیں کہ دن میں دو بار کھانا اسراف ہے اس سے بچنا چاہیے مرید کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ سادہ غذا کھائے اور جَو یا گندم کا اَن چھنا آٹا کھائے۔ جس نے اپنی ہر خواہش پوری کی، بزرگوں نے اس کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی۔

مشائخ کے کھانے پینے کے اسلوب

حضرت وہب بن مُنَبہ ؒ: فرماتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر دو فرشتے آپس میں ملے تو ایک نے کہا کہ میں دنیا میں جا رہا ہوں کیونکہ فلاں یہودی نے مچھلی کی خواہش کی ہے اور میں ایک مچھلی کو ماہی گیر کے جال میں پھنسانے جا رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں بھی جا رہا ہوں اس لیے کہ ایک روغن کا بھرا ہوا پیالہ جو فلاں عابد کیلئے لایا جا رہا ہے اس کو گرا دوں۔

حضرت عمر ؓ کی خدمت میں ایک مرتبہ ٹھنڈے پانی میں شہد گھول کر پیش کیا گیا۔ آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا مجھے اس کا حساب دینے سے معاف ہی رکھیے۔

حضرت عبدالغلام ؒ: روٹی اور پانی کو دھوپ میں رہنے دیتے تا کہ اس سے بھوک تو مٹ جائے لیکن کہیں لذت کی خاطر اس کی خواہش دِل میں پیدا نہ ہو یعنی مقصودِ لذت نہ بن جائے۔

حضرت مالک بن دینار ؒ: کو دودھ کی خواہش ہوئی تو چالیس برس تک دودھ نہ پیا۔ ایک شخص تازہ خرما لایا۔ آپ اس کو کافی دیر ہاتھ میں لیے تکتے رہے اور آخر اس شخص کو واپس کرتے ہوئے فرمایا تم ہی کھا لو۔ میں نے چالیس برس ہوئے انہیں ترک کر دیا تھا۔

حضرت احمد بن ابی الحواری ؒ: فرماتے ہیں کہ میرے مرشد حضرت سلیمان درانی ؒ نے ایک دن نمکین روٹی کی خواہش کی۔ میں پکوا کر لے آیا اور سامنے رکھ دی۔ آپ نے ایک لقمہ اُٹھایا اور پھر رکھ دیا اور زار و قطار رونا شروع کر دیا اور کہا خدایا! تو نے میری خواہش کے مطابق یہ چیزیں مجھے عطا کر دیں۔ آہ! یہ تو بہت بڑی سزا ہے۔ میرے اللہ! میں توبہ کرتا ہوں مجھے معاف کر دے۔

حضرت مالک بن ضیغم ؒ نے بازار میں تر (ککڑی) دیکھی۔ کھانے کی خواہش ہوئی۔ پس قسم کھائی کہ ہرگز نہ کھاؤں گا اور چالیس برس تک پھر کبھی اس کا نام بھی نہ لیا۔

حضرت حماد بن ابی حنیفہ ؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں حضرت داؤد طائی ؒ کے دروازے پر تھا تو اندر سے ان کی

یہ آواز سنی کہ تو نے ایک بار گاجر کی خواہش کی اور میں نے تجھے لا کر دے دی، اب تو خرما کی فرمائش کر رہا ہے تو اسے ہرگز نہ پائے گا اور نہ ہی کھا سکے گا۔ جب وہ اندر گئے تو کوئی اور ان کے علاوہ نہ تھا۔

حضرت ابوبکر جلابیؒ کا نفس جب کوئی چیز مانگتا تو وہ نفس سے کہتے کہ اگر یہ کھانا چاہتا ہے تو دس دن کچھ نہیں ملے گا اس طرح وہ نفس کو رام کر لیتے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جو شخص چالیس دن مسلسل گوشت کھاتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ ایک مرتبہ بازار سے گزرے تو ان کے دل میں انجیر کھانے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے دکاندار سے فرمایا کہ میرے جوتے لے لو اور مجھے کچھ انجیر دے دو۔ دکاندار نے کہا کہ یہ جوتے اتنے بوسیدہ ہیں کہ ان کے بدلے آپ کو کچھ نہیں مل سکتا۔ ایک شخص جو پاس ہی کھڑا یہ بات چیت سن رہا تھا دکاندار سے بولا کہ تم جانتے نہیں ہو، یہ امام مالک ہیں۔ دکاندار نے اپنے غلام سے کہا کہ یہ انجیروں کا پورا ٹوکرا لے جاؤ اور آپ کے گھر چھوڑ آؤ مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ دکاندار نے غلام سے کہا کہ اگر امام صاحب یہ ٹوکرہ قبول کر لیں تو میں تجھے آزاد کر دوں گا مگر امام صاحب اس کی منت سماجت سے بھی رضامند نہ ہوئے۔

راہِ اعتدال وہی ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو بتائی تھی کہ ایک بار گوشت، ایک بار روغن، ایک بار دودھ، ایک بار سرکہ سے کھانا کھائے اور ایک بار روکھی روٹی کھانا چاہیے (تاکہ نفس سرکشی نہ کرے)۔ حدیث شریف میں ہے کہ پیٹ بھرنے کے بعد فوراً سونا نہیں چاہیے کیونکہ اس طرح دو غفلتیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ نیز فرمایا کہ اپنے کھانے کو ذکر اور نماز سے گلایا کرو اور فرمایا زیادہ نہ سویا کرو کیونکہ اس سے دِل تاریک ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ کھانے کے بعد چار رکعت نماز پڑھیں اور سو بار تسبیح پڑھیں اور قرآن کے ایک جزو کی تلاوت کریں (اس سے نفس بغاوت سے رُک جاتا ہے)۔

حضرت سفیان ثوریؒ اگر کھاتے تو اپنے نفس سے فرماتے پوری رات عبادت کرو کیونکہ جس جانور کو کھلایا جاتا ہے اس سے پورا کام بھی لیا جاتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ کھانے کے بعد ذکرِ الٰہی نہ کرنے سے دِل سخت ہو جاتا ہے اور دِل میں ظلمت پھیل جاتی ہے۔ ذکرِ الٰہی کے انوار اس کے کھانے کو منور کر دیتے ہیں اور نورانی کاموں کی چاہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ''الفتح الربانی'' میں ہے کہ حضور پرنور ﷺ نے فرمایا ہے کہ کلمہ پاک کے ذکر سے شیاطین کو اس طرح دُبلا کیا کرو جس طرح کوئی شخص بار بار سوار ہونے سے یا بکثرت بوجھ لادنے سے اپنے اونٹ کو دُبلا کرتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مذبار اور موحدین کیلئے نور ہے۔ اخلاص تیرے دِل میں طمع کی آگ کو بجھا دے گا اور نفس کے تکبر کو توڑ دے گا۔

آپؒ فرماتے ہیں کہ ایسی جگہ نہ جا جہاں تیرے دل کی آگ بھڑک اُٹھے اور دین و ایمان کے گھر کو تباہ کر دے اور حرص و ہوس بھڑک کر تیرے دین اور ایمان کو غرق کر دے۔ (لوگ بازاروں میں جاتے ہیں تو بازار کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کیلئے سخت وعید آئی ہے)۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ مجھ سے نیند دور کر دے چنانچہ چالیس سال انہیں نیند نہیں آئی۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو جب نیند آتی تو دریا میں گھس جاتے اور تیرنے لگتے۔ حضرت شبلیؒ پر نیند کا غلبہ ہوتا تو آنکھوں میں نمک ڈال لیتے۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ سے کسی نے کہا کہ اگر ایک شخص دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتا ہے تو یہ کیسا ہے؟ فرمایا یہ صدیقین کا کھانا ہے۔ پھر پوچھا جو دن میں دو بار کھانا کھاتا ہے جواب دیا یہ مومنین کا کھانا ہے۔ پھر پوچھا تین بار کھائے تو فرمایا گھر والوں کو کہہ دو کہ وہ تمہارے لیے کُھرلی تیار کر دیں (جہاں جانور چارہ کھاتے رہتے ہیں)۔

طریقت میں بھوک ہے

طریقت میں نفس کی تادیب کرنا سب سے اہم مرحلہ ہے۔ اس میں شکم سیری سے منع کیا جاتا ہے تاکہ نفس کی سرزنش ہو سکے اور مشائخ کا اصول ہے کہ جو سالک بھوک برداشت نہیں کرتا اس کو طریقت کے زمرے سے نکال دیا جاتا ہے اور اسے کہہ دیتے ہیں کہ تجھے طریقت قبول نہیں کرتی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ مجھے ۳۰ سال کی سخت ریاضت اور مجاہدات سے صرف یقین کی دولت میسر ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ بھوک کو مجاہدات میں امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں نفس کی تادیب ہے۔ احادیث میں ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی رگوں میں گردش کرتا ہے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اس کی گردش کو بھوک کے ذریعے بند کر دو۔ بھوک دشمنِ خدا کیلئے قہر ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا شہوات کا منبع اور مرکز ہے۔ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دلوں کو بھوک کے ذریعے منور کرو اور اس کے توسط سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو۔ بھوکا رہنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے اور خدا کے نزدیک بھوک سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ حضور ﷺ کا ایک اور بھی فرمان ہے کہ آسمان کے فرشتے اس انسان کے پاس بالکل نہیں آتے جس نے اپنا پیٹ بھر کر عبادت کا مزہ کھو دیا۔ پیٹ کو بھوکا رکھنا تمام بزرگانِ دین کا شعار تھا۔[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ میں جب سے ایمان لایا ہوں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کا مزہ حاصل کر سکوں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب تعالیٰ کے دیدار کے شوق کی وجہ سے کبھی سیر ہو کر پانی نہیں پیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپؓ کا معمول تھا کہ آپؓ چھ دن فاقہ سے رہتے تھے۔

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۵، ۸۰۔

فرمان نبوی ﷺ ہے کہ دلوں کو زیادہ کھانے پینے سے ہلاک نہ کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح زیادہ پانی سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں اسی طرح زیادہ کھانے سے دل کا سوز اور گداز ختم ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں اگر فرعون بھوکا رہتا تو ہرگز خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔[1]

بھوک اور عصر حاضر

اسلام میں بھوک کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور بھوک کو اس قدر برداشت کرنا صرف اسی لیے ہے کہ اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے میں بھوک کا بہت بڑا کردار ہے اور نفس کشی اسی سے متعلق ہے اور اسی لیے اسلام نے ہر سال میں ایک ماہ کے روزے رکھنے کا حکم فرض کی حیثیت سے جاری کیا ہے۔ بھوک برداشت کرنے پر جو فوائد مرتب ہوتے ہیں ان مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ آج کے مسلمان ان باتوں پر عمل کرنا تو کیا ان کو تو ان حقیقتوں سے قطعاً کوئی آشنائی بھی حاصل نہیں۔ عام مسلمان کی بات تو ایک طرف ہمارے زمانے میں مسلکِ تصوف پر چلنے والے صوفیوں کیلئے بھی بھوک کو برداشت کرنے کی باتیں بعید از قیاس اور ان کے عمل کی سطح سے کہیں بلند نظر آتی ہیں۔ قارئین کی سہولت کیلئے (راقم الحروف) نے اس بات کو مناسب سمجھا ہے کہ جو کچھ مذکورہ کتاب ''سوز وسازِ رومیؒ'' میں بیان کیا گیا ہے اس کے خلاصے کو یہاں مختصر اور آسان حروف میں پیش کر دیا جائے تا کہ بھوک میں بیان کردہ تمام خوبیوں کا جامع نقشہ ذہن نشین ہو جائے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے آسان نکات چن لیے جائیں۔

بھوک کا عمل اختیار کرنے پر جو فوائد مرتب ہوئے ہیں اور جس طرح ہمارے اسلاف نے بھوک کی سختیاں برداشت کیں اس کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سختیاں برداشت کرنا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، جنیدؒ بغدادی، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے بزرگوں کا ہی کام ہے۔ احادیثِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھوکا رکھے جگر کو پیاسا رکھے، جسم کو زائداز ضرورت کپڑوں سے ننگا رکھے اور اپنی امیدوں کو کوتاہ رکھے تا کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ عرش کے نور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

یہی وجہ تھی کہ ایک طبیب جو مدینہ شریف میں مسلمانوں کا علاج کرنے کیلئے حضور ﷺ کی اجازت کے ساتھ آیا تو اس نے اس بات کی شکایت کی کہ یہ مسلمان تو بہت کم بیمار ہوتے ہیں اور وہ مدینے کے لوگوں کے علاج کرنے کی بجائے فارغ بیٹھا ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے اس طبیب سے فرمایا ''ہم ایسی قوم ہیں جو کھانا اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک بھوک نہ ہو اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔'' فرمایا یہی راز ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اچھی صحت کا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ابلیس انسان کو پیٹ کے ذریعے

---

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۴۔

گمراہ کرتا ہے اور غلط راستوں پر لے جاتا ہے۔[1]

شریعت کی اتباع بھی مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کیونکہ نفس کو اس کی بغاوت سے روکنے کیلئے اتباع شریعت سے بہتر کوئی کام نہیں۔ ماہِ رمضان کے روزے اسی لیے سودمند ہیں کہ روزہ انسان کے نفس کو مہذب بنا دیتا ہے اور مسلمان کو اس کا انعام تقویٰ کی شکل میں دیا جاتا ہے۔

بھوک سے جہاد

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ لوگوں کو خوف، بھوک اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے آزماتا ہے اور جو لوگ ان باتوں میں صبر سے کام لیتے ہیں وہی فلاح پاتے ہیں)۔[2]

بھوک کی اہمیت اسی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ بھوک نفس میں خضوع پیدا کرتی اور دل میں عجز و نیاز بڑھاتی ہے۔ قوتِ نفسانی بھوک سے گھٹتی ہے۔ بھوک سے جسم میں کمزوری ہوتی ہے مگر دل میں روشنی، جان میں صفائی اور سر میں حق کا مواد حاصل ہوتا ہے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ سالکینِ راہِ طریقت کیلئے تین حکم ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ غلبہ نیند ہو تو سوئے، ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے اور کھانا فاقے کے بعد کھائے۔ اس کے ساتھ اگر درویش میں کھانا کم کھانے کی طاقت ہو تو وہ قربِ الٰہی کے مرتبے کے لائق ہوتا ہے۔ کم کھانا شہوات کی موت ہے۔ زیادہ کھانے سے دل سخت ہو جاتا ہے اس کا نور چلا جاتا ہے۔ حکمت کا نور بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے اور سیرابی انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنے نفسوں سے بھوک اور پیاس کے ساتھ جہاد کرو۔ اس کا بھی وہی ثواب ہے جو کفار سے جہاد کرنے میں ہے۔ جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو ملکوت آسمانی کی طرف راہ نہیں سوجھتی۔[3]

حضرت عبدالواحد بن زیدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دوست نہیں بنایا سوائے اس کے کہ جو بھوکا رہا ہو اور ہوا میں کوئی نہیں اڑا مگر جو بھوکا رہا اور زمین کو طے کرنے کا شرف بھی بھوکے کو ہی ملتا رہا ہے اور کبھی ایک دفعہ کی بدنظری سے بندہ ایک عرصہ تک تلاوتِ قرآن سے محروم ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھرنے سے دل اندھا ہو جاتا ہے بخارات دل کو چڑھتے ہیں اور اس سے آدمی کند ذہن ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "پیٹ بھر کر کھانے سے دل سے نورِ معرفت ختم ہو جاتا ہے" جو شخص اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان پیٹ بھر کر ذکر و مناجات کی لذت چاہتا ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

مشائخ کرامؒ کا قول ہے کہ سرکش جانور (نفس بھی) اس وقت تک سیدھا نہیں رہتا جب تک اسے بھوکا نہ رکھیں۔ شہوت شکم سیری سے جنم لیتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ اسلام میں حضور ﷺ کے

---

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۵۔ [2] البقرہ ۲: ۱۵۵۔

[3] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۳۔

بعد سب سے پہلی بدعت جو ظہور میں آئی وہ یہ تھی کہ قوم نے سیر ہو کر کھانا شروع کر دیا اور ان کا نفس بغاوت پر آمادہ ہونے لگا۔[1]

بھوک میں ملنے والے درجات

صدیقین کا درجہ یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کرتے۔ بھوکا آدمی کمزوری کے باعث اگر بیٹھ کر بھی نماز پڑھے تو یہ شکم سیر کی کھڑے ہو کر پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن تک بھوکے رہے اور جنگ بدر میں تو دو صحابہ کی دن بھر کی خوراک ایک کھجور ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا پیٹ کمر کے ساتھ ملا رہتا تھا اور آپ ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آجاتا تھا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "بھوک تمام نیک اعمال کی سردار ہے، پرانا کپڑا پہننا اور آدھا پیٹ خالی رکھنا جزوِ پیغمبری ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ "تفکر نصف عبادت ہے جب کہ بھوک مکمل عبادت ہے"۔[2]

بھوک کے مسئلہ کا حل

مذکورہ تمام تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلا مسئلہ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج کا آزاد نوجوان بلکہ آج کا مبتدی اور متوسط صوفی بھی ان تمام منزلوں سے کیسے گذر سکے گا۔ جس طرح ہمارے بڑے بڑے بزرگوں نے اپنی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کیلئے مجاہدات کی سختیاں برداشت کیں اور ہمارے لیے ایسی قابلِ تقلید مثالیں چھوڑی ہیں کہ جس پر عمل کرنا موجودہ نسل کیلئے ممکن نہیں، تو اب اس نازک زمانے کے مسلمانوں کیلئے یہ مسئلہ حل کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی مشکل ہو گیا ہے کہ ہمارے زمانے میں لوگوں کیلئے ایسی تربیت گاہیں بہت کم نظر آتی ہیں جہاں ان باتوں کا سبق دیا جاتا ہو۔ آج کی پود کے (بقول علامہ اقبالؒ) ماں باپ بذاتِ خود روحانی طرز کی زندگی سے بالکل کورے نظر آتے ہیں اور علمی درسگاہوں میں دینی امور میں کامل استاد بھی نہیں ملتے تو کہاں سے آئے گی صدائے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه"۔

اس کے بعد دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ماحول کچھ اس طرز میں ڈھل چکا ہے کہ اب اتنی گہری روحانی باتیں تو کہاں دیکھنے میں آئیں گی، یہاں تو سیدھی سادی روحانی باتیں نہ تو سنانے والے ہیں اور نہ سننے والے اور اگر ہیں تو مسلمانوں کو دنیا کی رنگین زندگی کو خیر باد کہنے کے بعد ان کی باتوں کو سننے کی توفیق ہی کہاں ملتی ہے جو اپنی رنگین محفلوں کو چھوڑ کر دینی باتوں کو سنیں۔ دینی باتیں سنانے والے بھی شعلہ فشاں بزرگ نہیں رہے کہ جن کی بات کو سن کر لوگوں کے سینوں میں دین کی طرف آنے کی آگ بھڑک اٹھے۔ تیسرا مسئلہ

[1] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۸۔
[2] احیاء العلوم، جلد ۳، صفحہ ۷۴۔

یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو زمانۂ حال کی مغربیت یا نشۂ چرس کا ذوق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ اب اس مغربیت کو چھوڑ نہیں سکتے تاوقتیکہ کوئی علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ عشق کی آگ ان کے سینوں میں پھونک دے۔ یہی دنیا کے عشق کی آگ اگر روحانی یا حقیقی عشق کی طرف موڑ دی جائے تو پھر یہ لوگ روحانی دنیا میں بھی کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ۔

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی ۔۔۔ اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال

راقم الحروف اس بات کا قائل ہے اور اس بات کا تجربہ کیا ہے کہ اگر شیخ کامل میسر ہو جائے تو دنیا بدل جاتی ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ۔۔۔ نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

(ب ج:۴۱۲)

مذکورہ تین باتوں کا علاج اوپر بیان کردہ حروف میں ہی چھپا ہوا ہے کہ کوئی اس پر عمل پیرا ہو تو منزل ضرور مل جاتی ہے۔ یاد رہے کہ مذکورہ منزل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی سچی طلب اگر دل میں پیدا ہو جائے تو یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ بس کسی مردِ کامل کی تلاش کرنا ضروری ہے تاکہ سچی طلب دل میں پیدا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری خود لے لیتا ہے۔ اس میں بس استقامت کی ضرورت ہے۔

بڑے بڑے مشائخ نے جو مشاہدات کیے ہیں وہ ہمارا نوجوان نہیں کر سکتا البتہ کوئی رفتہ رفتہ اس میدان میں آنے کی کوشش جاری رکھے تو کام بن جاتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ اس خطرناک زمانے میں جہاں ہر طرف بے دینی کا رنگ پھیل چکا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے گنہگار بندوں کیلئے نرمی کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ایسے زمانے میں تھوڑا سا عمل بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ پچھلے زمانے کے بڑے بڑے بزرگوں کے اعمال سے زیادہ مہربانی فرمائے گا یعنی تھوڑی محنت پر زیادہ اجر دے گا لہٰذا نفس کی سرزنش کیلئے جو اوپر بیان ہوا ہے اس کے مطابق درجہ بدرجہ عمل کرنا شروع کر دیں اور بزرگوں کی کتابوں اور علامہ اقبالؒ کے کلام سے ہمت اور حوصلہ حاصل کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ پر بھی اللہ تعالیٰ کا وہی فضل و کرم ہو جائے جو مشائخ پر کبھی ہوا تھا۔ اگر کسی کو اس طرف آنے کی لگن ہی نہ ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔

اندکے صرفہ بکن از خواب و خور (کھانے اور نیند میں کسی قدر کمی گوارا کرو)

مولانا رومیؒ "درگاہِ حق میں ہدیہ لے جانے کا طریقہ بیان فرماتے ہیں کہ تھوڑا سونا اور تھوڑا کھانا چاہیے تاکہ طاعات و عبادات باحسن وجوہ انجام پذیر ہوں۔ فرماتے ہیں یہ چیز محبوب حقیقی کی درگاہ میں پیش کرنے کیلئے بہترین ہدیہ ہے اور اس کے مقامِ قرب میں باریاب ہونے کا سب سے اچھا وسیلہ ہے۔ خواب وخور

(سونا اور کھانا) اس ہدیہ کی رسائی اور وسیلہ بننے کے حصول کے مانع ہیں۔

زیادہ کھانے سے جسم میں ثقل وکسل پیدا ہو جاتا ہے۔ دل سے نشاط وتازگی زائل ہو جاتی ہے اور وہ ذوقِ عبادت ولطف مناجات سے محظوظ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے انسان عبادت کو ترک کرنے یا ناقص صورت میں بجالانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب ضرورت سے زیادہ نیند غلبہ کرتی ہے تو اوقاتِ عبادت کم بلکہ فوت ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کثرتِ طعام سے معدہ اور جگر کے فعل میں خلل آجاتا ہے، تو عروضِ امراض کے سبب سے ہفتوں یا مہینوں کیلئے بالکل ہی طاعات وعبادت سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اگر تقلیلِ غذا اختیار کی جائے تو اس سے تقلیلِ نوم کی مصلحت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے یعنی قلت طعام سے نیند خود بخود معتدل ہو جاتی ہے۔ پھر فرائض وسنن میں کسی قسم کی غفلت وکوتاہی وقوع میں نہیں آتی۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تقلیل غذا آثارِ ایمان میں سے ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی بہت سا کھانا کھایا کرتا تھا۔ پھر جب وہ مسلمان ہو گیا تو تھوڑا کھانے لگا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مومن ایک آنت میں کھانا کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے[1] یہ روایت بخاری شریف کی ہے اور مسلم شریف کی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے یوں ہے کہ جناب رسول ﷺ نے اس کیلئے بکری دوہنے کا حکم دیا۔ وہ بکری دوہی گئی تو وہ شخص اس کا سارا دودھ پی گیا حتیٰ کہ سات بکریوں کا دودھ نوش کر گیا۔ پھر وہ صبح کے وقت مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کیلئے بکری دوہنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ بکری دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر دوسری بکری کو دوہنے کا حکم دیا تو وہ یہ دودھ سارا نہ پی سکا۔ پس رسول خدا ﷺ نے فرمایا مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پی جاتا ہے۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ کافر کا مقصود پیٹ ہی پیٹ ہے اور مومن کا نصب العین آخرت ہے اور مومن کیلئے مناسب یہ ہے کہ کھانا کم کھائے اور اس کا کم کھانا ایمان کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے اور طعام کی حرص کفر کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔

شو قَلِيْلُ النَّوْمِ مِمَّا يَهْجَعُوْن باش در اسحار از يَسْتَغْفِرُوْنَ

(سوتے وقت تھوڑی نیند لو (اور) آخر شب میں (خداوند غفور رحیم سے) بخشش مانگو) (۱/۳۳۱)

تقلیل خواب کی فضیلت بیان کرنے کیلئے ان آیات سے اقتباس کیا ہے '' كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ٥ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ ''[3] یہ لوگ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے اور صبح کو استغفار

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۰۸۰، جلد ۵، صفحہ ۲۰۶۲۔ [2] صحیح مسلم، حدیث ۲۰۶۳، جلد ۳، صفحہ ۱۶۳۲۔ [3] الذاریات، ۵۱: ۱۷، ۱۸۔

کرتے تھے)۔

غرض یہ کہ تھوڑا سونا نزولِ برکات اور حصولِ سعادت کا ذریعہ ہے اور دعا و مناجات اور توبہ استغفار کیلئے نیم شب اور صبح دونوں اوقات زیادہ موزوں ہیں۔

چاشنے داں تو حالِ خواب را پیشِ محمولی حالِ اولیاء

(خواب کی حالت کو تو اولیاء کرامؒ کی حالت محمولیت کے آگے ادنیٰ نمونہ سمجھ) (۳۳۲/۱)

اولیاء کرامؒ کی محمولی یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار وارادہ کو بالکل ترک کر کے مرضیِ حق کے تابع محض اور منقاد خالص ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کے نزدیک تکلفِ فعل اور تجسم عمل کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا اور یہ امران کیلئے بمنزلہ امر طبعی بن جاتا ہے اور یہ محمولی خواب کی محمولی سے اکمل ہے۔ محمولی اولیاءؒ کی کیفیت اصحاب کہف کی سی ہے جو غار میں بے خود لیٹے پڑے ہیں۔ انہیں دنیا جہان کی کچھ خبر نہیں۔ اصحاب کہف کی طرح ان کی کروٹ بھی اللہ تعالیٰ بدلتا ہے۔ اسی طرح اولیائے کرامؒ بھی بیٹھتے اٹھتے چلتے پھرتے ہر حالت میں عشقِ الٰہی کے استغراق میں مست و بے خود ہیں۔

گر شود پُر نُور روزن یا سَرا تو مدَاں روشن مگر خورشید را

(اگر کوئی روشندان یا گھر روشن ہو تو تم صرف سورج کو (بالذات) روشن سمجھو (نہ اس گھر یا روشندان کو) (۳۳۸/۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کوئی گھر اگرچہ اپنے اندر نور پاتا ہے مگر وہ آس پاس والے روشن گھر سے جگمگا رہا ہے۔ یہ علم و حکمت جو تمہارے قلب کے اندر نزول کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ اولیاء اللہؒ کی برکت سے ہے۔ تم شکر کرو اور اس کو اپنا کمال سمجھ کر مغرور مت ہو اور صحبت پیر سے مستفید ہوتے رہنے سے انکار نہ کرو اور ہرگز خود بینی نہ کرو۔ اس علم و کمال نے مغرور لوگوں کو امت مرحومہ سے خارج کر دیا ہے۔ اگر دروازہ یا دیوار دعویٰ کرے کہ میں خود روشن ہوں اور کسی کا پرتو مجھ پر نہیں تو سورج کہہ سکتا ہے کہ اے خطا کار جب میں چھپ جاؤنگا تو اصلی راز کھل جائے گا۔

بدن اپنی خوبصورتی اور جمال پر نازاں ہے اور روح نے اپنی شان و شکوہ اور ساز و سامان چھپا رکھے ہیں۔ روح بدن کو کہتی ہے اے گندگی کے ڈھیر! تو ہے کیا؟ خیر میرے پرتو حیات سے تو نے ایک دو روز زندگی حاصل کر لی۔ میں ذرا تجھ سے علیحدہ ہو جاؤں پھر دیکھنا تیرے دوست تیرے لیے ایک قبر کھود یں گے۔ جب تیرے ہمدرد تجھ کو قبر میں دفن کر کے چل دیں گے پھر جب تو گل سڑ جائے گا تو وہ شخص بھی تیری بدبو سے ناک بند کر لیں گیں۔ پس جس طرح جان کا پرتو جسم پر ہوتا ہے اسی طرح علم و کمالات میں اولیاءؒ کا پرتو میری اور تمہاری روح پر ہے۔ اگر وہ روح یعنی مرشد کامل اپنا قدم ہماری روح سے پیچھے ہٹا لے تو ہماری روح ایسی بے کمال رہ جائے جیسے جسم بے جان۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ۔

اند کے صرفہ بکن از خواب و خور ارمغان بہر ملاقاتش ببر

(اپنی نینداور خوراک میں کسی قدر کمی گوارا کرو اور اس محبوب حقیقی کی ملاقات کیلئے (ایمان اور اعمال نیک کی) سوغات لے جاؤ) (۳۳۱/۱)

جوع رزقِ جانِ خاصانِ خداست (بھوک خاصانِ خدا کی روح کی غذا ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بھوک تمام بیماریوں کی دوا ہے اور سب دواؤں سے بڑھ کر دوا ہے۔ اس کو ایسی ویسی چیز نہ سمجھو یہ تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو دی جاتی ہے۔ بھوک میں سینکڑوں فضل و ہنر ہیں۔ زندگی کو موت کی لذت چکھا دینے والی بھوک زندگی سے بہتر ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

جوع خود سلطان داروہاست ہیں جُوع در جاں نہ چنیں خوارش مبیں

(جان لو کہ بھوک تو تمام دواؤں کی سردار ہے بھوک کو جان کے ساتھ رکھو اس کو ذلیل نہ سمجھو) (۲۸۷/۵)

رنج جُوع از رنجہا پاکیزہ تر خاصہ در جُوع ست صد نفع و ہُنر

(بھوک کی تکلیف بیماریوں سے بہت اچھی ہے خصوصاً (اس لحاظ سے کہ) بھوک میں سینکڑوں فائدے وہنر ہیں) (۲۸۷/۵)

جُوع مر خاصانِ حق را دادہ اند تا شوند از جُوع شیر و زور مند

(بھوک کی فضیلت صرف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو عطا کی گئی ہے تا کہ وہ بھوک کی بدولت شیر کی طرح طاقت ور اور روحانی قوم بن جائیں) (۲۸۸/۵)

جوع ہر جلف گدا را کے دہند چوں علف کم نیست پیش او نہند

(بھوک کی فضیلت) ہر کمینے بھکاری کو کب دی جاتی ہے جب (دنیا میں لذائذ کی گھاس کی کمی نہیں اس لیے یہ گھاس) اس کے آگے رکھ دی جاتی ہے) (۲۸۸/۵)

نبود اندر دل تُرا جُز فکرِ ناں ناید اندر خاطرت جُز ذکرِ ناں

تیرے دماغ میں سوائے روٹی کی فکر کے اور کچھ (متصور) نہیں ہوتا تیرے دل میں سوائے روٹی کے ذکر کے اور کچھ نہیں آتا) (۲۸۸/۵)

بعد چندیں سال حاصل چیستت جوع مردن بہ بود زیں زیستت

(اتنے برسوں کے بعد (شکم پُری) سے تجھے کیا ملا (سوائے اس کے کہ کھالیا اور ہضم کرلیا) تیری اس (حرص طعام کی) زندگی سے موت کی لذت چکھا دینے والی) بھوک اچھی) (۲۸۸/۵)

دانہ کمتر خور مکُن چندیں رفو چوں کُلُوْا خواندی بخواں لَاتُسْرِفُوْا

(خوراک تھوڑی کھاؤ اس قدر رفو نہ کرو جب تم نے قرآن مجید میں یہ حکم پڑھا ہے کہ کھاؤ تو اسکے ساتھ یہ بھی پڑھو کہ اسراف نہ کرو) (۱۴۷/۵)

تـاخـوری دانـه نیـفتی تـو بـدام　　ایں کُند علم و قناعت و السلام

(تا کہ تم دانہ کھاؤ اور جال میں نہ پڑو، قناعت کا علم یہی تلقین کرتا ہے والسلام)　　(۵/۱۴۷)

نعـمـت از دنیـا خـورد عـاقـل نـه غم　　جـاهـلاں مـحـروم مـانـده در نـدم

(عقل مند آدمی دنیا کے رزق قلیل سے بقائے حیات و ادائے طاعات کا فائدہ اٹھاتا ہے (جمع مال وحصول جاہ کا) غم نہیں (مول لیتا مگر) جاہل لوگ ندامت کے ساتھ (اس فائدہ عظیم سے) محروم رہ گئے)　　(۵/۱۴۸)

بھوک اور کم خوری پر مولانا رومؒ کے اور بھی بہت سے اشعار مثنوی میں درج ہیں لیکن اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

باب نمبر ۲۳

شیخ و مرشد اور تہذیبِ نفس

علم کسی بھی نوعیت کا ہو استاد اور مرشد کی ضرورت رہتی ہے۔ اصلاحِ نفس کے بغیر علم بھی ظاہری علم کہلاتا ہے۔ استاد کے بغیر علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ کبر و ناز کو ترک کرنے کے بعد ہی صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ متکبر اور خود بین لوگ جہلِ مرکب میں مبتلا رہتے ہیں۔ انسان کا کمال اس کا بہترین لباس ہے چنانچہ اگر کوئی لوہار یا چمڑا رنگنے والا پھٹے پرانے کپڑے پہن کر کام کرے تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ کمال حاصل کرنے کیلئے جامہ افتخار اور استکبار کو اتار دینا چاہیے اور یہ بغیر اصلاحِ نفس ممکن نہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ علم کا تعلق علم قولی علم فعلی یا علم صناعی یعنی حرفت سے ہوتا ہے۔ علوم قولی استاد سے اور کتابوں سے سیکھے جاتے ہیں علوم صناعی یا حرفت کسی ماہر کے ساتھ رہنے سے آتے ہیں، مثلاً فنِ زرگری کسی سنار کے پاس بیٹھ کر سیکھنے سے آئیگا تیسرا علم درویشی یا علمِ فقر جو تزکیہ نفس سے تعلق رکھتا ہے یہ کسی مرشد کے فیضان یا کسی اہلِ دل کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے اگر کسی شخص کو علم بھی حاصل ہو اور اعمال بھی صالح ہوں مگر اسے صحبت حاصل نہ ہوئی ہو تو اسے فقر کا کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

پس لباسِ کبر بیروں کن زتن ‌‌ ‌ مَلبَسِ ذُل پوش درِ آموختن

(تو تکبر کا لباس جسم سے اتار دے، سیکھنے میں ذلت کا لباس پہن لے) (۱۱۲/۵)

علم آموزی طریقش قولی ست ‌ ‌ حرف آموزی طریقش فعلی ست

(تو علم سیکھتا ہے تو اس کا طریقہ زبانی ہے، دستکاری سیکھتا ہے تو اس کا طریقہ عملی ہے) (۱۱۲/۵)

فقر خواهی آں بصحبت قائم ست   نے زبانت کار می آید نہ دست

(فقر چاہتا ہے وہ صحبت سے متعلق ہے نہ تیری زبان کام آتی ہے، نہ ہاتھ) (۱۱۳/۵)

دانش انوار ست در جانِ رجال   نے زراہ دفتر و نے قیل و قال

(انوار کا علم (سلوک اولیاءؒ) لوگوں کے دل میں ہے (وہ حاصل نہیں ہوتا ہے) کتاب کے راستہ سے نہ گفتگو سے) (۱۱۳/۵)

تا دلش را شرح آں سازد ضیا   پس اَلَمْ نَشْرَحْ بفرماید خدا

(جب تک کہ اس کے دل کیلئے نور اس کی تشریح نہ کردے پھر خدا فرماتا ہے کیا ہم نے تیرا سینہ نہ کھول دیا) (۱۱۳/۵)

در نگر در شرح دل دَر اندرون   تا نیاید طعنۂ لَایُبصِرُوْنَ

(دل کی شرح کو باطن میں دیکھ لے تاکہ ''وہ نہیں دیکھتے ہیں'' کا طعنہ نہ دیا جائے) (۱۱۳/۵)

شیخ کی روحانی تربیت سے کیا ملتا ہے

شیخ سے توجہ باطنی ملے تو نفس کی اصلاح آسان ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں روح کی تقویت ہوتی ہے۔ نگاہِ شیخ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ بندہ افکارِ شیخ سے سرمست ہو جاتا ہے اور اس کا تعلق عالم جبروت اور ملکوت سے ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی   سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

(ب، ج:۳۰۶)

شیخ کی صحبت انسان کو نفسانیت سے دور کرتی ہے اور اس سے مریدوں کی عقلوں اور روحوں پر شیخ کی روحانیت کا اثر ہوتا ہے۔ شیخ اپنے مریدوں کو اتباعِ شریعت کی تاکید کرتا ہے جس سے مرید کی روح اور بدن کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس اتباع میں نماز کی پابندی، روزہ کی مشقت، جہاد کی طرف رغبت اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب سے نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ تربیتِ شیخ میں شیخ ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، یاد کرد، بازگشت، نگاہ داشت، یاداشت، وقوفِ مکانی اور وقوفِ عددی کے اسباق سکھاتا ہے جو انسان کے نفس کیلئے اکسیر ہیں۔ مرید اگر کہیں بھی ہو تو رابطہ کے ذریعے وہ شیخ کی روحانیت سے دور نہیں ہوتا۔ شیخ کے ساتھ تعلق ایسے ہوتا ہے کہ گویا کسی مرید نے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ مضبوط کڑا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے تو اس سے مرید کی رسی شیخ کے ساتھ مل جاتی ہے اور شیخ اس کو جذب کر کے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور پھر اللہ سے ملا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا   خاک بر سر کن حسد را همچوما

(مردانِ حق کے قدموں کی خاک ہو جاؤ اور ہماری طرح حسد پر مٹی ڈالو) (م،۱:۷۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ تم نے جہنمی نفس کو باغ بنالیا ہے مگر شیخ اس میں وفا کا بیج بو دیتا ہے۔ اللہ اُسے ملتا ہے جو نفس سے عداوت رکھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی کی گئی ''یَا دَاؤُدُ عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّ وُدِّیْ بِعَدَاوَتِهَا'' [1] (اے داؤد اپنے نفس سے دشمنی کر اس لیے کہ میری دوستی اسکی عداوت میں ہے)۔

دامن آں نفس کش راسخت گیر

مشائخِ عظامؒ کا قول ہے کہ نفس کو کسی طریقے سے بھی مارا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور کسی شخص کے آزاد و غیر مشروط اختیار میں یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس کی مخلوق کو مارے۔ جب نفس کشی کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ نفس جو ایک سانپ کی مانند ڈستا ہے، اپنی سرکشی اور مزاحمت کو اس حد تک بند کردے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ ان معانی میں نفس کی تہذیب کی جاتی ہے اور اس کو تصوف کی اصطلاح میں ایسے طریقے سکھائے جاتے ہیں جن میں مصروف ہوتے ہوئے وہ صوفی کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ مولانا رومیؒ نے تصوف کے جملہ معاملات میں لب کشائی کی ہے اور انسانی نفس پر بھی آپؒ کا کلام نہایت وسیع ہے۔ نفس کو مہذب کرنے کیلئے آپ کے درج ذیل شعر کو اس باب کا موضوع بنایا گیا ہے اور ان شاء اللہ اس شعر کی مکمل تشریح کی جائیگی۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر   دامنِ آں نفس کش را سخت گیر
(۲-۲۴۲)

(نفس کو شیخ کے سائے کے سوا کوئی چیز نہیں مار سکتی اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے تھام لو)

مذکورہ بالا شعر کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ نفس ایک سانپ کی مانند ہے جو انسانوں کو ڈس لیتا ہے اور اگر سانپ کے دانت اکھاڑ دیئے جائیں تو پھر اُسے پتھر مارنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مرید اپنے شیخ سے روحانی طاقت حاصل کرتا ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ شیخ کی سنگت اختیار کرنا بہت بڑے نصیب کی بات ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ ''وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی'' [2] کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (اور (اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ ﷺ نے (وہ مشتِ خاک) جب آپ ﷺ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی)۔

معلوم ہوا کہ توفیقِ عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے بشرطیکہ اس عمل کیلئے کوشش اور خواہش پیدا کی جائے۔ مذکورہ شعر میں مولانا رومیؒ کے قول کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ جو کسی شیخ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے تو نفس کے حق میں یہ عمل ایسا ہوگا جیسے سانپ کے دانت نکال دیے جائیں۔ ایسی حالت میں سانپ

---

[1] احیاء العلوم، جلد ۹، صفحہ ۱۱۔
[2] الانفال، ۸:۱۷۔

(نفس) سے کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں رہے گا۔

زیر غور شعر میں جو سب سے ضروری بات نفس کو مارنے والے شیخ کا دامن مضبوطی سے پکڑنا تجویز کیا گیا ہے یہاں یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ شیخ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنے کے کیا معنی ہیں اور اس کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنے سے کیا مراد ہے حسب ذیل الفاظ میں اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ شیخ کے دامن کو تھامنے میں مرید پر کونسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور شیخ اپنے مرید کیلئے کون سے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ محض شیخ سے بیعت کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ مرید کیلئے ضروری ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں کو بجالائے جو بذریعہ بیعت اس پر عائد ہوتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

چو میگویم مسلمانم بلرزم　　　که دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

(جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں کیونکہ میں لا الہ الا اللہ کی راہ میں حائل مشکلات اور اس میں عقیدۂ توحید و رسالت کے تقاضوں کو جانتا ہوں)　(ا-ح:۹۴۱)

جب ایک شخص کسی عورت کو اپنے نکاح میں قبول کرتا ہے تو اس عورت کی تمام تر ذمہ داریاں اُس پر عائد ہو جاتی ہیں۔ بیعت کی سعادت حاصل کرنے کے بعد جو ذمہ داریاں کسی مرید پر عائد ہوتی ہیں وہ کوئی معمولی نہیں۔ جب تک کوئی مرید ان ذمہ داریوں کو بجا نہ لائے اس وقت تک اسے مرید کہلانے کا حق نہیں۔ رسمی طور پر ہاتھ میں ہاتھ دینا بیعت کا مقصود نہیں بلکہ جب تک بیعت کے تمام لوازمات پورے نہ کیے جائیں اس وقت تک بیعت کرنے کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مرید کے بیعت کر لینے کے بعد شیخ کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مرید بیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی استعداد رکھتا ہے تو اس کیلئے لازم ہے کہ شیخ ہونے کے ناطے سے ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرے جو اہل طریقت نے شیخ کیلئے واجب قرار دی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو اس معیار پر بہت کم پیر اور مرید پورا اترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیعت کے ثمرات شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ بیعت کرنا اور بیعت ہونا معمولی بات نہیں اس میں جب تک سخت محنت نہ کی جائے مناسب اثرات برآمد نہیں ہوتے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

میں بھی نمازی تو بھی نمازی　　　نہ میں مسلمان نہ تو مسلمان

(ب،ج:۹۱)

مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ نفس کی اصلاح بغیر شیخ کی صحبت کے نہیں ہو سکتی۔

هیچ نکشد نفس را جز ظلِ پیر　　　دامنِ آں نفس کُش راسخت گیر

(نفس کو شیخ کے سائے کے سوا کوئی چیز نہیں مار سکتی، اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔)　(م،۴:۲۴۲)

یہ بات مشاہدے میں آ چکی ہے کہ کسی پیر کے مرید تو لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں مگر ان میں

سے دس بیس ہی ایسے نظر آئیں گے جنھوں نے بیعت کے حقوق ادا کیے ہوں گے۔ اگر کوئی شخص سنجیدگی سے بیعت کرتا ہے تو شیخ کو درج ذیل باتوں کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور مرید کو بھی چاہیے کہ وہ شیخ کی ہدایات پر سختی سے عمل پیرا ہو۔ درج ذیل الفاظ میں چند ضروری نکات پیش کیے جاتے ہیں جن کیلئے پیر اور مرید کو پوری طرح کوشاں رہنے کی ضرورت ہے۔

اصلاحِ نفس کیلئے چند مفید نکات

نفس کی اصلاح جو کسی شیخ کی وساطت سے حاصل ہوسکتی ہے اسکا بیان درج ذیل نکات میں واضح کیا جارہا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ شیخ اپنے مریدوں کے نفس کو کن طریقوں سے مائل بہ اصلاح کرتا ہے اور مولانا رومیؒ نے انہی وجوہات کو شیخ طریقت کی نفس کشی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۱) توجہ باطنی سے اصلاحِ نفس

توجہ باطنی سے طریقت کے بہت سے کام وجود میں آتے ہیں لہذا مناسب ہوگا کہ طریقت کے اس ضروری پہلو کی وضاحت کردی جائے۔

توجہ باطنی کا تعارف: توجہ باطنی وہ توجہ ہے جو مرشد کی طرف سے مرید کے باطن کو دی جاتی ہے۔ اس توجہ کے ذریعے اولیاء کرامؒ حاضرین کے قلوب کا تزکیہ فرماتے ہیں۔ توجہ باطنی جہاں تک لینے والوں کا تعلق ہے تو یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ مرید اگر اہل ہمت اور اہل استطاعت میں سے ہو تو وہ بذاتِ خود پیر سے توجہ طلب کر لیتا ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ زبردستی توجہ طلب کر لیتا ہے اور توجہ کا دریا خود بخود بہنے لگتا ہے۔ اس مقصد کیلئے توجہ حاصل کرنے کا طریقہ سیکھ لینا ضروری ہے اور اگر اپنے شیخ سے عقیدت ہو تو یہ توجہ کا سلسلہ بہت جلد جاری ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلۂ توجہ آخر تک جاری رہتا ہے جو طالب کے عزم اور ہمت پر مبنی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کلام میں ابراھیمی توجہ کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اپنی اولاد پر ابراھیمی توجہ دے تو اس کے بچے سعادت مند ہو جاتے ہیں یہی توجہ کا دینا فیضانِ نظر کہلاتا ہے۔

توجہ کی تین مثالیں

حضرت شیخ عثمان ہارونیؒ اور حضرت معین الدین چشتیؒ نے ایک دن حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو درمیان میں رکھ کر کہا کہ آؤ فرید الدینؒ تم کو توجہ دیں۔ توجہ دینے کے بعد حضرت معین الدین چشتیؒ نے حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کو فرمایا کہ اپنے دادا پیر کے پاؤں پکڑ لو مگر آپؒ نے اپنے مرشد (حضرت معین الدین چشتیؒ) کے پاؤں کو پکڑ کر کہا کہ مجھے صرف یہی پاؤں نظر آتے ہیں۔ توجہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر نفی

واثبات (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) کے بعد "اللہ ھو" کی ضرب دل سے نکالی جائے اور طالب یا مرید کی طرف "اللہ ھو" کی ضرب روانہ کی جائے تو مرید کو فیض پہنچنے لگے گا اور اسی طرح مرید اگر "اللہ ھو" کی ضرب کو مرشد کی طرف روانہ کرے اور پھر وہاں سے اپنے دل میں واپس لے جائے تو مرید کو فیض پہنچنے لگے گا خواہ مرشد کتنی ہی مسافت پر کیوں نہ ہو۔ حضرت سلطان باہوؒ کے شعر کا ایک مصرع قابلِ غور ہے۔

سب معاملے حل ہو جاندے نیں   جے پیر نظر اک تکے ھُو

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر پیر اور مرید دونوں میں توجہ دینے اور لینے کی استعداد ہو تو نظر کارگر ہو جاتی ہے لیکن اگر مرید کا دل ابوجہل کی طرح پتھریلا ہو تو ایسا پتھر دل انسان کیا لے سکے گا حضرت حافظؒ کا ایک شعر بھی مذکور بالا شعر کی عکاسی کرتا ہے۔

آنانکه خاك رابنظر كيميا كنند   آيا بود كه گوشه' چشمے به ما كنند

(جو ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنا سکتے ہیں' کیا وہ ہماری طرف بھی ایک نظر کریں گے)

شیخ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مرید کیلئے اس کے لطائف ستہ (نفس، قلب، روح، سرّ، خفی اور اخفیٰ) میں صفائی اور لطافت پیدا کرے۔ ان میں سے کثافت دور ہونے سے لطائف پر انوار چمکنے لگتے ہیں اور دل میں ذکر جاری ہو جاتا ہے اور روح کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس سے منازل فنا اور بقا طے ہو جاتی ہیں اور روح کی پرواز تمام عوالم کی طرف شروع ہو جاتی ہے۔ جب ذکر سارے جسم میں جاری ہو جائے تو اسے سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ اس مقام پر سالک کو بہت لذت ملتی ہے حتیٰ کہ دنیا کی کوئی لذت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی (کیونکہ سالک پر انوارِ الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیدار میں جو لذت ہے اس جیسی لذت کسی شئے میں نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے انوار کی لذت اپنی مثال آپ ہے)۔ جو لذت لطائف ستہ میں سے باقی لطائف کے حصے میں آتی ہے وہ نفس کو حاصل نہیں اور جو نفس کو لذت ملتی ہے مثلاً خواب وخور اور مباشرت وذائقہ وغیرہ وہ دوسرے تمام لطائف کی لذات سے ادنیٰ ہے۔ جب ان پانچ لطائف پر انوار برستے ہیں تو آدمی بے خود، سرمست اور محو ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ان لذات کو پا لیتے ہیں تو وہ کسی اور طرف دھیان نہیں دیتے بلکہ بعض اوقات تو سالک مشاہدات کی لذت میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ بالآخر وہ مجذوب ہو جاتا ہے یہاں تک اس کو کھانے پینے اور سونے کی خواہش بھی نہیں رہتی۔ جن لوگوں کو ان لذات کا علم نہیں وہ اس طرف راغب ہی نہیں ہو سکتے۔

توجہ شیخ کی پہلی مثال

جب کوئی شیخ اپنے مرید کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کے باطن پر ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ

اگر مرید میں اس توجہ کو حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو جس قسم کی توجہ دی جائے اسی قسم کے اثرات مرید کے باطن پر چھا جاتے ہیں اور جو عمل بھی پیر اپنے مرید سے کروانا چاہتا ہے اس کا ذوق اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ فوراً اس کی طرف رغبت حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس کتاب میں باطنی توجہ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

توجہ شیخ کی دوسری مثال

حضرت سری سقطیؒ اپنے ابتدائی ایام میں نماز روزے کی پابندی نہیں کرتے تھے اور جب لوگوں نے حضرت معروف کرخیؒ کے پاس جا کر ان کی شکایت کی تو ایک دن حضرت معروف کرخیؒ ان کی دکان پر گئے اور پوچھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے۔ اس پر سری سقطیؒ نے کہا کہ کیا آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں نماز پڑھنے کی کوئی صورت موجود ہے جبکہ بے تحاشہ لوگ ہر وقت سودا سلف لینے میں مجھے مصروف رکھتے ہیں۔ حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا تو پھر آپ ''پاخانہ اور پیشاب بھی دکان کے اندر ہی کرتے ہوں گے'' جب آپ نے یہ کہا اور ساتھ ہی انکے باطن پر اپنی توجہ سے لبریز نگاہ ڈالی تو حضرت سری سقطیؒ پر وجد طاری ہو گیا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک دم تمام دکان لٹا دی اور اس کے بعد عبادت میں مصروف ہو گئے اہلِ علم جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد ہی طریقت میں آپؒ نے بہت بڑا مقام پایا۔ حضرت جنید بغدادیؒ انہی کے بھانجے اور مرید تھے۔ حضرت سری سقطیؒ کی ہی محنتوں اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ جنیدؒ کو سید الطائفہ جیسا اعلیٰ رتبہ حاصل ہوا۔

منقول ہے کہ مولانا عطارؒ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص آپ کی دکان سے عطر خریدنے کی غرض سے آیا تو مولانا عطارؒ نے اس شخص کو کہا کہ عطر تو اچھے کپڑوں کیلئے ہوتا ہے مگر تمہارے کپڑے تو اسقدر میلے کچیلے ہیں کہ ان پر عطر لگانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس شخص نے کہا کہ تمہیں اس سے کیا غرض کہ کپڑے میلے ہوں یا اجلے، تم عطر فروش ہو، تمہیں اس قسم کا اعتراض ہرگز روا نہیں۔ یہ بحث طول پکڑ گئی حتیٰ کہ دونوں میں اچھی خاصی گرما گرمی ہو گئی اور اس شخص نے مولانا عطارؒ کو کہا کہ تم ایسی باتیں کرتے ہو تو تمہاری جان کیسے نکلے گی۔ اس پر مولانا عطارؒ نے فرمایا ''تمہاری جان کیسے نکلے گی'' اس پر فقیر نے کہا کہ تم ہمارا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم جب چاہیں مر سکتے ہیں۔ مولانا عطارؒ نے غصے میں کہا ''اچھا اگر تم مر سکتے ہو تو مر کے دکھاؤ'' اس بات پر اس شخص نے ایک شعر پڑھا جس کا ایک مصرع یہ ہے ''بل ہیچ نہ دارم، غم ہیچ نہ دارم'' یہ کہا اور اس فقیر نے اپنی پگڑی اتار کر زمین پر رکھی اور اس کا دم پرواز کر گیا۔ یہ معاملہ دیکھ کر مولانا عطارؒ نے اپنی دکان لٹا دی اور درویشی اختیار کر لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ فقیر آپ کو اس راستے پر لانے کیلئے متعین کیا گیا ہو اور مولاناؒ کو اپنی توجہ سے متاثر کر دیا ہو۔

توجہ شیخ کی تیسری مثال

علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک دہریہ تین دن تک منطقی بحث میں اُلجھا رہا لیکن بحث کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہوئی۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اس فلسفی سے کہا کہ چلو تمہیں کسی مردقلندر کی نظر سے فیضیاب کراتے ہیں اور اس فلسفی کو میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے پاس لے آئے۔ بغیر کسی گفتگو کے حضرت نے اس فلسفی کی کمر پر ہاتھ مارا اور کہا ''کیوں بھئی بیلیا! رب ہیگا کہ نہیں'' وہ فلسفی بغیر کسی اعتراض کے مان گیا اور ایک ضرب کاری سے اس کا کفر ٹوٹا۔ حضرت میاں صاحب نے سگریٹ کے ایک ایجنٹ کے منہ پر تھپڑ مارا جو آپؒ کو سگریٹ کا ایک نیا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بزرگ سگریٹ پینے کو بُرا سمجھتے ہیں وہ شخص جو انگریزی رسم ورواج کا متوالا تھا ایک دو سال کے بعد آیا تو دینی لباس میں تھا لاہور اسٹیشن پر میاں صاحب نے ایک سکھ کی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو وہ کلمہ پڑھنے لگ گیا۔ یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل وتربیت'' میں دیئے گئے ہیں تنگیٔ قرطاس کے باعث زیادہ لکھنا ممکن نہیں۔ اور توجہ مشائخ کی عجیب مثالیں ہیں۔

ا) توجہ کی ایک مخصوص طرز

علامہ اقبالؒ کے بہت سے اشعار ایسے ہیں ہے کہ جن میں آپ نے فیضانِ نظر کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ آپؒ فرماتے ہیں کہ

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

جن لوگوں کی نگاہوں میں فیضان کی صفات موجود ہوں تو وہ جب بھی اولاد اور مریدوں پر نظر کریں تو اس کا اثر واضح طور پر پہچانا جاتا ہے اور وہ بچے نہایت اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔

ب) خالی پیٹ توجہ

اولیائے کرامؒ کا یہ معمول رہا ہے کہ سالک پیٹ کے تیسرے حصے کو خالی رکھتے ہیں کیونکہ شکم سیری میں سالک کی استطاعتِ طلب سست پڑ جاتی ہے۔ اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ خالی پیٹ توجہ زیادہ بااثر اور صحیح ہوتی ہے اسی لئے اسلام نے بھوکا پیٹ رکھنے کو اہمیت دی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا رکھو، جگروں کو پیاسا رکھو، حرص کو چھوڑ دو، اپنے جسموں کو (غیرضروری لباس سے) ننگا رکھو اور اپنی امیدوں کو کوتاہ رکھو تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نور کو دل کی آنکھوں سے دیکھ سکو۔[1] اگر کھانے پینے سے دریغ نہ کیا جائے تو جسم زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے اور اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ طاقتور جسموں کی روحیں اکثر کمزور ہوتی

---

[1] جلاء الافہام، صفحہ ۲۴۰۔

ہیں کیونکہ جسم اور روح ایک دوسرے کی نقیض (اُلٹ) ہوتے ہیں۔

ج) نفسانیت توجہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے

اولیائے کرامؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ انسان میں نفسانیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل سخت ہوجائے چنانچہ طالب کیلئے ضروری ہے کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے دل سخت ہوجائے۔ ذکر کم کردینے سے دل سخت ہوجاتا ہے۔ مناظرہ اور فضول بحثوں میں حصہ لینے سے للٰہیت ختم ہوجاتی ہے اور انسان میں نفسانیت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اطاعتِ الٰہیہ اور مجاہدات کے نہ ہونے اور عبادت میں کمی سے نفسانیت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ زیادہ خواب وخور سے جسم اور نفس موٹا ہوجاتا ہے اور نفسانیت بڑھ جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام وہ کام جن سے نفس کو آرام ملے وہ نفس کو طاقتور اور روح کو کمزور کردیتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اولیاء اللہؒ کے پاس بیٹھنے والوں کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مجاہدات کروائے جاتے ہیں اور ان پر جو انعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں وہ اس (خاتمہ بالخیر) کے علاوہ ہیں۔

د) دُعا میں توجہ طلب کرنا

احادیث میں دعائے توجہ منقول ہے جو حضور ﷺ نے ایک نابینا کو عطا فرمائی تو ان نوافلِ توجہ (جس میں توجہ طلب کی جاتی ہے) کے پڑھنے سے اس کی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ ترمذی ونسائی نے جو حدیث نقل کی وہ حسب ذیل ہے امام ابن ماجہ امام بیہقی اور طبرانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے حدیث یہ ہے۔ آپ کا ارشاد اس دعا کے پڑھنے کیلئے تھا کہ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَ اَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ تَوَجَّھْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّکَ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِہٖ لِتُقْضٰی لِیَ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ"[1] (اے اللہ میں تیری بارگاہ میں سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی الرحمہ ﷺ کا وسیلہ پیش کرتا ہوں۔ اے محمد ﷺ میں نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں آپ کا وسیلہ پیش کیا ہے اس ضرورت میں تاکہ وہ پوری ہو اے اللہ تو میرے حق میں حضور ﷺ کی شفاعت قبول فرما)۔

۲) صحبتِ صالحین سے عقلوں اور روحوں پر اثر

مشائخِ عظامؒ کا قول ہے کہ جب کسی بزرگ کے ملفوظات کا سالک توجہ سے مطالعہ کرتا ہے تو صاحب کتاب کی روح بھی (خواہ مصنف زندہ ہو یا وصال شدہ ہو) اس کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے اور پڑھنے والے کا

---

[1] سنن ترمذی، حدیث ۳۵۷۸، جلد ۵، صفحہ ۵۶۹۔

تزکیہ کرتی ہے کیونکہ روح کیلئے مکان وزمان اور موت وحیات کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے مکتوبات شریف میں لکھا ہے کہ بعض اوقات زندہ انسان کی روح اپنے معتقدین کی امداد کیلئے حاضر ہوجاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدد کرنے والے کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی روح کسی کی مدد کرنے کیلئے گئی ہے۔

سورۃ النور میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا نور ہر طرف پھیلا ہوا ہے چونکہ عقل بھی ایک نور ہے اس لیے جتنا کوئی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا اس کی عقل میں اضافہ ہوگا۔ (کافر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نور کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی مذہب اسلام کو مانتا ہے اس لیے وہ اس نور سے مستفید نہیں ہوسکتا)۔ انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام ؒ چونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کی عقلیں عام انسانوں سے بڑھ جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور سے منور ہوتی ہیں، لہٰذا جو لوگ ان بزرگوں کا قرب حاصل کریں ان کی عقلوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب میں جب دیوانے بھی آگئے تو عقل کی باتیں کرنے لگے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس درجہ فیضیاب ہوئے اس کا اندازہ ان کے کارناموں اور کمالات سے ہوتا ہے۔ انگریزوں کو لوگ عقلمند کہتے ہیں لیکن ان کی عقل بجلی اور بھاپ کی مشینوں تک محدود ہے، اگر وہ عقلمند ہوتے تو اسلام قبول کر لیتے۔

صحبتِ صالحین مرید کیلئے ضروری ہے

صحبتِ صالحین مریدوں کی طریقت کیلئے تریاق کا اثر رکھتی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باعث ہی تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازی، غازی، شہید، عالم، حاجی اور حافظِ قرآن وغیرہ بہت سی صفات کے حامل تھے، مگر ان کو صحابیت کی بدولت صحابی کہا جاتا ہے کیونکہ صحابیت صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھنے والوں کو ہی حاصل تھی خواہ کوئی کتنا بڑا ہی غوث یا قطب ہو صحابی کے برابر درجہ نہیں پا سکتا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے فرمایا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی جو جہاد کیلئے نکلتا ہے اس کے گھوڑے کے پاؤں سے اڑنے والی خاک اگر میرے جسم پر پڑ جائے تو مجھے اپنے جنتی ہونے کا یقین ہو جائے۔

صحبت میں اس قدر فیوض میسر ہوتے ہیں کہ اگر شیخ کی مجلس میں کوئی گفتگو ہی نہ ہو تب بھی اس کے جسم سے نکلنے والی نورانی شعاعوں کا اثر مریدوں کیلئے تزکیۂ اخلاق اور روحانی بلندیوں کے پانے کا سبب ہوتا ہے۔ اس بات سے شیخ کی نورانی گفتگو سے حاصل ہونے والے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا جو خدا کے ساتھ دشمنی کرنا چاہتا ہے اسے کہہ دو کہ اولیائے کرام ؒ کی ہم نشینی اختیار کرے۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ شیخ ایسی سیڑھی ہے جس سے مرید روحانی بلندیوں کے آسمان سے بھی آگے گزر حاصل کر لیتا ہے۔

صحبت کی برکات اور فیوضات کی گفتگو اس قدر طوالت کی حامل ہے کہ زیرِ نظر کتاب کے احاطۂ تحریر میں نہیں سما سکتی۔ اگر کسی روحانی طالب کو مزید معلومات درکار ہوں تو راقم الحروف کی تصنیفات ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' اور ''بیعت کی تشکیل وتربیت'' کا مطالعہ کرے۔

۳) عقیدت اور اتباعِ شریعت کا لزوم مرید کیلئے انتہائی ضروری ہے

اکثر مشائخ عظام اور تمام فقہاء کے نزدیک اتباعِ شریعت، طریقت کی راہ پر چلنے کیلئے شرطِ اوّل ہے۔ شریعت، اسلام میں بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس قدر نفس کی اصلاح اتباعِ شریعت میں متصور ہے وہ دیگر عبادات میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے کہ اگر اتباعِ شریعت اور اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت کا شرف حاصل ہو تو کوئی پروا نہیں کیونکہ ان دونوں کے نہ ہونے سے خرابی ہی خرابی ہے۔ اگر اعمال میں کچھ کمی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے اسے معاف کر دیتا ہے لیکن عقائد اور اتباعِ شریعت میں کمی واقع ہونے سے تو سالک نقصان ابدی سے داغدار ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ نفس کی تربیت کیلئے مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اور طریقت مکمل طور پر شریعت کی انتہائی درجے کی اتباع کرنے کا نام ہے۔ اتباعِ شریعت میں وہ تمام مشقتیں شامل ہیں جو اسلام نے مسلمانوں کیلئے فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کی پابندی میں رکھی ہیں۔ چند فرائض اور واجبات کا تذکرہ اصلاحِ نفس کے حوالے سے نیچے درج کیا جارہا ہے۔

ا) نماز کی پابندی سے اصلاحِ نفس

نماز کی ادائیگی سے مسلمان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اوقات کی پابندی کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔ مزید برآں نماز میں بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے آداب، نفس کے خلاف مسلسل جدوجہد، دنیا کے مسائل سے عدم توجہی، نفس کی نامرادی اور اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان دینے کا سبق ملتا ہے۔ نماز کی حرکات وسکنات، وضو، طہارت، مسواک وغیرہ میں لاتعداد طبی، طبعی اور روحانی فوائد مرتب ہوتے ہیں (اس کی تفصیل ہماری تصنیف ''سنتِ مبارکہ'' میں ''سنتِ نبوی ﷺ جدید سائنس کی روشنی میں'' مطالعہ فرمائیں)۔

ب) روزہ کی مشقت میں نفس کشی

روزہ کو اسلام میں فرض کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں کیا کچھ برداشت کرنا ہوتا ہے اسکا مختصر سا

ذکر ہماری کتاب ''نشان منزل'' میں دے دیا گیا ہے۔ وہاں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں روزہ رکھنے کی غرض وغایت ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ'' [1] بیان کی گئی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ روزہ رکھنے والا متقی اور پرہیزگار ہو جائے۔

روزہ رکھنے سے نفس کی مخالفت ہوتی ہے، برداشت کی قوت بڑھتی ہے، خلوص (جو تصوف کیلئے ضروری ہے) پیدا ہوتا ہے اور جفاکشی ومحنت کی عادت کو فروغ ملتا ہے۔ روزہ میں انسان کے اوقات کار متعین ہو جاتے ہیں۔ روزہ میں اعتکاف جیسی طریقت کی کارآمد عبادت اور غریبوں کیلئے فطرانے کے اسباب شامل ہیں۔

''عوارف المعارف'' میں ہے کہ نوجوان صوفی کو نکاح کی خواہش کو دبانے کیلئے صوم داؤدی رکھنا بہت مفید ہے۔ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو فرمایا ''يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ'' [2] (اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہوا سے چاہیے کہ وہ نکاح کر لے اس لیے کہ یہ نظر کو جھکانے والا اور شرمگاہ کا محافظ ہے اور جو نہ کر سکے تو وہ روزے رکھے کیونکہ روزے شہوت کیلئے وجاء (خصی کرنے) کا حکم رکھتے ہیں)۔ اگر تم اس کو کسی کام میں مشغول رکھو گے تو یہ تمہیں کسی کام میں مشغول کر دے گی۔ کہتے ہیں کہ نفس کو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنا چاہیے کیونکہ عبادت میں رہ کر نفس کشی ہوتی ہے اور نفس کے خطرات کم ہوتے ہیں۔

یہ تمام عبادات طریقت کے بلند مقامات کے حصول کیلئے جزو لازم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شیخ اپنے مرید کی نفس کشی بذریعہ روزہ کرواتا ہے اور بعض لوگ شوال کے روزوں کی مشقت برداشت کرتے ہیں۔ اہلِ طریقت اپنے مریدوں کو بہت کم خوراک کھانے کی تلقین کرتے ہیں۔

ج) اسلام میں جہاد رہبانیت کے بدل کا درجہ رکھتا ہے

اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاہب میں رہبانیت کو کسی نہ کسی شکل میں اختیار کیا جاتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اسلامی جہاد دوسرے مذاہب کی رہبانیت کا درجہ رکھتا ہے۔ جہاد میں ایک مجاہد اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھتے ہوئے وہ کام کرتا ہے جس میں اسلام کی سربلندی دکھائی دیتی ہے۔ جہاد کے دوران ایک مجاہد بے سروسامان اور رہائش کی سہولتوں سے محروم رہتا ہے۔ جہاد سامانِ خورد ونوش، آرام اور دیگر لوازمات زندگی سے محروم رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایسی بے سروسامان زندگی مسلمان کو حقیقی معنوں میں

---

[1] البقرہ ۲: ۱۸۳۔ [2] صحیح بخاری، حدیث ۴۷۷۹، جلد ۵، صفحہ ۱۹۵۰۔

مجاہد بننے کا پیغام دیتی ہے۔ اس سے مسلمان تمام مشکلات زندگی کو برداشت کرنے کا سبق لے کر اپنے گھر لوٹتا ہے اور اپنی باقی زندگی بھی جہاد کے انداز میں گزارنے کا عہد کرتا ہے۔ یہ مشکلات اور مجاہدات جہاد کے دوران جن کا سامنا کیا جاتا ہے ایک مسلمان کیلئے نفس کشی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ہماری تصنیف ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' کے ابتدائی باب میں علامہ اقبالؒ کے نظریۂ فقر میں رہبانیت اور جہاد کا تفصیلی ذکر ملاحظہ فرمائیں۔

د) زکوٰۃ کا ادا کرنا، اپنی خواہشات کی زکوٰۃ ہے۔

ہر چیز کی ایک زکوٰۃ ہوتی ہے جس کو ادا کرنے سے اس کے خبائث دور ہو جاتے ہیں اور برکات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلام نے مال میں زکوٰۃ کا نصاب مقرر کیا ہے جو مسلمان کے مال کو پاکیزہ اور بابرکت بنا دیتا ہے۔ جس طرح درختوں کی شاخیں کاٹنے سے درخت زیادہ پھلتا پھولتا ہے۔ اسی طرح مومن اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنے سے اپنے مال میں اضافے کا حقدار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر ملنے کا جو وعدہ قرآن اور حدیث میں موجود ہے وہ ان مذکورہ فوائد کے علاوہ ہے۔ مسلمان اپنی عبادات اور مجاہدات کی زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے اور اگر ان تمام فوائد کو جمع کیا جائے تو یقینی طور پر مرید کیلئے نفس کشی کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔

۴) حضرت مجددؒ الف ثانی کے بیان کردہ دو اصول

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں ''اگر دو چیزوں میں فتور نہ ہو تو غم کی ضرورت نہیں۔ (۱) شریعت کی متابعت (۲) اپنے شیخ سے محبت اور اخلاص۔'' (ان دو چیزوں کی موجودگی میں اگر ہزاروں ظلمتیں اور کدورتیں طاری ہو جائیں تب بھی ڈر کی بات نہیں)، کیونکہ اسے ضائع نہیں کریں گی۔ اگر خدانخواستہ ان دو میں سے کسی ایک میں نقصان پیدا ہو گیا تو خرابی ہی خرابی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے گریہ وزاری کر کے دونوں پر استقامت کی دعا کرتے رہیں۔

ایک جگہ حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات شریف میں (مکتوب ۴۶، ص ۱۰۸۳ ترجمہ سعیدی) ایک سوال (اور اس سوال کے جواب میں) کہ کیا عارف کبھی شریعت کے باہر قدم رکھتا ہے جواب میں فرماتے ہیں کہ شریعت ظاہر کا عمل ہے اور روحانی عروج باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر شریعت کا مکلف ہے اور باطن بھی اس کا گرفتار ہے۔ باطن کو ظاہر سے عظیم مدد پہنچتی ہے۔ باطن کی ترقی شریعت کی بجا آوری سے وابستہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ علمائے شریعت ظاہر کی دعوت دیتے ہیں۔ اولیائے کرامؒ سب سے پہلے توبہ کراتے ہیں اور رجوع الی اللہ کی دعوت دیتے ہیں اور احکام شریعت کی

ترغیب دیتے ہیں۔ دوسرے درجے پر اولیائے کرامؒ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی میں گزاریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ مرید اس قدر ذکر کرے کہ ذکر کے علاوہ سب کچھ دل سے نکال دے یہاں تک کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ سے اسقدر نسیان ہو جائے کہ وہ اگر تکلف سے بھی کوئی چیز یاد کرے تو اسے یاد نہ آئے۔ آپ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ میں سے ایک حکم کو بجالانا خواہش نفسانی کو زائل کرنے میں ان ہزار ریاضتوں اور چلوں سے بہتر ہے جو اپنے طور پر کئے جائیں۔ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں نفسانی خواہشات کو زائل کرنے کیلئے بنائی گئی ہیں۔

۵) قلب کی اصلاح

طریقت تمام تر دل کی اصلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ دل کی اصلاح ہو جائے تو تمام بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ، وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ، اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ'' [1] (سنو! بے شک جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے)۔

ہماری تصنیف ''حضورِ قلب'' میں قلب کے اسرار و رموز اور اس کے احوال پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ نفس کا تعلق قلب کے ساتھ رہتا ہے اور جب تک نفس کی اصلاح نہ ہو انسان کے قلب کا تزکیہ اور طہارت ممکن نہیں۔ شیخ مذکورہ بالا تمام طریقوں سے اپنے مریدوں کے قلوب کی اصلاح کرتا ہے۔

۶) سلوکِ نقشبندیہ کی گیارہ اصطلاحات پر عمل کرنا

حضرات نقشبندیہ حسب ذیل گیارہ اصطلاحات پر عمل کرواتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست نفس کو دبانے کیلئے بہت تیزی سے محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ان اصطلاحات کی تفصیل ہماری تصنیف ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں شامل کی گئی ہے۔ یہاں صرف نام گنوانا ہی مقصود ہے۔

(۱) ہوش در دم (کوئی دم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی نہ ہو) (۲) نظر بر قدم (ہر قدم پر ذکر کو سانس سے جاری رکھنا) (۳) سفرِ در وطن (صفاتِ ذمیمہ سے صفاتِ حمیدہ کی طرف سفر کرنا. ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ'') (۴) خلوت در انجمن (یعنی مجلس میں بیٹھے ہوئے ظاہراً الخلوق سے ہونا اور باطناً اللہ تعالیٰ کے ساتھ) (۵) یاد کردن (ذکرِ لسان اور ذکرِ قلب سے یادِ خدا تازہ رکھنا) (۶) بازگشتن (ذکر کے دوران اللہ تعالیٰ کو ہی مقصود سمجھنا اور اس کی بارگاہ میں وصول کی تمنا کرنا) (۷) نگاہ داشتن (احدیت مجردہ یعنی ایک خدا

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۵۲، جلد ا، صفحہ ۲۸۔

اور وراء الوراء پر نظر رکھنا اور اِدھر اُدھر خیال نہ ہونا) (۸) یادداشتن (شہودِ حق بتوسطِ حبِّ خدا یعنی مشاہدہ حاصل ہونا) (۹) وقوفِ زمانی (اپنے احوال سے موافقت کرنا اگر حال اچھا ہو تو شکر کرے ورنہ استغفار) (۱۰) وقوفِ عددی (ایسا حضور کہ غیر حق سے علاقہ نہ ہو۔ وقوف عددی کے ذکر میں اعداد کا حساب رکھنا ہوتا ہے) (۱۱) وقوفِ قلبی (دل کا حق تعالیٰ سے آگاہ رہنا)۔

۷) پیر کی مدد حاصل کرنے کا طریقہ

علامہ رشید احمد گنگوہی نے امداد السلوک میں لکھا ہے کہ مرید جب اپنے پیر کو دل کی آواز سے پکارے تو اس کا پیر اس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے مگر اس میں پیر اور مرید کی استطاعت کا مطلوبہ معیار پر ہونا ضروری ہے۔ یہ نسخہ بہت سے بزرگوں کا مجرّب ہے جس کی تفصیل اس مختصر تحریر کے احاطے سے باہر ہے۔

۸) فقط نظروں سے فیض دینا

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت باقی باللہ سے جو فیض حاصل کیا ہے اس کے متعلق آپؒ نے مکتوبات شریف میں جابجا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اخذِ فیض کے بغیر یہ راستہ کھلنا ممکن نہیں۔ آپ کے ایسے تذکرے ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس کتاب میں آپ نے یہ واضح طور پر رقم کیا ہے کہ جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے وہ سب کچھ اپنے مرشد کی نظروں سے حاصل کیا ہے (تفصیل مذکورہ کتاب سے حاصل کریں) توجہ باطنی کا طریقہ نیچے دیا جا رہا ہے۔

۹) برھانِ الٰہی مل جائے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں

سورہ یوسف میں اس حقیقت کا ذکر ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد کیا تو انہوں نے رب کی روشن دلیل دیکھی اور اسطرح وہ زلیخا کے جال سے بچ نکلے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "لَوْلَآ اَنْ رَّاٰبُرْهَانَ رَبِّهٖ ط كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ط" (اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی (روشن) دلیل، یوں ہوا تا کہ ہم دور کر دیں یوسف علیہ السلام سے برائی اور بے حیائی کو۔)[1]

علامہ ابو حیانؒ فرماتے ہیں کہ برھان (دلیل) سے مراد وہ قطعی دلیل ہے جو آپ کو معلوم تھی یا آپ کی جبلی طہارت اور فطری عصمت جو انبیائے کرام علیہم السلام کا لازمی خاصہ ہے آپ پر واضح تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہکانے کی

[1] یوسف ۱۲:۲۴۔

کوشش کی تو آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ دانتوں میں انگلی دبائے کھڑے ہیں اور آپ کے اس فعل کو دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام اس جگہ سے بھاگ نکلے۔ اس حکایت میں ایک اور بُرھان یہ بھی ہے کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کے کمرے میں جو بت موجود تھا اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا کیونکہ وہ اپنے بتوں سے شرم محسوس کر رہی تھی۔ اسکے اس عمل سے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ محسوس ہوا کہ جب یہ بتوں سے شرم کر رہی ہے تو مجھے بھی خدا سے شرم کرنا ضروری ہے۔ اس برھان نے بھی آپ کے دل کو برائی سے بچایا۔

اس واقعہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام پر ورغلانے کا یہ مرحلہ گزر رہا تھا تو ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام اس واقعہ سے خبردار تھے اور انہوں نے اپنی شکل کو وہاں ظاہر کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو بچنے کا اشارہ کیا۔ آج بھی بعض مشائخ کرامؒ اسی طرح اپنے مریدوں کو بچاتے ہیں۔

''کشف المحجوب'' میں بھی کسی بزرگ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ یہودی عورت کے عشق میں گرفتار ہو کر اسلام کو چھوڑ کر یہودیت کو قبول کرنے کیلئے تیار تھے تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو اس وقت وضو فرما رہے تھے اپنے مریدوں سے کہنے لگے کہ ''وہ ولایت سے تو پہلے ہی معزول ہو چکا تھا لو آج وہ ایمان سے بھی جا رہا ہے''۔ مریدوں نے عرض کی آپ اس کو بچا لیں۔ تو آپ نے پانی کا ایک چھینٹا ان کی طرف پھینکا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہودیہ کے گھر سے بھاگ نکلے۔ یہ اللہ کی طرف سے برھان تھی لیکن اس کا ذریعہ انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرامؒ گردانتے ہیں کیونکہ اپنی توجہ کے تصرف سے اپنے مریدین کو مصائب سے بچا لیتے ہیں۔

حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کی زندگی کے واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؒ نے اپنے مرید کو برائی سے بچانے کیلئے خود کو ایک نگران کی صورت میں اس جگہ پہنچا دیا جہاں ان کے مرید نے برائی کا قصد کیا تھا اور پھر جمعہ کے وعظ میں اس کو فرمایا کہ تم خود بھی برائی سے بچنا سیکھو میں کب تک سکھ بن کر تمہارے پاس حاضر ہوتا رہونگا۔ اس لئے مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ اپنے شیخ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو۔

۱۰) شیخ کی روحانیت کا اثر

مرید اپنے شیخ سے روحانیت اخذ کرنے کے قابل ہو تو شیخ کی روحانیت اس کیلئے فیض باری تعالیٰ کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ پیر خواہ کہیں ہو مرید اس کی روحانیت سے دور نہیں رہتا اور دور سے بھی فیض رسانی کر سکتا ہے۔ مولانا رومیؒ کا فرمان ہے کہ

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست دستِ اُو جز قبضۂ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ دور رہنے والوں سے چھوٹا نہیں، اس کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے قبضے کے سوا کچھ نہیں)(م-۱-۳۱۲)

مولانا رومیؒ نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے کہ مرید اگر شیخ کے سامنے حاضر ہو تو بغیر گفتگو کے بھی مرید کی اصلاح اور فیض رسانی ہو سکتی ہے۔ ایسے فیض کو وہ بے گفتہ سبق کا نام دیتے ہیں اور یہ فیض محض روحانی تجلّیات سے مرید میں منتقل ہونے سے ملتا ہے۔

۱۱) مضبوط کڑے کے ساتھ باندھنا

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا'' [۱] (اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا۔) اولیائے کرامؒ کا قول ضیاء القرآن میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ رسی جس کو پکڑنے کا مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہے وہ ذکر الٰہی کے کرنے سے مضبوط ہو جاتی ہے۔ مرشد اس رسی کو جلا کر اپنی طرف کر لیتا ہے اور پھر رسول اللہ ﷺ کی محبت کی طرف لاتا ہے اور پھر اس رسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہ کام مرشدِ کامل اور مرید کامل سے ہی مقصود ہے ورنہ عام لوگ اس سعادت کے اہل نہیں ہوتے۔

۱۲) مرید کے زاویۂ نگاہ کو بدل دینا

پیر کی صحبت میں رہنے والے مریدوں کو نت نئے اسباق ملتے رہتے ہیں۔ ان اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرشد مرید کے زاویۂ نگاہ کو اس حالت میں تبدیل کر دیتا ہے کہ اس کا ہر کام صحیح سمت میں اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جاتا ہے۔ زاویۂ نگاہ بدلنے کا ایک انداز یہ ہے کہ مرید جب کھانا کھانے کیلئے بیٹھتا ہے تو مرشد اپنے مرید کو یہ کہتا ہے کہ تم کھانے کیلئے نہ بیٹھو بلکہ اپنے نفس اور بدن کو کھلانے کیلئے بیٹھو (یعنی کھانے کی لذت حاصل کرنے کیلئے نہ بیٹھو) مرشد یہ بھی کہتا ہے بچوں کو اپنی ملک نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہی امانت یا ملک سمجھو اور یہ محسوس کرو کہ اس کو میرے سپرد اس لئے کیا ہے کہ میں اس کی پرورش اور تربیت کا انتظام کروں۔ کسی سمت چلنے والے کا زاویہ اگر ذرا سا بھی بدل دیا جائے تو ہزاروں میل سفر کرنے کے بعد منزل میں سینکڑوں یا ہزاروں میلوں کا فرق ہو جاتا ہے۔ غلط راستے پر چلنے والے مرید کا اگر ذرا سا بھی زاویۂ سفر تبدیل کر دیا جائے تو سالک صحیح منزل پر پہنچ جاتا ہے حالانکہ زاویہ میں معمولی سی تبدیلی ہوتی ہے جس سے مطلوبہ منزل مل سکتی ہے۔ یہ داستان بہت طویل ہے مگر اس لطیف اشارے سے بات سمجھ آ سکتی ہے کہ شیخ کس طرح صحیح منزل کا

---

[۱] آل عمران، ۳:۱۰۳۔

تعین کر کے مرید کے نفس کو تبدیل کر دیتا ہے۔

۱۳) سینے کے ذریعے فیض دینا

روایات میں ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام پہلی وحی لے کر آئے تو حضور ﷺ کو فرمایا "اِقْرَاْ" (یعنی پڑھو) تو آپ ﷺ نے فرمایا "مَا اَنَا بِقَارِئٍ" (میں پڑھنے والا نہیں ہوں)۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے تین بار "اِقْرَاْ" کا لفظ فرمایا اور تین بار سینے سے سینہ ملا کر حضور ﷺ کو بھینچا جس سے آپ ﷺ کو کچھ تکلیف بھی ہوئی مگر تیسری بار بھینچنے کے بعد آپ ﷺ نے پڑھنا شروع کر دیا۔[1] یہ سینہ بھینچنے کا عمل اب بھی طریقت میں جاری ہے اور مریدوں کے سینوں میں مرشد کامل اپنا فیض (یعنی ایک قسم کا کرنٹ) منتقل کر دیتا ہے۔ کبھی سینے پر ہاتھ پھیرنے سے بھی فیض دیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے سینے پر حضور ﷺ نے جب ہاتھ پھیرا تو آپ ؓ نے فرمایا کہ اب میں آپ کی محبت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھنے لگا ہوں۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ذاکر اور شاکر انسان سے فیض لینے کا بہت شوق ہے لہٰذا جب وہ کسی عاشق کے قریب سے گزرتے ہیں تو اپنا سینہ کھول کر گزرتے ہیں کہ شاید اس عاشق کے عشق کی ایک چنگاری ان کے سینے پر بھی پڑ جائے ہماری تصنیف ''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ '' میں ''مقامِ آدمؑ'' کے بیان میں یہ روایت انسان کی فرشتوں پر فوقیت کے سلسلے میں بیان ہو چکی ہیں۔

۱۴) پیر کے چہرے کو بطور آئینہ کام میں لانا

''اسلام و روحانیت اور فکرِ اقبالؒ '' میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مولانا رومیؒ کے مطابق مرید کیلئے شیخ کا چہرہ ایک آئینے کا کام دیتا ہے اور مرید اس آئینے میں دیکھ کر اپنی برائیوں کا ازالہ کرتا ہے اور نفس کی تربیت کیلئے اس میں بہت مدد ملتی ہے۔ ان معنوں میں بھی نفس کشی مقصود ہے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے مرید جدھر بھی دیکھتا ہے مرشد کا چہرہ ہی دیکھتا ہے جیسے فرمایا۔

در و دیوار آئینہ شد از کثرت شوق ہر کجا می نگرم روئے تو می نگرم

(کثرتِ شوق سے در و دیوار آئینہ بن گئے ہیں چنانچہ جدھر بھی دیکھتا ہوں تیرا چہرہ ہی نظر آتا ہے)

۱۵) شیخ سے ربطِ محبت قائم کرنا

تصورِ شیخ کامل ہو جائے تو مرید کا شیخ کے ساتھ ایک ایسا ربط قائم ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی ہو مرید کے دل و نگاہ میں شیخ کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اس ربط سے شیخ سے فیض ملتا ہے اور مرید کے دِل پر مرشد کے

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۲، جلد ۱، صفحہ ۴۔

انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے جس سے یہ محبت بڑھتے بڑھتے عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نفس کشی میں مدد دیتی ہے۔

۱۶) شیخ کو آسمان کیلئے زینہ سمجھنا

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ آسمان کا زینہ ہے اور یہ زینہ عالم ملکوت و جبروت وغیرہ کی طرف لے جانے میں مدد دیتا ہے۔

پیر باشد نُردبانِ آسمان تیر پرّاں از کہ گردد؟ از کماں

(پیر آسمان پر چڑھنے کی سیڑھی ہے، تیر کس چیز سے حرکت کرتا ہے؟ کماں سے)(م-۶-۳۹۵)

شیخ کی ذات کے ساتھ منسلک ہونے کا ایک یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ مرید شیخ کے ساتھ آسمان پر چڑھ جاتا ہے اور یہ کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ نمرود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نصیحت کی تھی کہ تو اگر آسمان پر جانا چاہتا ہے تو تجھے مگس (شہد کی مکھی) نہیں لے جاسکتی۔ آؤ اور میرے ذریعے آسمان پر پہنچ جاؤ۔ یہ بات بھی نفس کشی میں مدد دیتی ہے۔

۱۷) ذکر واستغفار سے تزکیۂ نفس کرنا

ذکر سے متعلق ایک مکمل مضمون ہماری تصانیف ''اسلام در روحانیت اور فکر اقبالؒ'' ''بیعت کی تشکیل وتربیت'' اور ''حضورِ قلب'' میں تفصیل کے ساتھ دیا جاچکا ہے۔ وقوف عددی کا ذکر جو مذکورہ کتابوں میں لکھا گیا ہے نفس کو تابع کرنے کیلئے ایک نہایت زوداثر طریقہ ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والا کسی مرشد کی نگرانی میں اس طریقے سے مکمل واقفیت حاصل کر چکا ہو۔ کثرتِ استغفار ہر مشکل کی کنجی ہے اور روحانی عیوب کو دور کرنے کیلئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ ذکر اور کثرتِ استغفار اصلاحِ نفس کا بہترین نسخہ ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی فکر منجمد ہوگئی ہو تو اسے کہو کہ وہ ذکر کرے کیونکہ ایسا کرنے سے فکر کی ایسی راہ کھل جاتی ہے جو سالک کو خدا تک پہنچا دیتی ہے۔

۱۸) کثرتِ درود شریف

کثرتِ درود سالک میں جمالی اثرات پیدا کرتا ہے چنانچہ ذکر سے پیدا شدہ جلال معتدل حدود میں ہی قائم رہتا ہے۔ مشائخ کا قول ہے کہ کثرتِ درود ایک کامل پیر کے اثرات مرتب کرتا ہے اور اگر کوئی کامل پیر نہ مل سکے تو درود شریف کافی حد تک شیخ کے نہ ہونے کی کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ مستند کتابوں میں یہ بات پائی گئی ہے کہ تیس ہزار سے زیادہ درود شریف کا پڑھنا سالک کو ایسی استطاعت بخش دیتا ہے جس سے

رسول اللہ ﷺ کی بیداری میں ملاقات ہونے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

حاصلِ کلام

مذکورہ بالا تمام نکات کی طرف توجہ دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولانا رومیؒ کے مذکورہ شعر کا مقصد حاصل نہ ہو سکے یعنی ان نکات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سالک کے نفس کو مار دینا عین ممکن ثابت ہوتا ہے۔ اس قدر تفصیل دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ نفس کو مار دینا اس قدر آسان بات نہیں اور مذکورہ بالاعنوانات کی روشنی میں سفر کیا جائے تو منزل دور نہیں رہتی۔ نفس کو مارنے سے مراد یہی ہے کہ نفس انسان کے تابع ہو جائے، سرکشی سے باز آ جائے اور عقل اور روح کے تابع ہو جائے۔ اس کے علاوہ اگر شیخ مرید میں اپنی توجہ سے جذبۂ عشق پیدا کر دے تو معاملہ اور بھی آسان اور قلیل مدت میں ٹھیک ہو سکتا ہے۔

نفس کا شیخ سے تعلق

انسان کی خاک میں پستی رکھی گئی ہے اور اس میں رذائل کی داغ بیل کام کرتی ہے۔ اس مٹی کے خصائل کو تبدیل کرنے کیلئے انسان کیلئے ضروری ہے کہ خود کو خاک کے سامنے خاک کی طرح پست اور عاجز خیال کرے تا کہ اس کی خاک اپنے اندر کیمیا کے اوصاف پیدا کر لے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

خاک شو در پیش شیخ باصفا تا ز خاک تو بروید کیمیا

(صاحب باطن شیخ کے سامنے خاک بن جا، تا کہ تیری خاک سے کیمیا پیدا ہو) (م۔۳۔۲۴۷)

مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ نفس کی صد ہا زبانیں ہیں اور ہر زبان میں ہزار مکر و فریب ہیں۔ کبھی ایک شکل میں آتا ہے اور کبھی دوسری شکل میں انسان کے سامنے آ کر اس کو ہر ممکن ذریعے سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب انسان کسی ولی اللہ کے سامنے آ جاتا ہے تو اس کی تمام زبانیں گنگ اور خاموش ہو جاتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ ؓ مسجد میں آرام کی غرض سے لیٹے ہوئے تھے اور ان کے قریب ایک جانب ایک شخص نماز ادا کر رہا تھا۔ ایک بزرگ کا گذر ادھر سے ہوا تو دیکھا کہ ایک شیطان مسجد کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس نے شیطان سے پوچھا اس جگہ تمہارا کیا کام ہے؟ اس نے کہا کہ وہ شخص نماز پڑھ رہا ہے اور میں اس کی نماز میں خلل ڈالنا چاہتا ہوں۔ پوچھا پھر آگے کیوں نہیں بڑھتے، اس شیطان نے کہا کہ وہ شخص (حضرت علی ؓ) جو اس کے قریب لیٹے ہوئے ہیں، ان سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے آگے جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا:

صد زباں در ہر زبانش صد لغت زرق و دستانش نیاید در صفت

(نفس کی) سوزبانیں ہیں اوراس کی ہرزبان میں سوسو بولیاں ہیں اس کا مکر اور حیلہ بازی بیان نہیں ہوسکتی ہے)

(م۳: ۲۴۷)

چوں بنزدیکِ ولی اللہ شود آں زبانِ صد گزش کوتہ شود

(جب وہ اللہ تعالیٰ کے ولی کے نزدیک ہوجاتا ہے تو اس کی سوگز لمبی زبان چھوٹی ہوجاتی ہے) (م۳: ۲۴۷)

نفس کا کردار نمرود جیسا مگر عقل وروح خلیل اللہ علیہ السلام کی مانند ہیں

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ لوگ جہنمی نفس کو بہشت کی طرح بناسجا کر رکھتے اور اس کے ساتھ وفاداری کا عہدو پیان باندھ لیتے ہیں جوسراسر اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ نفس کا کردار فرعون، ھامان اور نمرود کی طرح باغیانہ اور سرکش بندوں والا ہوتا ہے وہ ہروقت باغیانہ دلیلوں کا حامل رہتا ہے جبکہ عقل و روح، خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح مشاہدۂ حق کے طلبگار رہتے ہیں۔ نفس سوفسطائی ہے اور اس کی سرزنش کرنا ضروری ہے۔ نفس کو دبانا ہی بہتر ہے اور اس سے دلیلوں میں مت الجھو۔ اسلام نے عقل کو نفس کا پاسبان بنایا ہے اور اس اعتبار سے نفس سے توقع کی جاتی ہے کہ عقل اور نفس میں برادرانہ رشتہ قائم ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ عموماً یہ دونوں آپس میں متضاد اور مخالف رہتے ہیں۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کو مار کر اپنے لیے نیا جہاں پیدا کرو اس نے اپنے آقا (دین خدا) کو قتل کیا ہے اس کو اپنا غلام بنا کر رکھو۔ نفس تو اژدھے کی طرح بہت سے مکر اور فریب رکھتا ہے مگر شیخ و مرشد اس کے داؤ کو نکال کر پھینک دیتا ہے۔

نفس ناری راچو باغے ساختید اندر و تخمِ وفا انداختید

(چونکہ تم نے جہنمی نفس کو باغ بنالیا ہے (مگر شیخ) اس میں وفا کا بیج بودیتا ہے) (۲-۲۴۵)

نفس نمرود ست عقل و جاں خلیلؑ روح در عین ست و نفس اندر دلیل

(نفس نمرود ہے اور عقل اور روح خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ہے، روح عین (مشاہدہ) ذاتِ حق میں ہے اور نفس دلیل میں رہتا ہے)

نفس سو فسطائی آمد میزش کش زدن سازد نہ حجّت گفتنش

(نفس سوفسطائی ہے اسکی سرزنش کر کیونکہ مارنا ہی اس کے لائق ہے نہ اس سے دلیل بیان کرنا) (۲-۳۲۸)

نفسِ واحد از رسولِ حق شدند ورنہ ہر یک دشمن طلق بُدند

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ایک جان ہوگئے ورنہ ہر ایک مطلقاً دشمن تھا) (م۔۲: ۳۴۷)

نفس خود را کش جہانرا زندہ کن خواجہ را کشت ست اُورا بندہ کن

(اپنے نفس کو مار، اپنے جہان کو زندہ کر، اس نے آقا کو قتل کیا ہے اس کو غلام بنا) (م۔۳:۲۴۴۳)

نفس اژدہا ست با صد زور و فن روئے شیخ اُو را زمُرّد دیدہ کن

(م۔۳:۲۴۴۶)

(نفس سینکڑوں مکر اور فن والا اژدہا ہے شیخ کا چہرہ اس کیلئے آنکھیں نکال ڈالنے والا زمرد ہے)

جب مرید قدمِ شیخ کی اتباع کرے تو نفس اس کا فرمانبردار ہو جاتا ہے

نفس کی فطرت ایسی ہے کہ ہر وقت شر اور فساد برپا کرنے کی چنگاریاں اُگلتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے کہ خود کو بھی اور دوسروں کو بھی جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ جب تک نفس شراب اور شراب کے بعد کھانے والی چیزوں مثلاً کباب میوہ اور مٹھائی وغیرہ میں مشغول رہتا ہے تو جان لو کہ نفس نے نشے میں مبتلا ہونے کے باعث کوئی غیبی چیز نہیں دیکھی یعنی مشاہدات غیب سے بالکل کورا رہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب تیرا نفس تیرے قدموں کو شیخ کے قدموں کے ساتھ ملتا ہوا دیکھے گا تو مجبوراً تیرا فرمانبردار ہونے لگے گا۔ جب کسی شخص کا نفس بدل جائے تو اس کا جسم اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے ہاتھ میں ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا۔

نفس تو تا مست نُقلست و نبیذ دانکہ روحت خوشۂ غیبی ندید

(تیرا نفس جب تک شراب کے بعد کھانے والی چیز اور شراب کا مست ہے تو سمجھ لے کہ تیری روح نے غیبی خوشہ نہیں دیکھا ہے) (م۔۵:۲۵۰)

نفس تو ھر دم بر آرد صد شرار کہ بہ بینیدم منم ز اصحاب نار

(م۔۳:۲۳۹)

(تیرا نفس ہر وقت سینکڑوں چنگاریاں اگل رہا ہے (کہتا ہے) کہ مجھے دیکھو میں دوزخیوں میں سے ہوں)

نفس چوں با شیخ بیند گامِ تو از بُنِ دنداں شود اُو رامِ تو

(نفس جب تیرا قدم شیخ کے ساتھ دیکھے گا، تو مجبوراً تیرا فرمانبردار ہو جائے گا) (م۔۳:۲۴۴۶)

نفس چوں مبدل شود ایں تیغ تن باشد اندر دستِ صُنع ذُوالمِنن

(نفس جب بدل جاتا ہے تو یہ تیرے جسم کی تلوار، اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے ہاتھ میں ہوتی ہے) (م۔۵:۳۸۴)

انتباہ!

جو کلام مذکورہ بالا سطور میں لکھا گیا ہے اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سالک کسی شیخ سے بیعت کرتا ہے اور اس راہ کی مذکورہ ہدایات سے بالکل الگ رہتا ہے تو ایسی بیعت اس کے نفس کو مارنے کیلئے مددگار

نہ ہوگی کیونکہ اس نے صرف رسمی بیعت کی ہے اور ایسی رسمی بیعت کا اصلی اور حقیقی بیعت سے کوئی تعلق نہیں۔ پیر کو اگر پیر مان لیا جائے اور پھر مذکورہ بالا عبارتوں کی طرف حتی الامکان دھیان دیا جائے تو پھر نفس کا مرنا باور ہو جاتا ہے (یاد رہے کہ نفس کبھی مرتا نہیں بلکہ مہذب ہو سکتا ہے اور اسی مہذب ہونے کو نفس کا مارنا کہا جاتا ہے)۔ ظلِ پیر اسی وقت میسر اور فائدہ مند ہو سکتا ہے اگر اس کیلئے پوری کوشش کی جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ انسان کوئی کام ہی نہ کرے اور ہر وقت مذکورہ اصطلاحات کے ساتھ ہی چمٹا رہے بلکہ اس بیان سے مراد ہے کہ سالک ان نصائح پر عمل کرے جس حد تک وہ کر سکتا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوگی۔ بغیر عمل کے مقصود کے حل ہونے کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کے کاموں میں اس قدر محنت کرتا ہے تو وہ اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح نفس کشی کیلئے ایک خاص معیار کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہلِ ہمت کی زندگیاں ہمارے سامنے نمونے کے طور پر موجود ہیں۔ جو لوگ اتنی محنت نہیں کر سکتے ان کو شرم آنی چاہیے کہ وہ دنیا کا مال کمانے کیلئے رات دن ایک کر دیتے ہیں اور جب اسلامی کمالات حاصل کرنے کی بات ہو تو بہانے تراشنا شروع کر دیتے ہیں۔

مصادر و مراجع قرآن و تفاسیر قرآن

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	تاریخ وفات	مطبوعہ
۱	قرآن مجید			
۲	تفسیر الکبیر	امام فخر الدین	۶۰۴ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۳	الدر المنثور	امام جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ	دار الفکر، بیروت
۴	تفسیر ابی سعود	ابی سعود العمادی	۹۵۱ھ	دار احیاء التراث بیروت
۵	تفسیر ابن کثیر	اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی	۷۷۴ھ	دار الفکر، بیروت
۶	تفسیر طبری	محمد بن الجریر طبری	۱۳۰ھ	دار الفکر، بیروت
۷	روح المعانی	شہاب الدین السید محمود آلوسی	۱۲۷۰ھ	دار الفکر، بیروت
۸	احکام القرآن	احمد بن علی الرازی الجصاص	۳۷۰ھ	دار الفکر، بیروت
۹	تفسیر الثعلبی	عبد الرحمن الثعلبی		مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۱۰	تبیان القرآن	علامہ غلام رسول سعیدی		فرید بک سٹال
۱۱	تفسیر روح البیان	شیخ اسماعیل حقی		مکتبہ عثمانیہ، کوئٹہ
۱۲	فتح القدیر	محمد بن علی الشوکانی	۱۲۵۶ھ	دار الفکر، بیروت
۱۳	ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ		ضیاء القرآن، لاہور
۱۴	تفسیر نعیمی	مفتی احمد یار خان نعیمی		مکتبہ اسلامیہ، لاہور۔
۱۵	تفسیر بیضاوی	امام بیضاوی	۶۷۵ھ	دار الفکر، بیروت
۱۶	تفسیر مظہری	علامہ ثناء اللہ پانی پتی	۱۲۲۵ھ	بیروت
۱۷	تفسیر قرطبی	امام قرطبی	۶۷۱ھ	دار الشعب، القاہرہ
۱۸	تفسیر المنار	علامہ رشید رضا	۱۳۵۴ھ	دار المعرفہ، بیروت

مصادر ومراجع احادیث وشروعات حدیث

۱	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل البخاری	۲۵۶ھ	دارالفکر بیروت
۲	صحیح مسلم	مسلم بن حجاج القشیری	۲۶۱ھ	دارالفکر بیروت
۳	المستدرک علی الصحیحین	محمد بن عبداللہ النیشاپوری	۴۰۵ھ	دارالفکر بیروت
۴	صحیح ابن حبان	محمد بن حبان التیمی	۳۵۴ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۵	سنن نسائی	احمد بن شعیب النسائی	۳۰۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۶	سنن ابوداؤد	سلیمان بن اشعث ابوداؤد	۲۷۵ھ	دارالفکر بیروت
۷	سنن ابن ماجہ	ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی	۲۷۵ھ	دارالفکر بیروت
۸	سنن بیہقی الکبریٰ	احمد بن حسین البیہقی	۴۵۸ھ	دارالفکر بیروت
۹	سنن ترمذی	ابوعیسی محمد بن عیسی ترمذی	۲۷۹ھ	دارالفکر بیروت
۱۰	سنن الدارمی	عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی	۲۵۵ھ	دارالفکر بیروت
۱۱	مصنف ابن ابی شیبہ	عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ	۲۳۵ھ	دارالفکر بیروت
۱۲	مصنف عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام	۲۱۱ھ	دارالفکر بیروت
۱۳	الزھد الکبیر	احمد بن حسین البیہقی	۴۵۸ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۱۴	المعجم الاوسط	سلیمان بن احمد طبرانی	۳۶۰ھ	دارالفکر بیروت
۱۵	معرفۃ السنن والاثار	ابوبکر البیہقی	۴۷۰ھ	دارالفکر بیروت
۱۶	المعجم الکبیر	سلیمان بن احمد الطبرانی	۳۶۰ھ	دارالفکر بیروت
۱۷	مشکوۃ المصابیح	محمد بن عبداللہ		المکتب الاسلامی، بیروت
۱۸	السنہ	عمر بن ابی عاصم الشیبانی	۲۸۷ھ	المکتب الاسلامی، بیروت
۱۹	مسند ابی یعلیٰ	احمد بن علی التیمی	۴۰۷ھ	دارالفکر بیروت
۲۰	مسند احمد بن حنبل	احمد بن حنبل	۲۴۱ھ	دارالفکر بیروت
۲۱	مسند بزار	احمد بن عمرو البزار	۲۹۲ھ	دارالفکر بیروت
۲۲	مسند الرویانی	محمد بن ہارون الرویانی	۳۰۷ھ	دارالفکر بیروت
۲۳	مسند الشہاب	محمد بن سلامیہ القضاعی	۴۵۴ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۲۴	مسند ابن ابی شیبہ	ابوبکر محمد بن عبداللہ بن ابی شیبہ	۲۳۵ھ	مکتبۃ الرشید، الریاض
۲۵	مجمع الزوائد	علی بن ابی بکر	۸۰۷ھ	دارالفکر بیروت
۲۶	کنز العمال	علاؤالدین علی المتقی	۹۷۵ھ	دارالکتب العلمیہ بیروت

۲۷	فتح الباری	احمد بن علی ابن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ	دارالفکر بیروت
۲۸	علل الحدیث	امام الرازی	۳۲۷ھ	دارالمعرفہ، بیروت
۲۹	عمدۃ القاری	بدرالدین العینی	۸۵۵ھ	دارالفکر بیروت
۳۰	شرح زرقانی	محمد بن عبداللہ الباقی الزرقانی	۱۱۲۲ھ	دارالفکر بیروت
۳۱	فیض القدیر	عبدالرؤف مناوی	۸۲۲ھ	دارالکتب العربیہ بیروت
۳۲	مرقاۃ المفاتیح	علی بن سلطان القاری	۱۰۱۴ھ	دارالفکر بیروت
۳۳	حلیۃ الاولیاء	ابونعیم احمد بن عبداللہ	۴۳۰ھ	دارالفکر بیروت
۳۴	الاحادیث المختارہ	ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد	۶۴۳ھ	دارالکتب الاسلامیہ، بیروت
۳۵	جلاء الافہام	محمد بن ابی بکر الرازی	۷۵۱ھ	دارالعروبہ، الکویت
۳۶	روضۃ المحبین	محمد بن ابی بکر الزرعی		دارالکتب العلمیہ، بیروت
۳۷	الترغیب والترہیب	عبدالعظیم المنذری	۶۵۶ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۳۸	کشف المشکل	عبدالرحمٰن بن جوزی	۵۹۷ھ	دارالفکر بیروت
۳۹	البرہان المؤید	احمد الرفاعی	۵۷۸ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۴۰	شرح صحیح مسلم	غلام رسول سعیدی		فرید بک سٹال
۴۱	التذکرہ فی الاحادیث المشتہرہ	بدرالدین الزرکشی	۷۹۴ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۴۲	درء التعارض	تقی الدین	۷۲۸ھ	دارالفکر بیروت
۴۳	آداب النفوس	حارث بن اسد	۲۴۰ھ	دارالصار، بیروت
۴۴	الزہد لابن حنبل	امام احمد بن حنبل	۲۴۱ھ	دارالمعرفۃ، بیروت
۴۵	کتب ورسائل وفتاوی	امام ابن تیمیہ	۷۲۸ھ	والکتب العلمیہ، رابیروت
۴۶	علل الحدیث	عبدالرحمٰن بن محمد	۳۲۷ھ	دارالمعرفۃ، بیروت
۴۷	الریاض النضرۃ	احمد بن عبداللہ	۶۹۴ھ	دارالغرب الاسلامی، بیروت
۴۸	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ	دارالفکر، بیروت
۴۹	الفردوس بماثور الخطاب	امام الدیلمی	۵۰۹ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت

مصادر ومراجع اصول حدیث وتصوف

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	تاریخ وفات	مطبوعہ
۱	تخریج الحدیث	عبداللہ بن یوسف	۷۶۲ھ	دارابن خزیمہ، الریاض
۲	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ	دارالفکر بیروت

۳	الاجابه	بدرالدین الزرکشی	۷۹۴ھ	المکتب الاسلامی بیروت
۴	الطبقات	امام الشعرانی		دارالفکر بیروت
۵	احکام الاحکام	تقی الدین ابی الفتح	۷۰۲ھ	دارالفکر بیروت
۶	الوابل الصیب	ابن قیم	۷۵۱ھ	دارالکتب العلمیہ بیروت
۷	سبل الھدی والرشاد			تاج کمپنی لاہور
۸	جامع کرامات الاولیاء	ھبۃ اللہ ابن الحسن	۴۱۸ھ	دارالفکر بیروت
۹	الاعتصام	ابواسحاق الشاطبی	۷۹۰ھ	المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ مصر
۱۰	الموافقات	ابراہیم بن موسیٰ مالکی	۷۹۰ھ	دارالفکر بیروت
۱۱	اختلاف الحدیث	امام شوکانی	۲۰۴ھ	دارالفکر بیروت
۱۲	الرسالہ	محمد بن ادریس الشافعی	۲۰۴ھ	دارالفکر بیروت
۱۳	ارشاد الفحول	محمد بن علی الشوکانی	۱۲۵۰ھ	دارالفکر، بیروت
۱۴	الاحکام الآمدی	علی بن محمد آمدی	۶۳۱ھ	دارالکتاب بیروت
۱۵	مجموع الفتاویٰ	عبدالحلیم بن تیمیہ	۷۲۸ھ	دارالفکر بیروت
۱۶	حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ الدھلوی	۱۱۸۴ھ	دارالکتب الحدیثیہ، القاھرہ
۱۷	عوارف المعارف	شہاب الدین سہروردی	۶۳۲ھ	مدینہ پبلشنگ کراچی
۱۸	کتاب الروح	علامہ حافظ ابن القیم	۷۵۱ھ	نفیس اکیڈمی کراچی
۱۹	کشف المحجوب	داتا گنج بخش علی ہجویریؒ	۴۰۱ھ	ضیاء القرآن پبلی کیشنز
۲۰	رسالہ قشیریہ	شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری	۴۶۵ھ	المکتبۃ الحنفیہ، مردان
۲۱	غنیۃ الطالبین	شیخ عبدالقادر جیلانی	۵۶۱ھ	دارالفکر بیروت
۲۲	نعمۃ الذریعہ	ابراھیم الحلبی	۹۵۶ھ	دارالصادر، بیروت
۲۳	مکاشفۃ القلوب	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبۃ فیض العلم، کراچی
۲۴	مدارج النبوۃ	شاہ عبدالحق محدث دہلوی	۱۰۵۲ھ	دارالفکر بیروت
۲۵	مثنوی معنوی	مولانا روم	۶۷۲ھ	تہران
۲۶	کلیات اقبال (اردو)	ڈاکٹر علامہ اقبال		
۲۷	کلیات اقبال (فارسی)	ڈاکٹر علامہ اقبال		غلام علی اینڈ سنز
۲۸	مکتوبات امام ربانی	احمد سرہندی	۹۷۱ھ	
۲۹	شرح المقاصد فی علم الکلام	ابن عمر التفتازانی	۷۹۱ھ	دارالمعارف، بیروت
۳۰	بغیۃ المرتاد	ابن تیمیہ	۷۲۸ھ	مکتبۃ العلوم، بیروت

۳۱	التعریف لمذھب التصوف	محمد الکلاباذی	۳۸۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۳۲	احیاء العلوم	امام غزالی	۵۰۵ھ	
۳۳	حلیۃ الاولیاء	ابونعیم احمد بن عبداللہ	۴۳۰ھ	دار الکتاب العربی، بیروت
۳۴	الفوائد المجموعہ	محمد بن علی الشوکانی	۱۲۵۰ھ	المکتب الاسلامی بیروت
۳۵	شریعت وطریقت			ادارہ اسلامیات لاہور
۳۶	الانوار القدسیہ	امام عبدالوہاب الشعرانی		دار المعرفہ، بیروت
۳۷	اصول الاحکام	علی بن احمد بن حزم	۴۵۶ھ	دار الحدیث، قاہرہ
۳۸	کتاب المناقب	عبدالرحمٰن ابن جوزی	۵۰۵ھ	دار المعرفہ بیروت

مصادر ومراجع سیرت، تاریخ اور ادب ولغت

۱	الخصائص الکبریٰ	امام جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ	مکتبہ حقانیہ، پشاور
۲	السیرۃ الحلبیہ	علی بن البرھان الحلبی	۱۰۴۴ھ	دار المعرفہ بیروت
۳	السیرۃ الغبویہ	عبدالملک بن ہشام	۲۱۳ھ	دار المعرفہ بیروت
۴	فضائل صحابہ	احمد بن حنبل	۲۴۱ھ	دار المعرفہ بیروت
۵	فضائل صحابہ	احمد بن شعیب النسائی	۳۰۳ھ	دار المعرفہ بیروت
۶	الریاض النضرہ	احمد بن عبداللہ الطبری	۶۹۴ھ	دار المعرفہ بیروت
۷	مفتاح الجنۃ	عبدالرحمٰن السیوطی	۹۱۱ھ	دار المعرفہ بیروت
۸	البدایہ والنھایہ	اسماعیل بن عمر القرشی	۷۷۴ھ	دار المعرفہ بیروت
۹	تاریخ الخلفاء	عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی	۹۱۱ھ	مدینہ پبلشنگ کراچی
۱۰	مختار الصحاح	محمد بن ابی بکر الرازی	۷۲۱ھ	مکتبہ لبنان، بیروت
۱۱	المفردات فی غریب القرآن	ابوالقاسم الحسین بن محمد	۵۰۲ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۲	القاموس المحیط	محمد بن یعقوب الفیروزآبادی	۸۱۷ھ	دار المعرفہ بیروت
۱۳	لسان العرب	ابن منظور المصری	۷۱۱ھ	دار الصادر، بیروت
۱۴	تاج العروس	محمد مرتضیٰ بیدی	۱۲۰۴ھ	دار المعرفہ بیروت
۱۵	تاریخ مدینہ دمشق	امام علی بن حسین ابن عساکر	۵۷۱ھ	دار الفکر، بیروت
۱۶	کتاب التعریفات	علی بن محمد الجرجانی	۷۴۰ھ	دار الصادر، بیروت
۱۷	مناقب امام ابوحنیفہ	امام محمد بن حسن شیبانی	۱۸۹ھ	دار الکتب العربی
۱۸	تاریخ بغداد	امام خطیب بغدادی		المکتبۃ السلفیہ، مدینہ منورہ

۱۹	المعرفۃ والتاریخ	یعقوب بن سفیان	۲۷۷ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۰	جامع بیان العلم وفضلہ	یوسف بن عبدالبر	۴۶۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۱	الجامع الاخلاق الراوی	احمد بن علی البغدادی	۱۲۹۰ھ	مکتبۃ المعارف، الریاض
۲۲	معارج القدس	محمد بن محمد الغزالی	۵۰۵ھ	دارالآفاق الجیدہ، بیروت
۲۳	لسان المیزان	امام ابن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ	مؤسسۃ الاعلی، بیروت
۲۴	الجواب الکافی	محمد بن ابی بکر الرزعی	۷۵۱ھ	دارالمعرفہ بیروت
۲۵	الجرح والتعدیل	عبدالرحمٰن بن ابی حاتم	۳۲۷ھ	الاحیاء التراث، بیروت
۲۶	تحفۃ الاحوذی	محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری	۱۳۵۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۷	الکامل فی التاریخ	ابوالحسن علی الشیبانی	۶۳۰ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت

ختمِ خواجگان

بروز جمعۃ المبارک بعد نمازِ عصر و قبل از مغرب پڑھیں

۱ بسم اللہ شریف	۱۰۰بار	۲ درُود شریف	۱۰۰بار
۳ الحمد شریف	۱۰۰بار	۴ سورہ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ o"	۷۹بار
۵ سورہ الاخلاص	۱۰۰۰بار	۶ الحمد شریف	۷بار
۷ درُود شریف	۱۰۰بار		

۸ یَا قَاضِیَ الْحَاجَاتِ	(اے حاجات کو پورا کرنے والے)	۱۰۰بار
۹ یَا شَافِیَ الْاَمْرَاضِ	(اے امراض سے شفا دینے والے)	۱۰۰بار
۱۰ یَاکَافِیَ الْمُهِمَّاتِ	(اے مہمات کو پورا کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۱ یَادَافِعَ الْبَلِیَّاتِ	(اے بلاؤں کو دور کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۲ یَارَافِعَ الدَّرَجَاتِ	(اے درجات کو بلند کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۳ یَا حَلَّ الْمُشْکِلَاتِ	(اے مشکلات کو حل کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۴ یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ	(اے اسباب پیدا کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۵ یَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ	(اے رزق و کشادگی کے) دروازے کھولنے والے)	۱۰۰بار
۱۶ یَاغِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ اَغِثْنَا	(اے مدد چاہنے والوں کی مدد کرنے والے ہماری مدد فرما)	۱۰۰بار
۱۷ یَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَاتِ	(اے بخششوں کی بڑی گنجائش والے)	۱۰۰بار
۱۸ یَامُنَزِّلَ الْبَرَکَاتِ	(اے برکتوں کو نازل کرنے والے)	۱۰۰بار
۱۹ یَا مُجِیْبَ الدَّعْوَاتِ	(اے دعاؤں کو قبول کرنے والے)	۱۰۰بار
۲۰ یَااَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ	(اے رحم کرنے والوں میں سے زیادہ رحم کرنے والے)	۱۰۰بار
۲۱ درُود شریف		۱۰۰بار

ایصالِ ثواب برائے خواجگان نقشبندؒ

حضرت ابوبکر صدیق ﷛	خواجہ بایزید بسطامیؒ	خواجہ عارف ریوکریؒ
خواجہ باباسماسیؒ	خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ	خواجہ سیّد امیر کلالؒ
خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ	خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ	خواجہ ابو یوسف ہمدانیؒ
خواجہ ابومنصور ماتریدیؒ	خواجہ عبداللطیف خان نقشبندیؒ	

شجرہ شریف

سلسلہ نقشبندیہ بہ مناسبتِ عبداللطیف خان نقشبندی، خاکپائے آستانہ نیریاں شریف

یا الٰہی خستہ حالم رحم کن برحالِ ما | اِتقا دارم زِفضلت نیست جز تو والیِ ما
اِلتجا دارم بہ درگاہت بنامِ مصطفیٰؐ | کاں بُود اَحمدؐ محمدؐ درصفات و در عطا

دست ِ اُو گیرم کہ دستِ خویش اُو را گفتہ ای

زِیں سبب گفتہ نہ باشددشتِ اُو از تو جُدا

حضرت صدیق و سلمان، قاسم و جعفر دِگر | بایزید و خواجہ و بوالحسن خورشید فر
بو علی بحرِ عطا بُو یوسف ابر مکرمت | عبد خالق عارف و محمود شاہ داد گر
بحرِ کرم را میتنی بابا سماسی و کلال | نقشبند، عطار و چرخی عِشق را تیغ و سپَر
پس عبیدُ اللہ و زاہدؒ خواجہ درویش اَجل | خواجہ اَملنکی و باقی باللہ آمد خُوب تر
پس مجدد عروۃ الوثقٰی و شاہِ شاہ حُسین | خواجہ عبدالباسط و شاہ عبدِ قادر دیدہ ور
فغنوی محمود خواجہ اولیاء عبداللہ شاہ | شاہ عنایت حافظ احمد والیانِ بحر و بر
فخرِ ہند عبدالصبور و گُل محمد شاہ غفور | خلق را عبدالمجید عبدالعزیز آمزد گر
خواجہ سُلطان الملوک و آں نظام الدین شہ | خواجہ قاسم ہادیٔ ہند و جہاں را راہبر
زہد کامل محی الدین شاہِ نیروی | داد علاؤالدین جہانِ عشق را کامل نظر

یا الٰہی رحم کن بر ما طفیل آں شہاں

لُطف فرما بر لطیف و دوستاں شام و سحر

پیر صاحب علیہ الرحمۃ کی دیگر تصانیف

اقامۃُ الصلوۃ
اوراق:289 قیمت:175روپے

مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار کا باعث فقط مادہ پرستی ہے۔آج کا نوجوان دینِ اسلام سے ناواقف ہے۔اگر ان کو دین کی تعلیمات سائنٹیفک اور دلچسپ انداز میں صحیح طریقے سے بتائی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ نماز کی طرف راغب نہ ہو سکیں۔اللہ تعالیٰ پر یقین کے قرآنی، مشاہداتی اور عقلی دلائل، انسان کی تخلیق کی غرض غایت، عبادت گزاروں کو ملنے والے امتیازات نیز اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے جیسے اہم موضوعات پر قلم کشائی کی گئی ہے۔

بیعت کی تشکیل اور تربیت
اوراق: 270 قیمت:200روپے

جواز بیعت، اُس کی اہمیت اور تصوف کے احوال و اشغال پر مختلف زاویوں سے مختصر مگر مدلل گفتگو اس کتاب کی انفرادیت ہے۔مصنف کی یہ تحریر اُن کے سات روحانی درسوں سے اقتباس ہے۔راہِ طریقت کے مسافروں کے علمی، اخلاقی اور روحانی معیار کو مطلوبہ سطح تک لانے کیلئے نہایت موزوں ہے۔کامیاب زندگی کے آزمودہ نسخے، ذکر کے روحانی کمالات اور تقدیر کے بدلنے کا طریقہ کار اس کتاب میں دلچسپ انداز میں رقم کیا گیا ہے۔

رابطۂ شیخ
اوراق:416 قیمت250روپے

مقاماتِ سلوک کو طے کرنے کیلئے جہاں طالب کے ظرف کا معیار ضروری ہے وہاں شیخ سے ربط کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔اس راہ پر کامیاب ہونے کے لیے راہبر کی طرف سے حاصل ہونے والے تصرفات اور توجہ سالک کیلئے انتہائی اہم ہیں۔ رابطہ کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ اس کی اہمیت؟ ربط کیسے قائم کیا جاتا ہے؟ رابطۂ شیخ سے قربِ الٰہی کیسے ممکن ہے؟ کشف، الہام اور کشف القبور کیسے کیا جاتا ہے؟ ان سب سوالوں کا تسلی بخش جواب اس کتاب میں موجود ہے۔

جنیدؒ و بایزیدؒ
اوراق:752 قیمت:400روپے

کثرتِ مال اور حصول جاہ و منصب کی طلب نے مسلمانوں کو دین کی دولت سے محروم کر دیا ہے۔ایسے میں انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیائے کرامؒ کی زندگیاں ہماری تربیت کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس کتاب میں حضرت جنیدؒ و بایزیدؒ کی حیات مبارکہ کو خاطر خواہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔طریقت کی راہ کے سالکین کیلئے اس کتاب میں جنیدؒ و بایزیدؒ کی پُر کیف زندگیوں، مقالات، روحانی مدراج اور بلند پرواز احوال ایک نصاب کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاہین کا جہاں اور
اوراق:364 قیمت:120روپے

شاہین ایک نہایت دلیر شکاری پرندہ ہے جو بلند پروازی اور خودداری کی علامت ہے۔اس میں مردِ حر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔علامہ اقبالؒ نے اس کی قلندرانہ خوبیوں کے باعث یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بچوں کو شاہین کے بال و پر دے۔شاہین اور کرگس دونوں کی ایک ہی فضا میں پرواز ہونے کے باوجود ان دونوں کے جہانوں میں اتنا بڑا فرق ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اس کتاب میں مصنف نے اس سوال کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

سُنت مبارکہ

اوراق:640 قیمت:350روپے

سیرت مصطفوی ﷺ کی پیروی ہی سرچشمہ ایمان ہے۔اس کتاب میں مولف نے پابندی سنت کی عظمت انتہائی دلنشین پیرائے میں بیان کی ہے۔مصنف کا پراثر روحانی اسلوب بیان قاری کے قلب پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔آئمہ کرام کے اقوال اوراحوال قاری کیلئے نہ صرف دلچسپی کا باعث بلکہ ان کی زندگیوں میں مثبت تغیر پیدا کرتے ہیں۔بدعت کیا ہے،جدید سائنس نے سنت کو کیا اہمیت دی ہےاوردیگر بہت سے سوالات کے جوابات اس کتاب میں پائیں گے۔

اسلام و روحانیت اورفکراقبالؒ

اوراق:1211 قیمت:385روپے

اس کتاب میں میں جہاں سالکانِ طریقت کی تربیت کا اہم فریضہ ادا کیا گیا ہے وہاں مخالفان راہ سلوک کے شکوک کا قرآن واحادیث اور بزرگانِ دین کے اقوال واحوال کی روشنی میں احسن انداز میں ازالہ کیا گیا ہے۔اس کتاب میں فقرودرویشی، حکمت ومعرفت، مراتب ولایت اور مقام آدم جیسے مضامین کا بغور جائزہ لیا گیا ہے۔طریقت کی اصلاحات سے طبقات السمٰوات تک کے تمام علوم یکجا کر دیے گئے ہیں۔علامہ اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کے اشعار اس کتاب کی زینت ہیں۔

سوزو ساز رومیؒ

اوراق:579 قیمت:350روپے

مؤلف نے مثنوی مولانا رومؒ کی برس ہابرس کی عرق ریزی کے بعد ایسے منتخب اشعار کی تشریح شامل کی ہے جوزبان زد عام ہیں۔قارئین کے لیے مولانا رومؒ کی بیان کردہ انسانی زندگی میں کام آنے والی عشق کی کارفرمائیاں اور اُس کے وہ خوبصورت پہلو جس سے انسان اپنی زندگی میں گوناں گوں کامیابیاں حاصل کرتا ہے یکجا کر دی گئیں ہیں۔اُنہی کیلئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مولاناؒ ایک مرشد روشن ضمیر اور کاروانِ عشق ومستی کے امیر ہیں،اُن کو رفیق راہ بناؤ وہ جدھر تمہیں لے جائیں اُدھر جاؤ۔

نشان منزل

اوراق:313 قیمت:157روپے

مسلمانوں کی آج کی حالتِ زاران کی اسلام سے دوری کے سبب ہے۔اس دوری کی متفرق وجوہات پیش کرتے ہوئے مولف کی قرآن وحدیث کی رو سے حل تلاش کرنے کی سعی قابلِ تحسین ہے۔مصنف نے مسلمانوں کی بے عملی میں حائل چھ نکات رقم کیے ہیں۔ایمان کی تقویت کیلئے قرآنی، عقلی، سائنسی اور مشاہداتی دلائل اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ قارئین کے دل دین اسلام کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔پابندی صوم وصلوٰۃ کے خواہشمند حضرات کیلئے یہ ایک موزوں ہے۔

حضورِ قلب

اوراق:408 قیمت:300روپے

اس کتاب میں خشوع وخضوع اور حضورِ قلب کے متلاشیان کیلئے علم اور روحانیت کا ذخیرہ یکجا کیا گیا ہے۔قرآن و حدیث سے اس موضوع کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔اولیائے کرام کی زندگیوں کے روح پرور واقعات اس کتاب کی زینت ہیں۔مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کے کلام کا احاطہ یوں کیا گیا ہے کہ جہاں یہ قارئین کے انتہائی دلچسپی کا باعث بنتا ہے وہاں اُن کی عبادات میں اخلاص پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

حسن نماز

اوراق:932 قیمت:350روپے

اس کتاب میں مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی رکن نماز کی اہمیت سے آگاہ کرنے کے بعد وہ عناصر بیان کیے گئے

ہیں جن کی بنیاد پر سالک اپنی نماز کو معراج کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔ مصنف نے قارئین کو نماز کے اغراض و مقاصد کے علم کے ساتھ ساتھ نماز کے معارف، فضائل اور دیگر روحانی پہلوؤں سے آگاہ کیا ہے۔ متلاشیانِ حق، نماز کے آداب باطنی اور ظاہری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔

مجلس اقبال اوراق:716 قیمت:385روپے

اس کتاب کی مدد سے علامہ اقبالؒ کے کسی بھی فارسی شعر کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ (بحوالہ کلیاتِ اقبال مرتبہ غلام علی اینڈ سنز) یہ کتاب طلباء، علماء اور محققین کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ تفہیم اشاریہ کیلئے نکات، فارسی سمجھنے کے آسان طریقے، فارسی زبان کی چند گردانیں اور فارسی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ اس کتاب میں قارئین کی سہولت کیلئے ڈال دیئے گئے ہیں۔

تھذیب نفس: اوراق:586 قیمت:450روپے

انسان نفس و روح کا مرکب ہے۔ روح منبع خیر اور نفس منبع شر ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے حقیقت انسان پر روشنی ڈالتے ہوئے نفس کا مفہوم، اہمیت، اقسام و مدارج، قلب، عقل اور روح پر اس کے اثرات اور حقوقِ نفس پر عالمانہ محققانہ بحث کی ہے۔ آفاتِ نفس اور اس کے باریک خطرات سے قارئین کو مطلع کرنے کے بعد نفس کے علاج پر قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ و اولیاء کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے۔ جسے پڑھ کر نہ صرف تنقیح مسئلہ ہوتا بلکہ اصلاحِ ذات کا داعیہ بھی بیدار ہوتا ہے۔

ثنائے خواجہ: اوراق:200 قیمت:150روپے

حضرت خواجہ پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ جہاں بے پناہ نثری علمی کام کیا ہے وہاں آپ نے شاعری کا ذوق لطیف بھی خوب پایا ہے جس کا عکس تمام کتابوں واضح ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر جو کلام ارشاد فرمایا جس میں محامد، نعتیں، منقبتیں اور بالخصوص احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے قومی بیداری کے غرض سے جو نظمیں لکھی، اُنہیں ثنائے خواجہ کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔ آپ نے اردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور وہ سب اس کتاب کا حصہ ہیں۔

مکتوبات لطیف: اوراق:300 قیمت:250روپے

''مکتوباتِ لطیف'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آپ کے اپنے محبین، معتقدین اور مریدین کو مختلف مواقع پر لکھے گئے خطوط ہیں۔ آپ کے مکتوبات بھی آپ کی عالمانہ، محققانہ شان کو ظاہر کرتے ہیں۔ مکتوبات کے مطالعہ سے آپ کا اپنی ساتھیوں کی اصلاح کا مخلصانہ جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مکتوبات جہاں قارئین کے لیے روحانی فیض کا سبب بنیں گے وہاں پیر صاحبؒ کے خلوص کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

پیر صاحب علیہ الرحمۃ کی زیر طبع تصانیف

متعلقاتِ زوجین | مسئلہ تقدیر | اکتسابِ رزق و انفاق | سرمایۂ ملت

مسلکِ اولیائے اُمت | متاعِ اخلاق | عقل، عشق اور جنون | تعلیماتِ اقبال

ادارہ نشانِ منزل کے اغراض و مقاصد

پیر عبداللطیف خان نقشبندیؒ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد ان کی زندگی کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے ادارہ نشانِ منزل تبلیغ اور ترویج کے عمل کو اسی جذبے سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ ادارہ مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کے نبھانے میں مصروف عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی پاک ﷺ کے طفیل ہمیں ہدایت کی راہ پر ثابت قدم رکھتے ہوئے اپنے مقاصد میں سرفرازی و کامرانی سے نوازے، آمین:

تبلیغ و ترویج اسلام:

دین کی تعلیمات جدید انداز میں سائنٹیفک اور دلچسپ طریقے سے بتائی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام الناس کے دل دین کی طرف راغب نہ ہوسکیں اور اُن کی زندگیوں میں ایک نمایاں تبدیلی رونما نہ ہو۔ اسی جذبے کو آگے چلاتے ہوئے مختلف دروس، سیمینارز اور روحانی محافل کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

درس قرآن:

جدید طریقہ تدریس اور کمپیوٹر کی مدد سے ترجمہ و تفسیر کا درس جس میں عربی گرائمر اور تجوید کے بنیادی قواعد سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔ ہر جمعرات اور جمعہ کے دن بعد از نماز مغرب منعقد کیے جاتے ہیں۔ شہر سے باہر رہنے والے مریدین دروس سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ اور اتوار کو ادارہ میں مستفیض ہو سکتے ہیں۔

درس عقائد و فقہ:

ان دروس میں اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلامی شرعی احکام، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ناگزیر ہے، بتائے جاتے ہیں۔ یہ درس ہر جمعرات کو بعد از درسِ قرآن ادارہ میں دیا جاتا ہے۔

درس روحانیت:

ہفتہ وار محفل ذکر، جو گذشتہ چالیس سالوں سے منعقد کی جاتی ہے، میں ذکر اور روحانی درس سے عوام الناس کے قلوب پر نورانی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اب اس محفل کا انعقاد اتوار بعد از نماز مغرب ہوتا ہے۔

تحقیق و تخریج:

امت مسلمہ کا اپنے وقار کو کھونے کا سبب مادہ پرستی اور علم و تحقیق سے دوری ہے۔ اسلاف کی پیروی میں علمی کیفیت اور تحقیقی جذبے کو فروغ دینے کے لیے ادارہ کوشاں ہے۔

نشانِ منزل پبلی کیشنز:

پیر صاحبؒ کی کتب کی اشاعت اور مارکیٹنگ کی اہم ذمہ داری ادارہ سرانجام دے رہا ہے۔ جو کتابیں اب تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔